اردو
اپریل ۱۹۸۱ء

نیا دور

جلد ۳۶ | نمبر ۱

اپریل ۱۹۸۱

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

سرورق: آغا محمد حسن

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن وبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۹ اپریل کو اترپردیش اردو اکاڈمی کی جنرل کونسل کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سال ۱۹۸۱ء ختم ہونے سے قبل اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں جو وعدہ کیا گیا تھا، حکومت اس کی پابند ہے۔" لیکن اردو کو باقاعدہ طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے قبل اس کے لیے ریاست میں سازگار ماحول بھی قائم کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ وزیر اعلیٰ نے مذکورہ بالا جلسے میں کہا بھی تھا۔ اس سلسلے میں حکومت نے متعدد اہم اقدامات کیے ہیں۔ جن میں سرکاری دفتروں میں اردو میں پیش کی جانے والی درخواستیں قبول کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد اور اردو ٹیچروں کو مستقل کرنا شامل ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ممبران مجالس قانون ساز کو اردو میں حلف لینے کی سہولت فراہم کی جائے گی، اس کے لیے جلد ہی ضروری قانونی بندوبست کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری بسوں میں ان کی منزل کا نام اردو میں بھی درج ہو۔ اس سے قبل ۴ اپریل کو دوھان بھون میں منعقدہ ایک خصوصی جلسے میں بھی بعض اہم فیصلے کیے گئے۔ یہ جلسہ اردو زبان کی حوصلہ افزائی کرنے کے طریقوں پر غور و خوض کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا جس کی صدارت وزیر اطلاعات و قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی نے کی۔ اس جلسے میں جو فیصلے ہوئے ان کے مطابق اترپردیش کے ایسے اضلاع میں جہاں اردو جاننے والوں کی آبادی ۱۵ فیصد یا اس سے زیادہ ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولس سپرنٹنڈنٹ کے دفتروں میں اردو جاننے والے ایک ملازم اور ٹائپسٹ کی جلد سے جلد تقرری کی جائے گی تاکہ ان دفتروں میں اردو میں عرضداشتیں پیش کرنے والوں کو کسی طرح کی کوئی دشواری نہ ہو اور انھیں ان کی درخواستوں کا جواب بھی اردو ہی میں دیا جا سکے۔

اس خصوصی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ ابتدا میں یہ بندوبست ان ۱۲ ضلعوں میں جو اردو اضلاع قرار دیے گئے ہیں (یعنی رامپور، بجنور، بریلی، مرادآباد، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، پیلی بھیت، بہرائچ، گونڈہ، بارہ بنکی، بستی) اور لکھنؤ میں کیا جائے گا۔ بعد میں اس بندوبست کی توسیع دیگر اضلاع میں بھی کی جائے گی۔ ڈاکٹر رضوی نے کہا کہ اترپردیش کے تمام ضلعوں میں اردو میں دی گئی درخواستیں قبول کی جائیں گی اور ان کا جواب بھی اردو میں ہی دیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں دیگر ضلعوں میں فی الحال یہ بندوبست کیا جائے گا کہ موجودہ ملازمین میں سے ہی اردو جاننے والے ملازمین کا انتخاب کر لیا جائے گا اور انھیں کچھ ترغیبی رقم دے کر اردو درخواستوں کا اردو میں جواب دینے کا کام ان سے لیا جائے گا۔

جلسے میں اس پر بھی غور کیا گیا کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے صدر دفتر کی طرح ضلع اطلاعات دفتروں سے بھی اردو میں پریس نوٹ جاری کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ فی الحال ریاست کے اردو اضلاع اور بڑے شہروں کے ضلع اطلاعات دفتروں سے اردو میں پریس نوٹ جاری کرنے کی غرض سے وہاں ایک ایک شخص کی تقرری کر کے یہ کام شروع کیا جائے گا۔

جلسے میں ریاستی محکمۂ لسانیات کے اردو شعبے کو اور زیادہ مستحکم بنانے اور اردو کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے پر بھی غور و خوض کیا گیا۔

مذکورہ بالا فیصلوں اور اقدامات کے علاوہ مالیاتی سال رواں میں اردو اکاڈمی کا بجٹ بھی ۱۰ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۱۸ لاکھ روپے کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اترپردیش کی موجودہ حکومت وزیر اعلیٰ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں اردو کی توسیع و ترقی کے لیے مخلصانہ طور پر کوشاں ہے اور موثر اقدامات کر رہی ہے، جس کے نتیجے میں لازمی طور پر اردو کے لیے سازگار فضا تیار ہو گی۔ وزیر اعلیٰ اور ان کی حکومت کا رخ اور پالیسی اس سلسلے میں ابتدا ہی سے واضح رہی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اردو کی اہمیت، اس کے حسن و دلکشی، اس کی ضرورت اور قومی زندگی میں اس کے نمایاں اور شاندار رول کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے ۹ اپریل کو اردو کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اردو کی جڑیں ہمارے پردیش کی دھرتی میں پیوست ہیں اور اردو یہاں کے عوام کے دلوں میں رچی بسی ہے۔ اردو کا سرمایہ، اس کا ادبی خزانہ ایسا ہے جسے نہ کبھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ فراموش کیا جا سکتا ہے۔ اردو کو علاحدہ رکھنے کی کوشش تاریخ کی ایک کڑی کو الگ کرنے کے مترادف ہے۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بنانے والی اردو ہمارے مشترکہ قومی مزاج کا آئینہ دار ہے اور اس کے مزاج کی تشکیل میں بھی اردو نے اہم کردار ادا کیا ہے۔"

——— ایڈیٹر

غزلیں

صلاح الدین نیّر
۴۴ ۳ ۔ ۶ ۔ ۳۰ بازار روپ لال
حیدرآباد۔

زندگی کم ہے بہت تم کو بھلانے کے لیے
کیوں چلے آئے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے

کس طرح عمر کٹی یہ تو ہمیں جانتے ہیں
اپنے روٹھے ہوئے ساتھی کو منانے کے لیے

زندگی بھر جو یہاں فرشِ نظر بن کے رہا
تم نے چھوڑا ہے اسے ٹھوکریں کھانے کے لیے

ایک دو دن نہیں برسوں سے ریاضت کی ہے
تیری آواز میں آواز ملانے کے لیے

خلوتِ دل میں کبھی میں ہی چلا آؤں گا
بھولے بسرے ہوئے دن یاد دلانے کے لیے

اتنے رسوا ہوئے ہم عزتِ سادات گئی
ہم نے کیا کیا نہ کیا آپ کو پانے کے لیے

کب تلک پھرتا رہوں خانہ بدوشوں کی طرح
اب تو آجاؤ مرے گھر کو بسانے کے لیے

پیار کے شہر میں نیّر گلِ تازہ کی طرح
کون ہے خوشبو کا احساس دلانے کے لیے

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ، ہاسپٹل کوارٹر
لکھنؤ

میری بربادی کی کب تک داستاں دہرائے گا
ایک دن اے دوست تو بھی داستاں بن جائے گا

سب سے پہلے میرے ہاتھوں کا تصور آئے گا
انگلیوں سے جب تری زلفیں کوئی سلجھائے گا

ڈوبنے والے تجھے کیسے بچاؤں کیا کروں
آج کا یہ حادثہ میری غزل بن جائے گا

زندگی لایا ہوں میں دنیا میں خوشبو کی طرح
کوئی جھونکا آئے گا مجھ کو اڑا لے جائے گا

یہ سیاسی فاصلے یوں ہی اگر بنتے رہے
آدمی سے آدمی ملتے ہوئے گھبرائے گا

ہر نظر کا خیر مقدم مسکراہٹ سے نہ کر
ورنہ میرے دوست تو بھی بے وفا کہلائے گا

رقص کی یہ محفلیں یہ شام یہ ساغر کے دور
فرصتیں ہوں گی تو سونا پن ہی دل بہلائے گا

تیر کتنی ہی کمانوں پر چڑھے ہیں منتظر
امن کا پیغام سنتے ہیں کبوتر لائے گا

ہاں نہ تم تسنیم ڈھونڈو اس ہنسی کے شہر میں
ہر نفس ہر پھول اک دن بے وطن ہو جائے گا

مولانا محمد علی جوہر کی قدیم ترین تحریر

مولانا محمد علی ہندوستان کی تحریک آزادی و حریت کے رہنما ہی نہیں تھے، تعلیم کے معاملے میں بھی انقلاب انگیز انداز فکر رکھتے تھے۔

انھوں نے اپنی سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے مایوس ہو کر جامعہ ملیہ کا جو عملی نقشہ مرتب کیا وہ ان کے بھرپور خلوص، توجہ اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے تعلیمی تجربات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ ہمارے ان سیاسی رہنماؤں میں تھے جنھیں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کا بے حد احساس تھا۔

چنانچہ مولانا محمد علی بھی چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو نئی اور روح پرور غذا بھی میسر آتی رہے۔ خود ان کے ذہن کی تشکیل میں بی اماں کا ہاتھ بڑی نمایاں تھا۔ اسی وجہ سے ان کے انداز فکر اور ان کے انداز تربیت کا اقرار محمد علی نے بھی سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔ وہ بی اماں سے بے حد متاثر ہوئے۔ تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد قومی معروفیتوں کے سلسلے میں بھی بی اماں محمد علی کا بہت بڑا سہارا بنی رہیں۔ وہ بڑی روشن دماغ اور دور بین ہستی تھیں۔ اسی لئے انھوں نے اپنی قدامت پسند خاندان کی مخالفت کے باوجود محمد علی کو مغربی تعلیم دلائی۔ شاید ان کا یہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لیے ایک بیش قیمت انعام تھا جس نے محمد علی کو وہ کچھ بنا دیا جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔

محمد علی کی قومی تحریکات اور مشغولیتوں میں جو رخ بی اماں نے اختیار کیا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے محمد علی کی دنیاوی زندگی ہی کا سدھار نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے بیٹے کو قوم کے سپرد کرنے کے لیے تیار بھی کر رہی تھیں۔

"جان بیٹا خلافت پہ دیدو" کا نعرہ بی اماں سے منسوب کرنے والے نے دراصل بی اماں کی بزرگ، ہمدرد اور وطن دوست شخصیت کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے جس میں ان کے تمام انقلابی ولولے سما گئے ہیں۔

محمد علی بھی اپنے بچپن ہی سے تنگ و تاریک روایات کے حبس بیجا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور ان کی قائدانہ شان کے نقوش بہت واضح طور پر مل جاتے ہیں وہ گرفتار رسوم و قیود نہ رہ سکے اور بچپن میں ان کے ذہن نے جس روشنی کا اکتساب کیا وہ ہندوستان کے چپے چپے پر پھیل کر رہی۔

جو تحریر ہم آگے چل کر پیش کرنے والے ہیں اس سے اس محمد علی کا سراغ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی جو مغربی تعلیم کو فقط پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دولت بیدار کو عام کرتا چلے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ تحریر خاصی وسعت خیال کا پتہ دیتی ہے۔

یہ تحریر مولانا محمد علی کی عام شاعرانہ روییے کو سمجھنے میں بھی

دکھا یا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے ان کے ذہن میں بچپن ہی سے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اور وہ "نامشتہاں کوئے دلدار ہیں"، کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یاں بازوں سے دلداری کا رجحان اور شاعرانہ رندی و بیباکی سے دوری کا اظہار۔ یہ دونوں باتیں اسی تحریر میں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ان کا کلام شاعرانہ تاثرات اور رنگا رنگ احساسات سے عاری نہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس میں ان کے نجی جذبات کے اظہار اور واردات کے بیان کے ساتھ قوم کا درد بھی شامل ہے۔ اگر ایک طرف مذہبی [illegible] کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ملک و ملت پر سب کچھ نچھاور کر [illegible] دینے کا حوصلہ بھی پھوٹا پڑتا ہے۔ ان کا کلام خصوصی توجہ چاہتا ہے اور ہمارے نقادوں کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

یہ تحریر رام پور کے اسٹیٹ گزٹ کی اشاعت دوشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۰ء مطابق [illegible] کے صفحہ [illegible] پر درج ہے۔ مولانا محمد علی نے [illegible] یوں لکھی ہے۔

"[illegible] فرمایا تھا اس کا شکریہ [illegible] تاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ [illegible] کے پانچ سال پورے کیے۔" [1]

(مضامین محمد علی جلد اوّل صفحہ ۱۲ منقول از ہمدرد ۱۷ جون ۱۹۲۷ء)

گویا اوّل الذکر تحریر لکھتے ہوئے وہ اپنی عمر کے بارہویں سال میں تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے کیا۔ اس لئے ۱۸۹۰ء تک انھیں اسکول ہی کا طالب علم ہونا چاہیے۔

حیات جوہر میں عشرت رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

"ابتدا میں مولانا کو قرآن کریم کی مکمل تعلیم دلائی گئی۔ اور جب اس کی تکمیل ہو گئی تو جدید اصول کے مطابق ضروری درسیات سے فراغت ہوئی۔ بعد ازاں بریلی ہائی اسکول میں داخل کرائے گئے۔

... کچھ عرصے بریلی اسکول میں رہے۔ چندے بعد علی گڑھ کالجئیٹ اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ اسکول سے فراغت کر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی۔ جو اعلیٰ کامیابی اسکول میں حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ اپنی خاص ذہانت اور طباعی کا ثبوت کالج میں دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

(صفحہ ۳۵ کتاب مذکور)

مولانا محمد علی کے سوانح نگار، رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے:

"پہلے اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔"

(سیرت محمد علی صفحہ ۲)

مندرجۂ بالا بیانات سے گھریلو تعلیم اور بریلی ہائی اسکول کے درمیانی وقفے کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ان بیانات کے پیش نظر تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ گھریلو تعلیم کے متصل بعد وہ بریلی ہائی اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ لیکن اپنی انگریزی خود نوشت میں مولانا محمد علی نے لکھا ہے

'I WAS SENT TO A SCHOOL RECENTLY FOUNDED AT RAMPUR AND SUBSEQUENTLY TO ANOTHER AT BAREILLY ..." P. 4.

یہ رام پور کی کسی باقاعدہ درس گاہ میں ان کی تعلیم کی طرف محض ایک اشارہ ہے۔ جو تحریر میں آگے پیش کی جا رہی ہے وہ اس اشارہ کا ایک دستاویزی ثبوت پیش کرتی ہے۔ مزید برآں ہمارے عظیم رہنما کی پرخلوص، پرمحبت اور پرعزم باشعور زندگی کی داستان کی یہ کڑی اہم شکل میں سامنے

آتی ہے۔ کہ بچپن کا محمد علی اپنی عمر و فکر کی پرچھائیاں بھی واضح اور نمایاں طور پر آشکار کر دیتا ہے۔

گزٹ کے اسی شمارے میں محمد عبدالحق انسپکٹر مدارس کی ایک رپورٹ بھی شریک اشاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

"مارچ ۱۸۸۸ء میں انگریزی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ شہر میں کھولا گیا۔ اس مدرسہ نے اس وقت تک جو ترقی کی ہے بہمہ وجوہ باقاعدہ اور قابل اطمینان ہوئی ہے۔"

رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"ابتدا میں یہ صرف جماعت ششم تک تھا۔ پھر ۱۸۹۰ء میں درجہ مڈل بھی قائم کر دیا گیا۔"

(مذکورہ رام پور گزٹ صفحہ ۱۴)

اس لیے ۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی کا اس مدرسۂ انگریزی میں طالب علم ہونا قرین قیاس ہے۔

مینہ سیج کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر مولانا محمد علی رام پور آ گئے۔ جب انگریزی اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر کیے گئے تھے۔ دراصل اسی کے وہ اولڈ بوائے بھی تھے اور اس نے بھی اپنے لائق منتظم کی تعمیر میں ایک رول ادا کیا تھا۔

یہ مضمون مولانا محمد علی کی ذہنی اور مادی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے فراخدلی اور ذہنی وسعت جو وقت کا تقاضہ تھی۔

۲۔ گھریلو دینی تعلیم کے بعد اور بریلی ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفے کی تعلیمی مشغولیت کا ثبوت اسکول کے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے۔

مولانا نے اپنی اس تحریر میں انگریزی تعلیم کی جس شد و مد سے حمایت کی ہے اسے کورانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مضمون مولانا حالی اور سر سید احمد خان کی آواز بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لیے بھی مولانا محمد علی کی عملی زندگی کو دیکھنا چاہیے

جس کے بعد یقیناً یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالص مشرقی عادات و خصائل کے آدمی تھے۔ اپنے لباس میں بھی کسی نہ کسی حد تک اپنی عمر کے ہر حصے میں انھوں نے مشرق و مغرب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں کبھی نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار اس انداز میں ہوتے ہوں کہ اپنی مادری زبان بولنا بھی انھیں گناہ معلوم ہو۔ انھوں نے خود سپردگی کی وہ روش بھی اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے لاپروائی ثابت ہوتی ہو۔ وہ جذباتی ضرور تھے لیکن سنبھلے ہوئے۔

اصل تحریر سے پہلے یہ بات اور بتاتا چلوں کہ انسپکٹر مدارس کی رپورٹ اور طالب علم محمد علی کے مضمون کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں مدرسہ انگریزی کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھیں۔ اس لیے گزٹ میں دونوں پر ۱۸ اگست ۱۸۹۰ء اندراج تاریخ ہے۔

مولانا محمد علی کا یہ مضمون اس لیے قابل قدر ہے کہ یہ ایک ذہنی انقلاب کا نمائندہ ہے اور ایک تعلیمی انقلاب کی یادگار ہے۔ جو آگے چل کر ہندوستان کی سرزمین خصوصاً مسلمانوں کی دنیا میں آیا۔ لیکن یہ اس لیے بھی مزید قابل قدر اور اہم ہو جاتا ہے کہ یہ اب تک کی قدیم ترین معلومہ تحریر ہے جسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد علی کی یہ قدیم ترین تحریر اپنی افادیت اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر مولانا محمد علی سے متعلق سرمایہ میں اضافے کا باعث ہوگی۔

"مضمون محمد علی خاں طالب علم مدرسہ انگریزی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

"جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ایک بڑا حصہ ہماری ابتدائی عمر کا افسوسناک نمونہ دکھاتا ہے ہماری ابتدائی تعلیم محض ناکارہ اور ادھوری بلکہ خطرناک مرحلہ ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پا کر فقط قوت حافظہ کو کام میں لاتے ہیں، فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا، خصوصاً

کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔ وہی ابتدائی زمانہ عجیب زمانہ ہے، جس میں دل و دماغ صاف اور غیر مکدّر ہوتے ہیں۔ فکر و غور کرنے کی عمدہ اور مضبوط بنیاد اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ اس قوت کے پیدا ہو جانے سے شائستگی، تہذیب، علم و ہنر انواع اقسام کی دولت پر ثابت قدمی سے تصرف کر سکتے ہیں اور جو باقی زندگی کہ ہم کو اس دنیا میں بسر کرنا ہے نہایت فارغ البالی سے بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ایسے اقبال مند کہاں تھے جو یہ دولت ہمارے ہاتھ آتی ہم کو تو اوّل ہی حسن و عشق کی سوسائٹی میں شامل ہونا پڑا۔ قیس و فرہاد کی آشفتہ حالی کا نقشہ لیلیٰ و شیریں کے خوبی و جمال کی تصویر ہماری تعلیم کا جزو سمجھی گئی۔ اول جب ہی مکتب میں قدم رکھا کسی کا یہ شعر برزبان تھا:

اے داغ بر دل از غم خالِ تو لالہ را
شرمندہ ساختت آہوئے چشمت غزالہ را

اور کوئی یہ شعر ازبر پڑھتا:

ما مقیمان کوئے دلداریم
رخ بدنیا و دیں نمی آریم

یہ پرانے فیشن کی (دقیانوسی) تعلیم ہے جس تعلیم میں حکایات عشق آمیز اور فسانہ ہائے جنون خیز داخل ہوں اس سے پھر نتیجے کی امید رکھنا محض فضول خیال ہے بلکہ وہ سادہ اور صاف طبیعت کو بڑے خطرناک رنگ میں رنگتی ہے۔

ہر تعلیم کے واسطے قدیم ہو یا جدید طبیعت کا یکسو ہونا بہت ضروری ہے۔ شاعرانہ خیال کی پابندی یا عشقیہ شعر و سخن کا مطالعہ طالب علم کے واسطے خراب اثر پہنچاتا ہے جیسے روایات موسم ہوا کو اور ہوا طبیعت کو اور طبیعت جسم کو اور جسم جان کو تعلیم جدید جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے۔ جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب نیم وحشی انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے لیکن اب زمانہ بدل چلا ہے۔ زمانہ پہلے سے غیر ہے مگر بیشتر ہم کو اپنی عادت کی اصلاح کرنا فرض ہوگی۔ ہماری رفاہ اور اصلاح کا سارا مہیا ہے۔ ہماری حالت بھی بدل جائے گی ترقی کے زینے پر قدم جائیں گے اور انشاءاللہ ضرور ترقی مدارج کو طے کریں گے۔

خدا کے فضل سے عالی جناب جنرل محمد اعظم الدین خان صاحب بہادر دائس پریزیڈنٹ نے ان ضرورتوں کو ملاحظہ فرما کر یہ مدرسہ علوم جدید نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کرایا۔ جناب ممدوح کی دلی توجہ اس مدرسہ کی سرپرستی میں مصروف ہے۔ یہ ہونہار و تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ اپنی عمدہ کوشش سے اپنی اعلیٰ لیاقت کا ثبوت جناب معتمد الیہ کے حضور میں پیش کرے۔ اس روز عالی جناب اپنی خاص توجہ کا آخری نتیجہ ملاحظہ فرما کر کس درجہ اظہار خوشنودی فرمائیں گے۔

اے خدا جلد وہ مبارک دن دکھلا
محمد علی طالب علم مدرسۂ انگریزی
رام پور اسٹیٹ
(۱۸ اگست ۱۸۹۰ء)

جیسا کہ میں نے تمہیداً عرض کیا تھا مندرجۂ بالا تحریر میں مولانا محمد علی کا وہ ناقدانہ اعتراض بھی شامل ہے جو انھیں اپنے زمانۂ طالب علمی کے نصاب تعلیم کے غیر اخلاقی پہلو پر تھا چنانچہ انھوں نے اپنے امتحان اور محمود نامہ کے اشعار بھی ثبوت میں نقل کئے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

انقلاب کی خوشبو

عشرت ظفر

معرفت جوبلی واچ کمپنی نمبر ۱۶
لال امل کراسنگ
سائیکل مارکیٹ اکانا پور

اٹھو دیارِ عمل کے حسین شہزادو
جِلو میں لے کے چلو نورِ آگہی کا جلوس

طلوع ہونے کو ہے آفتابِ رامش و رنگ
دمک رہا ہے افق صورتِ عذارِ عروس

شمیمِ زلفِ نگارِ طرب ہے عطر فشاں
مہک رہا ہے فضاؤں کا شبنمی ملبوس

ہے دشتِ شامِ یقیں میں تراوشِ انجم
سیاہ رو نظر آتے ہیں وہم کے فانوس

دیارِ گیتی و گردوں میں پھر ہے آوارہ
نوائے صبح جو زندانِ شب میں تھی محبوس

فضائے وقت کے شاداب سبزہ زاروں پر
ہے پھر رقص پر افشاں حیات کا طاؤس

حصارِ سنگِ ہوس سے نکلنے والا ہے
سمن برانِ تمنا کا شیشۂ ناموس

جلالِ تیشۂ مزدور سے ہے لرزیدہ
شکوہِ سلطنتِ کیقباد و کیکاؤس

اٹھے ہیں تابشِ عہدِ جنوں کی تاب لیے
وہ آئنے جو غبارِ خرد سے تھے مانوس

تراشنے کو ہیں لے نو بہار نغموں کی
سحر نواز شوالوں کے دل نشیں ناقوس

ابھر رہے ہیں فضا میں چراغ اُجالوں کے
ہر ایک لمحۂ نو کر رہا ہے پھر محسوس

فضا میں ایک نئے آفتاب کی خوشبو
خرامِ قافلۂ انقلاب کی خوشبو

ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن
پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو
بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور

اکبر الہ آبادی کے سنہ ولادت کی تصحیح

"لسان العصر" سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے سوانح نگاروں میں ان کے سالِ ولادت کے اندراج میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی مثالیں ملاحظہ ہوں:—

۱۔ سید بشیر حسین ولد ڈاکٹر زاہد حسین الہ آبادی، اکبر الہ آبادی کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ یہ اکبر کی ہمشیرہ سیدہ علی باندی زوجہ شیخ غلام امام دیوبندی ثم الہ آبادی مادر شیخ ممتاز احمد عرف راجہ میاں کے نواسے ہیں۔ سید بشیر حسین کا ایک مقالہ بعنوان "اکبر کا آرٹ"، علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اپنے اس مقالے میں سید بشیر حسین نے اکبر کا سال و تاریخ ولادت ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء تحریر کیا ہے لکھتے ہیں:—

"دراصل حضرت اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء بمقام بارہ ضلع الہ آباد، عالمِ وجود میں آئے۔"[۱]

۲۔ اکبر الہ آبادی کے انتقال [۹ ستمبر ۱۹۲۱ء] کے بعد اکبر پر جو سب سے پہلی جامع تصنیف منظرِ عام پر آئی وہ طالب الہ آبادی کی کتاب "اکبر الہ آبادی" ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۲ء میں ادارہ احمدی پریس، الہ آباد سے شائع ہوئی۔ ہمارے سامنے اس کتاب کی طبع ثانی کا نسخہ ہے جو اسی پریس سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ طالب نے اپنی اس تصنیف میں اکبر کی تاریخ و سالِ ولادت بحساب شمسی

۷۸۶

خان بہادر سید اکبر حسین
جج و فیلو الہ آباد یونیورسٹی
معروف بہ
لسان العصر اکبر الہ آبادی
پیدائش ۱۸۴۵ء
وفات ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء
قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی مجھے
زہر سمجھے تھے جسے وہ شربت دیدار تھا

سال ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء اور بحساب قمری سال و ماہ — شوال المکرم ۱۲۶۲ھ تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

"سید اکبر حسین صاحب ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء بمطابق شوال المکرم ۱۲۶۲ھ کو موضع بارہ، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔"[۲]

مذکورہ بالا تحریر میں طالب الہ آبادی قمری مہینے کا نام تو لکھا ہے لیکن اس کی تاریخ کی تخصیص نہیں کی ہے۔

۳۔ "گلِ رعنا" کی اردو کے اہم تذکروں میں ایک اہم حیثیت ہے۔ یہ کتاب حکیم عبدالحیؒ، سابق ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اپنی اس تصنیف، میں

حکیم صاحب موصوف نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں حضرت اکبر کی زیارت اور ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا تذکرہ بڑے لطف کے ساتھ کیا ہے۔ "گل رعنا" میں اکبر کا سال ولادت سنہ عیسوی کے اعتبار سے تو وہی ۱۸۴۶ء ہی درج ہے، اکبر کے دوسرے سوانح نگاروں اور خود طالب الٰہ آبادی نے بھی تحریر کیا ہے، لیکن سنہ ہجری میں حکیم صاحب موصوف نے طالب الٰہ آبادی کی تحریر کردہ سال ولادت سے اختلاف کیا ہے اور ۱۲۶۱ھ کے بجائے ۱۲۶۲ھ تحریر کیا ہے:۔

"اکبر الٰہ آبادی کی حیات اور شاعری پر دو اور اہم تصانیف قابل قدر ہیں۔ "بزم اکبر" مصنفہ قمر الدین بدایونی اور آنجہانی مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی گراں قدر تصنیف "اکبر نامہ" یا "اکبر میری نظر میں" دو اہم دستاویز ہیں۔ دونوں تصانیف اکبر الٰہ آبادی پر تحقیق و تنقید کے مستند معیار اور سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بزم اکبر کی اشاعت ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے ہوئی۔ اور "اکبر نامہ" ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی اشاعت ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آئی۔

اکبر الٰہ آبادی کے سال ولادت کے اندراج میں ان دو حضرات نے ان ہی روایتوں کی پیروی کی ہے جن کی بنیاد ان کے پہلے کے سوانح نگاروں نے ڈالی تھی۔ "بزم اکبر" میں بحسب سابق اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہی تحریر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات گرامی ہر حیثیت سے مسلم ہے۔ اکبر الٰہ آبادی سے ان کو وہی عقیدت ہے جو حالی کو سر سید سے تھی۔ مولانا موصوف نے اپنی تصنیف "اکبر نامہ" کے صفحہ ۔۔ پر ایک مقالہ بعنوان "دیباچہ خطوط اکبر" تحریر کیا ہے۔ اسی مقالہ میں موصوف نے اکبر کا سال ولادت و وفات بھی تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرت اکبر (۱۸۴۶ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء) اپنے زمانہ کے مشہور ترین شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اکبر کے تمام سوانح نگاروں (باستثنائے چند) نے اکبر کے صحیح سال ولادت سے غفلت برتی ہے۔ خاکسار کی تحقیق و تدقیق کے بعد جو حقیقت سامنے آئی ہے وہ محققین کرام کی توجہ کی محتاج ہے۔ یہ حقیقت بڑی دلچسپی اور قدر کی نگاہ سے سنی اور دیکھی جائے گی کہ سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی کا سال ولادت ۱۸۴۵ء بمطابق ۱۲۶۱ھ ہے۔ اور یہی سال بہر نوع بالکلیہ صحیح ہے۔ یہ حقیقت مستند شہادتوں، معتبر اسناد اور عمیق تحقیق کے بعد سامنے آئی ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اکبر کا یہی سال ولادت اکبر کے لوح مزار پر بھی درج ہے جسے راقم السطور نے بذات خود دیکھا ہے۔

اور ان کی قبر کے کتبہ پر درج ۱۸۴۵ء کے سبب راقم الحروف کے ذہن میں اکبر کے صحیح سال ولادت کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں تحقیقات کی گئیں اور جو معتبر شواہد و اسناد سامنے آئے ان کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اکبر کا سال ولادت دراصل ۱۸۴۵ء بمطابق ۱۲۶۱ھ ہی صحیح ہے۔ اس تصحیح و تحقیق کی تقویت اور ثبوت میں تین اہم اسناد اور شہادتیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(الف) لوح تربت پر تحریر شدہ سال ولادت (۱۸۴۵ء)

(ب) ہندوستان میں موجود اکبر کے قریبی رشتہ داروں کی شہادتیں۔

(ج) سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا سابق مدیر "مخزن" کے دو اہم ارشادات۔

الف:۔ اکبر الٰہ آبادی کے سال ولادت کی تحقیق کے سلسلے میں راقم الٰہ آباد حاضر ہوا، اور مختلف معتبر وسائل سے استفادہ کیا۔ خسرو باغ (الٰہ آباد) سے مغرب کی جانب، جی ٹی روڈ پر محلہ ہمت گنج میں واقع "کالے ڈانڈے" نامی قبرستان میں سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی کے مزار کی زیارت نصیب

ہوئی۔ اکبر، ان کے بڑے صاحبزادے سید عشرت حسین اور ان کی بیگم فاطمہ صغریٰ کے مزارات ایک ساتھ ہیں۔ ان میں آدّا اکبر کی دو قبروں پر ڈھائی فٹ اونچی لوح تربت نصب کی گئی ہے۔ فاطمہ صغریٰ کی قبر پر نہ تو لوح تربت اور نہ کوئی کتبہ ہی درج ہے۔ یہ تینوں قبریں ایک ساتھ چبوترہ نما بنی ہوئی ہیں مشرق کی طرف سید عشرت حسین، درمیان میں اکبر الہ آبادی اور آخر میں بجانب مغرب فاطمہ صغریٰ کا مزار ہے۔

پیش نظر لوح مزار میں اکبر الہ آبادی کے سال وفات کی تاریخ سنہ عیسوی کے مہینے اور سال کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس کتبے میں اکبر کے سال ولادت کی تاریخ اور مہینے کا اندراج نہیں کیا گیا ہے صرف ان کا سال ولادت بحساب سال شمسی بخط جلی سنہ ۱۸۴۵ء درج ہے۔

(ب) ہندستان میں موجود اکبر الہ آبادی کے جن رشتہ داروں نے اکبر کی قبر کے کتبہ پر اکبر کے سال ولادت سنہ ۱۸۴۵ء کی تصدیق کی ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اکبر الہ آبادی کی ہمشیرہ سیدہ علی باندی زوجہ شیخ غلام امام دیوبندی ثم الہ آبادی کے پوتے کیپٹن ڈاکٹر اشتیاق احمد عرف [illegible] ایک ماہر معالج اور سماجی کارکن ایک ولد شیخ ممتاز احمد ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ الہ آباد شہر کے محلہ روشن باغ میں ان کی شاندار کوٹھی اور کلینک ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد سے راقم السطور کو ان کی کوٹھی پر شرف ملاقات حاصل ہوا۔ انھوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اکبر کے حالات زندگی بیان کیے اور کئی سربستہ رازوں کو بے نقاب کیا اور سید عشرت حسین کے "سوتوں کا مزہ بھول جانے" کے واقعے کی حقیقت بتائی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے بچپن میں حضرت اکبر کی زیارت کی ہے، وہ مجھے پیار سے گلن، کہا کرتے تھے۔ ان دنوں میری دادی سیدہ علی باندی

اکبر کی کوٹھی عشرت منزل، محلہ نخاس کہنہ، جی ٹی روڈ، الہ آباد، میں حضرت اکبر کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ مذکورہ کتبہ کی شہادت کے علاوہ راقم کو ڈاکٹر صاحب موصوف سے اور بھی کئی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

۲۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے چھوٹے بھائی تھے جن کا نام سید اکبر حسن تھا۔ اکبر کی مشہور زمانہ نظم "لوڈور کا آبشار" بزمانہ قیام علی گڑھ ان ہی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔[۶] سید اکبر حسن کے ایک صاحبزادے کا نام سید محمد عباس رضوی تھا۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ سید محمد عباس رضوی الہ آباد کے محلہ دوندی پور میں رہا کرتے تھے۔ ان کے چار صاحبزادگان ہیں۔ سید محمد رضوی، سید احمد رضوی، سید محمود رضوی اور سید آغا حامد رضوی۔ ان میں سے راقم السطور کی ملاقات سید احمد رضوی سے ان کے دولت کدہ واقع محلہ دوندی پور شہر الہ آباد میں ہوئی۔ سید احمد رضوی نے اکبر کی قبر پر درج (ان کے سال ولادت) ۱۸۴۵ کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔

۳۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کی دوسری بیوی کا نام فاطمہ صغریٰ ہے۔ اکبر کے سوانح نگاروں نے انھیں "اکبری بیگم" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ سید علی حسین کی صاحبزادی تھیں۔ سید علی حسین امامیہ مذہب کے پیروکار تھے۔ راقم کی ملاقات سید علی حسین کے پوتے اور فاطمہ صغریٰ کے بھتیجے سید ہاتف حسین ولد سید حافظ حسین سے ہوئی۔ ہاتف صاحب شہر الہ آباد کے محلہ نور علی گنج کے فاخرہ لاج میں رہتے ہیں۔ یہ ریلوے میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ موصوف نے بھی مزار اکبر پر کندہ ان کے سال ولادت ۱۸۴۵ کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مذکورہ بالا ان تینوں صاحبان نے اکبر کی قبر کے کتبہ پر درج ان کے سال ولادت ۱۸۴۵ء کے صحیح ہونے کی شہادت دی۔ ان تمام حضرات نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ اکبر کے

لوحِ تربت پر درج بالا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء معتبر خاندانی اسناد سے تحریر کرایا گیا ہے۔

اکبر کے افرادِ خاندان کی شہادت و تصدیق کی روشنی میں ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے کہ مزارِ اکبر کے کتبہ پر درج ۱۸۴۶ء ہی اکبر کا صحیح سالِ ولادت ہے۔

(ج) سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء ہی صحیح ہے اس سلسلے میں سب سے مستند اور معتبر تحریری ثبوت کے طور پر سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا سابق مدیر "مخزن" کی تین اہم تحریریں پیش کی جاتی ہیں:-

سر شیخ عبدالقادر کی زمانہ ساز شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان سے اکبر سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ "رقعاتِ اکبر" مرتبہ مرزا نصیر ہمایوں میں موصوف کے نام اکبر الہ آبادی کے کئی خطوط دستیاب ہوئے ہیں اور اکبر کے بیشتر اشعار رسالہ "مخزن" کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ انکشاف بھی قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اکبر الہ آبادی کو "لسان العصر" کا لقب بھی اسی رسالے مخزن کی طرف سے دیا گیا تھا۔ رقعاتِ اکبر کے مرتب مرزا نصیر ہمایوں نے کتاب کے صفحہ ۱۲۶ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے:-

"جب مولانا اکبر کی نظمیں "مخزن" میں چھپتی تھیں تو میر نیرنگ صاحب نے ان کے لیے "لسان العصر" کا موزوں لقب تجویز کیا تھا۔ مخزن ہی نے یہ لقب پہلے استعمال کیا۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۲۰ء کے ایک مکتوب میں اکبر نے سر شیخ عبدالقادر کو اسی خطاب کی طرف اشارہ کیا ہے، گویا اڈیٹر "مخزن" نے ان کو یہ خطاب دیا تھا۔"[۱]

رقعاتِ اکبر کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں کتاب ہذا کی اشاعت کا سال درج نہیں ہے۔ یہ کتاب خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے دستِ نگشن کے کیٹ لاگ نمبر ۷۹۱ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ رقعاتِ اکبر کا دیباچہ سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا نے لکھا ہے۔ اس میں دیباچہ نگار نے اکبر الہ آبادی کے حالاتِ زندگی بھی قدرے تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ اس دیباچہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ دیباچہ نگار نے اس میں اکبر کا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میر اکبر حسین بمقام بارہ، جہاں ان کے چچا صاحب تحصیلدار تھے۔ آخر ۱۸۴۵ء مطابق شوال مکرم ۱۲۶۱ھ پیدا ہوئے ... ایامِ غدر میں اکبر کی عمر ۱۲ سال سے کم تھی ..."[۱]

پیشِ نظر تحریر میں سر شیخ عبدالقادر نے طالب الہ آبادی صاحب "اکبر الہ آبادی" کی تحریر کردہ سالِ ولادت بحساب سنہ ہجری ۱۲۶۱ھ سے پورا پورا اتفاق کیا ہے لیکن سنہ عیسوی کے اندراج میں "۱۸۴۵ء" اکبر کے تمام سوانح نگاروں کے اندراج (۱۸۴۶) سے مختلف ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ سر شیخ عبدالقادر نے "آخر ۱۸۴۵ء" درج کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی لفظ آخر کو بنیادی بنا کر لکھنے والوں نے بجائے ۱۸۴۵ء کے ۱۸۴۶ء درج کر دیا ہو۔

کسی وجہ سے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ دیباچہ میں سر شیخ عبدالقادر نے اکبر کا سالِ ولادت بجائے ۱۸۴۶ء کے ۱۸۴۵ء سہواً لکھ دیا ہے تو شیخ موصوف کی دوسری تحریر ۱۸۴۵ء کی صداقت میں پیش کی جاتی ہے۔"

۱۹۲۹ء میں سر شیخ عبدالقادر نے اکبر کی شاعری پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ اس وقت کے ایک موقر ادبی جریدہ "ادبی دنیا لاہور، رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۸۴۲، جلد ایک[۱] شمارہ نمبر دو (۲) بابت ماہ جون ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے اپنے اس گراں قدر مقالے میں بحسب سابق اکبر کا سالِ ولادت بحساب سنہ عیسوی ۱۸۴۵ء تحریر کیا ہے[۱]۔

جناب عبدالرحمٰن طارق نے ایک کتاب "لسان العصر" کے نام سے ترتیب دی ہے۔ یہ کتاب "اشاعت منزل بگ روڈ، لاہور" سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر کہیں بھی سنہ اشاعت درج [illegible] یہ کتاب بھاگل پور یونیورسٹی لائبریری کے کیٹلاگ رکھان [illegible]

۱۹۳۴ ـ ۱۹۸ نمبر ۱۴۸۶۶ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔) کتاب ہٰذا کا دیباچہ سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا نے تحریر کیا ہے۔ دیباچے میں صفحہ نمبر ۱۰ پر اکبر کا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء درج ہے[7]

ان تمام حقائق، شواہد، دلائل اور اسناد کی روشنی میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔[8] ۔ ۔ ۔ اکبر الہ آبادی کے سوانح نگاروں کا درج شدہ سال ولادت ۱۸۴۶ء نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ دراصل اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۵ء بمطابق ۱۲۶۱ھ ہی صحیح ہے جسے سر شیخ عبدالقادر نے تحریر کیا ہے اور یہی سال اکبر کی قبر کے کتبے پر بھی درج ہے۔

برصغیر ہند و پاک میں اکبر پر کئی حیثیت سے تحقیقی کام ہوتے رہے ہیں۔ لیکن کہیں بھی اس حقیقت کی نقاب کشائی نہیں کی گئی ہے۔ پیش نظر مقالہ کے ذریعہ بہ تاخیر ہی، ایک عظیم مفکر و شاعر کے ساتھ کی گئی اس زبردست تحقیقی ناانصافی کی کے ازالہ کی سعی کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ محنت دلچسپی پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی۔

حواشی

[1] علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۰

[2] "اکبر الہ آبادی" تصنیف طالب الہ آبادی، مطبوعہ انوار احمدی پریس الہ آباد ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۲، ۱۸۔

[3] گل رعنا، مصنفہ حکیم عبدالحئی، مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۴۰ء صفحہ ۴۸۹۔

[4] اکبر الہ آبادی مصنفہ طالب الہ آبادی، مطبوعہ الہ آباد (۱۹۴۶ء) صفحہ ۴۷۔

[5] حیات اکبر، مرتبہ ملا واحدی، مطبوعہ "بزم اکبر" کراچی ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۳۲۔

[6] رقعات اکبر، مرتبہ مرزا نصیر ہمایوں، مطبوعہ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور صفحہ ۱۲۶۔

[7] دیباچہ رقعات اکبر، از شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا۔

[8] ادبی دنیا، لاہور، جلد ۱، شمارہ ۴، جون ۱۹۲۹ء

[9] دیباچہ لسان العصر، مرتبہ عبدالرحمن طارق، مطبوعہ اشاعت منزل، بل روڈ، لاہور، دیباچہ از قلم سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا صفحہ ۱۰۔

غزلیں

شاعر اعظمی
بارہ بنکی ۲۲۵۰۰۱

جو مرے شہر میں کچھ روشنی لائے ہوں گے
ان چراغوں نے کئی گھر بھی جلائے ہوں گے

پرسشِ غم کو مرے پاس جو آئے ہوں گے
آستینوں میں وہ خنجر بھی چھپائے ہوں گے

سو گئے جو تری دیوار کا سایہ پا کر
دھوپ میں چل کے بہت دور سے آئے ہوں گے

ہاتھ اس کے بھی ہوئے ہوں گے یقیناً زخمی
جس نے کانٹے مری راہوں میں بچھائے ہوں گے

چھاؤں گھر کی ہی غنیمت ہے کہاں جاؤ گے
راہ میں اور بھی تپتے ہوئے سائے ہوں گے

جب ترے گھر میں سجیں گے نئے رشتوں کے چراغ
ہم بھی پلکوں کی منڈیروں کو سجائے ہوں گے

شیش محلوں پہ جو پتھراؤ کیا کرتا ہے
اس نے بچپن میں گھروندے بھی بنائے ہوں گے

اس نے نفرت کا جو اظہار کیا ہے مجھ سے
اس کے جذبات نہ ہوں گے وہ پرائے ہوں گے

رات بھر اتنی ہوا تیز چلی ہے ساغر
ہر اک آہٹ پہ وہ دروازے تک آئے ہوں گے

کمال جائسی
کرنیل گنج برہان پور

جب برہمئ حسن شرر ریز ہوئی ہے
کچھ اور زمیں شوق کی زرخیز ہوئی ہے

اُس شاہدِ رعنا کی ہر اک جنبشِ ابرو
آئینے کے چہرے پہ سحر بیز ہوئی ہے

ان زلفوں کے ساون میں بڑھی تشنہ لبی اور
پیمانوں کی گردش جو کبھی تیز ہوئی ہے

تعبیر ہی تعبیر تھی خوابوں کے نگر میں
جب رات تری زلف کی گل ریز ہوئی ہے

اس شہرِ ستمگر میں مری زندہ دلی بھی
ہر گام پہ ہمرتبۂ پرویز ہوئی ہے

بہکا ہوں کمال اور مئے یاد سے ان کی
جب دل کی گلابی کبھی لبریز ہوئی ہے

ڈاکٹر اقبال ماہر*
۲۴۵ ، نخاس کہنہ ، الہ آباد

اقبال : آفاقیت کا علمبردار

اقبال کا فکری پیکر ایک ایسا مستحکم بت ہے جسے کوئی بھی بت شکن آج تک نہیں توڑ سکا ، ان کی ہمہ گیر علمی شخصیت نے تمام کائنات کا احاطہ کر لیا ہے ، ان کے حلقۂ خیال میں زماں و مکاں کی وسعت ہے ۔ وہ ایک قومی شاعر بن کر ابھرے لیکن رفتہ رفتہ ان کا علمی سرمایہ بین الاقوامی ادب کا حصہ بنتا گیا ۔ مختلف ممالک کے متعدد دانشوروں اور نقادوں نے قیمتی تحقیقی سرمایہ جمع کر دیا ہے ، ان کے علمی ادبی اور فنی کارناموں کا مکمل احاطہ کرنا آسان تو نہیں ہے ، اگر محقق نے اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق انھیں سمجھا ہے اور دنیا کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ اقبال ، فلسفی ، معلم ، ادیب ، مفکر ، شاعر اور مدبر بھی تھے لیکن جس چیز نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا ہے وہ ان کی آفاقی شاعری ہے ۔

جرمنی کے دوران قیام میں انھوں نے " فلسفۂ عجم " پر جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

" ایک برہمن اس بات کو پوری طرح محسوس کرتا ہے کہ اس کے نظریے ایک ملکی نظام کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے ۔ "

اقبال کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھے ۔ اپنے اس خاندانی [illegible] میں وہ اکثر برہمن زادگی کا فخریہ اعلان کرتے تھے ۔ وہ ہندوستانی تھے اور سچے محب وطن تھے ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہ نظم تو ہندوستان کا قومی ترانہ بن گئی ۔ دوسری دو نظمیں " ہمالہ " ہندوستان کی عظمت کی علامت اور " نیا شوالہ " قومی یک جہتی کا پیغام ہے ۔

اقبال کا دور ہندوستان کی غلامی کا دور تھا ۔ ان کی حریت پسند طبیعت کے لیے یہ صورت حال ایک چیلنج تھی جس کا انھوں نے ایک فرض شناس محب وطن کی طرح مقابلہ کیا ۔ ان کے سامنے ہندوستانی تہذیب ، معاشرہ اور عوام کی زبوں حالی تھی ۔ دل میں قوم کا درد تھا ۔ وہ اپنے کلام کے سوز و گداز اور تب و تاب سے ملک و قوم کے مردہ جذبات میں زندگی کی حرارت اور حرکت پیدا کرتے ہیں ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

وہ فرقہ پرستی کی لعنت کو قوم کی پسماندگی اور سیاسی و سماجی انتشار کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے قومی یک جہتی کا درس دیتے ہیں ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا	ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
شایاں ہے [illegible]	سب اہل وطن کے دل ایسے [illegible]
سرزمیں [illegible] قیامت کی [illegible]	وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
[illegible] کے لیے [illegible] غضب	ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہو غضب
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا	یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

اقبال ہندستانیوں کو غلامی کی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور آزادی کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

حاصل اس کا شکوہ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اسی آزادی کے لیے باہمی مفاہمت اور قومی اتحاد کی ضرورت ہے۔ یہ آزادی اپنے ہم وطنوں سے رواداری برتنے اور محبت کرنے سے ملتی ہے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو ہونا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

انگریزوں کے قول و فعل میں بڑا تضاد تھا۔ ایک طرف تو وہ انگریزی کتابوں کے ذریعے ہندستانیوں کو اخلاق، تہذیب اور صبر و رضا کی تعلیم دے رہے تھے لیکن دوسری طرف خود ان کا طرز عمل آمرانہ اور ظالمانہ تھا۔ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے انھوں نے ہندستانیوں پر ہر ظلم و تشدد روا رکھا تھا۔

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

سچی بات تو یہ ہے کہ مساوات نام کی کوئی چیز ہمارے ملک میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انگریزوں نے جاگیردارانہ نظام کی بنیاد مضبوط کر کے عوام کو غلام در غلام بنا دیا تھا۔ انسانوں کو امیر و غریب ادنیٰ اور اعلیٰ قبیلوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

قومی وحدت مفقود تھی۔ صدہا برس میں متعدد قوموں کے باہمی میل جول سے جو یک جہتی اور مشترکہ تہذیب بیدار ہوئی تھی، بدیسی سامراج نے اس کا شیرازہ درہم برہم کر دیا تھا اور یہ سب ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت ہو رہا تھا۔

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

فرنگی تہذیب کی جگمگاہٹ نے ہندستانیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ یوں بھی حاکم کی ہر بات اچھی اور ہر ادا محبوب ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کے تو ہندستانی عوام گرویدہ ہو گئے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یورپ کے صنعتی انقلاب نے جہاں دنیا کو جدید مشینوں، آلات اور صنعت و حرفت سے روشناس کیا وہیں سرمایہ داری کی بدترین لعنت سے انسانیت کو کچل دیا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یورپی ترقی پذیر ممالک نے اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے پس ماندہ ممالک کو اپنی تجارتی منڈی بنایا۔ اپنی مستقل اجارہ داری قائم کرنے کے لیے کمزور پس ماندہ ممالک پر قبضہ کیا اور حکمرانی کرنے لگے۔ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک غلام بن کر ذلت کی زندگی گزارنے لگے۔ شہنشاہیت کا دور دورہ ہوا۔ نو آبادیاتی نظام کی بنیاد پڑی۔ ہندستان بھی فرنگی سرمایہ داروں کا غلام ہو گیا۔ ملک کے قدرتی وسائل، دولت اور محنت کا استحصال شروع ہو گیا۔

سرمایہ داری نظام کے تحت ملک کا سماجی نظام بگڑ گیا۔ اوپر سرمایہ دار اور نیچے مزدور۔ درمیانی یا متوسط طبقہ تو معدوم ہو چلا۔ تمام دولت سمٹ سمٹ کر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں پہنچ گئی۔ عوام کی اکثریت مفلوک الحال مزدوروں میں تبدیل ہو گئی۔ جب اقتصادی زبوں حالی انتہا کو پہنچ گئی تو مزدوروں

میں بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ ان حالات میں خضر کی زبانی ان کا پیغام ملاحظہ ہو۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دو
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

(سرمایہ و محنت)

ان کے درج ذیل اشعار عالمگیر صداقت کے حامل اور ان کی تڑپ کے مظہر ہیں۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

(فرمانِ خدا — فرشتوں سے)

اقبال نے وقت سے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان جاگ اٹھا ہے۔ وہ زیادہ عرصہ تک محکوم نہیں رہ سکتا۔ اسے آزاد ہونا ہی ہے۔ ان کی سیاسی بصیرت پیشین گوئی کرتی ہے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
خبر ملی ہے خداوندانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

ہندوستانی تہذیب کسی ایک مذہب یا فرقہ کی جاگیر نہیں ہے۔ اس تہذیب کی نشو و نما اور ارتقاء مختلف قوموں کے اتحاد مذہبی رواداری، قومی یک جہتی اور ذہنی ہم آہنگی کا مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے احساسات و خیالات کے آئینہ دار درج ذیل اشعار ہیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

(قومی گیت)

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

(نیا شوالہ)

اقبال کی شاعری میں وطن پرستی، انسان دوستی اور احترامِ محبت کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ وہ گفتار ہی کے نہیں، کردار کے بھی غازی تھے وہ سمجھتے تھے کہ صرف آزادی کا وظیفہ پڑھنے سے یا صرف قومی گیت گانے سے کام نہیں چلتا بلکہ نصب العین کے حصول کے لیے جد و جہد، عزم و استقلال اور جوشِ عمل کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل کا لفظ بہت وسیع المعنی ہے۔ تمام بامقصد علوم و فنون، سماجی نظام، اخلاقیات، فلسفہ، ادب، شاعری اور زندگی کے دیگر لوازمات و معمولات سب کے سب عمل کے وسیع دائرے میں شامل ہیں۔

اقبال کا کلام قنوطیت زدہ نہیں ہے بلکہ رجائیت اور فعالیت کا مظہر ہے جو انسان کو جد و جہد اور ارتقاء کا درس دیتا ہے۔ اس کا مقصد انسان کی فطری صلاحیتوں کو فروغ دینا اور بروئے کار لانا ہے ان کی شاعری میں انسان

کی عظمت کا پہلو نمایاں ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اُس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

انسان کو جب اپنی ہستی اور مرتبہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے تو وہ تسخیرِ کائنات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ قدم اٹھتے ہیں اور نئے نئے راستے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ وہ ارتقا کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اس کی فکر و عمل سے کائنات کے رازہائے سربستہ بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اقبال کے کلام میں آفاقیت ہے۔ ان کے افکار تمام بنی نوعِ انسان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

شاہین، عقاب، خونِ جگر اور خودی جیسے علائم ان کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے گل و بلبل، قفس، آشیاں، زنداں، سلاسل، اور شمع و پروانہ جیسی اصطلاحات کو قدیم روایتی طلسم سے نکال کر جدید انداز فکر و نظر اور حالات سے آشنا کیا۔ اقبال نے ان علائم کو اتنی وسعت دی کہ زندگی کے تمام مسائل ان کے حلقہ میں سما گئے۔ یہ علائم مبہم نہیں بلکہ واضح ہیں: اور یہی صحیح علامت نگاری ہے۔

اقبال نے عشق کو بھی ایک نئے زاویئے سے دیکھا۔ ان کے نزدیک عشق بقا کا ضامن ہے اور اس کا مرتبہ بہت بلند ہے جو انسان کی عظمت میں اضافہ کرتا ہے۔

عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ہر صاحبِ کردار رہنما جو دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے پہلے اپنے گھر کا نظام درست کرتا ہے، اقبال بھی اپنے اہلِ وطن کو ان کی بے حسی اور زبوں حالی سے آگاہ کرتے ہیں اور امتیازِ رنگ و خوں کے خلاف خبردار کرتے ہیں۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

اقبال نے علی گڑھ کے جلسے کے خطبۂ صدارت میں اپنے مقصد کو بخوبی واضح کیا ہے "مذہب کا مقصد یہ نہیں کہ انسان بیٹھا ہوا صرف زندگی کی حقیقت پر غور کرے بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے یہ مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کرے۔"
چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال صرف اسلامی شاعر تھے محض غلط فہمی ہے۔ وہ اول تا آخر محبِ وطن تھے۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی کا عنصر بہت نمایاں ہے،

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

[illegible]

[illegible]

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب

(شعاعِ امید)

ہر شخص کو اپنے مادرِ وطن سے محبت ہوتی ہے۔ یہ غیر فطری نہیں۔ اقبال ہندوستانی تھے۔ انھیں ہندوستان سے آخر دم تک محبت تھی۔ وہ جہاں ایک طرف صدیقِ اکبر، بلال، شہیدِ اعظم حسین، معری اور عرفی کے قصیدہ خواں ہیں وہیں دوسری طرف وہ رام، مہاتما بدھ، نانک، سوامی رام تیرتھ اور بھرتری ہری کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ایک وسیع النظر اور روشن خیال انسان کی طرح انھوں نے ٹالسٹائی، لینن، شیکسپیئر، نطشے اور کارل مارکس پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ کسی ملک کا فنکار ہو اگر اس کے افکار میں زندگی کی آفاقی قدریں نظر آتی ہیں تو اقبال نے رواداری اور انصاف کے ساتھ اس کی قدر کی ہے۔

خدا نے آدم کی تخلیق ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے کی ہے۔ جسے اشرف المخلوقات کے خطاب سے نوازا گیا ہے اس کے جنت سے نکلنے کو اقبال سزا نہیں بلکہ جزا سمجھتے تھے۔ دیکھیے کس احترام کے ساتھ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

روحِ ارضی آدم کا کس طرح استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
دیکھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خودی، اقبال کی وضع کردہ ایک بلیغ اصطلاح ہے۔ کائنات کی اصل روح ہے۔ وہ اپنے اندر اعلا اور بلند صلاحیتیں رکھتی ہے۔ خودی کے ارتقار کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک استحکام خودی اور دوسرے اس کا اجتماعی مقاصد سے ہم آہنگ ہونا۔ اقبال انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ خودی کی تربیت اور فرد کی ترقی کے ساتھ ایسا معاشرہ بھی چاہتے ہیں جو صالح ہو۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی
خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں — تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
خودی میں ڈوبنے والوں کی عزم و ہمت نے — اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا
یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

خودی کے اس فلسفہ کو اقبال نے ادرجامعیت کے ساتھ اپنی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں پیش کیا۔ ماہرِ علوم شرقی ڈاکٹر رینالڈ اے نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے تمام یورپ کو اس سے روشناس کرایا۔ ہندستان سے کہیں زیادہ یہ یورپ کا توجہ کا مرکز بنی، پروفیسر نکلسن ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:
"اقبال صرف اپنے عصر کی آواز نہیں بلکہ اپنے دور سے آگے بھی ہیں اور ساتھ ہی زمانے سے برسرِ جنگ بھی"

اس کے بعد آرتھر آر۔ بیری نے لالۂ طور، زبورِ عجم، اور شکوہ و جواب شکوہ کے ترجمے انگریزی زبان میں پیش کیے۔ میوودیچ اور لوسی کلاڈ نے فرانسیسی زبان میں، ملسی مکارین نے ولندیزی میں، انی کیار نے روسی زبان میں، یان مارک نے چیک زبان میں، اور پروفیسر انا ماری شمل نے جرمن میں اقبال پر کافی کام کیا ہے۔
اطالوی عالم پروفیسر گبوسکی لی ترجی لکھتے ہیں:
"اقبال محض علم و حکمت سے سرشار نوابغ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا شمار ان عدیم النظیر حساس انسانوں میں ہے جو ایک نئے دور کے دہلیز پر کھڑے انسانوں کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ماضی کا دامن مستقبل سے وابستہ کرتے ہیں:
مہاتما گاندھی فرماتے ہیں (اردو خط سے اقتباس):۔
"ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور یاروودہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔"
جواہرلال نہرو نے اپنی کتاب "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے:
"اپنے آخری دنوں میں اقبال کا جھکاؤ زیادہ تر سوشلزم کی طرف ہونے لگا تھا۔ کچھ مہینے پہلے جب وہ بیماری کے بستر سے اٹھ بھی نہ سکتے تھے، انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور میں ان کے بلاوے پر حاضر ہوگیا۔ میں ان سے کئی موضوعات پر باتیں کرتا رہا۔ اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ان سے نباہ کرنا کتنا آسان تھا۔ وہ یادوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے میں نے ان کی شاعری کی تعریف کی۔"
شریمتی سروجنی نائیڈو نے ان الفاظ میں کیا ہے:
"ہم اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندستانی

نشاۃ الثانیہ کا عظیم شاعر سمجھتی ہوں۔ اس شاعر کے اردو فارسی شعری کارنامے ہندستانی قوم کے زبردست رہبر ثابت ہوں گے ——"

شریمتی اندرا گاندھی اس طرح خراج عقیدت پیش کرتی ہیں:

"—— اقبال ہندستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے ان بڑے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے پوری نسل پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے اور اپنے زمانے کے دکھ درد، امنگوں اور ولولوں کو اپنایا ہے —— ہم اقبال کی اس لیے بھی تعریف کرتے ہیں کہ وہ انسان کی آزادی اور ترقی کے شاعر تھے۔ مسلسل محنت، لگاتار تلاش اور کوشش ان کا نعرہ تھا ——"

علامہ اقبال کو ہر ملک اور قوم نے اپنی اپنی طرح سمجھا، پہچانا اور سراہا ہے۔ ان کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال کے ذہنی ارتقاء، داخلی کیفیات اور خارجی حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے کچھ لوگوں نے ان کے متعلق غلط نظریات بھی قائم کیے اور انصاف نہیں کر پائے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اقبال، اقبال تھے وہ ہر مکتبۂ خیال کو متاثر کرتے رہے۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی شہرت اور مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ ان کے کلام کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ جتنی بار ان کے کلام کا مطالعہ کیجیے اسرار و حقائق کے نت نئے گوشوں سے نقاب اٹھتا نظر آتا ہے۔ ان کے نظریات، تکریات اور خیالات کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کی آواز زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ ان کا درس حیات اور پیغام عمل کسی ایک جماعت، قوم اور ملک کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ تمام دنیا کے لیے ہے۔ وہ روشنی کے ایک بلند مینار ہیں۔ وہ تمام عالم انسانیت کے محسن ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی قدیم ترین تحریر —— (صفحہ کا بقیہ)

کہ جب وہ اپنی انگریزی سوانح تحریر کرنے بیٹھے تب بھی انھیں نصاب تعلیم پر اعتراض تھا۔ انھوں نے قابل اعتراض کتابوں کے نام تو نہیں لیے مگر اصل اعتراض بعینہٖ موجود ہے۔

"IN FACT, ONE OR TWO OF THE BOOKS SO OFTEN TAUGHT AS GOOD LITERATURE IN THOSE DAYS, WERE, ON ACCOUNT OF THEIR UNUSUALLY EROTIC NATURE, BY NO MEANS FIT FOR THE INSTRUCTION OF YOUTH;"

گویا بچپن میں جس اعتراض نے ان کے دماغ کو نصاب تعلیم پر نقد کے لیے مجبور کیا تھا وہی اعتراض برسوں گزرنے کے بعد بھی انھیں فکرمند بنائے ہوئے تھا اور اسے بھولے نہیں تھے۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ ۴۰۔۴۲ برس قبل تک یہ مخرب اخلاق لٹریچر عام طور پر پڑھایا جاتا تھا۔

غزلیں

شاد فیض آبادی
احاطہ آمل خاں، فیض آباد

جس فن میں بھی سچائی ہوتی ہے چمکتا ہے
ہر جھوٹ کے دامن میں بھی شعلہ سا لپکتا ہے

خوشبو سے وفاؤں کی جب عشق مہکتا ہے
آنچل رُخِ جاناں سے تب جا کے سرکتا ہے

گلشن میں بہاروں کو انگڑائی تو لینے دو
ہم تم کو دکھا دیں گے موسم بھی سسکتا ہے

وہ عہد گیا یارو جب شاعری جھوٹی تھی
اس دَور کی غزلوں میں انسان جھلکتا ہے

تم لان کے خاروں کو الزام نہ دو اپنے
دو ہاتھ جسے کھینچیں دامن وہ مسکتا ہے

آوازوں کے دریا پر تعمیر ہو جس پُل کی
سنجیدہ تلاطم سے وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے

اے شاؔد مرے شعری احساس کے پنگھٹ پر
گاگر بھی چھلکتی ہے ساغر بھی کھنکتا ہے

شوکت صبا کیفی
دکن محلہ، پیرو، بھوجپور، بہار

وہ آنکھ یونہی خلا میں بھٹک رہی ہوگی
نہ جانے کب سے مری راہ تک رہی ہوگی

مرے خیال کی ٹہنی لچک رہی ہوگی
چمن میں دل کے وہ ہر پل چہک رہی ہوگی

امید و شوق کی ہر سانس تھک رہی ہوگی
خوشی کی غم میں بھلا کب جھلک رہی ہوگی

اداس شام حسیں بوتلوں کی شہزادی
مری نظر میں سمٹ کر تھرک رہی ہوگی

اگر بجے گا مرے دل کی دھڑکنوں کا رباب
کسی کے ہاتھ میں چوڑی کھنک رہی ہوگی

کسی کے یاد کی خوشبو جو رات لائے گی
تو جیسے رات کی رانی مہک رہی ہوگی

صؔبا نے چاند کو چھونے کی آرزو کی تھی
تمام عمر یہ دل میں کسک رہی ہوگی

سید حامد احمد رنگیلا
سبز مسجد والا گھر، کٹرہ شہاب خاں
اٹاوہ

رشید احمد صدیقی: ایک عظیم اور منفرد خاکہ نگار

خاکہ نگاری غزل کی طرح دریا کو کوزے میں بند کرنے کا مشکل فن ہے۔ یہ سوانح نگاری سے قطعی مختلف اور الگ چیز ہے۔ شخصیت کے جن پہلوؤں اور گوشوں، حرکات و سکنات، عمل ردِ عمل کو خاکہ نگار کی قوتِ مشاہدہ اپنی گرفت میں لیتی ہے وہ سوانح نگار کے لیے نہ ضروری ہے اور نہ اُس کے بس کی بات ہے لیکن شخصیت کی بھرپور نمائندگی اور کسی انسان کو اُس کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے کی کوشش خاکہ ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ خاکہ نگاری ہمارے ادب میں انگریزی ادب کے اثر سے آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کافی ترقی کر گئی۔ اُردو میں خاکہ نگاری کے فن کی علامت کا دوسرا نام ہے رشید احمد صدیقی۔ اور بقول آل احمد سرور "گنجہائے گرانمایہ" اردو کے قلمی مرقعوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ . . .
اُردو میں ایسے جیتے جاگتے مرقعے نہیں لکھے گئے۔" رشید صاحب کے لکھے ہوئے مرقعوں پر اسلوب احمد انصاری کی رائے بھی بہت صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے کہ

"یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایسے مرقعے اُردو میں اب تک نہیں لکھے گئے۔ جو اچھے مرقع نگار ... میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبد الحق اور شاہد احمد دہلوی کے نام بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں ان قلمی تصویروں میں ... ، نرمی اور دل آسائی اور انسان دوستی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہاں مصنف کا موقلم ادنگل کا ... [illegible]

یہ ایک ایسے ذہن کا عکسِ جمیل ہیں جسے زندگی کی اونچ نیچ پر نظر رکھنے کی وجہ سے ایک طرح کی خلاقانہ دانش اور بصیرت سے سرفراز کیا گیا ہو۔ اِن مرقعوں میں اُن اقدارِ حیات کا انعکاس بھی صاف جھلکتا ہے جو انھیں دل و جان سے عزیز تھیں اور اس طرح ان سے خود رشید احمد صدیقی کے دل کا معاملہ بھی کھلتا ہے۔" (ماہنامہ آجکل مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۸)۔

مرقع نگاری میں رشید صاحب کا کوئی حریف نہیں ہے۔ محمد علی جوہر، اقبال، اصغر اور ذاکر صاحب ہوں یا کندن جیراسی یا کوئی نومولود بچہ۔ وہ سب کو صفحۂ قرطاس پر مجسّم اور متحرک کر دینے کا فن جانتے ہیں۔ اُن کی صناعی اور فنکاری کے لیے "شیخ نیازی" سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس میں اپنے نومولود بچہ "نیازی رشید" کی تصویر اُتاری ہے۔

"کچھ دن ہوئے میری ملاقات شیخ نیازی سے ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ ان کی آنکھیں تھیں پہچان نہیں سکتے تھے۔ کان تھے لیکن سُنتے نہ تھے۔ زبان تھی لیکن بول نہ سکتے تھے۔ ناک تھی لیکن خوشبو، بدبو میں فرق نہ کر پاتے تھے۔ ہاتھ پاؤں تھے مگر چل پھر نہ سکتے تھے۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان سے ایسی دوستی ہوئی کہ ان کے بغیر جی لگتا نہیں۔ گو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا نہ یہ بات کبھی دھیان میں آئی کہ خود شیخ صاحب کا میرے بارے میں کیا خیال تھا۔"

لیکن ابھی آپ نے رشید صاحب کے فن کا جادو تو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اسی بچہ کے ذکر میں آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"ایک دن باہر سے آئے، چہرہ تمتمایا ہوا۔ غصہ کا یہ حال جیسے جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑنے والا ہے۔ نتھنوں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی معلوم ہوتی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا، شیخ صاحب مزاج کیسا ہے؟ بولے "میں اب نماز نہیں پڑھوں گا"۔ عذرا نے سُنا تو بدحواس ہو گئیں کہنے لگیں۔ ارے توبہ کرو توبہ۔ یہ کیا بات تم نے منہ سے نکالی۔ بپھر کر بولے۔ فلاں نے مجھے گالی دی۔ ایک طرف سے آواز آئی تم نے کیوں نہیں گالی دی۔ یہ سننا تھا کہ شیخ بڑے اور عذرا پر ایسے جھپٹے گویا ان کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ بولے کیسے گالی دوں۔ اُس نے (عذرا کی طرف اشارہ کر کے)

جو کہہ دیا ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ گالی نہیں دیتا ورنہ نماز اکارت جاتی ہے" (شیخ نیازی صفحہ ۱۵)

علامہ اقبال پر کتنا لکھا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا لیکن رشید احمد صدیقی کے لکھے ہوئے علامہ اقبال کے مرقع کا جواب نہیں۔ اس چھوٹے سے مرقع میں جس طرح اقبال کی شخصیت کی انتہائی منفرد حیثیت اور خصوصیت سامنے آتی ہے وہ دوسرے لکھنے والے اپنے مقالات اور کتابوں میں نہ پیش کر سکے۔ اس بات کے ثبوت میں صرف ایک اقتباس دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ پڑھیے اور رشید صاحب کی نظر، اُن کی بیان اور اقبال کی شخصیت کے اس اہم جوہر کی رونمائی پر اس حسب نظر خاکہ نگار کو داد دیجیے:۔

"مرحوم (اقبال) کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اِصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا، ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغان حجاز میں دختران ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

ز شام ما بروں آور سحر را به قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأت تو دگرگوں کرد تقدیر عمر را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا۔ قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں۔ مرحوم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، صبر علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

اہل نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی جملہ اُن کی فکر و فرزانگی شاعری و شخصیت اور اُن کا مجموعہ اُن کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں اور جدا ہو کر بینائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو در کنار، اُن کا تصور بھی دشوار ہو جاتا ہے" (گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱ راولپنڈی ایڈیشن ۱۹۶۶ء)

رشید صاحب بحیثیت ایک صاحب طرز ادیب اپنے منصب و مقام سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ فن

اور زندگی کے اخلاقی تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہ بات اُن کے مرقعوں میں بہت کھُل کر نمایاں ہے۔ خود فرماتے ہیں:۔

"میں اُس شاعر یا ادیب کو اصلی معنوں میں صاحب طرز نہیں مانتا جس کے لکھنے کے انداز کی صرف چند دنوں واہ واہ رہے۔ صاحب طرز اس کو کہتے ہیں جس نے لکھنے کا ایسا انداز دریافت کیا ہو جس میں لکھنے والے کے سلیقے اور زبان و ادب کے حُسن و خوبی کا اظہار ہو اور فن کا احترام ملتا ہو۔ صاحب طرز شاعری اور ادب کے شعبدے نہیں دکھاتا اُن کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ صاحب طرز ہونے کی سب سے معمولی شرط یہ ہے کہ اس کے طرز کی عمر اور نہیں تو صاحب طرز کی عمر سے زیادہ ہو۔ یہ بات ذرا دور کی ہے لیکن غیر متعلق نہیں۔ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ اصلی صاحب طرز وہ ہے جو فن اور زندگی ہی کے رشتوں کو نہ جانتا ہو بلکہ اس رشتے کے اخلاقی تقاضوں کو بھی مانتا ہو" (ماہنامہ ہندستانی ادب حیدرآباد دکن مئی ۱۹۵۵ء صفحہ ۹)

رشید احمد صدیقی کے اپنے تجربات، مشاہدات و تاثرات ان کی فکر انگیز باتیں اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے اُن کے فقرے، ان کے لکھے ہوئے ہر خاکہ میں پڑھنے والے کے لیے باعث کشش بھی ہیں اور بصیرت و بصارت کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ موت اور زندگی کے عمل اور ردّ عمل پر ان کے یہ احساسات دل کو کتنا چھو لیتے ہیں۔ نمونتاً پیش ہیں:۔

"زندگی کا یہی دستور چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا تک اس میں فرق نہ آئے گا۔ دُنیا کا کاروبار اور آپس کا نفع نقصان اتنا پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے اور پیٹ پالنے جان بچانے، عزت پانے، لذت اٹھانے، نام اُچھالنے اور روزمرہ کے معمولات ادا کرنے کا جذبہ اتنا قوی اور عالمگیر ہے اور ان کی ہمہ وقت اتنی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے یا وہ ہمہ وقت ہماری اتنی دیکھ بھال کرتے ہیں کہ ہم کسی حادثہ کو اپنے آپ پر زیادہ دیر تک مسلط نہیں رکھنا چاہتے اور رکھ بھی نہیں سکتے۔ دُنیا کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ وہ موت کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ثابت نہیں ہونے دیتی بلکہ زندگی کا سب سے بڑا انعام بتاتی ہے۔ ایسا انعام جو ہر محرومی کی تلافی کرتا رہتا ہے۔ ایسا انعام جو بے بود اور غیر متیقن ہونے کے باوجود بڑے سے بڑا عالم اور عامی کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے۔ زندگی کی ہماہمی اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کوئی شخص موت کے عمل دخل پر زیادہ دیر تک غور کر سکے" (ہم نفسان رفتہ صفحہ ۱۸)

سید سلیمان ندوی کے خاکہ میں اُن کی علمی دیانت داری کا ذکر کرتے ہوئے رشید صاحب نے علم و مذہب اور آزادی پر کیا خوب رائے دی ہے:۔

"سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا وہ اُن کا علمی تبحر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے کام میں نہیں لاتے تھے، علم نہایت خطرناک چیز ہے، کم ذی علم ایسے پائے گئے جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو۔ ایک مثال مذہب سے دی جاسکتی ہے بطور کُلیہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے ہوش کی زندگی میں اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، انھوں نے مذہب کو آڑ بنا لیا، پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نا اہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں"۔

(ہم نفسان رفتہ صفحہ ۲۴-۲۵)

رشید صاحب تاثرات کے بادشاہ ہیں۔ مرقع لکھتے وقت انھوں نے اپنے دوستوں، ملنے والوں کی یاد میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اُن کے دل کی دھڑکن ان کے قلب کی رقت ان کے فکر و خیال کی پاکیزگی و رفعت اور عہد رفتہ کی وضع داریا

تہذیب اور پاکیزہ معاشرت کے انمٹ نقوش ملتے ہیں۔ اصغر گونڈوی کے خاکہ میں ایک جگہ اس سینی کا ذکر کرتے ہوئے جو اصغر نے انھیں نذر کی تھی رشید صاحب فرماتے ہیں :-

"وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اُسے منجواتا ہوں۔ اُسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جلنے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانہ کے سیمیائی پردوں پر رنگ دآہنگ خدوخال رعنائی وزیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسیں نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں۔" (گنجہائے گرانمایہ راولپنڈی ایڈیشن صفحہ ۱۳۰)

بعض اصحاب کے نزدیک اچھا خاکہ تب ہی لکھا جا سکتا ہے جب خاکہ نگار کا اُس شخصیت سے گہرا میل جول اور قریبی تعلق ہو جس پر اُس نے قلم اُٹھایا ہے لیکن یہ مفروضہ رشید احمد صدیقی نے مولانا ابو الکلام آزاد کا خاکہ لکھ کر غلط ثابت کر دیا کیونکہ

بقول رشید صاحب:- "مولانا مرحوم سے خط و کتابت عمر میں دو بار ہوئی ملاقات صرف ایک بار، وہ بھی اُن کے آفس میں چند منٹ کے لئے۔" (ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۹۸)

ابو الکلام آزاد کے خاکے لکھنے والوں میں کئی بڑی شخصیتیں شامل ہیں۔ سب کا اپنا اپنا اسلوب ہے۔ اُن میں سے بعض نے ابو الکلام آزاد کو بہت قریب سے بارہا دیکھا اور سنا تھا لیکن رشید احمد صدیقی نے صرف ایک مختصر ملاقات ہی کی تھی پھر بھی رشید صاحب کی باریک بینی اور مردم شناسی نے ابو الکلام کی قدآور شخصیت کو جس طرح چند الفاظ میں سمیٹ لیا ہے اس کے لیے بہتوں کو کئی

کئی پیراگراف لکھنے پڑ گئے ہیں کیونکہ رشید صاحب کے پاس اُن کا بے خطا حربہ اُن کا اسلوب نگارش ہے۔ مولانا کی انانیت، خودداری اور کم آمیزی پر بہتوں نے صفحہ کے صفحہ سیاہ کر ڈالے لیکن رشید صاحب نے صرف تین جملوں میں سب سے بہتر اور موثر طریقہ سے یہ خوبیاں پیش کر دیں :-

"مولانا ابو الکلام عوام کے آدمی نہ تھے کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجہ پر اکتفا کرنا پڑتا تھا، شاید انھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دُنیا بنا رکھی تھی۔" (ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۱۲)

انسانی زندگی کے اُتار چڑھاؤ پر گہری نظر، معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو اپنی باریک بین نظروں کی گرفت میں لے کر کسی شخصیت کی اندرونی خوبی یا خامی تک رسائی حاصل کر لینا، الفاظ کا موزوں ترین استعمال، انشاپردازی اور اسلوب کے بے خطا تیز زندگی کی شگفتگی سے لبریز نثر اور بیکراں خلوص و ایقان۔ وہ قیمتی سرمایہ ہے جو رشید صاحب کے پاس ہے اور جس سے رشید صاحب نے کوئی بھی مرقع لکھتے وقت پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور نتیجہ میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ وہ شخصیات کے کمزور پہلوؤں کو بھی اپنے خاکوں میں پیش کرنے کا ایسا ڈھنگ جانتے ہیں کہ پڑھنے والا اُن کمزوریوں کے باعث ممدوح شخصیت سے متنفر نہیں ہوتا۔ محمد علی کے مرقع میں انھوں نے محمد علی جوہر کی شاہ خرچی اور اسراف کی عادت کس خوبصورتی سے پیش کی ہے :-

"محمد علی پر دولت اور شہرت کی بارش ہوئی محمد علی نے دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفاہمت کی۔" (گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۔۔)

احساسات کی شدت، جذبات کی فراوانی، [illegible] کی چمک دمک اور قلب کی رقت کے باوجود رشید احمد صدیقی اپنے ہر ممدوح سے وابستگی اور سے تعلق [illegible] عنوان نظام فکر و عمل رکھتے ہیں جو کامیاب [illegible]

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

خواجہ توصیفہ
معرفت ریڈیو بورڈ
نزد ہائیکورٹ، لکھنؤ

اندیشے

سہمی خوشیاں نظر چرائے ہوئے
چھپتی پھرتی ہیں کونے کونے میں
سسکیاں لے رہی ہیں امیدیں
خوف منڈلا رہا ہے پر کھولے
زندگی ڈھونڈتی ہے راہِ فرار
دل بھی سینے میں یوں دھڑکتا ہے
جیسے کانٹا کوئی کھٹکتا ہے
اب دعا بھی دوا نہ ہو جائے
جو بھی ہونا ہے وہ نہ ہو جائے
اب سکون و قرار کیا ہوگا
اے مرے غمگسار کیا ہوگا
ہمتیں پست ہو گئیں کب کی
تلخ یادیں بھی سو گئیں کب کی
اور کمبخت دل یہ کہتا ہے
ہم ترا انتظار کر لیتے
زندگی تجھ سے پیار کر لیتے

مسعود عابدی
۱۲۲، فیرس لین، کلکتہ ۳ ۷۰۰۰۰

غزل

کوئی دھندلا سا تصور کوئی سایہ تو نہیں
رُت نے سوئے ہوئے لمحوں کو جگایا تو نہیں

ایک مدت پہ درِ دل پہ یہ دستک کیسی
گم شدہ درد کوئی لوٹ کر آیا تو نہیں

جسم کی دھول اُڑاتی رہی وحشت اپنی
عشق نے دشت کا احسان اٹھایا تو نہیں

تو بھی کس ضد میں بھلا جھیل رہی ہے مجھ کو
زندگی! میں نے ترا ساتھ نبھایا تو نہیں

کوچۂ یار سہی آخری منزل لیکن
اس کی دیوار کا سر پہ مرے سایا تو نہیں

سازشیں ہوتی ہیں اور قتل سے بچ جاتا ہوں
میرے اپنوں میں کوئی شخص پرایا تو نہیں

مصلح سلیم
ایچ-۱۳۰ ہاؤسنگ بورڈ کالونی
شاستری نگر، ٹی ٹی نگر،
بھوپال

فانی — حیات اور فن

"فانی سراپا غم تھے۔ ان کی تمام زندگی پر الم ہے غم سے ان کو فطری لگاؤ تھا اور ان کی دکھ بھری اور تکلیف دہ زندگی نے ان کے غم کو اور پائیدار بنا دیا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ اپنے فانس تنقید نگاروں کے اس قسم کے ہزار ہا جملے سنتے سنتے طبیعت بیزار سی ہو گئی ہے۔ ویسے یہ اچھا خاصہ آسان نسخہ ہے کہ اگر کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں کسی جید عالم نے کوئی رائے قائم کر لی تو متاخرین اسی لکیر کو برسہا برس تک پیٹتے رہتے ہیں۔ کاش کوئی شخص ایک بار بھی یہ کہہ دیتا کہ ہر چند فانی کی زندگی میں بے شمار غم تھے تاہم ان کی المیہ شاعری مکمل طور پر ان کی زندگی سے متاثر نہیں ہے بلکہ ان کی قنوطیت دراصل ان کا نظریۂ حیات ہے اسی لیے انھوں نے کسی وقت بھی اپنی شاعری کو اس روش TRACK سے ہٹنے نہیں دیا۔ درحقیقت وہ شاعری میں اپنا ایک منفرد لہجہ متعارف کرا کے اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے کے آرزومند تھے ان کو خوب معلوم تھا کہ JACK OF ALL TRADES ہونے سے کسی ایک میدان کا ماہر ہونا کہیں بہتر ہے اسی لیے انھوں نے ارادی طور پر اپنی شاعری کو ایک مخصوص لب و لہجے کے ساتھ ایک خاص جذبۂ انسانی کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فانی ایک رئیس خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں ان کے جد امجد نواب بشارت علی خاں بدایوں کے گورنر اور ایک بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس جائیداد کا کثیر حصہ ان کے خاندان کے قبضے سے نکل گیا پھر بھی فانی کے والد اپنی محنت اور قابلیت سے سب انسپکٹر آف پولیس ہو گئے اور خاندانی وقار کو برقرار رکھا۔ فانی کو بھی کافی ترکہ پہنچا تھا لیکن یہ میراث بے راہ روی، ناتجربہ کاری اور بے اعتنائی کی نذر ہو گئی۔ ان کی شاہ خرچی کے سلسلے میں مولانا ماہر القادری نے ایک جگہ ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"اکثر ایسا ہوا ہے کہ وہ موٹر لے کر میرے مکان پر آگئے اور سیر کے لیے میلوں شہر سے باہر چلے گئے۔ میں نے دو ایک دفعہ دبی زبان سے کہا بھی تو برا مانا۔ خرچ کے ذریعے وہ سوچ سوچ کر نکالتے تھے۔"

ان تمام حالات کے پیش نظر یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ فانی کی زندگی ہمہ وقت غم سے دوچار نہیں رہی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

گردش وہی یہاں بھی سپہر کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

فانی اپنے دورِ تعلیم میں بھی، جب وہ اپنے والد کے دست نگر تھے، شعر کہتے تھے حالانکہ یہ امر ان کے والد سے مخفی تھا اور اس کا راز تب کھلا جب فانی نے اپنی ایک غزل داغ دہلوی کے پاس بغرضِ اصلاح روانہ کی۔ یہ وہ دور ہے جب فانی نے اپنی اصل زندگی شروع نہیں کی تھی۔ وہ حلاوتِ کسب سے ناآشنا اور ہوسِ جاہ سے مستغنی تھے اور اس زمانے میں ان کو کافی سکون اور عیش میسر تھا۔ حیرت ہے کہ اس دور کے اشعار میں بھی فانی کا زندگی کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔

وطن کے باہر قیام لکھنؤ کے دوران بھی وہ وکالت پیشہ ہونے
کے باوجود رات گئے تک دوستوں کے ساتھ محفلیں گرم کرتے
تھے اور وہاں اصل المیہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ان
شب بیداریوں نے ان کے پیشۂ وکالت پر بے حد خراب اثر ڈالا۔
ظاہر ہے کہ کوئی خوش باش اور بے فکر شخص ہی ایسی بزم ہائے یاراں
آراستہ کر سکتا ہے۔

یہاں سے فانی حیدرآباد پہنچے اور وہاں بھی کافی عرصے تک
ان کے اچھے دن رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فانی کے حیدرآباد میں قدم
رکھتے ہی مصائب ان پر ٹوٹ پڑے بلکہ وہ کافی عرصے تک بلدہ
اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے اور نواب آصف جاہ کے مصاحبِ
خاص بھی۔ یہ بات ضرور ہے کہ اواخر عمر میں اہلیہ اور دختر کے
اچانک انتقال اور ملازمت سے سبکدوشی نے انھیں غم کے بیکراں
سمندر میں ڈھکیل دیا تھا۔

فانی کی زندگی متوسط طبقے کے ایک عام فرد کی کہانی ہے۔ اس برِّصغیر
کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں ایک درمیانی طبقہ (MIDDLE
CLASS) بھی پایا جاتا ہے۔ اس طبقے کا ایک قدم روسا کے محلوں
میں اور دوسرا فقرا کے جھونپڑوں میں ہوتا ہے۔ نتیجہ معلوم۔ اس
طبقے کے بیشتر افراد میں سے کسی ایک کی کہانی لے لیجیے: فانی کی
داستان سے کافی مماثل ہوگی۔ اس کے باوصف بھی وہ اپنے REF-
LEX ACTIONS (غیر ارادی حرکات) کا تابع ہوتا ہے۔ وہ
ایک نارمل شخص کی طرح ہنستا بھی ہے۔ گاتا بھی ہے اور خوشی
کے مواقع پر خوشی بھی مناتا ہے جبکہ ہر چہار سمت سے اس پر غموں کی
یلغار ہوتی ہے۔ خود فانی بھی ایک نارمل شخص کی طرح خوش مزاج
اور باغ و بہار قسم کے آدمی تھے اور اسی لیے دوستوں کی محفلوں
کی جان تھے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فنکار کی پیش کردہ
تخلیق لازمی طور پر اس کے نجی تجربات کی عکاس نہیں ہوتی۔ اکثر
کہا گیا ہے کہ فنکار ویسے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے واقعات
سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور عام طور پر اس کے نظریات کے خالق
اور جذبات کے محرک ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں جب ذہن ایک خاص
قسم کے واقعات سے متواتر دوچار ہوتا رہے تو نظریہ کی بنا پڑ جاتی
ہے اور پھر آئندہ وقوع پذیر ہونے والے حادثات اور واقعات
اس نظریہ کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً وہ ہر چیز کو اپنے
ذہن میں نشو و نما پانے والے اسی نظریہ کی روشنی میں دیکھتا اور پرکھتا
ہے۔ کشمیر جنت نظر کے بارے میں تمام دنیا کی رائے یہ ہے کہ یہاں
آ کر غمزدہ انسان فطرت کے حسن میں کھو کر اپنے تمام تر رنج و الم کو
کچھ روز کے لیے فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن فانی کا غم کشمیر جا کر
بھی دور نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں:

کشمیر میں ہر حسین صورت فانی   مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

اگر اس شعر کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خالص
نظریاتی شعر ہے جس کا تعلق فانی کی اصل زندگی سے ہرگز نہیں ہے
بلکہ یہ ان کے قنوطی نظریۂ حیات کا ترجمان ہے۔ اگر فانی کے ایسے اشعار کو
مجتمع کیا جائے جو کسی طرح ان کی زندگی کی عکاسی نہیں کرتے
تو کافی صفحات درکار ہوں گے اس لیے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

سر اب مجھے بھاری ہے صدقے ترے خنجر کے
یہ بار اتر جاتا جو وار ترے چل جاتے

لازم ہے احتیاط ندامت نہیں ضرور
لے اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

مٹ کر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے
دھویا ہوا ہے دامنِ قاتل جگہ جگہ

مندرجہ بالا اشعار مشتے از خروارے کے مصداق
ہیں۔ ان اشعار پر غور کیجیے۔ کیا ان میں فانی کی زندگی کی کوئی
تصویر ہے؟

علاوہ ازیں فانی نے اپنے اشعار میں نزع و مرگ لاش "

وکفن، میت وجنازہ، ماتم وشیون، تربت وگورِ غریباں، قبر کے پھول اور چراغِ مزار کو بار بار نظم کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار پڑھ کر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فانی نے اپنی شاعری میں رعایتِ لفظی کو زیادہ برتا ہے۔ اجزائے شعر میں وہ اسے ایک اہم درجہ دیتے ہیں اور کہیں کہیں اتنا تجاوز کرتے ہیں کہ اندازِ بیان یکسر طور پر روایتی ہو کر رہ جاتا ہے۔

عندلیب شادانی نے اپنی کتاب "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" میں فانی کی جن فنی اغلاط کی نشاندہی کی ہے ان سے کچھ حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ فانی ایک شاعر تھے کوئی جید عالم نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان سے چند الفاظ نامناسب طور پر نظم ہو گئے ہیں۔ یہاں میں ان میں سے چند اشعار کو نظم کرنا برمحل سمجھتا ہوں جن کی طرف عندلیب شادانی نے اشارہ کیا ہے۔

ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا

چشمِ کافر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

(ماسوا کے معنی خدا کے علاوہ تمام موجودات ہیں۔ یہ ماسویٰ اللہ کا مخفف ہے اور مرادی طور پر دنیا کے معنی میں مستعمل ہے۔ چنانچہ ماسوائے دل کا مطلب ہوگا دل کے سوا سب کچھ۔ لہٰذا ماسوا اس شعر میں غلط طور پر استعمال ہو گیا ہے۔)

ہائے دنیا وہ تری سرمہ تقاضہ آنکھیں

کیا مری خاک کا ذرہ کوئی بیکار نہیں

(سرمہ تقاضہ، سرمہ طلب کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ طلب اسم ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی صرف ونحو کے اعتبار سے امر بھی ہے اور اس ترکیب میں امر کا محل ہے۔ تقاضہ چونکہ صرف مصدر اور اسم ہے اس لیے یہ ترکیب درست نہیں)

ہے جو اس کان ملاحت سے طلبگار نمک

زخمِ دل شاید تبسم آفریں ہونے کو ہے

(تبسم آفریں کے معنی ہنسانے والا ہے جبکہ ہنسنے والے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے)

عندلیب شادانی نے اور بھی اشعار کی نشاندہی کی ہے لیکن کسی بھی شاعر کے یہاں کچھ نہ کچھ اغلاط ضرور مل سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی نکتہ چینی پر کمربستہ ہو ہی جائے۔ خود عندلیب شادانی نے اس کتاب کے اسی باب میں ایک مقام پر ایک حکایت قلمبند کرتے وقت اُقتُلِی السِّراجَ کو تین مرتبہ اُقتُلُ السِّراجَ لکھا ہے جو عربی صرف ونحو کی رو سے غلط ہے چونکہ مخاطب مؤنث ہے لہٰذا صیغۂ امر مؤنث واحد یعنی اُقتُلِی السِّراجَ آنا چاہیے نہ کہ اُقتُلُ السِّراجَ جو صیغۂ امر مذکر واحد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فانی کے یہاں روایت پسندی کے آثار ملتے ہیں لیکن یہ وہ دور تھا کہ روایت پرستی تمام شعری فضا پر چھائی ہوئی تھی خود ان کے کئی ہم عصر شعراء مثلاً اصغر، جگر اور حسرت وغیرہ اسی روایت پرستی کے دلدادہ تھے۔ ایسے ماحول میں خود کو روایت سے دور رکھنا شاید فانی کے لیے ممکن نہ رہا ہوگا۔ اگر ہمیں اصل فانی کی تلاش ہے تو ان معائب سے قطع نظر کر کے آل احمد سرور کے اس قول کا معترف ہونا پڑے گا کہ "فانی کی شاعری کی قدر وقیمت، ان کے اشعار کی شعریت، ان کی معنویت، ان کی بلاغت، ان کی سادہ پرکاری، بڑے بڑے مسائل کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کرنے کی قوت، ان کی زندہ اور روشن تصویریں ان کی دھیمی پرسوز اور پاوقار لے میں ہے"۔

فانی کی غزلوں کی ایک بات یہ ہے کہ ان کے مقطع حاصلِ غزل ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کے بھرپور عکاس۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ فانی کے زیادہ تر مشہور اشعار ان کے مقطع ہیں شاید اسی لیے علامہ سیماب اکبرآبادی نے ان کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہوگی کہ "انتخابِ کلام کے ساتھ فانی کے تمام مقطعوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ قطعی طور پر اردو میں ایک نادر چیز ہوگی" کیا عجیب اتفاق ہے کہ فانی کا سب سے معرکۃ الآرا شعر ان کا یہ مطلع ہے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

غزلیں

جلیس حیدری
صدر شعبۂ بیالوجی، امیرالدولہ
اسلامیہ کالج
لال باغ، لکھنؤ

جو تیرے انتخاب میں دیکھا
دل وہی اضطراب میں دیکھا

یادِ جاناں نے کی پذیرائی
زیست کو جب عذاب میں دیکھا

اپنے دل کے بھی داغ یاد آئے
جب گہن آفتاب میں دیکھا

بس توجہ پلٹ گئی ان کی
اور کیا انقلاب میں دیکھا

عکس، آئینہ، آرزو، حسرت
ہم نے سب کچھ سراب میں دیکھا

لاکھوں عنواں ایک ہی غم کو
جلوہ گر ہر کتاب میں دیکھا

ہم حقیقت پسند بھی ہیں جلیس
ہم نے سب کچھ خواب میں دیکھا

نجمی لکھنوی
معرفت بھارتی بجلی اسٹور
نادان محل روڈ، لکھنؤ

ناکام زندگی ہے اگر جستجو نہ ہو
جینے کا لطف کیا جو کوئی آرزو نہ ہو

پاسِ ادب یہی ہے اشاروں میں بات ہو
نظریں ملیں نظر سے مگر گفتگو نہ ہو

اے دوست مجھکو اتنا تو غم سے نوازئے
غم ہو شریکِ حال اگر پاس تو نہ ہو

الجھی رہی حیات اسی اک خیال میں
گذرے گی کس طرح جو کوئی روبرو نہ ہو

دیوانگی میں وحشتِ دل کا مقام کیا
چرچہ مرے جنوں کا اگر چار سو نہ ہو

غم معتبر نہیں ہے تو بیکار ہے وہ غم
وہ اشک کیا ہے جسکی کوئی آبرو نہ ہو

نجمی مرے خیال میں دنیا اسے کہو
سب کچھ ہو جسکے پاس وفا کی ہی خو نہ ہو

علی احمد نقی
زمیں ہاؤس ...
لکھنؤ ۳

رات آخر ہے ذرا اور پلا دے ساقی
اب تو دل کھول کے زندگی چھلکا دے ساقی

ڈھال دے ڈھال دے سورج مرے پیمانے میں
آج نظروں سے حجابات اٹھا دے ساقی

میرے افکار نے محصور کیا ہے مجھ کو
تو اگر چاہے تو یہ رنج مٹا دے ساقی

میرا مشرب تو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنا آئینہ مرے دل کو بنا دے ساقی

میری رندی میں ہیں انداز جنوں کے پیدا
غیر ممکن ہے مجھے دل سے بھلا دے ساقی

تیرے میخانے سے پینے کی اُسے عادت ہے
دور ہی سے سہی دانش کو صدا دے ساقی

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی
محلہ گجری، امروہہ ۲۴۴۲۲۱

تعزیتی اسلوب

خطوطِ غالب اردو نثر کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اردو نثر کے ارتقا میں غالب کی نثر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میر امن اور ان کے رفقا نے جو اسلوب اختیار کیا وہ ایک شعوری کوشش تھی۔ ان کی تصانیف کا مقصد کمپنی کے نووارد انگریزوں کو اردو سکھانا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے یہ اساتذہ اگرچہ داستان نگاری اور تراجم کا کام خود کر رہے تھے لیکن ان کا قلم کالج کے اربابِ حل و عقد کے ہاتھ میں تھا۔ کالج کی پالیسی ان کے پیشِ نظر تھی ــــ یہ لوگ بھی فارسی عربی داں تھے۔ وقت کا مزاج پہچانتے تھے۔ اگر ان کے قلم کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ بھی اپنی لغت دانی اور کسی مرصع اسلوب کا کوئی اعلا نمونہ پیش کر دیتے۔ رجب علی بیگ سرور آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ ان کے قلم پر کسی حکومت کا دباؤ نہ تھا۔ نہیٹ کی خاطر انھوں نے فسانۂ عجائب لکھی۔ لکھنؤ جہاں انھوں نے آنکھ کھولی، پرورش پائی وہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ یہ ماحول سرور کے خمیر میں رچ بس گیا تھا۔ ایسے ماحول میں سرور سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے جس اسلوب کا مظاہرہ کیا وہ زمانے کا تقاضہ تھا۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ وہ اسلوب موجودہ دور میں پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ۔ یہ عربی فارسی کا ماحول صرف لکھنؤ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ پورے شمالی ہندستان میں اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ دہلی کے روسا اور شرفا کی زبان فارسی ہی تھی۔ خود غالب کو اپنی فارسی غزل گوئی پر ناز تھا۔ نثر میں جو کچھ انھوں نے علمی کام کیا وہ بھی فارسی میں کیا۔ حتیٰ کہ ایک عرصے تک انھوں نے جو خطوط لکھے وہ بھی فارسی میں ہی لکھے۔ ۱۸۵۰ء کے بعد اردو میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔

غالب ایک ذہین اور طباع انسان تھے۔ جدت پسندی ان کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔ انھوں نے اپنے ماحول سے بغاوت کی۔ اول تو اس زمانے میں اردو میں خط لکھنے کا رواج ہی بہت کم تھا اور جتنا تھا اس میں فارسی کے اثرات کا غلبہ تھا۔ بلند الفاظ۔ ترکیبیں۔ جملوں کی ساخت فارسی جیسی ہوتی تھی۔ غالب نے ان سب چیزوں کو یکسر ترک کیا اور خط لکھنے کا وہ اسلوب اختیار کیا جیسے بات چیت یا گفتگو کرتے ہیں ــ یہ ان کی شعوری کوشش تھی۔ اگر شعوری کوشش نہ ہوتی تو غالب یہ کبھی نہ لکھتے کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ اس جملے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اس عمل میں ارادے کو بہت دخل ہے۔

بہرکیف یہ روش ارادی اور شعوری ہی کیوں نہ ہو انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا اس میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ ان خطوط میں بظاہر سب سے نمایاں بات جو ہمیں متاثر کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان نہایت سادہ، آسان اور عام فہم استعمال کی ہے۔ روزمرہ محاورہ کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری میں انھوں نے جدتیں بھی پیدا کی

ہیں۔ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ بھی ترک کیا ہے۔ تاریخ اور اپنا نام بھی مروجہ روش سے ہٹ کر لکھا ہے۔ سنجیدگی کو بھی کہیں کہیں بالائے طاق رکھ کر شوخی و ظرافت سے کام لیا ہے۔ یہ سب باتیں یقیناً بڑی اہم ہیں۔ ہر پڑھنے والے کی نگاہ اولین نظر میں ان ہی چیزوں پر جاتی ہے۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ ان کا وہ اسلوب کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے ان خطوں میں اختیار کیا ہے۔ ان خطوط میں غالب نے کسی ایک اسلوب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسالیب کا یہ تنوع موضوع، مقصد اور مکتوب الیہ کی شخصیت کا تابع ہے۔ جہاں غالب علمی موشگافیاں کرتے ہیں وہاں طرز تحریر نہایت عالمانہ ہے۔ جہاں واقعہ نگاری، اشخاص اور اشیاء کا بیان ہے وہاں بیانیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے اُن خطوط کا رنگ بالکل جداگانہ ہے جو تعزیت کے لیے لکھے گئے ہیں چنانچہ ایک تعزیتی خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے امین الدین خاں کے نام ان کی اہلیہ کے انتقال پر لکھا ہے:۔

"آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت، سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو، تلقین صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ بس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے رہی دعائے مغفرت میں کیا اور میری دعا کیا۔ مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے خط بہت تاخیر سے لکھا اس لیے تاخیر کی توجیہ ضروری ہو گئی۔ کیتنی مخلصانہ توضیح ہے یہ کہ آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں کیا لکھوں۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا تھا کہ تعزیت کی جاتی چنانچہ مخاطب کو یہ بتلانے کے لیے کہ تعزیت رسم محض ہے عمل تعزیت کا تجزیہ کر دیا گیا۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں مطلوب ہیں۔ "اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت"۔ کیا خیال ہے کہ یہ ترتیب قابل داد نہیں؟ اس کے ساتھ ہی خود ہی ہر جزو کا ابطال بھی کر دیا۔ "اظہار غم تکلف محض ہے" اس لیے کہ "جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو"۔ "تلقین صبر بے دردی" اور دلیل اس دعویٰ کی یہ کہ "یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا"۔ اب رہ گیا تیسرا جزو یعنی "دعائے مغفرت" تو اس سے بڑھ کر اور کیا عذر ہو سکتا ہے کہ "میں کیا اور میری دعا کیا"۔ پھر بھی دعائے مغفرت تو لازمی ہے اس لیے یہ کہہ کر کی گئی کہ "چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں اس لیے دل سے دعا نکلتی ہے"۔ غرض ان مختصر لفظوں میں مرزا صاحب نے جس ایجاز، قطعیت اور استدلال کے ساتھ ایک خیال کی توضیح کی ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں ملتی۔

یوسف مرزا کو ان کے باپ کے انتقال پر تعزیت کا خط یوں اس طرح لکھتے ہیں:

"کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر! یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یونہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو، ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو"۔

اس خط کے اندر کس قدر جامعیت ہے کہ پہلے یہ لکھا گیا کہ کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اس جملے سے خلوص یگانگت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر اس جملے کو عمومی انداز میں خبر کے طور پر کہا جاتا کہ یہ معلوم ہوا کہ تیرا باپ مر گیا، تو

اس میں کوئی ندرت نہ ہوتی - اب اس کے بعد تلقینِ صبر کی ضرورت تھی - اس کے لیے یہ تو لکھ دیا کہ " اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ پھر اس کے بعد خود ہی یہ کہہ کر صبر کو ایک رسم قرار دیا کہ" یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو" آگے چل کر عام روش سے ہٹ کر اس رسمی تلقینِ صبر کی تردید کی کہ" ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ - بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا "یہی وہ خاص جملہ ہے کہ جو تعزیت اور اظہار ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ آگے چل کر تلقینِ صبر کا ایک نیا انداز اختیار کرتے ہیں کہ" صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی - دعا کو دخل نہیں - دوا کا لگاؤ نہیں" گویا اتنا کہہ کر یہ بات صاف کر دی کہ موت برحق ہے - نہ اس میں دعا اثر کرتی ہے اور نہ دوا - سوائے صبر کے چارہ نہیں - اگلے جملے میں شدتِ غم کا اظہار اس طرح کرتے ہیں " پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا - مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو" غم خواری، یوسف مرزا کی بیکسی اور ان سے ہمدردی کا کتنا نیا اور عجیب انداز ہے - یہ اسلوب کا تنوع نہیں تو اور کیا ہے -

تعزیتی خطوط کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے کہیں باپ کے مرنے پر بیٹے کو پرسہ دیا جاتا ہے اور کہیں بیٹے کے مرنے پر باپ کو - کہیں بھائی کے مرنے پر بھائی کو - کہیں اہلیہ کے مرنے پر خاوند کو - غرض مرنے والے کی اہمیت دیکھی جاتی رشتہ کا وزن دیکھا جاتا ہے - غالب نے بھی جو تعزیتی خطوط لکھے ہیں ان میں سب سے پہلے اسی کے پیش نظر یہی رہا کہ رشتہ کی نوعیت کیا ہے اس کے بعد انھوں نے ویسا ہی اسلوب اختیار کیا - وہ مرزا حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ کے انتقال پر خط لکھتے ہیں:

" سنو صاحب، شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تینوں آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں - شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے - فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہووے - لیلیٰ اوس کے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری، بھئی مغلچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اوس کو مار رکھتے ہیں - میں بھی مغلچہ ہوں - عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے، خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی، کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں - مغفرت کرے - چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا - اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں اوس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا - جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑ دو -

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمد بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس، ماسوی ہوس -

ظاہر ہے یہ خط محبوبہ کے مرنے پر لکھا گیا ہے اس کا انداز عام تعزیتی خطوط سے جداگانہ ہے اس میں غالب نے اپنی جدتِ طبع اور معنی آفرینی کی بہترین مثال پیش کی ہے - تعزیت اس میں بھی کی گئی ہے مگر غالب کی شوخی اس میں بھی نہ چھپ سکی - غالب محبوبہ کے مرنے کو سطحی حیثیت سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں عشقِ مجازی عارضی اور وقتی چیز ہے اصلی اور حقیقی عشق تو عشقِ محمد اور عشقِ آلِ محمدؐ ہے اور بس - غالب کس قدر حقیقت پسند واقع ہوئے تھے انھوں نے چند جملوں میں اپنے نظریۂ عشق کی وضاحت کر دی ہے -

مگر جب غالب کے اس خط کے بعد بھی مرزا صاحب کو تشفی نہ ہوئی اور ان کے اندر وہی تڑپ اور بیقراری پائی جاتی رہی تو غالب ایک دوسرا خط لکھتے ہیں اور اس میں اپنا خالص عشق مجازی کا تصور پیش کرتے ہیں یہ ان کا نظریۂ عشق بھی ہے اور نظریۂ حیات بھی جس میں وہ لذتیہ کا زاویہ نگاہ کام میں لاتے ہیں۔

"ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو۔ کھاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی۔ کہاں ...

.... کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی اقامت جاودانی ہے اور وہی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور! بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار"

غالب کے دوسرے تعزیتی خطوط کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم یہ خط دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں تعزیت کے لیے ایک لفظ بھی نہیں بلکہ مرزا کے لیے ناصحانہ وعظ و پند ہیں۔ جب مرزا صاحب کو محبوبہ کے مرنے سے کسی طرح چین نصیب نہیں ہوتا تو غالب کسی اور ڈھنگ سے بھی ان کو تسلی و تشفی دے سکتے تھے لیکن غالب اس نفسیاتی نکتہ سے واقف تھے۔ وہ ان کو عشق سے کنارہ کشی کی تلقین نہیں کرتے بلکہ مزید عشق کی ترغیب دیتے ہیں مگر یہ کہہ کر کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ دراصل طور پر یہ جملہ تلقین صبر کی بہترین مثال ہے جس میں غالب کی شوخی بھری ہوئی ہے۔

غرض غالب کے یہ تعزیتی خطوط اسلوب کے اعتبار سے بڑے متنوع ہیں جہاں موقع اور محل کے اعتبار سے ان کی شوخی بھی ہے تلقین صبر بھی اور اظہار تعزیت میں ندرت اور جدت بھی ہے کہیں کہیں موت و حیات کے نظریہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

★

رشید احمد صدیقی : ایک عظیم اور منفرد خاکہ نگار ۔۔ (صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

خاکہ لکھنے والے کے لیے ایک بنیادی شرط ہے۔ پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ زبان و بیان پر ان کی بے پناہ قدرت ان کے مافی الضمیر کو صاف صاف ظاہر کرنے میں پوری طرح معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

★

عقیدت ملیح آبادی
ملیح آباد، لکھنؤ

ژاں ژاک روسو

فرانسیسی فلسفی، مصلح اور ادیب روسو ۱۷۱۲ء میں جنیوا میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب فرانس اخلاقی پستی کی تمام منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ عوام برائیوں میں مبتلا تھے، عورتوں پر ذاتی اختیار اور دباؤ کا فقدان تھا، معاشرے میں بزدلی اور کم ہمتی پھیلی ہوئی تھی۔ طبقۂ اشراف کی برائیوں کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو طاقت کے زور سے دبا دیا جاتا تھا۔ ایسے عبرتناک اور افسوسناک حالات میں روسو کے باپ نے جو ایک گھڑی ساز تھا، روسو کی پرورش شروع کی، روسو ایسا بدنصیب انسان تھا کہ اس کے پیدا ہوتے ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور ابھی وہ چند برس ہی کا تھا کہ اس کا باپ بھی کسی سے جھگڑا کر کے جنیوا سے بھاگ گیا۔ روسو کو زندگی کا کوئی سکون میسر نہیں ہوا، نہ ہی اسے ماں کا پیار ملا، نہ ہی باپ کی سرپرستی، اس نے کسی کو اپنا شریک حیات بھی نہیں بنایا۔ اولاد کا لطف کیا ہوتا ہے اس سے بھی وہ ناآشنا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اس نے کسی کو دوست بھی نہیں بنایا اور ساری زندگی دشمنوں کے گھیرے میں رہتے ہوئے بھی پیار و محبت کا درس دیتا رہا۔

باپ کے چلے جانے کے بعد اس کے چچا نے اسے ایک کندہ کرنے والے کی دوکان پر کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا، وہ چند ہی روز میں وہاں سے اکتا گیا اور ایک دن گھومنے پھرنے کا لطف اندوز ہونے جنیوا سے باہر نکل گیا اور سارا دن فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد شام کو جنیوا واپس ہوا تو شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے اسے نیک شگون سمجھا اور اسے فطرت کا اشارہ سمجھ کر جنیوا سے واپس لوٹ کر ایک کیتھولک گاؤں میں داخل ہو گیا، یہاں اس کی ملاقات کیتھولک پادری سے ہوئی جس نے اسے کیتھولک عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دی۔ روسو نے عقیدہ قبول کر لیا اور کیتھولک فرقے کی مبلغ مادام دے وران کے پاس انیس کے مقام پر رہنے لگا۔ وہ رات دن گھومتا ہوا دور دور تک نکل جاتا اور حسن فطرت سے لطف اندوز ہوتا۔ اس نے فطرت کو زندگی کے تمام رشتوں سے زیادہ پیار کرنے والا پایا اور اسی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب اس نے موسیقی بھی سیکھنا شروع کر دی، اور جو وقت بچتا اس میں بچوں کو تعلیم بھی دیتا اور خود بھی مطالعے میں غرق رہتا۔

۱۷۴۲ء میں روسو پیرس چلا گیا، جہاں اس کی ملاقات دیدرو، مارلی دو، اور فونتینل جیسے ادیبوں سے ہوئی، اس نے موسیقی کے ذریعہ جلد ہی پیرس میں شہرت اختیار کر لی اور مادام دپیانی نے اسے اپنا سکریٹری بنا لیا۔ انھیں دنوں حکمراں طبقے کے خلاف ایک پمفلٹ چھپوانے کے جرم میں دیدرو کو تین ماہ کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔ روسو اس سے ملنے جیل جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک اخبار میں اشتہار دیکھنے کو ملا جس کے ذریعہ ڈیژون کی اکیڈمی نے "آیا علوم و فنون نے رسوم کو پاکیزہ کرنے میں مدد دی ہے یا نہیں" کے عنوان کے تحت ایک انعامی مضمون کا اعلان کیا تھا۔ روسو کو یہ عنوان بہت پسند آیا اور دیدرو سے ملاقات کے بعد اس نے گھر آ کر مضمون لکھ ڈالا جسے اول انعام ملا اور ساتھ ہی اس کی شہرت

فرانس میں پھیل گئی۔ مضمون میں اس نے جن جدید خیالات کا اظہار کیا تھا وہ فرانس کے کلاسیکل ادیبوں کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔

۱۷۵۵ء میں اسی اکیڈمی نے ایک اور مضمون کا اعلان کیا۔ جس کا عنوان "انسانوں میں عدم مساوات کی ابتدا" تھا۔ روسو نے اس پر بھی مضمون لکھا۔ اس مرتبہ اسے انعام نہیں مل سکا۔ لیکن بعد میں یہی مضمون شائع ہو کر عوام میں بے پناہ مقبول ہوا۔ اپنے مضمون پر انعام نہ ملنے کی وجہ سے روسو کو بہت دکھ ہوا اور اس نے ۱۷۵۶ء میں باقاعدہ اپنی اولین تصنیفات لکھنا شروع کیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس کی ایک مداح مادام دے پینے نے پیرس سے کچھ فاصلے پر "موں موں رانسی" کے جنگل میں ایک خوبصورت خانقاہ روسو کے لیے تعمیر کروائی۔ اور روسو اس دلفریب اور خوبصورت مقام پر آکر بہت خوش ہوا۔ اس نے اسی خانقاہ میں امیل اور لا نوول ایلوائیس جیسی کتابوں کو مکمل کیا۔ وہ اس مقام پر پانچ چھ برس تک رہا اور فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا، یہاں تک جو سکون اور بے فکری کا ماحول نصیب ہوا اس کی یاد زندگی بھر وہ فراموش نہیں کر سکا، خانقاہ سے نکلنے کے بعد آٹھ دس برس تک وہ انگلستان سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے چکر لگاتا رہا اور کہیں بھی جم نہ سکا۔ وہ جہاں بھی گیا لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور پتھر ولے سے مار مار کر لہو لہان کر دیا، کیونکہ اس کے نظریات و خیالات کی وجہ سے اہل کلیسا اور اہل فکر دونوں اس کے دشمن ہو گئے تھے۔

۱۷۷۰ء میں روسو پھر پیرس واپس آ گیا اور کرایہ کا ایک بوسیدہ کمرہ لے کر باقی زندگی کے سات آٹھ برس وہیں گزار دیے۔ اسی بوسیدہ کمرے میں اس نے اپنی نایاب تصنیف اعترافات اور ایک نامکمل تصنیف تنہا گھومنے والے کی ادھوری [illegible] جو اس کی موت (۱۷۷۸ء) کے بعد شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے ذریعہ فرانس کے تمام مشہور ادیبوں اور اہل [illegible] کی [illegible] کی قابلیت اور علمیت کے آگے گھٹنے

"ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ والیتر جیسے عظیم مفکر نے اس کی شخصیت کا اعتراف کیا، نامور فلسفی ہیوم، کانٹ اور ہرڈر نے اسے اپنا پیغمبر تسلیم کیا۔ اس کی فطرت پرستی سے گوئٹے اور شیلر جیسے شاعروں اور ادیبوں نے استفادہ کیا اور اس کے اسلوب بیان کی پیروی کی، اور عظمت کی بلندیوں کو چھونے والے ادیب ٹالسٹائی نے کہا کہ "روسو میرا امام ہے"۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں وہ روسو کی تصویر گلے میں ڈالے رہتا تھا اور اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ میں روسو کے خیالات سے متاثر ہوا ہوں۔

روسو اپنے عہد کے یورپ کا استاد ہے۔ کیونکہ اہل فرانس جن علمی اور ادبی باتوں کے گن گایا کرتے تھے روسو ان کا خوب خوب مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس نے اپنی تصانیف کے ذریعہ تہذیب تمدن، علوم و فنون اور نام نہاد روشن خیالی کا پول کھول کر رکھ دیا۔ فرانسیسی فلسفی دالمبیر نے جب جنیوا میں تھیٹر قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا تو روسو نہایت برہم ہوا، اس نے دالمبیر کو ایک خط لکھ کر اس خیال کی سخت مذمت کی اور لکھا کہ عشق و عاشقی کے مناظر کے ذریعہ انسانی جذبات کو ابھارا جاتا ہے ان کی اصلاح نہیں کی جا سکتی، اداکاروں کے اخلاق کبھی بلند نہیں ہوتے بلکہ وہ بد اخلاقیوں کا پیکر ہوتے ہیں، اس لیے جنیوا میں تھیٹر کے خلاف تحریک چلانا چاہیئے اور پیرس سے بھی اس لعنت کو ختم ہونا چاہیئے تاکہ معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔ اس کے علاوہ فرانس کے مردوں کا عام خیال یہ تھا کہ بیوی کا کام گھر گرہستی دیکھنا اور بچے پیدا کرنا ہے نہ کہ وہ محبت کے لیے ہے، محبت تو صرف داشتہ سے کی جا سکتی ہے۔ روسو نے ان خیالات کو رد کرنے کے لیے آواز بلند کی اور اپنے ناول نوول ایلوائس کے ذریعہ اس خیال کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اس نے نوول ایلوائس کی ہیروئن جولی کے پیکر میں ایک گھریلو عورت کی روح پھونک کر فکر و خیال کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔ جولی اپنے استاد سین پریو کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لیکن جولی کا باپ اس کی شادی کسی دوسرے نوجوان سے کر دیتا ہے، جولی کئی بچوں کی

ماں بن جاتی ہے، لیکن اپنے عاشق کو فراموش نہیں کرتی ہے۔ اس کا شوہر "موسیو دے ولمار" اس بات کو جانتا ہے، وہ سین پرو کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اپنے مکان پر ہی رکھ لیتا ہے۔ جولی نے اسے اخلاقی خطوط کے ذریعہ متاثر کیا اور سین پرو بھی تمام خطوط کے جوابات دیتا رہا، اس طرح پورا ناول خطوط کی شکل میں ہے جس میں روسو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اور اخلاق کے سہارے بھی زندہ رہا جا سکتا ہے اور کسی سے عشق کرنے کے باوجود ایک گھریلو زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ کیونکہ سین پرو جولی کے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ہے۔ وہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اور ایک گرہست زندگی کو برباد ہونے سے بچا لیتا ہے۔ جولی بھی اپنے شوہر کی وفادار بیوی ثابت ہوتی ہے اور اپنے ایک بچے کو ندی سے بچانے کے بعد نمونیہ کا شکار ہو کر فوت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح پیرس کی گناہ آلودہ زندگی اور معاشرے میں روسو شرافت اور طہارت کا درس دیتا ہے، اس کے ذہن میں ایک ایسے گھر اور خاندان کا نقشہ تھا جو فرانس کے معاشرے میں انفرادیت رکھتا ہے۔ روسو نے اپنے ناول کے ذریعہ زندگی کی نئی ذمہ داریوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اصلاح معاشرہ پر اس نے ایک اور تصنیف بھی لکھی جس کا نام مساھدہ معاشرہ رکھا، اس کتاب میں اس نے بتایا کہ معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ لوگ قاعدے اور قانون کی پابندی کریں اور سیاست میں بھی انسان فطری، حالت میں داخل ہوں اور اس مملکت کے قوانین کی پابندی کریں جسے وہ خود بناتے ہیں، اس طرح عدل و انصاف قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے امیل میں لکھا

کہ فردی اصلاح سے ہی جماعت کی اصلاح ممکن ہے، اس نے تعلیم کے اصول مرتب کیے اور فطرت کے مطابق تعلیم کا ڈھانچہ تیار کرنے پر زور دیا، اس کا خیال تھا کہ انسان نیک پیدا ہوتا ہے تہذیب و تربیت اسے برا بناتے ہیں اس لیے بچے کی تربیت میں سلیقہ نہایت ضروری ہے۔ دس برس تک تربیت دینے کے بعد بچے کو فطرت کے مشاہدے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے اور علوم و فنون اور مذہب کی تعلیم پندرہ برس کے بعد دینی چاہیے۔

اعترافات میں روسو نے اپنے بچپن سے بڑھاپے تک کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور "تنہا گھومنے والے کی ادھیڑ بن" میں وہ اپنے مصائب اور ان دشواریوں کا تذکرہ کرتا ہے جو لوگوں نے اس کے ساتھ روا رکھیں، اپنی تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میں پیرس کی بھری بستی میں اپنے کو جتنا تنہا پاتا ہوں
اتنا رابنسن اپنے جزیرے میں تنہا نہ ہوگا۔"

وہ فطرت کا پرستار تھا اور کہا کرتا تھا کہ فطرت نے سب کو آزاد پیدا کیا ہے۔ معاشرے نے انھیں غلام بنا لیا، فطرت نے انسان کو اچھا پیدا کیا، معاشرے نے اسے بدی کی طرف لگا دیا۔ فطرت چاہتی ہے کہ انسان خوش رہے، معاشرے نے اس کی خوشیاں چھین لیں، فطرت کے ساتھ انسانوں کا جذباتی تعلق پیدا کر کے اس نے فطرت کو بلند مرتبے پر پہنچا دیا۔ اور اپنی عظمت کو بھی چار چاند لگا دیے، وہ انسانیت کی خدمت کے لیے زندہ رہا اور آنے والی نسلوں کو اس خدمت پر لگا کر رخصت ہو گیا۔

★

فانی: حیات اور فن

(صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانیؔ کے کلام کے مطالعہ کے بعد ذہن میں یہ احساس شدت پکڑ لیتا ہے کہ فانیؔ ایک ORIGINAL (منفرد) شاعر ہیں اور ہر ORIGINAL شاعر جدت پسند واقع ہوتا ہے ہر چند کہ انھوں نے دنیا کو ایک قنوطی کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے تاہم ان کی اس قنوطیت میں ندرت ہے۔ ان کا نظریہ راسخ ہے لہٰذا اس میں تضاد برائے نام بھی نہیں ہے۔ ہم کو فانیؔ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے غزل کو ایک منفرد لہجہ عطا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے مقلدین کی تعداد بے حد قلیل ہے تاہم انھیں ہم ایک بلند پایہ اور منفرد شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

★

(افسانہ)

عطیہ پروین
[illegible]، اندرون قلعہ
ماسے بریلی۔

نانی

نانی گرم گرم پکوڑی تل رہی تھی اور اُس کا مسکین صورت نواسہ دا جو گاہکوں کو نپٹا رہا تھا۔ نانی کی دکان پر حسبِ معمول بھیڑ تھی۔ صبح کے ۸ بجے تھے سردی شباب پر تھی کہرا ابھی تک چھایا ہوا تھا پھر بھی نانی کی دکان بھیڑ سے چھلک رہی تھی۔ وجہ یہ تھی نانی کی پکوڑیاں بے حد مزیدار اور چٹ پٹی ہوا کرتی تھیں۔ خالص سرسوں کے تیل میں تلی لال لال پکوڑیاں گرما گرم اور صبح کا وقت۔ لوگ ناشتے کے لیے لیتے۔ چائے اور پکوڑی کتنا سستا اور اچھا ناشتہ تھا۔ نانی ۲۵ پیسے میں ۲۵ پکوڑیاں دیا کرتی۔ اس کا انتظام بھی بڑا چوکس تھا۔ ۶ بجے صبح سے اٹھ کر وہ بھٹی چلا دیتی۔ مسالہ وہ رات ہی میں پیس کاٹ کے رکھ دیتی دوہری بھٹی میں ایک طرف چائے کی کیتلی اُبلتی اور دوسری طرف بڑے سے کڑھاؤ میں کھل بل۔۔ کھل بل پکوڑیاں تلتی رہتیں۔ محلے کے سارے غریب غربا نانی کی دکان کو اپنے لیے نعمت سمجھتے۔ پچاس پیسے میں جی بھر کے ناشتہ اور چائے مل جانا بہت بڑی بات ہے۔ بڑے آدمی بھی اب منہ کا مزہ بدلنے کے لیے نانی کی دکان سے پکوڑیاں خریدنے لگے تھے۔ شام کے وقت پکوڑی کی جگہ پر ایک دن مٹر کی چاٹ اور دوسرے دن چنے کی چاٹ ملا کرتی دام وہی پچیس پیسے، پھر وہ نا چاٹ لوچنی لپانی چٹنی ہوتی ہو کٹورے کا سستا جائزہ زبان معطر ہو اور اگر چلنے کی خواہش ہو تو جگمگ کرتے شیشے کے گلاس میں گاڑھی سنہری چائے ہو۔ گرمیوں میں لیموں، بالنگے یا فالسے کا خوب ٹھنڈا ٹھنڈا شربت ملا کرتا ۲۵ پیسے گلاس لوگ لوٹ ٹوٹ پڑتے۔ نانی اپنی شفیق مسکراہٹ اور نرم بولی کے ساتھ شربت دیتی جاتی اور پیسے ایک کپڑے کی جھولی میں رکھتی جاتی۔ وہ محلے بھر کی نانی تھی۔ کیا بوڑھا کیا جوان کیا بچہ ہر ایک کی نانی۔ دبلی پتلی لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی یہ عورت پیچ پیچ ہر آدمی سے نانی جیسی شفقت و محبت سے پیش آیا کرتی۔ اس کی شفیق مسکراہٹ ہر شخص کے لیے تھی مگر ہر شخص اپنی جگہ یہی سمجھتا کہ نانی صرف اسی پر اپنی مسکراہٹ اور شفقت نچھاور کرتی ہے۔

نانی کون تھی، کہاں سے آئی تھی یہ کسی کو نہیں معلوم اسی محلے کے آدمیوں نے ایک روز دیکھا کہ امپلائمنٹ اکسچینج کی بلڈنگ کے پاس ایک پتلی دبلی گوری رنگت کی بوڑھی عورت زمین پر ٹاٹ کا ٹکڑا بچھائے بیٹھی ہے، سامنے ایک لکڑی کے تختے پر تین چار ڈبوں میں گڑ اور تل کے لڈو، مرمرے کے لڈو، مونگ پھلی کی گزک اور پٹی اور بھنے چنے رکھے ہیں۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے جس کی آنکھیں چندھی ہیں اور صورت پر دنیا زمانے کی حماقت برس رہی ہے۔

دوسرے روز بھی یہ بڑھیا اپنی ننھی سی دکان

سجائے بیٹھی رہتی تیسرے دن بھی اور چوتھے دن بھی۔ محلے کے بچے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ پھر رکشے، کھڑ کھڑے والے سودا لینے لگے۔ پھر اُدھر سے گزرنے والی اسکول کی لڑکیاں بھی اس کے پاس رکنے لگیں۔ رفتہ رفتہ دکان چل پڑی۔ بڑھیا نے دو تین کورے مٹکے رکھ لیے دھلے منجھے گلاس ایک طرف تھالی میں اوندھے رہتے۔ گرمی کے دن تھے، جلے بھنے لوگ سوندھا پانی دیکھ کر کھنچے چلے آتے۔ بڑھیا بڑے پیار سے کہتی۔

"بیٹا۔ خالی پانی نہیں پیتے، چاہے کرچ بھر کچھ کھا دیر کھا سے بنا پانی نہ پیو، جانے کہاں کہاں سے چل کے آ رہے ہو۔ لیتو بچہ ذرا سا گڑ کھا لو اور ٹھنڈا پانی پیو!" بس میٹھی لڈو بھی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے اور پانی بھی خوب پیا جاتا۔ جاڑوں میں بڑھیا نے وہیں پر بھٹی بنا لی۔ کہیں سے ایک پرانا تخت لے آئی المونیم کی تھالیاں رکھ لیں، لوہے کا صاف ستھرا کڑھاؤ اور خالص سرسوں کا تیل۔ پکوڑیوں کی مہک نے لوگوں کو کھینچ لیا دفتر میں جتنے لوگ تھے سب اس دکان سے پکوڑیاں خریدنے دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا سب کی نانی بن گئی اور اس کی دکان نے شکل بدل لی اب اچھا سا چھپر پڑا تھا ادھر اُدھر کچی لیکن لپی پتی دیواریں تھیں پیچھے ایک کوٹھری جس میں نانی رہتی تھی اور دکان کا سارا سامان بھی تھا۔ باہر بھٹی کے پاس دو بنچیں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ لوگ بیٹھتے چائے پیتے پکوڑی کھاتے اِدھر اُدھر کی خبریں سناتے، نانی بھی برابر سے حصہ لیتی، بولتی جاتی، پکوڑی تلتی جاتی اور راجو کو ہدایت دیتی جاتی۔ اس کا راجو اب جوان ہو گیا تھا مگر تھا وہی بھوندو کا بھوندو۔ نانی اس کی حرکتوں پر ماتھا پیٹ لیتی ـــ

"موا بوکھل ہے کبھی تمیز نہ آئے گی۔"

"اب اس کی شادی کر دو نانی،" کوئی کہتا اور نانی ہنس پڑتی۔ "اے لو ایک اور بوجھ رکھ لوں چھاتی پہ!"

"بہو آجائے گی تو تمھارا ہاتھ بٹائے گی نانی۔" کوئی بولتا۔ "اے نہیں بیٹا۔ جب تک جان ہے تب تک اپنا کام خود کروں گی آج کل کی لڑکیوں سے کوئی امید فضول ہے!" بہرحال راجو اب جوان تھا لیکن کوئی ٹھور ٹھکانہ ہوتا تو شادی بھی ہوتی۔ نانی کے دم سے یہ جھونپڑی بھی سلامت تھی ورنہ راجو کو اتنی بھی تمیز نہیں تھی کہ سر پر ٹین کا سایہ ہی کر لیتا۔ نانی اس پر جان دیتی تھی اب بھی فرصت کے وقت اپنے ہاتھ سے اس کے سر میں تیل لگاتی، بال بناتی، کانوں میں تیل ڈال کے کان صاف کرتی، ڈانٹ ڈپٹ کے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاجل لگاتی اور تو اور ماتھے کے کنارے نظر کا ٹیکہ بھی لگا دیتی۔ راجو کبھی یہ ٹیکہ پونچھ دیتا تو وہ دوبارہ لگا دیتی اور خوش ہو ہو کے دیکھا کرتی۔ خود دو سوتی دھوتیوں میں پورا سال گزارتی لیکن راجو کو نیے نیے فیشن کے کپڑے پہناتی، باٹا کے جوتے پہناتی اور رات کو سوتے وقت ایک بڑا سا گلاس گاڑھی ملائی والے دودھ کا راجو کی حلق میں ضرور انڈیلتی۔ کبھی کبھی راجو فلم دیکھنے کی ضد کرتا تو موئے بوکھل، نکھٹو، جیسے خطاب دے کر نانی اس کے ہاتھ میں پیسے تھما دیتی۔

"میری بڑی بیٹی کی نشانی ہے!" وہ آہ بھر کر کہتی۔ "ایک دن کی جان تھی جب ماں مری تھی۔ تب سے اس انگلی برابر بچے کو چھاتی سے لگا کے پالا ہے!"

اب نانی کافی بوڑھی ہو گئی تھی، رات کو کم دکھائی دینے لگا تھا پھر بھی اپنی ہمت سے چلے جا رہی تھی دکان بھی اسی انداز سے چل رہی تھی ـــ کتنے سال گزر گئے تھے اس کو اس محلے میں آئے ہوئے اور اب تو وہ اسی جگہ کی ہو کر رہ گئی ـــ بچوں کی بڑوں کی عورتوں کی

لڑکیوں کی سب کی نانی

جس صبح کا یہ ذکر ہے اس صبح نانی کی دکان پر کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ نانی ادھر پکوڑیاں کڑھائی سے نکال کر تھالی میں ڈالتی، ادھر راجو کا ہاتھ مشینی انداز میں لپکتا اور تھالی خالی ہو جاتی۔ نانی پکوڑی تلتے تلتے تھک گئی تھی۔ کوئی حد بھی تھی چار بجے صبح سے متواتر اس کے بوڑھے ہاتھ چل رہے تھے پچھلو بیسن اب ختم ہو چکا تھا۔

نانی ذرا رک رک کر بائیں ہاتھ سے دایاں ہاتھ دبانے لگی اور اتنی ہی دیر میں کئی آدمیوں نے تقاضہ شروع کر دیا۔

"نانی!" راجو چلایا۔

"ارے چپ کر ذرا۔" نانی نے اس کو ڈانٹا۔ "ہاتھ ہوا پھوڑا بن گیا ہے۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں نانی راجو کی شادی کر دو اب تم سے دکان نہیں چلے گی!"

"چلے گی کیسے نہیں۔" نانی پھر سے کڑھائی میں پکوڑی ڈالنے لگی۔ "اور بھیا کروں بھی شادی تو کس بستے پر، نہ نوکری نہ چاکری، اس دکان کی آمدنی سے تو بہو کے نخرے پورے ہو چکے!"

"ارے تمھیں کیا پتہ نانی تمھارا نواسہ کتنا بڑا کاروبار کرتا ہے۔" محلے کا ایک نوجوان راجو کو آنکھ مار کر بولا۔ "یہ بس دیکھنے میں ہی بدھو ہے!"

راجو نے بوکھلا کر نوجوان کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے اور آنکھوں میں خوف کے۔

"ارے یہ کیا کاروبار کرے گا۔" نانی شفقت سے مسکرائی۔ "میرے بغیر رات میں باہر تک تو نکل نہیں پاتا، جب میں اٹھ کے کھڑی ہوتی ہوں تب تو پیشاب کے لیے اٹھتا ہے ڈرپوک کہیں کا!"

"ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں نانی کھانے کے اور۔۔۔" وہی نوجوان زور سے ہنسا۔

"اماں یار چپ رہو کیا بیکار کی بک بک کر رہے ہو!" راجو نے گھور کر نوجوان کو دیکھا تو وہ چپ ہو گیا۔

"کون سا کاروبار کرتے ہو راجو ہم بھی تو سنیں۔" محلے کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بولا۔

"کچھ بھی نہیں چاچا۔ یہ تو بس ایسے ہی بکتا ہے!" راجو جلدی جلدی تھالی سے پکوڑی سمیٹنے لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن۔۔۔

دوسری رات کوئی دو بجے، رات میں اچانک نانی کی آنکھ کھل گئی اس نے حسبِ عادت پکارا۔

"راجو۔ او راجو۔"

راجو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نانی نے بے تابی سے اپنا داہنا ہاتھ پاس بچھی چارپائی پر ادھر ادھر پھرا لیا اور بولی "او راجو۔ لحاف ٹھیک سے اوڑھے ہے نا، بڑا جاڑا ہے!"

بستر خالی پڑا تھا۔ ایک دم برف۔ نانی دھک سے رہ گئی۔ "راجو۔ راجو۔ راجو۔۔۔" راجو ہوتا تو بولتا۔ نانی نے گرم گرم بستر سے نکل کر کپکپاتے ہوئے پاس رکھی لالٹین کی بتی اونچی کی۔ راجو کا بستر خالی تھا۔ کوٹھری خالی تھی۔

"کہاں گیا!" نانی بڑبڑائی۔ وہ تو اس کو جگائے بغیر پیشاب کے لیے بھی نہ جاتا تھا، اتنا تو ڈرپوک تھا۔ دو برس پہلے ہی اس نے اکیلے لیٹنا شروع کیا تھا نہیں تو نانی کے پاس گھس کے لیٹتا تھا۔ بالکل کسی ننھے سے بچے کی مانند۔ اب اس وقت وہ ننھا سا بچہ کہاں تھا۔

نانی بے قرار ہو کے باہر نکل آئی۔ کیا غضب کی سردی تھی۔ تیز اور برفیلی ہوا کے جھونکے کلیجہ کو کپکپا رہے تھے نانی کا کمزور بوڑھا جسم اتنی ہی دیر میں برف بن گیا تھا سڑک

یہاں سے وہاں تک سنسان تھی۔ سیدھی سپاٹ اور روشنی سے بھری ہوئی۔

"راجو!" نانی کی کانپتی آواز ہوا کے جھکڑوں میں کھو کر رہ گئی۔ دور کہیں سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پہرہ پڑ رہا تھا۔ آج کل چوریاں بہت ہو رہی تھیں۔ پرسوں ہی محلے کے ایک مکان میں سیندھ لگا کے چور کئی ہزار کا سامان اٹھا لے گئے تھے۔ سامنے والے ماسٹر صاحب کی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کے جہیز سے کمرہ بھرا پڑا تھا ماسٹر صاحب اور ان کے گھر والے آج کل رات رات بھر جاگتے تھے مگر اس وقت ان کے یہاں بھی سناٹا تھا۔ بس روشنیاں جل رہی تھیں۔ نانی نے کمبل اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا اور سڑک پر کچھ قدم آگے بڑھ گئی۔

"نہ جانے سلیما ایسا تو نہیں چلا گیا۔ وہ بڑبڑائی۔ لڑکوں نے بہکایا ہوگا!"

سیٹی اب قریب آ کر کو کی پھر بوٹوں کی دھما دھم سنائی دی۔

"کون ہے؟" بھاری اور کوٹ اونی ٹوپی اور مفلر میں لپٹا ہوا کانسٹبل گرجا۔

"اے بیٹا میں ہوں!" نانی بولی۔

"کون؟ نانی؟ کانسٹبل قریب آ گیا۔ اس وقت کیا کر رہی ہو نانی سردی میں مر دو گی!"

"بیٹا میرا راجو جانے کہاں چلا گیا؟"

"راجو؟"

"ہاں۔ میرا نواسہ!"

"اس وقت کہاں گیا ہوگا!"

"میں خود حیران ہوں بیٹا!" ہر وقت ہنسنے مسکرانے والی نانی رو دے رہی تھی۔

کانسٹبل پہلے تو دل گھما گھما کے کچھ سوچتا رہا پھر سیٹی منھ میں لے کر زور سے بجائی پھر بولا۔

"نانی۔ کہیں تمھارا نواسہ چوری تو نہیں کرنے لگا ہے!"

"اے دشمنوں کے منھ میں خاک۔ نانی گھبرا کے بولی۔ نہیں بھیا میرا راجو ایسا نہیں ہو سکتا!"

"رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ کانسٹبل گھڑی دیکھ کر بولا۔ اتنی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اب اس وقت گھر سے کون نکل سکتا ہے۔ تم خود سو رہو نانی! جاؤ لیٹ رہو کہیں بیمار نہ پڑ جانا ....." کانسٹبل یہ کہہ کر بڑھا۔ ماسٹر صاحب کے گھر کے پاس پہونچ کے سیٹی بجائی، رول دیوار پر مارا اور آگے بڑھ گیا۔

نانی کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی پھر مرے مرے قدموں سے بڑھی اور کوٹھری میں آ گئی۔ کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ نانی اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ وہ بالکل گم سم تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد:

کوٹھری کے باہر چند آہٹیں ابھریں۔ کچھ سرگوشیاں ہوئیں پھر دروازہ بے آواز کھلا۔ نانی لحاف کے اندر بے حس و حرکت پڑی تھی۔

راجو نے اس کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بڑے سکون سے خراٹے بھر رہا تھا۔ نانی آہستہ سے اٹھی۔ وہ جانتی تھی راجو بڑے بے خبر نیند سوتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے لحاف ہٹایا۔ راجو کا چہرہ بڑا ہی بھولا لگ رہا تھا — لالٹین کی روشنی میں بے حد معصوم اور بے خبر۔

نانی چند لمحے اس کو دیکھتی رہی۔ ننھا سا گوشت کا لوتھڑا تھا جس کو سینے سے لگا کر روئی کے پھاہوں کو دودھ میں ڈبو ڈبو کر اس کے ننھے سے منھ میں نچوڑ نچوڑ کر پالا تھا۔ آج وہ اللہ رکھے کڑیل جوان تھا۔ کیسا پلا ہوا کسرتی جسم تھا خدا نظرِ بد سے بچائے۔

نانی کے دل میں کوئی ننھا سا سانپ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے راجو کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا کچھ

نہیں تھا پھر اس نے بستر کے کونے الٹ پلٹ کے دیکھے، صاف تھے۔ وہ شک کا ناگ دھیرے دھیرے پھن ڈال رہا تھا۔ نانی کے تنے ہوئے چہرے پر دوبارہ ممتا اور نرمی کے آثار ابھر رہے تھے۔

"صبح پوچھوں گی کہاں گیا تھا!" وہ اٹھی اور اپنے بستر پر جانے ہی لگی تھی کہ اس کے پیر سے کوئی چیز ٹکرائی ٹھنڈی اور سخت چیز —!

اس نے جھک کر وہ جگہ ٹٹولی اور پڑی ہوئی چیز اٹھالی۔ لالٹین کی روشنی میں وہ سونے کا بھاری ہار جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ بالکل نیا دمکتا ہوا ہار جیسے ابھی ابھی صراف کی دکان سے آیا ہو —!

نانی یوں اچھلی جیسے بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ یوں بدکی جیسے ہاتھ میں بچھو آ گیا ہو اور پھر یوں ساکت ہو گئی جیسے اچانک جیتی جاگتی صورت سے پتھر کی مورت میں تبدیل ہو گئی ہو۔!

اس کے ہاتھ سے ہار گر پڑا تھا اور رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ سیٹی کی آواز پھر قریب آ رہی تھی۔ سنتری نے محلے کا چکر پورا کر لیا تھا اور اب ادھر سے واپس جا رہا تھا نانی کے بے حس و حرکت جسم میں جنبش ہوئی۔ اس نے ایک بار مڑ کر سوتے ہوئے راجو کو دیکھا۔ وہ اب کروٹ سے سو رہا تھا۔ بڑے چین کی نیند —!

نانی نے اپنی دھوتی کے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھیں پھر دونوں گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر ایک کراہ کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ اب تک بالکل سیدھی چلنے والی نانی کی کمر جھک گئی تھی، وہ دھیرے دھیرے بڑھی۔ کیواڑ کھولنے سے پہلے دوبارہ پھر اس نے راجو کو دیکھا اور کیواڑ کھول کے باہر نکل آئی۔

کانسٹبل اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس کو کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پوچھا۔

"راجو آ گیا نانی؟"

"ہاں بیٹا۔" نانی مری مری آواز میں بولی۔

"کہاں گیا تھا؟"

"پتہ نہیں بیٹا!" نانی نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا سونے کا ہار بجلی کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"سونے کا ہار ہے۔ میرے خیال میں بیٹا راجو کہیں سے اسے چرا کر لایا ہے......"

"نا..نی....!" کانسٹبل ہکلا گیا۔

"وہ سو رہا ہے بیٹا۔ اسے جگا کے پوچھو یہ ہار کہاں سے لایا ہے!"

کانسٹبل چند لمحوں تک حیرت سے نانی کو تکتا رہا پھر اس نے جیب سے سیٹی نکال کر منہ میں دبائی اور پوری طاقت سے بجانے لگا۔

دوسری صبح: نانی اپنی دکان پر ہونے والی گفتگو سے لاپرواہ کسی کے سوال کا جواب دیے بغیر پکوڑیاں تلنے میں مصروف تھی یہ اور بات تھی کبھی پکوڑیاں جل کر سیاہ ہو جاتیں کبھی کچی رہ جاتیں اور کبھی وہ خالی کڑھاؤ میں ہی کرچھل پھرا پھرا کر گویا کرکری اور لال لال پکوڑیاں الٹنے پلٹنے لگتی۔

راجو کی گدی خالی تھی اور کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

★

اداریہ

اتر پردیش کی معیشت میں بنیادی تبدیلی کے لیے وزیر اعلا کی کوششیں

اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران جسے "صنعت کا سال" قرار دیا گیا ہے، ریاست کی معیشت میں بنیادی تبدیلی کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا ہے۔

وزیر اعلا کے سامنے سر دست جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کی معیشت زیادہ تر زراعت پر مبنی ہے یہاں صنعتی سہولتوں کی قلت ہے، دیگر ریاستوں کے مقابلے میں فی کس آمدنی کم ہے اور زیادہ تر آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر ریاست کی مجموعی سالانہ آمدنی کا ۵۷،۳ فیصد حصہ زراعتی اور دیگر بنیادی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے جب کہ دوسری طرف صنعتی پیداوار سے صرف ۱۰،۲ فیصد آمدنی ہوتی ہے۔

وزیر اعلا نے اس پس منظر میں گزشتہ دنوں بتایا کہ ریاست میں صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کی جائے گی تاکہ بے روزگار افراد کو روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں۔ اس طرح صنعتی سرگرمیوں کے باعث ریاست کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ وزیر اعلا نے پرزور الفاظ میں کہا کہ اس طرح ریاست کی خوش حالی میں اضافہ ہو جانے سے عوام اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں لگ جائیں گے اور سماجی تناؤ میں کمی ہوگی۔

شری سنگھ نے ترقیاتی حکمت عملی کا انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ اتر پردیش میں معاشی ترقی کے لیے ترجیحات کا تعین کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ریاست کا معاشی نظام مستحکم ہو سکے۔

ان ترجیحات کے بموجب سب سے پہلے مقامی طور پر دستیاب خام مال پر مبنی صنعتیں قائم کرنا ہے۔ وزیر اعلا نے اس سلسلہ میں الکوہل پر مبنی صنعتیں قائم کرنے کی ضرورت کا بھی ذکر کیا۔

خواہش مند صنعت کاروں کی درخواستوں پر فوری کارروائی کرنے کی غرض سے "ون ونڈو" کے اصول پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں وزیر اعلا کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کہا کہ "میں ریاست میں صنعتوں کے قیام کے سلسلہ میں حتی المقدور مالی امداد مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس میں ریاست کے مستقبل اور اس کی خوش حالی کا راز مضمر ہے۔"

نولکشور نمبر: تاثرات کے آئینے میں

جناب ایس ایم شفیع الدین، پریس سکریٹری برائے گورنر بہار

عزت مآب گورنر بہار کو بھیجا گیا "نیا دور" کا خصوصی شمارہ "منشی نول کشور نمبر" موصول ہوا۔ شکریہ

عزت مآب کو یہ خصوصی شمارہ اپنی گوناں گوں خوبیوں کی وجہ سے پسند آیا۔

کیفی اعظمی ۔ بمبئی

ہم اردو والوں پر منشی نولکشور کا جو قرض تھا، آپ نے یہ شاندار نمبر نکال کر ہم سب کی طرف سے اس کی ایک قسط ادا کی ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو آپ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ سب ہوں یا نہ ہوں، میں آپ کا شکرگزار ہوں۔

اردو والوں میں نہ جانے کیسے ایک طرح کی تنگ نظری راہ پاگئی تھی کہ وہ اردو کی مشاطگی کرنے والوں کو انگلیوں پر گنا کرتے تھے اور جب انگلیاں ختم ہوجاتیں تو وہ سمجھ لیتے کہ بس اردو کے محسن یا خادم بھی بس اتنے ہی ہیں۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے ہم نے اردو کے کچھ ایسے معماروں کو نظر انداز کیا جس سے ان معماروں کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ اردو زبان کو ضرور نقصان پہنچا۔ آپ کا یہ اقدام میری نظر میں اردو کو اس تنگ نظری سے نکالنے کی ایک کوشش ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

آوارہ ۔ مارہرہ، ایٹہ

مجھے اس رسالے کی خدمت کرتے اتنی مدت گزری کہ اب یاد بھی نہیں ۔ اتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ "منشی نولکشور نمبر" سے بہتر ذخیرے میں دوسرا رسالہ نہیں۔ آنجناب نے عرصہ ہوا مجھے بھی مدعو کیا تھا کہ کچھ لکھوں۔ سوچا بھی۔ مجھے کی سعی بھی کی مگر اتمام کو نہ پہنچا سکا۔ اب عمر کا تراسیواں برس چل رہا ہے اور حال یہ ہے کہ

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چند سطریں بیٹھے بیٹھے گھسیٹ رہا ہوں۔ پلنگ کا قیدی ہوں۔ ضرورت کے لیے اٹھنا اب میرے بس کا نہیں رہا۔ جس حد تک الٹ پلٹ کر دیکھ سکا۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ "منشی نول کشور نمبر" آپ دریا بہ کوزہ بستن کی بھی مثال ہے۔ اور آپ کی محنت کا نہایت واضح ثبوت۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۔ دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی

عزیز مکرم۔ آپ کا نول کشور نمبر تاریخ ادب اردو کا ایک اہم باب ہے۔ بڑا اچھا ہو اگر آپ اسے کتابی شکل میں بھی شایع کردیں۔ میں آپ کو اس گراں قدر دستاویز کے شایع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر سید حسن، پٹنہ یونیورسٹی ۔ پٹنہ۔

نیا دور کا منشی نول کشور نمبر موصول ہو کر نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ

اس کم نظیر نمبر کو دیکھ کر آپ کی مدیرانہ صلاحیت ومحنت و کاوش و کوشش کا معترف ہونا پڑا، آپ نے مختلف ذرائع سے حاصل شدہ مضامین وتصاویر اور اہم شخصیتوں کی پر از معلومات تحریروں سے اس خاص نمبر کو مزین ومفید وجالب دیدہ و دل بنانے کی کامیاب سعی فرمائی ہے، یہ نمبر اردو مجلات و رسائل کے خاص نمبروں میں امتیازی شان کا حامل ہے، اس کے مندرجات کے مطالعے سے فارسی اور اردو کے ایک ناقابل فراموش محسن کی سیرت و شخصیت اور گرانمایہ کارناموں سے پوری واقفیت حاصل ہوجاتی ہے، سورگ باشی منشی نول کشور کی یاد تازہ کرنے کے لیے آپ کا مرتب کردہ نمبر روشنی کے منار کی حیثیت رکھتا ہے، اس اہم کام کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے میں آپ کو ہدیہ تبریک وتہنیت تقدیم کرتا ہوں ۔ اردو نظم ونثر کا جو سرمایہ اس وقت ہندوستان بلکہ ایران میں بھی موجود ہے اس کے بیشتر حصے کی بقا جناب نول کشور کی مرہونِ منت ہے، پندرہ بیس سال پہلے ایران کے نامور ادیب جناب آقائے سعید نفیسی مرحوم نے امیر خسرو کا دیوان تہران سے شایع کیا تھا، اس کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ انھوں نے نولکشور پریس سے شایع شدہ دیوان کی محض نقل اتاری ہے۔

آپ کا مرتب کردہ خاص نمبر اردو رسالوں کے تزئین کے لیے

بہت مدت تک ایک قابلِ تقلید نمونہ کی حیثیت سے یاد رہے گا۔ خدا کرے آپ زیادہ سے زیادہ دنوں تک اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے مستعد و باقی رہیں۔

ڈاکٹر گیان چند۔ حیدرآباد یونیورسٹی۔ حیدرآباد

نیا دور کا منشی نول کشور نمبر ملا۔ اس کی ورق گردانی کر کے عش عش کرنے لگا۔ ایک شاعر یا افسانہ نگار پر نمبر نکالنا آسان ہے کیونکہ اس پر لکھنے والے بہت مل جاتے ہیں لیکن ایک علمی شخصیت پر قدرت اور صحت کے ساتھ قلم اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔

اس نمبر میں لکھنے والوں نے کیا کیا داد تحسین دی ہے اور آپ نے کس کس سے اور کہاں کہاں سے مواد جمع کیا ہے۔

اس سے پہلے بھی بعض رسالوں کے نول کشور نمبر نکل چکے ہیں لیکن تو چیرے دیگری والی بات ہے۔ جی چاہتا تھا کہ چند ایسے مضامین کے نام گنا دوں جو غیر معمولی محنت سے لکھے گئے ہیں اور جن میں معلومات کا انبار ہے لیکن پھر یہ سوچ کر قلم روکتا ہوں کہ جن کے نام نہ لوں گا وہ آزردہ ہوں گے۔ خواہ مخواہ کیوں کسی کی ناراضی مول لوں۔ اتنا اعتراف کروں گا کہ اس شمارے میں تحقیقی اعتبار سے جتنا مواد ہے مشاہیر کے خاص نمبروں میں کم ایسا مواد یک جا ہوا ہوگا۔

آپ کو بڑی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ شمارے کی تکمیل و اشاعت ہی اس کا اصل انعام ہے۔

یہ چٹھی مدیر کو خوش کرنے کے لیے روایتی تحسین نہیں بلکہ میری اس واقعی خوشی کا اظہار ہے جو رسالے کے معیار کو دیکھ کر ہوئی کاش مجھے بھی اس بزم میں شمولیت کی توفیق ہوئی ہوتی۔

مسیح الحسن رضوی۔ لکھنؤ

نیا دور کا "منشی نول کشور" نمبر ملا۔ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے کس طرح سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ریسرچ اسکالر تو اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے لیکن ہم مبتدیوں کے لیے بھی اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں۔ جن کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی امریکی اشاعتی ادارہ کی کارگزاری نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔

منشی نولکشور ایک بہت بڑے انسان تھے جنھیں دنیا صدیوں میں پیدا کرتی ہے۔ لیکن ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے یہاں کی درسی کتابوں کے لیے اردو ہندی، دونوں میں ان کے کارناموں کے بارے میں اسباق تیار کرا کے ان کتابوں میں شامل کریں۔ تاکہ نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ ایک حوصلہ مند اور باعمل شخص کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ منشی جی کی ایک بڑائی ہو تو اس کا ذکر کیا جائے وہ تو سبھی عظیم ہی عظیم تھے۔ تاجر، ناشر، صحافی، قوم پرست، بے تعصب اور [illegible] اس وقت میں جب قومی یک جہتی کی اصطلاح زبان کے [illegible] میں پروان چڑھ رہی تھی۔

کیا اچھا ہوتا کہ ہماری لکھنؤ یونیورسٹی، ٹوکیو یونیورسٹی کے طرز پر اپنی لائبریری میں ایک گوشہ نول کشور قائم کر کے لکھنؤ والوں کی طرف سے انھیں خراج عقیدت پیش کرتی۔ چونکہ وہ ایک تہذیبی لیڈر تھے اس لیے سڑکوں پر ان کا مجسمہ لگانا کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم لکھنؤ میں رہنے والے میر تقی میر کی یادگار کی بے حرمتی دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے میں اس کی رائے نہیں دوں گا۔

خدا کرے آپ کی ادارت میں اس طرح کے اور نمبر بھی شائع ہوں۔

بہر کیف اس شاندار نمبر کی اشاعت پر آپ کو اور آپ کے معاونین کو میں خلوص دل سے غیر رسمی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ثمینہ شوکت۔ حیدرآباد

نیا دور کا نولکشور نمبر موصول ہوا۔ یقیناً یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس پر آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب : مجلہ سیفیہ (سیفیہ کالج اردو میگزین) "یادگار اقبال"
سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال کے شعبۂ

اردو کا میگزین "مجلۂ سیفیہ" یادگار اقبال" (۸۰-۱۹۷۹ء) شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال سے متعلق لکھے ہوئے مختلف مضامین کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ پہلے ہی صفحہ پر بانی سیفیہ کالج ملا سجاد حسین مرحوم کی دلآویز تصویر نظر آتی ہے جنھوں نے ۵۹ء میں اردو زبان و کلچر کے شہر بھوپال میں اس کالج کی بنیاد ڈالی جس میں آج پندرہ مختلف شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں۔ ۶۸ء سے یہاں ایم۔اے کے درجات کا بھی آغاز ہو گیا۔ شعبۂ اردو کے سربراہ جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب ہیں جن کا نام تنقید و تحقیق کی ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے تقریباً ڈیڑھ سو مختلف ادبی مضامین کے علاوہ ڈاکٹر اقبال پر جو نایاب کتب پیش کیں ہیں وہ بلاشبہ اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ جوت سے جوت جلتی ہے یہ انھیں کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کے طلبا و طالبات نے مختصر عرصے میں ڈاکٹر اقبال پر اپنی محنت اور تلاش و جستجو سے جو علمی و تحقیقی مضامین پیش کیے ہیں کو یکجا کر کے مجلہ سیفیہ نے "یادگار اقبال" کی کتابی صورت اختیار کر لی۔ مضامین پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے طلبا، اقبال کے متعلق اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نواب بھوپال حمید اللہ صاحب کی دعوت پر ۱۹۳۶ء میں بھوپال تشریف لائے تھے، جہاں انھوں نے راحت منزل، یا ریاض منزل اور شیش محل میں مختلف اوقات میں تقریباً پورے چار مہینے قیام فرمایا۔ یہاں کے دوران قیام ان کی تیرہ مختلف اردو نظمیں اور ایک فارسی نظم "در حضور رسالت مآب" تخلیق ہوئی "کلیات اقبال فارسی" میں فرماتے ہیں۔

"شب سوم اپریل ۱۹۳۶ء کہ در دار الاقبال بھوپال بودم سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ را در خواب دیدم، فرمودند کہ از علالت خویش در حضور رسالت مآب عرض کن!" (کلیات اقبال فارسی شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ص ۸۴۳)۔ اور "ضرب کلیم" کو تو انہوں نے والیٔ بھوپال کے ہی نام معنون کیا۔

"یادگار اقبال" میں جاوید اقبال کے دو خطوط بھی شامل ہیں جن میں انہوں نے بھوپال میں گذری ہوئی بچپن کی چند یادوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کا صدارتی خطبہ کافی معلوماتی ہے۔ اس سے ایک ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب تک ہند و پاک میں اقبال پر کس قدر اور کس نوعیت کا کام کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے "بانگ درا" کی ان نظموں کو یکجا کر کے اچھا تبصرہ فرمایا ہے جو انگریزی نظموں کے نمونے پر طبعزاد ہیں۔

پروفیسر حامد جعفری صاحب اور پرصبین جہاں صاحبہ نے اقبال کی شاعری میں وطنیت کے تصور کو ابھارا ہے۔ اقبال مسعود ندوی صاحب نے "اقبال کا تعارف عالم عرب میں" کے عنوان سے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر علامہ اقبال نے عربی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہوتا تو شاید آج عالم اسلام میں اقبال کی مقبولیت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا۔ یہ اظہار خیال ایک نیا پن لیے ہوئے ہے۔ "اقبال اور دعا" کے عنوان کے تحت مصنف نے اقبال کی مختلف نظموں میں دعائیہ عناصر کی اچھی توجیہہ کی ہے محمد نعمان خاں نے اپنے مضمون "اقبالیات اور بھوپال" میں ان مضامین اور کتب سے روشناس کیا ہے جو اقبال پر بھوپال میں لکھی گئیں۔ مضمون کافی معلوماتی ہے۔ اقبال روسی اشتراکیت کے مداح رہے ہیں اور مارکس کے فلسفہ سے متاثر بھی نسیمہ شہنوی نے "اقبال اور فلسفہ مارکس" پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔ اقبال نے تقریباً تمام مروجہ صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن رباعیات نسبتاً کم کہیں صدیقہ بیگم صاحبہ نے اس موضوع پر مختصراً روشنی ڈالی ہے جہاں تک اقبال کی غزلوں کا تعلق ہے روایتی انداز کے ساتھ ساتھ یہاں ان کا اپنا انداز نمایاں ہے گویا انہوں نے غزل کو رزمیہ انداز میں پیش کیا ہے یعقوب یاور کوثی اور محمد ایوب خاں صاحب کی فکر انگیز

پرچے ... ساقی نامہ' پر اسما سلطان کا تبصرہ اچھا ہے۔ خالدہ بلگرامی صاحبہ نے اقبال کے کلام میں عورت کے تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اقبال خود عورت کے متعلق واضح تصور نہیں رکھتے۔ اقبال اور بچے اور اقبال اور نوجوان سے متعلق بالترتیب منیرالحق صدیقی اور خفطان احمد ہاشمی صاحب نے اپنے خیالات کی نا تمام ترجمانی فرمائی ہے۔ سرسید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود اور اقبال کے تعلقات پر مبنی انور سلطان کا مضمون خاصا معلوماتی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ اقبال کے کلام سے مختلف عنوانات قائم کرکے مثلاً "گل ولالہ، نرگس ونسترن" "پرندے"، اور "خودی" سے متعلق اقبال کے اشعار کو یکجا کرکے مرتبین نے ایک اچھی کوشش کا ثبوت دیا ہے۔ "خودی" پر ایک علیحدہ تبصرہ حبیب احمد صاحب کا لکھا ہوا بھی کافی اچھا ہے۔ فیروز بابر نے کتاب کے اختتام پر "سیفیہ کالج منزل بہ منزل" کے عنوان سے کالج کا مکمل تعارف پیش کیا ہے۔ جس سے کالج کا ایک واضح نقشہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

بلاشبہ مجلۂ سیفیہ نے "یادگار اقبال" شائع کرکے بھوپال اور اقبال دوستی کو مضبوط تر بنا دیا ۔۔۔ اس کے لیے دسنوی صاحب سیفیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شکور خاں صاحب نیز دیگر مضمون نگار قابل مبارکباد ہیں۔ سرورق پر اقبال کی تصویر کا اسکیچ سیفیہ کالج کے سابق طالب علم سید مظہر علی صاحب کا تیار کیا ہوا ہے جو ان کے اچھے آرٹسٹ ہونے کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر آصفہ زمانی
لکچرر، شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی

نام کتاب: **عرض واقعی**۔ شاعر: اقبال عمر۔ قیمت: دس روپیے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ فردوس ادب۔ ۲۰۔ امین آباد پارک لکھنؤ

"عرض واقعی" اقبال عمر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اقبال عمر نوجوان نسل کے ان شاعروں سے تعلق رکھتے ہیں جو گرد و پیش اور اپنے شعری نظریات مسلط کرنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ جنوں کی حکایت خونچکاں لکھتے رہتے ہیں اسی لیے انھوں نے پیش لفظ، مقدمہ اور ناموں نا قدوں کی "رائے" کی بیساکھی لگا کر اپنے پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اقبال عمر کی شاعری غم دل اور غم دوراں کی ترجمان ہے۔ وہ اپنے احساسات کو منعکس کرنے کے لیے ابہام کا سہارا نہیں لیتے ہیں اور نہ شعر کو چیستاں بناتے ہیں بلکہ بات وہ سیدھے سادے (۲۱۹۸۴ء) انداز میں کہہ دیتے ہیں اور غزل کی روایات کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری پہلو دار بھی ہے اور پُر کار بھی۔ خیال اور جذبہ کی آنچ سے وہ لفظی پیکر تراشتے ہیں اور یہ لفظی پیکر شعر کا روپ اس طرح دھار لیتے ہیں کہ قاری بھی شاعر کے دل کی کسک اور ٹیس اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ کامیابی ایک فن کار ہی حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال عمر خیال اور جذبہ مستعار نہیں لیتے وہ خیال اور جذبہ کو اپنے تجربہ کا حصہ بنا لیتے ہیں جس سے شاعری میں اور بھی تخلیقی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

میرا لہجہ میرے جیون کی طرح تلخ سہی
وہ مرا جذبۂ معصوم سمجھتے ہوں گے

عالم عالم شور مچا ہے دیوانے کے عالم کا
سب کی زباں پر نام آیا ہے اپنے اپنے پریتم کا

ہم نے تو کچھ غزلیں کہہ لیں شہر سخن کی سیر بھی کی
تم نے کیسے جی بہلایا، دور جدائی جب چمکا

جہاں آرزو بن کے برسوں رہے تھے
وہ دل آج خالی مکاں کی طرح ہے

مجموعے کے آخر میں چند نظمیں بھی شامل ہیں جن میں "مداہمہ" "مشورہ" اور "یہ شہر دلی ہے" دلکشی کے اعتبار سے اچھی نظمیں ہیں۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے۔

...... امیر احمد صدیقی

★

Vol 36 No 1
APRIL 1981
50 PAISE

REGD No LW/NP.17
Annual Subs
Rs 5

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۴ مارچ ۱۹۸۱ء کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں
فیڈرل ریپبلک آف جرمنی کے صدر شری کارل کارستینس سے گفتگو کرتے ہوئے۔

جلد ۳۶ نمبر ۲

مئی ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک دھر

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیشنل گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کے زیر اہتمام ۲۲ اپریل ۱۹۸۱ء کو سوچنا بھون کے آڈیٹوریم میں اردو اخبار نویسوں اور ناشروں کی ایک ریاستی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا افتتاح وزیر اطلاعات و قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی نے کیا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کانفرنس تھی، جس میں اردو اخبار نویسوں اور ناشروں نے اپنے اپنے مسائل پر الگ الگ غور و خوض کر کے کچھ ٹھوس تجاویز پیش کیں۔ شام کے اجلاس میں وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بھی شرکت فرمائی اور انھوں نے کانفرنس میں پیش کی گئی تجاویز کی روشنی میں بعض بڑے ہی فیصلہ کن اعلانات کیے۔ انھوں نے ایک بار پھر یقین دہانی کرائی کہ اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان بنانے کے "جس ارادے کا اعلان کیا جا چکا ہے اس پر عمل بھی ہوگا اور میں وہی کہتا ہوں جو ہونے والا ہے۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دسمبر ۱۹۸۱ء کا انتظار کیا جائے۔ یہ اقدام دسمبر سے پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔"

اردو اخبارات کو اشتہارات جاری کرنے کے سلسلے میں وزیر اعلا نے کانفرنس میں اعلان کیا کہ "اشتہارات کی تقسیم مرکزی حکومت کے طرز پر کی جائے گی اور تقسیم کے نظام میں مرکزیت لائی جائے گی تاکہ تمام اشتہارات ایک ہی ادارے کے توسط سے جاری کیے جا سکیں۔" انھوں نے اردو صحافت کی تربیت کے لیے یونیورسٹیوں میں ڈپلوما کورس شروع کرانے کا اعلان بھی کیا

فن کتابت کی بقا و ترقی کے لیے کتابت کے مزید تربیتی اسکولوں کے قیام کی ضرورت کے پیش نظر وزیر اعلا نے کہا کہ ایسے مزید اسکول اردو اکاڈمی کے توسط سے قائم کیے جائیں گے۔ لیتھو مشینیں ملک کے اندر ہی تیار کیے جانے کے مطالبے کے سلسلے میں وزیر اعلا نے کہا کہ وہ اس کے لیے مرکزی حکومت سے بات کریں گے اور اردو پریس کو مالی امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں بینکوں سے بھی گفتگو کریں گے۔ اس طرح یہ کانفرنس اس اعتبار سے بھی منفرد تھی کہ اس میں جو تجاویز اردو اخبار نویسوں اور ناشروں نے پیش کیں ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے وہیں فیصلوں کا اعلان بھی کر دیا۔ وزیر اعلا نے اپنی تقریر میں اردو کے مسئلے کو ایک خاموش طوفان قرار دیا اور کہا کہ یہ طوفان ایسا بھی ہو سکتا ہے جس سے آسمان گردش میں آجائے۔ انھوں نے کہا کہ ہر حکومت اسی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے کہ وہ حقوق کس حد تک دلاتی ہے۔ وہ حکومت نہیں جو حق نہ دلا سکے۔ انھوں نے کہا کہ حق اور حکومت ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا موقع آیا تو میں حکومت کی جگہ حق کا انتخاب کر لوں گا۔ انھوں نے اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کی مخالفت کرنے اور دھمکیاں دینے والوں کو آگاہی دیتے ہوئے کہا کہ ہم کسی دھمکی سے خوف زدہ نہیں ہوں گے، بلکہ اس کا مقابلہ کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی بھی زبان کی مخالف نہیں ہے اور سبھی اردو والے ہندی سے بھی واقف ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تواریخ نہ پڑھو ورنہ جغرافیہ کمزور ہو جائے گی۔ اسی طرح اردو پڑھنے سے ہندی بھی کمزور نہیں ہوگی۔ کئی زبانیں سیکھ لینا کسی طرح بھی نقصان دہ نہیں ہوتا اور پھر انسان ہی کئی زبانیں سیکھتے ہیں، ایک زبان تو جانوروں ہی کی ہوتی ہے۔

وزیر اعلا کی یہ حق گوئی، یہ بے باکی اور اردو کے بارے میں ان کے یہ گرانقدر خیالات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ان کی حکومت اردو کے لیے واقعی مخلص ہے اور اردو کو وہ مقام دے کر رہے گی، جس کی وہ مستحق ہے۔

● اپریل کی ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ تاریخ کو لکھنؤ میں ایک اور انتہائی اہم کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ تھی دوسری کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس۔ اس میں فراق گورکھپوری، مالک رام، آنند نرائن ملا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے قدآور اہل قلم اور دانشوروں کے ساتھ ہی ساتھ تمام ہندستان سے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ سابق مرکزی وزیر شری اندر کمار گجرال، وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ، وزیر اعلا بہار ڈاکٹر جگن ناتھ مسرا، وزیر اطلاعات و قومی یکجہتی (اتر پردیش) ڈاکٹر عمار رضوی اور وزیر اطلاعات بہار شری شاکل نبی بھی خاص طور سے اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے کانفرنس کو خطاب بھی کیا۔ فراق صاحب نے شدید علالت کے باعث اپنی معذوری کے باوجود کانفرنس میں "ہم اردو کے طرفدار کیوں ہیں؟" کے موضوع پر تقریر بھی کی۔ ان کی تقریر بیک وقت انتہائی بصیرت افروز، عالمانہ بھی تھی اور بہت ہی پرلطف اور طنز سے بھرپور بھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے اس کے جنرل سکریٹری رام لعل صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کانفرنس نے یہ حقیقت ایک بار پھر روز روشن کی طرح عیاں کر دی ہے کہ زبانیں کسی ایک فرقے یا کسی ایک طبقے کی جاگیر نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ اردو بھی کسی ایک فرقے یا کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کی زبان کبھی نہیں رہی اور نہ آج ہے۔ اس کی نشو و نما اور اس کی ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح اردو زبان جتنی مسلمانوں کی ہے، اتنی ہی ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کی بھی ہے۔ یہ زبان بھی فرقوں اور طبقوں کا ایک مشترکہ ورثہ ہے اور اس پر سب کا مساوی حق ہے۔

——— ایڈیٹر

محمد یوسف شاہجہانپوری
معرفت اقبال صدیقی
گوئن روڈ لکھنؤ

پنڈت جواہر لال نہرو

اور

قومی یک جہتی

ہمارا وطن ہندوستان بھی انہی ملکوں میں سے ایک ہے جہاں تہذیب کی شمعیں اوّل اوّل روشن ہوئیں اور جنھیں تہذیب تمدن کا باوا آدم قرار دیا گیا۔

ویسے تو بہت سی تہذیبیں بنیں بگڑیں، ملک سنورے، اجڑے، کچھ گمنام قومیں آندھی اور طوفان کی طرح اٹھیں اور اسی رفتار سے بیٹھ گئیں۔ فطرت کا یہ عمل بلا تفریق سب کے ساتھ ہوا اور آج بھی جاری ہے۔

فطرت کے اس طبعی عمل کے دھارے میں ہندستان بھی بہا اور عروج وزوال کی کئی کہانیوں نے یہاں بھی جنم لیا، افغانستان سے برما تک لاکھوں کیلو میٹر کے طول و عرض میں پھیلی چندر گپت اور اشوک کی وسیع اور عظیم الشان سلطنتیں تاریخ عالم کی مضبوط ترین حکومتیں تھیں۔ لیکن اس عظمت و شوکت کے باوجود ہندستان نے اپنے پڑوسی ممالک کے خلاف کبھی جارحانہ و غاصبانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ امن پسندی کا مظاہرہ کیا اور اس کا ..... ہندستان کو جو لازمی فائدہ پہنچنا چاہیے تھا بہر حال پہنچا۔ اپنے زمانہ کی انتہائی متمدن بابلی، مصری اور یونانی قوموں اور تہذیبوں کا زوال ہو گیا لیکن ہندستان اپنی "جیو اور جینے دو" کی پالیسی کی بدولت دوسرے کے ہاتھوں [illegible] [illegible] تباہ و برباد ہونے سے بچا رہا۔

رشیوں اور منیوں کا یہ دلیش جس کی فضاؤں میں اگر ایک طرف روحانیت کا نور اور .... مہک تھی تو دوسری طرف ہمالہ کی کوکھ سے پھوٹنے والے دریاؤں کی فیاضی نے سارے ملک کو جنت نظیر بنا دیا تھا، خدا کی بخشی ہوئی انہی دولتوں کی کشش نے بہت سی قوموں کو اپنی طرف کھینچا جن میں آریہ اور مسلمان قابل ذکر ہیں اور پھر اس نے آنے والے ہر اجنبی کے دل میں اپنائیت کا اتنا رنگ بھر دیا کہ ان کے مستقبل اسی سے جڑ گئے۔ اس کشادہ قلبی اور اپنائیت کے مظاہرہ کی کوئی دوسری مثال تاریخ عالم میں اگر ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ہندستان کو جس طرح اجنبیوں کو گلے لگانے اور اور اپنا بنانے میں نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے فیاض طبیعت، عظیم مدبر، قومی لیڈر اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان پنڈت جواہر لال نہرو بھی ایک منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ ہندستان کی خاک اور اس کی فضاؤں سے ہم آہنگی اور اپنائیت کا جو رنگ جواہر لال نہرو کی زندگی میں کھلا یقینی اور حتمی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی اور شخصیت میں نظر نہیں آیا۔ سابق وزیر اعظم سری لنکا، مسز سریما وُ بھنڈا نائکے نے پنڈت جی کے انتقال کے موقع پر اپنے تعزیتی پیغام میں اس حقیقت کی

ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہر شعبۂ حیات میں بڑی بڑی ہستیاں ہوئی ہیں لیکن نہرو کی مقناطیسی دنیا میں کسی طرح کم نہیں ہو سکتی ان کی شخصیت جدید ہندستان کی ہر بہترین چیز سے اتنی ہم آہنگ تھی کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ نہرو ہندستان تھے اور ہندستان نہرو، بے نہرو کے ہندستان میں ہونا کتنے دکھ کی بات ہے"۔

قومی یکجہتی اور جواہر لال نہرو

پنڈت نہرو امر ہیں۔ ان کے مادی جسم کو تو آگ نگل گئی۔ لیکن ان کے افکار و نظریات مجاہدانہ و سادہ اور پر امن بقائے باہم کے اعلا اصول و اقدار پر کاربند ان کی زندگی ہندستان اور اس کے تابناک مستقبل کے لیے منارۂ نور ہیں۔ پنڈت نہرو ۴۰ سال کے طویل عرصہ تک ملک میں آباد ہر طبقہ کے جذبات اور اس کے آئینی حقوق کی ترجمانی کرتے رہے، ان میں باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے یا دوسرے الفاظ میں قومی یکجہتی کے کاز کے لیے فرقہ پرست اور فاشسٹ طاقتوں کے خلاف ایک سپاہی کی طرح جنگ کرتے رہے۔ ان کی شاندار قیادت میں جہاں ہندستان کو آزادی ملی اور آزاد دنیا میں اس کو ایک باوقار مقام نصیب ہوا۔ وہیں یہاں آباد اقلیتوں کو ان کے قومی اتحاد کے پیغام سے بڑا سہارا ملا، تقسیم کے موقع پر جب فرقہ پرست طاقتوں نے اقلیت کے خلاف بربریت کا ننگا ناچ ناچا تھا اس وقت پنڈت نہرو ہی وہ واحد شخص تھے جو مسلم رہنماؤں کے ساتھ دہلی کی دہکتی آگ میں بے خطر کود پڑے تھے۔ اس غیر متوقع لیکن بھیانک خونیں ڈرامہ کے بعد انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ملک میں جب تک بھائی چارہ، میل محبت، اور قومی یکجہتی کی فضا قائم نہیں ہوگی نہ ملک کو امن و استحکام نصیب ہو سکتا ہے اور نہ ہی دنیا میں وہ باعزت مقام پا سکتا ہے۔

پنڈت نہرو اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ یہی روشنی ہے جس کے سہارے آج عوام قومی یکجہتی کی طرف گامزن ہیں۔ ان کے درمیان جو خلیج تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔

جواہر لال نہرو کا سیکولرازم

ہندستان بہت سے مذاہب و نظریات کے ماننے والوں کا دیش ہے اور شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جس کے ماننے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز نہ ہو اور یہ تعداد نمائشی نہیں ہے۔ یہاں کے باشندے آج بھی دنیا کے اور خطوں سے زیادہ مذہبی ہیں۔ اس حالت میں ملک کو پنڈت نہرو جیسے سیکولر رہنما کا مل جانا خدا کی خاص مہربانی اور ملک کی خوش قسمتی ہی ہے۔ ورنہ آزادی کے بعد اس ملک کا نہ جانے کیا نقشہ ہوتا۔

ملک کے لوگوں میں قومی ایکتا پیدا کرنے پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا اس کے باوجود کہ وہ مذہبی آدمی نہیں تھے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق ان کے جو نظریات تھے اس کا اظہار انھوں نے اپنی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے نام ایک خط میں اس طرح کیا تھا:

"حضرت رسول صلعم کے زمانہ میں عربوں میں وہ عجیب و غریب طاقت اور زندگی تھی جس کا بادشاہوں کی فوجیں بھی مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ جب وقت وہ آندھی کی طرح اٹھتے تھے اور طوفان کی طرح بڑھتے تھے تو بڑے بڑے بادشاہوں اور لشکروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔"

جواہر لال نہرو قومی یکجہتی کے جذبہ سے ہمیشہ سرشار رہے۔ سیکولرازم کا نظریہ ان کی رگ رگ میں پیوست ہو گیا تھا۔ یہ ان کی رواداری اور امن عالم کے لیے ان کی جد و جہد کا ہی نتیجہ تھا کہ جب وہ پہلی بار عرب ممالک کے خیرسگالی دورہ پر گئے تو "پیغمبر امن" کی حیثیت سے ان کا زبردست استقبال کیا

کیا گیا ــــــ

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ انھوں نے اپنے دامنِ دل کو بلا کسی ادنیٰ امتیاز و تفریق کے سب کے لیے پھیلائے رکھا تھا اور پھر ان کے دل کی دنیا اتنی وسیع و کشادہ ہو گئی تھی کہ سارے عالم کا درد اس میں سمٹ کر آ گیا تھا۔

مصر کے جمال عبدالناصر نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ مصری عوام، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں کے سچے ہمدرد تھے۔ ان کی زندگی ایک مشعل تھی جس نے ہندستان، ایشیا اور ساری دنیا کو روشنی بخشی ــــــ پنڈت نہرو ایک عظیم مفکر، رہنما، اور اس سے بھی زیادہ ایک عظیم انسان تھے۔ مجھے ان کی دوستی پر ہمیشہ ناز رہا ان کی وفات درحقیقت ساری انسانیت کا نقصان ہے۔"

★

اپنے معاونین سے

- غزلوں کی ایک کثیر تعداد یہاں منتظر اشاعت ہے۔ اس لیے فی الحال غزلیں بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

غیر طلبیدہ تخلیقات کے ساتھ ٹکٹ چسپاں لفافہ ضرور ارسال فرمائیں

یا

اپنی تخلیق اور مضمون کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

ــــ ادارہ

غزل

ڈاکٹر شیو گوپال مغموم
۳۱۴۴ - سیکٹر ۲۰ - ڈی،
چنڈی گڑھ یو ٹی

کس کو دکھائیں زخم جو سینے پہ آئے ہیں
جتنے بھی زخم کھائے ہیں اپنوں سے کھائے ہیں

اے حسن! اک تبسمِ شیریں سے ہو قبول
سوغات آنسوؤں کی جو ہم لے کے آئے ہیں

مڑ مڑ کے دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں
جب منزلِ شباب کو ہم چھوڑ آئے ہیں

جس نے بھی گل بچھائے ہیں دنیا کی راہ میں
دنیا نے اس کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں

خوشیوں کی نرم دھوپ کا آنچل کہیں نہیں
آہوں کا ہے دھواں تو کہیں غم کے سائے ہیں

برسوں ہوئے کہ جانبِ منزل چلے تھے ہم
منزل کہاں کی؟ راہ بھی ہم بھول آئے ہیں

نفرت کی آندھیوں میں بھی ہم نے ہزار بار
ہر رہ گزر پہ پیار کے دیپک جلائے ہیں

دار و رسن کی سمت بڑھے سینہ تان کر
ہم وہ نہیں کہ جن کے قدم ڈگمگائے ہیں

انسانیت کے نام پہ دھبّا لگا دیا
ہمسائگی میں ہم نے کئی گھر جلائے ہیں

گہرا ہوا ہے اور بھی احساسِ بے بسی
اللہ! کس جگہ ہمیں حالات لائے ہیں

مایوسیوں کے دور میں مغموم اک ہمیں
عزم و یقیں کا آج بھی پرچم اٹھائے ہیں

مدّ و جزرِ حیات

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
یونیورسٹی روڈ، لکھنؤ

زندگی اتنی تو کم زور ہے، کیا اس پہ غرور
گر سہارے نہ ملیں کیسے یہ پروان چڑھے
ماں کے آغوش میں یا باپ کے کاندھے لگ کر
بچپنا عہدِ جوانی میں پہنچ جاتا ہے
زور بازو میں جو آیا تو خودی جاگ اٹھی
ذہن پر چھانے لگی اپنی انا کی مستی
آسمانوں پہ پہنچنے لگے شاہین و عقاب
ذرّے میں نشۂ خورشیدِ درخشاں آیا
دلِ ہر قطرۂ ناچیز میں طوفاں آیا
یہ خودی اتنی بڑھی خود کو خدا کہنے لگے
نشہ کے زور میں ہم جانے کیا کہنے لگے

بعد ہر مد کے مگر جزر ہوا کرتا ہے
یعنی ہر نشہ میں ہوتا ہے خمار آخر کار
منزلِ شیب میں رکھتا ہے قدم اپنا شباب
حوصلے پست، قدم سست، نگاہیں کمزور
اب وہ نہ شوق تماشا ہے نہ وہ ذوقِ نظر
ذہن سے چھٹنے لگی اپنی انا کی بے خودی
آسمانوں سے اترنے لگے شاہین و عقاب
دوشِ احباب پہ آخر تنِ بے جاں آیا
سامنے مرحلۂ گورِ غریباں آیا
اب کہو پہلے تو کیا جانیے کیا کہتے تھے!
کیا اسی دن کے لیے خود کو خدا کہتے تھے؟

رام لعل
شانتی نکیتن۔ ڈی۔ ۲۲۹
رام ساگر کالونی فیض آباد روڈ لکھنؤ

قومی و لسانی یک جہتی

اور

غیر مسلم اردو مصنّفین کانفرنس

یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ایک شام کو میں ڈاکٹر گیان چند ...... کے گھر پر بھوپال میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ حمیدیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے صدر تھے، ہمارے درمیان اردو زبان کا مسئلہ زیر بحث تھا کہ اس پر ... لغت کے جو عیب سامنے محیط ہیں انھیں کیسے دور کیا جائے۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ آزادی کے بعد اسے ملکی تقسیم کے ساتھ جوڑ دیا گیا اگرچہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور یہ عوام کا صدیوں کا تاریخی اور سماجی ورثہ ہوتا ہے۔ بعض اردو مخالفوں کا یہ کہنا ہے کہ اردو نے تقسیم ملک میں ایک اہم کردار نبھایا ہے سراسر غلط ہے اور غیر منطقی معلوم ہوتا ہے۔ ملک کی سیاسی تقسیم میں صرف اردو بولنے والوں ہی نے حصہ نہیں لیا تھا ان میں ملیالم، تلگو، کنڑ، بنگالی، اڑیہ، آسامی، مراٹھی، اور پنجابی بولنے والے بھی شامل تھے۔ اگر کسی زبان کو ہی مورد الزام ٹھہرانا مقصود ہے تو صرف اردو ہی کو نشانہ کیوں بنایا جائے، دوسری زبانوں کو کیوں نہیں؟

اتفاق سے مندرجہ بالا سرزمین میں اپنا تخلیقی اظہار کرنے والوں میں ہر فرقے کے لوگ شامل رہے ہیں اور کسی ایک فرقے کے بل بوتے پر کسی بھی زبان کے ادب کی تاریخ مکمل اور معیاری نہیں ترتیب دی جا سکتی۔ یہی کیفیت اردو، ہندی زبانوں کی بھی ہے لیکن صرف اردو کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلانا کہ یہ صرف ایک طبقے کی زبان ہے اور یہی ملک کی تقسیم کی واحد ذمہ دار ہے۔ بہت ہی افسوسناک اور غیر دانشمندانہ فعل ہے۔

اردو کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانے کے ہر ممکنہ اقدام کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک ڈاکٹر گیان چند نے فرمایا کہ اگر کسی مخصوص کانفرنس میں جس میں صرف ہندو، سکھ، اور عیسائی ادیب، شاعر اور صحافی جمع ہو کر اردو کے حق میں آواز بلند کریں تو شاید اردو مخالف فضا کچھ بدل جائے گی۔ اس اجتماع سے کم سے کم غیر مسلم طبقے کو یہ احساس تو دلایا جا سکے گا کہ غیر مسلم مصنفین کا بھی ایک بڑا طبقہ اردو کے ساتھ ہے۔

میں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لکھنؤ پہنچ کر چند خطوط رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، پنڈت آنند نرائن ملا اور کرشن چندر کے علاوہ سجاد ظہیر، سید احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور کو بھی لکھے تاکہ ان سب بزرگوں کی رائے معلوم ہو جائے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ چند ہی روز کے بعد سوائے کرشن چندر کے سب کے جواب آ گئے اور سب نے اس خیال کی تائید کی کہ اس قسم کی کانفرنس ضرور ہونی چاہیے۔

ہندو ادیبوں کے ساتھ ساتھ مسلم ادیبوں کی رائے بھی معلوم کر لینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ پیدا ہو۔ چونکہ مقصد واضح تھا اس لیے انھوں نے اس بات پر بھی

زور دیا کہ یہ اجتماع اس حد تک ضرور نمائندہ ہو کہ اس میں زیادہ سے زیادہ غیر مسلم دانشور شرکت کر سکیں۔

پنڈت آنند نارائن ملا کی خواہش تھی کہ اس قسم کا اجتماع دہلی میں ہو تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ وہاں پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی کسی حیثیت سے شریک کر لینا آسان ہوگا اور انھوں نے خود دہلی میں ایسی کانفرنس منعقد کرانے کی ذمہ داری بھی لے لی لیکن گیارہ سال گزر جانے کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اسی دوران۔۔۔ پنڈت نہرو وفات پا گئے جن سے ہم اردو والے بہت کچھ امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔

۱۹۷۰ء میں اسی کانفرنس کا خیال میرے ذہن میں پھر جاگا جس کی ابتدائی شکل ایک سمینار کی تھی اور اس میں آٹھ دس ہی گنے چنے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے کا ارادہ تھا۔ میں نے یہ خیال آل انڈیا میر اکاڈمی کے صدر مقبول احمد لاری صاحب کے سامنے رکھا تو انھوں نے اس کی تائید تو فوراً کر دی لیکن مشورہ دیا کہ اس تعداد کو اور بڑھانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایک سو کے قریب غیر مسلم دانشوروں کو یکم مئی کو ایک گشتی سرکلر جاری کر دیا اور ان کے جواب کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

مئی کے وسط تک دو درجن کے قریب ادیبوں نے جواب بھجوا دیا اور کانفرنس میں اپنی شرکت کی منظوری بھجوا دی۔ اس وقت یہ کانفرنس ۲ر اکتوبر کو کرنے کا خیال تھا۔ بعد میں جب اور جوابات آ گئے اور یہ بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں دورہ کر کے منطقائی کونسلیں قائم کر دی جائیں تو کانفرنس کے انعقاد کی قطعی تاریخیں ۱۰ر اور ۱۱ر نومبر کی مقرر کر لی گئیں۔

جب کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں شرکت کرنے کے لیے ایک بڑی تعداد میں ادیب، شاعر اور صحافی آ گئے۔ مثلاً پنڈت آنند نارائن ملا، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، کرشن چندر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، بالمکند عرش ملسیانی، ڈاکٹر نریش، پنڈت میلا رام وفا، ملراج کومل، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رودا کر داسی، پریم کمار نظر، آزاد گلاٹی، ساحر ہوشیارپوری، ستیش بترا وغیرہ کے علاوہ

بطور مشاہدین پروفیسر آل احمد سرور، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، شمس الرحمٰن فاروقی، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر ظ انصاری، سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کی تعداد ایک سو چوراسی تھی۔ مقامی طور پر شریک ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ پانچ سو سے زائد اردو دوست موجود تھے۔

راجندر سنگھ بیدی، دیوان سنگھ مفتون، جمنا داس اختر، خوشتر گرامی، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، راما نند ساگر وغیرہ بھی اس کانفرنس کے حامی تھے لیکن وہ کسی نہ کسی وجہ سے پہنچ نہ سکے۔ دیوان سنگھ مفتون نے اپنی علالت کی وجہ سے شرکت سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور ان کا کانفرنس سے کچھ ہی روز پہلے انتقال بھی ہو گیا تھا۔ سید احتشام حسین اور سجاد ظہیر بھی کانفرنس سے چند ماہ پہلے چل بسے تھے۔

اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی اردو کی صحافتی دنیا میں ایک گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ، سیاست جدید کانپور، سیاست حیدرآباد، انقلاب بمبئی، آزاد ہند کلکتہ وغیرہ کے علاوہ ہفت روزہ بلٹز بمبئی، ہماری زبان، علی گڑھ، حیات، دہلی وغیرہ میں نہ صرف مسلسل خبریں چھپتی رہیں بلکہ ان اخبارات نے مضامین اور اداریے بھی چھاپے۔ انگریزی اور ہندی کے پریس نے بھی کانفرنس کے مقاصد میں خاصی دلچسپی دکھائی۔ جس میں موافقت اور مخالفت کے دونوں پہلو موجود تھے۔ چونکہ اردو کی لسانی تاریخ میں پہلی بار غیر مسلموں کا اتنا بڑا اجتماع ہوا تھا اس لیے اس نے سیاسی اور سماجی ہر حلقے کو یہ سوچنے پر راغب کر لیا کہ زبانیں داخلی کسی خاص فرقے کی نہیں بلکہ عوام کی ہوتی ہیں اور اب تک اردو کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے اس پر از سر نو غور کیا جانا چاہیے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کانفرنس کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے جو اپنا پیغام بھیجا تھا اس میں یہ بھی کہا تھا:

"ہندوستان کی کوئی بھی بڑی زبان کسی ایک فرقے کی زبان نہیں ہے۔ اور اردو ہمارے عوام کی ایک مشترکہ دولت ہے —— یہ معلوم کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے کہ یہ کانفرنس جو لکھنؤ میں ہو رہی ہے مختلف مذاہب اور مختلف علاقوں کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو اردو کے بارے میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ اور وہ سب ادیب اردو کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلق کو واضح کر دیں گے۔"

پہلی کانفرنس کی کامیابی کے بعد اردو کے حق میں جو فضا ہموار ہو گئی تھی اس کے دیکھتے ہوئے دوبارہ اس قسم کی کانفرنس کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن حکومت بہار نے جب نومبر ۱۹۸۰ء میں عام انتخاب کے موقع پر جاری کیے گئے اپنے مینی فسٹو میں کیے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے ایک آرڈی نینس جاری کر کے وہاں کے بعض اضلاع اور بستیوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا اور وہاں کے کچھ شہروں میں بعض اردو مخالف لوگوں نے لسانی فسادات برپا کیے تو ہمیں اپنے صوبہ اتر پردیش میں بھی اردو کے حق میں ہموار ہوئی ہوئی فضا کے بارے میں ایک خطرہ سا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اس موقع پر نہ صرف صوبہ بہار کے مذکورہ بالا لسانی فسادات کی مذمت کی بلکہ یہاں قومی اور لسانی یک جہتی کا ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۸۰ء میں ہی آئندہ سال دوسری کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہمارے اس اقدام کا خاص مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو اکثریتی طبقے کے بعض لوگوں کی ذہنی تربیت کرنے کی کوشش کریں کہ زبانیں اپنے تاریخی اور سماجی حالات کی صدیوں کی کروٹوں کی کوکھ میں سے جنم لیتی ہیں۔ ان کو کسی ایک فرقے یا مذہب سے جوڑنا اپنی زبان اور ثقافت کی جڑوں پر نہ صرف کلہاڑی چلانے کے مترادف ہوگا۔ بلکہ اردو جیسی جدید متحرک اور سیکولر زبان میں جو ہر فرقے اور مذہب کا کثیر تعداد میں مذہبی، ادبی اور سیاسی سرمایہ موجود ہے اور اس کے فروغ میں آزادی کے بعد بھی جو بیش قیمت کام ہوا ہے۔ اس سے کسی طرح روگردانی نہیں کی جانی چاہیئے۔ دوسری طرف ہمیں مسلم طبقے کے ان افراد کو بھی یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ وہ اردو کو جذباتی طور پر صرف اپنی زبان کہنے سے احتراز کیا کریں کیونکہ ان کے اس سلسلے کے قول و فعل سے اکثریتی طبقے کے ان لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اردو کو نہ صرف تقسیم ملک کے اسباب سے بلکہ اقلیتی گروہ کے ساتھ بھی جوڑ کر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۸۱ء میں ۱۸ اپریل سے ۲۰ اپریل تک ہماری دوسری کانفرنس کا بھی ملک بھر کے قومی اخبارات نے ایک بار پھر اسی طرح کا خیر مقدم کیا جس طرح انھوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا۔ اس موقع پر ہمارے بعض ساتھی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے تھے جن میں ہیمندر ناتھ، کرشن چندر، پنڈت میلا رام وفا، بالمکند عرش ملسیانی، ساحر لدھیانوی اور روی شنکر کے نام قابل ذکر ہیں۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو ان کی شدید علالت کے باوجود ان کی اردو سے محبت اور ان کے بصد اصرار پر الہ آباد سے لکھنؤ لے آیا گیا۔ شاید ان کی شخصیت کی تکمیل دوسری کانفرنس میں شرکت سے ہی ہو سکتی تھی۔ جس کا اظہار انھوں نے ۲۰ اپریل کے کھلے اجلاس "ہم اردو کے طرفدار کیوں ہیں" کا افتتاح کرتے ہوئے واضح طور پر کیا —— اس کانفرنس میں مالک رام، پنڈت آنند نارائن ملا، اندر کمار گجرال، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حکم چند نیر، جمنا داس اختر، ڈاکٹر نریش، بلدیو متر بجلی، پنڈت امر چند قیس جالندھری، مہر لال سونی ضیا فتح آبادی، راج بہادر گوڑ، آچاریہ دھریندر ناتھ، ٹھاکر پرشاد سنگھ، دویا

[illegible] مسعود رضوی، کملیش متر، گنپت سہائے سریواستو، [illegible] دہلوی، ڈی۔ اے ہیرسین قربان، راج شرما، ہیرانند سوز، شیام کرشن نگم، شردن کمار ورما، آنند رومانی، اینا موئل، جوزف اکور، جوج جینیوئی، جگدیش بھٹناگر حیات، راجیندر بہادر موج، ہرچرن چاولہ، کملیش مصرا، ڈاکٹر کے متنا منظر، کیمپ تیر، ڈاکٹر بشیر بدر، پردیپ وغیرہ کے علاوہ حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، پروفیسر محمود الٰہی، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر شبیہ الحسن، سید سبط رضی ممبر راجیہ سبھا، بیگم حامدہ حبیب اللہ ممبر راجیہ سبھا، قاضی جلیل عباسی، ممبر پارلیمنٹ، عابدی الہ آبادی، ایم۔ ایل۔ اے، ساغر نظامی۔ مقبول احمد لاری، پرنس انجم قدر، عمر انصاری، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر تنویر مسعود، ڈاکٹر محمد رضوان علوی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر ولی الحق انصاری، شفیع جاوید، رفعت سروش، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شاہ مشتاق احمد، رئیس نجمی، رضوان احمد، ساحل احمد، سید اطہر حسین، صباح الدین عمر۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی، ڈاکٹر عبد المغنی، احمد ابراہیم علوی وغیرہ کے علاوہ سینکڑوں اہم ترین مقامی ادبی و سماجی شخصیات، موجود تھیں جن میں سے بیشتر نے کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں تقریریں کیں ۔ اردو کے اس سیکولر کردار کو نہ صرف واضح کیا بلکہ اسے ثابت بھی کیا جس مقصد کے تکمیل کے لیے یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔

اس عظیم اجتماع میں ہندو مسلم اور سکھ، عیسائی ہر فرقے کے اہل قلم اور اردو دوستوں کی موجودگی نے قومی یک جہتی کے اس تصور کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر صحیح تصویر پیش کی تھی۔ جو ہمارے ملک ہندوستان کی جمہوری روایات کا نصب العین ہے۔

مقام مسرت ہے اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ناروے سے ہرچرن چاولہ، کویت سے ایم۔ اے۔ نجمی اور باقی احمد پوری، پاکستان سے محمد ممتاز انصاری اور امریکہ سے ہر مہندر سنگھ گگن نے دور دراز کے سفر کرنے کی زحمت گوارہ کی۔

اس کانفرنس کی ایک اور اہم خصوصیت صوبہ اتر پردیش و صوبہ بہار کے وزرا اعلا وشو ناتھ پرتاپ سنگھ اور ڈاکٹر جگن ناتھ مصرا کے علاوہ ڈاکٹر عمار رضوی وزیر اطلاعات و قومی یک جہتی یوپی اور شمائل نبی ریاستی وزیر اطلاعات بہار کی شرکت تھی۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں کانفرنس کے مندوبین، اور مشاہدین کو یقین دلایا کہ ان کی حکومتیں اردو کے لیے جو اقدام کر رہی ہیں وہ اردو پر احسان نہیں ہے بلکہ یہ اردو کا حق ہے جو اسے اگرچہ خاصی دیر سے لیکن دیا جا رہا ہے۔ ان سارے سیاسی رہنماؤں اور ہر فرقے کے دانشوروں کے اظہار خیال سے اردو کے قومی کردار کی توثیق ہوئی اور یہ اعتماد بحال ہوا کہ اردو کو اس کے جمہوری اور قومی حقوق بہت جلد دیئے جائیں گے۔

★

عابد کرہانی
عظمت منزل ۲۵ بنجاری ٹولہ
وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

وہ عہدِ نو کا آفتاب

(پنڈت نہرو کی یاد میں)

وہ امن کا پیامبر
وہ روشنی کا راہبر
ہزار شعلیں جلا کے راہ میں
گزر گیا

وہ شعلیں کہ جن سے جگمگا رہے ہیں بام و در
ہیں نور بیز دل تمام خیرہ کن نظر نظر
وہ شب، وہ ظلمتوں کی شب
(ہمیں وہ اب بھی یاد ہے)
سحر کا نام بھی زباں پہ لانا جب حرام تھا
زباں زباں غلام تھی، قدم قدم غلام تھا
اسی اندھیری رات میں
عرصۂ حیات میں
اٹھا وہ وقت کا شہاب
جو اک عقاب کی طرح جھپٹ پڑا
سیاہ قوتوں پہ آسمانِ قہر پھٹ پڑا

وہی شہاب
عہدِ نو کا آفتاب
جو ملک اور عوام کی حیاتِ نو کے واسطے
کرن کرن لٹا گیا، ابد کی نیند سو گیا
مگر جو ظلمتوں کو دفن کر گیا، ڈبو گیا

صداقتوں کا سنگِ میل
محبتوں کی سلسبیل
اصول جس کا پنچ شیل
وہ امن کا پیامبر، وہ روشنی کا راہبر
ہزار شعلیں جلا کے راہ میں گزر گیا
وہ شعلیں کہ جن سے جگمگا رہے ہیں بام و در
ہیں نور بیز دل تمام، خیرہ کن نظر نظر

ڈاکٹر اکبر حیدری
۲۳۸ نرسنگھ گڑھ سری نگر کشمیر

مرزا غالب کے ایک شاگرد

منشی بالمکند بے صبر

ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب تذکرہ "آثار الشعرائے ہنود" (مولفہ منشی دیبی پرشاد بشاش، بہار سخن (بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری) اور لالہ سری رام (خمخانہ جاوید) کے حوالہ سے منشی بال مکند بے صبر سکندر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"بے صبر۔ ان کے والد رائے کاہنہ سنگھ دکانجی مل۔ (خمخانہ جاوید) قوم بھٹناگر کایستھ تھے۔ یہ بھی سکندر آباد کے رہنے والے تھے جہاں کے تفتہ تھے۔ اور غالباً ان سے کچھ عزیز داری بھی تھی۔ بہت صغر سنی میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ چندے تفتہ سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ غالباً فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ منطق اور نجوم میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ ان کے بہت شاگرد تھے۔ جن میں بنواری لال شعلہ زیادہ مشہور ہوئے۔ مدتوں تک سرکار انگریزی میں محکمۂ مال میں منشی گری اور داروغگی کے عہدوں پر متمکن رہے۔ اسی سلسلے میں دہلی میں سکونت کا اتفاق ہوا۔ اور یوں غالب سے ملنے کی تقریب پیدا ہو گئی۔ ستر برس کی عمر تھی جب ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ دیوان اور ایک مثنوی "لخت جگر" مطبوعہ موجود ہے۔ مثنوی میں ۲۵۰۰ شعر ہوں گے۔ ایک دوسری مثنوی "انگیز عشق" غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ ۱۲۸۳ھ ہجری میں لکھی گئی تھی۔ "لالۂ پر داغ" تاریخ ہے۔" [تلامذۂ غالب ص ۵۰]

ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں بے صبر کا ایک رسالہ مسمّی بہ بدیع البدایع زیر نمبر ۳۹ محفوظ ہے۔ اس کی تقطیع ۶ × ۱۰ ہے اور ایک صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۴۲ء بکرمی مطابق اگست ۱۸۸۵ء میں چھپا تھا۔ صفحہ ۲ میں "سوانح عمری مصنف" کے عنوان کے تحت بے صبر کے چھوٹے صاحبزادے برہما سروپ نے بے صبر کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ ذیل میں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

منشی بال مکند نام بے صبر تخلص، قصبہ سکندر آباد ضلع بلند شہر میں ۱۸۱۰ء مطابق ۱۸۶۹ء بکرمی میں پیدا ہوئے۔ رسالہ کے صفحہ ۴ میں ذیل کے عنوان کے تحت بے صبر کی تاریخ ولادت درج ہے۔

"قطعۂ تاریخ ولادت شاعر بے بدل عدیم المثل جناب منشی بال مکند صاحب بے صبر تخلص، سکندر آبادی، مصنف رسالۂ ہذا از نتائج طبع مصنف منتخب از دیوان اوّل مصنف موصوف"

مرا سال ولادت ہندی میں   جو کوئی بصورت معنی بیان دے
تو کر دے قافیہ کو دو تا با کھ   ہزار و ہشت صد شصت و نہ آوے

۱۸۶۹ بکرمی (مطابق ۱۸۱۰ء)

بے صبر بچپن سے ہی بڑے ہونہار اور ہوشیار تھے۔ انھوں نے ذہن رسا اور فہم ذکا کی وجہ سے سولہ برس کی عمر میں فارسی اور عربی میں بڑی مہارت حاصل کرلی تھی۔ وہ علوم ریاضی و نجوم، ہئیت، منطق، ویدانت اور تصوف میں بھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ ان کے ماموں تھے۔ اس لیے ان کی صحبت سے شعر و شاعری کا شوق دامن گیر ہوا۔ آخرکار مرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں زانوے ادب تہہ کیا۔ غالب کے تمام ہندو شاگردوں میں بے صبر کثیر التعداد تصانیف کے مصنف ہیں۔

مرزا غالب بے صبر کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ یہ اصلاحیں پریم ترائن بھٹناگر کے پاس تھیں بعد میں مولوی مہیش پرشاد نے ان سے حاصل کیں۔ ان کا ارادہ ان اصلاحوں کو خطوط غالب کی دوسری جلد میں شامل کرنا تھا۔ یہ جلد ابھی تک نہیں چھپی ہے۔

مرزا غالب اور بے صبر میں خط و کتابت بھی جاری تھی۔ اس کا ذکر مرزا نے اپنے خطوط میں بھی اکثر مقامات پر کیا ہے۔ تفتہ کے نام مورخہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:—

"ہاں صاحب! منشی بال مکند بے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر قرض ہے۔ میں کیا کروں؟ اس خط میں انہوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ پس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا۔ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہہ دینا"۔

بے صبر نے غالب کی مدح میں قصیدہ بھی کہا تھا۔ اور اس کا نام "قصیدہ پرکالۂ آتش" رکھا تھا ذیل کے شعر قابل ذکر ہیں:

جس کا غالب ہے تخلص اسد اللہ نام ہے
یہ تو ہے کفر جو کہے کہ ہے یزداں میرا

پیر ہے ہادی مرا رہبر مرا استاد مرا
قبلہ ہے کعبہ ہے دیں میرا ہے ایماں میرا

مجھ کو گویا ہے حدیث اس کا ہے جو اردو کلام
فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآں میرا

انوری ہے میرا، اور وہ ہے مرا خاقانی
آگرہ ہند ہے اور دلی ہے شروان میرا

در عرفی و شفائی پہ جبیں سا نہیں میں
کعبہ شیراز ہے نے قبلہ صفاہاں میرا

نام "پرکالۂ آتش" ہے قصیدے کا مرے
کردہ بے صبر ہے سوزِ دلِ سوزاں میرا

غالب ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۸۶۹ء میں مرے۔ تو بے صبر نے فارسی اور اردو میں ہجری اور عیسوی میں تاریخیں کہیں

ہماں میرزا غالب استادِ من	بجاں آفریں جاں چو آخر سپرد
بپرسیدم از دل سنِ رحلتش	بنالید و گفت "آہ غالب بمرد"

۱۲۸۵ھ

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ	جس سے اہل کلام تھے مغلوب
جب سدھارے بسوئے خلد ہوئے	سخن ان کے کلام میں سینہ کوب
اس سپہر سخن کے اختر کا	مجھکو سال غروب تھا مطلوب

کہا علیمی نے از سر حسرت
ہوا حیف آفتاب ہند غروب

۱۸۶۹ء = ۱۸۶۱ + ۸

بے صبر ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اور ۵۵ برس کی طویل مدت تک شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کا انتقال شیو راتری کے دن ۸۰ سال کی عمر میں ۳ فروری ۱۸۸۵ء (مطابق ۱۹۴۱ بکرمی) کو میرٹھ میں ہوا۔ بدیع البدایع صفحہ ۴۴ میں ان کے بڑے صاحبزادے کرشن چند سرور تخلص فیر نے ذیل کا قطعۂ تاریخ کہا۔ ہر شعر کے مصرعہ اول کے پہلے حرف سے بحساب ابجد جمع کرنے سے مدت عمر ظاہر ہوتی ہے۔

"قطعۂ تاریخ وفات قبلہ و کعبہ والد بزرگوار جناب

منشی بال مکند صاحب بے صبر تخلص سکندر آبادی از
تاریخ طبع منشی کرشن چند رسروپ صاحب منیر تخلص
مہین پور مصنف رسالہ ہذا

۱ بیصبر چوں ز عالم فانی بخلد رفت
عالم بچشم اہل بصیرت سیاہ شد

۲ بازم مپرس حالِ دلِ بے قرار من
دور از سرم چو سایۂ آں قبلہ گاہ شد

۳ اے سایۂ سعادت ازلی کجا شدی
باز آکہ حال منشیانت تباہ شد

۴ یا رب بگو کہ تا چہ کند دیدہ زمن
اے دیدہ ام بخاک رہت فرش راہ شد

۵ سال وفات تو زکہ پرسم کہ بعد تو
ایں سلسلہ گسستہ چو متروک راہ شد

۶ چوں فکر سال تا خنم اندر جگر خلید
از بین و برگشت سوئے علیم نگاہ شد

۷ ہاتف بگفت ترک ز دو کردہ بسال ہند
بستہ دُرِ سخن جو فنانی الله شد

(۲) ۱۹ بکرمی

اعداد حرف اولین ابیات کن شمار
سن شریف داں کہ چہ شام و پگاہ شد

تعداد عمر - ۲ + ۲ + ۱ + ۲ + ۶۰ + ۳ + ۵ =
۷۵ سال

رسالۂ ہذا سے معلوم ہوتا ہے کہ بے صبر کے چار بیٹے تھے۔
(۱) کرشن چند رسروپ تخلص منیر (۲) برہما سروپ (۳) ہر سروپ
چوتھے کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ وہ ۱۲۵۰ھ ہجری مطابق
۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بے صبر نے تاریخ ولادت
کہی تھی۔

فرزند چارمی چو بمن داد کردگار
ہر دم ز دیدنش دل من شاد می شود
بے صبر چوں بظاہری و معنوی بجست
سال ہزار و دو صد و ہفتاد می شود

۱۲۷۰ ہجری

بے صبر کا تیسرا لڑکا ۱۲۴۸ھ ہجری مطابق ۱۸۳۲ء
میں پیدا ہوا۔ نام ہر سروپ اور تاریخ ولادت یہ ہے
ہوا جو طفل تولد بساعت مسعود   بلند بخت مبارک قدم خجستہ بقا
جب اس سے سال ولادت طلب کیا بے صبر   تو مجھ سے دل نے کہا "نونہال باغ بقا"۔

۱۲۴۸ ہجری

ہر سروپ کا انتقال عالم شباب میں ۱۲۷۹ھ ہجری (۱۸۶۲ء)
ہوا۔ بے صبر نے تاریخ وفات کہی ہے

مر گیا جب جوان لڑکا ہمارا ہر سروپ
ہر طرف تھا اس کے غم میں شور و غوغائے ہائے
سال تاریخ وفات اس کا دلِ بے صبر نے
پیٹ کر سر کو کہا ہے "ہے زریغا دلے وائے"

عرش ملسیانی نے غلطی سے بے صبر کے بڑے صاحبزادے
کی تاریخ ولادت ۱۲۶۰ھ ہجری لکھی ہے۔ پہلے اور دوسرے
بیٹے کی ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔

بدیع البدایع کے آخر میں غلط نامہ چھپا ہے۔ اس کے
صفحہ ۴ کی پشت پر مالکان مطبع دبیر ہند بلند شہر کی
طرف سے ایک اشتہار چھپا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے صبر
کے مرنے کے بعد صرف دو لڑکے کرشن چند رسروپ اور
برہما سروپ زندہ تھے۔ اور یہی دونوں بھائی ان کے وارث
تھے۔ اشتہار ذیل میں درج کیا جاتا ہے

"اشتہار"

"جو کہ ہم نے اجازت طبع رسالہ ہذا کی منشی برہما سروپ
و منشی کرشن چند رسروپ وارثان مصنف سے حاصل کی
ہے اور حق تصنیف اس کا مطبع ہذا میں محفوظ ہے۔ لہذا
کوئی صاحب بلا اجازت ہماری قصد چھاپنے کا نہ فرماویں۔"

رسالۂ بدیع البدائع میں بے صبر کی حسب ذیل تصنیفات اس طرح درج ہیں :-

(۱) دیوان اول اردو۔ موسوم بہ دیوان عام۔ اس میں غزلیات، رباعیات، قطعات وغیرہ درج ہیں۔ عنقریب طبع ہوگا۔

(۲) دیوان دوم اردو۔ موسوم بہ دیوان خاص۔ اس میں صرف غزلیات ہیں۔ چھپنے کو باقی ہے

(۳) دیوان فارسی۔ اس میں کل کلام فارسی غزلیات و قطعات و تضمین و دیوان رباعیات ہے۔ چھپنے کو باقی ہے۔

(۴) دیوان قصائد اردو۔ اس میں ۴۵ قصیدے اور ترکیب بند و ترجیع بند درج ہیں۔ چھپنے کو باقی ہے۔

(۵) مثنوی لخت جگر۔ ایک پر فصاحت مثنوی دیدہ ہے نہ شنیدہ چھپ گئی

(۶) مثنوی اخگر عشق۔ در حقیقت یہ مثنوی اسم با مسمیٰ "اخگر" ہے۔ چھپ گئی۔

(۷) سراپا سخن۔ تصنیف بطرز جدید۔ یادگار فرزنداں میں نوحہ و سراپا قابل داد ہے

(۸) رسالہ بدیع البدائع۔ اس میں بیان علم صنائع و بدائع کا ہے۔

(۹) رسالہ ادیب البنات۔ یہ نثر میں ہے اور تہذیب اخلاق اور تعلیم نسواں کے لیے قابل رواج مدارس ہے۔ زیر طبع۔

(۱۰) گلستان ہند نثر۔ اردو میں گلستان سعدی۔ اس میں پانچ باب ہیں۔

کتابوں کی متذکرہ بالا" فہرست اور کیفیات "بے صبر کے چھوٹے صاحبزادے برہما سروپ نے مرتب کی ہے۔ ان میں سے ذیل کی تین کتابیں چھپ گئی تھیں۔ بقیہ کتابیں عنقا ہیں۔ غالباً وہ چھپی نہیں۔ اور اگر چھپ بھی گئی ہوں تو دست برد زمانہ ہو گئیں۔

(۱) مثنوی لخت جگر (۲) مثنوی اخگر عشق (۳) رسالہ بدیع البدائع۔

جناب مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ

"مثنوی اخگر عشق غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ ۱۲۷۳ھ ہجری میں لکھی گئی تھی۔ لالہ پر داغ تاریخ ہے"۔

دراصل مثنوی "اخگر عشق" ۱۲۸۵ھ ہجری میں لکھی گئی تھی۔ رسالہ بدیع البدائع میں بے صبر نے اس کی تاریخ تصنیف یوں کہی ہے

"تاریخ مثنوی اخگر عشق در تعمیہ متخرجہ"

جس کا سن لالہ پر داغ رہا   پردہ لالہ بسر باغ ملا

"سر باغ کے عدد کہ بائے عربی اور اس کے دو عدد ہیں زیادہ کیجے۔ تو ۱۲۸۵ھ ہجری سال مطلوب کے پورے ہو گئے"

جناب مالک رام صاحب بے صبر کی نثر نگاری کے بارے میں خاموش ہیں۔ بے صبر نے اردو نثر میں تین کتابیں لکھی تھیں۔ (۱) رسالہ ادیب البنات (۲) گلستان ہند (۳) رسالہ بدیع البدائع۔ پہلی دو کتابیں نایاب ہیں۔ تیسری کتاب بدیع البدائع" کا ایک نادر الوجود نسخہ راقم کے پیش نظر ہے۔ یہ اردو نثر میں غالباً پہلی مستند کتاب ہے جو صنائع بدائع کے فن میں مصنف نے اپنی مثالوں کے ساتھ سلیس اردو میں مرتب کی ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے :-

رسالہ
مسمّیٰ بہ
بدیع البدائع
علم صنائع بدائع میں   بزبان اردو
واسطے طلبا مدارس و شائقان سخن کے
من تصنیف شاعر باکمال سخن ور شیریں مقال
مقبول بارگاہ لم یزلی جناب منشی بال مکند صاحب بے صبر

سکندرآبادی

حسب منشار اشتہار
نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی
و شمالی
کشور ہند دام اقبالہ
نمبر ۱۹۰۷ الف مورخہ ۳۰ اگست ۱۸۶۸ء مندرجہ
گورنمنٹ گزٹ ۲۶ اگست ۱۸۶۸ء جو بذریعہ ریزولیوشن
نمبر ۱۲۰۷ الف ۱۴ مئی ۱۸۶۸ء کے مشتہر ہوا منعقدہ ۱۸۶۸ء
مطبع دبیر ہند بلند شہر میں طبع ہوا

بے صبر کو اس کتاب کی تصنیف پر بڑا فخر تھا۔ اور اس بات کے متمنی تھے کہ اس سے ان کا نام ہمیشہ کے لیے رہے گا۔ چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں کہتے ہیں :—

"شکر خدا کا اور احسان کہ یہ نوبادہ گلستانِ افطار اور نونہال بوستان اسرار آبیاری یزدانی اور آبیاری سحاب مکرمت سبحانی کے گل زمینِ دل اور خیابان طبع سے نشو ونما آب و رنگ کی پاکر پھول مراد اور پھول آرزو کے لایا۔ الٰہی اس کو تند بادِ خزاں انقلاب دوراں سے بیچ سایہ ابرِ کرم اپنے کے سرسبز اور شاداب اور دامنِ بہارِ فضل اپنی میں پر بار و پر آب رکھے۔ رباعی

بے صبر ہوا یہ نسخۂ تازہ تمام مقبول جناب کبریا ہو یہ مدام
اللہ اسے عطا کرے فیض انام مشہور رہے ابد تک اس سے مرا نام

بے صبر نے بدیع البدایع ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں تصنیف کی۔ اور ان کے انتقال کے چند ماہ کے بعد اسے ۱۹۴۲ بکرمی میں ان کے بڑے بیٹے کرشن چندر سروپ تخلص منیر نے شائع کیا۔ صفحہ ۴۴ میں تاریخ طباعت درج ہے :

"قطعۂ تاریخ طبع رسالہ بدیع البدایع از نتائج فکر جناب کرشن چندر سروپ صاحب منیر تخلص خلف الصدق مصنف رسالہ ہٰذا"

چوں ز تصنیفِ آں عالی جناب طبع اول ایں کتاب پر فن است
سالِ طبعش از سرِ اعجاز گفت بانغم ایں تازہ و تر گلشن است
آ
۱ + ۱۹۴۱ = ۱۹۴۲ بکرمی

اس کے بعد خاتمۃ الطبع کے تحت درج ذیل عبارت ہے :

"الحمد کہ ایں نسخۂ نایاب کتاب لاجواب پر از علم صنائع بدائع یعنی بدیع البدایع از تصنیف شاعر یکتائے روزگار جناب منشی بالمکند صاحب بے صبر متوطن قصبۂ سکندرآباد متعلق ضلع بلند شہر در مطبع دبیر ہند بلند شہر بماہ اگست ۱۸۸۵ء مطبوع گردید"

بے صبر کو فنِ تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ کتاب میں اس فن کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر "قطعۂ تاریخ فتح ہند" یوں کہا ہے :

قبضۂ وکٹوریا میں آیا ہند غم دلوں کے ہو گئے رفت و گزشت
خوش ہوئے اس مژدۂ جاں بخش سے ساکنانِ شہر و بحر و کوہ و دشت
دن پھرے پھر ہند و اہل ہند کے ان کے پھر اقبال نے کی بازگشت
کرکے سر باغی کا اے بے صبر دور
گن ہزار و ہشت صد پنجاہ و ہشت

۱۸۵۸ء

اس کے بعد قطعۂ تاریخ کے ذیل میں بے صبر کہتے ہیں :

"واضح ہو کہ یہ مادۂ تاریخ ظاہری و معنوی کی ہے۔ جب اٹھارہ سو ستاون عیسوی میں فوج ہندستانی سرکار کمپنی انگریز بہادر کی باغی ہو گئی اور وہ ملک ہند قبضہ کمپنی میں نکل گیا۔ تو گورے کی فوج جناب ملکۂ معظمہ وکٹوریہ نے فوجِ باغی کو شکست دے کر ملک چھین لیا تو ٹھیکہ اس کمپنی سے چھوٹ کر یہ ملک قبضۂ ملکۂ معظمہ میں آ گیا۔ اور ملکہ کی عملداری ہو گئی۔ آخر مادہ کے بروئے ابجد اٹھارہ سو ساٹھ (۱۸۶۰ء) آئے۔ اور مطلوب ہے۔ اٹھارہ سو اٹھاون۔ تخرجہ میں سر باغی کہ بائے عربی ہے دور کیا تو اٹھارہ سو اٹھاون رہ گئے"

ذوقؔ کی تاریخ وفات یہ کہی ہے ؎

جب گئے جنت کو ابراہیم ذوق   رہ گیا مشہور ان کا نیک نام
سال رحلت ان کا اے بے صبر کہہ   تھے ہزار و دو صد و ہفتاد ایک

۱۲۷۱ ہجری

بہرحال بدیع البدائع معنوی و صوری اعتبار سے علم صنائع میں بے صبر کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف کا ایک مفید اور معلوماتی مقدمہ ہے جو ذیل میں من و عن پیش کیا جاتا ہے۔

رسالہ بدیع البدائع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بعد توحید وحدہٗ لاشریک صانع برحق اور حمد ایزد پاک مبدع مطلق کے یہ نااہل، سراپا جہل، خاکپائے ارباب سخن، خوشہ چیں خرمن اصحاب فن، بندۂ نیاز مند بال مکند المتخلص بہ صبر، قوم کایستھ رہنے والا قصبہ سکندرآباد علاقہ ضلع بلند شہر کا عرض کرتا ہے۔ کہ بعد تحصیل علوم درسی و رسمی کے مجھ کو شوق انشا پردازی و سخن طرازی کا دامن گیر حال ہوا اور رفتہ رفتہ ادب خدمت حضرت استاذی مولانا مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی میں پہنچ کے مدتوں خون جگر کھایا اور مشق سخن صاف کرکے سرمایہ دو دیوان اور تین مثنوی کا بزبان اردوئے معلیٰ میں اور ایک دیوان فارسی بہم پہنچایا۔ چاہتا تھا کہ علم صنائع میں ایک مختصر رسالہ اردو زبان کا درحقیقت اختراع و ایجاد ہے۔ جمع کیا جاوے تو ہر آئینہ موجب فیض عام اور سبب فائدۂ تمام کا ہوگا۔ کیونکہ ان دنوں ہندستان میں رواج اردو کا بیشتر موجود اور فارسی مفقود ہے اور سب علموں کی کتابیں اس زبان میں عربی اور فارسی اور انگریزی سے تصنیف و تالیف ہو کر مفید عام ٹھہرائی جاتی اور مدرسوں دیسی اور سرکاری میں پڑھائی جاتی ہیں اور جن لوگوں کو پارسی عربی میں استعداد نہیں ہے وہ فیض پاتے اور آپس میں پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ لیکن اس علم صنائع میں کوئی کتاب کسی نے تالیف یا تصنیف نہیں کی۔ اس باعث عوام اور خواص اس سے بے بہرہ ہیں۔ سبب جبکہ شعر و نظم میں اسی زبان کا رواج عام ہے اور یہ علم عروض سخن کا زیور ہے تو بہرحال عروض کو زیور کی احتیاج ہے کس واسطے کہ سخن کو خواہ نثر اور نظم میں صنائع سے نسبت خاص اور صنائع کو سخن سے اختصاص ہے۔ آخر کار بیچ سال ہزار و نہصد و بست و ششم ہندی (۱۹۲۶ بکرمی) مطابق ہزار و دو صد و ہشتاد و ششم ہجری (۱۲۸۶) موافق سنہ ہزار و ہشتصد و ہفتاد عیسوی (۱۸۷۰ء) کے یہ قطعہ خبر تاریخ اس کا لکھا۔

قطعہ تعمیہ

ہے تاریخ ختم ایں رسالہ   بسال عیسوی دل در شمار است
بجز تم از سر بجہت گر بے صبر   بنام ایزد عجب باغ و بہار است

۱۸۷۰ء = ۱۸۶۸ + ۲

یہ مختصر رسالہ بترتیب تین فصل کے اختتام کو پہنچایا اور نام اس کا بدیع البدائع رکھا۔ پہلی فصل بیان تقسیم کلام میں، فصل دوسری صنائع لفظی کے بیان میں، فصل تیسری بدائع معنوی کے ذکر میں۔

واضح ہو کہ علم صنائع کو علم کلام سے خواہ نظم ہو یا نثر گریز نہیں ہے۔ اس واسطے پہلی فصل میں بیان کرنا اقسام کلام کا ضرور و لازم آیا اور جو کہ اشعار مثال ہر ایک صنعت کے خاص مصنفہ راقم رسالہ کے ہیں اور یہ امر سبب نقص اور بے اعتباری کتاب کا ہوتا۔ تا چار تبرکاً ایک ایک شعر استادان فارسی کا ہر صنعت کی مثال میں درج کیا۔ لیکن فردوسی کے واسطے نظموں کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ کس واسطے کہ وہ اکثر مشہور ہیں اور نیز اس کے ایراد میں لحاظ طول ہو جانے اس مختصر کا تھا۔

محمد شاہ کے زمانے میں بیچ ہندستان کے نئی زبان اردو پیدا ہوئی۔ اردو لشکر بادشاہی کو بولتے ہیں۔ یعنی زبان لشکر کی۔ سب سے پہلے ولی نام شاعر نے فارسی وزنوں میں اردو زبان کہ بہت نافصیح تھی ڈھال کر شعر کہا اور غزل کا نام ریختہ قرار دیا۔ دلی والوں نے روز بروز آراستگی زبان پر کمر ہمت کی چست باندھ کر بول چال خاص و عام میں تمیز کرنی شروع کی۔ آخر کار رفتہ رفتہ ہوتے ہوتے محاورات و زبان کا اب یہ اس کا فصاحت اور بلاغت اور معنی اور محاورہ اور صنعت

لطافت اور گنجائش مضامین میں فارسی سے ہزار گونہ زیادہ بلند اور دل پسند ہوگیا اور دفاتر سرکاری میں رواج اس کا ہونے سے فارسی رہی سہی بھی ناپید ہوگئی خدا زیادہ ترقی اور شہرت اس کو بخشے ۔

بے صبر اردو میں ایک مسلّم الثبوت استاد اور باکمال شاعر تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے ۔ انھیں جملہ اصناف سخن میں خوب مہارت حاصل تھی ۔ ان کی غزلیں زبان کے لحاظ سے شیریں اور شگفتہ ہیں ۔ ان کا کلام نایاب ہے ۔ جناب مالک رام نے ان کے صرف تین شعر نقل کیے ہیں ۔ ذیل کا نمونۂ کلام بدیع البدائع سے درج کیا جاتا ہے ۔ یہ اشعار کسی تذکرے میں نہیں ہیں ۔

گھبرائی سی کسی کی مٹائی ہوئی سی ہے
اپنی طبیعت اب کہیں آئی ہوئی سی ہے

از خود یہ ہرگز اپنی نہیں سوزش جگر
یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے

قاصد جو کہہ رہا ہے کہ بن آئی تری بات
کچھ یہ تو بات اس کی بنائی ہوئی سی ہے

بوٹا سا قد، ہرا سا تن چمپئی سا رنگ
بھولی سی صورت آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

کس نقشے سے شب آگئے تم بس میں سچ کہو
انگیا تو عطر جس میں بسائی ہوئی سی ہے

چھوڑی جفا سمجھ کے جفا جو مجھے اُسے
یہ بات تو کسی کی جتائی ہوئی سی ہے

نسبت ہمارے کیا دلِ نالاں سے ہے اُسے
بلبل کی طرز نالہ اُڑائی ہوئی سی ہے

دستِ جنوں سے باقی ہے اک آستیں سو وہ
تیزاب اشک تر سے جلائی ہوئی سی ہے

رہنے لگا جو مجھ سے عناد اس کے دل میں اب
یہ خاک تو صبا کی اڑائی ہوئی سی ہے

بے صبر روتے ہیں پہ نکلتے نہیں ذرا
رقت کچھ ایسی دل میں سمائی ہوئی سی ہے

میرا سر آج زیرِ خنجر ہے — کون دنیا میں میرا ہمسر ہے
مرا سر اس کی راہ کا ہے سنگ — آتے ٹھوکر ہے جاتے ٹھوکر ہے
دشتِ وحشت میں ہوں میں سرگرداں — پانو میں میرے ایک چکر ہے
گر سرِ کینہ کشی ہے تو آ — طشت ہے سر ہے اور خنجر ہے
ہمسری سرو گر کرے اس سے — اس کا دعویٰ غلط سراسر ہے
اشک و لختِ دل اور داغوں سے — گہر و لعل و زر میسر ہے
منتِ خار و سنگ کا احساں — پانو پر میرے میرے سر پر ہے
خیلِ عشاق کا میں ہوں سردار — کہ سرِ دار پر مرا سر ہے
سنگِ در پر ترے بوقت سجود — سرِ شاہ و گدا برابر ہے

خاک اس کی گلی کی اے بے صبر
سرورانِ جہاں کا افسر ہے

پٹکا جو ہم نے سر تو زمیں ہل گئی ساری
توڑ آسماں کو آہ ہماری نکل گئی

راضی کریں شکاری کو جب تک رہائی پہ
افسوس فصلِ بادِ بہاری نکل گئی

بارے ہوا شگوں تو اچھا کہ میان سے
آتے ہی مرے اس کی کٹاری اوگل گئی

مرتا ہوں میں بن آئی اور آتی نہیں ہے وہ
قسمت کی کیا مرے کہیں ماری اجل گئی

اچھا لگایا دل کہیں بے صبر صاحب آہ
دو روز میں ہی شکل تمہاری بدل گئی

ترجیع بند

گیسو زنجیر ہے بلا کی — ابرو شمشیر ہے قضا کی
اے وعدہ خلاف کر نہ وعدہ — امید نہ تجھ سے ہے وفا کی
قاتل مرے ناوکِ نظر سے — بے قدری ہے کس قدر قضا کی
گر ظلم و ستم یہی ہیں تجھ سے — تو ہم کو بھی ہے قسم خدا کی

بند الفت سے تری حذر کریں گے
تجھ سے قطع نظر کریں گے

تو نے لیتے ہی دل جدائی کی　　واہ کیا خوب دلربائی کی
ناتوانی صد آفریں تو نے　　خوب ہی زور آزمائی کی
نہ رہی بال و پر تو مجھ کو امید　　نہ رہی ہائے اب رہائی کی
دیکھیو بے وفا نہ رہ جاوے　　ہوس آئندہ بے وفائی کی
آ جدا کر بدن سے سر بخدا　　نہیں طاقت مجھے جدائی کی

لے کے دل تو نے دل کی آزاری
کی ادا خوب شرط دلداری

مخمس

جو اذیت میں نے پائی یا مرے مشکل کشا
سو تمہیں سب کہہ سنائی یا مرے مشکل کشا
کیجیے حاجت روائی یا مرے مشکل کشا
قید غم سے دو رہائی یا مرے مشکل کشا
کیجیے مشکل کشائی یا مرے مشکل کشا

بے صبرؔ بھی اپنے استاد مرزا غالبؔ کی طرح انگریزوں کی تعریف میں قصیدے کہتے تھے، ملکہ معظمہ کی مدح میں ایک قصیدہ "مسمی درۃ التاج" کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

کیوں جبیں سے قد کا رتبہ ہو نہ کم　　لوح سے پیچھے ہوا پیدا قلم
ہو گئے لوح و قلم موجود جب　　ہو گئے اسرار سر تا سر قدم
آشکارا ہو کر اشکال حروف　　بن گئے الفاظ مل مل کر بہم
ہو گیا لفظوں میں معنی کا ظہور　　جسم حادث میں گئی روح قدم
خسرو ہندوستاں وکٹوریا　　ہے فریدوں فر کیخسرو حشم
جس کے کیوسکے نہیب نام سے　　کانپتا ملک عرب ہے اور عجم

درۃ التاج اس کا رکھ بے صبرؔ نام
کیونکہ اس میں ہے مدح خسرو رقم

ایک قصیدہ "در مدح ہندوستان" کہا۔ اس کا نام "نور بہار" ہے۔ مطلع و مقطع درج کیا جاتا ہے ؎

خطۂ دل نشیں ہے ہندوستاں　　خاک روئے زمیں ہے ہندوستاں
"نور بہار" اس قصیدے کا ہے نام　　کیوں کہ اس کی زمیں ہے ہندوستاں

ایک قصیدہ بے نقط ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

مالک ملک کرم سالک راہ ولا　　محرم اسرار دل سرور اہل عطا
گوہر سالک کرم کوہ محامد کا لعل　　مرہم درد و سوال درد الم کو دوا
ہوا سدا آسا اگر حملۂ ادہم سوار　　دور ہو سر سد راہ گر ہو عدو سام سا
ہر دم دہمو اراد رہر سحر دہر سا　　اس کا ہو مداح اور اس کو دلا کر دعا

سارا کلام اس طرح رکھا معطل مگر
کلمۂ بے صبرؔ الگ اسم ہمارا رہا

رباعیات

وحشت تہ خاک بھی ہماری نہ گئی　　فریاد و فغاں و آہ و زاری نہ گئی
سیماب کو مر کر تو قرار آتا ہے　　ہم مر گئے پھر بھی بے قراری نہ گئی

گھر آئی گھٹا ہے ناگہانی کیسی　　تیار ہے برسانے کو پانی کیسی
یہاں مے ہے نہ جام ہے نہ ساقی بے صبرؔ　　آئی ہے بلائے آسمانی کیسی

چشم اس کی ہے سحر اور وہ کافر ساحر　　ساحر سے بے خبر پھر نہ ہو کچھ ظاہر
ظاہر ہے کہ اس نے کیا مجھ پہ جادو　　جادو برحق ہے کرنے والا کافر

دم بھر بے گریہ ہے نہ چشم پرنم　　نمناک نہ کیوں رہ ہو کہ غمناک ہیں ہم
ہم غم کے شفیق اور ہمارا ہے غم　　غمخوار رفیق دوست مونس ہمدم

★

غزل

دعویٔ ظفر مندی نبھ سکا نہ دنیا کے نامور دلیروں سے
جب بدن کے جنگل میں سامنا ہوا ان کا واسنا کے شیروں سے

رات کی دلہنیا کے بستر تمنا پر جانے کب تلک چندا
کھیلتا رہا اس کی مشکبار زلفوں کے ریشمی اندھیروں سے

سبز باغ تو ہم کو دودھیا اُجالوں کے کب سے وہ دکھاتا تھا
اور ہم کو لے پہنچا بے کراں اندھیروں میں بیکراں اندھیروں سے

سازشی ارادوں کے جال تانے بیٹھا تھا وہ غنیم کا لشکر
ہم اصول کے بندے صاف کھا گئے دھوکا صلح کے پھریروں سے

سامنے وہ آئے تو والہانہ چومیں ہم ہاتھ اس صنم گر کے
جس نے مجھ کو گوندھا ہے شبنمی اُجالوں سے صندلیں سویروں سے

نوکِ خامہ سے پیہم دلنواز گیتوں کا سحر ہم جگاتے ہیں
ہے قلم کا ہم سے بھی اس طرح کا رشتہ جو بین کا سپیروں سے

اُس بھرے پُرے گھر سے اے شباب تم کو ہی مانگنا نہیں آیا
ورنہ مانگنے والے لوٹتے نہیں خالی جوگیوں کے ڈیروں سے

مئی ۱۹۸۱ء

حکیم محمد حنیف خاں شفا
جیل روڈ، رامپور یو۔پی

پنڈت موتی لال نہرو اور ان کا اردو فال نامہ

"لسان الغیب"

سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر نے جب ۱۵۲۵ء میں "تزک بابری" کے نام سے ہندستان کی نئی تاریخ لکھی، تو اس نے سرزمین آگرہ پر فاتحانہ قدم جماتے ہوئے کہا:

اس شہر میں لطافت بہت کم ہے۔ لوگوں میں نہ حسن ہے اور نہ حسن پسندی نہ مہربانی اور نہ ادب۔ فن اور فن کاروں کا طریقہ کار بھی پسندیدہ نہیں نہ میوے ہیں اور نہ بیل، برف نہیں، ٹھنڈا پانی نہیں حمام مدرسے شمع و شمعدان نہیں اس شہر کی دو چیزوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ گرد اور گرمی۔ "تزک بابری"

اب اسے آپ حسن اتفاق کہیئے! یا ستاروں کی کرامات قدرت نے اس سرزمین آگرہ کی گرد و گرمی سے تاج محل، نظیر اکبرآبادی، اسداللہ خاں غالب اور پنڈت موتی لعل نہرو کو پیدا کر دیا۔ موتی لعل ایک عظیم شخصیت اور بے پناہ عملاحیتوں کے مالک تھے لیکن عام طور پر انھیں ایک ماہر قانون، کامیاب وکیل، اعتدال پسند محب وطن، تحریک آزادی کا لیڈر، کانگریس پارٹی کا صدر اور آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے والد اور موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دادا کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موتی لعل جی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے خاندان مغلیہ کے بعد اپنے خاندان نہرو کو تاریخ ہند کا ایک زندہ جاوید باب بنا دیا۔

لیکن اس چیز نے ان کی علمی و ادبی شخصیت کو عام نظروں سے اوجھل کر دیا۔

موتی لعل جی پر اگر ایک بڑے کنبہ کا مالی بوجھ اور وکالت و سیاست کا انہماک نہ ہوتا تو وہ یقیناً ایک عظیم فن کار، اہم مصنف اور جید عالم ہوتے۔

موتی لعل جی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بزرگوں کی زبانی بہت سے قصے سنے ہیں۔

کرنل سید احمد ہاشمی صاحب کا بیان ہے کہ میں ۱۹۲۴ء میں ریاست لوہارو میں دیوان تھا۔ اور اکثر نواب سر امیر الدین صاحب کے ساتھ مشکات ہاؤس دہلی میں قیام رہتا تھا۔ نواب صاحب اس وقت والسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ اور رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علمی و ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ دہلی میں نواب صاحب کی قیامگاہ پر مشاہیر و علماء کا مجمع لگا رہتا تھا۔ صحبتیں بہت دلچسپ رہتی تھیں۔

"ایک مرتبہ پنڈت موتی لعل نہرو بھی آئے اس موقع پر دیگر مشاہیر دہلی کے ساتھ حکیم اجمل خاں جسٹس رفیق اور سر ذوالفقار علی خاں بھی موجود تھے، تمام وقت گفتگو موتی لعل جی چھائے رہے دوران گفتگو موقع محل سے فارسی اشعار بھی پڑھتے تھے، میں ان کی خوش گفتاری حاضر جوابی، وسعت معلومات اور فارسی ادب کے گہرے مطالعہ پر دنگ تھا۔"

دیر تک مجلس جاری رہی جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو میں نے نواب صاحب سے عرض کیا! حضور آج محفل میں موتی لعل نہرو کے سامنے کسی کی دال نہ گلی اور کوئی ان کے سامنے بول ہی نہ سکا۔ نواب صاحب نے فرمایا، بھئی یہ آہنی

مردہ ہے اور ہیپں نے اپنا پنجہ انگریز کے پنجہ میں ڈال دیا ہے۔ اب ایسا دور آنے والا ہے جس میں نہ انگریز کی خیر ہوگی اور نہ ہم تم جیسے قدیم وضع کے شرفا کی' ہاشمی صاحب فرماتے تھے تقسیم وطن کے بعد نواب صاحب کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صادق آئی۔

موتی لعل جی کا محل جس کا نام انھوں نے آنند بھون رکھا تھا، تحریک آزادی میں اہم مقام رکھتا ہے۔ سرامیر الدین نواب لوہارو متوفی ۱۹ر جنوری ۱۹۳۷ء کا بیان ہے۔ جب موتی لعل جی نے یہ محل تیار کر لیا تو ایک تقریب میں مجھے دیگر عمائدین ملک کو اور گورنر یو۔پی سر ہیوٹ پر لیکوٹ کو بھی مدعو کیا، ڈنر کے بعد گورنر نے بہت دلچسپ تقریر کی اور فرمایا:

یہ محل تین دیویوں کی رہائش گاہ ہے۔
حسن کی دیوی، دولت کی دیوی' اور علم کی دیوی[1]۔

گورنر نے یہ جملے کچھ ایسی ساعت سعید میں ادا کیے کہ آج تک یہ تینوں دیویاں آنند بھون کے بانی کی ذریت کے قدم چوم رہی ہیں۔

ممکن ہے جواہر لعل جی کے ذہن میں تین مورتی کا تصور گورنر کے اس جملے سے پیدا ہوا ہو۔

اس وقت ہمارا مقصد موتی لعل جی کی ایک نادر و نایاب کتاب کا تعارف کرانا ہے جو اہل علم کے لیے نیا انکشاف ہے۔ اور موتی لعل جی کی شخصیت ابتدائی رجحانات اور نہرو خاندان کو سمجھنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چونکہ یہ کتاب علم فال "شگون" پر لکھی گئی ہے۔ جو عصر حاضر میں تقریباً متروک ہے۔ اس وجہ سے ۹۵ سال اشاعت کو پورے ہونے کے باوجود آج تک غیر معروف ہے۔

اس کتاب کے ٹائٹل پیج صفحۂ اول پر یہ عبارت ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــــ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

لسان الغیب ۱۸۸۶ء

معروف بہ

فالنامہ = ۱۳۰۳ھ

در مطبع نامی واقع شہر لکھنؤ ـــــ"

مسلمانوں کے ہندستان میں حکمراں ہونے سے تقریباً انگریزوں کے آخری عہد حکومت تک ہندستانی زندگی کے اکثر شعبوں میں غیر مسلم حضرات بھی اسلامی اقدار کا لحاظ رکھتے تھے۔ اور اکثر غیر مسلم مصنفین ایسی کتابوں کو حمد و نعت سے ہی شروع کرتے تھے بلکہ غیر مسلم اہل علم کا خاصا بڑا طبقہ ایسا تھا جو صورت و سیرت میں اسلامی تعلیمات کا اعلیٰ نمونہ تھا جیسے مطبع نامی کے بانی منشی نول کشور صاحب وغیرہ۔

موتی لعل جی نے بھی رسم زمانہ کے مطابق بسم اللہ سے کتاب شروع کی۔ اور اسی عہد کا عالمانہ طرز تحریر بھی اختیار کیا ادھر اس وقت تک نہرو خاندان کا طرز زندگی بھی بڑی حد تک مشرقی تھا۔

اپنے دادا گنگا دھر نہرو کے بارے میں جواہر لعل جی نے لکھا ہے۔ وہ مغل دربار کا لباس پہنتے اور بالکل مغل امیر معلوم ہوتے تھے[2] موتی لعل جی نے بھی مشرقی روایات اور خاندانی اثرات کے تحت بسم اللہ اور سنہ ہجری کا استعمال کیا ہے۔

صفحہ ۲ پر ناشر نے مصنف یعنی موتی لعل جی کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

ـــــ " لسان الغیب یعنی فالنامہ جس کو صاحب فہم و ذکا پنڈت موتی لعل کول عرف نہرو طالب العلم گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور سلمہ اللہ تعالیٰ نے بغرض جنتری ہذا شہنشاہ نپولین کے مشہور و معروف فالنامہ انگریزی سے ترجمہ کیا، ماہ ستمبر ۱۸۸۶ء .... "

کول سے نہرو تک

اس فالنامہ سے نہرو خاندان کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کہ ۱۸۸۶ء تک یہ خاندان کول کہلاتا تھا صرف عرفیت میں نہرو لکھا جاتا تھا۔

کول۔ ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے جس کے کئی معنی آتے ہیں سنسکرت میں یہ اچھے خاندان والے کو کہتے ہیں چونکہ کشمیری برہمنوں میں ان کا خاندان اعلیٰ مانا جاتا تھا اس وجہ سے کول مشہور ہو گیا اور اب بھی ہندستان کے کئی خاندان اپنے آپ کو کول لکھا کرتے ہیں۔ تذکرہ شعرائے کشمیر میں متعدد کول خاندان کے شعراء کا ذکر ہے۔ مشہور مورخ پنڈت ٹیکارام بھی اپنے نام کے ساتھ کول لکھا کرتے تھے۔

جواہر لعل جی اپنے خاندان کی کشمیر سے شمالی ہند میں آمد اور لفظ کول کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے اب سے یعنی ۱۹۳۴ء سے کوئی دو سو برس پہلے اٹھارویں صدی کے شروع میں ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی چھوڑ کر دولت اور شہرت کی تلاش میں نیچے کے زرخیز میدان میں آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب کی وفات "۱۷۰۷ء" کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فرخ سیر ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء " ہندستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترک وطن کر کے دلی آ گئے۔

بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگا۔ اب خاندان کا نام کول کی جگہ کول نہرو قرار دیا گیا آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

اس فالنامہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۶۱ء تک اصل نام کے ساتھ کول اور نہرو دونوں کا ایک ساتھ استعمال ہوتا تھا

جواہر لعل جی مزید لکھتے ہیں :

"مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہمارے خاندان کی تقدیر نے بھی بہت سے نشیب و فراز اٹھائے بالآخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔ جائداد لٹ گئی خاندانی کاغذات اور دستاویزات اسی گڑبڑ میں تلف ہو گئیں۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح ہمارا خاندان بھی آگرہ میں آباد ہو گیا، جہاں ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو میرے والد موتی لعل جی پیدا ہوئے"

یہ بھی عجیب اتفاق ہے، اسی دن تاریخ اور وقت ہندستان کی دوسری عظیم شخصیت رابندر ناتھ ٹیگور کا جنم ہوا۔ موتی لعل جی کی ولادت سے چند ماہ قبل ان کے والد گنگا دھر نہرو کا ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۶۱ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی جو وکالت کرتے تھے الہ آباد میں ہائی کورٹ قائم ہونے کے بعد الہ آباد گئے اور جب سے ان لوگوں کا وطن الہ آباد ہو گیا اس فالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موتی لعل جی ۱۸۶۶ء سے قبل گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں طالب علم تھے۔

جواہر لعل جی نے لکھا ہے :

"میرے والد نے ابتدا میں خاندانی روایات کے تحت صرف عربی فارسی اور ہندستانی علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی وہ کم سنی میں فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ جب ان کی عمر بارہ چودہ برس کی ہوئی تو الہ آباد اور کانپور کے اسکول اور کالج میں انگریزی تعلیم شروع ہوئی۔"

شیخ نذر محمد، جنھوں نے ۱۹۲۱ء میں موتی لعل جی کی سوانح مرتب کی تھی، لکھتے ہیں :

"موتی لعل جی کی تعلیم ان کے بڑے بھائی نند لعل جی کی زیر نگرانی ہوئی جنھوں نے ابتدا میں عربی، فارسی پڑھا کر گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں داخل کرا دیا، جہاں سے وہ انٹرنس پاس کر کے میور کالج الہ آباد میں داخل ہو گئے اور چار سال تک اسی کالج میں پڑھتے رہے۔"

موتی لعل جی کے اسکولی مشاغل کے بارے میں جواہر لعل جی لکھتے ہیں :

"اسکول و کالج کے زمانے میں میرے والد کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی وہ کوئی قابل ذکر

طالب علم تھے، پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں کھیل کود اور من چلے پن کی حرکتوں سے دلچسپی تھی، کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے، انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں امتحان میں انھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے، جب بی اے کے امتحان کی نوبت آئی تو پہلا پرچہ بگڑ گیا اور وہ کامیابی سے مایوس ہو کر امتحان چھوڑ چھاڑ کر تاج محل کی سیر کرنے چلے گئے، یونیورسٹی کی تعلیم ان کی یہیں ختم ہو گئی وہ بی اے پاس نہیں کر سکے۔ تاہم ان کے دل میں ترقی کی امنگ تھی اور انھوں نے تیاری کر کے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا چونکہ صلاحیت تھی اس میں اول نمبر پر پاس کیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

اور کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کر دی، ترقی کی دھن میں انھوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا، مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا ۔۔۔[۱]

شیخ نذر محمد کا بھی بیان یہ ہے کہ:

"موتی لعل جی نے کانپور میں تعلیم حاصل کر کے اور پھر کانپور میں ہی وکالت شروع کی اور تین سال پریکٹس کرنے کے بعد ۱۸۸۶ء میں الہ آباد آ گئے، جہاں ان کے بڑے بھائی نند لعل نہرو ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بہت مشہور تھے مگر موتی لعل جی کے الہ آباد آتے ہی ۱۸۸۷ء میں نند لعل جی کا انتقال ہو گیا ۔۔۔"

چونکہ اب تک موتی لعل جی کی کوئی سوانح شائع نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ موتی لعل جی اس فالنامہ کی اشاعت کے وقت ستمبر ۱۸۸۶ء میں طالب علم تھے یا وکالت شروع کر دی تھی۔

جواہر لعل جی اور شیخ نذر محمد کے بیان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس سن میں موتی لعل جی وکالت کرتے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو واقعہ یہ ہوگا کہ جو فالنامہ موتی لعل جی نے طالب علمی کے دور میں مرتب کیا تھا وہ وکالت شروع کرنے کے چند سال بعد شائع ہوا اور ناشر نے وہ نوٹس جو ابتدا میں لکھا تھا وہی باقی رکھا۔ اس فالنامہ کی ترتیب کے وقت موتی لعل جی طالب علم تھے اور غیر شادی شدہ تھے اور اس کی اشاعت جواہر لعل جی کی پیدائش ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء سے تین سال قبل ہوئی۔ اس وقت موتی لعل جی کی عمر ۲۵ سال تھی یہ بھی ممکن ہے اس وقت زیر تعلیم ہی ہوں یا یہ بھی کہ وکالت شروع کر دی ہو۔

اس فالنامہ کی اہمیت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ موتی لعل جی کی ابتدائی گمنام تصنیف ہے یا خاندان نہرو کی پہلی اردو تخلیق ہے بلکہ اس کی اہمیت کی چند وجوہات اور بھی ہیں۔ یہ موتی لعل جی کی شخصیت کو سمجھنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس سے تھوڑی بہت اس عہد کے رجحانات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

جواہر لعل جی نے لکھا ہے کہ:

"میرے والد میں خودی خود سری اور منچلا پن بچپن سے تھا وہ کسی ایسے کام یا تحریک میں شامل ہونے کو برا خیال کرتے تھے جس میں انھیں کسی دوسرے کی پیروی کرنی پڑے اسی چیز نے انھیں ابتدا میں کانگریس سے دور رکھا اور یہی چیز تھی جس نے انھیں ان کے پیشہ وکالت میں کامیاب کیا اور ان کے دل میں خودی خودداری اور اعتماد نفس کے جذبات پیدا کیے[۲]"

موتی لعل جی کے عہد تک فن فال پر مذہب کا غلبہ تھا اور عموماً اس زمانے میں فال نکالنے کا کام یا تو مذہبی کتابوں یا دیوان حافظ سے لیا جاتا تھا[۳]

آزاد خیال حضرات اور حکمرانوں میں دیوان حافظ لسان الغیب کے نام سے مشہور تھا، اسی وجہ سے موتی لعل جی نے اپنے فالنامہ کا نام بھی لسان الغیب تجویز کیا۔ اور فال نکالنے کا طریقہ

۱۸، ۱۹، اور ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو رویندر الیہ لکھنؤ میں دوسری آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی
وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بھی ۱۹ اپریل کو اس کانفرنس سے خطاب کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

وزیر اعلا بہار ڈاکٹر جگن ناتھ مصرا بھی ۱۹ اپریل کو اس کانفرنس میں شریک ہوئے زیر نظر تصویر میں
وہ کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیر اطلاعات و قومی یک جہتی اتر پردیش ڈاکٹر عمار رضوی ۱۹ اپریل کو کانفرنس کے ایک سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے۔ یہ سیشن "ہماری قومی زندگی میں اردو کا حصہ" کے موضوع پر منعقد ہوا تھا۔

"ہم اردو کے طرفدار کیوں ہیں" کے موضوع پر فراق گورکھپوری ۲۰ اپریل کو سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے۔

۲۰ر اپریل کے سیشن کے مہمان خصوصی شری اندر کمار گجرال اظہار خیال کرتے ہوئے۔

۱۸ر اپریل کو ڈیلی گیٹ سیشن میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے ڈائرکٹر اور ہندی کے ممتاز ادیب اور شاعر شری ٹھاکر پرشاد سنگھ نے کانفرنس کے مندوبین کو نیا دور کا 'لوکشو نمبر' پیش کیا۔ زیرِ نظر تصویر میں وہ حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں۔
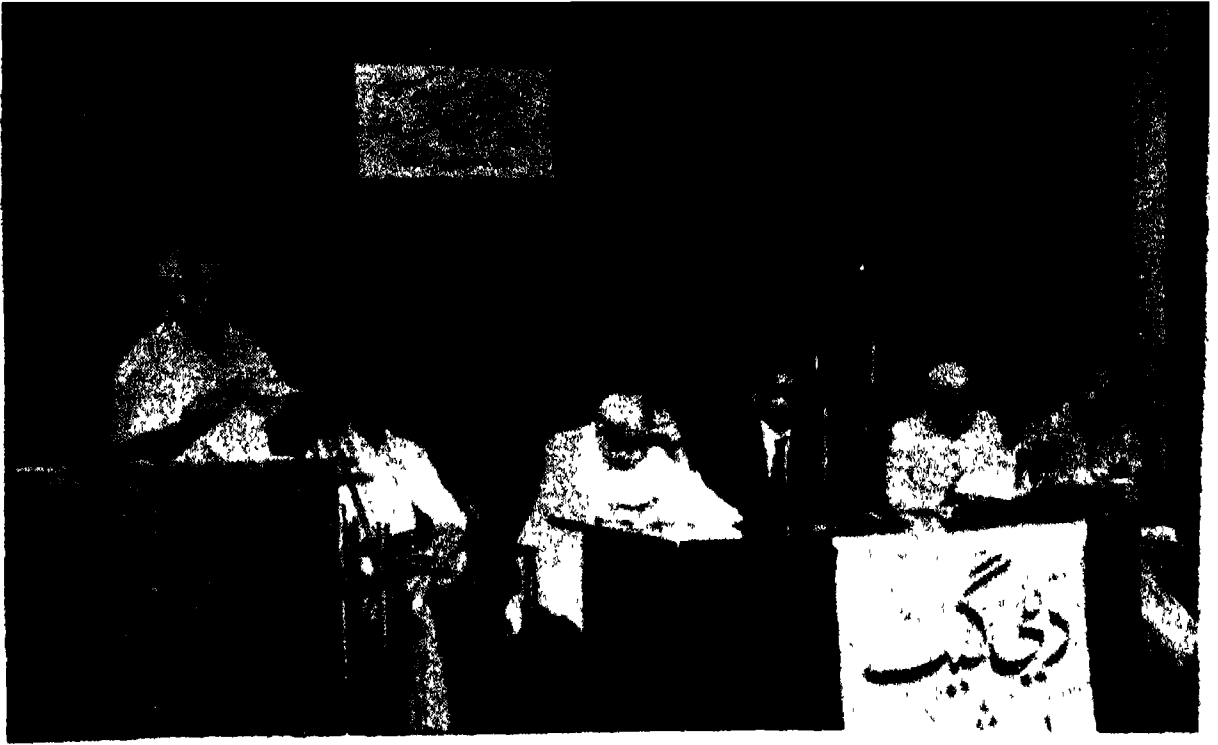
۱۰ اپریل کے سیشن میں کانفرنس کے جنرل سکریٹری شری رام لعل مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے۔

ڈیلی گیٹ سیشن کے حاضرین کا ایک منظر۔

خالص فن تحریر اور علوم الحساب پر محمول کیا جس میں مذہب کا شائبہ نہیں ہے۔

چونکہ موتی لعل جی نے اس فالنامہ پر دیباچہ یا مقدمہ نہیں لکھا ہے اس وجہ سے فن فال یا اس فالنامہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی نہیں پڑتی۔ یہ عجیب اتفاق ہے جس وقت موتی لعل جی کانپور میں طالب علم کی حیثیت سے انگریزی سے اس فالنامہ کو اردو کا جامہ پہنا رہے تھے بالکل اسی وقت موتی لعل جی کے ہم عصر اور ہم عمر عربی زبان کے طالب علم نجم الغنی خاں" ولادت ۱۸۵۹ء وفات ۱۹۳۱ء" رام پور میں عربی سے اردو میں ایک فالنامہ مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت نجم الغنی خاں کی عمر بھی تقریباً وہی تھی یعنی ۲۵ سال جو موتی لعل جی کی تھی۔ نجم الغنی خاں نے اس فالنامہ کا نام "مفتاح المطالب" رکھا اور یہ بھی تحریر کیا کہ یہ میری طالب علمی کے دور کی پہلی تالیف ہے جو قرآن سے فال نکالنے کے بارے میں شیخ محی الدین ابن عربی کے رسالے کا ترجمہ ہے جو سنہ ۱۸۸۳ء میں لکھا گیا اور سنہ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔

یعنی موتی لعل جی سے صرف دو سال پہلے، نجم الغنی خاں کے فالنامہ کا دیباچہ اس لیے کافی اہم ہے کہ اس سے فن فال اور موتی لعل جی کے عہد کے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس عہد میں لوگوں کی توجہ اس فن کی طرف کیوں تھی؟

جس کے سبب نجم الغنی خاں نے ابن عربی کے قدیم فالنامہ کو نیا روپ دیا اور موتی لعل جی نے شہنشاہ نپولین کے جدید انگریزی فالنامہ کو اردو کا جامہ پہنایا۔ یا طبع زاد کتاب لکھ کر تفنن طبع کی خاطر مشہور فاتح سے منسوب کر دیا۔

موتی لعل جی نے اپنے فالنامہ کو اس طرح شروع کیا ہے:

"اس فالنامہ میں آپ کو جواب چند سوالات کے جن کی تحریر تفت میں کی گئی ہے نہایت آسانی سے ملیں گے اور صاحب فال یعنی فال دیکھنے والا جوابات اپنے سوالوں کے صاف صاف پا دیں گے۔ طریقہ فال دیکھنے کا اس فالنامہ میں یہ ہے کہ صاحب فال منجملہ مندرجہ ذیل سولہ (۱۶) سوالوں کے کوئی سوال اپنے ذہن میں لے سولہ سوال یہ ہیں۔

۱	کیا میری مراد بر آوے گی؟	۹	کیا فلاں شخص کو میرے پاس محبت ہے؟
۲	کیا میرے منصوبے درست ہو دیں گے؟	۱۰	کیا یہ ازدواج سعید ہوگا؟
۳	میرا معاملہ سرسبز ہوگا یا نہیں؟	۱۱	میرا ازدواج کیا ہوگا؟
۴	کیا مجھے پردیس میں رہنا ہوگا؟	۱۲	فلاں عورت کے لڑکا ہوگا یا لڑکی؟
۵	کیا مسافر پردیس سے واپس آئیگا؟	۱۳	کیا مریض کو مرض سے صحت ہوگی؟
۶	کیا میرا مال مسروقہ مل جاوے گا؟	۱۴	کیا قیدی رہا ہوگا؟
۷	کیا فلاں شخص میرا دوست صادق رہیگا؟	۱۵	مجھے آج کا دن سعد ہے یا نحس؟
۸	کیا مجھے سفر ہوگا؟	۱۶	میرے خواب کی تعبیر کیا ہے؟

"ان میں سے کوئی سوال ذہن میں لے کر بعدہٗ نقطے چار سطروں میں دے نقطوں کی تعداد پر لحاظ نہ رہے صرف اسی قدر ضرور ہے کہ سطریں سیدھی ہی ہوں بعدہٗ دو دو نقطوں کو ملاتا جاوے اس طور پر آخیر میں ہر سطر کے ایک خط ملیگا خواہ نقطہ باقی رہے گا، وہ شکل جو بھی بنے علیحدہ لکھ دو اور پھر اس شکل کو نقشہ فالنامہ میں کہ جہاں اشکال بہ ترتیب نمبر لکھی گئی ہیں دیکھو وہ شکل مل جاوے گی پھر اس سوال کی طرف دیکھنا چاہیے جو ذہن میں لیا ہے، ہر سوال کے مقابل میں برابر شکل مذکورہ کوئی ستارہ ملیگا ہر ستارے کی مختلف اشکال کے خواص الگ الگ لکھے گئے ہیں ان میں مذکورہ شکل کے مقابل صاحب فال کو جواب اپنے سوال کا صاف صاف ملے گا۔"

اس کے بعد موتی لعل جی نے مثالوں سے بات واضح کی ہے اور تنبیہ کے عنوان سے یہ تحریر کیا ہے:

"واضح ہو کہ تواریخ مندرجہ ذیل نحس ہیں ان میں کوئی

نیا کام شروع نہیں کرنا چاہیے اور نہ فال دیکھنا چاہیے —
جنوری کی یکم ۲-۴-۶-۱۰-۱۱-۱۳-۲۰-۲۲
فروری کی ۶-۱۷-۲۸
مارچ کی ۱۴-۱۶-۲۴-۲۶-
اپریل کی ۱۰-۱۷-۱۸-۲۸-۲۷
مئی کی ۹-۸-
جون کی ۱۷-۲۷-
جولائی کی ۱۷-۲۱-۲۲
اگست کی ۲-۲۱-۲۲
ستمبر کی ۵- اکتوبر کی ۱ نومبر کی ۳-۶-۱۰ ۲۹
دسمبر کی ۶-۱۰-۱۱-۱۵
یاد رہے کہ ایک روز میں ایک ہی فال کو دو مرتبہ دیکھنا منع ہے۔"
صفحہ ۴ سے اصل فالنامہ اور اشکال کا بیان شروع ہوتا ہے۔ کل صفحات ۱۲ پیمائش طول ۲۵ عرض ۱۵ سطریں صفحہ ۱۶-

حوالے

میری کہانی۔ از پنڈت جواہر لعل نہرو۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۱ تا ۵۴-
جواہر لعل جی نے جلد اول کے ابتدائی حصہ میں موتی لعل جی کے بارے میں کافی لکھا ہے۔

بھارت سبھا۔ از شیخ نذر محمد مطبوعہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۹۳

تزک بابری۔ فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۳۰۸ھ اردو مطبوعہ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۸۹

دیوان حافظ کی تاریخی فالیں۔ از اسلم جے راجپوری مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۹

مفتاح المطالب۔ علامہ نجم الغنی خاں مطبوعہ احمدی پریس ۱۳۰۳ھ صفحہ ۳

اردو ڈائجسٹ لاہور۔ فروری ۱۹۷۸ء مضمون سید سعید احمد ہاشمی صفحہ ۱۱۱

مثنوی انبساط و انتشار۔ نواب لوہارو امین الدین احمد مطبوعہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۸۶

بہار گلشن کشمیر۔ از پنڈت جگموہن ناتھ شوق مطبوعہ ۱۹۳۱ء کول خاندان کے شعراء

سہیل نمبر۔ محمد حسن کا نکچ جون پور مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ۵ نظم بعنوان یا جاہر

سیاحت ہند۔ از عبدالرحمن امرتسری کانپور و الہ آباد کے اسکولوں کا ذکر۔

تاریخ کشمیر۔ فارسی قلمی از پنڈت ٹیکا رام کول بحوالہ معارف جلد ۹۴ صفحہ ۱۴۱

ہندی اردو لغت۔ از راجہ راجیسور راؤ اصغر مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۵ء لفظ کول

سوانح نجم الغنی خاں۔ حکیم محمد حسین مطبوعہ ناظم پریس رامپور صفحہ ۹

کچھ پرانے خط۔ مرتبہ پنڈت جواہر لعل نہرو مطبوعہ جامعہ ۱۹۶۰ء موتی لعل جی اور ان کے نام خطوط

جواہر لعل کی کہانی۔ مرتبہ محمد رحیم دہلوی مطبوعہ ۱۹۳۶ء منہاج پریس دہلی موتی لعل کا ذکر صفحہ ۴۰

★

کرشن بہاری نورؔ
۶۷۔ غوث نگر۔ لکھنؤ۔۱

بسنت کمار بسنتؔ
۲۹۔ سیڑھی بازار رکاب گنج لکھنؤ۔۳

غزلیں

اک غزل اس پہ لکھوں دل کا تقاضہ ہے بہت
آج کل خود سے بچھڑ جانے کا دھڑکا ہے بہت

صفر تک کھینچ کے لے آئے جو احساسِ وجود
اس کی قربت کا وہ اک آخری لمحہ ہے بہت

ایک قطرے سے جو پیاس اپنی بجھانے کو کہے
ساری محفل میں وہی شخص تو پیاسا ہے بہت

پردۂ دیر و حرم اب تو اٹھا دے یارب
ہو چکا جتنا تماشہ وہ تماشہ ہے بہت

رات ہو دن ہو کہ غفلت ہو کہ بیداری ہو
اس کو دیکھا تو نہیں ہے اُسے سوچا ہے بہت

میرے ہاتھوں کی لکیروں کے اضافے ہیں گواہ
میں نے پتھر کی طرح خود کو تراشا ہے بہت

کوئی آیا ہے ضرور اور یہاں ٹھہرا بھی ہے
گھر کی دہلیز پہ اے نورؔ اجالا ہے بہت

نگاہ میں جو زمانے کی سب سے احقر تھا
وہ اپنے دور کا سقراط تھا سکندر تھا

بڑے خلوص سے جو ہنس کے بات کرتا تھا
وہی چھپائے ہوئے آستیں میں خنجر تھا

گھٹا وجود تو انساں تھا ایک ذرۂ خاک
بڑھا وجود تو اک بیکراں سمندر تھا

حصارِ ذات سے نکلا تو یہ ہوا محسوس
کسی سے کوئی نہ کمتر تھا اور نہ برتر تھا

کنول سا چہرہ تھا اس کا حسین جھیل سی آنکھیں
ٹٹولا دل کو تو فولاد اور پتھر تھا

بسنتؔ کوئی سخن ور نہ تھا نہ تھا فن کار
نہ جانے شہر میں کیوں اس کا نام گھر گھر تھا

مرزا جعفر حسین
بدری ناتھ روڈ گولہ گنج لکھنؤ

شعلہ اور دریا

شہر لکھنؤ کے کشمیری محلہ کو عہدِ قدیم میں جغرافیائی نیز تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس علاقہ کے ایک جانب چوک اور دوسری جانب محمود نگر اور منصور نگر کے محلات آباد ہیں اور یہ تمام علاقے قدیم ترین بستیاں ہیں۔ عہدِ اکبری میں جب ساری مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور صوبہ اودھ ایک علیحدہ صوبہ قرار پایا تو اس شہر کا اقتدار شیخ عبدالرحیم کو سونپا گیا۔ انھوں نے لکھنؤ کو دارالمستقر بنایا تھا کیونکہ یہ شہر ان کو جاگیر میں مل گیا تھا۔ وہ آکر اسی مقام پر ٹھہرے تھے جو لچھمن ٹیلہ یا شاہ پیر محمد کا ٹیلہ کہلاتا ہے۔ شاہ پیر محمد رحمۃ اللہ علیہ بھی آکر اسی مقام پر ٹھہرے تھے۔ اور ان کا ورود بہت قبل ہو چکا تھا۔ یہ مقام چوک سے قریب ہے جہاں ہندو آباد تھے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اکبر نے برہمنوں کو باجپئی چڑھانے کے لیے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمائے تھے۔ چنانچہ چوک کے وہ محلے جن میں اکبر کے وقت ہی میں ہندو آباد تھے، باجپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، اہیرن ٹولہ ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ اس دور میں جب آبادی کم تھی اور لوگوں کے پاس بڑے بڑے رقبے تصرف میں تھے تو بنجاری ٹولہ بھی اسی علاقہ میں رہا ہوگا۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کشمیری محلہ کے ایک جانب ہندوؤں کی گھنی آبادی تھی۔

اکبر ہی کے زمانہ میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا اور یہاں کی آبادی بڑھنے لگی تھی۔ آبادی بڑھتی ہے تو پھیلنے بھی لگتی ہے چنانچہ شہزادہ سلیم نے اپنے باپ ہی کے زمانہ میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈال دی تھی جو شیخ عبدالرحیم کے قلعہ موسومہ مچھی بھون کے مغرب کی جانب واقع ہے۔ اسی قلعہ کے قریب میں یعنی علاقہ چوک میں عہدِ اکبری کے صوبے دار جواہر خاں کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے سمت جنوب داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے اور چوک کے درمیان میں یعنی جو علاقہ اس وقت چوک کہلاتا تھا اس کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کیا۔ عہدِ شاہ جہانی تک لکھنؤ اور ترقی کر چکا تھا۔ مرزا منڈی کی بدولت لکھنؤ خود سیاحوں کی نظر میں ایک عظیم الشان منڈی بن گیا تھا۔ اس وقت کے صوبے دار سلطان علی شاہ قلی خاں کے دونوں بیٹوں مرزا فاضل اور مرزا منصور نے اپنے نام کے دو محلے منصور نگر، اور فاضل نگر آباد کیے تھے۔ یہ محلے محمود نگر کے جنوب میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام علاقوں میں مسلمانوں کی گھنی آبادیاں رہی ہوں گی۔

متذکرہ بالا صورتِ حال واضح کرتی ہے کہ چوک اور اس کے شمالی علاقوں میں اس مقام تک جہاں گول دروازہ موجود ہے ہندوؤں کی گھنی آبادیاں تھیں اور سمت جنوب محمود نگر، منصور نگر اور فاضل نگر کے علاقوں میں مسلمان بستیاں تھیں۔ ان دونوں بڑے بڑے آباد علاقوں کے درمیان جو خلا تھا اس کو آصف الدولہ نے اپنے دورِ اقتدار میں آباد کیا اور یہ رقبہ کشمیری محلہ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ نام ہی ثابت کرتا ہے کہ اس محلہ کو کشمیریوں نے آباد کیا تھا اور یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ یہ لوگ آکر ایک ایسے علاقے میں آباد ہوئے

جس کے ایک سمت برہمنوں کی بستیاں تھیں تو دوسری جانب مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ چنانچہ لکھنؤ کی تاریخ شاہد ہے کہ کشمیری عقیدتاً ہندو ذات کے اعتبار سے برہمن لیکن ان کا سارا کلچر مسلمانوں کی تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا۔

دور تباہی میں محلوں کی آبادیاں مخلوط ہوگئی تھیں اس لیے ایک فرقہ کے لوگ دوسری جماعت کے افراد کو متاثر کرتے تھے۔ کشمیری محلہ میں بکثرت مسلمان بھی آباد تھے اور رؤسا کی ڈیوڑھیاں اور محل بھی تھے۔ اس جاگیردارانہ نظام نے کشمیری پنڈتوں کو بھی پوری طرح متاثر کیا تھا کشمیریوں میں بعض وثیقہ دار بھی تھے۔

کشمیری ہندو جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے یہاں ذات کی [illegible] نہیں ہے۔ وہ سب کے سب پنڈت ہیں اور پنڈت کہلاتے ہیں۔ البتہ ان کے ناموں کے آگے القاب لگے ہوتے ہیں مثلاً ہنرو، ملا وغیرہ، ان القاب کی وضاحت بہت دلچسپ ہے۔ کچھ لوگ اپنے عہدوں کے ناموں سے موسوم ہوئے جیسے بخشی۔ کچھ لوگوں نے عہدوں کے نام مختصر کر کے اپنا لقب اپنایا جیسے تنخواہ تقسیم کرنے والے تنخواہ کہلائے اور اب وہ ٹنخا ہوگئے۔ بعض القاب شخصی خصوصیت کی بنا پر قائم ہوئے مثلاً یہ کہ ایک بزرگ نے ایک مخصوص طرز کی ٹوپی پہنی اور وہ ٹوپا کہلائے۔ مختصر یہ کہ یہ القاب عہدوں، پیشوں اور ذاتی خصوصیات کی بنا پر کسی ایک بزرگ کو ملے یا انھوں نے خود اختیار کیے بعد ازاں وہی لقب خاندان میں نسلاً بعد نسلاً رائج ہوگیا۔ ایسے القاب میں کوئی ذات پات کا رشتہ نہیں ہوتا، بہت سے القاب اب اپنی اصلی حالت میں بھی نہیں ہیں۔ اخلاف نے اپنے مذاق و کلچر کے تحت ان میں صوتی تبدیلی کرلی ہے اور اسی تبدیلی کا اثر تحریر و تقریر پر بھی پڑگیا ہے۔ کشمیریوں میں ایسے بےشمار القاب ہیں لیکن لکھنؤ کے بعض کشمیری حسب ذیل القاب کے حامل تھے جن میں بعض کے اخلاف بھی موجود ہیں۔

بخشی، در، [illegible] ڈلشی، شرعہ، ہشانگلو، خشایہ، تکو، چک، چکبست، رازدان، کول، گھو، ملا، ہکسر وغیرہ وغیرہ۔

کشمیری شعرا کے تذکروں میں بعض ایسے نام بھی ملتے ہیں جن کے آگے کوئی القاب درج نہیں ہے اس کی وجہ راقم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ البتہ ان تمام کشمیری شعرا کی خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ان میں سے انتزاع سلطنت اودھ کے وقت تک کوئی ایسا نہیں ملتا جس نے فارسی میں مشق سخن نہ کی ہو اور بعض کا کلام زبان و بیان کے لحاظ سے انتہائی بلند ہے۔ عہد آصفی میں پنڈت تجلّی رام ہکسر المتخلص بہ سرور فارسی کے جلیل القدر شاعر تھے اور آخر میں دولت رائے..... شوقؔ کا نام نامی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ شوقؔ راجہ بھولا ناتھ کے اخلاف میں تھے، اور ان کو آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ سے تلمذ تھا۔

شوقؔ کا کوئی شعر اردو میں دستیاب نہیں ہوا حالانکہ وہ عہد واجدی کے شاعر تھے۔ اسی آخری دور کے شعراء میں شعلہؔ، اور دریا بھی تھے جن کا ذکر اس مقام پر کیا جارہا ہے۔

پنڈت امرناتھ شعلہؔ خلف پنڈت دتارام کے نام کے آگے بخشی کا لقب ملتا ہے۔ صاحب بہارگلشن کشمیر نے یہ لقب پنڈت دتارام کے نام سے متعلق نہیں کیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شعلہؔ بخشی گری کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے لیکن اس خیال کو یہ واقعہ مشکوک کردیتا ہے کہ شعلہؔ نواب سبحان علی خاں..... کی سرکار سے متعلق تھے۔ حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو یہ خاندان بہرحال بخشی کہلایا۔ ممکن ہے کہ آپ کے اجداد عہد شجاع الدولہ میں فیض آباد آگئے

ہوں اور جس طرح بہت سے دوسرے خاندان عہد آصفی
میں لکھنؤ آئے اور کشمیری محلہ آباد کیا ان کے بزرگ بھی
فیض آباد سے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے ہوں اور انھیں بزرگوں
میں کوئی عالی مرتبت سلطنت مغلیہ یا حکومت اودھ میں
بخشی کے منصب پر فائز رہے ہوں۔ اسی طرح یہ
بھی پتہ نہیں چلتا کہ شعلہ نے کس استاد کے آگے زانوئے
ادب تہہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ دور ایسا تھا جب لکھنؤ کے
در و دیوار شعر و سخن میں سرشار تھے اس لیے ہو سکتا ہے کہ شعلہ
نے اپنے فطری رجحان پر مشق سخن کی ہو اور خود انھیں کی
طبع رسا اور فکر سلیم نے ان کی رہنمائی کی ہو۔ ان کے اشعار
سے بہر حال ان کی کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے۔

یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان کا کلام اپنے دور کے ابتذال
سے پاک و صاف ہے اور زبان کا نکھار پوری طرح کارفرما
ہے ملاحظہ ہو

طاقت ہے کیا جو میں کہوں مجھ پر ستم ہوا — ہاتھوں سے تیرے جو ہوا ظالم وہ کم ہوا
دریا دلوں میں مجھ سا بشر کوئی کم ہوا — چشموں سے میری جو گرا قطرہ وہ یم ہوا

اللہ نے چمن میں گل شاداب بنایا — بلبل کو بھی سرگرم تب و تاب بنایا
دریائے محبت میں ڈبانے کو دلوں کے — چاہِ ذقن یار کو گرداب بنایا

ہر نقش قدم دشت میں ہے خاک بسر آج — دریا ہے کس آوارہ کا ہوتا ہے گزر آج
اے ابر چلا کشتی گرداں سے یہ ہونا — کچھ جوش پہ آتے ہیں نظر دیدۂ تر آج
پروانہ نے جان شمع پہ دی بزم میں شعلہ — عزت ہے اگر آئے قدم یار پہ سر آج

جلوۂ گلزار ابراہیم آتا ہے نظر — باغباں پھول ایک دو رکھ دے قفس کے چاک میں

انھیں پنڈت امر ناتھ شعلہ کے صاحب زادے پنڈت
رتن ناتھ بخشی المتخلص بہ دریا تھے جنھوں نے عہد امجدی
میں بڑا نام پیدا کیا تھا، انھوں نے اردو اور فارسی دونوں
زبانوں پر قدرت حاصل کر لی تھی۔ علم و فضل سے بہت ذوق تھا
باپ کا شمار نہ صرف ادیبوں اور عالموں میں بلکہ محققین میں بھی
تھا۔ شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور ناطق بلگرامی نیز میر اوسط علی
رشک سے تلمذ تھا۔ باپ کا تخلص شعلہ اور بیٹے کا دریا تھا۔
اس صورت حال پر بہت اچھا فقرہ مولف تذکرۂ ہندو نے
لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "باپ بیٹے نے دو عنصر آبی و آتشی
مسخر کر لیے تھے" دریا نے طویل عمر پا کر انتزاع سلطنت اودھ
کے ایک مدت بعد انتقال فرمایا تھا۔ انھوں نے تخت و تاج
کو دیکھا اور اس راج کو اجڑتے بھی دیکھا تھا، اسی لیے ان
کے کلام میں گداز بھی ہے اور اپنے زمانہ کی رنگینیاں بھی۔
تذکرہ نگاروں نے دریا کا جو ذکر کیا ہے وہ اس زمانہ کی حالت پر روشنی
ڈالتا ہے۔ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اس
دور میں فحشیات کا عام رواج تھا۔ اخلاقی قدریں ہمیشہ
بدلتی رہی ہیں جن باتوں کو ہم آج "مبتذل" کہتے ہیں عہد
قدیم میں تفنن طبع کے لیے جائز تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج کی
تہذیب کے کچھ عناصر کل ابتذال قرار پا جائیں، بہر حال ہم کو
ہر تہذیب کا اس کے اپنے مخصوص پس منظر میں جائزہ لینا
چاہیے۔ اس زمانہ میں شعرا اپنے ہم عصروں پر بالاعلان
پھبتیاں کستے تھے، اور بلند پایہ شعرا تک کے یہاں پست ترین
فحشیات موجود تھے۔ مثال کے طور پر سودا کے کلام سے ان کے
ہجویات کے نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہی طرز
ابتذال قرار پایا جس کو لکھنؤ کی طرف منسوب کر دیا گیا حالانکہ
وہ بھی لکھنؤ کے کلچر میں ایک جو کھا انداز سخن تھا جس کو اس دور
نے قبول و منظور کر لیا تھا۔

دریا نے فارسی میں زیادہ اور اردو میں کم مشق سخن کی
تھی لیکن جو کچھ بھی اور جتنا جس زبان میں کہا اس میں شاعری
کمال کے اعلا نمونے ملتے ہیں۔

دریا کے اردو کلام میں بھی ان کا فارسی رنگ سخن جھلکتا ہے

لیکن پھر بھی وہ لکھنؤ کے اس مذاق سے پوری طرح متاثر تھے جو اس زمانہ میں پسند کیا جاتا تھا اور جس میں مبالغہ، تصنع اور خوش نما الفاظ و تراکیب کے گہر ہائے آبدار غلطیدہ رہا کرتے تھے۔ مثلاً چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

صیاد بفصل گل میں جو مجھ کو کرے اسیر — روؤں یہ اشک خوں کہ نظر آئے جا بجا لالہ باغ

ساقی شراب ناب پلائے جو غیر کو — پڑجائیں کیوں نہ شیشۂ خاطر میں بال تیغ

یار تک بار کہاں پاتے ہیں — راستہ ناپ کے پھر آتے ہیں

سخت جانی نے کیا ہے حیران — ہم تو مرنے بھی نہیں پاتے ہیں

درد دل کس سے کہیں اے دریاؔ — کوئی غم خوار نہیں پاتے ہیں

ہر گوشۂ گل کی یاد کر چراغ قمر کی تو — اللہ جانے دل کو لگی ہے کدھر کی تو

دریاؔ دلوں سے ڈرتے ہیں روشن ضمیر بھی — تھرائے کیوں نہ پانی میں شمع قمر کی لو

فرما نروایان اودھ عقیدتاً شیعہ مسلمان تھے لیکن اُن کے خمیر میں پاسداری اور رواداری کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ انھوں نے اپنا مذہبی عقیدہ کبھی کسی پر لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کے مسلط نہیں کیا۔ مگر چونکہ وہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے اور اُن کے درباروں میں ہولی کھیلی جاتی اور بسنت منایا جاتا اس لیے محرم کے دوران تعزیہ داری میں سارا شہر اُن کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ تعزیہ داری لکھنؤ کے کلچر میں داخل ہو گئی تھی جس کو فروغ دینے میں شہر لکھنؤ کے ہر ہندو اور ہر مسلمان کا حصہ تھا۔ تعزیہ داری کی بدولت غیر مسلم لوگوں میں بھی آلِ رسولؐ سے محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ محبت عقیدت میں بدلی، چنانچہ بہت سے ہندو شعرا نے بھی حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی مدح میں اشعار کہے ہیں۔ دریاؔ بھی انھیں شعرا کے زمرہ میں شامل تھے اس موضوع پر ان کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔ اس شعر میں بھی حضرت علیؓ سے عقیدت مندی کا اظہار ہے لیکن شعریت میں اس کمال کا مظاہرہ ہے کہ دوسرا مصرعہ پڑھتے جایئے اور سر دھنتے رہیے ؎

اے مرے عقدہ کشا عقدہ کشائی کیجے
تارِ جاں میں گرہیں پڑ گئیں ارمانوں کی

★

ڈاکٹر پی بھوی راج دُوا
سی۔ ڈی۔ آر۔ آئی۔
چھتر منزل۔ لکھنؤ۔

ایکتا کے پھول

تھکن سے ارادوں کو نیند آ رہی ہے
مصیبت کی بدلی گھری جا رہی ہے
یہ امن و اماں ڈھونڈنے والے انساں
بہت ہیں پریشاں بہت ہیں ہراساں
کہاں سے یہ آئی ہے نفرت کی آندھی
نہ جانے یہ کس سمت لے کر چلے گی
یہ انساں کی صدیوں پرانی ہے وحشت
ہماری صدی پر بھی طاری ہے جشت
یہ گویا یہ کالا یہ ہندو مسلماں
انھیں الجھنوں میں ہے انساں پریشاں
الٰہی تو دنیا کو جنت بنا دے
دلوں سے عداوت کو بالکل مٹا دے
کھلیں پھول ہر سمت بس ایکتا کے
سبھی نام لیوا ہوں ہر دو خدا کے

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۱۰۔ ویو البرٹ لیڈر روڈ
الہ آباد ۔ ۳

کلاوتی سہائے ماہر گلاوٹھی
۱۹۴۔ سرائے حسن گنج ڈالی گنج، لکھنؤ

غزلیں

انسانیت کو حاصلِ ایماں بنائیے
مستقبلِ جہاں کو درخشاں بنائیے

ہر گام پہ کھلائیے مہر و وفا کے پھول
ویرانۂ جہاں کو گلستاں بنائیے

ساحل تو مل ہی جائے گا ساحل کی فکر کیا
کشتی کا پہلے کوئی نگہباں بنائیے

قطرے کو پہلے موج میں تبدیل کیجیے
پھر بن سکے تو موج کو طوفاں بنائیے

جب زخمِ دل کو راس آئے کوئی علاج
خود درد ہی کو درد کا درماں بنائیے

روشن خیالِ یار سے کیجیے شبِ فراق
شامِ الم کو صبحِ درخشاں بنائیے

جوہر مقامِ دل سے گزریے کچھ اس طرح
اک اک قدم کو منزلِ جاناں بنائیے

کبھی تم نے دل میں بسا گھر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہے تبھی سے گھر یہ صنم کدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی پہلا وار نگاہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سرِ راہ کا وہی سانحا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی دل پہ نقشِ حسیں بنائے تھے موشگاف نے
ہے تبھی سے آئنہ آئینا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمھیں اس کو پیار سے دیکھ کر کبھی جب چرانے لگے نظر
ہے تبھی سے دل یہ بجھا بجھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ذوق و شوقِ دلِ جواں وہی فوجِ غمزۂ کامراں
وہی حسن و عشق کا معرکا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ ادائے عشوہ و ناز کا سرِ بزم رات ہجوم تھا
کہ میں بھیڑ میں کہیں کھو گیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہے تبھی سے ماہرِ فلسفی یونہی رہتا کھویا سا ہر گھڑی
کبھی اس نے تم کو تھا دل دیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ویریندر پرشاد سکسینہ
ٹی سرائے بدایوں (یو۔پی)

اردو کے چند ممتاز ہندو شعرا اور ان کی خدمات

عام طور پر اردو کی کہانی یوں شروع کی جاتی ہے کہ یہ زبان مسلم بادشاہوں کے لشکر میں اس وقت خرید و فروخت اور کاروبار کی میل جول سے پیدا ہوئی جو ہندو مسلمان کے درمیان ہوتا رہا۔ اور یہ دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ اردو کے جنم دن سے ہر زمانہ میں اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی میں ہندو ولوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کر دی ہیں اور اس کے چمن کو اپنے خون جگر سے سینچ کر سرسبز و شاداب رکھا ہے۔ کسی زبان کا محافظ اور اس کی بقا کا ضامن اس کا ادب ہوتا ہے۔ اور ادب سماج اور قوم کی مکمل زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

جب ہم اردو ادب کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں چنداں مایوسی نہیں ہوتی۔ غیر مسلموں نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں اگر ان کی پوری تفصیل مرتب کی جائے تو ایک ہزار صفحات کی پانچ جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ آج اس مقالہ میں اردو کے چند قابل ذکر اساتذۂ سخن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کی ادبی خدمات پہ پردہ پڑا ہوا ہے۔

ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) منشی مینڈو لال زآر لکھنوی۔ (۲) منشی شنکر دیال فرحت (۳) پیارے لال رونق دہلوی۔ (۴) منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی۔ (۵) منشی رام پرشاد لال جوہر آنولوی (۶) منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ (۷) منشی نرائن پرشاد مہر گیاوی۔

منشی مینڈو لال زآر لکھنوی

آپ قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے۔ جو ایک مردم خیز خطہ ہے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ والد کا نام منشی چندی لال تھا۔ قوم کے کائستھ تھے۔ زآر کی پرورش و تربیت علم و ادب کے گہوارے میں ہوئی۔ ان کا ذوق شعر فطری بھی تھا اور خاندانی بھی فارسی کے جید عالم تھے۔ مولانا حیدر علی نظم طباطبائی مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں نے منشی مینڈو لال زآر سے فارسی پڑھی۔ فن شعر میں آپ نے منشی تو تا رام عاقی سے استفادہ کیا اور خود اساتذۂ وقت میں شمار کیے گئے۔ آپ کی قابلیت و سخنوری کا دور دور شہرہ تھا۔ انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے مشہور سخن گویوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ خود بعد کو صاحب کمال ہوئے اور استاد فن کرچکے مثلاً منشی منولال صفا اور منشی گوبند پرشاد فضا۔ صفا کے متعلق جناب رفیق مارہروی خلف حضرت احسن مارہروی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ عربی و فارسی زبان کے منتہی تھے اور اپنے وقت کے کاملین میں سے تھے۔ ذیل کے دو شعر جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں آپ ہی کے ہیں ؎

چمن کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

فضا کے متعلق رفیق مارہروی لکھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کے مشہور و معروف شعرا میں سے تھے۔ اور متعدد کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں جن میں گلزار فضا، عروس فضا، بوستان اردو منظوم۔ اور مثنوی شیریں خسرو، آپ کی اہم تصنیف ہے۔

طباطبائی صفا اور فضا جیسے سخن ور اور عالم جس کے شاگرد ہوں اس کے تبحر علمی و قدرت سخنوری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت جگر بریلوی کے والد مرحوم نے حضرت زار کا آخری زمانہ دیکھا تھا وہ جگر صاحب سے فرمایا کرتے تھے کہ زار لکھنوی دو بھائی تھے۔ دونوں کے یہاں ہر شام کو دربار لگا کرتا تھا۔ صدہا شاگرد جن میں سے اکثر کا شمار اس وقت کے استادوں میں تھا در دولت پر حاضر ہوتے، صفوں میں قرینے سے درجہ بدرجہ بیٹھتے۔ حضرت زار مسند و تکیہ کو زینت دیے متمکن رہتے۔ دبلے پتلے پستہ قد منحنی سے آدمی، سر پر پٹے، چہرے پر سفید بالوں کا نور اور علم و فضل کا جلال! جس شاگرد کی باری آتی یوں مخاطب ہوتے: "بھئی تم پڑھو" وہ آہستہ آہستہ ایک ایک شعر پڑھنا شروع کرتا، جہاں اصلاح کی ضرورت ہوتی تو فوراً فرماتے اس کو یوں بنا دو! جب وہ ختم کر چکتا تو دوسرے سے اسی طرح ارشاد ہوتا۔ غرض سر شام سے رات کے دس، گیارہ بجے تک چشمۂ فیض جاری رہتا۔ تشنہ کامان ادب مدتوں اسی طرح سیراب ہوتے رہے۔ غدر کے کئی سال بعد انتقال فرمایا۔

نثر میں آپ کی تصنیف "گلزار فصاحت" درسی کتب میں شامل ہے۔

نظم میں بھی ایک ضخیم مکمل دیوان یادگار چھوڑا جس کا اب پتہ نہیں۔ چند اشعار جو ذیل میں درج ہیں آپ کی قادر الکلامی اور کمال سخنوری کے آئینہ دار ہیں۔ ؎

میں وہ پژمردۂ خاطر ہوں کہ میری آہ افسردہ
ہوئی فصل بہاری کے لیے باد خزاں پیدا

یہ آتش غم یار کی محفل سے لگی ہے
اے شمع ترے سر سے مرے دل سے لگی ہے

آنکھ اپنی بت حور شمائل سے لگی ہے
بت بن گئے جنت کی ہوا دل سے لگی ہے

اس نے زلفیں کھول دیں یاں داغ غم کم ہو گیا
زار سچ ہے سانپ کے آگے نہ ہو روشن چراغ

جس دم دھواں اٹھا دل پر اضطراب کا
گل ہو گیا فلک پہ چراغ آفتاب کا

منشی شنکر دیال فرحت

فرحت کے اسلاف کا وطن بھوگاؤں ضلع مین پوری تھا۔ آبا و اجداد میں قانون گوئی کا عہدہ وراثتاً چلا آتا تھا۔ ان کے دادا منشی جہان سنگھ نے فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔ والد منشی پورن چند تلاش معاش کے سلسلے میں لکھنؤ آئے، سرکار اودھ کی قدر شناسیوں اور فیاضیوں نے خوش آمدید کہا۔ اس سرکار کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہیں فرحت کی ولادت ۱۸۵۵ء میں ہوئی جو ذکاوت اور ذہانت پیدائش سے ساتھ لائے تھے۔ بلکہ شاعری کا رجحان بھی فطری تھا۔ فارسی پر فاضلانہ عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور سنسکرت میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو کا تو ذکر کیا گھر کی زبان تھی اس کو ذریعہ تصنیف بنایا نظم و نثر دونوں میں اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ کسب معاش کے لیے مطبع امریکن مشن لکھنؤ (جو اب لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے) سے منسلک ہو گئے تھے۔ منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی نے جو تاریخ آپ کی وفات پر ارشاد فرمائی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ۱۲۹۵ف میں انتقال فرمایا۔ تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔

فرحت گئے اس جہاں سے ناگاہ
کیا زیست ہے بے ثبات ہے ہے!

فصل میں یہ صدرؔ نے لکھا سال
فرحتؔ نے کی وفات، ہے ہے۔

۱۲۹۵ ف

آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو بیشتر مذہبی رنگ کی ہیں۔ آپ کی حسب ذیل تصانیف، رامائن منظوم، پریم ساگر، منظوم جاتک، بیج منظوم، شو پران منظوم، ادبھت رامائن، گنیش پران، گوری منگل اور پدم پرانہ میری لائبریری میں محفوظ ہیں ہندو دھرم کے ضخیم صحیفوں کے منظوم ترجموں نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

منشی دیبی پرشاد بشاشؔ نے تذکرۃ الشعرائے ہنود میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"یہ بھی ہندوؤں میں بڑے شاعر شیریں زبان ہیں اور کئی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کی نظم میں ایک خاص لطف ہے۔ اس میں فصاحت اور بلاغت دونوں موجود ہیں اور صنائع بدائع مزید براں۔ لفظوں کی چستی اور قافیوں کی درستی جو ان کے اشعار میں دیکھی جاتی ہے، اس کی تعریف کہنے میں نہیں آتی۔ گویا سخن کا ایک دریا جوش مار رہا ہے۔ اس سے جو موزوں الطبع ہے وہ سخن کے شاہوار موتیوں کا مینہ سا برسا جاتا ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ کلام مختصر اور مطلب سے پُر ہے...... ان سب خوبیوں پر فائق ایک خوبی ان کی تصنیفات میں ہے۔ وہ یہ ہے کہ بہت بڑا حصہ ان کے کلام کا مذہبی حقائق پر مبنی ہے اور ان سے اہل عالم کو طرح طرح کے فیض و فائدہ پہنچتے ہیں۔"

فرحتؔ کی رامائن منظوم بہت مقبول ہوئی اور حق یہ ہے کہ اس کی بدولت آپ کا نام ہندوؤں میں یادگار چلا آتا ہے یہ مثنوی بلاغت و فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ روانی و جوش سے بھی معمور ہے صنائع و بدائع بھی کافی ہیں۔ بندشیں چست، الفاظ درست ترکیبیں مرصع، تشبیہیں اور استعارے پر لطف اور برمحل غرض شاعری کی تمام خوبیوں سے مالا مال ہے اور یہی اس کی دلکشی کا باعث ہے۔

فرحتؔ غزل بھی خوب کہتے تھے اور اردو فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ ان کی اردو غزل کا رنگ اس عہد کے لکھنؤ کا رنگ ہے۔ جس میں استادانہ شان نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔؎

کون اے جاں مرا حالِ دلِ برہم سمجھے
ہاں جو سمجھے تو تری کاکلِ پرخم سمجھے

ہو گئی اک دانۂ گندم سے خرابی کیا کیا
ہائے سمجھے نہ یہ حضرت آدم سمجھے!

حل کسی سے نہ ہوا عقدۂ پیچیدۂ زلف
اس معمے کو جو سمجھے تو فقط ہم سمجھے

سنگ اسود کا ہوا تل پہ گماں اے فرحتؔ
رُخ کو کعبہ دہن کو زمزم سمجھے

سنا ہے آپ ذکرِ عاشقِ ناشاد کرتے ہیں
جزاک اللہ مجھ بھولے ہوئے کو یاد کرتے ہیں
اُتر آئی ہیں پریاں صاف ان کے شیشۂ دل میں
نہیں معلوم کیا جادو یہ آدم زاد کرتے ہیں

قصۂ ہجر بتاں ہوش میں آؤں تو کہوں
تھام لوں ضبط کروں دل کو سنبھالوں تو کہوں
سلسبیل دہن پاک کی پوچھو تو خبر
ہاتھ منہ دھو لوں وضو کر لوں نہا لوں تو کہوں
زلف و لب زہر ہیں یا قند ہیں کہہ دوں کیونکر
سونگھ لوں ڈال لوں چکھ لوں مزا لوں تو کہوں
رازِ دل کی نہ کسی کو ہو خبر کانوں کان
فرحتؔ اغیار کو جب بزم سے ٹالوں تو کہوں

پیارے لال رونق دہلوی

پیارے لال رونق کا آبائی وطن دہلی تھا۔ آپ کے والد بزرگوار منشی جے نرائن دہلی کے مشہور کالستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں دہلی کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں خاص حصہ لیا تھا۔ شاعری کا ذوق رونق کو بچپن سے ہی تھا۔ اس لیے ابتدا میں کچھ غزلیں مرزا داغ کو دکھائیں اس کے بعد مولانا راسخ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ آپ کا شمار مولانا کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ بلکہ اگر آپ کو مولانا کا جانشین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آغاز شباب سے لے کر پیرانہ سالی تک شعر و شاعری کا مشغلہ رہا۔ دہلی اور نواح دہلی کے سینکڑوں مشاعروں میں شریک ہوے۔ رسالہ "کمال" دہلی بھی آپ کے زیر ادارت کئی سال تک نکلتا رہا، یہ شعر و سخن کا ایک گلدستہ تھا۔ آپ کی غزلیات کا دیوان ۱۹۰۲ء میں رونق سخن کے نام سے شائع ہوا تھا اور ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہو چکا ہے مگر اب کمیاب ہے۔ آپ کی وفات کے بعد کالستھ ارد و سبھا دہلی" نے آپ کی مختلف نظموں اور غزلوں کا انتخاب کلام رونق کے نام سے شائع کیا۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں ۶۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ رونق اپنے حلقۂ احباب میں ہر دلعزیز تھے۔ ان کے ہم عصروں نے ان کی وفات پر نوحے، نظمیں اور قطعات، تاریخیں لکھیں۔

سیدا دہلوی مرحوم کی نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

وہ بے مثال آپ ہی اپنی نظیر تھا
چالیس سال سے وہ مرا ہم سفیر تھا
گویا زبان داغ میں رنگ امیر تھا
وہ یادگار رونق روشن ضمیر تھا

دہرا ہوا ہوں غم سے وہ رنج و محن ہے آج
میری کمر بھی زلف شکن در شکن ہے آج

رونق کا شمار دہلی اسکول کے مستند استادوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں داغ اور امیر مینائی کا رنگ پایا جاتا ہے، زبان کی فصاحت، روزمرہ، اسلوب بیان کی جدت و دلآویزی کے علاوہ شگفتگی زبان اور قادر الکلامی کے لحاظ سے ان کی غزلیں خوب ہیں۔ آخری دور کی غزلوں میں تصوف و زبان کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

برق دہلوی رونق پر "زمانہ" اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اپنا مضمون ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتے ہیں:۔

"دلی کے مشاہیر حال میں جناب رونق کا دم بھی مغتنمات سے تھا۔ آپ کے انتقال پُر ملال سے سخنوران سراپا کمال میں ایک ایسے شاعر کی جگہ خالی ہو گئی جس کا پُر ہونا محال ہے۔ آپ بڑے کہنہ مشق، قادر الکلام اور اعلا پایہ کے سخن سنج تھے۔ استعداد علمی بقدر ضرورت تھی لیکن شعر خوب کہتے تھے۔ کلام میں فصاحت اور صفائی زبان کے علاوہ چستی، بندش، بلند خیالی تصوف و معرفت فلسفہ اور اخلاق کا رنگ بھی نمایاں ہے"

رونق کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں ؎

تصویر کے پردے میں جب حسن مجاز آیا
جو عشق کا مخفی تھا وہ سامنے راز آیا

پیشانی عاشق نے جھک جھک کے ترے در پر
سو بار کیے سجدے جب طرز نیاز آیا

کچھ نہیں اور یہاں جلوۂ وحدت کے سوا
کیا نظر آئے نگاہوں کو حقیقت کے سوا

نور آنکھوں میں رہا تیرا تصور دل میں
ہم نے جلوت میں بھی دیکھا تجھے خلوت کے سوا

پی کے کھل جاتے ہیں اسرار حقیقت رونق
اور کیا شغل ہو جام مئے وحدت کے سوا

کس کو اے رونق سناؤں داستان درد عشق
لاکھ افسانوں سے بڑھ کر ہے مرا افسانہ ایک

جب تک رہی خودی نہ ملا خود کا کچھ پتہ
اس کی خبر ملی مجھے جب بے خبر ہوا

جھپک گئی جو پلک اپنی وقت نظارہ
جمال یار تھا آنکھوں میں میری خواب نہ تھا
اٹھا کے پردۂ پندار دل سے جب دیکھا
تو حسن و عشق میں رو تک کوئی حجاب نہ تھا

منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی

خوشتر تخلص جگن ناتھ نام، منشی منا لال کے بیٹے تھے لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ان کے بزرگوں کا وطن ہڈیہ ضلع اناؤ تھا۔ خوشتر واجد علی شاہ کے دفتر میں متعلق تھے۔ ۱۸۶۴ء میں وفات پائی۔ راماین خوشتر کے علاوہ شیر میں بھاگوت منظوم اور مثنوی چتر گپت جس کا نام پدام پدیستھی ہے۔ آپ کی یادگار ہیں یہ تینوں کتابیں میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔

محمد سلیم صدیقی اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد یونیورسٹی بابتہ ۲۹-۱۹۲۸ء کے صفحہ ۴۳ پر لکھتے ہیں۔

"جگن ناتھ خوشتر نے دوسری بار راماین کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا جو آپ کی شیرینیٔ کلام کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بھاگوت اور مثنوی چتر گپت کا ۱۲۷۹ھ میں سنسکرت سے منظوم ترجمہ کیا۔ زبان صاف اور شیریں ہے جس میں نہ سنسکرت کے الفاظ کو دخل ہے نہ بھاشا کی کھپت کلام پر استاد غالب کا اثر غالب ہے۔"

خوشتر کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ہندو گھر میں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ راماین خوشتر مزے سے گئی۔ "راماین خوشتر" پہلی بار ۱۸۶۴ء میں مطبع منشی نول کشور پریس میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بعد اس کے سولہ ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ سولہواں ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ یہ راماین شائع ہوئی تو نسیم دہلوی نے یہ تاریخ کہی ہے

عیسوی تاریخ اے فکر رسا
کہہ "چھپے خوشتر کے افکار بجا"

اردو کے مثنوی نگاروں میں میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، احمد علی شوق قدوائی، مرزا شوق، جگر بریلوی، برق سیتاپوری، راحت کاکوروی، فرحت لکھنوی اور منشی مول چند منشی کافی مشہور ہیں۔ لیکن اس صنف سخن میں ان کی شہرت مثنوی راماین خوشتر کے پیش نظر کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ اس مثنوی کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں کیا جا سکتا ہے۔ سلاست زبان، پختگی بیان، بندش کی چستی اور شگفتہ طرز بیان میں یہ مثنوی لاجواب ہے۔ منظر نگاری اور واقعات نگاری کے دلکش اور اثر آفریں نمونے اس میں ملتے ہیں۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ہے

ہوا جب مطلعِ خورشید روشن
گلستانِ جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارضِ حور
رخِ عالم پہ چمکا پرتوِ نور
اڑا زاغِ سیاہِ شب جہاں سے
ہمائے روز نکلا آسماں سے
ہوئی قوسِ ہلالِ شب شکستہ
عروسِ صبح نکلی دست بستہ
فلک پر شاہدِ خورشید آیا
دُرِ شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوا بیدار شاہ بخت بیدار
شہنشاہ جنگ پور نیک کردار
ستارہ روشن جبین و ماہ سیما
ہوا تختِ شہی پہ جلوہ فرما
کہا بزم شہاں آراستہ ہو
مکانِ خسروی پیراستہ ہو

شہنشاہ آج ہوں سب رونق افروز
کہ ساعت احسن و فرخ ہے امروز
بحکم شاہ تب با شان و شوکت
ہوئے مصروف سب ارکانِ دولت
بچھے زریں ہزاروں تخت و کرسی
کہ تو سیں بیٹھنے کو جس پر قدسی
ہوا آراستہ جب سب یہ ساماں
ہوا خوش دیکھ کر یوں شاہ دوراں
جنک پور میں جو دارد تھے شہنشاہ
کیا سب کو شہ نزہت نے آگاہ
وفورِ شوق سے لے صبر و طاقت
شتاباں آئے سوئے بزم عشرت
ہر اک کو شاہ بالتعظیم لایا
بہ عزت کرسیٔ زر پر بٹھایا
رعایا شہر کی بہر تماشا
ہوئی دربارِ شہ میں جمع ہر جا
بٹھایا شہ نے با تکریم سب کو
مناسب کی جگہ تقسیم سب کو
بہ لطفِ شاہ کم کوئی نہیں تھا
جو ادنیٰ تھا وہاں کرسی نشیں تھا

منشی رام بہادر لال جویاؔ آنولوی

منشی رام بہادر لال جویاؔ آنولوی ۲۲ اگست ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو ان کا چراغِ زندگی گل ہو گیا۔ آنولہ ضلع بریلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا نام منشی رام غلام تھا۔ جو عربی فارسی اور ہندی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ انھیں سے جویاؔ صاحب نے درس تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ذاتی انہماک اور مطالعہ سے ایک عالم متبحر بن گئے اور اپنی قابلیت میں قابل قدر اضافہ کیا۔ شاعری میں سرورؔ جہاں آبادی کے بھائی حکیم رگھبیر سہائے برباںؔ کے شاگرد تھے۔ آغازِ شباب سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔

حضرت برباںؔ کی رہنمائی نے انھیں ایک پختہ کار شاعر بنا دیا۔ سوزنؔ بریلوی مرحوم تمرؔ بریلوی اور صہبائی بدایونی ایسے مشہور شاعروں کے آپ استاد تھے۔ آپ کا دیوان سروِ چراغاں کے نام سے انجمن جویائے سخن بدایوں نے شائع کرا دیا ہے۔ ناول پیراہن یوسفی اور ارمغانِ اردو کے بھی آپ مصنف تھے۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں سے کوئی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور نہ آئندہ اس کی کوئی صورت ابھی تک نظر آتی ہے۔

جویاؔ صاحب نے اپنے فن کے کمالات خوب خوب دکھائے۔ نظم اور غزل میں آپ کا شمار اساتذہ میں ہے۔ کلام میں شیرینی رنگینی، جوش اور سلاست کے علاوہ پختگی پائی جاتی ہے۔ قدیم رنگِ تغزل کے پیرو تھے۔ لیکن اسے کچھ ایسے نئے انداز اور آہنگ کا روپ دیا ہے۔ جس سے ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ سوز و گداز مگر ساتھ ساتھ رنگینیٔ بیان، ان کا حصہ تھی۔ خود فرماتے تھے کہ جس کلام میں درد نہ ہو وہ دل پر اثر ہی کیا کرے گا۔ بلیغ سے بلیغ مضمون کو سلیس سے سلیس زبان اور با محاورہ زبان میں بیان کرنا فنکاری سمجھتے تھے اور اس پر خود قادر تھے۔ ان کے کلام میں میرؔ کی نزاکت غالبؔ کی بلاغت اور داغؔ کی زبان کی جادوگری بیک وقت نظر آتی ہے۔ حضرت جگرؔ بریلوی سروِ چراغاں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"ان کا شمار استادوں میں تھا۔ استاد ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ شاعر ہونا بڑی بات ہے۔ جویاؔ شاعر تھے اور صفِ اوّل کے۔ انھوں نے اپنے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ غزل ان کا خاص موضوعِ سخن تھا۔ ملک کے سیاسی حالات سے بھی متاثر تھے۔ انھوں نے جنگِ آزادی کی ابتدا و اختتام دیکھا تھا۔ اس انقلابِ عظیم کے واقعات پر بھی انھوں نے لکھا ہے۔ انھوں نے آزادیٔ ملک کی روحِ پرور صبح بھی دیکھی اور

مہاتما گاندھی کا دلگداز سانحہ بھی ان تمام قومی واقعات کی تصویریں ان کی منظومات میں کھینچی ہیں۔ غزل انھوں نے بڑی شغف سے کہی ہے مگر ان کا دائرہ خیال غزل کے میدان تک ہی محدود نہیں رہا۔ وہ یک فن شاعر نہیں تھے۔ غزلوں کے اشعار کا ایک مختصر انتخاب پیش کرتا ہوں۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں ؎

چہرے پہ تازگی ہے مگر دل اداس ہے
میں پھول ہوں چراغ کا لو ہے نہ باس ہے

وہ دوائیں وہ دعائیں جو نہ دیکھی نہ سنیں
پھر بھی ہے شرم مسیحا تہِ بیمار کے ہاتھ

دکھاتا ہے دلا کر یاد کیوں دل باغباں میرا
گری تھی جس پہ بجلی ہاں وہی تھا آشیاں میرا
قفس میں کھینچ کر نقشہ چمن کا میں دکھاتا ہوں
یہاں چنتا تھا میں تنکے یہاں تھا آشیاں میرا

پھریں گے بعد فنا دن مرے نہ تھی یہ امید
وہ خواب میں مجھے دیکھیں گے یہ خیال نہ تھا

ہائے ان کے کشتگانِ نازکی بے تابیاں
مر گئے پھر بھی تو دل پر ہاتھ تھا رکھا ہوا

نتیجہ ضبطِ غم کا کون کہتا ہے برا ہوگا
یہی وہ زہر ہے جو ایک دن ہم کو دوا ہوگا

مجھ کو میری ہی نہ لگ جائے کہیں آج نظر
یا خدا بھول کے تم نے یہ کدھر دیکھ لیا

خزاں کا آتشِ گل کا گلا کس کس کا ہو گویا
مری فریاد ہی کو کیوں نہ برقِ آشیاں کہیے

نہ دو مجھ آشیاں برباد کو طعنے چمن والو
ابھی بادِ صبا تنکے لیے دو چار پھرتی ہے

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی

ولادت ۱۸۶۴ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ آپ کے والد منشی پورن چند ذرّہ اردو ادب کی ایک اہم شخصیت تھے۔ ہفتہ وار اخبار تمنائی کے بانی و مالک تھے۔ جس کی ادارت کے فرائض ان کے بڑے صاحبزادے منشی رام سہائے تمنا انجام دیتے تھے۔ منشی ماتا پرشاد نیساں منجھلے اور حضرت افق ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کے دادا منشی ایشوری پرشاد شعاعی اور پردادا منشی اودے راج مطلع بھی شمع سخن کے پروانے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ شعاعی مرزا قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ منشی شنکر دیال فرحتؔ آپ کے ماموں تھے جن کا شمار ہمارے صف اوّل کے اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ ان کی لافانی رامائن اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ افق مرحوم نے انھیں سے شاعری میں استفادہ کیا۔ افق مرحوم کمسنی ہی سے شعر فرماتے تھے۔ پہلے دلؔ تخلص رکھا لیکن بعد میں افق تخلص اختیار کیا۔ حضرت افق فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ انگریزی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ آپ کی تصانیف کی مجموعی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ آپ کی رامائن یک قافیہ کا تو اردو ادب میں جواب نہیں۔ رامائن منظوم، سناتن دھرم پرکاش، سوانح عمری گرو گوبند سنگھ منظوم خاص طور پر قابل قدر کارنامے ہیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اپنے بڑے بیٹے رام شنکر پرشاد مرحوم کے غم میں جو ایک نوعمر اور مشہور اہل قلم اور صحافی تھے حضرت افق نے جان دیدی۔ حضرت افق کے دوسرے صاحبزادے حضرت بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کا شمار بھی ان چند شاعروں میں ہے جن کی حیثیت ایک مسلم الثبوت استاد کی ہے۔ ان کے تیسرے صاحبزادے کشن پرشاد مقدر مزاحیہ رنگ میں لکھتے ہیں۔

حضرت افق کی تصانیف جو راقم کی نظر سے گزری ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رامائن منظوم :۔ یہ رامائن مثنوی کی بحر میں ہے اس میں تلسی داس جی کے شاعرانہ خصوصیات کو جس حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ رامائن دو بار نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۔ رامائن یک قافیہ منظوم :۔ صرف یہی ایک تصنیف آپ کے نام کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۸۰ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور دوسرا اڈیشن بھی اسی پریس سے ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔"

۳۔ "سوانح عمری گرو گوبند سنگھ منظوم"۔ اس منظوم سوانح عمری سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف کی قدرت بیانیہ قابل دید ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

۴۔ رام ناٹک :۔ یہ ڈراما بے جواب بھی ہندستان میں کھیلا جاتا ہے۔ ڈرامہ معیاری اور لاجواب ہے۔ اردو زبان میں رامائن کو ڈرامہ کے رنگ میں پیش کرنے کی سعادت سب سے پہلے حضرت افقؔ کو نصیب ہوئی۔

۵۔ حیات باقی :۔ فارسی مثنوی ہے جو مرحوم راجا گردھاری پرشاد باقیؔ رئیس حیدرآباد کے حالات زندگی سے متعلق ہے۔ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ ان کے خاص قدردانوں اور سرپرستوں میں تھے۔ انھیں کے توسل سے حضرت افقؔ کی رسائی میر محبوب علی خان نظام دکن کے دربار تک ہوئی تھی۔

حضرت افقؔ دورِ متوسط کے شاعر ہیں اور ان کا شمار اپنے وقت کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ آپ غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ لیکن زیادہ تر دلدادہ نظم ہی کے تھے۔ اور نظم گو ہونے کی حیثیت سے جس مرتبہ کے شاعر تھے کسی سے مخفی نہیں۔ ان کو مسدس سے خاصی دل چسپی تھی بیشتر کلام اسی صنف سخن میں ہے۔ ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے آپ کی خدمات کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ حضرت جگرؔ بریلوی یادِ رفتگاں میں آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

"آپ کا میدان فکر و خیال وسیع تھا۔ شاعر، ناشر، اخبار نویس، مترجم، مورخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس، ظرافت نگار، غرض ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس میں آپ کے قلم نے جوہر نہ دکھائے ہوں، علم عروض و قافیہ اور صرف و نحو کے ماہر تھے۔ کئی کتابیں آپ نے قواعد پر بھی لکھیں۔ تاریخی معلومات بہت وسیع تھی۔ نثر تو قلم برداشتہ لکھتے ہی تھے۔ نظم میں بھی یہ کمال تھا کہ بات بات میں مصرع اور شعر زبان سے نکلتے تھے۔

نظم میں ہر صنف میں آپ نے زورِ قلم دکھایا۔ غزل قصیدہ رباعی مسدس، مثنوی، غرض سب کچھ لکھا اور بہت لکھا...... آپ کی تصنیفات بے حساب اور بے شمار ہیں۔ بعض تو ایسی نایاب ہوئیں کہ فراموش ہی ہو گئیں۔ تصنیفات کے اس ضخیم و عظیم ذخیرے کو دیکھ کر حضرت افقؔ کی قابلیت اور قوت تحریر پر حیرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ تحریر و تقریر سے خالی نہ تھا۔ آپ کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور آپ نے اپنے زمانے میں بہت شہرت پائی۔ آپ کی تحریر میں روانی اور دلکشی ہے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا چٹخارہ۔"

(ماخوذ از یادِ رفتگاں صفحات ۲۹۱ سے ۳۰۰ تک)

سید مسعود حسن رضوی صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے تاثرات حضرت افقؔ کے سلسلے میں ملاحظہ فرمایئے :

"جناب افقؔ نے مختلف حیثیتوں سے شعر و ادب کی کی بڑی خدمت کی۔ وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ کئی ناولیں تصنیف کیں۔ کئی مختصر سوانح عمریاں لکھیں۔ رسالوں میں مضامین شائع کیے۔ گیت بنائے۔ ڈرامے لکھے۔ اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور خاص طور پر شاعری میں بہت شہرت حاصل کی۔ انھوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔

وہ ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم "اخبار جو تقریباً تمام و کمال نظم میں ہوتا تھا ان کی پُرگوئی اور زود گوئی کا شاہد ہے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

"مشہور یہ تھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اس کی تردید میں ایک ہجوم جس طرح ایک طرف کشمیری پنڈتوں (نسیم سرشار وغیرہ) کا تھا اسی طرح دوسری طرف کائستھوں کا تھا اور کائستھ اہلِ قلم برادری کی صفِ اول میں ایک جوالا پرشاد برق تھے اور دوسرے یہی دھار کا پرشاد افق تھے۔"

آپ کی غزلوں پہ ناسخ مرحوم کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ آپ کی غزل گوئی کے بارے میں حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں فرماتے ہیں:

"غزلیں آپ نے کم کہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد غزل سے بالکل طبیعت ہٹ گئی۔ نظم میں مذہبی رنگ غالب ہو گیا۔ غزلوں میں عشقیہ مضامین ہیں۔ وہی جن کے پیشوا امیرؔ و داغؔ تھے۔ طرزِ ادا میں سادگی، روانی، سلاست اور مٹھاس ہے اور کہیں شوخی بھی کہیں سیاسیت بھی جھلکتی ہے۔"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

زمانہ اپنا تھا اپنا برابر جب زمانہ تھا
تھا ربط و ضبط قسمت سے فلک سے دوستانہ تھا

جہاں گلزار میں چننے ہو تم بکھرے ہوئے تنکے
کبھی میرا بھی واں اے ہم صفیرو آشیانہ تھا

طیورِ باغ کیوں صیاد تیرے جال میں پھنستے
وہیں تقدیر لے آئی جہاں کا آب و دانہ تھا

پھڑک نے بھی نہ پایا طائرِ جاں نیم بسمل میں
غضب کی نوکِ ناوک تھی قیامت کا نشانہ تھا

دکھاتے اے افق لیلیٰ دشتوں میں سرگزشت اپنی
جو قصہ کوہکن کا تھا جو مجنوں کا فسانہ تھا

ہمارے زخم میں ٹھنڈک لہو سے ہوتی رہتی ہے
تسلیِ دل کی تکلیفِ رفو سے ہوتی رہتی ہے

مانعِ عشق کوئی لاکھ ہو، ہوتا کیا ہے
ہم جو مرتے ہیں کسی پر تو کسی کا کیا ہے

مردمِ چشم کے آگے نہیں آتے ہم کیوں
ابھی بچے ہیں یہ ان سے تمھیں پروا کیا ہے

آئے ہستی میں ہو کیوں اے مرے یارانِ عدم
خاک میں ملنے سے تم لوگوں کو ملتا کیا ہے

جانِ شیریں لبِ شیریں پہ جو دیتے ہو افق
نہیں معلوم کہ اس میں تمھیں میٹھا کیا ہے

دل ہی کی دل میں وصل کے دن بات رہ گئی
وہ چل دیئے جب ایک پہر رات رہ گئی

رہتی ہیں یادِ دلربا کے عوض آنکھیں اشکبار
دنیا میں ایک بس یہی برسات رہ گئی

حضرت افق کی خاص شہرت اولاً نظم "اخبار" اور دوم بھارت، ناٹک راجستھان والیکی رامائن اور شریمد بھاگوت (خلاصہ) کے تراجم سے ہوئی۔ یہ تراجم زمانہ قیام لاہور میں ہوئے۔ کہنے کو تو یہ کارنامے ترجمہ ہیں در حقیقت ان میں ایک مشاق ادیب کی اور بخیل نگارش کے بہترین نمونے ملیں گے۔

افسوس ہے کہ حضرت افق کے تصنیف کردہ ناول اب تقریباً ناپید ہیں طلسم دو جلدیں، فتنہ کا دوسری شاہزادی، اوزنگ زیب و شیواجی مرہٹہ اور عالم تصویر عرت جنگل کماری وغیرہ۔ کسی زمانے میں مشہور تھیں۔ ان کی ناول نویسی کا وہی زمانہ ہے جو سرشار کا تھا۔ نول کشور پریس لکھنؤ کے لیے انھوں نے کئی انگریزی ناول ترجمہ کیے جن میں کچھ شائع ہو چکے ہیں اور کچھ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں ان کا ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ یعنی انگریزی زبان سے مکمل الف لیلہ کا ترجمہ (جس کا حصہ نظم کا ترجمہ منظوم تھا) منصۂ شہود پر

جلوہ گر نہیں ہو سکا۔ یہ ترجمہ نولکشور پریس کے مالک رائے بہادر پراگ نارائن بھارگوا کی خاص فرمائش سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ اب بھی نولکشور پریس میں محفوظ ہے۔

لمعاتِ افق کے نام سے حضرت افق کے حالاتِ زندگی اور کلام کے مجموعہ کو ترتیب دے کر حضرت منور لکھنوی نے افق سنٹینری کمیٹی دہلی کی نگرانی میں ۱۹۶۴ء میں شائع کرایا۔

منشی نرائن پرشاد قہر گوالیاری

نرائن پرشاد نام، قہر تخلص ۱۸۶۸ء کو ریاست گوالیار کے مشہور ضلع بھل گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد سلطنت مغلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے چنانچہ آپ کے مورثِ اعلیٰ رائے پراگ داس شہنشاہ اکبر کے عہد میں دیوان تھے۔ سات سال کی عمر میں حضرت قہر نے پڑھنا شروع کیا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں منشی حکمت رائے صاحب سے پڑھیں جو فرخ آباد کے ایک کہن سال بزرگ تھے۔ اس کے بعد کتبِ متداولہ کا درس قاضی ہدایت اللہ صاحب سے لیا جو فارسی و عربی میں منتہی تھے۔

مشرقی زبانوں میں عبور حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بریلی گئے اور الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اس کے بعد سررشتہ تعلیم میں گوالیار میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۷ سال تک وکٹوریہ کالج گوالیار میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اس کے بعد مردم شماری کے کمشنر گوالیار کے پرسنل اسسٹنٹ ہوئے۔ مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا اور ان کے جانشین تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا داغ کے تلامذہ میں ان سے بہتر غزل کہنے والا اپنے استاد کے رنگ میں کوئی نہیں ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

حضرت قہر کے استاد بھائی حضرت نوح ناروی مرحوم اور جناب حسب لال رعد مرحوم نے حسب ذیل قطعات کہے ہیں جن سے آپ کے قلبی تعلق اور احترام کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

قطعہ تاریخ از حضرت نوح ناروی

قہر صاحب چل بسے دنیا سے آج — کر گئے ملک سخن کو وہ تباہ
نیک خو فرخندہ پیکر پاک ذات — خوش ادا والا حشم عالی نگاہ
واقفِ رازِ بلاغت لا کلام — ماہرِ سیرِ فصاحت آہ آہ
جلتے جلتے بجھ گئی شمعِ حیات — ہو گیا عالم نگاہوں میں سیاہ
نوح کے دل سے یہ نکلا سالِ فوت — لکھ غروبِ مہرِ زریں بارگاہ

۱۹۴۹-۶ء ۱۹۴۳ء

غروب قہر زریں بارگاہ۔ ۱۹۴۹ء تخرجہ نوح کے دل کا یعنی واو۔ ۶ = ۱۹۴۳ء

قطعات تاریخ از حضرت رعد مرحوم

(۱)

اٹھ گیا دنیا سے اک شیریں کلام — کیوں نہ ہو دل کو الم بے انتہا
تھے سخن سنج اور نقادِ سخن — خاص ملکہ شاعری کے فن میں تھا
تھے مرے استاد بھائی وہ بزرگ — مجھ پہ کرتے تھے کرم بے انتہا
فکر جب تاریخ لکھنے کی ہوئی — غیب سے یہ کان میں آئی ندا
رعد یوں لکھ قہر کا سالِ وفات — شاعرِ خوش فکر دنیا سے گیا

۱۹۴۳ء

حسب ذیل تصنیفات آپ کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں:

(۱) "شعاعِ مہر" مجموعہ ہے نرائن پرشاد قہر کی غزلوں اور نظموں کا۔ یہ مجموعہ ان کی حیات ہی میں بمبئی سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کے شائع ہوتے ہی اردو کے نقادوں اور ادیبوں نے جناب قہر کو اپنے دور کا ایک ممتاز غزل گو شاعر تسلیم کر لیا تھا:۔

(۲) "رہنمایانِ ہند" یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ پرنسس آف انڈیا کا کامیاب ترجمہ ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد دکن سے بھی یہ ترجمہ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ پنڈت منوہر لال زتشی، مولانا شبلی اور منشی دیا نرائن نگم جیسے ماہرانِ فن نے اس کتاب کے ترجمے کی تعریف کی ہے۔

(۳) "سفید جوگتے" دلی کی ٹکسالی زبان میں ایک معاشرتی

ناول ہے یہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ حضرت مہر نے خود اس کتاب کو شائع کرایا تھا۔

(۴) "منثور ثریا" چھ بلند پایہ اردو مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب مسلم پریس بنگلور نے شائع کی تھی مگر اب عنقا ہے۔

(۵) "رہبر مضمون نگاری" یہ کتاب زبان اردو میں اپنے موضوع پر بے مثل و نایاب کتاب ہے۔ اردو مضمون نگاری سکھانے کے لیے اس کتاب کا دوبارہ شائع ہونا ضروری ہے۔

(۶) "محاورات مہر" اردو زبان کے محاوروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ سند کے لیے حضرت مہر نے اپنے دیوان سے اشعار درج کیے تھے یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی۔

حضرت مہر گوالیاری اپنے استاد مرزا داغ کی طرح زبان کے بے مثل جادوگر تھے۔ انھوں نے زبان اردو کو خس وخاشاک سے پاک وصاف کر کے جوبن کی دلھن بنا دیا تھا۔ فصاحت و بلاغت اور پاکیزگی کے علاوہ شوکت الفاظ، محاورات کی برجستگی، معنی آفرینی اور نادر تراکیب سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ داغ کا کلام بعض جگہ سوقیانہ اور رندانہ نظر آتا ہے۔ لیکن مہر گوالیاری کے یہاں کوئی بھی شعر اس قبیل کا نہیں ملے گا۔ حضرت جگر بریلوی "جذبہ غزل" میں رقمطراز ہیں:-

"آپ کی غزل نہایت صاف شستہ اور پاکیزہ ہے داغ کا سا لہجہ نرمی چستی اور بانکپن ہے لیکن حیرت ہے کہ داغ کی سی سوقیت اور بازاری تعشق اور پست قسم کے معاملات حسن و عشق سے یکسر پاک ہے۔ مہر داغ کے شاگرد رشید ہیں۔ داغ کے طرز ادا اور انداز بیان کا کامیابی کے ساتھ اتباع کرتے ہیں مگر پست مذاقی سے بالکل مبرا ہیں آپ کی غزل سادگی و سلاست کا نمونہ ہے اس میں ایک دلفریب ترنم ہے طرز ادا میں طرحداری ہے جو پاکیزگی مضامین سے مل کر دل و دماغ کو مسرت انگیز لذت بخشتی ہے وہ لذت جو بلندیِ فطرت کی کیفیتوں سے معمور ہے"

آپ کے کلام پر سید احمد شاد کاکوروی کی رائے ملاحظہ ہو:-

"آپ کا رنگ سہل ممتنع - زبان کی فصاحت - روزمرہ کی صفائی اور بیان کی ندرت ہے - ان پر نظر کرتے ہوئے ہم آپ کو حضرت داغ کے بہترین تلامذہ میں جگہ دیے بغیر اور ان کا صحیح اور سچا جانشین مانے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فصاحت، خوش بیانی، بندش کی صفائی، مضمون کی دلنشینی سے ہر غزل دل میں چٹکیاں لیتی ہے ہر شعر بیتاب کر دیتا ہے۔ اکثر محض الفاظ کی الٹ پھیر، ترکیب کی درستی بندش کی چستی شعر میں جان ڈال دیتی ہے اور بے اختیار زبان سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ آپ فن شاعری کے ماہر کامل، اردو زبان کے خاص محسن، غزل گوئی میں ید طولیٰ رکھنے والے اردو شاعری کے سرمایۂ ناز اور ہند کے نامور ادیب ہیں۔"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

ہم رہے فرقت کی شب بیتاب جس کے واسطے
وہ تو وعدے پر نہ آیا اور وعدہ آ گیا

اللہ رے بیخودی دلِ آشفتہ حال کی
تدبیر پوچھتا ہوں عدو سے وصال کی

وہ مراسم بھی تمھیں یاد ہیں یا بھول گئے
کبھی مہماں مجھے کرنا کبھی مہماں ہونا

بات کرنے کے لیے آپ سے ہم آئے تھے
آپ نے ہم سے کوئی بات نہ کی جاتے ہیں

ہم عشق میں افتاد اٹھا کر بھی نہ سنبھلے
کھاتے ہیں جو ٹھوکر وہ سنبھل جاتے ہیں کیونکر

سپید ہو گئیں آنکھیں سحر نہیں ہوتی
الٰہی کتنی شب انتظار باقی ہے

ستمگر کی نگاہِ ناز بھی کتنی ستمگر ہے
جو سیدھی ہے تو ناوک ہے جو ترچھی ہے تو خنجر ہے

کیا کہیں کیا عشق میں ہم عمر بھر دیکھا کیے
جو دکھایا دل نے قصہ مختصر دیکھا کیے

★

(افسانہ)

ضیا حسنی
آفس آف دی اسسٹنٹ کمشنر
(ایگزیکیٹو) سیلس ٹیکس پھول باغ۔ کانپور

دیوانے کا خواب

جب کُما پہلے پہل سپید بے داغ چکن کی ساری زیب تن کیے دفتر آئی تو سبھی کلرکوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس سادہ پوشاک سے اس کی رنگین جوانی اُبلی پڑ رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے اسے بناؤ سنگھار سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ نہ آنکھوں میں سرمے کی تحریر، نہ زلفیں آراستہ و معطر، ہونٹ اور ناخن سرخی سے بے نیاز پھر بھی وہ دل میں سمائی جا رہی تھی۔

بڑے بابو نے اسے دیکھا تو ان کا احساسِ برتری جاگ پڑا اور انھوں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"آپ کو میں ہلکا پھلکا کام دوں گا جسے آپ بآسانی کر لیں گی۔"

"کٹھنائیوں سے گھبراتی نہیں ہوں۔ آپ جو کام بھی مجھے دیں گے اسے میں لگن سے کروں گی۔ محنت اور لگن سے کام کرنے والا اسپھل نہیں ہوتا بڑے بابو!"

ایسی بات سنتے ہی بڑے بابو کی پیشانی پر بل آ گئے اور انھوں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"آپ کو آفیسرس اسٹیبلشمنٹ کا کاؤنٹر دے دیا جائے گا اپوائنٹمنٹ، ٹرانسفرس، اے۔ بی۔ شکایتیں سبھی معاملے اسی کاؤنٹر سے نپٹائے جاتے ہیں۔ لوگ اس کاؤنٹر پر جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ آپ محنت اور لگن سے کام کریں گی تو ضرور سپھل ہوں گی۔"

وہ خاموش رہی بھی کا خیال تھا کہ وہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام نہ دے سکے گی، لیکن اس نے اپنی جگہ کا نہ صرف خوشی خوشی چارج لیا بلکہ بے خوفی سے کام کرنے لگی جب اس نے اپنی پہلی فائل ڈپٹی کمشنر کے ملاحظہ کے لیے بھیجی تو انھوں نے اس کے ڈرافٹ کو سراہا اور ان کی اس حوصلہ افزائی سے اس نے کافی محنت اور لگن سے کام کرنے کا عزم مصمم بھی کر لیا۔ وہ معاملات کو قوانین اور قواعد کے رو سے اچھی طرح پرکھتی اور پھر مطمئن ہو کر ان کی روشنی میں قلم اٹھاتی تھی۔ تھوڑے دنوں میں اس کی کارکردگی رنگ لانے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ قدرت کی طرف سے جہاں اسے حسن و جمال کی رنگینی فیاضانہ طور پر بخشی گئی تھی وہاں اسے ایسا ذہن بھی ملا تھا جس کے ذریعہ وہ معاملے کی تہہ تک بآسانی پہنچ جاتی تھی۔ اس طرح وہ بہت جلد دفتری حلقے میں جانی پہچانی جانے لگی۔ دن گزرتے رہے مارچ کا مہینہ آیا۔ وہ اسی طرح خلوص اور لگن سے کام کرتی رہی۔ کسی کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی لہٰذا اس کی انتھک محنت کے صلے میں اس کے کیرکٹر رول میں اچھی انٹری کی گئی اور انعام سے بھی نوازا گیا۔

اب میں کُما کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مسکراتی تو اس کی طرف دل کھنچنے لگتا، ہنستی تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے نئے سکے کھنک رہے ہوں۔ بول ایسے رسیلے ہوتے کہ میں قلم پکڑ کر اس کا منہ دیکھنے لگتا۔ میں کوئی سوال کرتا تو وہ ایسا مدلل جواب دیتی کہ میں احساسِ مسرت سے جھوم

اٹھتا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ مجھے ایک اذیت بھی دیا کرتی تھی اسے بھی سنتے چلیے، وہ باتیں کرتے کرتے اس طرح خاموش ہو جاتی کہ اس کی شگفتہ مزاجی اچانک دم توڑ دیتی تھی۔ ایک دن اسے ایسے عالم میں دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکا اور بول پڑا۔

"کیا بات ہے کسما جی؟ کبھی آپ اس طرح چنتاؤں سے گھر جاتی ہیں کہ آپ کو اپنے اردگرد کی بھی خبر نہیں رہتی۔"

"ایسی باتیں اوش ہیں جو مجھے الجھائے رکھتی ہیں۔ پردیپ صاحب! یہ عمر کتنا اچھا ہے جس کے سہارے کچھ سمے بیت جاتا ہو۔"

"میں آپ کو کوتری نہ بننے دوں گا کسما جی! آپ جب ایسا روپ دھار لیتی ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اب مجھے موقع مل گیا تھا لہٰذا میں نے بات آگے بڑھائی۔

"اگر آپ کسی کٹھنائی کی وجہ سے چنتت رہتی ہیں تو مجھے بتایئے میں ہزار جتن کر کے آپ کی مدد کروں گا۔"

"دھنیہ واد مجھے جیون کے راستے میں اکیلے چلنے ہی میں سکھ مل رہا ہے۔"

"ہاں، یہ تو بتایئے وہ کون سی بات ہے جو آپ کو ہنستے بولتے ایک دم گمبھیر بنا دیتی ہے۔"

ایسی بات سنتے ہی وہ خاموش ہو گئی اور کافی کریدنے کے بعد بھی اس نے وہ بات نہیں بتائی۔ دن گزرتے رہے اور کسما میرے سامنے معمہ بنی رہی۔ میں اس انداز سے سوچ رہا تھا کہ کسما میری کو لیگ ہے اسے ایک ایسا انجانا غم مل گیا ہے جو رہ رہ کے دل میں کچوکے لگایا کرتا ہے۔ میں اسے رنج والم میں ڈوبا ہوا بے بسی سے دیکھا کرتا ہوں اور بڑھ کر اس کی مدد نہیں کر پاتا۔ وہ عورت ہو کر طوفان کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہی ہے اور میں مرد ہو کر کونے کنارے میں سہم کر بیٹھ جاتا ہوں اور اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا ایسی بات سوچتے ہی میرے ذہن پر ضربیں لگنے لگتیں۔

"آخر وہ کون سا غم ہے جو اسے راہی بے آب کی طرح مضطر رکھتا ہے اور اسے کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔"

ایسا خیال آتے ہی اتوار کو میں اس کے یہاں جا پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھا تو دل کی گہرائی سے میرا استقبال کیا اور اپنے گھر کا گوشہ گوشہ دکھا دیا تاکہ اس کی زندگی کا ہر پہلو بے نقاب ہو جائے۔ فرنیچر اور سامان کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ گرہست اور منتظم ہے۔ دوسرے اسے کوئی مالی دشواری بھی نہیں ہے۔ اس کی ایک لڑکی اور دو لڑکے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے اور میز پر کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے بات چھیڑی۔

"آپ کے پتی کہاں ہیں کسما جی؟"

"ان کا دیہانت ہو گیا"

"کب اور کیسے؟"

"اپنے الجھے ہوئے جیون سے گھبرا کر انھوں نے گومتی کے پل سے چھلانگ لگائی اور اس کی بھیانک لہروں میں اس پرکار گھل مل گئے کہ میں ان کا انتم دیدار بھی نہ کر سکی۔" ایسی بات سنتے ہی میں نے کسما کو دیکھا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیوں میں نے ایسی بات چھیڑی کہ وہ ہنستے بولتے رنجیدہ ہو گئی۔ اسی اثنا میں وہ بول پڑی۔

"پردیپ صاحب! میں بیتے جیون کو بالکل بھول جانا چاہتی ہوں لیکن [illegible] دار ہوں، میرے پہلو میں ایک جاگتا ہوا دل دھڑک رہا ہے۔ جب کچھ باتیں دل میں کچوکے دلاتی ہیں تو بیتا جیون کڑی در کڑی سامنے آنے لگتا ہے۔ اچھا تو سنیے! مجھے اپنے پتی سے دلی ہمدردی ہے کیونکہ انھوں نے جیسے ہی آنکھ کھولی پریشانیوں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ بتاتے تھے کہ انھیں ماتا جی کا پیار نہیں ملا۔ ان کے کانوں میں لوریوں کا رس کبھی گھل نہیں سکا۔ ماتا جی کا دیہانت ہو گیا تھا۔ پتا جی دو برس بھی شانتی سے نہ بیٹھ سکے اور دوسری شادی رچالی، نئی پتنی آئی تو وہ بالکل بے بس ہو گئے۔ ان پر اتیاچار ہوئے اور پتا جی ٹک ٹک دیکھا کرتے کبھی کرودھ میں آکر خود بھی انھیں کو ڈانٹتے اور راستے پیٹتے بچاتے تھے۔ کبھی دودھ ملائی مکھن اور پھل کھاتے تھے اور ان کے حصے

میں سوکھے کو آنے تھے۔ دن گزرتے رہے اور ایک دن انھیں دھکا دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ ناناکے گھر پہنچے تو انھوں نے کلیجے سے لگا یا اور ہائی اسکول تک پڑھوا دیا اس کے بعد مامی نے انھیں کبھی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ہر ہر بات پر اعتراض کرتی تھیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے طعنے دیا کرتی تھیں۔

"اپنے بچوں کا گلا گھونٹ دوں اور تمہارا ساتھ دیتی ہوں جس کی بلا ہو وہ جانے۔"

"وہ ناناکے یہاں سے بھی چلے آئے اور ٹیوشن کر کے پیٹ بھرتے رہے اور پڑھتے رہے اس پرکار بی۔اے پاس کر لیا اور ایک پریس میں منیجر ہو گئے۔

اب وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے لیکن ان کے جیون میں ایسا پری ورتن آگیا تھا کہ انھیں کسی آدمی پر بھروسا نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی آدمی ہمدردی بھی کرتا تو انھیں یقین نہ آتا اور وہ چھان پھٹک کر اس بات میں کیڑے نکال دیتے۔ وہ سبھی سے کٹ کر اکیلے جیون بتا رہے تھے۔ اسی بیچ میں میرے پتاجی نے انھیں دیکھ لیا اور میرے رشتے کی بات چل پڑی۔ واستو میں وہ بیاہ کے لیے خوشی خوشی تیار نہ تھے پتاجی نے بل ڈالا تو راضی ہو گئے وہ بیاہ نہ کرتے تو اچھا ہی ہوتا۔ میں ان کے یہاں آئی تو دیکھا کہ وہ دن ... رات لگن اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ ہر مہینے وہ اتنے روپے بھی لا کر دیتے جس سے آسانی سے کام چل جاتا تھا۔ بس میرے سامنے ایک اُلجھن تھی کہ وہ ہر آدمی سے کٹے کٹے رہتے اور کسی پر بھروسہ نہ کرتے تھے کبھی کوئی بات نہ بتاتے اور اپنے آپ چنتاؤں میں ڈوبے رہنے میں تھیر ٹی تو اُلجھ پڑتے۔

میں کوئی بات کرتی، کوئی سُجھاؤ دیتی تو کڑائی سے اس کی جانچ پڑتال کرتے اور مجھے لگتا کہ مجھ پر بالکل بھروسہ نہیں۔ میں سب کچھ خوشی خوشی جھیلتی رہی۔ میرا وچار تھا کہ بچے ہوں گے تو ان کا دل بہل جائے گا اور ان کا جیون بدل جائے گا۔ تین بچے ہو گئے کبھی کبھی انھیں پیار کرتے اور گود میں لیتے تھے لیکن ان کے جیون میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

ہم دونوں سات برس مل جل کر رہتے رہے۔ انھوں نے مجھے کبھی مارا پیٹا اور ستایا نہیں۔ البتہ ان کا کئی کئی دن منھ سے نہ بولنا اور میری ہر بات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا، اس سے مجھے کافی کشٹ ہوتا تھا اور میرا جی چاہتا کہ میں میکے چلی جاؤں اور کبھی لوٹ کر نہ آؤں۔

ان کا کوئی دوست نہ تھا۔ نہ وہ کسی کے یہاں جاتے اور نہ کوئی ہمارے یہاں آتا تھا۔ پڑوس میں اوما سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اُن کے پتی لیکھک اور پترکار تھے۔ انھیں سبھی جانتے تھے۔ اوما بڑے چاہ سے میرے یہاں آتی اور گھل مل کر باتیں کرتی تو میرے پتی کو کافی کھلتا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ اوما کے آنے جانے کو پسند نہیں کرتے ہیں لیکن میں اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک نہیں پاتی تھی کیونکہ اس کے من میں میرے لیے پیار رچا بسا تھا۔

اوما نے میرے جیون کی کڑواہٹوں کو سمجھ لیا تھا اور میرے پتی سے وہ ہنس بول کر ان میں پری ورتن لانا چاہتی تھی لیکن وہ اسپھل رہی۔ اس نے اپنے پتی پر بل ڈال کر انھیں راستے پر لانے کی کوشش کی لیکن جو کام بھی کیے گئے ان کا اُلٹا ہی پربھاؤ اُن پر ہوا۔ نریش ان سے بار بار ملنے لگے تو انھیں میرے چرتر میں کالک دکھائی دینے لگی۔ وہ اس بات کو اپنے من میں چھپائے رہے اور اس پر اتنی گہرائی سے سوچا کہ انھیں اپنا جیون ہی بھیانک دکھائی دینے لگا اور انت میں انھوں نے آتم ہتیا کر کے سدا کے لیے شانتی پراپت کر لی۔

بھگوان جانتا ہے کہ میرا کوئی دوش نہیں، نریش اور اوما نے مجھے سہارا دیا اور انھیں دونوں کے کارن میں آج اپنے پیروں پر کھڑی ہوں اور میرا سمے سُچار روپ سے بیت رہا ہے۔

آج بھی مجھے اپنے پتی سے ہمدردی ہے جب ان کے دکھوں کا دھیان آتا ہے تو میں چھپ چھپ کر روتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے دکھی جیون کا سایہ بھی میرے بچوں پر پڑے۔ میں ان کے سامنے ہنستی کھلکھلاتی رہتی ہوں۔ مجھے آج بھی یہ سوچ کر دکھ ہوتا

(باقی ص ۴۸ پر)

تاثرات کے آئینے میں

خورشید احمد۔ سابق ایڈیٹر نیا دور، اعظم گڑھ

نیا دور کا منشی نول کشور نمبر ملا۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ اردو کے ایک ایسے محسن اور بے لوث خدمت گزار کے شایان شان آپ نے اور آپ کے رفقائے کار نے جس محنت و کاوش سے یہ نمبر شائع کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ مبارک باد قبول کیجیے۔

کوثر چاندپوری۔ نئی دہلی

نیا دور کا نولکشور نمبر مثالی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے مضامین نہایت قیمتی اور بصیرت آموز ہیں، ترتیب میں سلیقہ اور دانشورانہ نیور نمایاں ہیں، ہر عنوان کے تحت معلوماتی علیقات پیش کی گئی ہیں

پروفیسر عبدالقوی دسنوی سیفیہ کالج۔ بھوپال

۲۹ اپریل کو بارہ دن ممبئی میں قیام کے بعد بھوپال واپس آیا تو خطوط، رسائل اور کتابوں کے انبار میں جو چیز اپنی طرف سب سے زیادہ متوجہ کرتی نظر آئی وہ آپ کا مرتب کردہ نیا دور کا منشی نول کشور نمبر تھا۔ یہ نمبر مجھے اگر نہ ملتا اور کہیں اور اس پر نظر پڑتی تو ساری زندگی اس محرومی کا شدت سے احساس ہوتا۔

میں نے شروع سے آخر تک اس خاص نمبر کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ نہ صرف ظاہری حسن اور خوبیوں یعنی سرورق، ترتیب، تزئین اور ضخامت کے اعتبار سے یہ نمبر بہت خوب ہے بلکہ مشمولات یعنی نظم و نثر کے اعتبار سے بھی یہ نمبر بہت ہی خوب ہے — اللہ اکبر چپکے چپکے آپ نے اتنی ساری اور اتنی اچھی تحریریں کس طرح جمع کر لیں اور وہ بھی اس زمانے میں جبکہ اچھے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس خارزار سے گزرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ اس نمبر میں مختلف زاویوں سے منشی نول کشور اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے یہ نمبر ایک دور کی ادبی، صحافتی خدمات کی تاریخ بن گیا ہے۔

یہ بات بھی خوشی کی ہے کہ منشی نول کشور پر جیسا کہ مجھے علم ہے اتنا اچھا، خوبصورت، معیاری اور ضخیم نمبر کسی نے نہیں نکالا ہے۔

میں آپ کی اور آپ کے معاونین کی خدمت میں اس پروقار کام کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اچھے اور مفید نمبروں سے آپ اردو زبان و ادب کو ہمیشہ مالامال کرتے رہیں گے۔ دراصل یہ نمبر اس سلسلے کی ابتدا ہے۔

سید نواب افسر۔ لکھنؤ

نیا دور کا منشی نولکشور نمبر نظر سے گذرا۔ یقیناً آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ایک ایسی شخصیت کا حق ادا کر دیا جس نے اردو فارسی اور عربی زبان کی بے شمار کتابیں فراہم کرنے اور ان کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔

اگر آپ کا نمبر شائع نہ ہوتا تو ہم اس الزام کے نیچے دبے رہتے کہ ہم نے ایک عظیم خادم علم و ادب کو فراموش کر دیا۔

منشی نول کشور نمبر منشی جی کی حیات اور خدمات کی ایک مکمل تحقیقاتی دستاویز ہے۔

سید امیر حسن نورانی۔ دہلی یونیورسٹی دہلی

نول کشور نمبر نظر نواز ہوا۔ اس کو دیکھ کر جو مسرت حاصل ہوئی۔ اس کے اظہار کے لیے ایک مضمون کی ضرورت ہے۔ یہ میری دیرینہ آرزو تھی جس کو آپ نے انتہائی سلیقہ کے ساتھ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایک دل کش ادبی مرقع کی صورت میں مکمل کر دیا۔ مواد کے اعتبار سے معیار بلند ہے۔ بیشتر مضامین معلومات افزا ہیں۔ منشی نول کشور پر باقاعدہ پہلا مضمون میں نے ہی لکھا تھا جو ۱۹۳۹ء میں تہذیب پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مضمون ۱۹۵۳ء میں زیادہ تفصیلی ادب لطیف لاہور میں شائع ہوا۔ اس کے بعد لوگوں نے جو مضامین لکھے عموماً میرے ہی مضامین سے ماخوذ تھے۔ نیا دور کے اس شمارہ کے ذریعہ بہت سی نئی چیزیں منظر عام پر آئیں۔ جن سے خود مجھے بھی استفادہ

کا موقع ملا۔ ورنہ اس سے قبل کی ساری معلومات کا ذریعہ میرے مضامین تھے۔ اس نمبر کی کامیابی پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے یہ نمبر نہایت کامیاب ہے۔ بہت سے یونیورسٹی کے اساتذہ اور اہلِ علم آپ کے اس کارنامہ کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ حکومت اتر پردیش کا محکمۂ اطلاعات بھی قابلِ صد مبارکباد ہے کہ اتنے ضخیم اور شاندار نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھ کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس سے قبل نیا دور کا کوئی اتنا شاندار نمبر منظرِ عام پر نہیں آیا۔ آپ نے ایک اہم شخصیت اور اردو کے بہت بڑے محسن کے کارناموں کو منظرِ عام پر لا کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔

عزمرت الاکرام۔ مرزاپور

"نول کشور نمبر" نظر نواز ہوا۔ دل سے متشکر ہوں۔ اس نمبر کے ذریعہ منشی نولکشور کو جو اردو کے محسنوں میں بلند تر مقام رکھتے ہیں، تحسین و عقیدت کا خراج ہی نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو منشی نول کشور پر کام کرنے والوں کے لیے منارۂ نور ثابت ہوگی۔ کسی شخصیت سے متعلق اتنا وقیع اور بیش بہا مواد فراہم کرنا اور اسے اس قدر خوش اسلوبی سے زیبِ قرطاس کرنا بجائے خود ایک اہم کارنامہ ہے جس کے لیے آپ لائقِ صد مبارکباد ہیں۔

نصر قریشی۔ الٰہ آباد

نیا دور نے منشی نول کشور نمبر کی صورت میں اردو زبان و ادب کے خزانے میں کوہِ نور ہیرے کا اضافہ کیا ہے۔ ترتیب و تزئین، کتابت و طباعت کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ مواد کے معاملے میں ہر طرح سے بھرپور ہے۔ آپ لوگوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اعلیٰ صحافت کے اس حسین نمونے کی اشاعت پر میری جانب سے آپ اور دیگر رفقائے ادارہ نیا دور دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

اللہ کرے زورِ صحافت اور زیادہ

ایس۔ ایم۔ عباس۔ جونپور

منشی نول کشور نمبر کا رنگ و روپ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ یقینی طور پر یہ خوبصورت اور وقیع دستاویز ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور آپ کے ذوقِ سلیم اور حسنِ عمل کی یاد دلائے گی۔

شاد فیض آبادی۔ فیض آباد

"منشی نول کشور نمبر" نظر نواز ہوا۔ عزت افزائی کا شکریہ۔ اس میں قطعی دو رائے نہیں کہ آپ کی ادارت میں نیا دور کا یہ لاثانی شاہکار ہے۔ آپ کی مسلسل کوششوں اور انتھک حوصلوں نے آنجہانی منشی نول کشور صاحب کی پرشکوہ ہمہ گیر شخصیت، پیکرِ تہذیب انسانیت، مجسمۂ علم و ادب، سراپائے حسن و خلوص میں چار چاند لگا کر اسے فہم و ادراک کا ایسا لازوال آسمان بنا دیا ہے جس میں سیکولر سورج کا اجالا۔ گنگا جمنی کہکشاں۔ قومی یکجہتی کی چاندنی، رواداری کی شعاعیں۔ غرمنِ تعصب کو جلا دینے والی بجلیاں۔ سماج کی رنگ برنگی شفق صاف نظر آتی ہے۔

موہن لال وشنوی۔ لکھنؤ

ماشاء اللہ کیا خوبصورت نمبر نکالا ہے۔ جی ہاں "نیا دور" کا منشی نول کشور نمبر دیکھ کر بے اختیار کئی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کے اور آپ کے رفقاء کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ حضرات کو مبارکباد دینا چاہوں گا کہ اس اعلیٰ درجہ کا نمبر نکال کر آپ نے نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام محبانِ اردو کی طرف سے بھی منشی نولکشور جی کی بلند بام و عظیم شخصیت اور ادبی دنیا کے اس درخشاں ستارے کا واقعی حق ادا کر دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نیا دور کا منشی نول کشور نمبر ہر لحاظ سے ایک شاہکار ہے، ایک یادگار ہے۔

★

دیوانے کا خواب

(صفحہ ۴۶ کا بقیہ)

ہے کہ میرے پتی جب بھی باتیں کرتے تو وہ ساری دنیا سے کٹے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کی الجھی باتوں کی کڑیاں نہ ملتی تھیں جب میں ان کی باتوں پر وچار کرتی تھی تو میرا سر چکرانے لگتا تھا اور سوچتی تھی کہ یہ کسی دیوانے کا سپنا تو نہیں ہے۔"

★

نیا دور
۵۰ پیسے

جلد ۳۶ نمبر ۳

جون ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

زرِ سالانہ کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشنز انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

برائے رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کہا تھا "میرا یقین ہے کہ ترقی برف کی طرح نہ ہو جو صرف پہاڑوں کی بلندیوں پر گرتی ہے بلکہ موسلا دھار بارش کی طرح ہو اور ایک ایک وادی کو سیراب کرے" وزیر اعلا کے ان جملوں میں تخیل بھی ہے اور شاعرانہ حسن بھی۔ لیکن جو جذبہ ان جملوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر اور نمایاں ہے وہ ہے غریب ترین اور نظر انداز کیے گئے طبقوں کے تئیں خدمت کے لیے ان کا خلوص اور ان طبقوں کو اوپر اٹھانے کا اُن کا عزم۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد گذشتہ ایک سال کے دوران انھوں نے جو کچھ کہا ہے اور ان کی حکومت نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اتر پردیش کو حقیقتاً ایک ترقی یافتہ ریاست بنانے کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ پُرعزم ہیں بلکہ کوشاں اور سرگرم عمل بھی ہیں۔ اپنے اسی عزم کے تحت انھوں نے کہا ہے "ہماری یہی کوشش رہی ہے کہ اتر پردیش ترقی کی بلندی تک پہنچ جائے، لیکن تجربہ یہی رہا ہے کہ ترقی کا فائدہ چند ہی لوگوں تک پہنچ پایا ہے۔" یعنی انھیں یہ احساس بھی ہے کہ ترقیاتی سرگرمیوں اور اقدامات سے سارے لوگ مستفید نہیں ہو پاتے۔ حقائق کا احساس و اعتراف، صاف گوئی، خلوص اور ٹھوس اقدامات اور عوام سے براہ راست رابطہ، شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت کی نمایاں خصوصیت ہے۔

گذشتہ ایک سال کے دوران ریاستی حکومت کی جو کارگزاری رہی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت نے اپنی اعلان کردہ پالیسی کے تئیں خلوص اور عمل کے سلسلے میں خود کو وقف کر دینے کے جذبے نیز زبردست مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے۔

حکومت کس کی فلاح و ترقی کے لیے کوشاں ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کہا تھا کہ "غریب ہی ہماری توجہ کا مرکز ہے" وزیر اعلا کا یہی جملہ حکومت کی تمام پالیسیوں کی بنیاد ہے۔

موجودہ حکومت کی گذشتہ ایک سال کی کارگذاری کے جائزے کے تحت سب سے پہلے کسانوں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسانوں کے مفادات کو اوّلیت دی گئی ہے۔ شہروں اور صنعتوں کی ضرورتوں میں کٹوتی کر کے دیہاتوں کو بجلی کی فراہمی، خشک سالی اور سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں وصولی ملتوی کرنا، کسانوں سے دھان کی براہ راست خریداری، کسانوں کے مسائل حل کرنے کی غرض سے کسان دوست سیلوں کا قیام اور فصل بیمہ اسکیم کا آغاز۔ یہ سارے اقدامات ایسے ہیں جو کسانوں پر حکومت کی بھرپور توجہ کے مظہر ہیں۔ یہی نہیں وزیر اعلا کاشت کاروں سے بذات خود گفتگو بھی کرتے ہیں۔ گاؤں پردھانوں کو وہ جوابی پوسٹ کارڈ بھیجتے ہیں، جن کے ہزاروں کی تعداد میں جواب آتے ہیں۔ ان میں جن مسائل کا ذکر ہوتا ہے انھیں حل کرنے کے سلسلے میں فوری کارروائی بھی کی جاتی ہے۔

اسی طرح عوامی نظام تقسیم کو لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام کو زیادہ موثر اور فعال بنانے کی غرض سے حکومت نے سستے غلے کی دکانیں صرف امداد باہمی انجمنوں کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے معاشی نظام سے درمیانی اشخاص کو علاحدہ کرنے کے سلسلے میں یہ ایک بڑا قدم ہے۔ اس سے امداد باہمی تحریک کو جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان کا راستہ ہے، فروغ ملے گا۔ اس نظام کے مستحکم ہو جانے پر اسے تقسیم کی مزید ذمے داریاں سونپی جائیں گی جس کے نتیجے میں معیشت کو درمیانی اشخاص کی چیرہ دستیوں سے بچایا جا سکے گا اور مصنوعی قلت نیز مہنگائی پر بھی پوری طرح قابو پایا جا سکے گا۔

امن و امان کی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی کافی سدھار ہوا ہے۔ چور، اُچکے بھی اب بہت سہم گئے ہیں۔ جتنے ڈاکو اس سال گرفتار یا ہلاک ہوئے ہیں، اتنے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ڈاکوؤں سے جتنی مڈبھیڑیں اس سال ہوئیں، اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان مڈبھیڑوں کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ صرف ۱۹۸۱ء میں ہی ۴۰ پولیس ملازمین ان مڈبھیڑوں میں ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد بھی بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔

اسی طرح مزدوروں کی فلاح و ترقی کے لیے بھی گذشتہ ایک سال کے دوران بڑے موثر اقدامات کیے گئے۔ وزیر اعلا کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ نگر پالیکاؤں کے صفائی مزدوروں کو کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تو انھوں نے حکم جاری کیا کہ مزدوروں کی تنخواہ کی ادائیگی بلدیاتی اداروں کی آمدنی کے خرچ کی پہلی مد ہوگی۔ اس کے علاوہ غیر منظم مزدوروں مثلاً کیوٹوں، ماہی گیروں، بیڑی مزدوروں، پتھر توڑنے والوں پر بھی حکومت پوری توجہ دے رہی ہے۔ زرعی مزدوروں کے لیے اجرت کی نئی شرحوں کا تعین کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پابند مزدوروں کو نجات دلانے اور انھیں روزگار مہیا کرنے کے لیے بھی موثر اقدامات کیے گئے ہیں۔ اتر پردیش میں سب سے زیادہ (تقریباً ۹۰۰) پابند مزدور جانسر باور (ضلع دہرہ دون) میں پائے گئے۔ ان میں سے تقریباً ۳۰۰ مزدوروں کو نجات دلا کر ان کے قرضوں کی ادائیگی کر کے انھیں دوسرے کاموں میں لگا دیا گیا ہے، اسی طرح اور پابند مزدوروں کا بھی پتہ چلا کر انھیں نجات دلانے اور روزگار مہیا کرنے کا کام جاری ہے۔

(باقی ص۳۱ پر)

جمیل مہدی
ایڈیٹر "عزائم" امین آباد لکھنؤ

سیاست اور حکومت میں

اخلاقی قیادت کی اہمیت

اس دنیا کا کاروبار جو کچھ ہے وہ انسانوں کے دم سے چلتا ہے، انسان اس دنیا کو آباد رکھتے ہیں، سماج بناتے ہیں، قوموں اور فرقوں کی تشکیل کرتے ہیں اور سب مل کر اس دنیا کو ترقی یا تنزلی کی طرف بڑھانے میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کی خوشحالی یا تباہی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور اس کی طاقت اور کمزوری کا باعث بنتے ہیں۔

جو لوگ سماج اور سوسائٹی میں ذاتی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتے وہ اپنے فرض سے غفلت کا ثبوت دیتے ہیں جو لوگ سوسائٹی اور سماج میں ذاتی کردار سے برائی کا منبع ہوتے ہیں وہ سماج دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جو لوگ سوسائٹی اور سماج کو اوپر اٹھانے، آگے لے چلنے اور حیات انسانی کا فطری تقاضا پورا کرنے کے فرض کو ادا کرتے ہیں۔ وہ پیغمبر لیڈر اور مصلح کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں اور نسل انسانی کے لیے قابل تقلید اور اجتماعی احترام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

سماج کی تعمیر اور ملکوں کی ترقی میں، افراد اور قوم، انفرادی اور اجتماعی کردار و عمل کے تشخص کی بحث بہت پرانی ہے اور جمہوری دور میں جہاں اتفاق رائے کے ساتھ قوت کا سرچشمہ عوام کو قرار دے دیا گیا ہے، افراد کی اہمیت کے خلاف ایک رجحان ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوسائٹی کی تعمیر اور اسے موجودہ ترقی و عروج تک پہنچانے کی جدوجہد میں افراد کے غیر معمولی کام محنت اور کارناموں سے انکار کر دیا جائے۔ بلکہ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معمولی سی توجہ سے بھی یہ بات روشن اور ثابت ہو جاتی ہے کہ اس دنیا کی تعمیر اور قوموں کی خوشحالی، ترقی، انسانیت اور اخلاقی خصائص سے سوسائٹی کو مزین اور آراستہ کرنے کا سارا کام افراد کی ہی کوشش، دانش اور جدوجہد کے ذریعہ انجام پایا ہے۔

سائنس اور علوم کی ترقی ہو، یا فلسفے اور منطق کا میدان، قوموں کی رہبری، ملکوں اور سلطنتوں کے قیام اور قومی عروج و زوال کی تاریخ، ان سب میں ہم دیکھتے ہیں کہ موجدوں، فلسفیوں، معلمین اخلاق، مذہبی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کی شخصی جانکاہی، محنت اور کوشش، جدوجہد اور دانش ہی وہ سامان تھا جس کا ظہور آج اجتماعی ترقی کی فلک بوس چوٹیوں کی صورت میں آج کی نسل انسانی کے سامنے ہے۔ اور یہ سب کے سب افراد ہی تھے

ہندستان کی ہزاروں برس کی تاریخ کے منظر پر ابھرنے والے ہزاروں افراد کا تذکرہ چھوڑ کر، ہم صرف پچھلے چالیس پچاس برس پہلے کی تاریخ کو بطور نمونہ سامنے رکھیں تو ہم آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ آزادی کی لڑائی، ہندستانی قوم کی اجتماعی جدوجہد، جو قربانیوں۔ اور ایثار کے بے شمار واقعات کے ایک پورے سلسلے کی حامل ہے۔ دراصل اس ایک شخص کی دانشمندانہ رہنمائی اور غیر معمولی رہنمایانہ صلاحیتوں کا پرتو تھی، جو آج بابائے قوم، مہاتما گاندھی اور گاندھی جی کے نام سے مشہور ہے۔

اس طرح یہ مفروضہ، حقیقت کی دنیا میں بہت دور تک اپنے پیروں پر نہیں چل پاتا کہ اجتماعی اور قومی مسائل میں افراد کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور قوم کا اجتماعی فیصلہ اور رجحان ہی شہریت کے موجودہ نظام میں دراصل اہمیت کا مالک ہے فرد کا سب سے کم اور معمولی درجہ ہے، جس میں

وہ صرف اپنی ذات تک سمٹ کر محدود ہو جاتا ہے اور دوسرے کے مفاد یا وجود سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کے بعد جو درجہ آتا ہے وہ گھر اور فرد کا تعلق ہے، جہاں محدود تعداد میں لوگ فرد کی شخصیت کے گرد اکٹھے ہوتے ہیں اور اس کے کردار وعمل کی اچھائی اور برائی سے متاثر ہوتے ہیں۔ گھر کے بعد ماحول، محلے، شہر اور آخر میں قوم اور ریاست کے ساتھ فرد کے تعلق اور شخصیت کے رویہ کے اثرات وعمل کا درجہ آتا ہے اور دنیا میں وہی لوگ محسنین قوم اور عظیم شخصیتوں کی فہرست میں شامل ہونے کے مستحق قرار پاتے ہیں، جنھوں نے ذات، گھر بار، ماحول، ذات برادری اور فرقہ کی گھیرابندیوں کو توڑ کر اجتماعی قومی مفاد کو اپنی فکر وعمل کا محور بنایا اور آفاقی میدان میں اپنی صلاحیتوں، اہلیتوں اور خدمتوں کو صرف کیا۔ اس کا پھل انھیں یہ ملا کہ وہ خود آفاقی بن گئے، اور ان کے احترام اور عظمتوں کے اعتراف کے سامنے ملکوں اور قوموں کی حد بندیاں تک باقی نہ رہ سکیں اور ان کے نام ساری دنیا کے لوگوں کے لیے، محترم اور مانوس بن گئے۔

اس بات اور اس حقیقت سے انکار کہ لیڈر اور حکمرانوں کے کردار وعمل کا اثر قوموں کے اجتماعی مزاج اور رجحان پر نہیں پڑتا، اپنے آپ کو دانستہ گمراہیوں کے سپرد کر دینے کے برابر ہے اس کے برعکس حقیقت یہی ہے کہ عوام اپنے رہنماؤں کے کردار وعمل سے اس درجہ متاثر اور مرعوب ہوتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کی عادت اور مزاج کے سانچوں میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ عربی کا یہ مقولہ کہ "الناس علی دین ملوکہم" (عوام اپنے حاکموں کے طریقہ پر ہی چلتے ہیں) اپنا حقیقت افروز اور مجرب ہے کہ آج بھی اس کے اثرات قومی رہنماؤں اور قوم کے تعلق اور اثر و نفوذ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اتنی تمہید کے بعد اترپردیش کے موجودہ وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی شخصی حیثیت، انفرادی خصوصیت اور اس کے عوامی اثر و نفوذ کا جائزہ لیا جائے تو ایک برس کی مدت کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ انھوں نے یہ پوری مدت، عوام کے سامنے اپنے آپ کو کھولنے اور اخلاقی قوت کے بل پر مسائل کو حل کرنے کی خواہش کو ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔ ایک نازک ... بہت نازک اور خلفشار سے بھرپور زمانے میں انھوں نے اترپردیش کی قیادت کا بار اپنے کندھوں پر لیا تھا اور وہ ایک ایسا وقت تھا جب ریاست کی رہنمائی کرنے کے بجائے اپنے آپ کو آزمائشوں کے حوالے کر دینے کی جرأت کا مظہر تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ایک سال کی مدت میں انھوں نے شخصی طور پر، جو چیز اترپردیش کے کروڑوں لوگوں پر، ثابت کر دی ہے، وہ یہ کہ وہ اقتدار پر جمے رہنے کی اس حرص میں مبتلا نہیں ہیں، جو لوگوں کو عزت وذلت کے احساس سے لاپروا کر کے محض کرسی اقتدار پر قابض رہنے کی حد تک، اپنی جدوجہد کو محدود کر دینے پر مجبور کرتی ہے اور جس کا نتیجہ اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ عزت و وقار اور اقتدار میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہ پاتی۔

ان کے عہد اقتدار کے ایک سال میں مرادآباد کے فساد سے زیادہ المناک اور آزمائشی واقعہ کوئی دوسرا پیش نہیں آیا۔ لیکن جہاں اس فساد کی نوعیت، اور اثرات نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہیں اس فساد کی بدولت وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی تصویر میں دلآویزی کا پہلا رنگ نمایاں ہوا، جبکہ انھوں نے اقتدار کی فکر، شخصی وقار کے تحفظ، اور سیاسی مصلحتوں کی رکاوٹ میں سے ہر چیز کو نظر انداز کر کے، فساد کی ذمہ داری پورے طور پر، شخصی طور پر قبول کر کے، مستعفی ہونے کی پیش کش کر دی اور نہ صرف پیش کش کر دی بلکہ ایک حد تک اصرار بھی جاری رکھا کہ ان کا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ان کے استعفیٰ کی پیش کش پر تبصرہ کرتے ہوئے جب اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ

میں کہا تھا کہ ـــــ

" استعفیٰ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا "
تو انھوں نے بالکل صحیح بات کہی تھی (نیز) یہ بات قطعی طور
پر غیر مشکوک ہونے کے باوجود کہ استعفیٰ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا
محض ایک سمت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ سمت نظم و نسق اور انتظام
کے شعبہ کی سمت ہے، لیکن ملکوں اور قوموں کے معاملات صرف نظم و نسق
، انتظام ، دستور اور قانون کے ذریعہ حل نہیں کیے جا سکتے
قانون ایک عمل کی سزا دے سکتا ہے۔ اس عمل کا انسداد نہیں کر
سکتا، یہ صرف اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ جو سوسائٹی کو متوازن
اور مطمئن رکھنے میں اساس اور بنیاد کا کام کرتی ہے اور
سوسائٹی کو یہ اخلاقی قوت مہیا کرنے، یا اسے اخلاقی قوت
سے محروم کرنے میں ان افراد کا رویہ فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے
جو رہنمائی اور اقتدار کے اعلا مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

انگلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر ایڈن، وزیر دفاع
پروفیومو، امریکہ کے صدر نکسن، اور خود ہندستان میں ڈاکٹر
سمپورنانند ، کرشنا مینن لال بہادر شاستری، کیشو دیو مالویہ
اور گلزاری لال نندا کے عظیم ترین عہدوں سے استعفے تاریخ
سیاست کے نمایاں واقعات میں اسی لیے شمار ہوتے ہیں کہ ان
کے ذریعہ سوسائٹی کی اخلاقی قوت کا مظاہرہ ہوا، اور افراد
کے رویہ کی نوعیت سامنے آئی، اور مختلف اوقات میں مختلف
شخصیتوں کے رویے کی اس نوعیت کی بدولت افراد کی شخصی عظمتوں
اور سوسائٹی کی قوت میں اضافہ ہوا اور قوموں کے مزاج اور
افراد کے اخلاقی خصائص کے ایسے پہلو سامنے آئے جنھوں
نے اخلاق، سیاست، اور رواج کے مروجہ پیمانوں اور
معیاروں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

اس موقعہ پر کہ ایک بد نما واقعہ اور اسکے اثرات کی
بدولت قومی سطح پر رنج و ملال کی کیفیت طاری تھی اور اخلاقی
قدروں کی کمزوری اور اخلاقی قوت کے انحطاط کے احساس
سے ناامیدی کے بادل اجتماعی ذہن کے مطلع پر چھائے ہوئے تھے
وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے مستعفی ہونے کے
اقدام نے بجلی جیسی ایک لہر سوسائٹی کی اخلاقی دنیا میں
پیدا کی اور لوگوں کو غیر شعوری طور پر ایک ایسے نشاط انگیز
اطمینان کا احساس ہوا، جو مایوسی کی تاریکیوں میں امیدوں
کی روشنی کے یکایک جگمگا اٹھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس
ایک برس میں، اتر پردیش میں، جو کام ہوئے ہیں ان میں
سب سے نمایاں اور بڑا کام۔ جسکا کریڈٹ وشوناتھ پرتاپ
سنگھ کی قیادت اور حکومت کو دیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ
سڑکوں پر شور وغل اور احتجاج مظاہروں اور مخالفانہ
جلوسوں کی بھیڑ کم ہوئی ہے اور اس کی بدولت تشویش
اور خوف کے وہ بادل ریاست کے سیاسی مطلع پر سے کم ہوئے
ہیں جو ان مظاہروں کے تسلسل اور حکومت کے سبھی شعبوں
اور محکموں میں پھیلی ہوئی بے چینی کی بدولت ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ریاست کے انتظامی ڈھانچے کو اور جمہوری نظام
تک کو سیلابی طوفان میں ڈبو کر رکھ دینگے۔

جن لوگوں کو آج سے ایک برس پہلے کا وہ زمانہ یاد
ہے۔ جس میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے انتظامی
کاروبار سنبھالا تھا۔ انھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ تحریکوں، مطالبوں
اور مظاہروں کی شدت اور بوجھ سے پورا انتظامی ڈھانچہ
دبتا، کچلتا اور ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ پوری ریاست محکموں، اداروں اور تعلیم گاہوں
سے باہر نکل کر سڑکوں پر آ گئی ہے اور ہڑتالوں کے نعروں
سے حکومت کے پورے کاروبار کے مکمل بحرانی حالت اور تعطل
میں پڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور دھمکیوں اور
ہنگاموں کے ذریعہ ایک ایسی مایوس کن صورت حال پوری
ریاست میں جاگ پڑی ہے۔ جس میں عام انسانوں اور پرامن
شہریوں کے لیے، امید اور اطمینان کی ہلکی سی کرن کی
موجودگی بھی باقی نہیں رہی۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے کہیں نرمی

(بقیہ صفحہ ۷۱ پر)

سعید تابش
لیکچرار۔ اسلامیہ کالج، لکھنؤ

اُتّر پردیش

ہے یہ پردیش محبت کے گلابوں کا چمن
خاک نے اس کی کیے لال[1] و جواہر[2] پیدا

اس کی مٹی میں شہیدوں کا لہو شامل ہے
گامزن راہِ ترقی پہ ہے بے خوف و خطر

سر پہ ہے سایہ فگن اس کے ہمالہ کا جلال
اک شہنشاہ نے بخشا ہے اسے تاج محل

گاؤں اس کے ہیں نیارے تو نگر ہیں پیارے
مختلف چشمے یہاں آ کے بہم ہوتے ہیں

لکھنؤ آصف الدولہ کا ہے خوابِ رنگیں
دیکھ کے کاشی و متھرا کے صنم خانوں کو

خاک سے اس کی اٹھے جائسی و سور و کبیر
راحتِ قلب و نظر صبحِ بنارس کا نکھار

ہے یہ پردیش ہی گہوارۂ اربابِ نظر
تلخ کاموں کو شکر اس نے مہیا کی ہے

جب سے پردیش میں سرکار نئی آئی ہے
بادِ امید بہاروں کا سندیسہ لائی

کشورِ علم و ادب، جانِ وطن، شانِ وطن
رام اور لچھمن و سیتا کا یہی تھا مسکن

درحقیقت یہی پردیش وطن کا دل ہے
سامنے اس کے امیدوں کی نئی منزل ہے

ذرے ذرے سے جھلکتا ہوا فطرت کا جمال
اس کے ماتھے پہ ہے جھومر کی طرح نینی تال

رشکِ گلزارِ عدن اس کے گلستاں سارے
گود میں اس کی ملے گنگ و جمن کے دھارے

اور پریاگ ہے ایثار و محبت کی زمیں
لوگ کہتے ہیں کہ یہ حسن کہیں اور نہیں

نقش ہے صفحۂ تاریخ پہ جن کی تصویر
کاکلِ شام اودھ نے ہے کیا دل کو اسیر

اس کی آغوش کے پروردہ فراق اور جگر
اس کے مشہور زمانے میں ہوئے اہلِ ہنر

امن و انصاف کی چلنے لگی پروائی ہے
ہر طرف لطف و مسرت کی گھٹا چھائی ہے

---

[1] لال بہادر شاستری [2] جواہر لال نہرو

ڈاکٹر عمار رضوی
وزیر اطلاعات و قومی یکجہتی
اتر پردیش

قومی یکجہتی

طاقتور قوم کی اولین شرط

ہمارے ملک کی اصل قوت ہماری قومی یکجہتی میں مضمر ہے ملک میں جب بھی اتحاد رہا ہے تبھی اسے عظیم تسلیم کیا گیا ہے۔ آج ہمارے سامنے سب سے بڑا کام نہ صرف سماج کے سبھی طبقوں اور فرقوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنا ہے۔ بلکہ ہمیں اس بات کی بھی پوری کوشش کرنا ہے کہ لوگوں میں علاحدگی اور تفریق و امتیاز کے رجحانات پیدا ہی نہ ہوں۔

اسی مقصد کے تحت اور قومی یکجہتی کی اہمیت کے پیش نظر وزیر اعلا کی سربراہی میں ریاستی یکجہتی کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی سرگرمیوں کے ذریعہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے تدابیر اور مشورے پیش کرنا، زبان اور تعلیمی پروگرام، کارخانے اور مزدوروں کے باہمی تعلقات نیز طلبا اور ٹیچروں کے تعلقات وغیرہ سے متعلق مسائل پر غور کرنا، اس کونسل کے دائرۂ کار میں شامل ہے۔

اسی طرح اضلاع میں ضلع مجسٹریٹوں کی سربراہی میں ضلع یکجہتی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے جن میں ضلع کے تمام ممبران مجالس قانون ساز، سیاسی جماعتوں کے صدر، ضلع پریشد کے چیرمین، رضاکار اداروں کے نمائندے اور ممتاز مذہبی رہنماؤں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں وغیرہ کو بحیثیت ممبران شامل کیا گیا ہے۔ ان کمیٹیوں کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں بھائی چارہ کے جذبہ کو فروغ دیں۔ ان سے یہ بھی توقع کی گئی ہے کہ وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اہم تیوہاروں مثلاً بسنت، عید، ہولی، دیوالی اور رکشا بندھن وغیرہ کو اجتماعی طور سے منانے کے لیے کام کریں۔ ضلع مجسٹریٹوں کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ضلعوں میں تحصیل، تھانہ بلاک، محلہ یا وارڈ کی سطح پر بھی ایسی کمیٹیاں تشکیل کریں قومی یکجہتی کو مستحکم بنانے کے لیے ریاست میں قومی یکجہتی ادارہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔

حکومت اتر پردیش قومی یکجہتی کے کاموں میں خاص طور پر حصہ لینے والے ہند ستانیوں کی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت نے شہنشاہ اکبر کی ۱۵۸۰ء میں اعلان کردہ پالیسی صلح کل یعنی عالمی بھائی چارہ کی ۴۰۰ ویں سالگرہ آگرہ اور فتح پور سیکری میں منائی۔ صلح کل کے تحت ذات مذہب اور طبقہ وغیرہ پر مبنی تفریق و امتیازات کو ختم کیا گیا تھا جشن صلح کل کے پروگرام گذشتہ سال ۳۰ اکتوبر سے یکم نومبر تک آگرہ

میں فتح پور سیکری، سکندرہ اور آگرہ فورٹ میں منعقد کیے گیے جشن کا افتتاح ۳۰ اکتوبر، ۱۹۸۰ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا۔ جشن "صلح کل" کی تقریبات میں ان اصولوں کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا جن کا یہ پردیش ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔

ریاستی حکومت نے قوم دشمن جذبات اور عناصر کا مقابلہ کرنے اور قومی اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھنے کے مقصد کے پیش نظر ۱۹ نومبر سے ۲۵ نومبر، ۱۹۸۰ء تک ضلع، تحصیل اور بلاک کی سطح پر قومی اتحاد ہفتہ منایا۔ اس موقع پر عوام سے قومی اتحاد کو برقرار رکھنے کا حلف لیا گیا۔

ریاست میں کچھ غیر سرکاری ادارے بھی قومی یکجہتی کو مستحکم بنانے اور فرقہ وارانہ رواداری اور خیر سگالی کی حوصلہ افزائی کے لیے کوشاں ہیں۔ حکومت ایسے رجسٹرڈ اداروں کو مالی امداد فراہم کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں دو رائیں نہیں ہیں کہ مختلف ذاتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان شادیاں، بھائی چارے اور اتحاد کو فروغ دینے میں بہت معاون ہوتی ہیں حکومت کی ایک اسکیم کے تحت ایسی شادیاں کرنے والے جوڑوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک توصیفی سند اور تمغہ کے علاوہ ...۱ روپئے کا نقد انعام اور کوئی بھی چھوٹی صنعت چلانے کے لیے ...۱۵ روپئے تک کا بلا سودی قرض منظور کیا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۱۳۲ افراد کو انعام دیا جا چکا ہے۔

شمال اور جنوب کی لسانی تفریق کو ختم کرنے کی غرض سے ریاست کے آٹھ مقامات پر جنوبی ہند کی زبانوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں موتی لال میموریل سوسائٹی میں تامل تیلگو، کنڑ اور ملیالم کے ڈپلوما کورس کے علاوہ تامل اور تیلگو زبانوں کی اعلا تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔

اردو زبان کی ترقی کے لیے بھی حکومت مسلسل کوشش کر رہی ہے۔ وزیر اعلا شری وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۸۱ء میں بھی اردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیدیا جائے گا۔ یہ احکامات جاری کردیے گئے ہیں کہ سبھی سرکاری دفتروں میں اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں گی اور اردو میں ہی ان کا جواب دیا جائے گا۔ ریاست کے ۱۲ اضلاع میں کمشنر، ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتروں میں اردو جاننے والے ملازمین کی تقرری کی جا رہی ہے۔ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ نے اضلاع سے بھی اردو میں پریس نوٹ جاری کرنا شروع کر دیے ہیں۔ محکمہ اطلاعات کے صدر دفتر سے پریس نوٹ اور فیچر وغیرہ اردو میں جاری کرنے کے بندوبست کو زیادہ مستحکم اور موثر بنایا جا رہا ہے

پرائمری اسکولوں کے ۳۸۲۳ اور جونیر ہائی اسکولوں کے ...۱۱ اردو ٹیچروں کو مستقل کر دیا گیا ہے۔ بقیہ تقریباً ...۶ اردو ٹیچروں کو بھی مستقل کرنے کی کارروائی جاری ہے۔

اردو زبان کی ترقی کے سلسلہ میں اردو اکاڈمی کا تعاون بھی قابل ذکر ہے۔ اکاڈمی کا سالانہ بجٹ اس سال دس لاکھ روپئے سے بڑھا کر ۱۸ لاکھ روپئے کر دیا گیا ہے۔

اردو اکاڈمی کی سرگرمیوں میں اردو کتابوں کی اشاعت اردو کتابوں پر انعامات دینا، عوامی لائبریریوں اور ریڈنگ روم کو مالی امداد دینا اردو ادیبوں کے مسودات کی اشاعت میں مالی امداد دینا معمر اور بیمار ادیبوں کو گرانٹ نیز اردو کے طلبا اور کتابت کے طالب علموں کے لیے وظیفوں کا بندوبست کرنا شامل ہے۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی رفتار تیز تر کرنے کی غرض سے اردو اکاڈمی کی جنرل کونسل اور ایکزیکیٹیو کمیٹی کی تشکیل بھی اسی سال کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے ممتاز ادیبوں کی تخلیقات پر انعامات دینے کے لیے پانچ لاکھ روپئے سے فخر الدین علی احمد فنڈ قائم کیا گیا ہے۔

اقلیتوں کے مفادات کی نگہداشت کے لیے ایک اقلیتی کمیشن بھی تشکیل کیا گیا ہے جس میں مختلف مذہبی اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

محشر صادقی
نظام آباد- اعظم گڑھ

میری پیاری زمیں

یہ چمن یہ بہاریں یہ موجِ صبا
لہلہاتے ہوئے کھیت، ٹھنڈی ہوا
بھیگی بھیگی پون، کالی کالی گھٹا
تیری آغوش میں ہے بہشتِ بریں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

ہر طرف مسکراتی ہوئی زندگی
یہ چمکتی ہوئی دھوپ، یہ چاندنی
تازگی، روشنی، دلبری، دلکشی
خوش نما، خوبرو، دلکشا، دلنشیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

انجم و مہر و مہتاب تیرے لیے
ندیاں، جھیل، تالاب تیرے لیے
باغ و کہسار کا خواب تیرے لیے
کس قدر کیف زا اور کتنی حسیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

ذرہ ذرہ ہے آئینۂ کہکشاں
گوشہ گوشہ ترا نازشِ گلستاں
تیری پستی میں ہے رفعتِ آسماں
چاند تاروں میں ایسے نظارے نہیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

سمتِ مشرق سے سورج نکلتا ہوا
دیپ جیسے اندھیروں میں جلتا ہوا
وقت موسم کے سانچے میں ڈھلتا ہوا
جس طرح رقص میں ہو کوئی نازنیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

زمزمے، چہچہے گلستاں گلستاں
منزلیں، رہگذر کارواں کارواں
ہر قدم ہر نفس کامراں کامراں
حسنِ فکر و نظر، نورِ علم و یقیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

گاؤں میں تازگی شہر میں زندگی
شور و غل، قہقہے، حادثے، خامشی
کھیت، میداں، مشینیں، دھواں، روشنی
روپ ہیں زندگی کے ہزاروں یہیں
میری پیاری زمیں میری پیاری زمیں

متھرا پرشاد سنہا
مشیر اطلاعات حکومت اتر پردیش

وشوناتھ پرتاپ سنگھ

بے لوث خدمت کی علامت

اتر پردیش ہمارے ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے ۵۷ اضلاع پر مشتمل یہ ریاست مذہب، ثقافت، زبان، ادب، تاریخ اور سیاسی سرگرمیوں کا گہوارہ رہی ہے اور اسی کی قیادت ہندوستانی عوام کے لئے سرچشمۂ تحریک و عمل رہی ہے جنگ آزادی میں بھی ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۴۷ تک اسی ریاست نے سارے ملک کی قیادت کی ہندوستان کے تین وزرائے اعظم یعنی پنڈت جواہر لال نہرو، شری لال بہادر شاستری اور شریمتی اندرا گاندھی کی دلنواز شخصیتیں اسی اتر پردیش کی عظمت کی آئینہ دار رہی ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گی۔

تو ذیلی زبانوں والی اس وسیع ریاست کی خدمت کرنا۔ خادم اور حکمراں دونوں حیثیتوں سے ___ واقعی انتہائی مشکل کام ہے۔ جس وسیع خطہ کے نظم و نسق کے نگراں پنڈت گووند ولبھ پنت اور ڈاکٹر سمپورنانند جیسے عظیم دانشور، اولوالعزم اور سیاسی اور انتظامی امور کے ماہر افراد رہے ہیں، اس ریاست کی باگ ڈور ایک نوجوان مرد مجاہد سنبھالے اور وہ بھی انتہائی کامیابی، بے پناہ جوش و ہمت، اور عدیم المثال رواداری کے ساتھ اور صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت و قوت برقرار رکھتے ہوئے اور ہنستے مسکراتے آگے بڑھتا جائے، تو یہ تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ہمارے جواں سال وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو خشک سالی اور زبردست بارش، طوفان، سیلاب، بدامنی، افراط زر، خستہ حال معیشت، خالی خزانہ، مہنگائی، چور بازاری، سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین سے لیکر طلبا تک کی ہڑتالوں ڈسپلن شکنی، بدعنوانی، بدنظمی، انتشار پسند اور سماج دشمن عناصر کی غلط الزام تراشیوں اور سب سے بڑھ کر فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سنگین مسائل کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنا اور فرقہ وارانہ منافرت جیسے سنگین جرائم کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر لے لینا ایک عظیم پختہ کردار کے مالک اور آدرش وادی انسان کے خلوص و اعتماد اور حق پرستی کا بین ثبوت تھا۔

پو پھٹنے کے قبل سے لیکر رات ڈھلنے کے بعد تک ریاست کے عوام کے مسائل سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے راجکمار ہیں جو نہ صرف ایک بلند پایہ سیاستداں بھی ہیں اور ان میں سائنسی سوجھ بوجھ بھی ہے اور فنکارانہ شعور بھی۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ڈیاّ (الہ آباد) کے راج گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بچپن میں ہی راجہ صاحب مانڈہ نے انھیں گود دے دیا تھا۔ اسی لئے وہ راجہ مانڈہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں امتیازی حیثیت سے پاس کئے وہ نوجوانوں کی بین اقوامی کانفرنس میں ہندستانی وفد کے ممبر کی حیثیت سے شرکت کے لئے روس گئے۔ انھیں دنوں ان میں عوامی خدمت سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ ونوباجی کے بھودان یگیہ سے بھی متاثر ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ نہ صرف ونوباجی کے ایک انتہائی عزیز رفیق کار بن گئے بلکہ انھوں نے اپنی سیکڑوں ایکڑ زمین ونوباجی کو دان میں دے دی۔ ان کی سلیقہ مند رفیق حیات بھی اس ایثار میں پیچھے نہیں رہیں اور انھوں نے بھی اپنے حصہ کی زمین سرودئے نیتاکو سونپ دی۔ بھودان تحریک میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے بھی شری سنگھ حصول التعلیم کی جانب برابر متوجہ رہے اور موقع ملتے ہی انھوں نے انٹر سائنس کا امتحان دیا اور اس میں بھی وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ اس کے بعد پونا کے ایک مشہور تعلیمی ادارہ میں داخلہ لیکر بی۔ ایس سی امتیاز کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۱۹۶۹ء میں سرگرم سیاست میں داخل ہوئے اور ضلع الہ آباد کے سوراؤں حلقہ انتخاب سے ودھان سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کے حلقہ انتخاب پھولپور سے ۱۹۷۱ء میں بھاری اکثریت کے ساتھ انتخاب جیت کر لوک سبھا کے ممبر ہوئے ان کی اہلیت و صلاحیت کا ثبوت وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو پہلے ہی مل چکا تھا اور انھوں نے شری سنگھ کو اپنی کابینہ میں نائب وزیر تجارت کی حیثیت سے شامل کرلیا۔ مرکزی حکومت کی وزارت تجارت میں ہی وہ ۱۹۷۵ء میں وزیر مملکت کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ان کی زندگی کا ایک دور وہ بھی تھا۔ جب وہ ۱۹۷۷ء میں لوک سبھا کا چناؤ ہار گئے۔ لیکن چناؤ وہ بھلے ہی ہارے ہوں، عزم محکم کی حامل ان کی شخصیت نے کبھی شکست نہیں تسلیم کی۔ مرکزی وزیر کے عہدہ پر طویل عرصہ تک فائز رہنے کے بعد شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو دلی ریلوے اسٹیشن پر دوسرے درجہ کے ٹکٹ کے لئے لائن میں لگا دیکھ کر لوگ حیرت میں پڑ جاتے تھے اور ان ہی دنوں الہ آباد میں عوامی مسائل کے سلسلہ میں رکشے پر آتے جاتے انھیں جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ان کی سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

۱۹۸۰ء کے ودھان سبھا کے عام انتخابات کے بعد اتر پردیش کانگریس قانون ساز پارٹی نے شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو ریاست کی قیادت کے لئے اپنا لیڈر منتخب کیا۔ "سب سے سیوک دھرم کٹھورا" (خدمت گذار کے فرائض سب سے زیادہ مشکل ہوتے ہیں) کے مقولہ سے آشنا، تجربہ کار، عوامی خدمت گذار، شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ایثار تپسیا، بے لوث عوامی خدمت اور اپنی محبوب لیڈر شریمتی اندرا گاندھی کے تئیں خلوص اور انتہائی وفاداری کے متعدد واقعات مشہور رہیں۔ خدمت عامہ کے اس عمل میں ان کے کردار کی پختگی، ایمانداری، بے مثل ایثار اور تپسیا کی متعدد خوبیاں ابھر کر سامنے آئیں۔ اقتدار حاصل ہو جانے پر اور حکمرانی کا اختیار مل جانے پر طاقت کا نشہ کس پر سوار نہیں ہوتا۔ ایک انگریزی مقولہ ہے کہ طاقت انسان کو بدعنوان بنا دیتی ہے اور انتہائی طاقت انسان کو انتہائی بدعنوان بنا دیتی ہے لیکن اپنے جواں سال سر دلعزیز وزیر اعلا نے ان مقولوں کو غلط ثابت کر دیا ہے شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے وزیر اعلا بننے کے بعد جس طرح نظم و نسق کو درپیش دشوار مسائل حل کرنے کی کوشش کی وہ ان کی سوجھ بوجھ کی آئینہ دار ہے۔ ان کے طریقہ کار کی ایک بڑی خصوصیت ہے حکومت کے مفاد عامہ سے متعلق فیصلوں پر عملدرآمد میں کسی بھی اصول کے خلاف سمجھوتہ نہ کرنا، خواہ وہ سرکاری زمرہ کے توسط سے دیہی علاقوں میں نظام تقسیم کو منظم کرنے کا سوال ہو۔ خواہ کسی افسر کے تبادلہ کا معاملہ ہو۔ انھوں نے کسی بھی موقع پر اصولوں کے خلاف سمجھوتہ کرکے سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اتر پردیش کی زراعت اور صنعت کی مناسب ترقی میں حائل برقی توانائی کی قلت کا بنیادی مسئلہ حل کرنے کے سلسلہ میں شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، اس مسئلہ کو اولیت دے کر اونچا ہار تھرمل بجلی پراجکٹ، آنپارہ تھرمل بجلی پراجکٹ اور ٹہری

مائیڈل باندھ کے کام میں تیز رفتاری انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کچھ عرصہ قبل کلارکس اودھ لکھنؤ میں منعقدہ الموینم کے ماہرین کے ایک سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلا نے اپنی تجزیاتی تقریر میں جس سائنسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اس سے خود ماہرین دنگ رہ گئے۔ اسی طرح انھوں نے بیربل ساہنی انسٹی ٹیوٹ آف باٹنی میں دیے گئے اپنے خطبہ میں ماہرین نباتات کو نباتات سے متعلق اپنی عمیق معلومات سے حیرت زدہ کر دیا تھا

کارخانوں اور مختلف اداروں کے انتظامی امور میں مزدوروں کی شرکت کے رہنما اصول کے نفاذ کا وزیر اعلا کا فیصلہ بجائے خود ایک بڑا انقلابی قدم ہے۔ عوام سے وابستہ سرکاری خدمات میں نظم و نسق کی ذمہ داری کا اصول نظام حکومت کو مستعد اور چاق و چوبند بنانے کے سلسلہ میں ایک ٹھوس قدم ہے۔ بجلی بورڈ کو لامرکزی بنانے کے پس پشت صرف یہی مقصد کارفرما ہے کہ دستیاب صلاحیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چل سکے کہ پیداوار میں کمی کے لیے دراصل کون ذمہ دار ہے۔ تاکہ عوامی زندگی کے متاثر ہونے سے قبل ہی خطاکار افسروں کے خلاف کارروائی بھی ہو سکے۔ انھوں نے متعدد محکموں میں ایماندار افسروں کو صحیح کام بہ خوبی کے ساتھ کرنے کی تلقین کر کے انھیں پورا تحفظ فراہم کیا اور بدعنوان افسروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے اور نظم و نسق کو صاف ستھرا بنانے کی مہم شروع کی۔ ریاستی بس سروس کو عوام کے لئے زیادہ مفید بنانے کی غرض سے ریاستی سڑک ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں اس سلسلہ میں کئے جانے والے اقدامات اس امر کے شاہد ہیں ریاست کے طلبا کے لئے پانچ کروڑ روپیہ کے فلاحی فنڈ، ریاستی سطح پر طلبا کی کونسل کی تشکیل طلبا سے متعلق امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ ضروری اشیا کی تقسیم کا بندوبست یہ ثابت کرتا ہے کہ وزیر اعلا قومی زندگی کے ہر شعبہ میں سدھار لانے کے لئے پرعزم ہیں۔

لوک سبھا کے گذشتہ انتخابات کے دوران پرچار میں خود اپنے اور کارکنوں کے لئے جیپ اور موٹروں کا حتی المقدور استعمال نہ کر کے موٹر سائیکل سائیکل، یکہ وغیرہ کے ذریعہ انتخابی بندوبست کرنا ان کی سادگی، بلند خیالات اور خالص عوامی زندگی کے قابل تقلید پہلو ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل اپنے بڑے بیٹے کی شادی میں انھوں نے جس سادگی کا مظاہرہ کیا اسے دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ شادی کے جب دو چار دن ہی رہ گئے اور ریاست کے مسائل سے نپٹتے ہوئے وزیر اعلا نے اپنے بیٹے کی شادی کے کم سے کم انتظامات کے لئے بھی وقت نہیں نکالا تو ان کی بیوی فکرمند ہوئیں۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اپنی شادی کے سلسلے میں ضروری بندوبست تم خود کر لو جس خاندان میں ایسے مبارک موقعوں پر ہزاروں مہمان دھوم دھام سے شامل ہوتے تھے۔ وہاں دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے وزیر اعلا ہونے کے باوجود کسی لیڈر یا اپنے کابینی رفقا تک کو مدعو نہیں کیا اور شادی خاموشی کے ساتھ سادہ طریقہ سے ہو گئی۔ وہ خود بارات میں شرکت کے لئے چند گھنٹے قبل ہی وارانسی پہنچ سکے۔ شادی کے بعد نوبیاہتا جوڑے کی خیر مقدمی تقریب اور ضیافت کا اہتمام ان کے بڑے بھائی نے اپنی رہائش گاہ پر کیا۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے فلاح عامہ کے راستہ میں جتنی دشواریاں اور رکاوٹیں آئیں اور بعض عناصر نے اپنی سازشوں، غیر ذمہ دارانہ رویہ اور اصول دشمن سرگرمیوں کا بار بار جو مظاہرہ کیا وہ سب وزیر اعلا کی خوش اسلوب کارگزاری کو متاثر کرنے کے بجائے اور معاون ہی ثابت ہوا۔ بے شمار دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود ہمارے فعال وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ریاست کے دشوار مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور ریاست کی ہمہ گیر ترقی کے لئے موثر اقدامات کئے ہیں ہمیں امید ہی نہیں یقین کامل ہے کہ ان کی قیادت میں اترپردیش منظم اور ہمہ گیر ترقی کی راہ پر مسلسل آگے ہی بڑھتا جائے گا۔

★

(افسانہ)

رام لعل
شانتی نکیتن - ڈی ۲۲۹۰
رام ساگر کالونی - فیض آباد روڈ
لکھنؤ

نئی فصل کا ایک ٹرک بھرے بازار میں

دُرلبھ سنگھ نے دوسرے کھیت سے آلوؤں سے بھرا ہوا ایک ٹرک نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ورنہ اُس کا ارادہ تھا کہ پیڑ کی گھنی چھاؤں اور ہلکی ہلکی ہوا جو رفتہ رفتہ نیند کو اس کے قریب۔ بہت قریب کیے دے رہی تھی کی گود میں پہنچ جائے۔ تھوڑی دیر پہلے ساون رام کی بیٹی گلابی اسے گڑ کے ساتھ تین بڑے بڑے گیہوں کے پراٹھے کھلا گئی تھی۔ ان کی وجہ سے بھی اُس کی آنکھوں پر غنودگی چھا رہی تھی۔ جس سے بچنے کے لیے اس نے اپنے ٹرک کے تین چار چکر لگائے۔ کلینر کو اُس کی بلا ضرورت صفائی کی ہدایت کی پھر آلوؤں کے اُس ڈھیر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں دس کھیت مزدور انھیں بوریوں میں بھرنے میں مصروف تھے۔ ایک مزدور سُتلی اور سوجے سے بوریوں کا منہ بند کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ایک اور مزدور لال رنگ کا ڈبہ اُٹھائے ایک چھلے ہوئے داتون سے بوریوں پر ساون رام کا نام لکھتا جا رہا تھا۔ ساون رام خود ایک اور پیڑ کے نیچے بیٹھا چلم بھی گڑگڑا رہا تھا اور اپنے سامنے زمین پر آلوؤں کو اس ترتیب سے رکھے ہوئے تھا۔ جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ صبح سے کتنے سو بوریاں کولڈ اسٹوریج میں بھجوائی جا چکی ہیں۔

دُرلبھ سنگھ نے اپنی نیند ہی کو اڑانے کے لیے ادھر سے چلا کر کہا — "ساون رام جی — تمہارے آدمی پوستہ کھا کر آئے ہیں کیا؟"

"کا ہوا؟" ساون رام نے بڑے اطمینان سے چلم گڑگڑاتے ہوئے جواب میں پوچھا۔

اُس نے ایک جھٹکے سے چارپائی چھوڑ دی اور کھلتے ہوئے تہمد کو کس کر کمر کے گرد لپیٹا اور پھر کنگھے سے سر کے بال جوڑے میں سمیٹتا ہوا مزدوروں کی طرف چل پڑا۔ یہ کہتا ہوا۔

"میں نے قاسم کے ساتھ شرط لگا رکھی ہے کہ اس سے پہلے تمہارے کھیت کا مال کولڈ اسٹوریج میں پہنچاؤں گا۔ پر میرا دوسرا ٹرک نکلنے سے پہلے اس کا دوسرا چکر لگ رہا ہے۔ دیکھو قاسم کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر مجھے چڑا رہا ہے۔"

جو ٹرک دوسرے کھیت میں سے آلوؤں کے بورے لاد کر سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کا ڈرائیور سچ مچ ہنستا ہوا بھی دکھائی دیا۔

دُرلبھ سنگھ ملٹری کا ریٹائرڈ ڈرائیور تھا۔ چوٹ لگ جانے سے لنگڑا ہو گیا تھا۔ ڈیل ڈول کا مضبوط اور لمبا تھا۔ اس نے مزدوروں کے پاس جاتے ہی دو ایک کو ہلکی ہلکی دھول جمائی۔ کسی کسی کو پیار سے گالی بھی دی اور ساتھ ساتھ شاباشی بھی۔ پھر بوریوں کا منہ سینے والے مزدور کے ہاتھ سے سُتلی اور سوجا لے کر جلدی جلدی دس بارہ بوریوں کے منہ بند کر دیے۔ نظروں ہی نظروں میں سو کے قریب بوریاں ٹرک کو لادے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ پھر ساون رام کی طرف بڑھتے ہوئے بولا — "ان پوستیوں سے کہو میں اپنی شرط نہیں ہارنا چاہتا۔"

"کونسی شرط بدی ہے تیں نے سردار!"

ساون رام کے انداز سے لگتا تھا اُسے بھی دُرلبھ سنگھ کے شرط ہار جانے پر چنداں افسوس نہ ہوگا۔

دُرلبھ سنگھ اس کے سامنے پیروں کے بل بیٹھ گیا اور زمین پر آلوؤں کی گنتی کی قطاریں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے۔ بولا — "شرط ہار جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہوگا کہ اُس میں سے مجھے حصہ نہیں

ملے گا۔ قاسم میرا بڑا پرانا یار ہے۔ کچھ سال پہلے ہم ایک ہی ٹرک مالک کے ملازم تھے۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے ٹرک کے مالک ہیں اور اکثر ساتھ ساتھ مال ڈھوتے ہیں۔ کئی بار ہمارا ساتھ مدراس اور بمبئی تک مال لے جانے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ ہم تو بس دلچسپی کے لیے شرط لگا لیتے ہیں جو پہلے اپنا کام ختم کرلے وہ بوتل لینے کا حقدار بن جائے۔ شام کو ذرا شغل منانے کا بہانہ چاہیے اور کیا۔"

ساون رام کانے تیرپر کا ایک کسرتی ادھیڑ عمر کسان تھا اس نے دربھو سنگھ کی بات جیسے ان سنی کرکے کہا۔ "تمہارے پنجاب کے چودھری برکت رام کا آدمی سویرے سویرے آیا تھا۔ آلوؤں کی فصل دیکھ گیا۔ بھاؤ بھی بتا گیا۔ کہتا تھا ہم ایک دو ہفتے کے بعد کولڈ اسٹوریج سے سارا مال اٹھالیں گے۔ میں نے کہا ابھی اٹھالو۔ یہیں سے سیدھے منڈی میں لے جاؤ۔ بولا۔ منڈی میں بہت مال آگیا ہے اور بہت مندا چل رہا ہے۔ ابھی پندرہ بیس روز کے بعد اچھا منافع ہاتھ آئے گا۔"

"پھر! کچھ بیانہ دیا نہ بھی دے گیا کہ نہیں!"

"وہ تو دے رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ جب اٹھانے آؤ گے تبھی طے کرلیں گے۔ صاف کہہ دیا۔"

"تم ہوشیار ہو ساون رام! ۔ اب تم بھی فصلوں کے بیوپار کی ساری اے بی سی سیکھ گئے ہو۔"

"سب پیٹ سکھا دیتا ہے سردار اور جبرورت بھی۔ سرکار کا بھلا ہو۔ بڑی سہولتیں دیدیں۔ بیج کے لیے کرجا، کٹائی جتائی کے لیے کرجا، اس کے اوپر پھسل کا بیمہ اور زمین سے بیدخلی کے خلاف کانونی مدد بھی۔ بس ایک کام اور بھی سرکار کردیتی تو کسان بڑا سکھی ہو جاتا۔ بہت جیادہ سکھی!"

دربھو سنگھ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جتنی سرکاری سہولتوں کا اس نے ذکر کیا تھا ان سب کا اس کے باپ دادا کے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان سے اس نے ان کے زمانے کے مصائب کی ساری کہانیاں سنی تھیں۔ اسی لیے تو اس نے کھیتی باڑی کا کام چھوڑ کر ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس کے بزرگوں میں اب کوئی بھی زندہ [illegible] تھا۔

"بات یہ ہے سردار ہماری پچھڑی جاتوں کو اوپر اٹھانے کے واسطے سرکار جتنی سہائتا کر رہی ہے۔ ہم اس کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدل رہے ہیں۔ تم جانتے ہو ادھر کا دوسرا کھیت میرے ایک دور کے بھائی کا ہے۔ اسے میں نے بچپن ہی سے اپنے ساتھ رکھ کر محنت مجوری کرنا سکھایا۔ اب پٹے پر زمین بھی لے دی۔ جس طرح مجھے کرجے میاں سکو بھی دلاے ہیں۔ اس کا سالا سہر میں نوکر ہے ایک دپتر میں بابو ہے سایئد میں نے کہا۔ اس کا رشتہ میری بیٹی سے کروا دو لڑکا برا نہیں ہے۔ ناک نکسے کا بھی ٹھیک ہی ہے۔ پر اونچی جات برادری والوں کی دیکھا دیکھی اس کو بھی ہوا لگ گئی۔ کہلا بھیجا دس ہجار تو نکد لوں گا۔ باکی کی باتیں بیہ طے ہونے پر بتاؤں گا۔ میں کہتا ہوں ہماری جات برادری میں پہلے ایسی بات کبھی نہیں ہوئی تھی سرکار جتنے کانون بنا رہی ہے ہم لوگوں کی سہائتا کے واسطے۔ ایک یہ بھی بنادیتی کہ جو کوئی بنا دہیج کے سادی کرے گا اسے ترکی مل جائے گی اس سے بہت سے ماں باپ کے سنکٹ کٹ جاتے۔"

دربھو سنگھ نے سر گھما کر پہلے تو ذرا فاصلے پر بنے ہوئے چند گھروں کی طرف تاکا جن میں سے ایک گھر ساون رام کا بھی تھا۔ پھر اس نے کام کرتے ہوئے مزدوروں کی طرف نظریں گھمائیں اور اسی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"سماج کے ریت رواج بدلنے والے تو ہم خود ہوتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ اگر تم ووٹوں سے جیت کر اسمبلی میں پہنچ جاؤ اور اتفاق سے منتری بھی بن جاؤ تو کیا ایسا قانون بنوا لوگے؟"

"ارے میں تو بالکل اَن پڑھا آدمی ہوں سردار، ووٹ لوں گا اور منتری بھی بنوں گا۔؟ مورکھوں والی بات مت کرو جی۔ ہماری ہی برادری کا وکیل ٹیک رام منتری بنا بیٹھا ہے بڑا ٹیک ٹھاک ہے۔ وہ یہ بات کیوں نہیں سوچتا۔"

"تب! تب تم اپنی بات کیوں نہیں کہتے اس سے؟ کیا کوئی تمہیں اس کے پاس جانے سے روکتا ہے؟ اپنی جات برادری کی بات اس سے ضرور کہی جانی چاہیے ــــــ وہ سب کو جمع کرکے بھی سمجھا سکتا ہے۔ سارے برے قانون سے تھوڑے ہی حل کرائے جا سکتے ہیں۔"

ساون رام نے اپنے مزدوروں کی طرف سر گھما کر زور سے پکارا ــــ" اے سگوا، راما ہو! جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ جرا! کا مُردوں کی طراں کام کرت ہو!"

پھر اُس نے اپنے گاؤں کی طرف تاکا۔ اور بولا۔ "گلبیا کا کر رہی ہے پتہ نہیں! ۔ ان کے لیے چائے کی بالٹی لے کے آنے کے واسطے کہا تھا۔ یہ سب جب تک چائے نہ سڑک لیویں گے ہاتھ پاؤں چلانے میں تیجی نہ دکھاویں گے؟

پھر وہ مزدوروں کی طرف دیکھ کر چلّایا" اے منوموا ہو۔ تنِک آجاؤ۔ بیڑی کے بنڈل لے جاؤ رے!"

اس نے ایک بوری کے نیچے رکھے ہوئے بیڑیوں کے چار پانچ بنڈل اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیے اور چلم گڑگڑانے لگا۔

دُرلبھ سنگھ اُٹھ کر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے بولا" میں جا کر دیکھتا ہوں۔ چائے تیار ہو گئی ہو گی تو بالٹی اٹھا کر لے آؤں گا۔ تم ذرا مزدوروں کے سر پر جا کر کھڑے ہو جاؤ باپو!"

ساون رام کی بیٹی اُسے دروازے پر ہی مل گئی۔ وہ ایک ہاتھ میں گرم گرم چائے سے بھری ہوئی بالٹی کو کپڑے سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں دس پندرہ لال لال مٹی کے کلہڑ تھے۔ دُرلبھ سنگھ نے اُس کے ہاتھ سے بالٹی لے لی اور اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا" گلابی، ترا باپو تو ابھی تک اُسی آدمی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ تو نے اُسے بتایا نہیں میرے بنک کے لاکر میں رکھے ہوئے گہنوں کے بارے میں جو میں نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد وہاں رکھ چھوڑے ہیں!"

گلابی سر جھکا کر بولی ــ یہ سب تو اُسے پہلے سے معلوم ہے۔"

"پھر۔!" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا ــ" پھر کیا کہتا ہے وہ؟"

"میں کیا جانوں ۔" وہ شرم سے لال سرخ ہوتی گئی" تم کھد ہی کیوں نہیں کہہ دیتے باپو سے، صاحب صاحب۔"

"دکیا معلوم تمھارا انکار ہی نہ کر دے کہیں!"

ساون رام مزدوروں کے پاس کھڑا سر گھما گھما کر دونوں کو آتا ہوا بھی دیکھ رہا تھا۔ دُرلبھ نے اُن کے پاس پہنچ کر بالٹی زمین پر رکھ دی۔ وہ خود پاؤں کے بل بیٹھ کر چائے کے کلہڑ بھر بھر کر گلابی کو دینے لگا مزدور ان کے سامنے قطار باندھ کر زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ گلابی ہر ایک کے ہاتھ میں چائے کے کلہڑ دیتی گئی۔

دُرلبھ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا ــ" چار بج رہے ہیں یارو۔ پانچ بجے تک ٹرک بھر دو تو میں ایک چکر لگا لوں گا۔"

اُسی وقت پاس کے کھیت سے ایک ٹریکٹر بھی گھڑ گھڑاتا ہوا آگیا جس کے ٹریلر پر بہت سی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ٹریلر کے پیچھے پیچھے چھ مزدور بھی آگئے تھے۔ وہ سب مل کر ٹرک میں بوریاں لادنے لگے۔ ساون رام ہر ایک بوری پر نیلی سیاہی سے لگے ہوئے نشان دیکھتا گیا۔ پھر اُس نے اُنہی مزدوروں کو اپنی بوریاں بھی لادنے پر لگا دیا۔ دُرلبھ سنگھ اب کچھ مطمئن سا نظر آیا۔ پیٹر کے نیچے چارپائی پر رکھی ہوئی اپنی پگڑی بھی اٹھا لایا اور سر پر جما جما کر باندھتے ہوئے ساون رام سے بولا ــ" سات بجے تک ایک ٹرک کا مال اور بھروا دو تو سمجھو بیڑا پار ہو گیا۔"

" سردار، بھروا دوں گا نہیں تو کیا یہ رات بھر کھلے آسمان کے نیچے پڑا رہے گا۔ بارس وارس ہو گئی تو سب ستیاناس نہیں ہو جائے گا!"

ٹرک روانہ ہونے لگا تو اچانک ساون رام اُس کے پاس آکر بولا۔" سردار گلبیا بھی تیرے ساتھ جا رہی ہے۔ بجار سے کچھ سامان لینا ہے اُسے جاتے بخت اُتار دینا آتے بکت سنگ لیتے آنا!"

پھر اُس نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ جدھر سے گلابی بغل میں ایک پوٹلی دبائے جلدی جلدی بھاگتی ہوئی سی چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک بار لڑکھڑائی تو اس کا باپ چلّا کر بولا" جرا سنبھل کے چل ری چھوکری۔ گر پڑی اور چوٹ کھا گئی تو میرا تو گھر بھی سنبھالنے والا اور کوئی نہیں ہو گا۔"

وہ ٹرک میں دُرلبھ سنگھ کے ساتھ آگے بیٹھ گئی۔ راستے بھر پیچھے آلوؤں کے بورے پر بیٹھے ہوئے مزدور گانا گاتے رہے۔ اُن کی یہ خوشی محنت مزدوری کے وقار کا ہی ایک اظہار تھی۔ دُرلبھ سنگھ

نے کہا۔

"تم باپ بیٹی دونوں بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔"

"کیسے؟" گلابی نے بڑی حسرت سے اس کی طرف تاکا۔

"تھوڑی دیر پہلے تک تو تیرا میرے ساتھ آنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ یہ اچانک کیسے فیصلہ ہو گیا؟"

"وہ تو میں نے کہلایا باپو سے۔ سردار بجنور کے بجار سے ہی تو ہو کر جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں۔ اسی کے ساتھ لوٹ آؤں گی۔ مان گیا باپو۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں تم دونوں بہت چالاک ہو۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ وہ چمک کر بولی "اس میں چالاکی کی کونسی بات ہے؟"

"اب یہ کوئی جھاوت تو ہے نہیں جو تیری سمجھ میں نہ آ رہی ہو!"

وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے کتنے لمحوں تک اس کی طرف گھورتا رہ گیا۔ پھر اس کے پاس سے کتنے ٹرک اور بسیں نکل گئیں اور وہ اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ پیچھے سے آنے والی ایک کار کو بھی راستہ دے چکا اور پھر اپنے سامنے دور تک سڑک کو صاف پا کر بولا "کیا تیرا باپو اس طرح تجھے کسی اور ڈرائیور کے ساتھ بھیج سکتا تھا؟"

"وہ نہیں جانتا ہے نا۔ کتنے مہینوں سے یہاں کا مال ڈھو رہے ہو۔" "اس کا مال تو اور کئی ڈرائیوروں نے بھی ڈھویا ہوگا۔ پر اس کی جوان بیٹی کو اب تک کسی نے اس طرح نہیں ڈھویا ہوگا۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے؟" وہ ہنس بھی پڑا۔

"کیا کالا کالا نظر آتا ہے"؟ وہ اسی طرح معصومیت سے بولی اگرچہ اس کے چہرے پر خوشی کی رنگت بھی ہویدا تھی۔

درلبھ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر تک سر گھما گھما کر اسے دیکھتا رہا۔ سانولی سلونی سی لڑکی کو جس کے چہرے اور لباس کی کیفیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ گاؤں اور شہر کے فاصلے سے کافی اوپر اٹھ چکی ہے۔

بجنور کے بیچوں بیچ جس بازار سے ٹرک کو گزرنا تھا وہاں ایک جگہ درلبھ سنگھ نے گلابی کو اتار دیا۔ وہ کھڑکی کے پاس اس کے ساتھ اپنی واپسی کا پروگرام طے کر رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک سائیکل سوار آ گیا۔ اور گلابی سے مخاطب ہو کر بولا "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو"

اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے اور اسے ایک سکھ ڈرائیور کے ساتھ کھڑے ہو کر اس طرح باتیں کرتا ہوا دیکھ کر اچھا نہیں لگا ہے لیکن گلابی نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور درلبھ سنگھ سے بولی۔

"یہ وہی لڑکا ہے جس کے ساتھ باپو نے بات چلائی تھی۔"

درلبھ سنگھ نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ اور گلابی کی طرف بھی جو اسے کوئی جواب دیے بغیر جانے لگی تھی۔ اس لڑکے نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچھ باتیں اور کہیں اور سر گھما کر درلبھ سنگھ کی طرف بھی دیکھا۔ گلابی کھڑی ہو گئی اور اس نے اس سے تیز تیز لہجے میں کچھ کہا۔ درلبھ سنگھ سمجھ گیا۔ وہ اس پر اپنا کچھ حق سمجھ کر اس سے جواب طلب کر رہا ہے۔ اس سے نہ رہا گیا اور ٹرک چھوڑ کر ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ گلابی کے منہ سے صرف یہ جملہ سن کر "تم سے مطلب، میں کسی کے بھی ساتھ آؤں جاؤں!" اس نے لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا کہتا ہے بوا!"

لڑکے نے کچھ تیز ہو کر گلابی سے کہا "میں تیرے باپو سے شکایت کروں گا!"

"کیا شکایت کرے گا؟ مجھے بھی تو بتا!" درلبھ دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں" وہ اسی غصّے سے بولا۔

"کیوں نہیں کر رہا ہے۔ تجھے مجھ سے بات کرنی پڑے گی اور میں بھی پوچھتا ہوں تو نے اس سے بات ہی کیوں کی؟ بول!" یہ کہہ کر درلبھ نے اس کی قمیض کا کالر پکڑ لیا۔

وہ کالر چھڑاتے ہوئے بولا "میں تمہاری پولیس میں رپورٹ کر دوں گا۔ میرا کالر چھوڑ دے۔؟"

"پولیس کیا تیری ہی سب کچھ لگتی ہے؟ میری کچھ نہیں۔؟ چل کون سے تھانے میں لے چلتا ہے مجھے۔ میں بھی یہاں سب کو جانتا ہوں۔ مجسٹریٹ تک مجھے پہچانتے ہیں۔ ان کی عدالتوں میں میں نے کتنی بار جرمانہ بھرا ہے اور ان سے پرمٹ بھی لیے ہیں۔ یہ مت بھول کہ انصاف کے دروازے سب پر کھلے ہوئے ہیں صرف تیرے جیسے شہری باپوؤں کے لیے نہیں جو رشتہ کرنے کے لیے دس دس ہزار روپئے مانگتے ہیں اور لڑکی کو یہ اجازت بھی نہیں دیتے کہ وہ آزادی سے کسی کے ساتھ آ جا سکے۔"

لڑکے نے دُرلبھ سنگھ کی طرف بڑی حیرت سے تاکا۔ ٹرک کے اوپر بوریوں پر بیٹھے ہوئے مزدوران کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "سردار جی ہم آئیں کچھ مدد کریں!"

"نہیں۔ تمہاری ضرورت نہیں۔ میں ہی کافی ہوں۔" اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں منع کر دیا اور گلابی سے کہا۔ "تو جا اپنا کام کر۔ میں اس لڑکے کو ٹرک پر لاد کر ذرا تھانے تک لے جاتا ہوں جہاں یہ میرے خلاف رپٹ لکھوائے گا۔ جا جا تو جا۔" لیکن گلابی وہاں سے نہ ہٹی۔

لڑکے نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی اپنی خیریت سمجھی وہ سائیکل ہاتھ میں لیے ہوئے ایک طرف چلا گیا تو دُرلبھ سنگھ نے ہنستے ہوئے اپنی مونچھیں سہلائیں۔ اور گلابی سے بولا۔ "آج تیرے باپ سے صاف صاف کہنا پڑے گا۔ شاید وہ بھی اسی انتظار میں ہوگا کہ کوئی کہ ضرور کچھ کہوں گا۔ تو بھی وہاں موجود رہنا۔ سمجھی!"

یہ کہہ کر وہ پھر ٹرک میں جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ گیئر دبایا اور پھر کھڑکی میں سے سر نکال کر بولا۔ "دو گھنٹے کے بعد آؤں گا۔ اسی جگہ ملنا اور سن یہ لونڈا تیرا راستہ پھر روکے نا تو اسے بھرے بازار میں میری طرف سے دو تھپڑ لگا دینا۔ ڈرنا مت! باقی میں آکر سنبھال لوں گا۔"

★

صفحہ ۵ کا بقیہ

کہیں گرمی، کہیں سختی، کہیں ضابطہ سے کام لیکر اس صورت حال کو ختم کرنے میں جس نمایاں طریقہ سے کامیابی حاصل کی ہے اس کی بدولت بہت دنوں کے بعد اتر پردیش میں ایک ایسا ماحول تیار ہو سکا ہے جس میں تعمیری کام اور ترقی کی جدوجہد نئے اطمینان اور سکون کے ساتھ جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں کون سے شعبہ میں کتنی بہتری آئی ہے۔ کون سے محاذ پر کتنی کامیابی ملی اور انتظامیہ کے کون سے پہلو پر کتنی پیش رفت عمل میں آئی یہ کام اعداد و شمار کے ذریعہ ہم سے زیادہ بہتر اور باصلاحیت لوگ انجام دے سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو ساری اہمیت اس ماحول کو پیدا کر دینے میں کامیابی کی ہے، جس میں ترقی اور تعمیر، پیش رفت اور آگے بڑھنے کا عمل جاری رکھا جا سکتا ہے اور ایک سال کی قلیل مدت میں اتنی کامیابی یقیناً ایک کارنامہ کے نام سے یاد کی جا سکتی ہے۔

اس کارنامہ کو انجام دینے کے سلسلے میں، اتنی بات ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لینے کی ہے کہ اخلاقی قوت سے آراستہ قیادت کے بغیر، کوئی بنیادی کام انجام نہیں دیا جا سکتا، اور اس کامیابی کا اصل سبب یہی ہے کہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ایک ایسی اخلاقی قیادت ریاست کو مہیا کر دی ہے جس کے سربراہ کی نیت، ایمانداری اور ترقی کے جذبہ کے بارے میں ان کا کوئی مخالف بھی شبہ نہیں کر سکتا۔

شہری حقوق کے تحفظ سے متعلق قانون ۱۹۵۵ء کو موثر طور سے نافذ کرنے کے لیے حکومت مسلسل کوشاں رہی ہے اس قانون کے نفاذ اور اقوام مندرجہ فہرست پر ہونے والی زیادتیوں کی جانچ کے لیے صدر مقام پر ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے تحت ایک خصوصی جانچ سیل بھی قائم کیا گیا ہے۔ قانون کے تحت معاملات کو جلد نپٹانے کے لیے ہر ضلع میں ایک علاحدہ جوڈیشیل مجسٹریٹ بھی نامزد کیا گیا ہے۔

حکومت کی سبھی سروسوں اور اسامیوں میں اقوام

صفحہ ۳ کا بقیہ

مندرجہ فہرست اور پسماندہ طبقوں کی بعض ذاتوں کے لیے ریزرویشن کا بندوبست کیا گیا ہے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔

قومی اتحاد کے استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے ریاستی حکومت قومی یکجہتی سے متعلق کام کو ایک مسلسل جاری رہنے والی تحریک کی شکل دے رہی ہے جس کے یقینی طور سے خاطر خواہ اور سود مند نتائج برآمد ہوں گے۔

★

مشتاق پردیسی
بھدرواں۔ کلمرگ

تبدیلیاں اور نفسیاتی شعور

تبدیلیاں جب کبھی آتی ہیں تو پہلے ماحول اور مادی وسائل میں آتی ہیں رفتہ رفتہ یہ تبدیلیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں اور اس سے آدمی من حیث القوم متاثر ہونے لگتا ہے۔ تبدیلیوں سے واقفیت اور اس سے متاثر ہونے کے بعد ہی آدمی نفسیاتی طور پر تبدیلیوں کو قبول کرنے اور ان تبدیلیوں کے خد و خال میں اپنے کو ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔

تبدیلی ایک ایسا عمل ہے جو ابتدائے کائنات سے ہوتا آیا ہے ہو رہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا اگر آدمی کو درمیان سے نکال دیجیے تو تبدیلیاں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آدمی ماحول کی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر ہی آگے بڑھنے یا دوسرے الفاظ میں ترقی کی بات سوچتا ہے۔ جب وہ ترقی کی راہوں پر چلتا ہے۔ تو اس کے ساتھ سارا ماحول چلنے لگتا ہے اور ایسے ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسا تمدن فراہم کرتا ہے۔ جس کے اثرات تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ترقیاں اور یہ تبدیلیاں وقت کی گردش کے ساتھ تیز رفتار ہو کر سست رفتار ہوتی ہیں اور پھر ان پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے اور یہی وہ نقطہ عروج ہوتا ہے۔ جہاں سے تہذیب و تمدن موت کی ہچکیاں لینے لگتے ہیں۔ یہ عمل بہر حال صدیوں پر پھیلا ہوتا ہے۔

انسانی نفسیات کے بموجب بچہ پیدا ہونے کے بعد سے ہی اپنے گرد و پیش کے طبعی، مادی اور حسیاتی ماحول سے دوچار ہوتا ہے۔ ابتدا میں ماں کی گود ہی اسکی کائنات ہوتی ہے۔ پھر اس کائنات میں ماں کی آواز شامل ہو جاتی ہے۔ ماں کی آواز کو علاحدہ سیاق و سباق میں دیکھنے کے لئے وہ دوسری آوازوں کو بھی سنتا ہے اور ان میں تمیز کرنا سیکھتا ہے۔ عمر کے ساتھ ہی اسکی کائنات میں خاندان کے دوسرے افراد، گھر کی دوسری چیزیں (پیار اور کام) ذہن کی آزمائش کے لئے مختلف قسم کی غذائیں شامل ہونے لگتی ہیں اور یہ ننھی سی جان ہر چیز سے نہ صرف متاثر ہوتی ہے۔ بلکہ اسے قبول کرتی ہے۔ "اس طرح بچہ Adjustment کے لامتناہی عمل میں شامل ہوتا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح تہذیب و تمدن بھی اپنے بچپن ہی کے دور سے مختلف تبدیلیوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور تاریخ قدیم سے تاریخ حال کی طرف رواں ہوتے ہیں

تہذیب انسانی کا بچپن ختم ہو چکا پھر بھی مختلف اقوام کی زندگی میں کچھ ایسے اہم موڑ ضرور آجاتے ہیں کہ وہ اچانک ایک نئی سمت کو چل پڑتی ہیں۔ جہاں سے ان کی تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اور وہیں سے Adjustment کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی چل پڑتا ہے۔

اہم موڑ | ہندوستان میں یہ اہم موڑ ۱۹۴۷ء میں آیا تھا۔ ۱۵ اگست کو ہم نے اپنے سفر کی سمت بدل دی حصول آزادی کے مقصد کے بعد اب ایک نیا مقصد سامنے تھا اور وہ تھا۔ "ترقی"۔

ایسی ترقی جس کی برکت سے ملک کا ایک ایک فرد زمین سائنس اور علم سے حاصل ہونے والے فوائد کا حصہ دار بن سکے۔ اسکے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسا منصوبہ تیار ہو جو برسوں پہلے ترقی کے سفر کی منزلوں کا تعین کر دے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی پنج سالہ منصوبے تیار کئے گئے۔ ملک کے کسی حصہ کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے سڑکوں ریلوں۔ آبپاشی بجلی اور غذائی سامان کی فراوانی کے لئے کام شروع کر دیا گیا۔ اس دور نے جمشید پور در بھلائی کے حصار میں فولاد کی طاقت کو اسیر کر لیا۔ بھاکڑہ ننگل۔ ریہانڈ اور دامودر کے شکنجوں میں بجلیوں کو قید کر لیا گیا۔ کرشنا ساگر اور چمراج ساگر کے عظیم ذخیرہ آب کو کسانوں کے پیاسے کھیتوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ ترقی کی برکتوں سے ایک ایک فرد روشناس ہوا۔ اس سے متاثر ہوا

ان تبدیلیوں کو قبول کرنے لگا اور مزید تبدیلیوں کے لئے تیار ہونے لگا۔

اتر پردیش

اس ریاست کے عوام کی نفسیاتی فضا ساز گار کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو متنازعہ نہ ہو۔ جو بڑی آسانی سے اور اپنے ذاتی کردار کے بل بوتے پر عوام کا اعتماد حاصل کرلے اور اسکے بعد ان جزئیات پر اپنی نظر رکھ سکے۔ جن کو عام طور سے حکمراں جماعتیں بھولنے لگتی ہیں۔ آخر کار اتر پردیش میں بجائے کسی ممبر اسمبلی کو وزیر اعلا بنانے کے دہلی سے ایک ممبر پارلیمنٹ کو لایا گیا۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ جو فطری طور پر شرمیلے مگر نڈر۔ جزئیات پر گہری نظر رکھنے والے اور عام آدمی کی ضروریات کو سمجھنے والے اور ان کی مشکلات کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرنے والے شخص ہیں اس بڑی اور سیاسی طور پر الجھی ہوئی ریاست کے وزیر اعلا بنائے گئے۔

وزیر اعلانے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پنج سالہ منصوبے میں جو رخنے سابقہ حکومت نے پیدا کردیے تھے۔ انھیں دور کیا بجائے ٹیکس لگائے بغیر بجٹ تیار کیا۔ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کو اولیت دی۔ آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے کی اب بھی وہ کوشش کر رہے ہیں بنکروں کے لئے اور ہینڈلوم صنعت کے لئے انھوں نے ضروری اور تعمیری اقدامات کیے اور اسطرح کسانوں۔ بنکروں اور مزدوروں کے بہت بڑے طبقے کا دل جیت لیا۔ یہ اقدامات عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یقیناً ضروری تھے۔

ریاستی حکومت جانتی ہے۔ کہ جب تک جمہوریت میں عوام اور حکومت ایکدوسرے کے قریب نہ آئیں گے اور ایک دوسرے کو تعاون نہ دیں گے۔ اسوقت تک ہمہ جہتی ترقی ناممکن ہے۔ اسی لئے ریاست کے وزرا اور خود وزیر اعلانے عوام کے قریب آنے کی پوری کوشش کی۔ عوام کے ساتھ ہی انھوں نے اخبار والوں یعنی صحافیوں کا اعتماد حاصل کیا۔ یہ اعتماد خوشامد یا منھ بھرائی سے نہیں بلکہ صحافیوں کی کھلی تنقیدوں کا سامنا کرکے اور ان کو مطمئن کرکے حاصل کیا گیا۔

امیٹھی۔ اناؤ۔ بھدوہی جیسے پس ماندہ علاقوں میں صنعت کاری کے عمل کو تیز تر کرنے کے لئے لال فیتہ شاہی کی بالادستی ختم کرکے دراصل انھوں نے ریاست کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

اس مضمون میں میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ریاستی حکومت نے جو کام کیے اسکے اعداد و شمار پیش کروں۔ میرا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ فرد سے سوسائٹی بنتی ہے۔ سوسائٹی ہی سیاست اور حکومت کو جنم دیتی ہے اور اگر حکمراں طبقہ فرد کی نفسیات اور اس کی ضروریات پر گہری نظر رکھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ عوام مطمئن ہو سکتے ہیں بلکہ حکومت بھی تعمیری کاموں میں منہمک رہ سکتی ہے۔

اسی جگہ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ انسان کے Adjustment کا عمل مشکل اور دیرپا ہوتا ہے مگر آدمی کو جب تک تعمیری یا مثبت Adjustment کی فضا نہ مہیا کی جائے تو وہ یقینی طور پر منفی ردعمل کا شکار ہونے لگتا ہے۔ بعض عناصر جان بوجھ کر عوام کے ایک طبقے میں منفی ردعمل پیدا بھی کرتے رہتے ہیں جو فرقہ وارانہ فساد۔ ذات برادری کی تفریق۔ طلبا اور مزدوروں کی بے چینی کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ایک بہت آسان عمل ہوتا ہے۔ کچھ افواہوں کو بنیاد بنا کر عام آدمی کے ایک مخصوص گروہ کو حکومت کا مخالف بنا دیا جاتا ہے۔ اس منفی ردعمل میں آدمی اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ قدرتی اور فطری مظاہر کو بھی سیاست سے جوڑنے لگتا ہے۔ مثلاً فلاں جگہ سوکھا پڑ گیا تو یہ موجودہ وزیر کی وجہ سے ہوا۔ یا زلزلہ حکمراں پارٹی کی وجہ سے آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک کامیاب حکمراں وہی ہے جو اس طرح کے منفی ردعمل کی کاٹ آسانی سے اور خوبصورتی سے کرسکے اسکی کاٹ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حکمراں شخص اور اس کی جماعت عوام کے اتنے قریب آجائے کہ افواہوں کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔ اور ایسا ہی اس ریاست میں ہوا بھی۔ مرادآباد کے فرقہ وارانہ فسادات کے موقعہ پر وزیر اعلانے فوری طور پر اپنا استعفا پیش کرکے دراصل اسی منفی ردعمل کی کاٹ کرنے اور عوام نیز حکمراں طبقے کے درمیان افواہوں کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش تھی اسکے بہتر نفسیاتی نتائج سامنے آئے۔

اب بہرحال ریاست میں مجموعی طور پر ایک ایسی فضا بن چکی ہے۔ جس میں لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ خوش ہوں کہ مراغم نظر انداز نہیں ہے۔

★

مظہر نظامی
جوہری محلہ لکھنؤ

پروازِ ترقی

بھارت ترے سینے میں کیا امن کے ڈیرے ہیں
ہر شام روپہلی ہے، زرتار سویرے ہیں
خوشبو کی سبک گامی اب رہبرِ دوراں ہے
آغوش میں شبنم کی پھولوں کے بسیرے ہیں

بھارت کو تغیّر کا آئینہ بنانا ہے
ہم سمجھے ہیں اے انساں جو حوصلے تیرے ہیں
اب مہرِ سیاست کی کرنوں کا یہ عالم ہے
نزدیک اجالے ہیں اور دور اندھیرے ہیں

اب ہند ہمارا ہے جمہور کا آئینہ
اس چاند کا کیا کہنا تارے جسے گھیرے ہیں
یوں نقش ابھرتے ہیں دامانِ ترنم پر
حیران زمانہ ہے اعجازِ تکلّم پر

ہمّت کے سفینے بھی طوفانوں میں ٹھہرے ہیں
تصویرِ یقیں میں اب جو رنگ ہیں گہرے ہیں
اسطرح سے جاگے ہیں اب نیند کے ماتے بھی
دیکھے ہیں جو آنکھوں نے وہ خواب سنہرے ہیں

یہ چاند ستارے بھی کیا خوب خزینے ہیں
یا جھیل میں نیلم کی، چاندی کے سفینے ہیں
جوہر نے تراشے ہیں، یا پونے سنوارے ہیں
بھارت کی انگوٹھی پر خوش رنگ نگینے ہیں

ہے عزم کی تابانی شائستہ جبینوں پر
گفتار میں نرمی ہے سنجیدہ قرینے ہیں
لیکن ہے ارادوں میں کچھ شعلۂ بیتابی
پروازِ ترقی کے دراصل یہ زینے ہیں

اب پیارا وطن اپنا اک امن کا پرچم ہے
آزادیِ انساں کا کچھ اور ہی عالم ہے

نصیر ناطقی
معرفت "قومی آواز"
قیصر باغ۔ لکھنؤ

کارنامے

اپنے صوبے کا خلوصِ دل سے لیں ہم جائزہ
تاکہ ہو کارِ حکومت سے ہر انساں آشنا
کاوشیں، اہلِ حکومت کی فقط اک سال کی
داد دینا ہی پڑے گی، اُس کے استقلال کی

یہ حکومت تو، اندھیروں میں ہے اک روشن چراغ
روشنی سے جس کی انساں ہو نہ کیسے باغ باغ
کس نے یکجہتی کا سہرا، اپنے سر پر باندھ کر
راستہ طے کر لیا ہے خود ہی بے خوف و خطر

صنعتوں کی اک کمیٹی بھی بنائی اِس لیے
چھوٹے طبقوں کو سہولت جس سے فوراً مل سکے
ہے جو اک "ادیوگ بندھو" وہ بھی لا محدود ہے
جس سے صنعت کار کی بہبود ہی بہبود ہے

اور کسانوں کو دیا انعام "مِتّرِ سیل" کا
کھاد اور بجلی کو پاکر کام اُن کا چل گیا
نرخ گنّے کا بڑھایا، یہ کیا کارِ عظیم
کیوں نہ کھیتوں میں چلے اٹھلا کے اب بادِ نسیم

اُردو سرکاری زباں بن جائے گی، وعدہ کیا
پر ضیا اُس کا بھی مستقبل نظر آنے لگا
ہم دعاگو ہیں پھلے پھولے حکومت حشر تک
یوں ہی راہِ زندگی کھولے حکومت حشر تک

شوکت عمر
معرفت "قومی آواز"
قیصر باغ لکھنؤ

پیداوار : مہنگائی کا متبادل

قیمتوں میں ہونے والے اضافہ کا رونا تو بہت رویا جاتا ہے لیکن کیا کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ قیمتوں میں اضافہ کیوں ہوتلہے؟ اس کیلئے تنہا حکومت ذمہ دار ہے یا ہم لوگوں پر بھی اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

ماہرین اقتصادیات اس بات پر متفق ہیں کہ جب پیداوار کم ہوتی ہے اور مانگ بڑھتی ہے تو چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پیداوار ایک پیچیدہ عمل ہے۔ مل مالک اور مزدور سامان تیار کرتے ہیں اور وہی اپنی بنی ہوئی چیزیں منڈی میں فروخت کے لیے لاتے ہیں۔ وہی قیمتیں مقرر کرتے ہیں مزدور کو تو وہی اجرت ملتی ہے جو طے ہے لیکن مصنوعات کا فائدہ مل مالک اٹھاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کارخانوں کے مالک زیادہ منافع کمانے کے لیے چیزیں مانگ سے کم تیار کرتے ہیں۔ اس سے ان اشیا کی قلت ہو جاتی ہے اور وہ جی کھول کر منافع حاصل کرتے ہیں۔ مل مالکوں کا یہ رویہ معیشت کے لیے منفی ہے اور ملک کے لیے نقصان دہ ہے۔ لیکن یہ رجحان عمومی طور پر نجی زمرہ کے کارخانوں کے مالکوں کا ہے۔ حکومت نے اس رجحان سے لڑنے کے لیے عوامی زمرہ کے کارخانے قائم کیے ہیں اور کلیدی صنعتوں میں حکومت کو خود داخل ہونا پڑا ہے تاکہ پیداوار اور مانگ میں توازن قائم رکھا جائے لیکن ہندستان جیسے بڑے ملک میں حکومت تنہا سارے کارخانوں میں پیداوار کی نگرانی نہیں کر سکتی ہے۔ عوام کو بھی اس سلسلہ میں حکومت کو تعاون دینا ہوگا۔

حکومت تو صرف قانون بنا سکتی ہے، نگراں ایجنسیاں قائم کر سکتی ہے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکتی ہے۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں قائم ہونے والی حکومت نے منافع خوری اور چور بازاری سے نمٹنے کے لیے اشیائے ضروریہ قانون بنایا ہے۔ منافع خوری اور چور بازاری کی روک تھام کرنے کے لیے بعض موثر اقدامات کیے ہیں جس کے نتیجہ میں قیمتوں میں بڑی حد تک استحکام پیدا ہوا ہے لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو سکے ہیں۔

پیداوار اور مانگ میں توازن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پیداوار بڑھائی جائے۔ حکومت نے صنعت کاروں کو پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے مختلف سہولتیں دی ہیں۔ بجلی اور خام مال مناسب اور معقول قیمت پر سپلائی کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ نئی صنعتوں کے قیام کے لیے زمین اور مالی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے قرضہ آسان شرطوں پر دے رہی ہے لیکن پھر بھی پیداوار اور مانگ میں توازن نہیں پیدا ہو پا رہا ہے۔ اس کا سبب منافع خوری کی جبلت ہے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کارخانے دار تو مقررہ قیمتوں پر ڈیلروں کو مال سپلائی کرتے ہیں لیکن ڈیلر بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھ کر ان چیزوں کو اپنے گوداموں میں چھپا لیتے ہیں۔ حکومت نے روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزوں کی تقسیم کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا کام امداد باہمی انجمنوں کے سپرد کیا ہے۔ اس کا مقصد درمیانی لوگوں کو تقسیم کے کام سے ہٹا کر عوام کو اس کام میں شامل کرنا ہے۔ جن قصبات اور دیہاتوں میں امداد باہمی انجمنوں نے تقسیم کا کام سنبھالا ہے وہاں عوام کو راحت ملی ہے۔ حکومت نے یہ کام تجرباتی بنیاد پر شروع کیا ہے۔ اس میں کامیابی کے بعد اس کی توسیع کی جا سکتی ہے۔ حکومت نے بعض اشیا جیسے تیل، بناسپتی، شکر وغیرہ کی تقسیم کا کام امداد باہمی

فیڈریشن کے سپرد کیا ہے۔ اس کا مقصد سبھی آڑھتیوں کو ختم کرنا ہے۔ لیکن حکومت کو ہر طبقہ کا مفاد دیکھنا ہوتا ہے۔ اگر آڑھتیوں کو فی الفور ختم کر دیا جائے تو سماج کا ایک طبقہ بیکار ہو جائے گا۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں موجودہ حکومت سوشلزم کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے بڑی احتیاط سے اور بتدریج اقدام کر رہی ہے۔ لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود پیداوار بڑھائے بغیر قیمتوں کو مستحکم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مہنگائی پر قابو نہیں پایا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پیداوار کیسے بڑھائی جائے؟ اس کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا کہ کارخانوں میں پیداوار کا کام مزدور انجام دیتے ہیں۔ مل مالک سرمایہ اور خام مال فراہم کرتے ہیں۔ اگر مزدوروں کو معقول اجرت دی جائے تو وہ زیادہ محنت اور لگن سے کام کریں گے اور اس کے نتیجے میں پیداوار بڑھے گی لیکن اگر مزدور میں یہ احساس ہے کہ اسے تو طے شدہ تنخواہ ہی ملے گی تو وہ اتنی جانفشانی سے کام نہیں کرے گا۔ ڈھرّے کا کام کر کے گھر چلا جائے گا اس لیے مزدوروں میں یہ احساس پیدا کرنا ہوگا کہ کارخانہ کے انتظام اور انصرام میں وہ بھی حصّہ دار ہیں۔ اس خیال سے حکومت نے کارخانوں کی انتظامیہ میں مزدوروں کو شامل کرنے کی اسکیم رائج کی ہے۔ جن کارخانوں میں مزدوروں کو انتظامیہ میں شامل کیا گیا ہے ان میں پیداوار بڑھی ہے۔ مل مالک اور مزدور کے تعلقات آقا اور مالک کے نہیں رہے اور دونوں ایک مشین کے ناقابل تبدیل پرزے بن گئے۔ مل مالک سرمایہ نہ فراہم کرے اور خام مال کا بندوبست نہ کرے تو مزدور سامان کیسے تیار کر سکتا ہے اسی طرح مزدور کارخانہ میں مشینوں پر کام نہ کرے تو پیداوار نہیں ہوگی۔ اس لئے دونوں کے تعلقات خوشگوار ہونا چاہیے صنعتی تنازعات کے نتیجہ میں ہونے والی ہڑتالوں، تالہ بندیوں تحریکوں اور گھیراؤ کا منفی اثر پیداوار پر پڑتا ہے، صنعتی تنازعات ملک کی معیشت کے لیے مضرت رساں ہیں۔

موجودہ حکومت نے صنعتی تنازعات کو جلد نپٹانے کے لیے سہ فریقی کمیٹی کو فعال بنایا ہے اور لیبر عدالتوں کو ہدایت دی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ان تنازعات کا فیصلہ کر دیا جائے۔

پیداوار بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو ترغیبات دی جائیں۔ ان کی اور ان کے بیوی بچوں کی صحت اور تعلیم کا خیال رکھا جائے، انھیں معاشی الجھنوں سے نجات دلائی جائے۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے صنعتی علاقوں میں لیبر ویلفیئر سنٹر قائم کیے ان میں لائبریری بھی ہے اور صحت مند تفریح کا سامان بھی۔ موجودہ حکومت ان مرکزوں کو زیادہ فعال بنا رہی ہے۔ جہاں تک معاشی الجھنوں سے نجات دلانے کا سوال ہے اس کا علاج محض قرضہ یا گرانٹ کی فراہمی نہیں ہے۔ اگر پیداوار کو محنت سے مربوط کر دیا جائے تو مزدور کو معاشی الجھنوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے اگر مزدور یہ سمجھنے لگیں کہ کارخانہ میں جتنی زیادہ پیداوار ہوگی اس کا فائدہ صرف مل مالک کو نہیں بلکہ انھیں بھی حاصل ہوگا تو وہ تندہی سے کام کریں گے، پیداوار بڑھانے کے نئے نئے طریقے سوچیں گے، مشینوں پر احتیاط سے کام کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں پیداوار یقیناً بڑھے گی اور جب پیداوار بڑھے گی تو چیزیں سستی ہوں گی۔

★

پرسودم سنگھ سیٹھی
۵ - آفیسرس ہوسٹل
میرابائی مارگ - لکھنؤ

اترپردیش میں

اُردو کی ترقی کے لیے موثر اقدامات

ہندستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو کا درجہ دوسرا ہے اور اس زبان نے جنگ آزادی میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اردو شعرا نے جنگ آزادی کے زمانے میں اپنی نظموں کے ذریعہ لوگوں میں بیداری پیدا کی اور انھیں متحد ہو کر غیر ملکی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دی۔

قومی زندگی میں اردو کے اس کردار اور اس کی اہمیت کے پیش نظر حکومت اترپردیش نے اردو کی ہمہ گیر ترقی کے لیے متعدد اہم اور موثر اقدامات کیے ہیں۔ ان میں ممبران مجالس قانون ساز کو اردو میں حلف لینے کی سہولیت دینا، سرکاری دفتروں میں اردو کی درخواستیں قبول کرنا اردو ٹیچروں کی مستقلی، محکمہ تعلیم کے پاٹھیہ پستک ادھیکاری کے دفتر میں اردو جاننے والے ملازم کی تقرری، ریاست کے بارہ اضلاع کے کمشنر، ضلع مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتروں میں اردو جاننے والے ایک ایک ملازم اور ٹائپسٹ کی تقرری کے اقدامات قابل ذکر ہیں۔

حکومت اترپردیش کی جانب سے شائع ہونے والے گزٹ کو اردو میں بھی شایع کرنے کا جو بندوبست تھا اسے زیادہ فعال اور موثر بنایا گیا ہے تاکہ اردو گزٹ وقت پر شائع ہو سکے اور اردو عوام حکومت کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکیں۔

اترپردیش کے سرکاری افسران اور ملازمین کو اردو زبان سیکھنے کی ترغیب دینے کے لیے حکومت کی جانب سے ہائی اسکول کی سطح کا ایک امتحان ہر سال منعقد کیا جاتا ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے پر سرٹیفکیٹ کے ساتھ ہی ساتھ پہلی، دوسری اور تیسری ڈویژن حاصل کرنے والوں کو بالترتیب ۵۰۰ روپے ۳۰۰ روپے اور ایک سو روپے کا انعام بھی دیا جاتا ہے۔

اسی طرح حکومت نے ہر سال جونیر ہائی اسکول کی سطح کا ایک اہلیتی امتحان بھی رجسٹرار محکمہ جاتی امتحانات، اترپردیش الہ آباد کے توسط سے کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو کے اس امتحان میں جو امیدوار ۴۵ فیصد یا اس سے زیادہ نمبر حاصل کریںگے انھیں ایک سو روپئے کا نقد انعام اور سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ اس امتحان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے، اس میں شامل ہونے والے افسران اور ملازمین کو ان کی تعیناتی کے مقام سے امتحان کے سنٹر تک جانے اور وہاں سے واپس آنے کی مدت میں انہیں ڈیوٹی پر سمجھا جائیگا اور انھیں اس سلسلے میں سفر بھتہ اور

دو دن کا یومیہ بھتہ بھی دیا جائیگا۔

پرائمری اسکولوں کے ۳۸۲۳ اردو ٹیچروں اور جونیر ہائی اسکولوں کے ایک ہزار اردو ٹیچروں کو یکم فروری ۱۹۸۱ء سے مستقل کیے جانے کا اعلان وزیر اعلا پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وزیر اعلا نے متعلقہ افسران کو یہ احکامات بھی جاری کر دیے ہیں کہ بقیہ چھ ہزار اردو ٹیچروں کو بھی مستقل کرنے کے لیے بلا تاخیر کارروائی کی جائے۔

وزیر اعلا نے اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لیے قائم کی گئی یوپی اردو اکاڈمی کی سالانہ گرانٹ بھی دس لاکھ روپئے سے بڑھا کر ۱۸ لاکھ روپئے کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ریاست میں پرائمری سے ڈگری اور ریسرچ کی سطح تک اردو کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا اور طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے اکاڈمی وظائف دیتی ہے درجہ چھ سے لیکر ایم۔اے اور تحقیقی کام کرنے والے طلبا کو اردو مضمون میں حاصل شدہ نمبروں کی بنیاد پر اردو اکاڈمی ہر سال ۱۲ روپئے ماہانہ سے ۲۰۰ روپئے ماہانہ تک کا وظیفہ دیتی ہے سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں مجموعی طور پر ۷۰۲ طلبا کو ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زیادہ کے وظائف منظور کیے۔

اس کے علاوہ اردو اکاڈمی ریاست کے معمر اور بیمار ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد بھی دیتی ہے اس وقت ریاست کے پچیس ادیبوں کو ماہانہ مالی امداد دی جا رہی ہے۔ اور ۲۸ ادیبوں کی یک مشت مالی امداد کی شکل میں ۲۱۷۰۰ روپئے دیے گئے۔ سال رواں کے بجٹ میں اس کے لیے ۷۵۰۰۰ روپئے مختص کیے گئے ہیں۔

یوپی اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں میں ان مقامات کے نام جہاں سے وہ چلتی ہیں اور جہاں تک جائیں گی اردو میں درج کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیے گئے ہیں۔

سرکاری محکموں میں نام کی تختیوں پر افسروں کے نام ہندی کے ساتھ اردو میں بھی لکھنے کی شروعات ہو گئی ہے۔ اخباروں کو اشاعت کی غرض سے جاری کیے جانے والے پریس نوٹ اور فیچر وغیرہ اردو اخبارات کو اردو میں بھی فراہم کرنے کا بندوبست اگرچہ پہلے سے ہی ہے لیکن اب اردو کی زیادہ سے زیادہ ترویج و توسیع کی پالیسی کے تحت محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ اترپردیش میں قائم شدہ اردو یونٹ کو "اردو سیل" کی حیثیت سے اور زیادہ مستحکم اور فعال بنایا جارہا ہے تاکہ فولڈر، پوسٹر اور کتابچے اردو میں بھی باقاعدگی سے اور برابر شایع ہوں۔

ان تمام اقدامات کے ساتھ ساتھ وزیر اعلا اترپردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ ۱۹۸۱ء ختم ہونے سے قبل ہی اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیدیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ دسمبر تک انتظار کیا جائے یہ اقدام دسمبر سے پہلے بھی کیا جاسکتا ہے۔

وزیر اعلا کے اعلانات اور ان کی حکومت کی جانب سے کیے جانے والے یہ ٹھوس اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ حکومت اردو کے لیے حقیقتاً مخلص ہے اور اردو کو وہ مقام دینے کے لیے کوشاں بھی ہے، جس کی اردو مستحق ہے۔

*

صدر جمہوریہ شری نیلم سنجیوا ریڈی لکھنؤ میڈیکل کالج میں سنجے گاندھی پوسٹ گریجویٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا افتتاح کرتے ہوئے۔
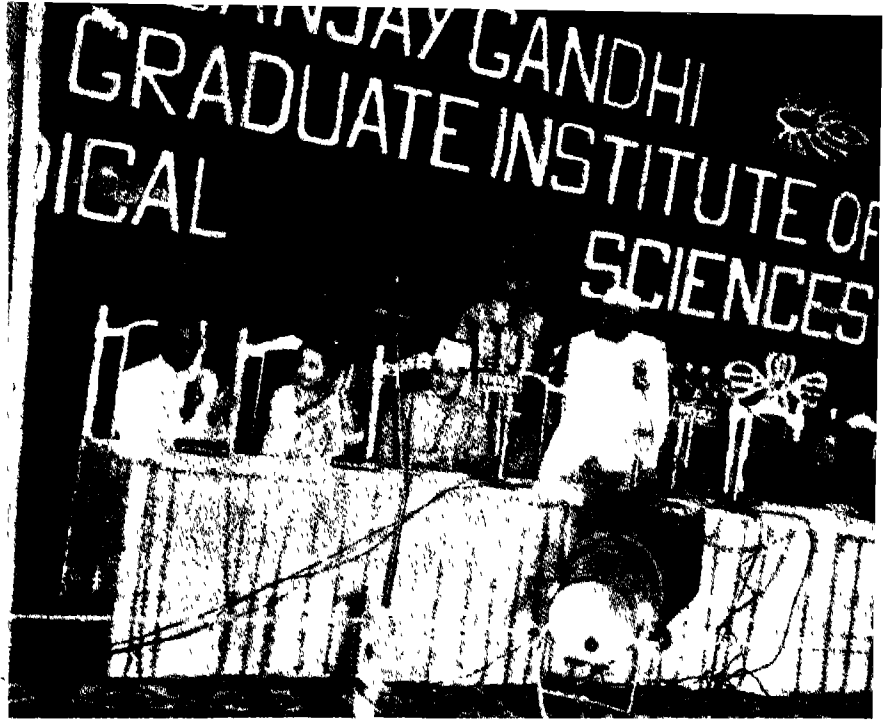
وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو اتر پردیش اسٹیٹ ٹیکسٹائل کارپوریشن کتائی مل بیجا (الہ آباد) کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۱ اپریل ۱۹۸۱ء کو بعدوہی سیاحت پراجکٹ
کا افتتاح کرتے ہوئے۔

وزیر اعلا اترپردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ۔ گردھارا روڈ
پر ککھیری ندی کے پل کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔

زمینی مواصلاتی مرکز، سکندر آباد۔ بلند شہر
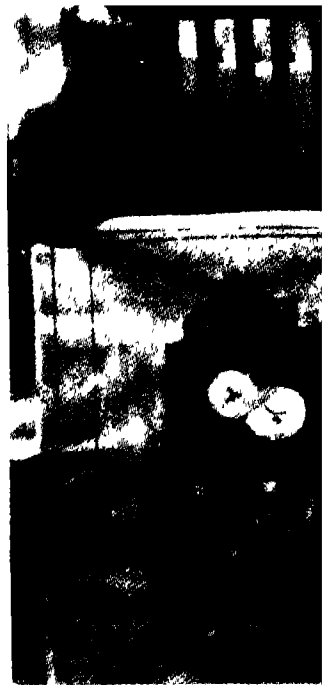
وزیر اعلا وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے سستے غلے کی دکان کا اچانک معائنہ کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

ڈیال بھانبور پل ، (ضلع رامپور)

پانی کی ٹنکی (سیتاپور)

سرجو امداد باہمی شکر مل، (لکھیم پور)
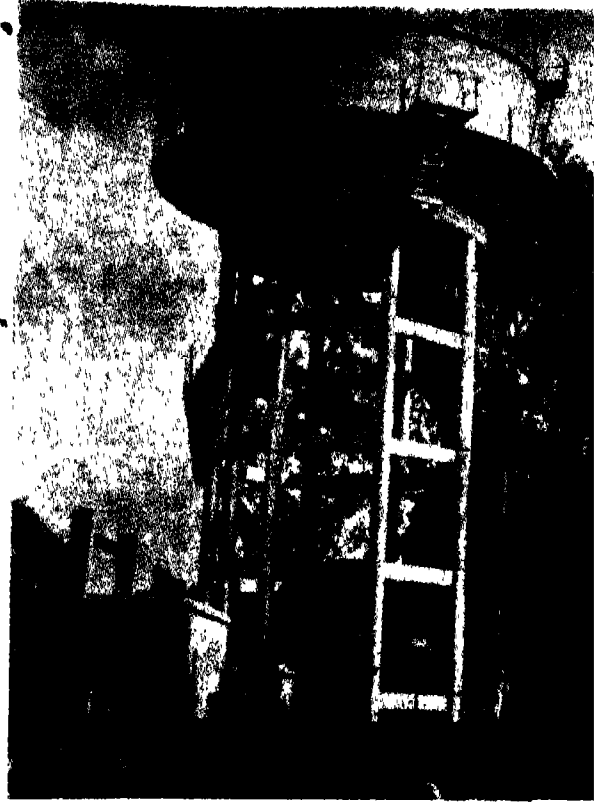
ربابیہ رشیدی
۱۵۔ تارین بھلی شاہ جہاں پور

مزدوروں کے لیے
فلاحی اقدامات

مسائل اپنی جگہ، مشکلات اپنی جگہ، وسائل کی کمی اپنی جگہ، لیکن عمل میں صداقت، جذبے میں قوت، قلب میں خلوص ہو تو مسئلے گرد بن کر اڑ جاتے ہیں، مشکلیں مشکلیں نہیں رہتی اور وسائل کی کمی عزم وحوصلہ کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس آئینے میں جب ہم موجودہ حکومت اتر پردیش کی ایک سال کی کاوشوں کا عکس دیکھتے ہیں تو ایک خوشگوار حیرت سے واسطہ پڑتا ہے۔ جس برق رفتاری سے مختصر مدت میں اس فعال و مدبرانہ قیادت نے صحرائے گرم و خشک میں امیدوں کے پھول کھلائے ہیں، پژمردہ چہروں پر شگفتگی کے اجالے بکھیرے ہیں وہ لائق تحسین بھی ہے اور قابلِ مبارکباد بھی۔ اسی شان وانکسار کے ساتھ شاہراہِ حیات میں یہ قافلہ چلتا رہا تو جو خواب یہاں کے رہنے والے برسوں سے دیکھتے چلے آرہے ہیں یعنی اطمینان و فراغت کا، شادمانی و خوشحالی کا، امن و سلامتی کے ماحول کا، ان کی تعبیر بہت جلد ہمارے سامنے ہوگی۔

کامیاب حکومت وہی کہلاتی ہے جس کے مشاقانہ ہاتھ نبضِ حالات پر اس طرح ہوں کہ پس پردہ بھی سر پردہ نظر آئے۔ پہلے حکماء مریض کا حال سننا توہین سمجھتے تھے۔ ادھر نبض پر ہاتھ رکھا ادھر نسخہ لکھوانا شروع کردیا۔ اگر بیچ میں مریض نے کچھ کہنا بھی چاہا تو اس کی اگلی پچھلی کیفیت بتاکر حیرت میں ڈال دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نوجوان وزیرِ اعلیٰ کی قیادت میں جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں حکومت نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے ان تمام مفسدانِ قوم کے دعووں کو یکسر غلط ثابت کر دیا ہے جو کہتے تھے کہ اتنی بڑی ریاست کے صدہا مسائل سے نپٹنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس موقع پر ہم تو یہی کہیں گے کہ ہمارے نئے وزیر اعلا ایسے آزمودہ کار نکلے کہ ہواؤں کا رخ ہی بدل دیا۔ برسوں کے پیچیدہ مسائل کو چشم زدن میں حل کرکے دکھادیا۔ اب محنت کش بھائیوں کے مسئلے کو لے لیجیے، حکومت نے اس طبقے کی اہمیت کے پیشِ نظر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ سماج میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے، اپنی خصوصی توجہ کا حامل سمجھا جس کے نتیجے میں ایک سال کے اندر بہت سی مفید اور دوررس اسکیمیں نافذ کی گئیں۔

اول قدم یہ اٹھایا گیا کہ آجرین اور مزدوروں کو ایک ہی زنجیر کی کڑی بنا دیا گیا۔ تاکہ آخر الذکر کی شرکت یقینی بن جائے۔ اس سلسلے میں ۱۴ نومبر ۱۹۸۰ء سے ایک اسکیم کا آغاز ہوگیا ہے جس کا نفاذ وہاں ہوگا جہاں دو سو یا اس سے زیادہ ملازمین کام کرتے ہوں

صفائی مزدوروں کے لیے ایک جامع اسکیم حکومت نے تیار کی۔ بلدیاتی اداروں اور نگر مہاپالیکاؤں میں گندگی کو جمع کرکے اسے کمپوسٹ بناکر فروخت کرکے حاصل شدہ

آمدنی کا ایک چوتھائی مزدوروں کی فلاح وبہبود میں صرف کیا جائے گا جس میں رہائشی اور دیگر سہولتیں شامل ہیں چھٹے پنج سالہ منصوبے میں بڑے پیمانے پر مکانوں کی تعمیر کا جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے اس میں کم از کم ۵۰ فیصدی صفائی مزدوروں کے لیے مختص کیے جانے کی کوشش جاری ہیں۔ صفائی مزدوروں کو مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں ملنے والی پیشگی رقم اور پراویڈنٹ فنڈ کی ادائیگی میں نرمی برتی جائے گی۔ ان کے علاقوں کی صفائی اور ماحول کو پاک وصاف بنانے میں اولیت دی جائے گی۔ مویشیوں کے لیے باڑوں کا انتظام ہوگا، مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا بہتر بندوبست کیا گیا ہے۔ وظیفوں کی سہولتیں حاصل کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں رکھی گئی۔ چھ برس تک کی عمر کے بچوں کے لیے حکومت نے لکھنؤ، الہ آباد کانپور، وارانسی اور آگرہ کی نگر مہا پالیکاؤں میں شیشو شالائیں بالواڑی قائم کی ہیں ہر ایک میں ۲۵ کو بچوں کی نگہداشت کا بندوبست ہوگا اور اس سلسلہ میں صفائی مزدوروں کی خواتین کو ہی ملازم رکھا جائے گا۔ تمام نگر مہا پالیکاؤں میں صفائی مزدوروں کو پنشن کی سہولت حاصل ہے جبکہ بلدیاتی اداروں میں سرکاری ملازمین کے برابر تنخواہ دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ صفائی مزدوروں کے لیے اجتماعی زندگی بیمہ اسکیم پر بھی عملدرآمد کو یقینی بنایا جائے گا۔ اگر کوئی صفائی مزدور بلدیاتی انتخاب میں نہ آسکے گا تو ایک نمائندہ ان کا نامزد کیا جائے گا ——— مندرجہ بالا اسکیموں کے ذریعہ صفائی مزدور بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔

محنت کش طبقہ میں ایک بڑا طبقہ کھیتوں پر کام کرنے والوں کا ہے۔ زرعی مزدوروں کو کم سے کم اجرت پر پچھلی بار ۱۹۷۵ء میں نظر ثانی کی گئی تھی۔ اس سال کم سے کم اجرتوں کی شرح مندرجہ ذیل رکھی گئی۔

منطقہ	بالغ مزدوروں کی اجرت کی کم سے کم شرحیں	
مشرقی منطقہ کے اضلاع	۱۶۹ روپئے ماہانہ یا	۶.۵۰ روپئے یومیہ
وسطی یا بندیل کھنڈ علاقہ کے اضلاع	۱۸۲ روپئے ماہانہ یا	۷ روپئے یومیہ
مغربی علاقہ کے اضلاع	۲۲۱ روپئے ماہانہ یا	۸.۵۰ روپئے یومیہ
پہاڑی علاقہ کے اضلاع	۲۰۸ روپئے ماہانہ یا	۸ روپئے یومیہ

ریاست کے جنگلوں میں تقریباً ۴ لاکھ مزدور کام کرتے ہیں ان کی فلاح کے لیے ۲۱ نکاتی سہولتیں فراہم کرنے کا اعلان ہوا ہے۔

جنگلات میں ٹھیکیداری نظام کو سات سال کے اندر اندر بتدریج ختم کر دیا جائے گا

آجرین ہر ماہ مسٹر رول، تیار کریں گے اور ہر ایک ماہ "پے سلپ" مہیا کی جائے گی۔ کسی بھی مزدور سے ایک دن میں ساڑھے آٹھ گھنٹے یا ہفتہ میں ۴۸ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔ ان مزدوروں کو ہفتہ میں ایک دن تنخواہ کے ساتھ چھٹی دینا ہوگی۔ فاضل کام لینے میں فاضل مزدوری ادا کرنا ہوگی۔ کسی مزدور کی واجب الادا رقم میں سے اس رقم کی کٹوتی نہیں ہوگی جو اسے ملازمت سے قبل دی گئی ہو ان کو ژالہ باری، بارش اور دھوپ وغیرہ سے بچانے کے لیے مناسب بندوبست کیا جائے گا۔ کوئی حادثہ ہونے کی صورت میں لیبر کمیشن کو مطلع کرنا ازبس ضروری ہوگا اور علاج کی مدت کے رٹینشن چارجز، کی ادائیگی آجرین کو کرنا ہوگی۔ جنگلات کے مزدوروں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور ان کے کنبوں کیلیے تفریحی سہولتوں کا بندوبست

مناسب طریقے سے کیا جائے گا۔ ایک کمیٹی کا بھی تقرر اُن کی
فلاح و بہبود نیز اتفاقی بنیاد پر تقرر شدہ مزدوروں کے مسائل
اور درپیش مشکلات کے سلسلے میں ہوگا۔

شکر صنعت جو اتر پردیش کی اہم ترین صنعت ہے
اس کے کارخانوں میں کام کرنے والے ہزاروں محنت کشوں کا
مسئلہ عرصے سے امید و بیم کی حالت میں تھا چنانچہ ۳۱ دسمبر
۱۹۸۰ء کو فیصلہ کیا گیا کہ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے ۳۲ روپئے
ماہانہ اضافہ کیا جائے۔ اسی طرح انجینرنگ صنعت بھی پردیش
میں خوب پھول پھل رہی ہے اس کے زمرے میں کام کرنے
والے محنت کشوں کے لیے ۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو منعقدہ سہ فریقی
اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ انجینرنگ کے جن صنعتی اداروں میں
۵۰ یا اس سے زیادہ ملازمین کام کرتے ہیں وہاں ۲۵ ر ۴۱ روپئے
ماہانہ اضافہ یکم ستمبر ۱۹۸۰ء سے منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان
کو یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء سے صنعتی مزدوروں کے مساوی مہنگائی
بھتہ بھی منظور کیا گیا۔

کانپور میں سوتی کپڑے کی صنعت کا ایک جال سا بچھا ہے۔
اس کے اداروں میں کام کرنے والوں کے لیے ۷ مئی ۱۹۸۱ء کو کانپور
میں سہ فریقی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس صنعت کے آجرین
و محنت کشوں کے نمائندوں کی دو فریقی کمیٹی قائم کی جائے جو
تنخواہ و دیگر مسائل کا جائزہ لے کر جلد سے جلد اپنی سفارشات
حکومت کو پیش کرے۔ اختلاف کی صورت میں وزیر صنعت کا
فیصلہ دونوں فریقوں کو ماننا ہوگا ایک اعلانیہ کے ذریعہ اس
کمیٹی کے ممبروں کے نام شائع ہو چکے ہیں۔

ریاست میں مزدوروں کی کم سے کم اُجرت کو یقینی
بنانے کے لیے کم سے کم مزدوری قانون ۱۹۴۸ء کے ذریعہ
حکومت نے ۴۹ صنعتوں کو شامل کیا ہے عام طور سے ۵ سال کی
مدت میں جو صنعت اس قانون کے تحت لائی جاتی ہے اس میں
کم سے کم اجرت پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ
سال سات صنعتوں میں مزدوروں کی کم سے کم اجرت

مقرر کی گئی، باقی ۲۹ کے معاملہ میں اولیت کی بنیاد پر
فیصلہ ہونے والا ہے۔ بیڑی بنانے، ریشمی ساڑیوں کی بُنائی
اور زری کا کام کرنے، کپڑا دھونے کا صابن بنانے، کھنڈ
ساری صنعت، کھیتی باڑی کا کام اور کمبل تیار کرنے
وغیرہ کی صنعتوں میں کام کرنے والوں کی کم سے کم
اجرت مقرر کی جا چکی ہے۔

روزناموں کی چھپائی کا کام کرنے والے ملازمین
اور پردیش کے روزناموں اور خبررساں ایجنسیوں کے کارکن
صحافیوں کے حالات و مسائل کا جائزہ لینے کے لیے دو الگ الگ
مطالعاتی ٹیموں کی تشکیل کی گئی ہے اسی طرح چوڑی کی
صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں اور ریاست کے اسٹار
ہوٹلوں کے ملازمین کے لیے ایک ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی گئی
ہے۔

مرکزی قانون کے تحت ریاست میں اپرنٹس شپ قانون
۱۹۶۱ء کے بموجب اپرنٹس شپ اسکیم چل رہی ہے۔ اس کا
مقصد صلاحیت کو چمکانا، مہارت کا پیدا کرنا اور تربیت یافتہ
افراد تیار کرنے کے علاوہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری پر روک
لگانا بھی ہے۔

ریاست میں اپریل ۱۹۸۱ء کے لگ بھگ اس
قانون کے تحت ۱۳۶ پیشوں میں بحیثیت مجموعی تقریباً ۱۵۰۰۰
اسامیاں تھیں۔ جن میں سے ۱۲۹۰۰ اسامیوں پر اپرنٹسوں
کو لگایا گیا جب کہ اس سے قبل ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو
۱۱۶۵۶۱ اسامیاں دستیاب تھیں جن میں سے ۹۴۲۸
اسامیوں پر اپرنٹس لگائے گئے۔

پابند مزدوروں کا رواج ختم ہو چکا ہے اور ان
کو اس ظلم سے نجات دلائی جا چکی ہے۔ ریاست کے دہرہ دون،
اترکاشی، ٹہری گڑھوال، الہ آباد، باندہ اور بعض دیگر
اضلاع میں اب تک ۸۵۴۲ پابند مزدوروں کو اس
لعنت سے نجات دلائی جا چکی ہے جس میں وہ ایک عرصہ

سے مبتلا تھے اور زندگی کو کوہِ گراں سمجھ کر اٹھا رہے تھے۔ اِن مزدوروں کی بحالی کے لیے مرکزی حکومت برابر امداد دیتی رہتی ہے۔ بحالی پروگرام کے تحت مزدوروں کو مالی امداد نہ دے کر انھیں دودھ دینے والے مویشی، زرعی آلات اور بکریوں کی شکل میں امداد دی جاتی ہے۔ ۱۹۸۰ء تک مجموعی طور پر ۱۳۵ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔

ملازمت سے ریٹائرڈ لوگوں کی پنشن کا مسئلہ انتہائی نازک ہے اِس روز افزوں مہنگائی نے واقعی کمر توڑ رکھی ہے۔ موجودہ حکومت نے یکم اپریل ۱۹۸۰ء سے پنشن کی موجودہ رقم بڑھا کر ۵۰ روپیے ماہانہ کر دی تھی بعد میں مہنگائی کے پیشِ نظر حکومت نے دوبارہ اضافہ کر کے یکم اپریل ۱۹۸۱ء سے ۶۰ روپیے ماہوار کر دیا ہے۔ جسٹس پالیکر کی سفارشات کی روشنی میں ۱۶ جنوری ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ میں ایک سہ فریقی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں اتفاقِ رائے سے اخباری اداروں کی سفارشات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جسٹس پالیکر کی سفارشات پر عمل درآمد کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے تاکہ فوری طور پر عملی قدم اٹھایا جائے۔

اس وقت ریاست میں ۸۱ روزگار دفاتر قائم ہیں جہاں بے روزگار افراد اپنا نام درج کراتے ہیں اور وہ دفاتر پوری ذمہ داری کے ساتھ ان لوگوں کی فراہمی روزگار میں معاونت کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان دفتروں میں ۷۹۱۹۴۷ افراد رجسٹرڈ تھے جن میں ۴۷۱۵۲ لوگ روزگار سے لگائے گئے سالِ آخر میں ان دفتروں میں درج بے روزگار افراد ۱۳۶۴۰۸۹ تعداد میں تھے۔ ۸۰-۸۱ء کے دوران جھانسی اور اعظم گڑھ میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور پسماندہ طبقوں کے بے روزگاروں کی تربیت دینے اور کاروبار کے معاملات میں اچھی طرح مہارت پیدا کرنے کے لیے دو نئے مرکز حکومت اتر پردیش نے قائم کرنے کی منظوری دی ہے اس قسم کے تین مرکز دہرہ دون آگرہ اور وارانسی میں پہلے سے ہی قائم ہیں۔ جہاں یہ سہولتیں حاصل ہیں اور لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ہماری ریاست اتر پردیش آبادی کے اعتبار سے ملک میں سب سے بڑی ریاست ہے اس لیے اس کے مسائل بھی بڑے ہیں۔ پرانے مسئلوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن جیسا کہ میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ حکومت مستعد اور عوام بیدار ہوں تو کوئی سبب نہیں کہ خدا کی مہربانیاں شاملِ حال نہ ہوں اور جب یہ صورت میسر آ جائے تو خار و خس کی حقیقت کیا بڑی بڑی چٹانیں پگھل جاتی ہیں۔

★

اقبال صدیقی
محمد علی لین۔ لکھنؤ

لاقانونیت کا خاتمہ

کسی بھی علاقہ کی ترقی کے لیے انسانی جان و مال کا تحفظ اور سماج کی خوشحالی کے لیے سکون و اطمینان سے کام کرنے کے مواقع حاصل ہونا ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں امن کو برقرار رکھنے، سماج دشمن عناصر پر قابو پانے اور آئینی ضمانتوں پر عمل درآمد کیے جانے کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ اس وقت پورے ملک کے جرائم کی صورتِ حال کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ چند مہینوں میں اترپردیش میں جرائم کی صورت حال میں نہ صرف کافی سدھار ہوا ہے بلکہ وسائل کی کمی کے باوجود لاقانونیت کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے کے سلسلے میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔

ہماری ریاست اترپردیش میں ہر دس ہزار کی آبادی پر قابل دست اندازی پولیس جرائم کا تناسب دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے جب کہ موجودہ پولیس ملازمین کی تعداد کا تناسب ہر دس ہزار پر گیارہ کا ہے۔ یہ تناسب پنجاب میں ۲۰، گجرات میں ۱۹ اور کئی دوسری ریاستوں میں اترپردیش سے کہیں زیادہ ہے۔

حکومت اترپردیش کے سربراہ مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور وزیر مملکت برائے داخلہ مسٹر راجندر ترپاٹھی نے روزِ اول سے ہی لاقانونیت کے خاتمہ اور امن عامہ کی بحالی کی جانب مثبت قدم اٹھائے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں جرائم کی رفتار میں کمی ہوئی ہے مثلاً ۱۶ جون سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۰ء تک قابل دست اندازی پولیس جرائم کی تعداد تقریباً گیارہ لاکھ ۲۵ ہزار تھی جبکہ ۱۹۷۹ء میں اس مدت کے دوران یعنی ۱۶ جون سے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۹ء تک ایسے جرائم کی تعداد گیارہ لاکھ ۸۰ ہزار تھی۔ اس طرح ۱۹۸۰ء میں موجودہ نظم و نسق نے عملی طور پر جرائم میں ۴۳ ہزار کمی کا رکارڈ قائم کیا ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۱ء میں ۱۵ اپریل تک ۵۵ ہزار ۴۵ جرائم کا ارتکاب ہوا جبکہ گذشتہ سال اس مدت میں انکی تعداد ۵۸ ہزار ایک سو ۵۸ تھی۔ ڈکیتی، لوٹ، رہزنی، فساد اور نقب زنی جیسے جرائم میں بھی کمی واقع ہوئی ہے موجودہ وزیر اعلا نے لاقانونیت کے خاتمہ اور جرائم کے انسداد کے لیے ایک اڈیشنل انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدہ کا بھی اضافہ کیا ہے۔

ہریجنوں پر بڑے طبقے کے مظالم سے پولیس کی چشم پوشی کا رویہ ختم کیے جانے اور ہریجنوں کی جانب سے ایسے عناصر کے خلاف رپورٹ لکھائے جانے کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے مؤثر قدم اٹھائے جس کے نتیجے میں ہریجنوں کے خلاف ہونے والے جرائم کا تناسب ۱۸ اور ۲ فیصد ہے جبکہ ان کی آبادی کل آبادی کی تقریباً ۲۱ فیصد ہے۔

عوامی جان و مال کے تحفظ کے سلسلہ میں حکومت کی زیادہ تر توجہ انسداد ڈکیتی پر رہی ہے چنانچہ گذشتہ سال اور اس سال کئی مقامات پر پولیس نے ڈاکوؤں کا محاصرہ کر کے مقابلہ کیا اور متعدد بدنام زمانہ ڈاکوؤں کے گروہوں کا قلع قمع کیا۔ اس سلسلے میں اترپردیش کی قربی

ریاستوں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی حکومت اترپردیش بڑی حد تک
کامیاب رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں اترپردیش کی سرحد پار کر کے
دوسرے صوبے میں ڈاکوؤں کے پناہ لینے کی حکمت عملی ناکام ہوتی
نظر آرہی ہے۔ ڈاکوؤں سے نپٹنے کے لیے پولیس کمپنیوں کو جدید
اسلحہ سے لیس کر دیا گیا ہے انھیں ہیلی کاپٹر بھی فراہم کر دیا گیا
ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ پولیس کی تین بٹالینوں پر مشتمل
ایک خصوصی دستہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ پی۔ اے۔ سی کی دو
درجن سے زیادہ کمپنیاں انسداد ڈکیتی مہم میں حصہ لے رہی ہیں
اس حکمت عملی کے نتیجہ میں جرائم پیشہ گروہ سراسیمہ سے
نظر آتے ہیں اور پولیس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے
ہوتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ۳ ہزار ۶ ۳۸ موقعوں پر پولیس سے مسلح ڈاکوؤں
کے تصادم میں ۳۲ ۹ ڈاکوؤں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا
اور ایک ہزار ۴ سو ۲۹ ڈاکو پکڑے گئے ان ڈاکوؤں کے قبضے
سے سات ہزار ۷۶۲ آتشیں اسلحہ برآمد کیے گئے۔ سال رواں
میں ۱۵ اپریل تک ۱۸۱۱ مڈبھیڑوں میں ۴۴۰ ڈاکوؤں کا صفایا ہو
گیا۔ اور ۳۴۵۶ ڈاکو گرفتار کیے گئے جن کے قبضے سے ۱۲۷۵ اسلحہ
برآمد ہوئے بدنام زمانہ ڈاکوؤں میں مستقیم۔ دیارام، رامان
جگ راگ وغیرہ کے گروہوں کا صفایا کیا گیا۔ جرائم پیشہ عناصر
ور ڈاکوؤں سے مورچہ لینے میں گذشتہ سال ۲۹ پولیس والوں
نے اپنی زندگی کی قربانی دی جبکہ اس سال ۳۱ مارچ تک ۲۴ پولیس
کے نوجوانوں نے جن میں انسپکٹر مول چند بھی شامل ہیں ڈاکو
ؤں اور دوسرے گروہوں سے تصادم میں اپنی جانیں قربان کیں

فرقہ وارانہ فسادات گذشتہ اگست ۱۹۸۰ء میں ریاست
کے چند اضلاع میں نئے انداز میں۔۔۔ رونما ہوئے ان تشدد کے
واقعات نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس اچانک لاقانونیت کی لہر کو ختم
کرنے کے لیے پولیس اور مسلح پولیس نے جس چوکسی کا ثبوت دیا
اور جلد اس پر قابو پالیا اس کے سبھی لوگ معترف ہیں اس کے
ساتھ ہی نظم و نسق نے بعض اضلاع میں ان شرپسند عناصر کے
منصوبوں کو بھی ناکام بنا دیا جس کے تحت وہ ان شہروں
میں فرقہ وارانہ فسادات کرانا چاہتے تھے۔ لکھنؤ میں بھی ایک ایسی
ہی سازش کو پولیس ناکام بنانے میں کامیاب ہوئی ان فسادات
پر قابو پانے کے لیے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی قیادت
میں بٹالینوں کی تشکیل کی گئی۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ اس سلسلہ میں
جو احتیاطی اور انسدادی اقدامات کیے گئے ان میں فسادات
کے انسداد کے لیے ایک خفیہ سیل کا قیام بھی ہے۔ ان علاقوں کے
ساتھ ہی ساتھ دوسرے علاقوں میں بھی پولیس کو وائرلیس کی
سہولت فراہم کی گئی۔

اس کے علاوہ محلہ محلہ اور گاؤں گاؤں عوامی کمیٹیوں کی تشکیل
کی گئی۔ ۱۹۸۰ء میں ۱۸۳ موقعوں پر ان کمیٹیوں کے ممبران نے ڈکیتوں کا مقابلہ کرنے
کے ساتھ ہی ساتھ ۱۲۵ ڈاکوؤں کو جان سے مار دیا اور ۶۸ کو زندہ گرفتار
کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

غیر قانونی اسلحہ جات بھی عوامی زندگی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں
ان کی کھوج اور برآمدگی کا مسئلہ بھی نظم و نسق نے اپنی حکمت
عملی سے حل کیا اور ایک مہم کے ذریعہ پوری ریاست میں ۲۱ ہزار
۵۲۵ غیر قانونی اسلحہ برآمد کیے۔ چلتی ٹرینوں اور اسٹیشنوں پر
ہونے والے جرائم میں بھی کافی کمی ہوئی۔

پولیس کی ۸۱-۱۹۸۰ء کی کارکردگی اور عوامی خدمت
کے جذبہ کو دیکھتے ہوئے پولیس کی از سر نو تنظیم کے ساتھ نئی
اسامیوں کا قیام۔۔۔۔۔ عمل میں آیا۔ چنانچہ ایک ڈپٹی انسپکٹر
جنرل پولیس (جرائم) کا عہدہ قائم کیا گیا جس کے ماتحت ۱۹ انسپکٹر
۴۴۵ سب انسپکٹروں ۳۸۳ ہیڈ کانسٹبلوں اور ۳ ہزار ۱۷۴
کانسٹبلوں کی تقرری کا بندوبست کیا گیا، ریلوے پولیس کے عملہ میں
۱۵۵ سب انسپکٹروں ۱۶۶ ہیڈ کانسٹبلوں اور ۱۳۳۶ سپاہیوں کے
اضافہ کے ساتھ ساتھ ۱۳۸ نئے تھانوں اور ۴۳ نئی چوکیوں کا قیام
عمل میں آیا پولیس کی نقل و حرکت میں تیزی لانے کے لیے موٹر وہیل
جیپوں اور وائرلیس سیٹوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اترپردیش
کے صدر مقام کا ۲۱ علاقوں سے ٹیلی پرنٹر سروس کے ذریعہ رابطہ

قائم کیا گیا تاکہ مجرموں کی بروقت گرفتاری کے ساتھ ساتھ ان کے طریقہ کار پر نظر رکھی جا سکے۔

حکومت نے جہاں ایک طرف پولیس فورس کو سہولتیں فراہم کر کے ان میں دیانت داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے کا جذبہ پیدا کیا وہیں دوسری طرف بدعنوان پولیس والوں کے خلاف اپنی کارروائی بھی مؤثر طور پر شروع کی چنانچہ ۱۹۸۰ میں ۴۹ ملازمین کے خلاف مقدمات چلا کر انھیں عدالتوں سے سزائیں دلانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ محکمہ جاتی کارروائی کے نتیجہ میں ۶۱ ملازمین کی تنزلی کی گئی ہے۔ ایک ہزار ۲۷ ملازمین معطل کیے گیے، ۵۴ ملازمین کی ترقی روکی گئی اور ۴،۶۵ ملازمین کے خلاف دوسری تادیبی کارروائی کی گئی پولیس فورس کے سبھی ملازمین پر واضح کر دیا گیا کہ حکومت جہاں ایک طرف بہتر کام اور فرض شناسی کی قدر کرے گی وہیں دوسری طرف فرائض کی انجام دہی میں غفلت اور بدعنوانی کو برداشت نہیں کرے گی۔

اتر پردیش کی موجودہ حکومت نے ریاستی پولس فورس کو مزید فعال بنانے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان میں اس سال ۶۵ نئے تھانوں اور ۱۶ نئی چوکیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ ۱۶۹ موٹر گاڑیوں اور ۲۴۷ ٹیلی فونوں کی فراہمی بھی شامل ہے۔

اس صورت حال کے ایک سرسری جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اتر پردیش میں عوامی جان و مال کے تحفظ کا جو نیا شعور بیدار ہوا ہے۔ اس سے امن و سکون کا نیا ماحول بنے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت نے جو مثبت طرز عمل اختیار کیا ہے وہ پولیس فورس اور عوام کے درمیان ایک ایسے پل کا کام انجام دے گا جس پر زندگی کا سفر بلا خوف و خطر طے کیا جا سکے۔

★

اپنی بات — (صفحہ ۲ کا بقیہ)

موجودہ ریاستی حکومت سماج کے کمزور طبقوں، ہریجنوں اور آدی واسیوں کی فلاح و ترقی کے لیے بھی خاص طور سے کوشاں رہی ہے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد ریاستی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ جن لوگوں کو کاشت کے لیے زمین الاٹ کی گئی تھی اور انھیں اس پر قبضہ نہیں مل سکا تھا، انھیں قبضہ دلانے کی کارروائی شروع کی گئی۔ یہ کام ایک مقررہ مدتی پروگرام کے تحت شروع کیا گیا۔ ہر گاؤں کو پینے کا پانی اور بجلی فراہم کرنا بجائے خود ایک بڑا کام ہے، جسے حکومت مرحلوں میں مکمل کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ بجلی کی فراہمی ایک خاموش انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے، جو طرز معاشرت بدل دیتی ہے۔

اسی طرح شجرکاری اور جنگلات کا کام بھی بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔ یہ پالیسی وضع کر دی گئی ہے کہ جنگلات کی کٹائی کے کام سے ٹھیکہ داروں کو علاحدہ کر دیا جائے۔ (ٹھیکہ داری نظام کو تعمیراتی کاموں سے بھی خارج کیا جا رہا ہے) ٹھیکہ داری نظام کا خاتمہ، شجرکاری اور جنگلات کا تحفظ ایسے اقدامات ہیں جو ریاست کا نقشہ ہی بدل سکتے ہیں۔

موجودہ حکومت نے ناخواندگی کی لعنت دور کرنے، تعلیم کی توسیع اور اس میں معیاری سدھار کے لیے شروع ہی سے کوششیں کی ہیں۔ تقریباً ۴ لاکھ بالغ افراد کی تعلیم کے لیے مرکز قائم کیے گئے۔ ان بچوں کے لیے جو کسی بھی وجہ سے تعلیم [illegible] چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے، غیر رسمی تعلیم کے ۲۰۰۰ جز وقتی مرکز بھی قائم کیے گئے۔ طلبا کو سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے پانچ کروڑ روپیے [illegible] فلاحی فنڈ قائم کیا گیا۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتحانات کا معیار بلند کرنے کے لیے ریگولر اور پرائیویٹ طلبا کے امتحانات الگ الگ کر دیے گئے۔ ان اقدامات کا ہی نتیجہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں اب پہلے جیسی بدامنی، بدنظمی اور انتشار نظر نہیں آتا۔ تعلیمی سال بھی اب باضابطہ ہونے جا رہے ہیں۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے وقت وزیر اعلیٰ نے گذشتہ سال جو [illegible] انھیں یا تو پورا کر دیا گیا ہے یا پورا کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ترقی اور خوشحالی کی وہ منزل جہاں حکومت ریاست کو لے جانا چاہتی ہے اب زیادہ دور نظر نہیں آتی۔

——— ایڈیٹر

اطہر نبی
گرینڈ ہاؤس۔ بادشاہ نگر
سانیال روڈ۔ لکھنؤ

پینے کا پانی: اب کوئی مسئلہ نہیں

اتر پردیش ہندستان کی سب سے وسیع و عریض ریاست ہے۔ حالیہ مردم شماری کے بعد ایک اندازے کے مطابق اتر پردیش کی آبادی دس کروڑ سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔

اتنی کثیر آبادی اور اتنے طویل و عریض رقبے والی اس ریاست کے مسائل بھی گوناں گوں ہیں، جن میں ضروری اشیا کی فراہمی، رہائش کے مسائل اور انتظامی امور کے علاوہ سب سے اہم مسئلہ پینے کے پانی کی فراہمی کا ہے۔ جس کے بغیر کاروبار حیات درہم برہم ہو سکتا ہے۔

ریاستی حکومت نے ان تھک محنت اور لگن کے ساتھ ریاست کے تمام مسائل کو تیز رفتاری کے ساتھ حل کرنے کے سلسلے میں ایک مثال قائم کر دی ہے منجملہ دیگر مسائل کے گذشتہ ایک سال کی قلیل مدت میں پینے کے پانی کی فراہمی کا اہم اور مشکل مسئلہ حل کرنے کی جو کامیاب کوشش کی گئی ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ ریاست کو درپیش دیگر مسائل بھی بہت جلد حل کر دیے جائیں گے۔

پانی حیات انسانی کی اہم ترین ضرورت ہے ریاستی سرکار نے اس ضرورت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس مسئلے کو تقریباً حل کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے سرکار کو مرکز کے علاوہ بین الاقوامی اداروں سے بھی تعاون حاصل کرنا پڑا ہے کیونکہ محدود وسائل کے سبب حکومت اتر پردیش اس عظیم منصوبے پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی تھی جو اس کا نصب العین تھا۔

آج ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اتر پردیش جل نگم کے ذریعہ تمام ریاست میں پائپ لائن کا ایک جال بچھا دیا گیا ہے اور آب رسانی کے کام کو اولیت دی جا رہی ہے

یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ ہندستان کی آبادی کی اکثریت دیہاتوں اور گاؤں میں بستی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل ہندستان وہی ہے جس کو ہم گاؤں یا دیہات کہتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ہندستان کی آبادی کا وہ حصہ جو پورے ملک کی ضروریات کو پورا کرتا ہے پانی جیسی اہم ضرورت کے مسئلے سے دوچار تھا۔

دیہی آبادی کی اس سب سے اہم ضرورت کے پیش نظر ایسی اسکیمیں وضع کی گئیں جن سے دیہاتوں اور گاؤں کی اس ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔ ان منصوبوں میں بھی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ وہ علاقے جو قلت زدہ اور پانی سے یکسر محروم ہیں ان منصوبوں سے خاص طور پر فیضیاب ہو سکیں۔

ان منصوبوں کے تحت گذشتہ ایک ہی سال میں ریاست کے ایک ہزار چھ سو پچاس مواضعات میں صاف و شفاف پینے کا پانی دستیاب ہو گیا ہے جب کہ ان میں ایک ہزار ایک سو گاؤں تو ایسے تھے جو پینے کے پانی کی سہولت سے قطعی طور پر محروم تھے اور ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان کا یہ مسئلہ اتنی جلد اور اتنی خوبی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔

اسی طرح گذشتہ مارچ ۸۱ ۱۹ء کو ختم ہونے والے مالیاتی

سال میں گیارہ ہزار سات سو چھ مواضعات کو پینے کا پانی فراہم کر دیا گیا۔

یہی نہیں بلکہ موجودہ مالیاتی سال کے لیے جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق سال کے آخر تک دو ہزار سات سو گاؤں ایسے ہو جائیں گے جہاں پینے کے پانی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اتر پردیش سرکار کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آزادی سے قبل تک پینے کے پانی کا تمام تر انحصار صرف کنووں، ڈگیوں اور ندیوں وغیرہ پر تھا۔ ۱۹۷۲ء میں اس جانب خصوصی توجہ دی گئی اور جب جائزہ لیا گیا تو جو اعداد و شمار سامنے آئے وہ بڑے ہی پریشان کن تھے یعنی ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو اکسٹھ گاؤں میں سے پینتیس ہزار پانچ سو چھ گاؤں ایسے تھے جن میں پینے کے پانی کی شدید قلت تھی۔

قلت زدہ علاقوں میں واقع مواضعات میں پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے سرکار نے امدادی رقومات بھی دی ہیں۔ ویسے یہ امداد فی الحال صرف بیس ضلعوں تک محدود ہے لیکن دیگر اضلاع میں واقع ان مواضعات کو یہ امداد بہم پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو پانی کی قلت سے متاثر ہیں۔

اتر پردیش سرکار کوشاں ہے کہ پینے کے پانی کا کوئی مسئلہ نہ رہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈچ سرکار کے اشتراک سے الہ آباد، وارانسی اور رائے بریلی اضلاع میں بھی ایک ایسی اسکیم وضع کی گئی ہے جس کے تحت ان اضلاع کے دیہی علاقوں میں پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایک ایسا منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ جس کی تکمیل کے بعد آگرہ، اٹاوہ، اور متھرا اضلاع میں فلورائڈ ملے ہوئے پانی اور پینے کے کھاری پانی والے ہر گاؤں کو صاف پانی مہیا ہو جائے گا۔

سال ۱۹۷۹ء بڑا آزمائشی سال تھا، جس میں تمام ریاست زبردست قحط کی زد میں آگئی تھی اس قدرتی آفت سے مقابلہ کرنے کی غرض سے ریاستی سرکار نے مرکز کی مدد سے خاص قسم کی ایسی ۲۲ مشینیں خریدیں جن کو "رِگ" کہتے ہیں اور جو چٹانی علاقوں میں بورنگ کرنے کے کام آتی ہیں۔ چٹانوں کی مزاج شناس ان مشینوں کے ذریعہ بندیلکھنڈ کے چٹانی علاقوں میں نیز مرزاپور، الہ آباد اور وارانسی میں واقع ۴۱۹ گاؤوں میں ۶۳۶ جگہوں پر بورنگ کی گئی اور خاص قسم کے ہینڈ پمپ لگائے گئے، جس کے سبب سے خشک سالی سے متاثرہ ۱۴۳ مواضعات میں پائپ لائن بچھ گئی اور وہاں پینے کے پانی کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔

کچھ گاؤں ریاست میں ایسے بھی ہیں جو قحط کی صورت حال سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں ان مواضعات میں اس طرح کی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی پورا بندوبست کر لیا گیا ہے اور ایسی تیاریاں کر لی گئی ہیں کہ قحط کے آثار نمایاں ہوتے ہی ان مواضعات تک ڈھلائی کر کے پانی پہنچایا جا سکے اس کام کے لیے ۱۲۹ ٹینکر، دس ہزار ڈرم، ۱۰۹ اسٹیل ٹینک اور ۵۰۷ کینوس بیگ مہیا کر لیے گئے ہیں۔

چٹانی علاقوں اور سوکھے سے جلد متاثر ہو جانے والے علاقوں میں ہینڈ پمپ لگانے کا کام اس وقت بھی جاری ہے جس کے نتیجے میں بہت جلد ایسے تمام علاقوں میں صاف اور میٹھا پانی دستیاب ہو جائے گا۔

اس کو فطرت کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ اگر گذشتہ سے پیوستہ سال قحط کی آفت نے پریشان کیا تو سال گذشتہ بارش اور سیلاب نے قیامت ڈھا دی بارش اور سیلاب نے جہاں عام زندگی کو درہم برہم کیا۔ وہیں پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں پر بھی پانی پھیر دیا اس سے ان پراجکٹوں کو بھی نقصان پہنچا جو زیر تکمیل یا تکمیل کے قریب تھے۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے اور کام میں تیزی لانے کے لیے مرکزی سرکار نے فوراً ہی تین کروڑ روپیہ فراہم کیا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاستی سرکار نے ریاست کے ۶۳۳ شہروں میں سے ۳۹۹ شہروں میں سال ۱۹۸۰ء میں ہی پینے کے پانی کی سہولتیں فراہم کر دی ہیں۔ اس سے قبل کے سال میں

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

محمد مسعود
د اٹروکس روڈ، عیش باغ، لکھنؤ

اتر پردیش میں بڑے پیمانے پر
صنعت کاری

صنعت کاری ترقی کی علامت ہے، لیکن ادب میں خاص طور سے نئے ادب میں صنعت کاری اور صنعتی ترقیوں کو منفی انداز میں ہی پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انڈسٹریلائزیشن ـــــ نے زندگی کو بھی صنعتی مشینی اور تجارتی بنا دیا ہے۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ صنعتیں آج کی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہیں۔ صنعت کاری کے بغیر کوئی ملک خود کفیل نہیں ہو سکتا اور صنعتی ترقی کے بغیر آج کوئی ملک ترقی اور خوشحالی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات بڑے اطمینان اور خوشی کی ہے کہ اتر پردیش کی موجودہ حکومت کی نظر اس نکتہ پر ہے۔ اسی لیے اتر پردیش میں بڑے پیمانے پر صنعت کاری کو فروغ دینے کے لیے ایک متوازن صنعتی پالیسی وضع کی گئی ہے۔ جس کے تحت بڑی اور درمیانی درجہ کی صنعتوں کے ساتھ چھوٹی صنعتوں مثلاً ہینڈلوم، دست کاری اور دیہی صنعتوں کے فروغ پر بھی خاص زور دیا جا رہا ہے۔ حکومت نے زیادہ سے زیادہ صنعتی واحدوں کے قیام کے لیے جو مربوط اقدامات کیے ہیں ان سے روزگار بخش اسکیموں کے ذریعہ یقینی طور پر پیداوار بھی بڑھے گی اور افرادی قوت کا زیادہ استعمال بھی ہوگا۔ حکومت کی اس نئی پالیسی کے تحت سال ۸۲-۱۹۸۱ کو صنعتی ترقی کے سال کی حیثیت سے منایا جائے گا اس کے علاوہ تیز رفتار صنعت کاری اور صنعت کاروں کے لیے "ون ونڈو" کا تصور بھی اپنایا گیا ہے۔

نئی صنعتی پالیسی کو عملی شکل دینے اور صنعت کاری کے خواہش مندوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انھیں ایک ہی مقام پر ضروری امداد اور سہولتیں فراہم کرنے کے مقصد سے حکومت نے "صنعت دوست سیل" قائم کیا ہے۔ جس کا دفتر جواہر بھون لکھنؤ میں ہے۔ اس سیل کی جانب سے صنعتیں قائم کرنے والوں کی مختلف محکموں کی بھاگ دوڑ ختم ہو گئی ہے اب ریاست کے محکمۂ صنعت کی جانب سے منظور کی گئی نئی صنعتوں کو ۲۵ ہارس پاور تک ضلع کی سطح پر اور ایک سو ہارس پاور تک سپرنٹنڈنگ انجینیر کی سطح پر ۱۴ دن کے اندر بجلی کی منظوری مل جائے گی۔

صنعت دوست سیل انتظامیہ کی سطح پر ایک اعلا اختیاری کمیٹی ہے۔ جس میں پک اپ بطور سکریٹریٹ کام کرتی ہے نیز بڑے اور درمیانی درجوں کے پراجکٹوں کی نگرانی اور ان کی ترقی کا جائزہ لیتی ہے۔ ٹکنو اکنامک سہولیات پر مشتمل سیکڑوں رپورٹیں صنعت دوست سیل کے پاس موجود ہیں اس کے علاوہ یہاں کوئی بھی رپورٹ صرف ۲ مہینے کی مدت میں تیار کی جا سکتی ہے اور تکنیکی امداد زمین، بجلی اور سرمایہ کاری کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ ادیوگ بندھو کے پاس ۲۵۰ سے زائد مجوزہ صنعتی پروگرام ہیں۔ جن کی تکمیل یو پی میں چھٹے پنج سالہ منصوبہ کے دوران

ہوتا ہے۔ ان میں فرٹلائزرز، غیر منظم بھاری کیمیکلز، بھاری منظم کیمیکلز لائم اسٹون معدنی اشیاء پر انحصار رکھنے والی صنعتیں، جراثیم کش دوائیوں پیٹرو کیمیکلز، ریشے، پلاسٹک، ابرک الکحل سے متعلق صنعتیں ہینڈلوم اور ایگرو سے متعلق یونٹس، کاغذ سازی، پرزوں دھاتوں، انجینئرنگ، بجلی الکٹرانکس، ٹیلی کمیونی کیشن، ٹکسٹائیل اور رنگائی سے متعلق صنعتیں اور متعدد دیگر صنعتی اسکیمیں شامل ہیں۔

حکومت اترپردیش نے سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۶ ہزار نئے چھوٹے اور بہت چھوٹے واحدے قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا تھا۔ لیکن سال کے دوران اس سے زیادہ یعنی ۷۹۵۳ واحدے قائم کیے گئے جس سے چھوٹے واحدوں کی مجموعی تعداد اب ۵۵۷۶۱ ہو گئی ہے۔ اسی طرح ۳۱۶۷۵ کاریگروں کے واحدے قائم کیے گئے اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار افراد کو روزگار مہیا کرنے کے مقررہ نشانے سے زیادہ یعنی ایک لاکھ ۴۲ ہزار افراد کو روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے چھوٹے چھوٹے واحدوں کی کا اوسط تخمینہ ۲۵ ہزار روپئے تک ہوتا ہے اسٹامپ ڈیوٹی کا خرچ اب محکمۂ صنعت برداشت کر رہا ہے۔

قومی روزگار پروگرام کے تحت امیدواروں کے انتخاب اور انھیں تربیت ... دینے میں ریاست نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ سال کے اختتام تک ۸۰ ترقیاتی مرکزوں کا انتخاب کرکے دیہی صنعت کاری کے پروگرام کی عمل آوری کی رفتار کو تیز تر کیا گیا ہے۔ ضلعوں میں صنعت کاری کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ضلع صنعتی مرکزوں کو اور زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ صنعت کاری کے خواہش مندوں کو ایک ہی مقام پر تمام سہولتیں حاصل ہو سکیں۔ صنعت قائم کرنے والوں کو صنعتوں کے رجسٹریشن پلاٹ اور شیڈ ۲۵ ہزار روپئے کا قرض، ۲۰ ہزار روپئے تک کیپٹل سبسیڈی، مارجن منی ۲۵ ہارس پاور تک بجلی اور اس کے علاوہ دیہی صنعتوں کو ۵۰ ہزار تک کے قرض کی سہولت اب ضلع کی سطح پر ہی فراہم کی جارہی ہے۔

کانپور کے الکٹرانکس ٹریننگ اینڈ ڈیولپمنٹ سنٹر کے کام کو اور پھیلایا گیا ہے جس سے ریاست میں چھوٹی صنعتوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اس تربیتی مرکز کے ذریعہ چھوٹی صنعتیں قائم کرنے والوں کے تربیتی کورس کا انتظام بھی کیا گیا ہے الہ آباد اور نوائیڈا میں بھی الکٹرانکس کارپوریشن کی جانب سے اس طرح کے تربیتی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے کارپوریشن کی جانب سے حکومت ہند کے قومی روزگار پروگرام کے تحت کانپور، نوائیڈا، صاحب آباد اور رائے بریلی میں الکٹرانکس مرکز قائم کیے گئے ہیں جہاں صنعت کاری کے خواہش مندوں کو تکنیکی تربیت اور مالی امداد کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی فراہم کی جارہی ہیں۔

اترپردیش ریاستی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی جانب سے پسماندہ علاقوں کے صنعت کاروں کے لیے پانچ مخصوص مقامات پر زمین کی شرح میں خصوصی رعایت دی گئی ہے اور زمین کی قیمت ادا کرنے کے لیے امداد بھی دی جارہی ہے اس طرح اترپردیش مالیاتی کارپوریشن کی جانب چھوٹی اور درمیانی درجہ کی صنعتوں کے لیے مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

۱۔ تیس لاکھ روپئے تک کے قرضے کے لیے برائے نام سود اور قرض کی آسان شرائط پر فراہمی

۲۔ درآمد کی جانے والی مشینوں کے لیے غیرملکی زرمبادلہ کی فراہمی

۳۔ دست کاری کے دیہی یونٹوں کے لیے مشترکہ قرضے۔

۴۔ ٹرانسپورٹ آپریٹروں کو قرض۔

۵۔ پہاڑی علاقوں کی صنعتوں کے لیے خاص طور پر کم کی گئی شرح سود پر قرضے۔

۶۔ سرکاری قواعد کے مطابق سرمایہ کاری میں امداد اور سود کی ادائیگی میں امداد۔

اترپردیش فائنینشیل کارپوریشن نے پسماندہ ضلعوں میں ۳۰۶۹ واحدوں کو ۲۸ر۶۳۱۱ لاکھ روپئے کے قرضے دیے۔ اسی طرح تکنیکی صنعت کاروں کو برائے نام سود اور آسان شرائط پر ۳۰ر۱۳۱۰ لاکھ روپئے کی امداد دی گئی اس

سال ۲۰ کروڑ روپئے کے قرضوں کی تقسیم کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

مرزاپور ضلع میں ۸۵ کروڑ روپئے کی لاگت سے قائم کیے گئے کجرہٹ چنار سمنٹ کارخانے میں کام شروع ہوگیا ہے۔

پرتاپ گڑھ میں ۱۷ کروڑ روپئے کی لاگت سے قائم کیے جانے والے ٹریکٹر کارخانے میں ہر سال ۵۰۰ ٹریکٹر تیار کیے جائیں گے اور چھٹے منصوبے کے آخر تک ۸ ہزار ٹریکٹر اور ۴ ہزار انجن ہر سال تیار ہونے لگیں گے۔

ریاست کی الکٹرانکس کارپوریشن کی جانب سے لکھنؤ میں ٹیلی ویژن سکایک اور کارخانے کے قیام سے اس کی صلاحیت ۲۰ ہزار ٹی۔ وی سیٹوں کی ہوگئی ہے۔ اپٹران ڈیجیٹل سسٹم لمیٹیڈ لکھنؤ میں مختلف قسم کے کمپیوٹر تیار کیے جارہے ہیں جن میں پلانٹ کنٹرول کرنے اور ایر لائنس کے کمپیوٹر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ایرلائنس کے لیے تیار کیے گئے اس اپٹران کمپیوٹر سے بمبئی اور دلی کے ایر انڈیا بکنگ آفس سے ریزرویشن حاصل کرنے کا کام شروع ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی جرمنی کے تعاون سے اور تقریباً ۱ کروڑ روپئے کی لاگت سے لکھنؤ میں ایک ٹول روم ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے۔

سال ۸۲-۱۹۸۱ کے دوران مرادآباد ضلع میں پیتل کی رولنگ مل اور پیتل نگری قائم کی جائے گی ایک سال کے دوران ریاست کے ہر بلاک میں چھوٹی صنعتوں اور دستکاری کے ۱۲ ہزار واحدے قائم کیے جائیں گے، جس کے نتیجے میں پوری ریاست میں صنعتی واحدوں کی مجموعی تعداد ۱۰ ہزار ہو جائے گی اور اس سے ۵۰ ہزار افراد کو روزگار مل سکے گا۔ موجودہ مالیاتی سال میں ڈیڑھ لاکھ افراد کو صنعتوں کے ذریعہ روزگار فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ اترپردیش میں صنعت کاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے اب اس ریاست کو بھی بغیر کسی پس و پیش کے اور فخر کے ساتھ ایک صنعتی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے۔

مصطفٰے فطرت
۴۲۹ حسن پوریہ کشمیری محلہ
لکھنؤ ۳

مشورے

بھائیو! ہم وطنو! سن لو دُکھے دل کی پکار
اپنی دیرینہ روایات سے کیوں ہو بیزار
اپنی تہذیب و ثقافت سے نہیں کیا تمہیں پیار
اپنے اسلاف کی محنت نہ کرو تم بیکار

باہمی میل محبت ہے وراثت اپنی
قابلِ رشک ہے عالم میں رفاقت اپنی

ہم ہیں سب ایک یہ دنیا کو دکھانا ہے ہمیں
اختلافات کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں
جذبۂ عشق ہر اک دل میں جگانا ہے ہمیں
اپنے اقدامِ عمل سے یہ بتانا ہے ہمیں

خلق و ایثار و مروّت کے پرستار ہیں ہم
دوستو! جنسِ محبت کے خریدار ہیں ہم

نفرت و بغض سے دامن کو بچانا سیکھو
سب کو تم راہِ محبت پہ چلانا سیکھو
اپنی تدبیر سے تقدیر بنانا سیکھو
قومی کاموں میں ذرا ہاتھ بٹانا سیکھو

اپنے آزاد وطن کے لیے کچھ کرنا ہے
دیش کا دامنِ امید تمہیں بھرنا ہے

متحد ہو کے رہو صرف گزارش ہے یہی
ہر بہی خواہ، وطن دوست کی خواہش ہے یہی
فرضِ تہذیب یہی، حسنِ نوازش ہے یہی
وصفِ انساں کا سزاوارِ ستائش ہے یہی

لازمی کام ہے تعمیرِ وطن اے فطرت
اس سے بڑھ کے نہیں دنیا میں کوئی بھی خدمت

ڈاکٹر سید مسعود حسین جعفری
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ
لکھنؤ

گنے کی فصل میں آبپاشی اور معدنی اجزا کی اہمیت

زرعی خوشحالی کا انحصار ملک کے آبی وسائل پر ہے۔ ملک کے شمالی منطقہ خصوصاً اترپردیش میں موسم کے صرف دو برسوں کا ہی جائزہ لیا جائے (۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء) تو پتہ چلتا ہے کہ سالِ ۱۹۷۹ء انتہائی خشک رہا اور سالِ ۱۹۸۰ء انتہائی سیلابی کیفیت میں گذرا۔ دونوں برسوں میں خریف کی دیگر فصلوں کا تو ذکر ہی کیا۔ گنے کی فصل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ عموماً شمالی منطقہ میں مانسون یا تو وقت پر نہیں آتے یا پھر بارش ناکافی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کسانوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نئی زرعی تکنیک کو اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔

ملک کے شمالی منطقہ خصوصاً اترپردیش میں گنے کی بوائی فروری سے مارچ تک ہوتی ہے جسے Spring Planting کہتے ہیں۔ اس علاقہ میں گنے کی فصل کا ابتدائی دور موسم گرما کے انتہائی شدید درجۂ حرارت میں گذرتا ہے۔ شمسی تمازت سے آبی ذخائر نہایت تیزی سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ فصل کو کم از کم ایک ماہ میں ایک بار آبپاشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالانکہ پانی کی یہ مقدار نہایت قلیل تصور کی جاتی ہے۔ عموماً مانسون سے قبل پانچ یا چھ بار آبپاشی فصل کو تناور رکھتی ہے۔ وقفہ سے آبیاری اور گڑائی کا عمل پودوں کی بالیدگی میں معاون ہوتا ہے۔

گنے کے ابتدائی اور درمیانی دور میں تقریباً ۵ فیصد نمی مٹی میں رہنا چاہیئے کیونکہ پودے کے کیمیائی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس نمی کا تعلق پودوں کے نسیجوں خصوصاً sheath کی نمی سے ہے۔ تناور فصل کے لئے ضروری ہے کہ نسیجوں کی نمی ۸۰ سے ۸۵ فیصد تک ابتدائی دور سے لیکر درمیانی دور تک قائم رہنا چاہیئے آخری دور میں جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو یہ نمی گھٹ کر ۷۲ فیصد رہ جاتی ہے۔ اس وقت شکر پتیوں سے بتدریج منتقل ہو کر تنے میں جمع ہو جاتی ہے اس دور میں عموماً آبپاشی کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اگر خشکی کی علامت پتیوں سے ظاہر ہو تو ایک بار آبپاشی کر دینا چاہیئے۔ جہاں آبی وسائل زیادہ ہیں فصل میں دس بار تک آبپاشی کی جاتی ہے۔ اترپردیش اور بہار میں ۱۵ سے ۲۰ دن کے وقفہ کے ساتھ ۵ سے ۶ بار تک آبپاشی کا رواج ہے۔ جنوبی منطقہ (کرناٹک۔ مہاراشٹر۔ آندھرا اور مدراس) میں آبی صرف زیادہ ہے۔ اس لئے وہاں تقریباً ۱۲ دن کے وقفہ سے ۲۰ سے ۲۵ بار تک سنچائی کی جاتی ہے۔ چونکہ شمالی ہند میں پانی کی کمی محسوس ہوتی ہے لہذا آبی کفایت کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ گنے کی دو قطاروں کے درمیانی فاصلہ کو گنے کی خشک پتیوں سے ڈھک دیا جائے اس عمل سے نہ صرف آبی کفایت ہوگی بلکہ گھاس پھوس (Weeds) کی خود روی بھی ختم ہو جائے گی۔ دوسرا کفایتی طریقہ یہ ہے کہ گنا بوتے وقت اسکی نالیوں کی ساخت انگریزی کے حرف وی (V) سے مشابہ رہیں۔ ابتدائی دور میں جب پودے چھوٹے رہتے ہیں ہلکی سنچائی زیادہ وقفہ سے کی جائے۔

گنے کی تدریجی نشو نما کے ساتھ ساتھ اس کے اجزار کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا فصل دور میں کیمیائی تجزیہ ضروری ہے۔ مٹی کے نسیجوں کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔

کہتے ہیں تقریباً ۱۲۰ دن درمیانی Formative stage دور Grand growth stage ۱۵۰ سے ۲۷۰ دن اور آخری دور جسے Maturity stage کہتے ہیں ۳۰۰ سے ۳۶۰ دن میں مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے گنے کی فصل پورے ایک سال میں تیار ہو جاتی ہے۔

ابتدائی اور درمیانی دور میں پودے کے معدنی اجزار خصوصاً نائٹروجن اور پوٹیشیم وافر مقدار میں ملنا چاہیئے شمالی منطقہ میں ستمبر تک فصل میں شعاعی ترکیب عمل مکمل ہو جاتا ہے اور آخری دور میں شکر پتیوں سے منتقل ہو کر تنے میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت گنے کے رس میں شیرینی بڑھ جاتی ہے۔

پودے کے کیمیائی تجزیہ سے یہ انکشاف ہوا کہ فصل کے ہر دور میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ معدنی اور آبی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل اعداد و شمار تحقیقی مشاہدہ سے دستیاب ہوئے ہیں۔

گنے کے پودے میں مختلف دور میں نسیجوں کی نمی اور ترکیبی اجزار

مختلف دور	پودے کی عمر دِنوں میں	نسیجوں کی نمی (فیصد) (sheath)	ترکیبی اجزار (فیصد) نائٹروجن (Leaf)	فاسفورس (sheath)	پوٹیشیم (sheath)
۱. ابتدائی دور	۶۰	۸۵ر۸۹	۲ر۱۳	۰ر۱۰۸	۱ر۸۷
	۹۰	۸۵ر۳۷	۱ر۸۸	۰ر۱۰۵	۱ر۸۸
	۱۲۰	۸۵ر۴۲	۱ر۸۶	۰ر۱۰۰	۱ر۸۵
۲. درمیانی دور	۱۵۰	۸۶ر۳۴	۲ر۰۰	۰ر۰۹۷	۲ر۰۵
	۱۸۰	۸۵ر۰۴	۱ر۸۷	۰ر۱۰۰	۱ر۸۴
	۲۱۰	۸۳ر۵۹	۱ر۷۷	۰ر۰۹۵	۱ر۹۶
	۲۴۰	۸۳ر۳۹	۱ر۶۸	۰ر۰۹۱	۱ر۹۹
	۲۷۰	۸۱ر۵۸	۱ر۶۴	۰ر۱۰۴	۱ر۹۵
۳. آخری دور	۳۰۰	۷۷ر۹۱	۱ر۶۹	۰ر۱۰۳	۲ر۰۲
	۳۳۰	۷۹ر۷۹	۱ر۴۳	۰ر۱۱۷	۲ر۱۰
	۳۶۰	۷۷ر۷۰	۱ر۲۴	۰ر۱۱۴	۱ر۸۴

جیسا کہ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ نباتاتی نسیجوں میں نائٹروجن کی تعداد ۲۷۰ دن کے بعد بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا آخری دور میں نائٹروجن بشکل کیمیائی کھاد دینا مفید نہیں۔ اس وقت پودے میں جمع نائٹروجن لحمیہ (Proteins) میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ابتدائی اور درمیانی دور میں جب پودوں کی نشو نما عروج پر ہوتی ہے۔ نائٹروجن کیمیائی کھاد کی شکل میں دینا فصل کے لئے بے حد مفید ہوتا ہے۔ اسے قسط وار دینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ جبکہ پوٹیشیم اور فاسفورس ایک ہی بار اور بوائی کے وقت دینا چاہیئے۔ تینوں معدنی اجزار کی متناسب مقدار بھی فصل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مشاہدہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گنے کی بڑھی والی فصل (Ratoon) خشک سالی سے کم متاثر ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کے لیے شجری فصل (Planted crop) کے بہ نسبت معدنی اجزار کی مقدار ۲۰ سے ۵۰ فیصد زائد درکار ہوتی ہے۔

بارش کی شدت اور سیلاب سے نہ صرف خریف کی دیگر فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ گنا بھی متاثر ہوتا ہے۔ جولائی سے ستمبر تک مسلسل بارش کی وجہ سے کھیتوں کی مٹی اسقدر نم ہو جاتی ہے کہ پودے سیدھے نہیں رہتے تند ہوائیں پودوں کو زمیں بوس کر دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں اس بات کا خیال رہے کہ جب بارش کی شدت کا امکان ہو تو پودوں کی جڑوں پر مٹی کی مضبوط پرت چڑھا دی جائے جسے Earthing up کہتے ہیں۔ اگر فصل کی نشو نما تیزی سے ہو رہی ہے۔ تو پودوں کی بندھائی (Tying) کر دی جائے لیکن اس بات کا دھیان رہے کہ بندھائی زیادہ اوپر سے نہ کی جائے ورنہ نشو نما متاثر ہوگی۔ اگر کھیتوں میں پانی بھرا ہے تو اسے جلد سے جلد باہر نکال کو دیا جائے سیلاب میں معدنی اجزار پودے کو نہیں ملتے اور مٹی میں موجود بیکٹیریا اپنا کیمیاوی عمل بند کر دیتے ہیں۔ زیادہ عرصہ تک گرے ہوئے پودوں میں توصیفی خصوصیت ضائع ہو جاتی ہے اور تنے کی شکنوں کا گانٹھوں سے جڑیں نکل آتی ہیں۔ اگر گرے ہوئے پودوں کو زیادہ عرصہ تک زمیں بوس رہنے دیا گیا تو انہیں دوبارہ سیدھا رکھنا مشکل ہو جائے گا یہاں تک کہ تنہ جگہ جگہ سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ لہٰذا بندھائی مناسب وقت میں کر دینا چاہیئے تاکہ یہ نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مہیندر کور

اتر پردیش میں علاج وصحت کے نئے تجربے

کسی ملک کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے باشندے صحت مند ہوں اور دلجوئی سے کام کر سکیں نیز ترقیاتی پروگراموں میں نمایاں حصہ لے سکیں ہر حکومت کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ علاج وصحت کے لیے بہتر سہولتیں فراہم کرے اور اس سلسلے میں ہر فرد وبشر کا خیال رکھے۔

ہندستان کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست اتر پردیش میں اس سلسلے میں متعدد اہم اقدامات کیے گیے ہیں۔

علاج وصحت کے میدان میں کچھ نئے تجربے بھی کیے گیے ہیں۔ ریاست کے دور افتادہ علاقوں کے دیہی باشندوں کو علاج کی ابتدائی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اجتماعی صحت کارکن اسکیم شروع کی گئی ہے ریاست میں ہر فی ہزار آبادی پر اسی علاقہ کا منتخب کردہ ایک سواستھ رکشک (محافظ صحت) مقرر ہوتا ہے۔ جسے پچاس روپئے ماہانہ کی اعزازی رقم اور پچاس روپئے کی دوائیں بھی دی جاتی ہیں۔ یہ کارکن معمولی بیماری کے علاج کے لیے تربیت یافتہ ہوتا ہے اور سنگین نوعیت کے امراض کے علاج کے لیے وہ مریض کو ابتدائی صحت مرکز بھیجتا ہے ریاست کے ۵۴۲ ابتدائی صحت مرکزوں میں ۴۵۹۳۵ کارکن تربیت حاصل کر چکے ہیں اور اب وہ دیہی علاقوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

غیر تربیت یافتہ عورتوں اور دائیوں سے زچگی کا کام کرانے سے زچہ بچہ دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے چنانچہ شرح اموات کو کم سے کم کرنے کے لیے دائیوں کو تربیت دینے کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔ ریاست کے ہر گاؤں کی دائی ایک ماہ کی تربیت حاصل کر کے اپنے گاؤں میں ہی اے۔ این۔ ایم کی نگرانی میں کام کرتی ہے۔ زچگی کے بعد زچہ بچہ کی دیکھ بھال کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس پروگرام کے تحت تیس ہزار کے لگ بھگ دائیوں کو تربیت دی جا چکی ہے اور مالیاتی سال رواں کے دوران بیس ہزار دائیوں کو تربیت دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

عوام کو گھر بیٹھے علاج کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ایسا بندوبست کیا گیا ہے کہ ہر ابتدائی صحت مرکز میں تعینات میڈیکل افسر اپنے علاقہ میں جاکر عوام کو علاج کی سہولتیں فراہم کرے۔ اسی طرح ہر ضلع میں علاج وصحت کے ماہرین کی گشتی ٹیم ضلع کے ابتدائی مرکزوں میں جاکر مریضوں کی جانچ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر میڈیکل کالج سے ضلع کے تین ابتدائی مرکزوں کا الحاق عمل میں لایا گیا ہے۔

ریاست میں ایک ہزار کی آبادی پر ایک اجتماعی صحت کارکن اور ایک تربیت یافتہ دائی کی خدمات فراہم کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح دس ہزار کی آبادی پر ذیلی مرکز میں ایک ابتدائی

صحت کارکن اور ایک اے۔ این۔ ایم یا خاتون صحت کارکن خدمت انجام دیتی ہے ہر ابتدائی صحت مرکز میں آٹھ سے دس تک ذیلی مرکز ہوتے ہیں ریاست میں اسوقت مجموعی طور پر ۷۶۵۰ ذیلی مرکز قائم ہیں اس طرح ریاست کے ۹۰۷ ابتدائی صحت مرکزوں میں عوام کو علاج و صحت اور خاندانی فلاح سے متعلق خدمات دستیاب ہیں۔ ریاست میں عام طور پر ایک ابتدائی صحت مرکز میں مریضوں کے علاج کے لیے چار پلنگوں کا بندوبست ہوتا ہے۔ ابتدائی صحت مرکزوں کا درجہ بلند کرکے اب انھیں ۳۰ پلنگوں والے اسپتالوں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ میدانی علاقوں میں اسّی ہزار سے ایک لاکھ تک کی آبادی پر ایک ابتدائی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ جبکہ پہاڑی علاقوں میں ۲۵ سے ۵۰ ہزار کی آبادی پر ایک ابتدائی مرکز قائم ہے۔

اترپردیش میں اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے لکھنؤ میں ۳۵ کروڑ روپئے کی لاگت سے ایک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے یہ انسٹی ٹیوٹ مرحوم سنجے گاندھی کے نام پر ہوگا۔ اس کا سنگ بنیاد ہندستان کے راشٹرپتی نے لکھنؤ میڈیکل کالج کے احاطے میں رکھا ہے اس کے قائم ہوجانے سے اترپردیش میں بہتر سے بہتر علاج کی سہولتیں فراہم ہوں گی۔ علاوہ ازیں نئی نئی دواؤں اور بیماریوں پر ریسرچ کی جائے گی۔

ریاست کے ضلع کی سطح کے سبھی اسپتالوں میں خصوصی علاج کی خدمات دستیاب ہیں ان میں توسیع کرنے کا پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ اسپتالوں میں خصوصی علاج کی سہولتیں فراہم کرنے کی بھی اسکیم وضع کی گئی ہے۔ اسپتالوں میں ایکسرے اور خون کی جانچ وغیرہ کی مزید سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

حکومت اترپردیش کا نصب العین ہے "سب کے لیے صحت"۔ جہاں ایک طرف منطقائی صحت خدمات کا بندوبست ہے وہاں دوسری طرف اسکولوں و کالجوں میں صحت کی تعلیم کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ سال رواں میں دو ہزار بچوں کی صحت بہتر بنانے اور بچوں میں خود اپنی صحت کے بارے میں باخبر رہنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اسکول صحت پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

ریاست کے عوام کو صحت مند اور خوشحال بنانے کے لیے ہماری ریاستی حکومت ہمہ تن کوشاں ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ علاج و صحت کی خدمات کی کامیابی کا انحصار عوام کے تعاون پر ہے۔ اس لیے "سب کے لیے صحت" کے نشانہ کے حصول کے سلسلے میں عوامی تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ اترپردیش میں چیچک، ملیریا اور ایسی دوسری بیماریاں بہت کم ہوگئی ہیں لیکن چند نئی بیماریوں کے آثار نمودار ہو رہے ہیں جن پر قابو پانے کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

★

صفحہ ۳۴ کا بقیہ

۱۲۵ اضلاع ان ــــ سہولتوں سے پہلے ہی مستفیض ہوچکے تھے۔

گذشتہ سال شہروں میں پانی فراہم کرنے کی غرض سے ۱۰ر۵۴۴ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا اور موجودہ مالی سال میں بھی ۱۵۰۰ لاکھ روپئے شہری اور ۱۳۱۷ لاکھ روپیہ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی پر خرچ کیا جائے گا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ حکومت زندگی کے لیے ضروری شے پانی کی فراہمی پر نہ صرف یہ کہ ضروری توجہ دے رہی ہے، بلکہ اس کے لیے اس نے ٹھوس اور موثر اقدامات بھی کیے ہیں۔ جس سے دور افتادہ علاقوں اور گاؤں۔ گاؤں میں صاف و شفاف پانی کی سہولت دستیاب ہوگئی ہے۔

★

ڈاکٹر محمود حسین
۸۵ - فتح گنج لکھنؤ

ایک سال ہمہ گیر ترقی کا

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں اترپردیش عزم مصمم کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ گذشتہ ایک سال کے دور اقتدار میں موجودہ حکومت نے امن و قانون کی صورت حال کو بہتر بنانے، سماج دشمن اور تخریب کار عناصر کی بیخ کنی، انسداد بدعنوانی اور معاشی جرائم کی روک تھام، صنعتی اور زرعی پیداوار میں اضافہ، بجلی اور آبپاشی سہولتوں میں توسیع، دیہی ضروریات سے ہم آہنگ علاج و صحت خدمات کی فراہمی، ضروری اشیاء کے نظام تقسیم کو امداد باہمی انجمنوں کے سپرد کرنے، معیاری تعلیم کا بندوبست، سماجی نابرابری کو دور کرنے کے لیے خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے غریبوں، پسماندہ طبقوں، ہریجنوں اور سماج کے دبے کچلے افراد کو اوپر اٹھانے اور انھیں سماج میں باعزت مقام دلانے کی غرض سے مثبت اقدامات کیے ہیں۔

ریاست میں گذشتہ ایک سال کی قلیل مدت میں موجودہ حکومت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کا ایک مختصر تجزیہ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

چھٹا پنج سالہ منصوبہ۔

اترپردیش میں ۸۵ - ۱۹۸۰ء کے لیے ۶۲۰۰ کروڑ روپے کا چھٹا پنج سالہ منصوبہ منظور ہوا ہے جو ملک بھر میں سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ اس بار پہاڑی علاقوں کے لیے ۷۵۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے جو ہماچل پردیش سے زیادہ ہے۔ ریاست میں چھٹے منصوبہ کے تحت زراعت اور متعلقہ خدمات میں ۱۰۲۷٫۷۶ کروڑ روپئے، امداد باہمی میں ۵۷ کروڑ ۳۹ لاکھ روپئے، آبپاشی اور بجلی میں ۲۴۳۳ کروڑ روپئے، صنعت اور کانوں میں ۳۲۱٫۱۰ کروڑ روپئے، نقل و حمل اور مواصلات میں ۵۵۰ کروڑ روپئے، سماجی، اجتماعی اور معاشی خدمات میں ۸۹۶٫۷۵ کروڑ کی سرمایہ کاری کی تجویز ہے۔

ضروری اشیاء کی فراہمی:-

عوام کو غلہ اور ضروری اشیاء کی بروقت اور مناسب قیمت پر فراہمی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ان اشیاء کا نظام تقسیم بہتر اور مستحکم ہو۔ چنانچہ موجودہ حکومت نے اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اشیائے صرف کی تقسیم کا کام امداد باہمی انجمنوں کے توسط سے کرایا جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں یکم جنوری، ۱۹۸۱ء سے ریاست کے دیہی علاقوں میں غلہ، شکر اور مٹی کے تیل وغیرہ کی تقسیم کی پوری ذمہ داری امداد باہمی انجمنوں کو سپرد کر دی گئی جن کے توسط سے تقریباً ۱۵۰۰۰ سستے غلہ کی دکانیں سرگرم کار ہیں جن سے عوام کو ۱۴ اپریل ۱۹۸۱ء تک ۲۶۶ لاکھ کوئنٹل غلہ، ۳۹٫۷۰ لاکھ کوئنٹل شکر اور ۱۴۴ لاکھ ۹۳ ہزار لیٹر مٹی کا تیل تقسیم کیا گیا۔

اسی سال اپریل میں [illegible] میٹرک ٹن شکر ریاست کو الاٹ کی گئی۔ دیہی علاقوں میں امداد باہمی انجمنوں کی سستی غلہ کی دکانوں کو شکر کا جو کوٹہ الاٹ کیا گیا تھا، اس میں سے تمام دیہی کارڈ ہولڈروں کو شکر تقسیم کرنے کے بعد بھی ۲۰ فیصد شکر بچ گئی۔ چنانچہ ان انجمنوں کی خوش اسلوب کارگزاری کو ملحوظ رکھتے

ہوے موجودہ حکومت امداد باہمی غلہ کی دکانوں کے توسط سے دس ضروری اشیار یعنی موٹا کپڑا، خوردنی تیل، صابن ماچس، بیڑی، چاے، بیٹری سیل، سائیکل ٹائر ٹیوب اسٹیشنری اور نمک کی فروخت کا بندوبست کررہی ہے۔ اسی طرح شہری علاقوں میں بھی ۲۰-۲۵ اشیار کی فروخت کا بندوبست کیا جارہا ہے تاکہ صارفین کو معقول قیمت پر ان کی ضرورت کی تمام اشیار بہ آسانی دستیاب ہوسکیں۔ حکومت نے جعلی راشن کارڈوں کو ختم کرنے اور صارفین کو نئے راشن کارڈ جاری کرنے کے لیے ایک اسکیم وضع کی ہے۔

اس کے علاوہ حکومت نے منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں اور دیگر معاشی مجرموں کے خلاف زبردست مہم شروع کی ہے۔ غذا سے متعلق جرائم کی روک تھام کے لیے ریاست کے کاوال شہروں اور غازی آباد میں اڑن دستے تشکیل دیے گیے ہیں۔

کمزور طبقوں کی فلاح:۔

سماج کے کمزور طبقوں مثلاً ہریجنوں، آدی باسیوں اور خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے موجودہ حکومت نے اس سال ۱۱۹ کروڑ روپئے کا بندوبست کیا ہے جبکہ ۱۹۷۹ء میں یہ رقم محض ۲۸ کروڑ روپئے تھی۔ خصوصی مربوط اسکیم کے تحت موجودہ حکومت نے ریاست کے ۱۲ ضلعوں کے ایسے ۳۸ بلاکوں کا انتخاب کیا ہے جہاں ہریجنوں کی آبادی مجموعی آبادی کی ۴۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہے۔ ان بلاکوں میں ترقیاتی اور فلاحی پروگراموں پر تیز رفتاری سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ریاست کے جن ۱۳ قبائل کو ابتک مندرجہ فہرست نہیں قرار دیا گیا تھا حکومت نے انھیں بھی قبائل مندرجہ فہرست کو ملنے والی تمام سہولتیں مہیا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہریجنوں کو تعمیر مکانات کے لیے ملنے والی رقم پہاڑی علاقوں میں ۱۹۰۰ روپئے سے بڑھ کر ۳۰۰۰ روپئے اور میدانی علاقوں میں ۱۰۰۰ روپیہ سے بڑھا کر ۲۵۰۰ روپئے کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے ۱۲ اضلاع کے ۸۸ ترقیاتی بلاکوں میں آباد ۶۶ اقوام مندرجہ فہرست پانچ قبائل مندرجہ فہرست اور ۷ ڈی نوٹیفائیڈ ذاتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۰ کروڑ روپئے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

تعلیمی سہولتوں کی توسیع:۔

ریاست میں تعلیم کی توسیع و ترقی اور ناخواندہ عوام کو خواندہ — بنانے کے لیے موجودہ حکومت مسلسل کوشاں ہے۔ پرائمری، ثانوی اور اعلا تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ تکنیکی تعلیم سے متعلق پروگرام کی موثر عمل آوری کے لیے مالیاتی سال رواں کے دوران تین ارب ۴۸ کروڑ روپئے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مالیاتی سال رواں کے دوران دیہی علاقوں میں ۲۴۶ نئے پرائمری اسکول اور شہری علاقوں میں ۳۰ پرائمری اسکول قائم کیے گیے اس سال پرائمری اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے ۲۰/۱۱ لاکھ روپئے کی رقم منظور کی گئی۔ ریاست میں اپریل ۱۹۸۰ء سے دسمبر ۱۹۸۰ء تک کی مدت میں پرائمری اسکولوں کے لیے ۴۹۵ عمارتیں اور جونیر ہائی اسکول کے لیے ۷۱ عمارتیں تعمیر کی گئیں جبکہ پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں کے لیے بالترتیب ۸۱۳ اور ۲۴۰ عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ اس کے علاوہ ان اسکولوں کی مرمت کے لیے بھی مالیاتی سال رواں میں ایک کروڑ روپئے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ کمزور طبقوں کے بچوں کو مفت پوشاک فراہم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ کتابیں مہیا کرنے کے لیے کتب بینک قائم کیے گیے ہیں۔ اس سال ریاست میں ۹ نئے سرکاری ہائی اسکول قائم کرنے اور ۱۱ سرکاری ہائی اسکولوں کا درجہ انٹر تک بلند کرنے کی منظوری دی گئی۔

قومی یک جہتی کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر نصابی مضامین میں ترمیم کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے ریاست کی یونیورسٹیوں میں سہ سالہ ڈگری نصاب نافذ کرنے کے لیے

ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اس کے علاوہ تعلیمی سال کو باقاعدہ بنانے کیلیے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہر حال میں تمام یونیورسٹیوں کے امتحانات جون کے آخر تک مکمل ہو جائیں تاکہ آئندہ تعلیمی سال وقت پر شروع ہو سکے۔ ریاست میں گزشتہ دسمبر تک ۹۴۸۵ تعلیم بالغان مرکز قائم کیے گیے جہاں ۲۴۳۰۸۸ ناخواندہ افراد کا رجسٹریشن ہوا۔ ریاست کے ۴۸۲۳ اردو ٹیچروں کو مستقل کرنے کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں اور بقیہ عارضی ٹیچروں کو بھی مستقل کرنے کی کاروائی کی جا رہی ہے

آبپاشی سہولتوں میں اضافہ:۔

ریاستی حکومت نے زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے آبپاشی سہولتوں میں زیادہ سے زیادہ توسیع کرنے کی غرض سے متعدد مثبت اقدامات کیے ہیں۔ ریاست میں گذشتہ مارچ کے آخر تک سرکاری آبپاشی وسائل سے ۹۱ لاکھ ۱۶ ہزار ہیکٹیئر آبپاشی صلاحیت پیدا کی گئی۔ سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے آخر تک ریاست میں سرکاری آبپاشی وسائل کا بندوبست کرنے پر تقریباً ۱۵۸ کروڑ روپئے خرچ ہوا۔ آبپاشی کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چھٹے منصوبے میں بڑی، درمیانی اور چھوٹی سینچائی اسکیموں کے لیے ۱۳۱۴ کروڑ روپئے کے مصارف کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ زیر نظر مدت میں ۲۰ لاکھ ۱۵ ہزار ہیکٹیئر مزید آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ریاست میں ۸۲-۱۹۸۰ء کے دوران بڑے اور درمیانی آبپاشی پراجکٹوں کے لیے ۱۷۶ کروڑ ۱۸ لاکھ روپئے اور چھوٹی آبپاشی اسکیموں کے لیے ۱۵ کروڑ ۵۳ لاکھ روپئے کے مصارف کی تجویز ہے اسی طرح امسال چار لاکھ ۶۰ ہزار ہیکٹیئر آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اتر پردیش میں چھٹے منصوبے میں ۷،۳۰۰ ٹیوب ویلوں کی بورنگ اور ۷،۹۰۰ ٹیوب ویلوں کی بجلی کاری کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ عالمی بینک کی مدد سے ۵۰۰۰ نئے ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور ۱۴۰۰ پرانے ٹیوب ویلوں کی جدید کاری کی تجویز ہے۔ پہاڑی علاقوں میں مارچ، ۱۹۸۰ء کے آخر تک ۱۲۰۰۰ ہیکٹیئر رقبہ کو آبپاشی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ریاست کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے چھٹے منصوبے میں ۱۴۴ کروڑ روپئے کا بندوبست کیا گیا ہے جس کے تحت ۴۰۰ کلومیٹر لمبے پشتے اور ۸۰۰ کیلو میٹر لمبے نالے تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ اسی طرح سیلاب کی روک تھام کے لیے ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپئے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

بجلی کی صورت حال میں سدھار:۔

ریاست میں بجلی گھروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے بجلی کی تقسیم کے نظام کو چاق و چوبند اور مستحکم بنانے نیز بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کو یقینی بنانے کی غرض سے موجودہ حکومت نے جو مثبت اقدامات کیے ہیں، ان کے نتیجہ میں بجلی کی پیداوار کی صورت حال کافی بہتر ہوئی ہے۔ ریاست میں بجلی کی پیداواری صلاحیت کے ۲۴۴ میگا واٹ کے مقررہ نشانہ کو پورا کیا گیا جس سے بجلی کی صلاحیت بڑھ کر ۳۴۸۹ میگا واٹ ہو گئی۔ اس سال ربیع کی آبپاشی کے لیے روزانہ آٹھ گھنٹے بجلی سپلائی کی گئی جبکہ گذشتہ برسوں میں اوسطاً چار۔ پانچ گھنٹے بجلی فراہم کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کیمیاوی کھاد، شکر، بناسپتی، سیمنٹ اور دوائیں تیار کرنے والے کارخانوں کو بجلی کی کٹوتی سے بالکل مستثنا قرار دیا گیا اور دیگر تمام عمومی صنعتوں پر عائد بجلی کی کٹوتی کو ۶۶ $\frac{2}{3}$ سے گھٹا کر ۳۳ $\frac{1}{3}$ فیصد کر دیا گیا۔ اسی طرح بعض اہم صنعتوں پر عائد بجلی کی کٹوتی گھٹا کر ۲۵ فیصد کی گئی۔ ریاست کے تھرمل بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں اگست ۱۹۸۰ء میں بجلی کی جو پیداوار ۲۸٫۴ فیصد تھی وہ بڑھ کر مارچ ۱۹۸۱ء میں ۴۸٫۷ فیصد ہو گئی۔ زیر نظر مدت میں ۴۰ ہزار سے بھی زیادہ نجی اور سرکاری ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ ان میں ۳۹۷۸۱ نجی ٹیوب ویل اور پمپنگ سیٹ نیز ۱۲۶۸ سرکاری ٹیوب ویل شامل ہیں۔ اس طرح ریاست میں مارچ، ۱۹۸۱ء تک ان کی تعداد بالترتیب ۳۳۹۱۶ اور ۱۸۸۲۱ تک پہنچ گئی۔ مزید براں اسی مدت میں ۳۲۶۳ مواضعات اور ۲۴۳۰

ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی گئی جس سے ان کی مجموعی تعداد مارچ ۱۹۸۱ء تک بالترتیب ۴۱۸۴۰ اور ۱۶۳۳۴ ہو گئی۔ اس طرح دیہی بجلی کاری کارپوریشن نے زیر نظر مدت میں سب سے زیادہ یعنی ۱۷۴ پراجکٹوں کی منظوری دی۔ پردیش میں ۴۰۰ کے وی کی ۲۹۵ کیلو میٹر لمبی لائنیں، ۲۲۰ کے وی کی ۲۰۷ کیلو میٹر لمبی لائنیں اور ۱۳۲ کے وی کی ۵۴۹ کیلو میٹر لمبی لائنیں بچھائی گئیں۔ اس کے علاوہ بجلی کی چوری کی روک تھام کے لیے بھی مثبت اقدامات کیے گئے۔ ریاست کے چار تھرمل بجلی پراجکٹوں کے تعمیراتی کام کی رفتار تیز تر کی گئی اور ۱۳ مزید تھرمل بجلی پراجکٹوں کے لیے مرکز سے منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

زرعی پیداوار میں اضافہ:۔

موجودہ حکومت نے کسانوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے، غلہ، دلہن اور تلہن کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لیے حوصلہ مندانہ پروگرام شروع کیے ہیں۔ ریاست میں زرعی پیداوار میں اضافہ کو یقینی بنانے کے لیے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے سال ۸۱-۱۹۸۰ء کو "کسانوں کا سال" قرار دیا گیا۔ اتر پردیش ملک کی وہ پہلی ریاست ہے جس نے سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں کسانوں سے براہ راست دھان خریدنے کا بندوبست کیا۔ اسی سال دھان کی سہارا قیمت ۱۰۵ روپئے فی کوئنٹل مقرر کی گئی جو گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۰ روپئے زیادہ ہے۔ اس سال کسانوں کی شکایتوں اور دشواریوں کے فی الفور ازالے کے لیے ایک "کسان دوست سیل" قائم کیا گیا۔ ریاست میں ۸۱-۱۹۸۰ء کے لیے مجموعی طور سے ۲۳۲ لاکھ ٹن غلہ پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جبکہ موصولہ اطلاعات کے بموجب مقررہ نشانہ سے زیادہ یعنی تقریباً ۲۴۰ لاکھ ٹن غلہ کی پیداوار متوقع ہے۔ اسی طرح ۱۲۸ لاکھ ٹن گیہوں کی پیداوار کا تخمینہ لگایا گیا ہے جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔ ریاست میں دالوں اور تلہن کی پیداوار بھی مقررہ نشانے سے زیادہ یعنی بالترتیب تقریباً ۳۰ لاکھ ٹن اور ۱۷ لاکھ ٹن متوقع ہے۔

اس وقت اوسر زمین کو قابل کاشت بنانے کا کام ریاست کے ۲۴ ضلعوں میں ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تین ہیکٹیر سے کم جوت والے کسانوں کو ۷۵ فیصد اور دیگر کسانوں کو ۵۰ فیصد مالی امداد دی جاتی ہے۔ کسانوں کو فاسفیٹ اور پوٹاش کی کیمیاوی کھاد کی خریداری پر ۱۰ فیصد مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔ ریاست میں ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۷ اہم منڈیوں اور ۲۹ ذیلی منڈیوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔ اتر پردیش میں خشک سالی، سیلاب اور شدید بارش کی وجہ سے فصلوں کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے کسانوں کو ۲۷ کروڑ روپئے سے زیادہ رقم بطور تقاوی تقسیم کی گئی۔ اس کے علاوہ مال گذاری اور دیگر بقایاجات کی وصولی میں چھوٹ دی گئی۔

سڑکوں اور پلوں کی تعمیر:۔

ریاست میں ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۸۰۰ کیلو میٹر نئی سڑکوں کی تعمیر، ۱۲۳۰ کیلو میٹر موجودہ سڑکوں کی مرمت اور ۶۷ پل تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ سال ۸۲-۱۹۸۱ء میں پختہ سڑکوں کی نگہداشت پر ۱۷۰۰ روپئے فی کیلو میٹر کی شرح سے رقم خرچ کی جائے گی۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ حکومت ریاست کو ہمہ گیر ترقی کی راہ پر تیز رفتاری سے آگے بڑھانے اور مکمل خوشحالی کی منزل تک پہنچانے کے لیے پورے عزم کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

★

قطب اللہ

(افسانہ)

نیا مندر

رادھے شیام نے میز پر بکھرے کاغذات کو قرینے سے فائل میں سجایا کچھ نقشوں اور چارٹوں کو یوں ہی بکھرا چھوڑ کر، اپنی عینک اتار کر صاف کرنے لگا۔ وہ کسی گہری فکر میں تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا دیکھا تو ماں کھڑی کہہ رہی تھی۔

"بیٹا ذرا کنٹرول کی دکان تک چلا جا، شکر تو لے آ ورنہ ختم ہو جائے گی" ماں نے اس کی طرف راشن کارڈ بڑھا دیا۔

رادھے شیام نے عینک پھر آنکھوں پر سجائی اور تھکے ہوئے انداز میں بولا "ماں اس وقت رہنے دو شام کو لے آؤں گا، کچھ کھانے کو ہو تو دے دو میں فوراً ہی کام سے جا رہا ہوں۔"

"ہونھ کام۔۔ کام۔ سن سن کر تنگ آ گئی ہوں کون سا کام ہے؟ بغل میں دبی ہوئی وہی فائل سڑکوں پر چکر، اور شام کو آ کر میز پر اسی فائل میں پھر ڈوب جاتے ہو، میں پوچھتی ہوں آخر یہ کون سا کام ہے۔ پڑھائی ختم کیے سال بھر ہو گیا ہے۔ بیٹا اب، بابو کو آرام دینے کی سوچو، جلدی سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔ مل سے ان کے ریٹائر ہونے میں صرف ۲ برس رہ گئے ہیں۔ آخر اس نوکری میں حرج ہی کیا ہے، تیرے پتا جی بہت دکھی ہیں کہہ رہے تھے۔ صاحب سے زندگی میں ایک کام کہا تھا وہ تیار بھی تھے۔ لیکن جب اپنی اولاد ہی ناکارہ ہو تو کیا کیا جائے۔"

"ناں۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے یہ نوکری، باپ نے گیٹ پر چوکیداری کر کے کاٹ دی اور بیٹے نے فائل کے پیچھے دم توڑ دیا مجھے صاحب کی یہ مہربانی منظور نہیں، میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں تو کیوں کرنے لگا نوکری، تو تو لاٹ صاحب کی اولاد ہے نا، ابھی نہیں سمجھو گے ابھی تو بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل جاتا ہے نا۔ میں کہتی ہوں۔۔ جب تجھے یہی آوارہ گردی کرنی تھی تو یہ پڑھائی لکھائی کا ناٹک کیوں کیا تھا۔ کاش تو بھی ان پڑھ ہوتا اور باپ کی طرح خاکی وردی پہن کر شان سے سینہ تان کر کسی مل کے گیٹ پر کھڑا ہو جاتا، گھر جب آتا تو تیری جیب میں چار پیسے ہوتے، گومتی کاکا کے لڑکے کو دیکھو دسواں پاس کیا ٹائپ سیکھا اور سکریٹریٹ میں بابو ہو گیا، شادی ہو گئی ماں باپ اب چین کی بنسی بجا رہے ہیں۔

سرکار نے ہم لوگوں کو پڑھائی اور نوکری میں جو سہولتیں دی ہیں وہ تیرے جیسے نکھٹو لوگوں کے لیے نہیں گومتی کاکا کے جیسے لائق لڑکوں کے لیے ہیں۔"

"ماں۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمہیں دکھ دے رہا ہوں لیکن تم دل نہ چھوٹا کرو میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔"

ماں غصہ سے مڑ کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔

رادھے شیام کچھ لمحے کھڑے کھڑے کچھ سوچتا رہا پھر جلدی جلدی جوتے پہننے لگا اسی دوران کسی نے باہر

سے آواز دی۔

"ارے بھئی! رادھے شیام ورما جی ہیں!؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دے ماں تیزی سے چیخ پڑی "لو پھر آگیا .... وہ اد یوگ محکمے کا بابو، جاؤ گھومو اور اس کے دفتر میں بیٹھ کر چائے پیو، یہی کام تھا نا۔ کیوں تم نے ایسے لوگوں کا ساتھ کیا ہے"

"ماں .... تم چپ رہو جس کے بارے میں ...."

"ہاں! ہاں! میں چپ رہوں، کیوں چپ رہوں جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تیرے باپو نے کسی سے سنا ہے کہ یہ آدمی اس دفتر کا بدنام بابو ہے اور ایک نمبر کا رشوت خور ہے"

"ماں .... بس، بہت ہو چکا اس غریب کے بارے میں تم لوگوں نے نہ جانے کیا کیا سن رکھا ہے۔ میں جا رہا ہوں"

"سچائی نہیں سن سکتے نا، بہت کڑوی ہوتی ہے اچھا کھانا تیار ہے کھالے بیٹا ہم تیرے دشمن تھوڑے ہیں۔ تیری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں"

رادھے شیام بغیر کوئی جواب دیئے چلا گیا۔

"معاف کیجیے گا ترلوکی بابو ذرا دیر ہو گئی۔ چلیے فوراً چلتے ہیں"

"کوئی بات نہیں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے"

دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہو گئے۔ ماں دروازے پر آکر رک گئی تھی اور دونوں کو گلی کے موڑ تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

رادھے شیام کے پراجکٹ کی پوری فائل دیکھنے کے بعد ترلوکی بابو نے اطمینان کی سانس لی، بولے "اب ٹھیک ہے سارے کاغذات درست ہیں، چلو صاحب سے بات کرتے ہیں" دونوں اٹھ کر بڑے صاحب کے پاس پہنچے اتفاق سے وہ فرصت میں تھے

رادھے شیام کو دیکھتے ہی وہ ہنس کر بولے۔

"کہیے مسٹر سب ٹھیک ہو گیا"

"جی ہاں!"

"کچہری کے کاغذات؟"

"جی .... وہ بھی تیار ہیں ایک نظر ڈال لیں تو بہتر ہو گا" رادھے شیام نے ان کی طرف فائل بڑھادی۔ ترلوکی بابو نے بڑھ کر فائل کھولنے میں بڑے صاحب کی مدد کی۔

بڑے صاحب نے فائل دیکھنے کے بعد فیصلہ سنایا "بس اب ٹھیک ہے، کچھ دن اور صبر کرو، سمجھو کام ہو گیا"

"شکریہ جناب ــــ!"

"ہاں بھئی بنک منیجر خان صاحب تمہاری بڑی تعریف کر رہے تھے کہہ رہے تھے آج کل ایسے پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگوں کی بڑی کمی ہے"

"ارے سر میں کیا یہ تو آپ ...."

"صاحب نیتا جی آئے ہیں" چپراسی نے آکر بات کاٹ دی بڑے صاحب اٹھ کر نیتا جی کے پاس چلے گئے

وہ بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہا تھا گھر سے تو بہت پہلے نکل آیا تھا لیکن بس نہ آنے کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی۔ اسے دو تین جگہ پہنچنا تھا۔ لوگوں نے وقت دے رکھا تھا، اگر وہ لوگ اٹھ گئے تو بڑی مشکل آن پڑے گی۔

دھوپ میں کھڑے کھڑے اکتا رہا تھا لیکن مستقبل کے حسین خوابوں نے کلفتوں کا احساس کم کر دیا تھا جب وہ اپنی تکنیکی تعلیم کے آخری سال میں تھا تو کتنے لمبے چوڑے منصوبے بنایا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ امتحان دیکر باہر نکلتے ہی فیکٹری کے مالکان دروازے

پر نقدی کے کاغذات لیے کھڑے ملیں گے. خوبصورت بنگلے
جن پر انجینیر کی خوبصورت تختی دروازے پر لگی ہو گی ان کی
راہ تک رہے ہوں گے. ایک دو بار جب رادھے شیام نے
اپنے منصوبے کا ذکر کیا تو لوگوں نے اس کا بڑا مذاق اڑایا تھا،
اس کا ایک ساتھی جو نہ جانے کیوں اس سے چڑھتا تھا ایک بار
بولا تھا.

"تم خواہ مخواہ ان جھنجھٹوں میں پڑتے ہو. ارے بھیا
ہر محکمہ میں تمہاری جگہ ریزرو ہے تمہارا انتظار ہو رہا ہے ڈگری
دکھاؤ اور شاندار کرسی پر جم جاؤ"

رادھے شیام نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی
ارے بھئی تم ایسا کیوں سوچتے ہو، بہت پرانی ہو گئی
ہیں یہ باتیں، نئے زمانے کی نئی بات کیوں نہیں کرتے تم واقعی
اگر اتنے حساس ہو تو تمہیں سب سے پہلے اس سبجکٹ کو دیکھنا
چاہیے جس میں تم کو بہت کم نمبر ملے ہیں، تمہیں اس کمی کو پورا
کرنے کی کوشش کرنا چاہیے."

"اب جا بڑا آیا میری خیر خواہی کرنے والا' میں
جیسا ہوں ٹھیک ہوں، مجھے کس چیز کی کمی ہے، نہ ملے نوکری
نہ سہی. دکان، زمین، سب کچھ ہے چار چار مکان کرائے پر
اٹھے ہیں، پڑھائی تو وقت کاٹنے کے لیے اور گھر والوں کے کہنے
پر کر رہا ہوں."

رادھے شیام کو اس سے نفرت تو نہیں تھی لیکن وقت
بے وقت وہ اس پر جو جملے کستا تھا وہ اس سے ضرور چڑھ جاتا
تھا. لیکن اس کا علاج کیا ہے اس کے ماں باپ بھی تو یہی سوچتے
ہیں. انٹر پاس کرنے کے بعد ہی باپو نے نوکری کی رٹ لگانی
شروع کر دی تھی. مل کے دروازے سے گزرنے والی گاڑیوں کو
سلوٹ کرتے کرتے ان کے سوچنے کا دائرہ بھی محدود ہو گیا
تھا. صدیوں کی پس ماندگی کی سطح سے کبھی اوپر اٹھنے کی
کوشش نہیں کی. رادھے شیام نے نئی راہ پر چلنے کی کوشش
کی تو بولے "نہیں بیٹے یہی کرم کا سدھانت ہے شاستروں میں
یہی لکھا ہے."

اس پر وہ جھنجھلا جاتا" باپو کرم کا سدھانت میں
بھی جانتا ہوں شاستروں میں جو لکھا ہے اسے میں نے
بھی پڑھا ہے آپ تو سنی سنائی باتیں کرتے ہیں."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے لیکن تو کیا بنے گا میری
سمجھ میں نہیں آتا میری تو جہاں تک پہنچ تھی بات پکی کرلی
تھی. اپنے ہی مل میں جگہ خالی تھی اپنے ہی لوگوں کے لیے
رزرو تھی چٹکی بجاتے نوکری مل جاتی. کہاں ملتی ہے
اتنی آسانی سے اس زمانے میں."

یہ بات رادھے شیام کی سمجھ میں نہیں آتی تھی
اس نے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ اور کرنا چاہتا
ہے. اس نے تکنیکی تعلیم کے ادارہ میں داخلہ لے لیا.

اور اب جب کہ اس نے یہ کورس مکمل کر لیا تو باپو
نے پھر ایک بار بڑے صاحب سے بات چلائی انھوں نے کہا تھا
بھئی دیکھو اس وقت اس کے لائق کوئی جگہ تو خالی
ہے نہیں ویسے میں اسے ڈیوٹی کلرک کی جگہ رکھ سکتا ہوں"

رادھے شیام کے باپو کو بڑے صاحب کی بات بڑی
معقول لگی تھی انھوں نے پھر رادھے شیام کو مشورہ دیا
تو وہ جھنجھلا گیا بولا "میں جو کر رہا ہوں کرنے دیجیے، کبھی کبھی
کچھ میری بھی سن لیا کریں آپ لوگ."

باپو بھی غصہ ہو گئے اور زمین کے کاغذات جو بنک
سے قرضہ لینے کے لیے جمع کرتے تھے، ان پر جھنجھلا کر جہاں جہاں
لڑکے نے کہا انگوٹھا لگا دیا. بولے لیا تو بھی دل کی بھڑاس نکال
لے بچپن سے آج تک جب نہیں روکا تو اب کیا؟ کہنے کو نہ رہ
جائے کہ باپ نے موقعہ نہیں دیا."

آج رادھے شیام کی زندگی کا بڑا مبارک دن تھا.
انڈسٹری کے دفتر سے تو اس کی اسکیم منظور ہوئے مہینوں ہو گئے
تھے. اب تمام کارروائیوں کے بعد آج بنک میں اسے مینیجر

خان صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے قرضہ کی پہلی قسط کا چیک
پیش کیا تھا انھوں نے کہا تھا " رادھے شیام میری دعائیں تمہارے
ساتھ ہیں. خدا تمہیں کامیاب کرے سرکاری قرضہ تو آسان
قسطوں میں ادا کر ہی دوگے. لیکن اس ملک کا جو قرض تم پر
واجب ہے اسے بھی اتارنے میں اسی طرح چوکسی دکھانا.
اب تمہیں بڑی محنت اور ایمانداری سے کام کرنا ہوگا!
"خان صاحب اگر آپ کا آشیرواد میرے ساتھ رہا تو مجھے کامیابی ضرور
ملے گی."

ترلوک بابو کی زمین کا ایک ٹکڑا جو خالی پڑا تھا اس
پر دیوار کھڑی کر کے ٹین کی چھتیں ڈالی جا چکی تھیں. اندر
نئی نئی مشینیں لگ چکی تھیں، قرضہ کی دوسری اور آخری قسط
بھی مل چکی تھی. رادھے شیام نے اپنے ساتھ کے پڑھے
ہوئے تین اور ہوشیار نوجوانوں کو جو بیکار تھے لگا لیا
تھا، سب بڑی تندہی سے مل جل کر کام کر رہے تھے. نوجوانوں
کی یہ چھوٹی سی فیکٹری نے جس میں اسکوٹر کے پلگ بنانے کا
کام شروع ہوا تھا. بہت جلد تاجروں کو اپنی طرف متوجہ کر
لیا تھا. مقامی تاجر باہر کے ہول سیل کا کام کرنے والے اور دور
دراز کے لوگ آنے لگے تھے. نمونہ دیکھ کر آرڈر بھی دے
رہے تھے. رادھے شیام اور اس کے ساتھی تکنیکی امور
سے لیکر تجارتی معاملات تک سب کام خود دیکھ رہے تھے.
فیکٹری کا باقاعدہ افتتاح چار دن بعد ہونے والا تھا.
تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں. دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے.

چھوٹی سی ٹین کی چھت والی عمارت جس پر
ورما انڈسٹری کا بورڈ مسکرا رہا تھا دلہن کی طرح سجی
تھی، بھیڑ بھاڑ کوئی خاص نہیں تھی اس کے دوست
احباب کالج کے ٹیچر انڈسٹری محکمہ کے کچھ افسران بنک
منیجر اور اس کے ماتا پتا موجود تھے، فیکٹری کے صدر دروازے
پر لگے سرخ فیتے کو اس کے ایک ٹیچر نے کاٹ کر عمارت
کا افتتاح کیا ! اب لوگ اندر کارخانے میں کھڑے تھے.
نئی نئی تازہ دم مشینوں نے ان کا استقبال کیا، ان پر
اس کے ساتھی پوزیشن لیے کھڑے تھے. اب ان مشینوں
کا افتتاح ہونا تھا.

رادھے شیام نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو آگے بڑھایا
وہ لوگ ہچکچائے، " ارے یہ تو کیا کر رہا ہے بیٹے. اتنے بڑے
بڑے لوگ ہیں."

"نہیں ماں... باپو یہ سب آپ دونوں کی محبت
محنت اور آشیرواد کا نتیجہ ہے یہ شبھ کام شروع کرنے کیلئے
آپ دونوں سے بہتر کوئی نہیں. بس اس بٹن کو انگلی سے
دبا دیجئے."

بٹن دبتے ہی مشینیں حرکت میں آگئیں، تالیوں کی
گھڑگھڑاہٹ میں رادھے شیام کا چہرہ کھل اٹھا تھا. اس کے
والدین کی بوڑھی دھندلی آنکھیں چھلک آئی تھیں. ان میں
جیسے نئی روشنی آگئی تھی. دونوں نے مشینوں اور عمارت
کا جائزہ لیا. ماں نے بیٹے کا ہاتھ تھام رکھا تھا،
"ہے بھگوان یہ کیسی کایا پلٹ ہے"

یہ نیا مندر ہے ماں، یہاں محنت ایمانداری
اور لگن سے کام کرنا ہی پوجا ہے."

اسی وقت کسی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی.
اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے بنک منیجر خان صاحب کھڑے
تھے. جو کہہ رہے تھے.

"میرے دوست مجھے یقین ہے کہ تمہاری پوجا
کامیاب ہوگی."

★

Urdu Monthly

Vol. 36 No. 3
JUNE 1981
50 paisa

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

REGD. No. LW/NP. 17
Annual Subs
Rs. 5/-

نیا دور

جلد ۳۶ نمبر ۴

جولائی ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پکاشن ویبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ۔

بذریعہ وی۔پی: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی باتیں

ملک کے صف اول کے مجاہد آزادی مورخ، مصنف صحافی اور اردو کے پرستار پنڈت سندر لال کا انتقال ہندستان اور اس کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے لیے ایک نقصان عظیم ہے اور یہ نقصان ایسا ہے جس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

پنڈت سندر لال جی نے مختلف شعبہ ہائے حیات میں بے مثل و منفرد خدمات انجام دیں۔ ان کی پہلو دار شخصیت اور ان کی خدمات کے تجزیے کے سلسلے میں ان کی ابتدائی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ ملک کی جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہدین کے ساتھ نظر آئیں گے۔ اس حیثیت سے انھوں نے قربانیاں بھی دیں اور صعوبتیں بھی جھیلیں نیز ملک کو جہد و عمل کی تحریک بھی دی۔ وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں بالکل صحیح کہا کہ "انھوں نے ہندستان کے لوگوں میں انگریزی حکومت سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کیا۔" اسی کے ساتھ ہی وہ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے خلاف بھی ہمیشہ برسرپیکار رہے اور انھوں نے ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے لیے بھی بڑا کام کیا۔ انھوں نے الہ آباد سے ایک رسالے کی اشاعت شروع کی تھی، جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں برسوں شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے قرآن اور گیتا کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور پیغمبر اسلام کی مکمل سوانح اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے مسلم محبان وطن، صوفیائے کرام اور مسلم درویشوں کی خدمات ان کی تعلیمات و روایات کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ پنڈت سندر لال کی ان سرگرمیوں اور خدمات سے ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور سیکولر قدروں کو زبردست تقویت پہنچی۔ سندر لال جی نے "بھارت میں انگریزی راج" جیسی اپنی تصنیف کے ذریعہ تاریخ پر اپنی دسترس کا ثبوت بھی دیا۔ اس کتاب میں انھوں نے انگریزی حکومت کی ریشہ دوانیوں، پھوٹ ڈالنے والی سرگرمیوں اور اس حکومت کے سامراجی ذہن پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ عملی حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں ہندستان کا ایک ثقافتی وفد سندر لال جی ہی کی قیادت میں چین گیا تھا۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی وہ ان علاقوں میں جاتے رہے جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور وہاں سماج پر فسادات کے منفی اثرات کو کم کرنے کی انھوں نے زبردست کوششیں کیں۔ وہ بابائے قوم مہاتما گاندھی کے دیرینہ اور قریبی رفیق کار تھے۔ ان کی شخصیت پر گاندھی جی کے انداز فکر اور طرز عمل کی چھاپ بہت گہری تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کے ہندستانی زبان کے تصور کو عملی شکل دینے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں الہ آباد سے شائع ہونے والے اپنے رسالے سے کافی کام لیا۔ انھوں نے اردو کے کاز کی بھی ہمیشہ حمایت کی، بلکہ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں اور سرگرم رہے۔ اردو کے لیے تیس سال پہلے بیس لاکھ دستخط جمع کرنے کی جو مہم چلائی گئی تھی اس میں بھی انھوں نے زبردست عملی حصہ لیا تھا اور وہ اس وفد میں بھی شریک تھے جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں ان ۲۰ لاکھ دستخطوں کے ساتھ اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملا تھا۔ اردو کے کاز کے لیے لڑنے والے مجاہدین میں ان کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا اس حیثیت سے اردو کی تاریخ میں انھیں جو مقام حاصل ہوا، وہ لافانی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ اردو اپنے ایک سچے عاشق اور ایک جانباز سپاہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ اب جب بھی اردو کی بات ہوگی، اردو تحریک کی بات ہوگی اردو کے کاز کا سوال اٹھے گا پنڈت سندر لال کی یاد ضرور آئے گی۔ ادارہ نیا دور اس عظیم مجاہد آزادی، اردو کے بے لوث پرستار، گنگا جمنی تہذیب کے پیکر اور سیکولر قدروں کے علمبردار کی یاد میں اپنا سر خم کرتا ہے اور انھیں اپنا پرخلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

مختار احمد مکی
کریم کالج آف ایجوکیشن
ساکچی جمشید پور، (بہار)

علامہ اقبال اور کشمیر

شیخ عبداللہ علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوے فرماتے ہیں کہ "ساری دنیا انھیں ایک عظیم شاعر اور عظیم تر فلسفی کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔ جو اپنے ہم آہنگ لب و لہجہ اور آواز کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وہ عالم انسانیت کے شاعر ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ اس لیے ان کی شاعری اور شخصیت کو جغرافیہ کے قید خانوں میں محبوس نہیں کیا جا سکتا وہ ساری دنیا کی میراث ہیں اور ان پر ساری دنیا کا حق ہے۔ لیکن مجھے اس خودغرضی کے لیے معاف کیجیے کہ میں ان کی ذات پر کشمیر کے حق کو فائق اور اوّل سمجھتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ علامہ کے آبا و اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا اور انھوں نے اپنے کشمیری نژاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ وہ کشمیر کے سچے عاشق، اہلِ کشمیر کے سچے دوست، ہمدرد اور ان کی آزادی کے بہت بڑے علمبردار اور انکی غریبی اور غلامی کے ماتم گسار اور مطلق العنانیت کے خلاف ہماری جد و جہد میں شریک کار تھے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ کشمیر کے سچے عاشق اور ثنا خواں تھے۔ کشمیر کی سیاسی زندگی پر جہاں ہمیں پنڈت نہرو کا گہرا اثر ملتا ہے وہیں علامہ اقبال کے فکر و شخصیت کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ نیشنل کانفرنس کی ہمہ گیر تشکیل میں علامہ اقبال کے مشورے شامل تھے اور ان کے ہی مشورہ پر مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر کے درد کو محسوس کر کے بہت پہلے ہی سے اس کی آزادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے اور اگر انہیں کسی دن کا انتظار تھا تو بس اس دن کا جب حریت پسند کشمیری عوام باطل کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر اپنی آزادی و خودمختاری کو حاصل کریں اور کشمیری عوام دیوانہ وار عروسِ آزادی کے حصول کے لیے اپنا تن من دھن سب نچھاور کر دیں۔

علامہ اقبال کو کشمیر سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں کشمیر میں جب حصول آزادی تحریک شروع ہوئی تو محکوم و مظلوم قوم کے افراد باطل کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ غلامی کی زنجیر کو توڑ کر آزادی کے متوالوں میں خودی اور خود آگہی کا تصور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں اقبال خاموش کیونکر رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے اندر صرف ایک شاعر کا دل ہی تو نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے ہمدرد، مصلح حریت پسند اور انقلابی ذہن بھی تو پایا تھا۔ آخر وہ کیونکر خاموش تماشائی بن جاتے؟ آزادیٔ کشمیر کے متوالوں کے لیے جب لاہور میں کشمیر کمیٹی تشکیل دی گئی تو علامہ دامے، درمے، قدمے اور سخنے مدد و مشورہ کے لیے حاضر تھے۔ وہ نہ صرف اس کے ایک سرگرم رکن ہی تھے۔ بلکہ اس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ انہیں دنوں علامہ نے "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیر کا بیاض" کے نام سے

انیس نظمیں بھی لکھیں جو ۱۹۳۷ء میں پہلی بار "ارمغان حجاز" میں شائع ہوئیں۔ ان تمام نظموں میں علامہ نے کشمیریوں کو حریت کا پیغام دیا ہے ساتھ ہی انھیں زندگی کے اعلیٰ حقائق سے بھی روشناس کرایا ہے۔

ملازادہ ضیغم ایک فرضی نام ہے۔ ضیغم سے مراد شیر ہے۔ علامہ کے پیش نظر کشمیریوں میں شیروں کی صفات پیدا کرنا تھا تاکہ ان کی رسائی آزادی کی دیوی تک ہو سکے۔ لولابی سے مراد وادیٔ کشمیر کے ایک خاص خطۂ سرزمین سے ہے۔ جو ایک وسیع، زرخیز اور مردم خیز علاقہ ہے۔ جہاں علماء و صلحاء کی ایک کثیر تعداد کی پیدائش ہوئی ہے۔ حضرت انور شاہ کشمیری اور وادی کے دوسرے بزرگوں کی مناسبت سے انھوں نے خود کو ملازادہ کے قلمی نام سے روشناس کرایا ہے۔

ان تمام نظموں میں انھوں نے جہاں وادیٔ لولاب یا وادیٔ کشمیر کی زبوں حالی پر ماتم کیا ہے وہیں انھوں نے کشمیر کی زرخیزی، مردم خیزی، حسن و شادابی، پاکیزگی و صفائی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جہاں کے چشمہ مثل سیماب رواں دواں ہیں۔ جب وہ کشمیر کے درخشاں ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں جبکہ کبھی کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جب یہ اپنی نفاست ذہانت، دانشمندی، تہذیب و شائستگی کی وجہ سے ایران کا مقابل و ہمسر تھا تو ان کی نظر صرف درخشاں ماضی تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ حال کو بھی دیکھتے ہیں جبکہ ۱۹۳۰ء میں رسوائے زمانہ بیع نامہ امرتسر کے تحت کشمیر کا سودا ہوا تھا۔ تو ان کے اندر کا حریت پسند انقلابی شاعر چیخ اٹھتا ہے۔

باد صبا اگر بہ جینوا گذر کنی
حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گو

دہقان کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ظاہر ہے۔ وہ کشمیر کے حال سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن وہ اس کے مستقبل سے مایوس بھی نہیں تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ کشمیر کا درخشاں ماضی لوٹ کر ضرور آئے گا۔

جس خاک کی ضمیر میں ہے آتش چنار!
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ آتش خاک ارجمند

علامہ کے پاس ان مصائب و آلام کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہی نہ تھی۔ بلکہ ان داستانوں کا حل بھی تھا۔ انھیں وہ ترکیب معلوم تھی جس سے اس مظلوم و محکوم اور مجبور قوم کو آگے بڑھا سکیں۔ ان میں جذبۂ خودی پیدا ہو سکے۔ پھر وہ ایک آزاد اور زندہ قوم کی مانند زمانہ میں سرخ رو ہو کر جی سکیں۔ وہ اکبر آلہ آبادی کے مانند موجودہ زمانہ کے لیے صرف طنز کا سہارا نہیں لیتے اور نہ ہی الطاف حسین حالی کی طرح صرف درخشاں ماضی کے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک تابناک مستقبل کے لیے سرگرم جہد ہیں۔ جہاں وہ حال کا رونا روتے ہیں وہیں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی حالت ایسی کیونکر ہوئی اور اب وہ اس سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ انھیں کشمیریوں کی صلاحیت پر اعتماد کامل ہے۔ ہاں اگر انھیں انتظار ہے تو اس دن کا کہ

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

ملازادہ ضیغم کولابی کشمیری کی بیاض کی پہلی نظم میں علامہ نے وادیٔ کشمیر کے خداداد حسن کا تذکرہ کیا ہے۔ جہاں حسن فطرت کی فراوانی سے مرغان سحر نغمہ سرائی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں کے عوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر علماء و صلحاء ان کے اندر ولولہ آزادی کو پروان نہ چڑھا سکیں اور نماز سربلندی کا جذبہ پیدا نہ کر سکے تو یہ دین نہیں بلکہ پیام موت ہے۔ آخر مبنر و محراب سے روح میں ایک ولولہ اور امنگ کیونکر پیدا نہیں ہوتا؟ اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں کہ نوائے جگر سوز۔ ساز پر موقوف ہے اور اگر ساز کے تار ڈھیلے ہیں تو، مضراب بیکار محض ہے۔

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب

لیکن یہ تار ڈھیلے کیوں ہیں؟ اس کی وجہ ان کی نظر میں مسیح

رہنماؤں کا فقدان ہے۔ مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری بہت حد تک ملا اور صوفی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن خود ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ ملا کی نظر نورِ فراست سے خالی ہے۔ جہاں ایمان کا رنگ پیدا نہیں ہوتا اور صوفی کے میخانہ کی شراب میں نشہ ہی باقی نہ رہا کہ جہاں حاضری دینے پر عشقِ رسول (سوز) پیدا ہوتا۔

دوسری نظم میں علامہ نے غلامی اور خودی کے درمیان فرق کو ظاہر کیا ہے۔ ان کی نظر میں غلامی بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جو طبعی موت سے مختلف ہے۔ لیکن اس سے بھی بدتر جہاں انسان بظاہر زندہ تو ہوتا ہے لیکن مردوں سے بدتر۔

اپنی تیسری نظم میں علامہ کو حیرت ہے کہ آخر انقلاب زمانہ بھی کیا چیز ہے کہ کشمیر جو اپنی نفاستِ ذہانت، دانشمندی، تہذیب و شائستگی کی وجہ سے۔ ایران کے ہم پلہ تھا اور جس کو لوگ بجا طور پر ایران صغیر کہتے تھے۔ آج خود ہی محکوم و مجبور و فقیر ہے۔

وہ اقبال جو تقدیر کو خود بدل دینے کے قائل ہیں انتہائی مایوسی و پریشانی کے عالم میں گویا ہیں کہ یا خدا اہل کشمیر کی مصیبت اور ذلت کی انتہا ہو گئی۔ اب تو ان کو ان مصائب سے نجات دیدے۔

چوتھی نظم میں علامہ کا اشارہ ایک آفاقی کلیّہ کی جانب ہے کہ آخر صبر کی انتہا ہوتی ہے۔ جب غلام قوم زندگی سے عاجز آجاتی ہے تو اس کے اندر آزادی کا جذبہ شدت سے موجزن ہوتا ہے۔ اور اس کا ضمیر ہر قسم کے وساوس اور تشکیک کو پس پشت ڈال کر ایک لائحۂ عمل متعین کر لیتا ہے۔ اور اس قوم کے افراد یک دل، یک جان و یک آہنگ ہو کر باطل کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور ان کی ضربِ پیہم سے ملوکیت کا بُت پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اپنی پانچویں نظم میں علامہ نے کشمیری مسلمانوں کی ۱۹۳۰ء کی جد و جہدِ آزادی کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ کشمیری مسلمانوں نے متحد ہو کر ظالم حکمران کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ کی قوت فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کی غلامی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ قوم جو شاید شورِ قیامت سے بھی بیدار نہیں ہوتی آج ظالم سے نبرد آزما ہے۔

نفرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگ اسرافیل کا محتاج

مدافعت کی یہ صلاحیت دیکھ کر حکمراں طبقہ بھی انگشت بدنداں ہے کہ یہ گڈریے کا دل رکھنے والے شیروں کے مانند دہاڑ کیوں رہے ہیں وہ حیرت زدہ ہیں کہ کیا یہ وہی کشمیری ہیں جو غلامی پر قانع تھے یا کوئی اور ہی قوم ہے۔ آخر ان میں شاہین کی صفت خصوصیت کیونکر پیدا ہو گئی۔

دراج کی پرواز میں ہے شوکت شاہین
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج

چھٹی نظم میں علامہ نے اس بنیاد کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ حریت روحانی ترقی کے لیے بمنزلہ سنگ بنیاد ہے اگر سالک میں حریت کاملہ پیدا نہیں ہوتی تو وہ کسی قسم کی روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔

ساتویں نظم میں علامہ نے موجودہ ملاؤں اور صوفیوں کی ذہنیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ ان میں رہبانیت کا جذبہ پروان چڑھتا جا رہا ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ وہ مسلمانوں کو نماز روزہ کے مسائل تو سمجھا دیتے ہیں لیکن اس انداز میں کہ لوگ دنیا کو چھوڑ دیں۔ ان میں دنیا سے نفرت کا جذبہ پروان چڑھے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے ایسا انقلاب جو ان کو خانقاہوں اور درگاہوں سے نکال کر باطل کے مقابلہ میں صف آرا کر دے۔ کیونکہ خانقاہ کی تعلیم میں مایوسی ناکامی اور رنج و الم کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اگر رہبران قوم کا یہی حال رہا تو امت و ملت کا شیرازہ یقیناً بکھر جائے گا۔ دوسری طرف ملوکیت کے علمبردار مسلمانوں کو غلام بنانے کے لیے تمام تر حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ علامہ کو تعجب ہے کہ آخر کشمیری اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کیونکر نہیں کرتے ؎

چہ بے پرواگذشتند از نوائے صبحگاہ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

آٹھویں نظم میں اقبال نے کشمیری مسلمانوں کو دل کی ماہیت اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے کہ دل محض گوشت کا لوتھڑا یا بدن کا ایک عضو ہی نہیں بلکہ غیر مادی جوہر ہے جس کی بدولت انسان کے اندر تسخیر کائنات کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ شمس و قمر کی گردشیں متعین ہیں۔ لیکن انقلابات زمانہ مادی قوانین کے پابند نہیں پھر جس خاک کی ضمیر میں آتش چنار کی تیزی و شدت ہے وہ خاک ارجمند کیونکر سرد ہو سکتی ہے۔

اپنی نویں نظم میں علامہ نے عشق کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے کہ عشق و عقل میں ہمیشہ رسہ کشی جاری رہی ہے۔ لیکن ابھی تک عقل کسی بھی مسئلہ کو سلجھانے میں ناکام رہی ہے۔ اس کے برعکس عشق کسی بھی لائحۂ عمل کو فوراً ہی متعین کر لیتا ہے۔ سہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

اس نظم میں گفتگو لالہ و گل کی زبانی ہے۔ جو زندگی کی اصلیت کو ظاہر کرتی ہے کہ آخر زندگی کیا ہے؟ خود ہی اس بات کا جواب دیتی ہے۔ کہ زندگی شب و روز کے جاری رہنے کا نام نہیں اور نہ ہی زندگی فرائڈ کے نظریۂ مستی اور مارکس کے نظریہ نیم خوابی کا نام ہے بلکہ زندگی اپنے اندر غور و فکر کا نام ہے اپنی آگ میں جلنے کا نام جو صرف عشق کی بدولت سینہ میں روشن ہو سکتی ہے یعنی زندگی کسی نصب العین کے حصول میں ہمہ تن کوشاں رہنے کا نام ہے اور اگر نصب العین کے حصول کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے تو مانند آفتاب وہ سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر سکے گا۔

نہیں زندگی سلسلہ روز و شب
نہیں زندگی مستی و نیم خوابی

حیات ست در آتشِ خود تپیدن
خوش آں دم کو این نکتہ را بازیابی

اگر ز آتش دل شرارے بگیری
تواں کرد زیر فلک آفتابی

علامہ اقبال اپنی دسویں نظم میں آزاد و محکوم کے درمیان موازنہ کرتے ہیں ان کے خیال میں آزاد کی شخصیت پتھر کی طرح سخت و مضبوط ہوتی ہے۔ نتیجتاً مخالف قوتیں خودی کی صلابت کی بنا پر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ جبکہ محکوم کی خودی ضعیف ہوتی ہے۔ یا تو وہ مقابلہ نہیں کرتی اور اگر کرتی بھی ہے تو مغلوب ہو جاتی ہے۔ غلامی کی وجہ سے محکوم کا دل مردہ و افسردہ ہوتا ہے نہ اس میں تسخیر کائنات کا جذبہ ہی پیدا ہوتا اور نہ ہی سروری کی خواہش۔ اس کے برعکس آزاد کا دل زندہ ہوتا ہے اس میں دنیا کو فتح کرنے کا ولولہ موجزن ہوتا ہے اور وہ مسرت و شادمانی سے معمور ہوتا ہے۔

اپنی گیارہویں نظم میں علامہ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں میں بڑی صلاحیتیں مخفی ہیں اور وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں لیکن ان تمام خوبیوں پر غلامی نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ علامہ کو کشمیریوں میں حضرت موسیٰ جیسے مردِ مومن و کامل کا انتظار ہے۔ جو بنی اسرائیل کے مانند کشمیریوں کو غلامی کے تاریک غار سے نکال سکے۔ سہ

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندہ درویش
کہ جس فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

بارہویں نظم میں وہ کشمیری مسلمانوں کو اس بنیادی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ اگر زندہ قوم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تغیر و انقلاب پیہم کی بدولت اس دنیا میں بڑے بڑے معرکے انجام دیے ہیں اس لیے وہ قوم جو دنیا میں ترقی کی آرزومند ہو اس کو جمود و سکوت کی زندگی کو ترک کرنا پڑے گا۔ دنیا میں انقلاب لانے کے لیے خود ان کے اندر ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ ملا اور صوفی جب خود اپنے اندر انقلاب برپا نہیں کر سکتے ہیں۔ تو شاعر ولر کے کنارے محو انتظار ہے کہ دیکھیں آخر کب کشمیریوں میں حصول آزادی کا جذبہ

موجزن ہوتا ہے اور کب وہ آزادی کے لیے انقلاب کا راستہ اپناتے ہیں۔ سہ

سمال کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

اپنی تیرھویں نظم میں علامہ نے زندہ و مردہ قوم کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ بقول علامہ زندہ قومیں اپنی تقدیر کو بدل دینے پر قادر ہیں۔ زندہ قوموں سے ان کی مراد ایسی قومیں ہیں جو دنیا میں حکمرانی کی طالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان تمام علوم میں ماہر ہیں جس سے وہ قوانین فطرت کو جان سکیں تاکہ ان طاقتوں کو تسخیر کر سکیں۔ ان کی زندگی میں بھلائی، فلاح و صداقت موجود ہے جو حکمرانی اور سرداری کی شرط اولین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت بھی ان کی معمولی فروگذاشت اور لغزشوں کو معاف کر دیتی ہے۔ ان زندہ قوموں میں قلندرانہ جمال اور سکندرانہ جلال پایا جاتا ہے۔

چودھویں نظم میں علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ زمانہ کے قدم بقدم چلتا رہے۔

مومنانہ طریقہ تو یہ ہے کہ اصول کی پابندی ہو اور قانون خداوندی پر عمل خواہ زمانہ مخالف ہو یا موافق۔ کیونکہ مومن زمانہ کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ زمانہ اس کا پابند ہوتا ہے۔

مسلمانانِ عالم کے روحانی و عقلی انحطاط پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر ان اسلامی مدارس کو کیا ہو گیا ہے جہاں سے علماء و فضلاء کی کثیر تعداد پیدا ہوا کرتی تھی۔ گو اب بھی یہ اسلامی مدارس موجود ہیں لیکن ان میں حضرت جنید بغدادیؒ جیسے ... صاحب معرفت بزرگ پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی امام غزالی اور امام رازی جیسے ارباب علم و حکمت۔

آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ میرے قبضہ میں نہ کوئی سمرقند ہے اور نہ بخارا جس کو محبوب قوم کی نذر کر سکوں۔ ہاں اگر میں کچھ کر سکتا ہوں تو صرف یہ کہ ان کے لیے دعائے خیر کروں کہ خدا ان کو پھر دنیا میں سربلندی عطا کرے۔

اپنی پندرھویں نظم میں انھوں نے اہل مغرب و مشرق کے فرق کو ظاہر کیا ہے کہ مادہ پرست ہونے کی وجہ اہل مغرب کی ذہنیت تاجرانہ ہے یا دنیا دارانہ ہے۔ جبکہ اہل مشرق ترک دنیا کی طرف مائل ہیں۔ کیونکہ یہ مادی دنیا سراسر دکھ، تکلیف اور کلفت کا نام ہے۔ یہ زاویہ نگاہ مغرب کی ضد ہے۔ کیونکہ مغربی اقوام کا مقصدِ حیات حصولِ دنیا ہے۔ جبکہ مشرقی عوام کا مقصد حیات ترک دنیا۔

یہ دونوں نقطۂ نظر علامہ کی نظروں میں غلط ہیں۔ اس لیے وہ ایک درمیانی راستہ جو اسلام نے صراط مستقیم کے نام سے پیش کیا ہے۔ اپنانے کی تلقین کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا بری چیز نہیں جس سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کا حصول مقصدِ حیات ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف نجات کی فکر ضروری ہے لیکن ضروریات زندگی ترک بھی نہیں کی جا سکتیں۔

مسلمان کے لیے تقدیر پر قناعت اور عمل سے اجتناب باعث گمراہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ سہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی یا خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

سولہویں نظم میں وہ باشندگان کشمیر سے خصوصی طور پر مخاطب ہیں کہ تمھیں اپنی داستان ظلم و ستم سنانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں ان سے خوب اچھی طرح واقف ہوں اور اسی آگاہی کے باعث میرا دل گل و لالہ کی طرح خون ہو رہا ہے آخر یہ قدرت کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ ہنرمند لوگ جو بہترین قسم کے دوشالہ تیار کر کے مالداروں کو دیتے ہیں وہ خود ہی موسم سرما میں برہنہ ہیں

سترھویں نظم میں جو صرف ایک شعر پر مشتمل ہے علامہ فرماتے ہیں کہ جب قوم میں یا افراد میں خود آگاہی نہ خودی کی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے تو نہ صرف ان پر شہنشاہی کے راز کھل جاتے ہیں بلکہ اس پر خود فراموشی کی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے

کافر ہے تو، کرتا ہے شمشیر پر بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

علامہ اقبال مسلمانوں میں خاص طور پر کشمیری مسلمانوں میں ایسی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے کہ ... ان پر ان کی خودی کا راز آشکار ہو اور وہ مردانہ وار میدانِ کارزار میں بے خطر دادِ شجاعت دیتے نظر آئے۔ ؎

خود آگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی

علامہ کی اٹھارہویں نظم بھی ایک شعر پر مشتمل ہے جس میں علامہ اقبال کشمیریوں سے خصوصاً اور دنیائے اسلام سے عموماً مخاطب ہیں کہ اگر تو حقیقت میں اپنے اسلاف کی طرح حکمرانی کا آرزومند ہے تو پھر جدِّ امجد کی طرح اپنے بازو پر بھروسہ کرکے میدانِ عمل میں کود جا اور اس کے لیے صحیح علم حاصل کر کیونکہ اللہ نے مسلمانوں کو دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور خلیفہ وہ ہے جو غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے بلکہ اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ساری دنیا کو قانونِ خداوندی کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے۔

انیسویں نظم کے ذریعہ علامہ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل آخری بار اپنی قوم کے سامنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے جس نے انھیں کامل تیس برس تک مثلِ سیماب بے چین رکھا۔ بالِ جبریل کی دوسری نظموں میں بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

اثر کرے نہ کرے سن تو میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

ملت کی تباہی و بربادی کے مناظر نے انھیں جس طرح بے چین کر رکھا ہے اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں۔

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

★

خضر برنی
ایڈیٹر پندرہ روزہ ہمدرد
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

غزل

اک لطف بات بات میں جانے کب آئے گا؟
یہ دن مری حیات میں جانے کب آئے گا؟

وعدہ خلاف جوش میں وعدہ تو کر گیا
میں منتظر ہوں رات میں جانے کب آئے گا؟

دُلہا بنا ہوں سر پہ اٹھا کر چلے ہیں دوست
اک بے وفا برات میں جانے کب آئے گا؟

دار و رسن ہوں جس کے لیے بیقرار خود
وہ رنگ حادثات میں جانے کب آئے گا؟

مدت سے اپنے جیب و گریباں ہیں تار تار
دامن کسی کا ہات میں جانے کب آئے گا؟

ہو جائے دیکھتے ہی جسے موت بھی نثار
وہ رنگ مری ذات میں جانے کب آئے گا؟

گذرے ہیں جو مصائب و آلام اے خضر
یہ ذکر واقعات میں جانے کب آئے گا؟

نازش پرتاپگڈھی
بیگم وارڈ۔ پرتاپگڈھ

بازار

بول، اے شاعر! اے نغمہ گر
بیچے گا۔ فن کو بیچے گا؟
بول، اپنے دھن کو بیچے گا؟
اپنے شہ پارے بیچے گا۔ اپنی تحریریں بیچے گا
نظموں میں جو ڈھلتی رہتی ہیں کیا وہ شمشیریں بیچے گا؟
یہ اپنی برہنہ گفتاری۔ یہ شعلہ بیانی بیچے گا
یعنی جو ترے لفظوں میں ہے خنجر کی روانی، بیچے گا؟
ڈھلتا ہے جو تیرے خوابوں میں وہ رنگ بہاراں بیچے گا
پلتا ہے جو تیرے سینے میں وہ خونیں طوفاں بیچے گا؟
جو پردۂ مستقبل میں ہیں کیا وہ تنویریں بیچے گا
جن انسانوں کو جگاتا ہے ان کی تقدیریں بیچے گا؟
فن کی تاثیر کو بیچے گا؟
بیچے گا۔ ضمیر کو بیچے گا
بول اے شاعر! اے نغمہ گر!
ہم نکتہ دانِ فکر و نظر
ہم قدر شناس علم و ہنر
تیری خدمت کا صلہ دیں گے، تیری محنت کا ثمر دیں گے
جیون کی اندھیری راتوں میں زر کا اُجالا کر دیں گے
چاندی کے کھنکتے سکوں سے ہم تیری جیبیں بھر دیں گے
بول اے شاعر! کیا کہتا ہے
تو کس دنیا میں رہتا ہے؟
اے نغمہ گر!
اِن سوکھے ہاتھوں سے فن کا ایوان سجائے گا کیونکر

فاقوں کے اندھیرے میں رہ کر شہ کار بنائے گا کیونکر ؟
افلاس کے عالم میں کیوں کر تو رنگیں غزلیں لکھے گا
روٹی کو ترستا رہتا ہے کیا کھا کر نظمیں لکھے گا ؟
جینا ہو جو اس دنیا میں تو پھر بازار میں آ۔ دوکان لگا
کچھ دام و درم کی باتیں کر ۔ بکنے والا سامان سجا
ہاں بیچ دے اپنی جرأت کو آجائے گی چہرے پر سرخی
ہاں بیچ قلم کی طاقت کو ورنہ یہ تجھے لے ڈوبے گی
اس ایک قلم کا ذکر ہی کیا انسان خریدے ہیں ہم نے
مذہب کے دام چکائے ہیں، ایمان خریدے ہیں ہم نے
ہر شے نیلام پہ چڑھتی ہے وہ دھرتی ہو یا اوج فلک
ہر چیز یہاں بک جاتی ہے مٹی سے لے کر ملک تلک
لا ۔ تو بھی اپنا مال دکھا، دیکھیں ترے پلے میں کیا ہے
کچھ خودداری، کچھ بے باکی، کچھ حق گوئی خیر۔ اچھا ہے
جلدی سے یہ سب کچھ بیچ بھی دے دام ان کا گرنے والا ہے
کل کوئی نہ ان کو پوچھے گا
سنہ وقت ابھی کر لے سودا۔ بیچ آدنے پونے یہ کوڑا
موقع ہے یہی روشن کر لے مستقبل اپنے بچوں کا
اے احمق انساں ہوش میں آ، کچھ عقل و خرد کی باتیں کر
بے فیض نہ اپنی محنت کر ۔ برباد نہ اپنی راتیں کر
کچھ دھوکا دے، کچھ گھاتیں کر
اے نغمہ گر!
بیچے گا۔ خود کو بیچے گا ؟
ہم تیرے خریدار آئے ہیں
بول ۔ اپنی قیمت کیا لے گا ؟

★

صابر حسین صابر سنبھلی
شعبۂ اردو،
مہاراجہ ہریش چندر کالج، مرادآباد

فرخ قادری نگینوی کی غزل گوئی

کیا عجب باقی رہے کچھ فکر و غم کی یادگار
میرا ہر اک شعر ہے میرے قلم کی یادگار (فرخ)

اُردو کا شاعر ہونے کے لیے غزل گو ہونا اگرچہ ضروری تو نہیں ہیں مگر کچھ ایسی روایت قائم ہو گئی ہے کہ جس نے اُردو شاعری کی اس نے غزلیں ضرور کہیں۔ زیادہ تر شعراء کی شعر گوئی کی تو ابتدا ہی غزل گوئی سے ہوتی ہے۔

ہر چند کہ فرخ صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا قصیدہ نگاری سے کی۔ مگر رواجِ زمانہ کے مطابق غزل کی طرف بھی توجہ دی۔ رواجِ زمانہ کی بات اس لیے کہی گئی کہ غزل گوئی کے لیے دل میں عشق و محبت کا جوش ہونا ضروری ہے مگر ان کی بعض تحریروں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل کم از کم اس عشق و محبت سے خالی تھا جو تڑپتی ہوئی یا تڑپا دینے والی غزلیں شاعر سے کہلواتا ہے۔ مگر چونکہ شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے اس لیے اچھی خاصی غزلیں کہہ گئے اور کافی تعداد میں کہہ گئے۔ ان کے دیوان کا جو مخطوطہ میرے پیشِ نظر ہے اس میں کل ملا کر چھ سو سات غزلیں ہیں۔ جن میں سات ہزار نو سو چھیالیس شعر ہیں۔ الف سے لے کر یے تک کوئی ردیف نہیں چھوڑی ہے۔ بلکہ یائے معروف اور یائے مجہول کی غزلیں الگ الگ درج ہوئی ہیں۔

پیشِ نظر مخطوطہ حدیثِ محبت بڑے سائز کے ۵۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ "چراغِ محفل" (دیوانِ غزلیات) اور شمعِ بزم (مجموعہ منظومات) ایک ہی جگہ مجلد ہیں۔ چراغِ محفل شروع میں چھ صفحے کا اور شمعِ بزم کے شروع میں ایک صفحے کا مقدمہ بہ عنوان التماس مصنف شامل ہے۔ پورا مخطوطہ سیاہ روشنائی سے قلم بند ہوا ہے کہیں کہیں نیلی روشنائی بھی نظر آجاتی ہے۔ الفاظ کا املا روایتی ہے۔ بعض الفاظ اور حروف میں بہت جگہوں پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔ جیسے ھ اور ھ، ایک اور اک، میں میرے اور مرے میں۔ لفظوں کو ملا کر بھی لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ نقطے اور مرکز بھی جا بجا چھوٹ گئے ہیں جو یقیناً عجلت اور کبر سنی کا نتیجہ ہیں۔ تحریر صاف اور سڈول ہے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ زیادہ غلط ہو جانے کے سبب بہت جگہ الگ سے کاغذ کے ٹکڑے چپکا کر ان پر دوبارہ لکھا گیا ہے۔

اشعار کی ترتیب میں عجلت یا مصروفیت کے سبب توجہ اور احتیاط سے کم کام لیا گیا ہے۔ بہت جگہ مطلعے بھی بیچ بیچ میں آ گئے ہیں۔ کسی کسی غزل میں ایک سے زاید مطلعے بھی موجود ہیں۔ کہیں کہیں قوافی کی مسلسل تکرار بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ کسی کسی ردیف میں ایک سے زیادہ غزلیں بھی ہیں اور کہیں کہیں مسلسل ہی ایک ہی زمین میں بھی غزلوں کی تکرار موجود ہے جن کو بجا طور پر دو غزلے کہا جا سکتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح قافیہ پیمائی بھی ہے۔ ایسا طویل غزلوں میں ہوا ہے۔ ادق زمینوں میں کہیں کہیں ردیفیں بے کار ہو گئی ہے۔ جیسے ؎

دس گنا ان کے ستم ہو گئے بڑھتے بڑھتے
ایک دو جرم پہ دیتے ہیں سزائیں دس بیس

ڈھل گیا حسن مگر پھر بھی نہ چھوٹا مجھ سے
ابھی باقی ہیں ستمگر میں ادائیں دس بیس

یہ بھی بیمار محبت پہ ہے احساں ان کا
بھیجدیں لے کے طبیبوں سے دوائیں دس بیس

ظاہر ہے کہ دس بیس ردیف کی خانہ پُری کرتا ہے ورنہ اس لفظ کا کوئی محل اس جگہ نہیں تھا۔ لیکن ایسی فروگذاشتیں خال خال ہی ہیں جن سے فرخ صاحب تو کیا کوئی بھی شاعر محفوظ نہیں رہا ہوگا۔

غزل گوئی میں سب سے بڑا مسئلہ مضامین غزل کی آمد کا ہے۔ قدما نے قریب قریب سبھی مضامین ادا کر دیے اس لیے نئے مضامین کی تلاش کار دشوار ہے۔ شعرا نے اس کا حل نکالا ہے کہ قدیم مضامین کو نیا پیرایہ بدل کر نظم کر دیتے ہیں۔ فرخ صاحب کے یہاں بھی ایسے کافی اشعار مل جاتے ہیں۔ جن میں یا تو بالکل اچھوتے مضامین بیان کیے گئے ہیں یا تبدیل پیرایہ سے وہ کسی کی نقل یا تکرار نہیں معلوم ہوتے مثلاً ؎

دیوانۂ الفت کو بے کار نصیحت ہے
دشوار ہے رک جانا بہتے ہوئے پانی کا

سایۂ طوبیٰ کو ہم اوڑھیں بچھائیں کیا کریں
چاہیئے عشاق کو سایہ تری دیوار کا

اللہ اللہ کفر کو کتنی بلندی ہے نصیب
حافظ قرآں ہے ہر تل ترے رخسار کا

ہوا ایام طفلی سے ہی ثابت سنگدل ہونا
کھلونا مانگتا ہے وہ بت بے پیر پتھر کا

آبلہ سوز محبت سے پڑا دل کے قریب
ایک دل کو رو رہا تھا دوسرا دل ہو گیا

اس مضمون کو دوسری جگہ عمدہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ ؎

اے خدا سینے میں کیا ہے دوسرے دل کی بِنا
آبلہ سا اک نظر آتا ہے میرے دل کے پاس

اے فشارِ قبر جو چاہے اذیت دے مجھے
ہاں بچا نا دل کو اس میں ہے مرے قاتل کا راز

بچ گئے ہیں مصلحت سے دیدۂ خونبار کی
چند قطرے خون کے موجود ہیں اب دل کے پاس

اپنے ہی دامن سے کب ممکن ہے تکمیل جنوں
چاہیئے کچھ تار کھینچیں دامن قاتل سے ہم

کھولنے دے گی نہ لب اس کی محبت حشر میں
شکوۂ قاتل کریں گے کس طرح کس دل سے ہم

مشکل زمینوں میں غزلیں کہنا ہمیشہ سے ہی قادر الکلامی کی دلیل رہی ہے۔ ہر بڑے شاعر نے ادق زمینوں کو اختیار کیا ہے۔ اور دیوانوں کی تکمیل کے لیے یہ ناگزیر بھی ہے۔ بعض ردیفیں ایسی ہوتی ہیں جن میں شعر کہنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ شعرا اپنی دقت پسند طبیعت سے مجبور ہو کر مشکل ردیفوں کو لے کر زمین کو اور بھی سخت بنا لیتے ہیں۔ کہیں یہ اپنی قادر الکلامی کے اظہار اور کہیں کہیں معاصرین شعرا کی دعوتِ طبع آزمائی کے سبب ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ جتنی مشکل زمین ہوتی ہے اتنے ہی اچھے شعر نکلتے ہیں۔ مگر یہ سب کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ قادر الکلام شعرا ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

حالی نے ردیف کو شعر کے پیر کی بیڑی کہا ہے جو رفتار کو سست کرتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی باندھ کر بھی ڈال دیتی ہے۔ مگر زیور کا کام بھی دیتی ہے۔ فرخ صاحب نے بھی اپنی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے یا رواجِ شعر کے مطابق بہت سی ادق اور مشکل زمینوں کو اختیار کیا ہے۔ چند نمونے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ؎

نہیں کچھ فکر دل رکھتا ہے وہ بے پیر پتھر کا
ہلا دیں گے کلیجہ نالۂ شبگیر پتھر کا

کبھی زعم ستم شمشیر قاتل بن کے آ چمکا
کبھی وہ باعثِ تسکین بسمل بن کے آ چمکا

خواب میں آ آ کے وہ چمکا گئے اکثر نصیب
زندگی میں بارہا جاگا ہے سو سو کر نصیب

لے رہا ہے اس طرح میرا مقدر ایچ پیچ
کھا رہا ہے جس طرح زلفِ معنبر پیچ پیچ
عکس روئے آتشیں سے ہو گیا گلزار سرخ
گل کی رنگین ہے قبا غنچے کی ہے دستار سرخ
اس لبِ شیریں سخن سے سن لیے دشنام تلخ
ہو رہی ہے اب حیاتِ عاشقِ ناکام تلخ

زلف اور دل میں چلی جاتی ہے کب سے چھیڑ چھاڑ
بڑھ رہی ہے بات کیوں ہے کس سبب سے چھیڑ چھاڑ
ایک دل دیکھے سبھی میں نے جفائیں دس بیس
جرم تھا ایک ملیں مجھ کو سزائیں دس بیس
درد عشق کی وہ داستاں طویل و عریض
کہ جیسے ہیں ورقِ دو جہاں طویل و عریض
جاتے ہیں ہم محفلِ دلدار تک بے روک ٹوک
وصل کے ہونے لگے اقرار تک بے روک ٹوک

ہر شاعر کے کچھ پسندیدہ موضوعات ہوتے ہیں جن کی تکرار وہ بارہا کرتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو بعض مخصوص الفاظ سے لگاؤ اور انس ہوتا ہے۔ جو دانستہ یا نادانستہ اس کی زبان اور قلم پر آتے رہتے ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ فرخ صاحب کو بعض الفاظ سے لگاؤ تھا مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انھیں بعض مضامین بہت پسند اور مرغوب تھے جن کا وہ بار بار اعادہ کرتے رہے ہیں۔

قیس اور لیلیٰ کی داستانِ عشق شاید مرحوم کو بہت مرغوب تھی۔ اس تلمیح کو انھوں نے بہت جگہ شعر کا قالب پہنایا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی اس داستانِ محبت کو جن اشعار میں انھوں نے استعمال کیا ہے اس میں سے چند اس طرح ہیں۔ ؎

دل قیس کے سینے میں آتا ہے نظر لیکن
ہوتا ہے گماں اس پر محمل ہے وہ لیلیٰ کا
کیوں خاک نہ چھانے اب یہ خاک بسر مجنوں
جلوہ نظر آتا ہے ہر ذرّے میں لیلیٰ کا

وہ ساری صحفِ رخسارِ لیلیٰ کی عبادت تھی
پڑھا تھا قیس نے جتنا دبستانِ محبت میں
بڑھتے بڑھتے ربطِ حسن و عشق نے انجام کار
تھا جو دل لیلیٰ کا اس کو قیس کا دل کر دیا
بزمِ ازل میں اے خدا سامنے سب کے طے ہوا
قیس کو کس نے دیدیا مجنوں کا خطاب تھا
تلاشِ تربتِ مجنوں میں لیلیٰ پا پیادہ تھی
غبارِ قیس اٹھا اور محمل بن کے آ نکلا
وہ بھی تیرے ناز کی زد میں شکستہ ہو گیا
ایک کاسہ تھا فقط لیلیٰ ترے سائل کے پاس
اس زمیں پر کیا غبارِ قیس تھا پھیلا ہوا
کیوں بگولے خاک کے اٹھنے لگے محمل کے پاس

ہماری شاعری میں حضرت منصور حلاّج کی صدائے انا الحق کی بازگشت ایک مدت سے سنائی دے رہی ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوا ہے جس نے اس تلمیح کو نہ اپنایا ہو۔ فرخ صاحب کا بھی یہ پسندیدہ مضمون ہے۔ کہتے ہیں ؎

مثلِ منصور شریعت کو نہ برہم کر تو
ہونہ رسوائے زمانہ رسن و دار سے بچ
جانے منصور نے کیا دیکھ لیا ہے فرخ
جان و دل سے ہے فزوں تر رسن و دار عزیز

حضرت منصور کی صدائے انا الحق کی طرح حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السّلام کی صدائے ربِّ ارنی اور جواب میں لن ترانی، یدِ بیضا، معرکۂ فرعون و کلیم، کوہِ طور، تجلّیِ ذاتِ باری وغیرہم ایسی چیزیں ہیں جو اردو شاعری کے موضوعات میں سے ہیں۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السّلام کی تلمیحات بھی ان کو پسند آتی ہیں۔ کہا ہے۔

اعجازِ کفِ موسیٰ پردہ ہے ترے رخ پر
منہ ڈھانپ لیا دے کر شہرہ یدِ بیضا کا
حجاب بے خودیِ موسیٰ پہ ڈالا واہ کیا کہنا
بلایا طور پر خود اور پردا درمیاں رکھا

فرخ صاحب کا ایک پسندیدہ مضمون خاص طور سے قابل
ذکر ہے رخِ محبوب کو قرآن اور خال، رخ یا زلفوں کو ہندو تصور
کرنا۔ یہ مضمون ویسے تو کئی جگہ آیا ہے مگر دو شعر پیش ہیں۔

آیۂ خالِ سیاہ حفظ ہے مجھ کو فرخ
کفر کا غلبہ ہے اور مصحفِ رخسار کی یاد

بکھری ہوئی زلفیں ہیں اگر عارضِ بت پر
ہم ہندی میں قرآن کی تفسیر کریں گے

ان کے علاوہ جو موضوعات، مضامین، تخصیات اور تلمیحات
ان کو پسند ہیں فرہاد و کوہکن، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف
علیہ السّلام، بازارِ مصر، خریدارانِ یوسف وغیرہم۔ جو ان کے دیوان
کے متعدد اشعار کا موضوع بنے ہیں۔

ہر چند کہ شاعری اخلاق تو نہیں مگر اخلاق اس کا موضوع ہمیشہ سے
رہا ہے۔ صوفیائے کرام کی شاعری کا مقصد ہی تزکیۂ نفس اور اصلاحِ
اخلاق تھا۔ اس موضوع نے غزل میں بھی اپنی جگہ بنا لی بلکہ قائم
کر لی ہے۔ فرخ صاحب چونکہ بہ حیثیت انسان خود اچھے اخلاق
کے حامل تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی غزلیات میں اخلاق کے
جزوی موضوعات پند و نصائح، ناپائیداری دنیا اور حقائق
زندگی وغیرہم کو جگہ دی ہے۔ جس سے ان کی غزلیات صرف
رندی و سرمستی کا منظوم دفتر ہی نہیں رہ گئی ہیں۔ نمونے کے چند
شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

دنیا کی جو دولت تھی دنیا پہ لٹا بیٹھے
کچھ فکر بھی ہے فرخ سرمایۂ عقبےٰ کا

آ گئے ریشِ سیاہ میں فرخ موئے سفید
رات گزری ہوش میں آؤ سویرا ہو گیا

مار کر شہواتِ نفسانی ہوائے دنیوی
اے فرشتو دیکھو انسان انساں ہو گیا

نہ فکر بیش و کم اس کو نہ سرد و گرم کی پروا
روانی میں سمندِ عمر ہے کیا تیز پا ہو کر

کیا دریائے ہستی پار جیسے بھی ہوا ممکن
مگر ہے عاقبت کا ایک بحرِ بیکراں ہونا

غم جو دیتا ہے وہ غم میں یاد آتا ہے ضرور
راحتیں دیتا ہے جو راحت میں کم آتا ہے یاد

کام آ جاتے ہیں جو وقتِ ضرورت فرخ
ساری دنیا سے ہیں بہتر وہی دو چار عزیز

حدیثِ محبت کے مخطوطے میں بطور پیش لفظ فرخ صاحب
رقم طراز ہیں ؎

"میں نے اب تک کوئی فارسی دیوان نہیں پڑھا۔ نہ
فارسی زبان جانتا ہوں اور نہ اردو دیوان میرے مطالعے
میں رہے۔ زمانہ طالب علمی میں جو ۱۹۱۲ء تک گزر رہا تھا
شعرا کے کلام درسی کتابوں میں پڑھ لیے تھے اور وہ بھی
۱۹۵۸ء تک جس میں یہ دیوان مرتب کیا گیا ہے اگرچہ
قطعی محو نہیں ہوئے تھے مگر دھندلے سے نشانات رہ گئے
تھے۔ کارِ سرکار اور سرکاری کام کی کشمکش، افکارِ
معیشت نے اتنا دم ہی نہ لینے دیا کہ استادوں کے
کلام پڑھوں اور سمجھوں۔"

(التماسِ مصنف)

یہ تو کیسے کہا جائے کہ فرخ صاحب کا مندرجہ بالا بیان غلط
یا کسی مصلحت پر مبنی ہے۔ مگر ان کے اشعار اس کی تصدیق نہیں
کرتے۔ جگہ جگہ شعرائے ماسبق کے بیان کردہ مضامین ان کے
اشعار میں اپنی جھلک دکھا رہے ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا
بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی استاد شاعر کے مشہور شعر کو سامنے
رکھ کر شعر کہا گیا ہوگا۔ اس بحث کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے
کہ مرحوم پر سرقہ کا الزام لگایا جا رہا ہے بلکہ ایک عام قاری کو
اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شعرائے ماسبق کے اشعار کا
شاعر نے کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کا عکس ذہن میں باقی
رہ گیا ہے جو فکرِ شعر کے وقت اپنی ہیئت تبدیل کر کے صفحۂ قرطاس
پر نمایاں ہو گیا ہے۔ اس کا بھی بہت قوی امکان ہے کہ یہ اشعار

توارد کا ہی نتیجہ ہوں۔ بہرحال ایسے چند اشعار مثالاً نذرِ قارئین کیے جاتے ہیں۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (غالبؔ)

صرف آنکھوں میں ہے دم اعضا کی جنبش ختم ہے
رکھے ہیں آگے مرے صہبا الگ ساغر الگ (فرخ)

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ (غالبؔ)

الٰہی عمر گزری ہے بے خودی میں تمام
مرے گناہ نہیں ہیں حساب کے قابل (فرخؔ)

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا (غالبؔ)

تو نے بھی زاہد کبھی دیکھی ہے جنت کی بہار
کوچۂ دلدار میں میرا گزر اکثر ہوا (فرخؔ)

آئی قضا تو لے کے چلی ساتھ خلد میں
پہنچا دیا نہ حیف مجھے کوئے یار میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گا حساب میں (غالبؔ)

دیکھے ہیں میں نے ہجر میں وہ بیشمار دن
ہوتے تھے ایک دن کے برابر ہزار دن (فرخؔ)

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دل
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے (غالبؔ)

فصلِ بہار دستِ جنوں چپ ہے المدد
مدت ہوئی کہ ہے چاک گریباں کئے ہوئے (فرخؔ)

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (غالبؔ)

پڑ رہے چپ اسے تسکین کی صورت سمجھے ہیں
نہیں ہے طاقتِ فریاد بیمارِ محبت میں (فرخؔ)

وہ یہ سمجھے اضطراب دل کا دعوا ہے غلط
دیکھ کر ان کو ہوا تھا کچھ سکون دل سے مجھے (فرخؔ)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالبؔ)

جوشِ وحشت نے دکھایا آہ کیا انقلاب
میں بیاباں میں ہوں گھر ہے بیاباں کی طرح (فرخؔ)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں (ناسخؔ)

زندہ دل رہنے کو ہوتی ہے مسرت کی بہار
مردہ ہو جاتے ہیں دل رہتے ہیں جو اکثر ملول (فرخؔ)

مژدہ عید ہے دیکھ تو کیا رنگِ چمن
گل کی رنگین ہے قبا غنچے کی رنگیں ہے مندیل (ذوقؔ)

عکسِ روئے آتشیں سے ہو گیا گلزار سرخ
گل کی رنگیں ہے قبا غنچے کی ہے دستار سرخ (فرخؔ)

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے (جگرؔ)

جا رہا ہوں سوئے منزل اپنے جذبِ شوق میں
میرا دل ہی دے رہا ہے رہبرِ کامل کا کام (فرخؔ)

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل (غالبؔ)

اک گلِ تر کے ہیں شیدا دونوں ہم اے بلبلو
آؤ مل کر کریں آہ و فغاں تم اور ہم (فرخؔ)

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا (آتشؔ)

گرچہ اک قطرہ خوں کا نہ نکلا
آبرو رہ گئی مگر دل کی (فرخؔ)

ایسے اشعار جن میں پیشرو شعرا کے مضامین کا عکس ہے۔ ان کی یہ کل تعداد نہیں ہے۔ نمونے کے یہ اشعار سرسری نظر میں

سامنے آ گئے ہیں۔ فرخ صاحب کے ضخیم دیوان میں تلاش کرنے سے ایسے اور اشعار بھی مل سکتے ہیں۔ مگر اس سے لازمی طور پہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ اشعار شعرائے ماسبق کے اشعار کا چربہ ہیں۔ ایسے توارد ات کے نمونے ہر شاعر کے یہاں مل جاتے ہیں حتیٰ کہ گم گو اور استاد شعرا بھی اس سے محفوظ نہیں رہ پاتے چہ جائے کہ فرخ جیسا بسیار گو۔

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ فرخ صاحب نے ابتدائی دور کے بعد کسی استاد سے باقاعدہ اصلاح لی یا نہیں یا فن شعر میں ان کے کچھ شاگرد بھی تھے یا نہیں جو ان کو استادی کے درجے پہ فائز کر دیتے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان کے دیوان میں استادانہ اشعار کی کمی نہیں ہے۔ نئے نئے مضامین کے ساتھ متعدد اچھے شعر کہے ہیں۔ حدیث محبت حصہ اوّل (چراغ محفل) میں جگہ جگہ ان کی شاعری کا رچا ہوا انداز جلوہ گر ہے جس کو بجا طور پر پختگی شعر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لیے چند اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

آئینہ دیکھ کے ہو جاتے ہیں مغرور حسیں
تیری ایجاد کی ہے تجھ سے سکندر فرہاد

دیدۂ نرگس کی صورت پل جھپکتی ہی نہیں
ایک تحیر کا عالم ہے یا تمہارا انتظار

خاک کو میری بگولوں میں اڑا کر رکھ دیا
ہائے تربت پہ پڑی کیا بادِ صرصر کی نظر

مجبور نہ کر کوچۂ دل دار نہیں دور
اے ضعف خدا کے لیے دو چار قدم اور

ہوش میں تھا یہ کبھی ظالم خدا کا خوف کر
تیرا دیوانہ ہے، دیوانے کو ہنس ہنس کے نہ چھیڑ

ایک میں ہوں کھا رہا ہوں بحرِ غم میں ڈبکیاں
وہ بھی ہیں جن کا سفینہ جا لگا ساحل کے پار

چاند سے چہرے پہ اپنے کیوں نہ اس کو ناز ہو
ایک جھلک ہے حسن کی تیرے سر کا ہالہ پاس

شرق سے تا غرب جگر کاٹتا ہے کس لیے
کس سے ملنے کا ہے تجھ کو ماہِ نو اشتیاق

ادھر تو رکھا ہے کیا ظالم یہ بات ہے
تیرے کوچے میں بھی آکر یہاں جاتا ہے دل

یہ کعبہ ہے، یہ بت خانہ، یہ مسجد ہے یہ میخانہ
خدایا مدعائے جستجو ہوگا کہاں حاصل

میں تو یہ سمجھا ہوں فرخ دل کی الجھن دیکھ کر
بل مری تقدیر میں ہیں، زلف پیچاں میں نہیں

پھینک دے ناحق تراشیدہ کوئی سوئے فلک
ہے ہلال عید کی تشویش خاص و عام کو

آئے وہ سب کے سامنے اور مجھ سے چھپ گئے
میں جانتا ہوں ناز ہے پردا نہیں ہے یہ

محشر میں نہ روکی جائے گی تم سے زباں میری
سنو گے اور تمہیں سننا پڑے گی داستاں میری

کیا مدد کرتے شریک حال ہو کر اقربا
ٹل گیا وقتِ مصیبت اک شکایت رہ گئی

جانے والے دل کی جانب اور مڑ کر دیکھ لے
رہ چکا ہے جس میں وہ اجڑا ہوا گھر دیکھ لے

اگر ہو امن تو زیرِ زمیں رہیں چل کر
حوادثات بہت زیرِ آسماں گزرے

کوئے جاناں سے ہوا آتی ہے فرخ جب کبھی
سانس لینے میں ہوا کرتی ہے آسانی مجھے

کیا سنائیں تجھے ہم کیا نہ سنائیں اے دوست
دیکھتے ہی تجھے سب ہجر کے غم بھول گئے

★

حسن کمال
دی تسٹ، ۵/۱۹۰ سینٹ پال روڈ
باندرہ۔ بمبئی۔ ۵۰

بستی پہ چھایا ہے سایا غرض کا بند ہیں سارے دوارے او بابا
کاہے کو نیندیں اجاڑے او بابا کاہے کو سب کو پکارے او بابا

جائے کہاں جلتی دوپہر یا کس کو صدا دے سونی ڈگریا
تو بھی جو آکے سب کی طرح سے سایا ہی سایا پکارے او بابا

سنیاس لے کر دنیا کو چھوڑا اپنے سے لیکن ناتا نہ توڑا
جیون تو خود ایک تپسیا ہے پگلے سانسوں کی دھونی رمائے او بابا

سپنے ہیں ماٹی کی کچی گگریا، بپھرا ہوا ہے حقیقت کا دریا
اک بار سن لے اترنے سے پہلے گہرے بھنور تیز دھارے او بابا

سوچو اگر تو سونا بھی ماٹی، دیکھو اگر تو ماٹی بھی سونا
کھونا بھی پانا، پانا بھی کھونا یہ تو حسن کو بنا دے او بابا

محمد اسحاق صدیقی
۵-اے، گوئن تالاب
لکھنؤ

آم ـــــ ہمارا قومی پھل

دنیا کا ہر ملک اپنے کسی نہ کسی پھل کے لیے مشہور ہے۔ آم نے ہمارے ملک کو شہرت دوام بخشی ہے۔ یہ نہ صرف ہمارا قومی پھل ہے۔ بلکہ تمام پھلوں کا بادشاہ ہے۔ کیونکہ اس میں جو لذت اور خوبیاں ہیں وہ دنیا کے کسی اور پھل میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آم کی فصل ہوتی ہے تو بازار میں دوسرے پھلوں کے خریدار کم نظر آتے ہیں۔

آم ہندی زبان کا لفظ ہے۔ سنسکرت میں اسے آمر (आम्र) کہتے ہیں۔ ہندستان کی پرانی زبان پالی میں اسے آنبو اور پراکرت میں آنبم (اَمم) کہتے ہیں۔ یہی لفظ فارسی میں جاکر انبہ ہوگیا۔ انگریزی میں آم کو مینگو (MANGO) کہتے ہیں۔ جو پرتگیزی زبان کے لفظ منگا (MANGA) سے نکلا ہے اور پرتگیزی لفظ جنوبی ہندستان کی تامل زبان کے لفظ مانگا کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

آم کا وطن

اندازہ کیا جاتا ہے کہ انسان تقریباً چار ہزار سال سے آم کے پیڑ لگا رہا ہے۔ آم کا اصلی وطن کون سا ملک ہے یہ بتانا مشکل ہے۔ بعض عالموں کی رائے میں جنوبی مشرقی ایشیا کا کوئی ملک یا ملایا ہے بعض ہندستان کا مشرقی علاقہ آسام یا برما بتاتے ہیں۔ بعض کی رائے میں ہندستان ہے۔ چنانچہ آج بھی چٹاگانگ کی پہاڑیوں اور آسام میں آم کے خودرو جنگل پائے جاتے ہیں۔ لیکن ملایا یا کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوتے یہی نہیں ہندستان میں آموں کی جتنی اور اچھی قسمیں ہوتی ہیں ملایا یا کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوتیں۔

دیگر ممالک میں

غالباً جنوبی ہندستان سے آم ملایا پہنچا۔ چنانچہ ملایا کی زبان میں اسے منگکا کہتے ہیں جو تامل زبان کے لفظ مانگا کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ملایا کے لوگ اسے میڈاگاسکر لے گئے اور وہاں بھی اسے منگکا کہتے ہیں۔

آم اتنا لذیذ پھل ہے کہ دنیا کے دوسرے ملک والوں نے اسے اپنے وہاں اگانے کی کوشش کی اور بعض جگہ خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ آم مصر، سوڈان، افریقہ کے مشرقی ساحل میڈاگاسکر، مارشیش، سیلون، برما، تھائی لینڈ، ملایا، انڈونیشیا، کوئنس لینڈ (آسٹریلیا) فلپائن، جزیرۂ ہوائی، برازیل، میکسکو، ویسٹ انڈیز اور فلوریڈا (شمالی امریکا) میں بھی ہوتا ہے اور ان تمام ملکوں میں یہ پھل ہندستان سے پہنچا ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں کے آموں میں وہ لذت اور مہک نہیں ہوتی جو ہندستانی آموں میں ہوتی ہے۔

بادشاہ اور آم

دہلی کے غلام خاندان کے بادشاہ التمش (۱۲۱۱ــ۱۲۳۶ عیسوی) کو آم اس قدر پسند تھا کہ اس نے اس کا نام نغزک رکھا۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "نادر، نایاب تحفہ" لیکن یہ نام

مقبول عام نہ ہوا اور لوگ آم یا انبہ ہی کہتے رہے۔

مغل بادشاہ بابر کو ہندستان کے حیوانات و نباتات کا بڑا تجربہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے واقعات ترک بابری میں لکھے ہیں۔ اس کتاب میں ہندستانی پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ آم کے بارے میں لکھتا ہے۔

" سچ یہ ہے کہ آم ہندستان کے عمدہ پھلوں میں ہے۔ اس کا درخت بہت بڑھتا ہے۔ (اس کا پھل) برسات کے موسم میں پکتا ہے۔ اس کو ایک تو اس طرح کھاتے ہیں کہ پیچے کی طرف بلبلا کرتے ہیں اور پھر اس کو منھ میں "اوپر کی طرف) سوراخ کرکے ہیں اور رس چوستے ہیں۔ دوسرے پوست کو علاحدہ کر کے (کاٹ کر) کھاتے ہیں۔"

شہنشاہ اکبر نے آم کو تمام پھلوں کا بادشاہ قرار دیا تھا۔ وہ آموں کا بہت شوقین تھا۔ اس نے دربھنگہ (بہار) میں آم کا ایک باغ لگوایا تھا جس میں آم کے ایک لاکھ درخت تھے۔ اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل نے اپنی مشہور تصنیف آئین اکبری میں (جو ۱۵۹۰ء میں لکھی گئی تھی) "لکھا باغ" کا حال لکھا ہے۔ ابوالفضل نے آموں کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ اس کی آم سے دلچسپی کا ثبوت ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

" بعض آم وزن میں ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتے ہیں آموں کے نہ صرف مربّے اور اچار بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ سالن میں ان کے قتلے بھی ڈالے جاتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتے ہیں لیکن قتلہ اسی وقت اچھا ہوتا ہے جب آموں میں گٹھلی پڑ جاتی ہے۔ بعض آم جاڑوں کے شروع میں بھی ہوتے ہیں، جن کو ھدیہ کہا جاتا ہے۔ آموں کے کچھ درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال بھر پھل دیتے ہیں لیکن ایسے درخت بہت کم کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل ہندستان میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کی کثرت بنگال، گجرات، مالوہ، خاندیش اور دکن میں ہوتی ہے۔ پنجاب میں کم ہوتا ہے۔ آم کے پودوں کو اگر دودھ اور شکر سے سینچا جاتا ہے تو پھلوں میں مٹھاس زیادہ ہوجاتی ہے۔ اگر آم کو پکنے سے پہلے وہ انگل لمبے ڈنٹھل سمیت درخت سے توڑ لیا جائے اور ڈنٹھل کے سرے پر گرم موم لگا کر اس کو گائے کے گھی یا شہد میں ڈال دیا جائے تو آم کے ذائقے میں دو تین مہینے اور اس کے رنگ میں ایک سال تک کوئی تغیر نہیں ہوتا۔"

سیاح اور آم

ہندستان میں آنے والے یونانی سیاح میگس تھنیز (۳۰۲ سال قبل مسیح) اور چینی سیاح فاہیان (۴۱۱ــ۴۰۵ء) اور ہوان سانگ (۶۴۵ــ۶۲۹ عیسوی) نے اپنے سفرناموں میں آم کا ذکر کیا ہے۔ محمد تغلق کے زمانے میں افریقی سیاح ابن بطوطہ ہندستان آیا (۱۳۳۳ء) اس نے آم کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:

" ہندستان میں ایک میوہ ہوتا ہے انبہ اس کا درخت نارنگی کے درخت سے مشابہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے پتے نارنگی کے پتوں سے بڑے اور تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا سایہ بھی زیادہ گھنا.... ہوتا ہے لیکن جو شخص اس کے سایہ میں سوتا ہے اسے بخار آجاتا ہے۔ (یہی بات املی کے درخت کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے) اور اس کا پھل آلوبخارے سے بڑا ہوتا ہے۔ پکنے سے پہلے سبز ہوتا ہے اور جب گر پڑتا ہے تو اس میں نمک ڈال کر اچار بناتے ہیں۔ جب خریف کے موسم میں انبہ پکتا ہے تو زرد رنگ کا ہوجاتا ہے اور اس کو سیب کی طرح کھاتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو تراش کر کھاتے ہیں اور بعض چوستے ہیں۔ اس میں مٹھاس کے علاوہ کچھ کھٹاس بھی ہوتی ہے گٹھلی بڑی ہوتی ہے جس کو بوتے ہیں تو درخت ہوجاتا ہے"

فرانس کے سیاح برنیر (BERNIER) نے جو ۱۲ سال تک اورنگ زیب کا طبیب رہا اپنے سفرنامے میں ۱۶۶۳ء میں لکھا تھا:

"آم کی فصل گرمی کے دو مہینوں میں ہوتی ہے بکثرت اور سستے ہوتے ہیں لیکن دلی میں اگنے والے پھل معمولی ہوتے ہیں. بہترین آم بنگال، گولکنڈہ اور گوا سے آتے ہیں. اور یہ واقعی نہایت عمدہ ہوتے ہیں. مجھے اس سے لذیذ کسی مٹھائی کا علم نہیں"

شاعر اور آم

ہندستان کے قدیم شاعر دالمیکی نے رامائن میں آم کے باغوں اور جنگلوں کا ذکر کیا ہے۔ مشہور شاعر کالی داس نے اپنے کئی ناٹکوں مثلاً رُت سنگار، کمار سنبھو اور میگھ دُوت میں آم کا ذکر کیا ہے۔

ہندستان کے مسلمان شاعر بھی آم کی تعریف میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ امیر خسرو نے آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے محمد تغلق شاہ کے زمانے میں آم کے بارے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں آم کو ہندستان کا سب سے افضل پھل اور "فخر گلشن" کہا ہے۔ اس قصیدہ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"پھلوں کو کاٹ کر کھانے میں شاید مزہ نہ آتا ہو۔ مگر یہ خوبی صرف آم ہی کی ہے کہ اسے تراش کر کھایئے کچا کھایئے پکا کھایئے، اسے ہر صورت میں کھایا جا سکتا ہے اور یہ ہر صورت میں لطف دیتا ہے۔"

اردو شاعروں میں مرزا غالب آم کے بڑے قدردان تھے۔ آم کی فصل میں ان کے دوست ان کے لئے عمدہ سے عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود بھی اپنے دوستوں سے تقاضہ کر کر کے آم منگواتے تھے۔ انھوں نے اپنے خطوں میں آم کا ذکر کیا ہے۔ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"شام ہوئی چراغ روشن ہوا منشی سید حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوں کہ ناگاہ نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ میں اس کے سر پر ایک ٹوکرا۔ اس پر ہری گھاس بچھی ہوئی۔ ایک ایک آم کو سر بہ مہر گلاس سمجھا۔ بادۂ انگوری سے بھرا ہوا۔ مگر کس حکمت سے بھرا ہے کہ ۵۰۰ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا۔ میاں کہتا تھا، یہ ۸۰ تھے۔ ۱۵ بگڑ گئے۔ تاکہ ان کی برائی دوسروں کو سرایت نہ کرے۔ ٹوکرے میں سے پھینک دیئے۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اب کے سال ہر جگہ آم کم ہے اور جو کچھ ہے وہ خشک اور بے مزہ ہے آم کہاں سے ہو؟ پھادٹ نہ برسات، دریا پایاب ہو گئے کنویں سوکھ گئے۔ اثمار میں تراوٹ کہاں سے ہو۔ جناب اس کا خیال نہ فرمائیں ... برسگال آئندہ تک جیوں گا۔ اب کی آم کھاؤں گا۔"

مرزا غالب بڑے حاضر جواب تھے اور بات سے بات پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ آم کے بارے میں ان کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔ مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے کہ حکیم رضی الدین خاں، جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ "دیکھیے آم ایسی چیز ہے کہ جسے گدھا بھی نہیں کھاتا" مرزا نے کہا۔

"بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

ایک بار دوستوں کی صحبت میں آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا۔ جب مرزا سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا۔ "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، "میٹھا ہو اور بہت ہو" سب ہنس پڑے۔

اکبر الہ آبادی کو بھی آم بہت پسند تھے ان کی نظم "آموں کی فرمائش" مشہور ہے:

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجیے
اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجیے

معلوم ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سید بھے الہ آباد میرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہو گی پہلے مگر دام بھیجیے

مصوّر اور آم آم کے پھل اور پیڑ کی قدیم ترین تصویریں ہمیں سانچی کے استوپ میں نظر آتی ہیں۔ جسے ۲۰۰ سال قبل مسیح تعمیر کیا گیا تھا۔ کچے آم یعنی "کیری" کی شکل کو ہندستانی دستکاروں نے گل اور بوٹوں سے آراستہ کیا ہے۔ یہ شکل کپڑوں پر چھاپی یا کاڑھی جاتی ہے۔ لطف کی قرد اور چکن کے کام میں آپ اسے اکثر موجود پائیں گے۔

جادوگر اور آم بابر کی طرح جہانگیر نے بھی اپنی سوانح عمری لکھی تھی۔ جس کا نام "تزک جہانگیری" ہے۔ اس کتاب میں جہانگیر نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے، جسے ہم آم کے سلسلے میں بیان تو کر سکتے ہیں لیکن وہ آم سے زیادہ ہندستانی جادوگروں کے کمال پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ۱۶۱۰ء کا واقعہ ہے کہ جہانگیر کے دربار میں چند بازیگر حاضر ہوئے انھوں نے جہاں اور کمال دکھائے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے سب کے سامنے آم کی گٹھلی بوئی فوراً ہی پودا اُگا اور اتنا بڑا ہو گیا کہ اس میں آم لگ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پک گئے ہر ایک نے جو وہاں موجود تھا۔ ان آموں کو چکھا اور انھیں نہایت ہی لذیذ پایا۔ یہی نہیں درخت کی شاخوں پر اتنے خوشنما خوش رنگ اور خوش آواز پرند نظر آئے جو اس سے پہلے دنیا والوں نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ کھیل ختم ہونے پر آم کے پتوں کا رنگ بدل گیا گویا خزاں کا موسم آ گیا ہے۔ وہ مرجھا کر جھڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آم کا پیڑ زمین میں سما کر غائب ہو گیا۔

[illegible] (مرحوم)
ایک تماشا [illegible] منہ کی بوتل اور ایک
بڑا سا آم [illegible]

آم کو بوتل میں داخل کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ چھوٹے منہ کی بوتل میں بڑا سا آم کیسے جا سکتا ہے۔ سب مجبوری ظاہر کرتے۔ اس کے بعد پردے کے پیچھے جا کر باہر آتے اور ان کے ہاتھ میں بوتل کے اندر آم نظر آتا۔ لوگ بوتل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے۔ کہیں جوڑ نظر نہ آتا۔ آم بھی اصلی ہوتا۔ اس پر لوگ حیرت زدہ ہو جاتے۔

اس جادو کا بھید یہ تھا کہ وہ پردے کے پیچھے جا کر اس بوتل اور آم کو جسے مجمع کو دکھایا تھا، رکھ دیتے اور اسی طرح کی دوسری بوتل جس میں ویسا ہی آم ڈال کر پہلے سے رکھا ہوتا لا کر لوگوں کو دکھاتے۔ اس بوتل میں آم پہنچانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ آم کی فصل میں بوتل کے اندر آم کی ایسی شاخ داخل کرتے جس کے سرے پر ننھی سی کیری لگی ہوتی اس کے بعد وہ بوتل کو شاخ سے باندھ کر چلے آتے۔ جب آم پورے طور پر بڑھ کر پک جاتا تو شاخ کاٹ کر بوتل لے آتے۔ اس میں شہد بھر کر کارک لگا کر رکھ دیتے اس طرح آم مہینوں خراب نہیں ہوتا۔ جب تماشہ دکھانا ہوتا۔ وہ شہد انڈیل کر بوتل کو اچھی طرح دھو لیتے اس طرح کی وہ کئی بوتلیں تیار کیا کرتے اور سال بھر تماشہ دکھاتے تھے آپ بھی یہ تماشہ دکھا کر لوگوں کو حیرت زدہ کر سکتے ہیں۔

بچے اور آم بچے نہ صرف آم شوق سے کھاتے ہیں بلکہ ایک کھیل بھی کھیلتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سب بچے ایک گھیرا بنا کر بیٹھتے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر گھیرے کے بیچ میں اپنی مٹھیاں باری باری سے اوپر رکھتے ہیں پھر آپس میں اس طرح باتیں کرتے ہیں:

پہلا بچہ: "آم والے آم دے۔"
دوسرا بچہ: "آم ہیں سرکار کے۔"
پہلا بچہ: "ہم بھی ہیں دربار کے۔"
دوسرا بچہ: "گٹھلی کا کس نے کا بچا لو گے؟"
پہلا بچہ: "بچا لیں گے۔"
دوسرا بچہ: "اچھا لے لو۔"
پہلا بچہ: ایک مٹھی ہٹا کر منہ کے پاس لے جا کر چاٹتا

آم چوسنے کی نقل کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔
"یہ تو کھٹا ہے ایک اور دے دو۔"
دوسرا بچہ: "کالا کتا کاٹنے لگا بچا لو گے؟"
پہلا بچہ: "بچا لیں گے۔"
دوسرا بچہ: "اچھا ایک اور لے لو۔"
پہلا بچہ: اپنی دوسری مٹھی اٹھا کر منھ کے پاس لے جاتا ہے اور آم چوسنے کی نقل کرتا ہے۔
پھر کہتا ہے۔
"میرے تو دونوں میٹھے ہیں، میرے تو دونوں میٹھے ہیں۔"
اسی طرح باری باری سب بچے کھٹے میٹھے آم کی نقل کرتے ہیں۔

بچے آم کا ایک کھلونا بھی بناتے ہیں وہ اکثر خود سے اگا ہوا آم کا پودا اکھاڑ لیتے ہیں اور گٹھلی کے اوپر کا چھلکا اتار کر گری نکال لیتے ہیں اور اسے کسی دروازے یا پتھر پر گھس کر سوراخ کر لیتے ہیں اس طرح جو سیٹی بنتی ہے اسے پپیا، پپیہا، یا پپیرا کہتے ہیں۔ جب اسے منھ سے لگا کر بجاتے ہیں تو ایک خاص طرح کی آواز نکلتی ہے۔ اسے بجانے سے پہلے کہتے ہیں۔

"آم کا، ٹام کا، کالی ببول کا
میرا پپیا بولے پٹ پوں، پٹ پوں۔"
یہ گویا پپیے کو جگانے کا منتر ہے۔

آم کی کہاوتیں

آم کے بارے میں ہماری زبان میں کئی کہاوتیں ہیں۔ مثلاً

۱۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔
۲۔ آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے۔
۳۔ آم کھائے پال کا اور خربوزہ کھائے ڈال کا۔
۴۔ ایک آم ہزار دام۔
۵۔ آم بوؤ آم کھاؤ، املی بوؤ، املی کھاؤ
۶۔ کوئل بولے آم پکے۔

آم کی قسمیں

آم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) تخمی یا بیجو، جس کا رس چوسا جاتا ہے۔ (۲) قلمی یا پیوندی، جس کے ٹکڑے کاٹ کر کھائے جاتے ہیں۔ تخمی آم قدرت نے پیدا کیا اور قلمی انسان کی ایجاد ہے۔ پہلے آم کے خود سے اُگے ہوئے جنگل پائے جاتے تھے (بعض جگہ اب بھی پائے جاتے ہیں) ان جنگلی آموں کے پھل کھانے کے قابل نہ تھے۔ بہت پرانے زمانے میں انسان نے ان میں سے کسی ایسی قسم کو چنا جس کے پھل کھانے میں کچھ لذیذ تھے۔ اس نے اس کی گٹھلی کو بویا۔ اُگنے والے پودے کی دیکھ بھال کی۔ اچھی کھاد دی، یہاں تک کہ وہ تناور درخت بن گیا جب اس میں پھل آئے تو وہ اس درخت کے پھلوں سے بہتر تھے۔ جس کی گٹھلی سے وہ اُگا تھا۔ اس طرح انسان بہتر سے بہتر قسموں کو چن کر اور ان کی دیکھ بھال کرکے ایسے درخت پیدا کرنے کے قابل ہو گیا، جن کے پھل آج ہم شوق سے کھاتے ہیں۔

ہندستان کے مختلف حصّوں میں پیدا ہونے والے آموں کے رنگ روپ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا آم امرود کے برابر اور بڑے سے بڑا آٹھ نو انچ (۲۰-۲۵ سنٹی میٹر) لمبا ہوتا ہے۔ آموں کے وزن میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اس کے اندازہ کے لیے نیچے چند مشہور قسموں کے اوسط وزن درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ چندر کرن۔ (کیرل) ۴۲ گرام
۲۔ گولن داس (رتناگری، مہاراشٹر) ۸۵ گرام
۳۔ کالی پری (حیدرآباد) ۷۹۲ گرام
۴۔ ملغوبہ (جنوبی ہند) ۹۲۲ گرام
۵۔ ٹینیرو (آندھرا پردیش) ۴۹۸ گرام

گویا چھوٹے سے چھوٹے قلمی آم کا وزن ۵۰ گرام سے کم اور بڑے سے بڑے کا ڈیڑھ کلو سے زیادہ ہوتا ہے۔ اتر پردیش میں ایک آم ہوتا ہے جسے پنج سیرا کہتے ہیں اس کا وزن بھی پانچ سیر تک ہوتا ہے۔

شکل کے لحاظ سے آم لمبا، تپلا، چپٹا، یا گول ہو سکتا ہے۔
اس کے سر پر سیب کی طرح ہلکا یا گہرا گڈھا ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ بعض کے نچلے حصے میں چھوٹی یا بڑی چونچ ہوتی ہے اور بعض کے نہیں ہوتی۔

بیشتر آم پکنے کے بعد رنگ تبدیل کرتے ہیں۔ لیکن چند قسمیں ایسی ہیں جن کے پھل پکنے کے بعد بھی سبز رہتے ہیں۔ آم پکنے پر سبز، زرد، سرخ، نارنجی، یا ملے جلے رنگ کے ہوتے ہیں۔

آموں کا ذائقہ کھٹا، میٹھا، یا ملا جلا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی بو باس الگ ہوتی ہے۔ سب سے اچھی خوشبو گلاب خاص کی ہوتی ہے اور سب سے خراب وہ ناقص اقسام ہوتی ہیں جن کی بو پیٹرول یا تارپین سے مشابہ ہوتی ہے۔

آم کی جتنی قسمیں ہندستان میں پائی جاتی ہیں ان کا اندازہ ہزار سے اوپر کیا جاتا ہے۔ اس تعداد میں تخمی آم کی قسمیں شامل نہیں ہیں۔

آم کے نام

ظاہر ہے کہ جس ملک میں آموں کی اتنی قسمیں پائی جاتی ہوں وہاں کے لوگ ان کے کیسے کیسے نام رکھیں گے۔ آم کی مختلف قسموں کے نام رکھنے میں شاعرانہ طبیعت کے لوگوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں جب کسی نے آم کی ایک قسم کو ایک علاقے سے لے جاکر دوسرے علاقے میں لگایا تو اس کا نیا نام رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آم کی ایک ہی قسم کے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف نام ہیں۔ مثلاً:

اتر پردیش کا طوطا پری اور جنوبی ہند کا بنگلورا ایک ہی قسم ہے۔ اسی طرح بسودان ریکھا اور سفید دریا بھی ایک ہی قسم کے دو نام ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض جگہ دو مختلف قسموں کو ایک ہی نام سے پکارتے ہیں۔ مثلاً کلکتے کے بازاروں میں جس آم کو مالدہ کہتے ہیں وہ دراصل فضلی ہوتا ہے اور اتر پردیش میں جسے مالدہ کہتے ہیں، وہ دسہری سبز ہوتا ہے۔ یہی حال سفیدہ کا ہے۔ ملک کے بہت سے حصوں میں سفیدہ نام کے آم پائے جاتے ہیں، حالانکہ وہ مختلف قسموں کے ہوتے ہیں:۔

سفیدہ لکھنوی، سفیدہ ملیح آباد، سفیدہ کلکتہ، سفیدہ بشیر بخش۔

بسا اوقات آم کے تاجر گاہک کو پھانسنے کے لیے پرانی قسموں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ بعض نام تو صرف رکھنے والوں کے دماغ میں ہی پائے جاتے ہیں، درحقیقت ان کا وجود نہیں ہوتا۔ بہرحال آموں کے ناموں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ پیوندکاری کے ذریعہ آموں کی نئی نئی قسمیں تیار کی جا رہی ہیں۔

آم کی مختلف قسموں کے نام کیسے کیسے رکھے گئے، یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بعض ناموں پر نظر اپنی اپنی .... پسند اپنی اپنی والی مثل صادق آتی ہے۔ مثلاً: امام پسند، بادشاہ پسند، بیگم پسند، پیٹر پسند، جبار پسند، حضور پسند، رانی پسند، رئیس پسند، صفدر پسند، عزیز پسند، علی پسند، عنایت پسند، نازک پسند، نثار پسند، ناظم پسند۔

بعض کا تعلق دل سے ہے جیسے: دل آرام، دل پسند، دل فریب، دل کش، ہر دل عزیز۔

بعض کے نام دیوی یا بھگوان کے نام پر ہیں جیسے: دیبی بھوگ، کشن بھوگ، گوپال بھوگ، موہن بھوگ، رام کیلا، رام گولا۔

بعض پر حسین عورتوں کے ناموں کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے حسن آرا، کالی پری، محمودہ، نازک بدن،

بعض قدرت کے نظاروں سے موسوم کیا جیسے: چندر کرن، سحر تارا، کالا پہاڑ، کوہ طور، ہر سنگار، ہون راج۔

بعض کے نام حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں جیسے: بلبل چشم، طوطا پری، مچھلی، ناگن، مرغ،

بعض کے نام سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی جوہری کی دکان پر پہنچ گئے ہوں جیسے: زمرد، نیلم، گوہر نایاب، یاقوت، چمکن، سونا تولہ۔

[illegible] [illegible] چیزوں کے نام پر ہیں جیسے : پاپوش [illegible] جیسے دال، قندیل، گلاس، ہاتھی جھول۔

بعض کے نام ان شعلیہ، سے منسوب ہیں جیسے : تیموریہ، تیمور لنگ، جہانگیر،

بعض کے نام انگریزی یا پرتگیزی ہیں جیسے : انفانسو، بلیک اینڈ رپوز، پرنس، پیٹر، جارج، جیلر، جانسن، ڈاکٹر [illegible]، کلکٹر، فرنانڈن، مس ہارووڈ، مسٹر ہارڈ، میڈم بیگم صاحبہ، ولیم لٹے، ہیملیٹ۔

بعض آموں کا ذائقہ رنگ روپ دوسرے پھلوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض کے نام پھلوں کے نام پر ہیں۔ اور چند آموں کا تعلق ترکاریوں اور مسالوں سے ہے جیسے : اناس، آلو بخارا، سردہ، آنا، ملغوبہ، آمن انگوری، بیل خاص، زرد آلو، سنگترہ، سنگھاڑا، سویا کلاں، سیب ہند، سونفیہ، شریفہ، کیلا، کھیرا، لیمن، ناشپاتی۔

بعض کے نام پھولوں پر ہیں جیسے : دو پھول، گلاب خاص، موتیا،

بعض کے نام آم کے رنگ پر ہیں جیسے : زعفرانی، سرخہ، سفیدہ، سیندوریا، سوورن ریکھا، عنابی گولا، لال ملغوبہ، کاپر گرین، کاپر ریڈ، کالا، چیتلا آفاق،

بعض کا تعلق ان کے ذائقے سے ہے جیسے : انگبین، شکر پینی، شکر گٹھلی، لذت بخش، مٹھوا، کھٹا میٹھا، کوزۂ شیریں۔

بعض کا نام مٹھائیوں پر [illegible] جیسے : دودھیا، قلاقند، گلاب جامن، سوہن حلوہ،

بعض کا [illegible] موسم [illegible] سوجیلہ، بارہ ماسی، [illegible]، بیبیاں،۔

بعض آموں کے نام [illegible] نام پر ہیں، جہاں وہ پیدا ہوتے ہیں یا جہاں سے وہ ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچے ہیں : امبالوی، بمبئی، بنگلورا، بنگالی گولا، بندرابنی، بنارسی، کلکتیا، جونپوریہ، دسہری، مالدہ، مرشدآبادی، ملیح آبادی، کوٹھی حیدرآباد۔

بعض کے نام تو ایسے ہیں جو نام سے زیادہ آم کے خطاب معلوم ہوتے ہیں جیسے : اشرف الثمر، اعزار الثمر، اعظم الثمر، حبیب الثمر، سلطان الثمر، فخر الثمر، محمود الثمر، ثمر بہشت، بدر الاثمار، شمس الاثمار، بے نظیر، خداداد، خاص الخاص، رحمت خاص۔

آم کے فوائد

سنسکرت ادب میں آم کو "کلپ درکش" یعنی جنت کا درخت مانا گیا ہے۔ جو انسان کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آم ہمارے ملک کے لیے قدرت کا ایک بیش بہا تحفہ ہے جس سے امیر و غریب یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلکہ بعض علاقوں میں تو ایسے ہیں جہاں کے غریب لوگ مہینوں صرف آم کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔

آم کے کچے پھلوں سے (جنھیں کیری یا امبیہ کہتے ہیں) چٹنی، اچار، مربے، اور جیلی تیار کرتے ہیں۔ کچے آموں کی پھانکوں کو سکھا کر کھٹائی بنائی جاتی ہے۔ جس کے بغیر دال، ترکاری اور چاٹ کا مزہ پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ کچے آم کا پنا لو اور پسینے [illegible] فائدہ کرتا ہے۔

پکی آم کے رس کو سکھا کر امرس بنایا جاتا ہے۔ آم کے رس سے اسکولیش، اور ٹافی بھی بناتے ہیں۔ آم کے گودے اور پھانکوں کو بوتلوں اور ڈبوں میں محفوظ کرتے ہیں۔

آم کی گٹھلیاں سکھا کر مویشیوں کو چارے کے طور پر کھلائی جاتی ہیں۔ اور بعض نادان انھیں ایندھن کے طور پر جلاتے ہیں۔ غریب لوگ گٹھلیوں کو بھون کر یا ابال کر گری نکال لیتے ہیں اور [illegible] کر کھاتے ہیں۔ اس گری میں کافی غذائیت ہوتی ہے [illegible]

---

[1] اگست ستمبر میں ہوتا ہے۔ [2] (جولائی اگست) میں ہوتا ہے [3] ضلع ہردوئی میں سندیلے کے قریب ایک گاؤں ہے [illegible] کے نزدیک ایک گاؤں ہے۔ [4] دہلی کے قریب ایک گاؤں ہے۔

کیا جاتا ہے گٹھلی کی گیلی بنا کر کھاتے ہیں۔ گٹھلی سے نشاستہ علاحدہ
کرکے لئی تیار کی جاتی ہے جسے کاغذ، کپڑے اور پٹ سن کے
کارخانے کام میں لاتے ہیں۔ گٹھلی میں ۱۰ فی صد تک تیل ہوتا ہے۔
جسے نکال کر صابن اور دواؤں میں ڈالتے ہیں۔ اور گٹھلی کی کھاد
بناتے ہیں۔

آم کے پھل میں ۸۵ سے ۹۰ فی صد تک پانی ہوتا ہے۔ باقی
دس فی صد پروٹین، چربی، کاربوہائیڈریٹ، ٹارٹرک ایسڈ
سائٹرک ایسڈ، شکر، کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس، لوہا، اور
وٹامن اے، بی، سی، پائے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں صحت کے
لیے نہایت ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم، وید، اور قدرتی
علاج کے ماہر آم کو تمام پھلوں سے زیادہ فائدے مند بتاتے ہیں۔

آم کی لکڑی میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں جس کی وجہ
سے وہ کافی ملائم ہوتی ہے۔ سوکھنے پر آم کی لکڑی کافی مضبوط ہو
جاتی ہے لیکن نمی سے جلد خراب ہو جاتی ہے۔ یہ لکڑی جلانے
کے کام آتی ہے اور بڑھئی اس سے طرح طرح کی چیزیں تیار
کرتے ہیں۔

آم کی چھال چمڑا رنگنے کے کام آتی ہے۔ آم کی شاخوں سے
گوند نکلتا ہے۔ جو دواؤں میں کام آتا ہے۔

ہندو آم کے پیڑ کو مقدس مانتے ہیں۔ وہ آم کے پتوں کو
پوجا اور شادی کے موقعوں پر ڈوری میں باندھ کر دروازے پر
لٹکاتے ہیں۔

آم کے پتوں کا دھواں کالی کھانسی اور گلے کی بیماریوں
میں مفید ہے۔

آم کی چھال اور پتوں کی راکھ پھوڑے پھنسی اور جلے ہوئے
مقام پر لگانے سے کافی آرام ملتا ہے۔

آم کی پتیوں اور گٹھلی (جسے گٹھلی کہتے ہیں) کے رس کی
دو چار بوند ناک میں ٹپکانے سے نکسیر بند ہو جاتی ہے۔

یہ خیال کہ انسان صرف جاڑے کے موسم میں اپنی صحت
بنا سکتا ہے آم نے غلط ثابت کر دیا ہے کیونکہ گرمی کے موسم میں آم
کے باقاعدہ استعمال سے صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ البتہ زیادتی
ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔

بغیر ریشے والا (تخمی) آم قلمی آم کے مقابلے میں زیادہ مفید
ہے کیونکہ وہ جلد ہضم ہوتا ہے جبکہ قلمی آم ثقیل اور دیر میں ہضم
ہوتا ہے۔ بے ریشے کا آم قبض پیدا کرتا ہے، اس کے مقابلے
میں ریشے دار آم زیادہ فائدے مند ہے۔

آم ایک نہایت مقوی غذا ہے۔ خون کو صاف کر کے جلد کا
رنگ نکھارتا ہے۔ پیٹ اور آنتوں کی صفائی کرتا ہے پیشاب
لاتا ہے۔ پت (صفرے) کو دور کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے
بھوک بڑھتی ہے خون بڑھتا ہے۔ کچے آم میں وٹامن سی زیادہ ہوتا ہے اس
لیے دانتوں کی بیماریوں اور اسکروی میں مفید ہے۔ اسکروی (SCU
RVY) ایک بیماری ہوتی ہے جس میں مسوڑھے سوج جاتے ہیں۔
جسم پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں اور ہاتھ پیروں میں درد ہوتا ہے۔

مضر اثرات سے کیسے بچیں

آم کا زیادہ استعمال گرم مزاج والوں کے
لیے مضر ہے کیونکہ اس سے ان کے بعض امراض خصوصاً بواسیر اور
پیچش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آم کا استعمال نہار منہ نقصان
دہ ہے۔ البتہ جن کے پیٹ میں کیڑے ہوں وہ نہار منہ استعمال
کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کیڑوں کو مارتا ہے۔

آم کے زیادہ استعمال سے قبض، بدہضمی، آنکھ کی
بیماریاں، خون کی خرابی اور موسمی بخار جیسے امراض پیدا ہو جاتے
ہیں۔ جو بچے آم بہت کھاتے ہیں ان کے پھوڑے پھنسیاں
نکل آتی ہیں۔

آم کھانے کے بعد دودھ کا استعمال مفید ہے۔ ایک
گلاس دودھ میں ۵۰ یا ۷۰ گرام آم کا رس ملا کر پینے سے
پرانے سے پرانا قبض دور ہو جاتا ہے اور خون خوب بڑھتا ہے۔
اگر دودھ نہ ملے یا اس کی خواہش نہ ہو تو آم کھانے کے بعد
بیل کا شربت یا جوارش پی سکتے ہیں۔ جامن، کالا نمک
وغیرہ بھی مفید ہے۔

آم کھانے کا طریقہ۔ آم کھانا اور کھلانا ایک فن ہے قلمی آم کھانے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ تیار ہے یا نہیں۔ اس کے لیے بعض لوگ اسے انگوٹھے سے دبا کر دیکھتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے انگوٹھے کے دباؤ سے آم کا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ پکے آم کو پہچاننے کے لیے نظر چاہیے۔ جب آم تیار ہو تو اسے آہستہ سے بائیں ہاتھ میں تھام کر دائیں ہاتھ میں چاقو لے کر چھلکا اُتارنا چاہیے۔ اس کے لیے بائیں ہاتھ میں آم کو آہستہ آہستہ گھمانا ضروری ہے۔ چھلکا کتنا موٹا اتارا جائے یہ بات تجربے سے آتی ہے۔ کبھی کفایت شعاری کے خیال سے لوگ باریک چھلکا اُتارتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ گودے میں لگا رہ جاتا ہے اور کھانے میں کھٹا پن محسوس ہوتا ہے۔ کبھی زیادہ موٹا چھلکا اُتارتے ہیں جس سے گود ضائع ہو جاتا ہے۔ بہرحال جب آم کا اوپری حصہ نصف سے کچھ زیادہ چھل جائے تو اسے آہستہ سے کاٹ کر منھ میں رکھیے اور بجائے دانتوں سے کاٹنے کے زبان اور تالو کی مدد سے گھلا کر حلق میں اُتاریے۔ اسی طرح باقی نصف حصہ چھیل کر کھائیے۔

تخمی آم کے اوپری حصے کو انگوٹھے سے دبا کر اسے نرم کرتے ہیں۔ نرم کرنے کا یہ عمل اُس وقت تک جاری رکھنا چاہیے جب تک آم پلپلا نہ ہو جائے۔ جب آم خوب نرم ہو جائے تو انگوٹھا ہٹا کر دونوں ہاتھوں سے دبا دبا کر اس کا رس چوسنا چاہیے۔

آم کھاتے وقت اس کا لحاظ ضروری ہے کہ منھ کے باہر کا حصہ اور ہاتھوں کی انگلیاں آم کے رس سے کم سے کم آلودہ ہوں، کیونکہ یہ بات تمیزداری میں داخل ہے۔

آم چوس کر کھانے والا ہو یا کاٹ کر، دونوں کو ٹھنڈا کرنا ضروری ہے۔ بہتر ہوگا کہ کھانے سے پہلے انھیں ٹھنڈے پانی میں بھگو دیا جائے۔ اگر برف کو کوٹ کر اُس میں آموں کو دھونے کے بعد دبا دیں تو اور اچھا ہے۔

شکریہ: میں اُن مصنفین اور ناشرین کا ممنون ہوں جن کے مضامین سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ اُن کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) ہندستانی پھل۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۱ء۔
(۲) بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے۔ شمس کنول۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۱ء۔
(۳) پھلوں کا بادشاہ۔ آم۔ اندرجیت لال۔ دوماہی "شیرازہ" سرینگر، جلد ۹ شمارہ ۱۰۔
(۴) آم تمام پھلوں کا بادشاہ۔ روزنامہ "سیاست جدید" (کانپور) ۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء۔
(۵) آم ثمر بہشت کب بنتا ہے؟ خان محمد عاطف۔ روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ۔
(۶) ہمارا راشٹریہ پھل آم۔ پنکج کمار۔ روزنامہ "سوتنتر بھارت" (ہندی) لکھنؤ۔

—

★

غزل

والی آسی
مکتبہ دین و ادب
امین الدولہ پارک
لکھنؤ۔

میں شام تک آؤں گا بہلائے ہوئے رکھنا
بچوں کو کھلونوں میں اُلجھائے ہوئے رکھنا

معصوم تمنائیں چھیڑیں گی بہت تم کو
لیکن دلِ ناداں کو سمجھائے ہوئے رکھنا

جاڑوں کی یہ راتیں جب تم سے بھی نہ کٹ پائیں
یادوں کے کچھ انگارے دہکائے ہوئے رکھنا

چہرے کا تمھیں اپنے ہر داغ نظر آئے
آئینۂ دل اتنا چمکائے ہوئے رکھنا

ممکن ہے فقیری پر کچھ طنز بھی ہوں لیکن
تا عمر یونہی دامن پھیلائے ہوئے رکھنا

تم کو تو خدا جانے کیا وہم ہے اے والی
جب گھر میں قدم رکھنا گھبرائے ہوئے رکھنا

اُردو کے آج کے ناولوں میں گاؤں

اردو کے آج کے ناولوں کے زمرے میں وہ ناول آتے ہیں جو تقسیم ہند کے بعد سے اب تک لکھے گئے ہیں۔ اس زمانے کو اردو ناول نگاری کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں بہت سے ایسے ناول سپردِ قلم کیے گئے ہیں جو موضوع، فن اور تکنیک کے اعتبار سے عظیم اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان ناولوں میں شہروں کی بھی عکاسی کی گئی ہے اور گاؤں کی بھی۔ آئیے دیکھیں کہ ان میں گاؤں کی عکاسی کتنی اور کیسی ہے۔

آج کے تین ناول "آگ کے دریا"، "اداس نسلیں" اور "لہو کے پھول" ایسے ناول ہیں جو کافی ضخیم ہیں اور جن کا کینوس بہت ہی وسیع اور موضوع انتہائی عظیم ہے۔ "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر کا وہ لافانی ناول ہے جسے اردو ناول نگاری کی آبرو کہا جائے تو کسی طرح غلط نہ ہوگا۔ یہ ہندستان کی پچیس سو سال کی تہذیب اور اس کے تسلسل کی داستان ہے۔ اس عظیم موضوع کو دیکھتے ہوئے شہر اور گاؤں میں بانٹ کر اس کا جائزہ لینا ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ہم اس ناول میں گاؤں کی عکاسی کا تجزیہ کرنا ہی چاہیں تو ہمیں اس میں قدیم ہندستان کے ان گاؤں کی جھلک بھی ملے گی جن میں ودیارتھی جاتے تھے تو ان کی طرح طرح سے آؤ بھگت کی جاتی ہے اور جن میں بھاٹ لہک لہک کر قصے سناتے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام کے زمانے کے بنگال کے ان گاؤں کا عکس بھی نظر آئے گا جن کے کسان مہنگائی، اکال اور دنگے فساد سے پریشان تھے اور برطانوی تسلط کے دور کے شمالی ہند کے ان گاؤں کی تصویر بھی دکھائی دے گی جن میں کانگریس کی تحریک کے زیر اثر کسان ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں اور مظالم برداشت کرتے ہیں اور جن کے پس منظر سے قدیر جیسے کردار ابھرتے ہیں، وہ قدیر جو مرزاپور کے ایک گاؤں کے ایک کسان کا بیٹا ہے اور جس کے باپ کو زمیندار کے سپاہی لگان نہ ادا کرنے پر اس قدر مارتے ہیں کہ وہ مر جاتا ہے اور باپ کی موت کے بعد بیٹے کو کلکتہ جا کر کلینری کرنی پڑتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ناول کے آخری حصے میں آزادی کے بعد کے ہندستانی گاؤں کی بھی جھلک دکھائی دے گی۔ ناول کا آخری باب ان سطور سے شروع ہوتا ہے:

—— کچی سڑک پر لڑکا بیل گاڑی ہانکتا جا رہا تھا۔ ایک سٹیشن ویگن دھواں چھوڑتی، دھول اڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑی بان نے بیل کی دُم مروڑ کر موٹر والے کو ڈانٹا ہے "دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹر یا۔ ابھی جو ہمرا بیل چوک جایت ——"

یہ آزاد ہندستان کے اس گاؤں کی جھلک ہے جس میں گاؤں والے سر اٹھا کر جینے کے قابل ہو گئے ہیں اور ایک گاڑی بان موٹر والے کو ڈانٹ دیتا ہے۔ اس ناول کے اختتام سے صرف چند سطور قبل یہ گیت ملے گا جسے گاؤں میں ایک منڈلی گا رہی ہے اور جس کے بول ناول کے ہیرو گوتم کے کانوں میں گھر لوٹتے وقت پڑتے ہیں:

نجرا آتا ہے ...

کھیتن ... ...

جیون آج سنبھل رہے
اچھا دھان اچھی فصل رہے

یہ گیت آزاد ہندستان کے گاؤں کی معاشی خوشحالی کا عکاس ہے ـــــ "اداس نسلیں" کے خالق عبداللہ حسین ہیں۔ یہ ناول جنگ آزادی کے ابتدائی زمانے سے تقسیم ہند تک کے پرآشوب دور کی داستان پر مشتمل ہے اس میں اس دور کے مختلف گاؤں کے مرقعے ملتے ہیں۔ اس کی کہانی کی ابتدا روشن پور نام کے ایک گاؤں سے ہوتی ہے ناول میں اس گاؤں کی وہ تصویر بھی ہے جس میں شروع میں ہندو مسلمان اور سکھ، امن اور صلح جوئی کے ساتھ رہتے ہیں، پھر اس کا وہ نقشہ بھی ہے جس میں انگریز حاکموں کے حکم سے زبردستی فوجی بھرتی ہوتی ہے، فصلیں تباہ ہوتی ہیں اور جاگیردار کے مظالم کسانوں کی کمر توڑنے لگتے ہیں، اور اس کے بعد وہ عکس بھی ہے جس میں تحریک آزادی کے اثر سے ابھرتے ہوئے کسانوں کی دنیا سامنے آتی ہے، جس کے متعلق ناول نگار لکھتا ہے:

ـــــ "سر اٹھاتے اور کمر سیدھی کرتے ہوئے کسانوں کی دنیا
جو تیزی سے بدل رہی تھی اور اپنی حیثیت اور طاقت کا علم
جو متعدی بیماری کی طرح کسانوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔"

"لہو کے پھول" سب سے زیادہ ضخیم ناول ہے جو حیات اللہ انصاری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ناول ہندستان کی تحریک آزادی کا ایک نثری رزمیہ ہے جس میں اس تحریک کا ہر ہر گوشہ اور ہر ہر پہلو سمٹ آیا ہے۔ اس ناول میں تحریک آزادی کے مختلف مدارج کے پس منظر میں ہندستان کے گاؤں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی بڑی ہی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ کہانی کا دیہی مرکز کٹ پور ہے۔ یہ گاؤں علامتی حیثیت رکھتا ہے، اور ہندستان کے تمام گاؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس گاؤں میں کسان اپنی محنت سے فصلیں اگاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہاں پٹواریوں، مہاجنوں، پنڈتوں، تحصیلداروں، چوکیداروں اور تھانے داروں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے اور برطانوی اقتدار کی گوناگوں لعنتوں کے نیچے گاؤں والوں کی زندگی میں گرتے جاتے ہیں جاگیردار اور زمیندار کا استحصال عذاب جان بن جاتا ہے۔ زمینوں سے کسانوں کی بے دخلی ہوتی ہے۔ اچھوتوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں، پھر گاؤں میں کانگریس کی تحریک آزادی کی بدولت بیداری آتی ہے۔ کسان سامراجی طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں، اچھوت بھی انسانوں کی طرح زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ گاؤں میں ہندو اور مسلم فرقہ وارانہ بھی سر اٹھاتی ہے لیکن گاؤں کے لوگ مہاتما گاندھی کے آدرشوں کی روشنی میں اس سے بلند ہو کر آزادی کی تحریک میں پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لینا جاری رکھتے ہیں۔ "لہو کے پھول" کے آخری حصے میں آزاد ہندستان کے گاؤں کا عکس بھی نظر آتا ہے، جب کٹ پور میں نل کنویں کا افتتاح ہوتا ہے اور اس کا پانی کھیتوں میں بہنے لگتا ہے، جو آزادی کے بعد ہمارے گاؤں میں آنے والے سبز انقلاب کا اشاریہ ہے۔

آج کے ناولوں میں شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" خدیجہ مستور کا "آنگن" خواجہ احمد عباس کا "انقلاب" اور قرۃ العین حیدر کا "آخر شب کے ہمسفر" بھی انتہائی اہم ہیں۔ ان میں پہلے دو ناولوں میں گاؤں کی عکاسی نہیں ہے۔ "انقلاب" کا موضوع "اداس نسلیں" اور "لہو کے پھول" کی طرح ہندستان کی تحریک آزادی ہے لیکن اس میں ناول نگار کی توجہ زیادہ تر شہروں کی طرف مرکوز رہی ہے اور گاؤں کی جھلک بس چند ایسے گنے موقعوں ہی پر دکھائی دیتی ہے اور وہ بھی بہت ہی ہلکی سی۔ ایک موقع وہ ہے جب ناول کا ہیرو انور کمسنی میں نور پور نام کے ایک گاؤں میں جاتا ہے اور وہاں ایک کسان کا ایک چھوٹا سا لڑکا بھولا، تحصیلدار صاحب کے باورچی کو تین انڈے دینے سے انکار کرتا ہے، جو سول نافرمانی کی تحریک سے ہندستان کے گاؤں کے متاثر ہونے کا مظہر ہے۔ دوسرا موقع وہ ہے جب علی گڑھ سے آگرہ جاتے وقت انور، نذیر، سلیم اور سلمہ کار پنکچر ہو جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے ایک گاؤں میں جاتے ہیں جس کی خستہ حالی انگریزی سامراج

کے منحوس سائے تلے پلتے ہوئے دیہاتوں کی زبوں حالی کی آئینہ دار ہے ـــــ "آخر شب کے ہم سفر" " بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، سنہ ۱۹۴۲ء کے اندولن، مطالبۂ پاکستان، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں" لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی گاؤں کی کچھ جھلکیاں ہی نظر آتی ہیں۔ ایک خاص جھلک اس وقت دکھائی دیتی ہے جب دیپالی، ریحان کے بلاوے پر، سندر بن کے ایک گاؤں میں جاتی ہے اور وہاں ایک غریب مسلمان ماہی گیر مولوی ابوالہاشم کے گھر میں مہمان ہوتی ہے۔ اس گھر کا نقشہ آزادی سے پہلے کے بنگال کے فلاکت زدہ گاؤں کا عکاس ہے۔

دور حاضر میں کئی ایسے یادگار ناول بھی تصنیف ہوئے ہیں جن کی ضخامت کم ہے اور جو ناولٹ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس قسم کے ناولوں میں جیلہ ہاشمی کا "یادوں کے الاؤ" راجندر سنگھ بیدی کا "ایک چادر میلی سی" اور قاضی عبدالستار کا "شب گزیدہ" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ـــــ "یادوں کے الاؤ" اور "ایک چادر میلی سی" کی کہانی پنجاب کے گاؤں میں پروان چڑھتی ہے "یادوں کے الاؤ" کا موضوع انتقام کا وہ جذبہ ہے جو پنجاب کے گاؤں میں بسنے والوں کے گرم خون میں کافی جوش کے ساتھ اچھلتا ہے اور جس کا مظاہرہ وہاں کی دیہاتی بہادری کی روایت کا جز ہے۔ اس ناول میں شروع سے آخر تک پنجاب کے گاؤں کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے ـــــ "ایک چادر میلی سی" کا موضوع انسانی جبلت کے ایک جنسی پہلو پر مبنی ہے۔ اس موضوع کو ایک پنجابی گاؤں کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے جس کی عکاسی بڑی ہی جاندار ہے ـــــ "شب گزیدہ" میں یو، پی کے ضلع سیتاپور کے گاؤں کا نقشہ ملتا ہے۔ اس ناول میں جاگیردارانہ ذہنیت کے ایک نہایت بھیانک پہلو کو کہانی کی بنیاد بنایا گیا ہے جس کے واقعات کے اصل مرکز جام نگر گاؤں کی حالت بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے:

ـــ "ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور نوچے کھسوٹے چھپروں کے نیچے ہڈیوں کا پنجر بنے ہوئے جانور اپنے مالکوں کی خالی جیبوں کی طرح سوکھی ہوئی ناندوں کو چاٹتے رہتے تھے ـــــ"

یہ غلامی کے دور کے گاؤں کا نقشہ ہے۔

غرض یہ کہ آج کے ناولوں میں بحیثیت مجموعی گاؤں کی عکاسی کی کمی نہیں ہے، لیکن آج کے بیشتر اہم ادبی ناول ... آزادی سے پہلے کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں زیادہ تر دور غلامی کے ہندستانی گاؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ "آگ کا دریا" اور "لہو کے پھول" کے آخری حصے میں آزاد ہندستان کے گاؤں کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن یہ صرف ہلکی سی جھلک ہے، بھرپور تصویر نہیں۔ آزادی کے بعد مختلف النوع فلاحی اقدامات اور ترقیاتی پروگراموں کے باعث ہمارے گاؤں میں جو معاشی خوشحالی آئی ہے اور جو خوش آئند سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی بھرپور عکاسی کرنے والا کوئی ادبی ناول اردو میں اب تک نہیں لکھا گیا۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی جانب آج کے ناول نگاروں کو متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

★

عرفان عباسی
۵، موتی لال بوس روڈ، لکھنؤ

عبدالمجید حیرت شملوی (خاکہ)

عرفان عباسی

۱۹۰۰ء — ۱۹۶۴ء

حیرت شملوی

میانہ قد۔ اوسط جسم، گہری سانولی رنگت، کشادہ پرشکن ماتھا، چھوٹا متین و سنجیدہ بجھا بجھا لیکن پر وقار چہرہ۔ اس پر جوڑی اور بڑی تراشی ہوئی مونچھیں، ستواں ناک قدرے موٹے متبسم ہونٹ، بڑا دہانہ، لمبی ناک، پھیلے نتھنے، بڑی روشن اور زمانہ شناس آنکھیں ان پر سنہرے فریم والا خوب صورت چشمہ، گھنے ابرو۔ ٹھہرا ٹھہرا لہجہ، نرم آواز، بڑے اور کھڑے کان، سر پر تیل کنگھی سے محروم انگریزی تراش کے سفید بال، کرتا پائجامہ اور صدری زیب تن کیے۔

مشہور شاعر اور معروف ادیب "عبدالمجید حیرت شملوی" بھی قصۂ پارینہ بن گئے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں عبداللطیف صاحب کے گھر شملہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور شملہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر علیگڑھ چلے گئے اور وہاں سے بی، اے کیا۔ ان کا شمار نہایت ذہین اور ہونہار طلبا میں ہوتا تھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد مرکزی سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے تھے۔ فرائض منصبی حسن و خوبی انجام دے رہے تھے کہ صحت خراب ہو گئی اور انھیں کہنا پڑا ؎

یہی وہ حیرت آشفتہ سر ہے
جسے تم نے کبھی اچھا نہ دیکھا

رفتہ رفتہ جسم کا نچلا حصہ کمزور ہونے لگا یہاں تک کہ دوران خون سست پڑتے پڑتے پیر مفلوج ہو گئے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو کر ریٹائرمنٹ کے وقت سے کئی سال قبل ہی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنی سسرال راجستھان چلے گئے۔ قبل از وقت سبکدوشی کی وجہ سے پنشن بہت کم تھی اور کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ تقریباً دو سال وہاں گزارنے کے بعد سنہ ۱۹۵۱ء میں رام پور چلے گئے۔ چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن ادبی مصروفیات میں فرق نہ آنے دیا پلنگ پر لیٹے لیٹے خط و کتابت اور شعر و شاعری میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ معاشی بدحالی کا مقابلہ ہمت و استقلال سے کرتے اور کہتے رہے ؎

آرام کا سودا جسے ہوگا اسے ہوگا
اپنی تو اسی گردش آفات میں گزری

کچھ بچے گھر پر پڑھنے آ جاتے تھے جنھیں وہ نہایت شفقت سے پڑھاتے تھے۔ اس سے بھی برائے نام بافت ہو جاتی تھی سنہ ۱۹۶۲ء میں رام پور سے پاکستان منتقل ہو گئے۔

حیرت صاحب علم و ادب شعر و سخن کا فطری ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لال فیتے والی روایتی روکھے اور غیر ادبی دفتری ماحول میں رہتے ہوئے بھی ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ کیا جو "بنی اسرائیل کا چاند" کے نام سے چھپ کر مقبول ہوا۔ یہ ترجمہ صحت الفاظ کے

ساتھ محاورے کی خوبی کا دلکش نمونہ ہے۔ دورانِ قیام دہلی ادبی جلسوں میں پابندی اور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد شاعری کا آغاز ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی شہرت حاصل کرلی۔ نہایت دلکش انداز میں کلام سناتے تھے اور سراہے جاتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ملازمت سے سبکدوشی کے بعد "آئینہ حیرت" کے نام سے شائع ہوکر شرف قبولیت حاصل کرچکا ہے۔ حیرت صاحب نے بہت کہا لیکن غالباً صحت کی خرابی، معاشی بدحالی اور عسرت و کلفت میں گزرنے والی زندگی کے آخری حصے میں یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ آخر میں پاکستان چلے گئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے جہاں جسمانی معذوری کے باوجود ایک قدرداں کی توجہ سے محکمہ اوقاف سے منسلک ہوگئے تھے اور برائے نام یعنی ایک سو روپے ماہانہ یافت ہوتی تھی۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء کو حسبِ معمول کچھ لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے۔ تذکرہ شعر و سخن کے بعد فرمائش ہوئی، غزل سنا رہے تھے اسی حالت میں قلبی دورہ پڑا اور حیرت موت سے ہم کنار ہوگئے۔

نمونۂ کلام

غزل کے چند اشعار ؎

جرأتِ عرضِ تمنا تو نہیں کم لیکن اپنی کوتاہئ قسمت کا خیال آتا ہے
لاکھ کریں تشریح زباں میں آپ کا مطلب آپ ہی جانیں

آج یہ سوچے بیٹھا ہوں کہ کل کیا ہوگا اس سے بڑھ کر بھی کسی کا سرِ خلل کیا ہوگا
کچھ اگر ہے تو یہی ان کے تغافل کا جواب کہ ہم اس پر بھی انہیں یاد کیے جاتے ہیں
دل کہا کرتے ہیں جس چیز کو دنیا والے ایک آزار ہے ہر وقت مری جاں کے ساتھ
پڑتی رہیں اس پر بھی ہمنشینوں کی نگاہیں اک جام جو ساقی کی عنایت سے ملا تھا

پہنچا دیا کہاں سے کہاں یہ تو دیکھیے دریائے غم کے ایک ہی سیلاب نے مجھے
اب آپ اپنا جذب و اثر آزمائیے ہم نے تو اپنی آہ کی تصویر دیکھ لی
اور امید کیا زمانے سے جی رہے ہیں یہی غنیمت ہے
آپ نے بھی تو ہم غریبوں سے بے نیازی کی انتہا کردی
ہر وقت ہے ایک آزمائش آرام کہاں ہے زندگی میں

حالِ دل کس کو سنائیں حیرت
سننے والا بھی کہیں ہے کوئی

منتظر ہوں مگر نہیں آتے اب وہ شام و سحر نہیں آتے
وائے قسمت کہ آزمائش کے دن بھی اب مختصر نہیں آتے
روز آتے تھے ناصحِ مشفق آج آتے نظر نہیں آتے
عجب بقراط جب بہکتے ہیں مدتوں راہ پر نہیں آتے
خارِ گل کے قریب رہ کر بھی گل کے زیرِ اثر نہیں آتے
کب وہاں جا کے اہلِ فکر و نظر لے کے اک دردِ سر نہیں آتے
لوگ کیوں رنگ ان کی محفل کے غور سے دیکھ کر نہیں آتے
ہوں نہ مایوس اس کی رحمت سے ڈوبتے کیا ابھر نہیں آتے

سعیِ پیہم نہ ہو تو اے حیرت
ہاتھ لعل و گہر نہیں آتے

اس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہوگئی ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہوگئی
کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور جس پر نثار ہستیِ پروانہ ہوگئی
یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہوگئی
صد شکر کچھ تو ان سے ہوئی آج گفتگو یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہوگئی
اللہ ری اشکباریِ شمعِ شبِ فراق جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہوگئی
حیرت کے غم کدے میں خوشی کا گزر کہاں تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہوگئی

★

شافع قدوائی
خاتون منزل حیدر مرزا روڈ
گولہ گنج، لکھنؤ ۱

ساحر لدھیانوی کا شعری آہنگ

ساحر لدھیانوی نے اپنی نغمہ سرائی کا آغاز اس وقت کیا جب اردو شاعری کی فضا میں رزمیہ جہت، ادعائی لب و لہجہ، رجائی نقطۂ نظر، انقلابی اور پر اعظمانہ و خطیبانہ انداز کے نغموں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور جوش ملیح آبادی کی بلند آہنگی (LOUD POETRY) محض گرج، داعظانہ و ناصحانہ اور اشتراکی طرز فکر کی شاعری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ادب کی رمزیت، ایمائیت اور جمالیاتی اقدار کو رجعت پسندی کی علامتیں قرار دے کر ادبی تخلیقات کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف نظریات کے ذریعہ لگایا جا رہا تھا۔ اختر شیرانی کی لائی ہوئی رومانیت سے نوجوان شعراء انحراف کر رہے تھے۔ "نیا ادب" کے ذریعہ اعصابی تشنج اور جذباتی ہیجان کی حامل اور وقتی اور موضوعاتی نظموں کی پذیرائی کی جا رہی تھی اور ادبی دہشت انگیزی کو فروغ دیا جا رہا تھا اور جن شعری تخلیقات میں انگارے، شعلے، طوفان، خون، باغی، دار و رسن وغیرہ الفاظ کا میکانکی طور پر استعمال کیا گیا ہو وہ عصری اور کامیاب شاعری کی نمائندہ کہی جا رہی تھیں۔ سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین، فکشن، افسانہ اور تنقید میں انہی فکری عناصر کو فروغ دے رہے تھے۔ اس وقت کے بیشتر شعراء کے ذہن میں بقول آل احمد سرور انقلاب کا ایک رومانوی اور طفلانہ تصور تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس ذہنی بغاوت کی نوعیت بڑی حد تک تخریبی بتائی اور اس وقت کے "انقلابی ادب" کا جائزہ لیتے ہوئے ممتاز ناقد رشید احمد صدیقی نے لکھا " یہ انقلاب کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے آغا حشر کے ڈراموں میں یا ان کے زمانے کے تھیٹروں میں ایکٹر غل غپاڑے کرتے نظر آتے ہیں۔" ساحر لدھیانوی بھی اس شعری رجحان سے متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی ذہنی طور پر انقلاب سے رومانی وابستگی کے مقبول و محبوب ..... تصور کو قبول کیا۔ ساحر کا اولین شعری مجموعہ "تلخیاں" انہی جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہے یعنی

> چناں قحط سالی شد اندر دمشق
> کہ یاراں فراموش کردند عشق (سعدی)

(یعنی دمشق میں قحط پڑ جانے کی وجہ سے یار لوگ عشق کرنا فراموش کر بیٹھے تھے۔)

ساحر نے بھی انقلاب اور وطن کی آزادی کے حصول کی خاطر رومانی نغمے گانے سے گریز کیا اور اپنے مجموعہ کے اولین صفحہ پر یہ شعر درج کیا ؎

> " ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
> ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں "

مذکورہ شعر ساحر کے شعری رجحان کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے پچیس سالہ دور میں جن شعراء کو ذہنی طور پر متاثر کیا ان میں غالباً ساحر کا ہی نام اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے کہ ان کے مجموعہ کلام "تلخیاں" نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ساحر روایت کا رچا ہوا شعور رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے روایت کے صالح امکانات کو سماجی شعور کی فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ برتا۔ جس میں تخیل کی لطافت

بھی ہے اور جذبات کی طہارت بھی۔ "تلخیاں" کی شعری کاوشیں جوانی افسردگی، نوجوانی کی محرومی کی غماز اور داخلی و شخصی ہونے کے باوجود زندگی کے گرم و سرد تجربات سے قریب ہیں۔" (۱) ساحر کے مزاج میں بے ساختگی اور تغزل کے عناصر شروع ہی سے ملتے ہیں اور ساحر کلیتاً نہ تو فیض کی طرح ذہین طبقے کے شاعر ہیں اور نہ ہی مزدوروں کے شاعر۔ ان کی اپیل متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نوجوان سے ہے۔ ساحر کی شاعری میں کرختگی کے بجائے شیرینی اور بے ساختگی ہے جو براہ راست نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے اور ان کے لب و لہجہ میں اک خاص قسم کی رنگینی اور شادابی ہے جو اپنے اندر خاص دلکشی رکھتی ہے یہی ساحر کی مقبولیت کا راز ہے۔ "ساحر لدھیانوی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پرجوش جذبے کی شاعری (PASSIONATE POETRY) ہے جس میں احساس کی شدت بہت نمایاں ہے اور ساحر کی شعری تخلیقات وحدت تاثر، جذبے کے خلوص اپنے فن سے کلی وفاداری (TOTAL COMMITMENT) کی وجہ سے انتہائی متاثر کن ہیں۔ ساحر کی غزلوں کی خصوصیت ہے ایجاز (CONDENSATION) اور ایمائیت۔ ساحر کے شخصی اور داخلی تجربے جنھیں انھوں نے بڑی مہارت سے شعری پیکر عطا کیے ہیں، قاری کو اپنے شخصی اور قیمتی تجربات سے زیادہ اثر انگیز اور دقیع لگتے ہیں "تلخیاں" کے شاعر کا اسلوب ہموار اسلوب ہے اور احساس کی شدت سے عبارت ہے۔ ساحر کی تخلیقات کا سرچشمہ زندگی کے دروں تجربات ہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوئی نظریہ خواہ وہ کتنا ہی دلپذیر کیوں نہ ہو بذات خود کسی ادب کے حسن و عظمت کا ضامن نہیں ہوتا۔ ساحر کے اولین دور کی غزلوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں ؎

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے — ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

ہو کر خراب مے ترے غم تو بھلا دیے — لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح — پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی — وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید — لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے — گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے — پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ — دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

ساحر کی اس دور کی سب سے مشہور نظم "تاج محل" ہے جو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی کے ذریعے ساحر نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت کرائی۔ "تاج محل" اپنے شدت احساس اور جذبے کے خلوص کے باعث انتہائی متاثر کن ہے۔ ساحر کی دوسری کامیاب نظمیں چکلے، نور جہاں، ایک شام تصویر رنگ، متاعِ غیر، شہکار، فن کار، خوب صورت موڑ، جاگیر، پرانے چراغوں کو گل کر دو وغیرہ ہیں۔

ساحر کے والد جاگیردارانہ نظام سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے ساحر اور ان کی والدہ کو ان کے جائز حقوق نہیں دیے اور ان کے اس عمل کے پیچھے طبقاتی برتری کا جذبہ کارفرما تھا۔ ساحر کو باپ کی شفقت نہیں مل سکی، شاعری اگر ذاتی احساسات و جذبات کا اظہار ہے تو ساحر کی تمام تخلیقات میں اسی بے نام سی کسک کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

ساحر کا دوسرا شعری مجموعہ "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" ہے اس مجموعہ کا خالق ماضی سے گریزاں اور حال سے ناآسودہ ہے جو سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں کے خلاف مستقل جہاد کر رہا ہے اور اندر ہی اندر کڑھتا، ٹوٹتا اور بکھرتا رہتا ہے اور جو زندگی

---

(۱) ترقی پسند تحریک، خلیل الرحمن اعظمی صفحہ ۱۹۲

کہ بے آب وگیاہ میدان میں ہر انسان پریشان پھر رہا ہے
اور تنہائی کی آگ میں جل رہا ہے، اس دور کی ساحر کی شاعری
کرب خود کلامی اور ان کی شخصی کیفیات کے اظہار
سے عبارت ہے۔

اس مجموعہ کی دوسری نظموں میں گہری اداسی (جو آج کے
حقیقی فنکار کا مقدر ہے) کی دھندھلاہٹ دکھائی دیتی ہے ساحر
کے اس مجموعہ کی شعری تخلیقات میں محاکاتی اور تجسس آمیز
کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ساحر نے جنگ کے موضوع پر
ایک انتہائی اہم نظم "اے شریف انسانو" کے عنوان سے کہی
جس میں عدم تشدد اور قدیم ہندوستانی رواداری کے فلسفے کے
فکری عناصر جلوہ گر ہیں

"اے شریف انسانو"

(۱)

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لیے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

(۲)

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

جنگ وحشت سے بربریت سے
امن تہذیب و ارتقا کے لیے
جنگ مرگ آفریں سیاست سے
امن انسان کی بقا کے لیے

جنگ افلاس اور غلامی سے
امن بہتر نظام کی خاطر
جنگ بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن بے بس عوام کی خاطر

جنگ سرمائے کے تسلط سے
امن جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن پر امن زندگی کے لیے

ساحر نے امن کے موضوع پر ایک طویل نظم "پرچھائیاں" بھی کہی جو بقول خلیل الرحمٰن اعظمی اس موضوع پر کہی گئی سب سے اہم اور کامیاب نظم ہے۔

ساحر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے مگر ان کا رشتہ اس تخلیقی اور حقیقی شاعری سے استوار رہا جو ادبی اور فنی معیاروں پر پوری اترتی ہو۔ ساحر نے فلمی نغموں میں بڑی خوبی سے ترقی پسند میلانات کو برتا اور جدید سماجی اور سیاسی نظریوں کو عوام تک پہنچایا اور اپنی فن کارانہ مہارت اور جولانیٔ فکر کے قابل قدر نمونے چھوڑے۔ "گاتا جائے بنجارہ" ساحر کے فلمی نغموں کا مجموعہ ہے۔ الغرض بقول جاں نثار اختر فلمی گیتوں کو سطحیت، ذہنی گندگی اور غلاظت کی دلدل سے نکال کر ایک صاف ستھری، عصری اور نکھری شاعری سے روشناس کرایا۔ یہ ساحر کا اہم ادبی کارنامہ ہے۔

بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

—— "ترقی پسند تحریک نے اپنے پچیس سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمایے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اگر تخلیق ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصہ نارسیدہ و ناتراشیدہ ہونے کے سبب ناقابل التفات قرار پائے گا اور چند مخصوص شعراء کا کلام ہی برقرار رہے گا جن کے گرد فن و فکر کا ایسا روشن اور رنگین ہالہ ہے جسے بدلتے ہوئے زمانے کی رو کبھی بے نور نہیں کر سکتی" ——

ساحر کا شمار ان ہی معدودے چند ترقی پسند شعراء میں ہوگا جن کے گرد فن و فکر کا ایک ایسا روشن اور رنگین ہالہ ہے جسے بدلتے ہوئے زمانے کی رو کبھی بے نور نہیں کر سکتی۔

★

ڈاکٹر عبدالرؤف
لکچرار شعبہ اردو
کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ

غزل

جو درد اپنی نگاہوں کی آب و تاب میں ہے
وہ آئینے کی چمک میں نہ آفتاب میں ہے

عطا ہوا اُس کو بھی یارب شعورِ منزل کا
وہ قافلہ جو ابھی وقت کے سراب میں ہے

وہ آگہی کہ ضمانت تھی اپنی قربت کی
ہزار پردوں میں لپٹی ہوئی وہ خواب میں ہے

جو پڑھنا چاہو تو پڑھ لو ہر ایک پہلو سے
ہمارا ذکر بھی لکھا ہوا کتاب میں ہے

شکستہ رشتوں کو اب پھر سے کون جوڑے گا
کمالِ بخیہ گری جانے کس حجاب میں ہے

اخلاق حسین عارف
باردو خانہ۔ گولہ گنج لکھنؤ

امانتؔ کی واسوخت نگاری

سید آغا حسن امانتؔ مشہور و معروف اردو ڈرامہ" اندر سبھا" کے مصنف بہ مقام لکھنؤ ۱۲۳۱ ہجری مطابق ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے علوم رائج الوقت سے فراغت حاصل کی۔ مگر بہ قول ان کے بڑے صاحب زادے سید حسن لطافتؔ "پندرہ سال کی عمر سے شعر و سخن کا آغاز کیا" ۱؎

مراثی اور سلام وغیرہ میں مشہور زمانہ مرثیہ گو میاں دلگیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ غزل گوئی اور دیگر اصناف سخن پر اپنی ذاتی کاوش اور استعداد سے عبور حاصل کیا۔

جس طرح امانتؔ اندر سبھا کی نسبت سے عوام میں مشہور ہوئے اسی طرح واسوخت نگاری کی بدولت اہل علم کے حلقہ میں ممتاز ہوئے۔ جیسا کہ صاحب تذکرہ "مہر جہاں تاب" رقم طراز ہیں:

"این واسوخت کہ حالا شہرتے تمام دارد۔ اگر راست پرسی شہرت امانت بدو شد۔ از ابتدائے طرز واسوخت ایں چنیں واسوخت نہ نوشتہ اند کہ در مراعات النظیر و دیگر صنایع بے نظیر افتادہ بہ لطف سخن و چستی بندش بے سہیم" ۲؎

یہ واسوخت جو اب بڑی شہرت کا حامل ہے اگر حقیقت پوچھو تو یہی امانت کی شہرت کا باعث ہے۔ واسوخت کے طرز ابتدا سے ایسا واسوخت کسی نے نہیں لکھا کہ مراعاۃ النظیر اور دوسری صنعتوں میں بے نظیر ہے اور لطف سخن اور چستی بندش میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس کی مقبولیت کی دوسری تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ یہ پہلی بار ۱۲۷۶ ہجری میں طبع ہوا اس کے بعد بقول سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ "واسوخت امانت پچاسوں مرتبہ چھپا" ۳؎

یوں تو امانتؔ نے چار شاہان اودھ، غازی الدین حیدر، (۱۸۱۴ ـ ۱۸۲۷) نصیر الدین حیدر، (۱۸۲۷ـ ۱۸۳۷)، محمد علی شاہ (۱۸۳۷ ـ ۱۸۴۲) اور امجد علی شاہ (۱۸۴۲ ـ ۱۸۴۷) کے ادوار دیکھے تھے۔ مگر عہد سلطان عالم واجد علی شاہ میں ان کی عمر ۳۲ سال تھی۔ وہ اس سن میں پختہ ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ فنی حیثیت سے جو عروج عہد واجدی ۱۸۴۷ ـ ۱۸۵۶ء میں ہوا وہ اس سے قبل نہیں تھا۔ کیوں کہ دیگر فنون لطیفہ کی سرپرستی کے علاوہ بادشاہ کو بذات خود دو چیزوں سے عشق تھا۔ ایک شاعری دوسری موسیقی۔

اس حساب سے رنگینؔ، نسیمؔ دہلوی، وزیرؔ، برقؔ، رشکؔ، ہنرؔ، منیرؔ، بحرؔ، جلالؔ، تعلقؔ، رندؔ، صباؔ اور اسیرؔ وغیرہ امانتؔ کے ہم عصر قرار پاتے ہیں۔ شہر میں کہیں نہ کہیں تقریباً روزانہ بزم مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی اور شعرا اپنے کلام

[illegible] تھے۔ بقول مولانا شرر:

"[illegible] دنیا میں لکھنؤ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یہاں کا بچہ بچہ فارسی داں تھا۔ جاہل رنڈیوں اور بازاری مزدوروں کی زبان پر فارسی کی غزلیں تھیں اور بھانڈ تک فارسی کی نقلیں کرتے تھے"ہے

اسی تصنیف میں موصوف دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"واجد علی شاہ کا دربار مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ وہی علم اور علماء کی ضرب المثل سرپرستی، وہی ارباب فنون لطیفہ اور علوم مشرقیہ کی قدردانی، وہی جود و سخا"شہ

جس طرح فارسی شاعری سے جملہ اصناف سخن اردو میں منتقل ہوئیں اسی طرح واسوخت بھی فارسی کی دین ہے۔ فارسی میں واسوخت کا موجد وحشی یزدی کو بتایا جاتا ہے۔ اردو میں سب سے پہلے واسوخت پر کس نے طبع آزمائی کی یہ امر تحقیق طلب ہے۔ لیکن ایسا پتہ چلتا ہے کہ سودا کا واسوخت اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے۔ اس نے اپنے واسوخت میں آٹھ مصرعوں سے کام لیا ہے۔ جس میں چھ مصرعے اردو میں اور آخری دو مصرعے فارسی میں ہیں۔ بعدہ شعرا نے مثمن کے بجائے مسدس کو ترجیح دی۔ اس کی ہیئت کو بدل کر ارتقائی منزل تک لے گئے۔ میر کے ذخیرے میں بھی واسوخت ملتے ہیں۔ میر اور مرزا سے لے کر حکیم مومن تک پہنچتے پہنچتے اس صنف سخن میں مزید ترقی ہوئی اور لکھنؤ آکر اس میں اور جلا ہوئی۔

واسوخت کے باب میں مولانا شرر لکھتے ہیں:

"اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں۔ ان کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار اس کے بعد معشوق کا سراپا اس کی بے وفائیاں پھر اس سے روٹھ کر اسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہوگئے ہیں۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کرکے معشوق کو جلانا چھیڑنا جلی کٹی سنانا اور یوں اس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا"ہو

اس سلسلے میں مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:

"واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکائتیں کرتا ہے گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا"شہ

مولانا شرر اور عسکری کے بیانات تشنۂ تشریح ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ واسوخت میں بالعموم تمہید کے طور پر عشق کی تباہ کاریاں اور جاں ستانیاں گنوائی جاتی ہیں پھر گریز سے کام لیتے ہوئے اظہار عشق ہوتا ہے۔ معشوق پر واضح کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے عاشق ہی نے اسے حسن سے آگاہ کیا ورنہ وہ اس کوچہ میں بیگانہ تھا۔ کسی واسوخت میں موقع کی مناسبت سے سراپا بھی بیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد عاشق شکوہ و شکایت کا دفتر کھولتا ہے۔ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ معشوق اسے نظرانداز کرکے دوسروں سے میل جول بڑھانے لگا ہے۔ اس رویہ پر وہ بہت چراغ پا ہوتا ہے اور انتقاماً ایک دوسرا معشوق تلاش کر لیتا ہے۔ جو اس سے وضع قطع اور شکل و شمائل میں بہتر اور افضل ہی نہیں ہے۔ بلکہ پیکر اخلاص و وفا بھی ہے۔ دوسرا محبوب اگرچہ فرضی ہے اور پہلے معشوق کو حسد و رقابت میں جلانے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی بے وفائی سے دست بردار ہو کر عاشق کی جانب دوبارہ ملتفت ہو اور خلوص و وفا کے ساتھ پیش آئے۔ اس منزل تک پہنچ کر عاشق کو اس بات کا اشتباہ ہوتا ہے کہ اس کی اس حرکت سے کہیں معشوق کا دل نہ ٹوٹ جائے چنانچہ وہ قدرے نرم رویہ اختیار کرکے مصالحت کی راہ نکالتا ہے اور بالآخر دونوں کے دل صاف ہو جاتے ہیں اور وہ آپس میں گلے ملتے ہیں یہی واسوخت کا تکنیک ہے۔

شعرائے دلی نے تکلفات سے قطع نظر واسوخت [illegible]

سادے الفاظ میں خطوط بھیجو اور مقصد تک پہنچنے کے لیے تار دیا ہے گزر گیا ہے۔ برخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ کے یہاں واسوخت کے ڈھانچے میں تفصیلات اور استاد طبع کو نکھار کر بیان کرنے کا انداز ملتا ہے۔ ان شعرا نے اس عہد کے ماحول کے مطابق معشوق کا سراپا اور مجلسی رکھ رکھاؤ کے ضمن میں کمال شاعری کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ ان ہی بنیادوں پر امانت نے اپنے واسوخت کی عمارت تیار کی۔

امانت کے علاوہ دبستان لکھنؤ کے متعدد نامور شعرا نے بھی واسوخت پر طبع آزمائی کی جو ان کے دواوین کی زینت ہیں۔ بعض علاحدہ بھی طبع ہوئے۔ اسی دور کے ایک مشہور شاعر عیش نے بہت سے واسوخت یک جا کر کے انھیں کتابی شکل دے دی اور اس کا نام "شعلۂ جوالا" رکھا۔

جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا ہے امانت نے دو واسوخت کہے۔ پہلا واسوخت انھوں نے آغاز جوانی میں لکھا جو ایک سو ستر بندوں پر مشتمل ہے اور ان کے مجموعۂ کلام "خزائن الفصاحت" میں موجود ہے۔ دوسرا واسوخت تین سو سات بندوں پر مشتمل ہے جو "شعلۂ جوالا" میں شامل ہے اور علاحدہ سے بھی طبع شدہ ملتا ہے۔ امانت کا دوسرا واسوخت اردو واسوختوں میں طویل ترین ہے۔ دراصل یہی واسوخت ہے جس نے اس میدان میں امانت کی عظمت و امتیاز کا سکہ بٹھایا اسی کی طرف صاحب تذکرہ "مہر جہاں تاب" نے اشارہ کیا ہے جو ابتدا میں درج کیا جا چکا ہے۔

دونوں واسوختوں میں امانت نے اس کی مقررہ اور متعین راہوں سے انحراف نہیں کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ پلاٹ کے تانے بانے میں قدرے اپچ سے کام لیا ہے۔ پہلے واسوخت میں شاعر نے بچپنے کے عہد پر اپنے زمانے کی یاد تازہ کی ہے۔ جب وہ عشق اور اس کے لوازمات سے نا آشنا تھا۔ اس کی زندگی پرسکون تھی۔ ناگاہ ایک روز اسے علم ہوا کہ اس کا کوئی شناسا کسی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ساتھ ہی اس سے تفصیلات معلوم کیں۔ اس کے بعد وہ خود کسی ماہ رو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جس سے وہ دل لگا سکے۔ آخر ش ایک معشوق اسے مل گیا۔ اس سے گفتگو ہوئی اور وہ بھی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ دونوں مزے سے زندگی گزارنے لگے۔ اسی دوران اس نے معشوق کو کنگھی چوٹی کرنا، کاجل مسّی لگانا، دیدہ زیب لباس پہننا، غرضیکہ خود آرائی کے جملہ انداز سے روشناس کرا دیا۔ شومیٔ قسمت سے جب وہ ان تمام لوازمات سے آراستہ و پیراستہ ہو گیا تو اس نے پَر نکالنے شروع کر دیے اور ادھر ادھر بھی تانک جھانک شروع کر دی۔ یہ صورت حال عاشق کو ناگوار گزری اس نے ایک دوسری پری رو کی آڑ لے کر خبر اس تک پہنچا دی کہ اس کا ناک نقشہ رفتار و گفتار اور دیگر تمام چیزیں اس سے بدرجہا بہتر ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ دوسرا معشوق اپنی گوناگوں دل آویزیوں کے باوصف وفا شعار بھی ہے۔

دوسرے محبوب کا سراپا اور اس کے اوصاف عاشق نے کچھ اس انداز سے واضح کیے کہ وہ حسد کی آگ میں جل کر تڑپنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے افعال پر حد درجہ خجل ہوا اور اس کے سوا کسی اور کو نہ چاہنے کا عہد و پیمان کر کے عاشق کے گلے سے لپٹ گیا۔ عاشق کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا اور اس نے بھی وعدہ کیا کہ وہ اب اس کے سوا کسی غیر سے نہ ملے گا۔ دونوں کی مزے سے نبھنے لگی۔ قصہ تمام ہوا۔

دوسرے واسوخت میں جو طویل ترین ہے پلاٹ پہلے واسوخت جیسا ہے مگر امانت نے اس میں عشق کے مختلف پہلوؤں کو ذرا تفصیل سے بیان کیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتی کہ پہلا واسوخت ابتدائے عشق کی پیداوار ہے جو بہ تقاضائے عشق اتنا پختہ نہیں کہ وہ عشق و ہوس اور اس کے متعلقات کو ایک تجربہ کار اور مشاق کے طور پر پیش کر سکا۔ اس لیے پہلا واسوخت ذاتی مشاہدات و تجربات پر مشتمل ہونے کے بجائے محض کتابی معلوم دیتا ہے۔ جبکہ دوسرے واسوخت میں

جو باریکیاں پیدا کی گئی ہیں اس کا ان کے ہم عصر اساتذہ کے واسوختوں سے موازنہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ وہ ان سے ممتاز اور افضل ہے۔

پہلے واسوخت میں امانتؔ نے تمہید کے طور پر صرف پندرہ بندوں پر اکتفا کی ہے جس میں عشق کی ہونا کی اور عواقب کی نشان دہی کی ہے۔ جبکہ دوسرے واسوخت میں تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اسی کو چوالیس بندوں پر پھیلایا ہے۔ سراپا کے سلسلہ میں بھی کوئی خاص جولانیٔ طبع نظر نہیں آتی جبکہ دوسرے واسوخت میں اس سلسلہ میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور مختلف صنعتوں کے اجاگر کرنے میں بڑی صناعی اور فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ایک مثال سے مطلب واضح کرنے کے لیے دو اساتذہ کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ نقادان ادب کی رائے ہے کہ شعرائے لکھنؤ نے سراپا کے سلسلہ میں خوب خوب کاوشیں کی ہیں۔ محبوبہ کی ناک کے ضمن میں جرأت اور امانتؔ کی بندشیں ملاحظہ ہوں ؎

بینی ایسی ہو کہ دیکھے تو یہ ہو حال تیرا
لوگ کیا جانئے لا لا کے سنگھا دیں کیا کیا
نتھ پہ نتھنوں کی پھڑک سے ہو یہ آفت برپا
کہ یہ خود آئے پہ بھی جائے نہ دل کا دھڑکا
اس کی بو باس میں لوں اور وہ بدن سونگھے مرا
تجھ کو دکھلاؤں میں اور ناک میں دم لاؤں ترا
(جرأتؔ)

خمِ ابرو میں ہے کیا یار کی بینی کی صفا
جیسے ہو طاق میں مینائے بلوریں رکھا
شمع کافور کی محراب حرم میں ہے ضیا
یا کوئی حور در خلد میں ہے جلوہ نما
تو اسے دیکھے تو خود بینی نہ یہ خاک رہے
رشک سے ہو ترا دم ناک میں غم ناک رہے
(امانتؔ)

دونوں بندوں کے تقابل سے مترشح ہوا کہ ہر دو اساتذہ نے اگرچہ کہ ایک ہی چیز پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جرأتؔ نے ناک کی خود نمائی اور نتھنوں کے ارتعاش سے پیدا شدہ کیفیت کو ظاہر کیا ہے اور گو کہ اظہار میں صناعانہ چابکدستی ہے لیکن یہ طریقہ براہ راست بات کو واضح کرنے کے لیے عام فہم نہیں، جبکہ امانت نے تشبیہ اور استعارہ کے ذریعہ اپنے مدعا کا اظہار کیا ہے۔ وہ قاری کو براہ راست بارگاہ حسن میں لے جاتا ہے اور نہایت فن کارانہ اور خوش نما الفاظ میں اظہار حقیقت کرتا ہے۔ وہ ناک کو مینائے بلوریں سے تشبیہ دیتا ہے جو خم ابرو کے طاق میں رکھی ہے۔ پھر اسے محراب حرم میں روشن شمع کافور کہتا ہے۔ وہ اس مقام پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک قدم اور بڑھ کر خلد میں ایک حور کو جلوہ نما دکھا کر ذہن کو منور کر دیتا ہے۔

اس مقام پر ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح سراپا کی چیزوں، گیسو، ابرو، چشم، رخسار، لب، دندان، ذقن، سینہ، کمر اور ساق وغیرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بلاشبہ ان کے مطالعہ سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ امانتؔ کو سراپا کے بیان میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ جیسے عاشق نے محبوب کے سراپا کو کمال صناعی کے ساتھ اس سے مماثل قدرتی اشیاء سے ہم آہنگ کر کے دار فتگی کی ناقابل بیان کیفیت پیدا کی ہے۔ اس سلسلہ کے بندوں میں اس نے معشوق کے ہر ہر عضو کے مقابل اس سے مشابہ چیز کو ملا کر اس طریقہ سے منظر عام پر پیش کیا ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ قامت کے سلسلہ کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

بے کلی کی جو لگی غنچۂ خاطر کو ہوا
خاک عالم کی لگا چھانتے مانند صبا
نالۂ بلبل کی روش کرنے لگے صبح و مسا
کبھی صحرا کبھی گلشن کی طرف جا نکلا
سرو گلزار نے جو بن جو دکھایا مجھ کو
جلوۂ قامتِ جاناں نظر آیا مجھ کو

رنگینی پائی جاتی ہے۔ اس نے اگر اس میں اپنے عہد کی تہذیب
و معاشرت اور مجلسی زندگی کی دل آویز جھلکیاں دکھائی ہیں تو
نہایت رنگین نگاری سے اپنے عہد کی حسن پرستی اور خوش مذاقی
مذہبی عقائد اور رسوم و رواج کے نہایت دلکش مرقعے بھی پیش
کیے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ واسوخت اس
دور کی رنگین مگر جامع تاریخ ہے۔

نقادان ادب کا خیال ہے کہ لفظی صنعت گری اور رعایت
لفظی میں امانت اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہ امانت کے ساتھ زیادتی
ہوگی اگر اسے اپنے دور سے الگ کر کے عصری مذاق پر پرکھا
جائے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ واسوخت معرض وجود میں آیا اور
پہلی بار ایسی مجلس میں پڑھا گیا جس میں صاحب فن حضرات کے
علاوہ رؤسا اور امرا سب ہی موجود تھے اور حاضرین مجلس نے
اسے سن کر تحسین کے نعرے بلند کیے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ
اس دور کے ثقہ حضرات کا مذاق کیا تھا۔؟ چنانچہ امانت نے
پورے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کوئی ایسی بات نہیں کی
جس سے سنجیدگی اور متانت و تہذیب پر حرف آتا۔

امانت نے علاوہ دیگر باتوں کے الفاظ کے استعمال اور ان
کی نشست و برخاست میں نہ صرف معانی ہی کا خیال رکھا ہے
بلکہ اس نے اس کے صوتی حسن کی طرف بھی توجہ دی ہے اور
متعدد مقامات پر معنوی خوبیوں اور صوتی تاثر کی عجیب و غریب
مثال پیش کر دی ہے۔ مثلاً ؎

میٹھی باتوں میں ہے اس کی مزۂ آب حیات
جن کا مشتاق رہے یوسف مصری دن رات
اس کی شیرینیٔ گفتار کرے شہد کو مات
قند باتوں میں وہ گھولے مجھے کچھ آئے نبات
زندگی تلخ ہو شیرینیٔ سخن کی کھو جائے
شربت زیست مجھے زہر ہلاہل ہو جائے

بال الجھے ہیں تو پروا نہیں اس کو سر مو
چوٹی موباف سے برہم ہے سراسر یک سو
مانگ کج رہتی ہے شانے سے کشیدہ گیسو
عاری رکھتا ہے آئینہ سے وہ آئینہ رو
تیری صورت کوئی کب شکل کا دم بھرتا ہے
اپنے چہرہ کی طرف رخ وہ نہیں کرتا ہے

اب ذرا گفتگو کی خالص گھریلو زندگی میں ہونے والی گفتگو
کے نمونے ملاحظہ ہوں۔ یہ وہ محل ہے جب عاشق و معشوق تنہا
بیٹھے ہیں شکوے شکایت کا دفتر کھلا ہے۔ معشوق کو راہ پر لانے
کے لیے عاشق ایک فرضی محبوب کی بات لے کر محو گفتگو ہے۔
چاہتا ہے کہ کسی طرح معشوق کو سیدھی راہ لے آئے۔ لاٹھی
بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ معشوق مصالحت پر آمادہ
نظر آتا ہے۔ عاشق اس کے سامنے ایک صورت پیش کرتا ہے۔ ؎

ہاں اب اس شکل میں اخلاص کی صورت ہوگی
پھر قسم کھاؤں "بڑی چیز" اٹھائیے تو بھی
یعنی غیروں سے ملاقات کروں گر میں کبھی
ایک ہفتہ میں سزا دیوے جناب احدی
اس پہ راضی ہو تو قرآن اٹھا لاؤں میں
رکھ تو اسے مصحف رخ ہاتھ، قسم کھاؤں میں

اس کے بعد عاشق و معشوق کے مابین عہد و پیمان کی تجدید
ہوتی ہے۔ معشوق مطالبہ پیش کرتا ہے۔ ؎

پھر لگا مجھ قسم دے کے وہ اپنے سر کی
دست بردار ہو یک دست اب اس سے تو بھی
پاؤں پڑ پڑ کے اگر دیوے بلا بیٹھ وہ بھی
ہاتھ توڑ کے جھٹک دے کے چلے الٹا بھی
ہم بغل ہوئے تو پہلو سے اٹھانا اس کو
بوسے دیوے تو ذرا منہ نہ لگانا اس کو

اس مطالبہ میں شدت لانے کے لیے معشوق کہتا ہے
(باقی صفحہ ...)

فاطمہ حسن
گلستان کالونی لکھنؤ

(افسانہ)

فاصلے

کوٹھی میں غیر معمولی طور پر سناٹا تھا۔ ڈاکٹر شعیب نے گاڑی پورٹیکو میں کھڑی کر دی۔ دونوں بچیاں موٹا اور رعنا اندر نانا امی کے پاس دوڑی گئیں لیکن شعیب اور زیبا کو احساس ہو گیا تھا کہ کوٹھی میں چھائی خاموشی بے معنی نہیں ہے۔ سامنے صاف ستھرے لان کی مخملی گھاس پر ڈوبتے سورج کی سنہری شعاعیں پھیلی تھیں۔ بڑے آہستہ قدموں سے شعیب و زیبا کوٹھی کے اندر گئے۔ تخت پر رنگ برنگے کپڑے پھیلے پڑے تھے۔ امی گوٹا کناری سمیٹ کر اٹھا رہی تھیں۔ ڈاکٹر شعیب اور زیبا کو جواباً دعائیں دیتے ہوئے امی کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ آہستہ آہستہ امی کہہ رہی تھیں کیا کروں اچھے سے اچھے پیغام کو بھی شہنا رد کر دیتی ہے۔ اللہ جانے کیا وجہ ہے۔ اپنے ابی کے سمجھانے پر کچھ دنوں تک چپ تھی۔ مگر آج پھر وہی۔۔ ۔ امی آگے بول نہ سکیں ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ مگر شعیب و زیبا سمجھ گئے تھے کہ شہنا نے پھر شادی سے انکار کر دیا ہے۔

امی کہہ رہی تھیں، کیا کیا جائے، کیسے سمجھائیں، شادی سے انکار کرنے کی کوئی وجہ تو ہو، بیٹی کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، اپنے پیروں پر کھڑی ہو بھی جائے لیکن والدین کی ذمہ داری کب ختم ہوتی ہے۔ وہ تو جب ہی سبکدوش ہوں گے جب بیٹی کا ہاتھ اس کی زندگی کے ہم سفر کے ہاتھوں میں دے دیں۔ کون ہے [illegible] شہنا کو سمجھائے۔

[illegible] اس کی [illegible] اسے سمجھا [illegible] سہیلیاں ہر طرح کی کوششیں کر کے تھک چکی تھیں۔ بظاہر کوئی وجہ نہ تھی اور شہنا بتاتی بھی کچھ نہیں تھی۔

آج بڑی آس بھری نگاہوں سے امی نے داماد کی طرف دیکھا۔ انھیں خیال آیا شاید ڈاکٹر شعیب کے سمجھانے سے ہی شہنا شادی کے لیے رضامند ہو جائے۔ اتنے اچھے اچھے پیغام لوٹائے جا چکے تھے اور اب تو امی کو ڈر تھا کہیں پیغام ہی آنا نہ بند ہو جائیں اس لیے ممکن ہے شعیب کی بات شہنا مان لے۔ امی کی بات سن کر ڈاکٹر شعیب کچھ جواب نہ دے سکے، انھیں لگا حلق میں کچھ پھنس گیا ہے۔ کیسے بتاتے، کیا کہتے! تقدیر کا مذاق وہ خود سمجھتے تھے یا پھر شہنا۔

شہنا کو جب شعیب نے پہلی بار دیکھا تھا تو انھیں ایسا لگا کہ زمین نے گردش بند کر دی ہے، وقت ٹھہر گیا ہے۔ جھیل سی گہرائی لیے دو آنکھیں جیسے کائنات کو سمیٹے لے رہی ہوں۔ نظر اٹھیں، ملیں اور پھر جھک گئیں، عکس دل میں اتر گئے، شعیب مسکرا اٹھا کوئی لطیف سا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ زندگی نے بار بار اور حالات نے اکثر موقع فراہم کیا کہ شہنا اس کے سامنے ہوتی اور وہ شہنا کے۔ زبانیں خاموش رہتیں لیکن نگاہیں بہت کچھ کہہ جاتیں۔ چھٹیوں میں جب بھی وہ گھر آتا کہیں نہ کہیں شہنا [illegible] اسے ضرور نظر آتی۔

شعیب [illegible] کورس مکمل کر کے [illegible] ہو گیا تھا [illegible] ہے، گھر [illegible]

[illegible] نے بتایا آپی نے بڑی اچھی لڑکی پسند کی ہے آپ کے لیے۔ وہ لوگ آپ کو دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے بلایا ہو[گا]
بہن کی بات سن کر شعیب کو الجھن شروع ہو گئی۔ اب تک تو وہ اپنی زندگی میں صرف شہنا کو دیکھ رہا تھا۔ اب امی نے بھی تو کیسے اور کیا؟ پھر بھی دل کی بات امی سے تو کہنا ہی پڑے گی ورنہ۔۔۔۔۔ وہ آگے کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ دل کی بات زبان پر آئے امی خوشی سے گلنار چہرہ لیے مسکرا کر بیٹے سے کہہ رہی تھیں "مختار احمد ایگزیکٹیو انجینئر کی بیٹی ہے۔" شعیب کا دل اچھل پڑا یہ تو شہنا کے والد کا نام ہے۔
"بہت خوبصورت اور بڑی پیاری لڑکی ہے مجھے بہت پسند ہے۔ ہر لحاظ سے وہ تمہارے لیے مناسب ہے۔ ٹرانسفر کی وجہ سے والدین سے الگ ضرور رہی ہے مگر ہے بڑی ذمہ دار لڑکی" امی تعریفیں کرتی رہیں۔ شعیب پرسکون اور مطمئن بیٹھا خوشی سے سن رہا تھا۔ بات وہی رہی جو وہ چاہتا تھا۔ دراصل شہنا پسند کرنے والی لڑکی ہی تھی اور امی نے اسے بیٹے کی سعادت مندی سے تعبیر کیا۔

معمولی رسموں کے بعد شعیب واپس چلا گیا لیکن اس بار وہ شہنا کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ آج تک چند رسمی جملوں کے سوا شہنا سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی وہ تو صرف نگاہوں کے پیغام پڑھتا رہا تھا۔

شادی کی معینہ تاریخ سے ایک روز قبل شعیب گھر پہنچا تو اس کی امی اور جہاں آئی بیگمات نے شکوے شکایتوں کے دفتر کھول دیے تھے۔ عین وقت پر آنے سے ساری رسمیں رکی ہوئی تھیں۔ شعیب مسکرا کر چپ ہو رہا تھا۔ دراصل وہ اپنی چھٹیاں شادی کے بعد شہنا کے ساتھ گزارنے کے لیے بچا رہا تھا۔

نکاح کے وقت قاضی کی زبان سے زیبا احمد کا نام سن کر شعیب چونکا لیکن فوراً ہی اسے خیال ہوا تو یہ شہنا کا اصلی نام ہے۔ لیکن آرسی مصحف کی رسم کے وقت چاند لگے فریم میں [illegible] آئینہ میں شہنا کے بجائے شہنا سے مشابہت رکھنے والا دوسرا چہرہ تھا۔ شعیب گھبرا اٹھا۔ شادی کی رسمیں ہوتی رہیں۔ بیگمات اور خواتین کی زبان سے اس نے شہنا کا نام کئی بار سنا تو اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ زیبا شہنا کی بڑی بہن ہے۔ تقدیر کے اس ستم پر شعیب نہ ہنس پایا اور نہ ہی رو سکا۔ اجازت کی طبیعت بنے روتے دل کے ساتھ وہ دلہن کو گھر لایا۔ اس کی ادا کاری صرف نقلی ہی بجھی بجھی تھی۔

شعیب کے ذہن میں خیالات الجھتے رہے۔ جہاں خواتین اور بیگمات دلہن کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتی رہیں اور شعیب کا دل روتا رہا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ بس ایک خوابیدہ کیفیت کے تحت وہ باتیں کرتا رہا، جواب دیتا رہا۔

شادی کے بعد زیبا کو لے کر وہ پہلی بار سسرال گیا۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں شہنا نظر آئی۔ شعیب کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے کنول بجھ گئے تھے۔ چہرہ کی دمک اس کے سامنے آتے ہی ماند پڑ گئی تھی۔ برسوں سے شہنا کی آنکھوں کو پڑھتا آیا تھا۔ آج ان آنکھوں میں سہمی سہمی سی التجا تھی۔

بیگمات میں سے کسی نے کہا: "یہ تمہاری چھوٹی سالی ہے شہنا۔" لیکن شعیب مسکرانے کے بجائے اور سمٹ گیا تھا۔ شعیب اس سے نہ تو مذاق کر سکا اور نہ شہنا ہی نے کسی مذاق اور رسم میں خود سے پیشوائی کی۔ بس لڑکیوں کے ساتھ شامل رہی۔ سسرال کی ان رسموں کو بڑی بے دلی سے شعیب پورا کر رہا تھا جو آج ہونا تھیں۔

اپنے گھر واپس آ کر شعیب نے بڑی گہری اور ٹھنڈی سانس لی یہاں اسے قدرے سکون ملا۔ لیکن امی کے سوالوں سے بچنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح بیماری اور تھکان کا بہانا کر کے وہ امی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا عجیب بیماری تھی۔ مرد کے ہونے سے وہ رو بھی تو نہ سکتا تھا۔

چھٹیوں کے ختم ہونے سے [illegible] آیا تھا اور امی نے [illegible]

نہیں جائے گا ـــــ زیبا اس کے ساتھ تھی اُف یہ شعیب نے سوچا تھا۔ فاصلے اور دوریاں اسے زیبا سے قریب کر دیں گے اور وہ شہنا کو بھول جائے گا مگر ہوا کچھ اور ہی۔ زیبا کی قربت میں بھی شہنا اس کے خیالوں میں بسی رہی۔ شعیب نے اپنی مصروفیت بڑھا لی تھی۔ تاکہ بھٹکتے ذہن کو راحت ملے مگر جگنوؤں کی مانند چمکتا ہوا شہنا کا تصور اس کے ذہن کے پردوں پر ابھرتا رہتا اور اسے بے چین کرتا رہتا۔

زیبا میکے جاتی تو شعیب اس کے ساتھ نہ جاتا، ہمیشہ چھٹی نہ ملنے کا عذر کرتا اور زیبا سے بعد میں آنے کو کہہ کر اسے میکے بھیج دیتا۔ زیبا کے خطوط اسے بلاتے رہتے۔ خوشدامن بڑی محبت اور اپنائیت سے لکھتیں "فرصت نکال کر ایک ہی دن کے لیے آجاؤ" ایسے موقعوں پر ڈاکٹر شعیب زیبا کو فوراً میکے سے واپس بلا لیتے تھے۔

واپس آکر جہاں زیبا میکے کا مفصل حال بیان کرتی وہاں شہنا کی شادی کا بھی ذکر کرتی۔ اعلا عہدے پر فائز اچھے تعلیم یافتہ و خاندانی لڑکوں کے پیغام برابر آرہے تھے لیکن شہنا کسی طرح شادی پر رضامند نہیں ہوتی ہے۔ زیبا کی زبان سے یہ سب سن کر شعیب کو ایک دھکا سا لگتا۔ وہ خود کو مجرم محسوس کرتا۔ شہنا کیوں خوشیوں سے منہ موڑ رہی ہے آخر اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ وہ فکرمند سا ہو جاتا... اور اداسیاں گہری ہو جاتیں۔

دوسری بیٹی کی ولادت پر زیبا سخت بیمار ہو گئی تو مجبوراً شعیب کو سسرال جانا ہی پڑا۔ وہ شہنا کی ایک آدھ جھلک ہی دیکھ سکے۔ وہ جلدی ہی واپس لوٹ آئے تھے۔ زیادہ رہنے سے کہیں ان کے دل کا حال گھر والوں پر ظاہر نہ ہو جائے۔

وقت کے ساتھ زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ وقت گزرتا رہا لیکن شہنا پھر بھی شادی کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس کے ابّو کے ریٹائرمنٹ میں اب بہت کم دن رہ گئے تھے۔ اس بار ایک لمبے وقفے کے بعد شہنا کے لیے ایک پیغام آیا۔ والدین کی ٹوٹی آس پھر سے بندھ گئی۔

ابّی نے اشکبار آنکھوں سے شہنا کو اپنے دل کا ارمان بتایا۔ ساتھ ہی ماں کی گھبراہٹ اور بے اطمینانی کی وجہ سمجھائی۔ والدین کی اس سے بڑی اور کیا آرزو ہو سکتی ہے کہ اولاد کا گھر بس جائے۔ پدرانہ شفقت کے سامنے شہنا پگھل گئی۔ ابّی نے لڑکے والوں سے حامی بھر لی۔ امی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ زیبا اور شعیب کو بلا بھیجا تاکہ کچھ ہاتھ بٹے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل ہی شہنا اپنا فیصلہ بدل چکی تھی۔

زیبا اور اس کی امی کے اصرار پر ڈاکٹر شعیب کو بھی خیال آیا" اگر شہنا شادی کر لے تو خود ان کے دل کا بوجھ بھی اتر جائے گا۔ ڈاکٹر شعیب ہمت کر کے اٹھے۔ شہنا اپنے کمرے میں تھی۔

زیبا اور ڈاکٹر شعیب کمرے میں داخل ہوئے سامنے شہنا بیٹھی تھی۔ روئی روئی سی آنکھیں بکھرے بال۔ شعیب ٹھٹھک سا گیا۔ شعیب کو سامنے دیکھ کر شہنا بھی گھبرا سی گئی۔ اس کا ہاتھ ماتھے تک گیا مگر مبہوت کھڑے ڈاکٹر شعیب میں گویائی کی سکت کب تھی جو اس کے سلام کا جواب دیتے۔ زیبا شہنا سے باتیں کرنے لگی۔ اور وہ اپنے حواس جمع کرتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار آج اسے خود اپنی بیچارگی پر رحم آیا۔ زیبا کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے وہ بڑی احتیاط سے جملے ترتیب دے رہا تھا۔ اسی وقت امی نے زیبا کو پکارا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی تو شعیب جیسے خواب سے چونکا نظریں جھکائے سامنے شہنا بیٹھی تھی۔ سکوت اور معصومیت کی مورت کو تکتے ہوئے آخر شعیب نے کہنا شروع کیا" بہت دنوں سے سن رہا ہوں شہنا۔ اسی لیے آج پوچھنے آیا ہوں۔ تم آخر زندگی کے اندھیروں میں بھٹکنا کیوں چاہتی ہو؟"

شہنا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں جھیل کی ان گہرائیوں

[illegible] کیا تمھیں بھی کچھ بتانا ہے؟"

[illegible] گیا۔ شہنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ [illegible] شعیب کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہا۔ کچھ لمحے یوں ہی گزر گئے۔ شعیب نے آہستہ سے اعتراف کیا "سب کچھ جانتا ہوں مگر میری وجہ سے یوں اپنے آپ کو نہ مٹاؤ" برسوں سے دل کی ساری مایوسیاں آج الفاظ کی صورت میں شعیب کی زبان پر خود بخود آگئی تھیں۔ تقدیر کا ستم اور خود اس کی نا سمجھی کہ وہ شہنا کو ہی والدین کی تنہا اولاد سمجھ بیٹھا تھا۔ زیبا اور شہنا دونوں بہنیں ہیں یہ تو شادی کے وقت ہی اسے معلوم ہوا تھا۔ زیبا ماموں جان کے پاس رہتی تھی۔ اس کا علم بھی اسے بعد ہی میں ہوا۔ زندگی نے عجیب مذاق کیا تھا ان کے ساتھ۔ شہنا کے آنسو تھم چکے تھے۔ اس درمیان کب زیبا کمرے کے اندر آئی اور کب سے وہ بیٹھی تھی۔ دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ شعیب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر فوراً بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنے اطراف سے کچھ سہارا چاہا لیکن خاموش و ساکت در و دیوار پر بہت سے سوالیہ نشان ابھر آئے تھے۔ شعیب اٹھ کر کمرے کے باہر چلے گئے۔

دوسری صبح ایک ایسا سانحہ لے کر آئی کہ سارا گھر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ زیبا نے رات میں زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ تکیہ کے نیچے رکھے پرچے پر زیبا کی تحریر تھی۔ اس نے شعیب اور شہنا کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

ناموس کا پاس رکھنا تھا اس لیے اچانک موت کا سبب زیبا کا ہارٹ فیل ہو جانا ہی بتایا گیا تھا۔ نہ صرف کوٹھی کے اندر و باہر بلکہ شعیب کے والدین کو بھی یہی سمجھایا گیا تھا۔ دل کے ٹوٹے ٹکڑوں پر صبر و ضبط کی سل زبردستی رکھنا پڑی تھی۔ اس صدمے نے خود شعیب کا دل مسوس کر رکھ دیا تھا وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ بے بسی کے مارے اس کی آنکھیں چھلک آتیں اسے [illegible] جیسے خود اپنا وجود آنسوؤں میں بہنے لگا ہو۔ مجبوراً اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور زیبا کی امی سے رخصت ہونے آیا۔ شعیب کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ ہی بولتی گئیں۔ الفاظ سسکیوں کے درمیان ٹوٹتے جا رہے تھے مگر شعیب کا دل رکھنے کے لیے وہ کہہ رہی تھیں۔ "رشتہ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ گھر اب بھی تمھارا ہے جب جی چاہے چلے آنا تم فکر نہ کرنا، بچیاں تو ابھی میرے پاس ہیں۔ کچھ دنوں بعد آکر لے جانا۔"

شعیب بچیوں کو چھوڑ کر اپنی پوسٹنگ پر چلا آیا تھا۔ کئی دنوں تک اس پر ایک خوابیدہ سی کیفیت طاری رہی۔ اس کا احساس ذہن پے در پے زندگی کے وار سہہ رہا تھا۔ اس گھر میں اب صرف زیبا کی پرچھائیاں رہ گئی تھیں شہنا کی زندگی میں بہاریں لانے کی کوشش میں خود اپنا آشیانہ لٹا بیٹھا تھا۔

کچھ عرصہ بعد بچیوں کو لے کر شعیب کی والدہ اس کے پاس آگئی تھیں۔ مگر شعیب خاموش رہتا گھر اور بچیوں میں بہت کم دلچسپی لیتا۔ زندگی میں عجیب طرح کا جمود طاری تھا۔ امی اس کی کیفیت دیکھ کر خود رو پڑتیں۔ وہ سوچتیں تیزی سے گزرتے وقت کے ساتھ شعیب کا زخم بھی مندمل ہو جائے گا اس لیے ایک سال گزر جانے کے بعد ہی شعیب سے دوسری شادی کا ذکر کیا جائے۔

مگر وقت نہ تو پر لگا کر اڑا اور نہ ہی ہوا کے دوش پر۔ بلکہ دن، ہفتے، مہینے اور سال گزرے، ایک عمر گزری ایک زمانہ گزر گیا تو امی شعیب کو سمجھا رہی تھیں "ماں کا بدل خالہ ہی ہو سکتی ہے شہنا اور زیبا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے لیے نہ سہی بچیوں کا خیال کرو۔ ان کی صورتیں دیکھ کر میرا دل ہولتا ہوتا ہے۔" امی اپنی دلی کیفیت کو الفاظ کے جامے پہناتی رہیں اور شعیب کے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکتا رہا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور روزانہ کی طرح اسپتال میں ضروری آپریشن کا عذر کر کے چل دیا۔ [illegible] اس کے بعد بھی امی نے کئی بار شعیب سے دوسری شادی کے لیے

کی بات کی مگر وہ کچھ بولے ہی نہیں تھے۔
آخر شہنا کی امی نے بھی تو یہی سوال اٹھایا۔ بچیوں کو دیکھنے کے لیے وہ کئی بار ڈاکٹر شعیب کے گھر آئیں اور شعیب کی امی سے بہت سی باتیں انھوں نے کیں۔ دونوں کا ایک ہی خیال تھا۔ شعیب اور بچیوں کے لیے ان کے غم کا مداوا شہنا ہی بن سکتی ہے۔ دونوں نے اپنی جگہ پر طے کر لیا تھا مگر جب بھی وہ لوگ شعیب سے اس موضوع پر بات کرتیں وہ بالکل خاموش ہی رہتا۔ ہر بات سنتا رہتا مگر زبان سے کچھ نہ کہتا۔ شعیب نے خود کو زندگی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا وہ اسی خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ امی اس کے دل کا حال نہ جان پائیں۔ اس کی رضا کے بغیر کچھ ممکن بھی تو نہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد بچیوں کو دیکھنے کے لیے شہنا بھی اپنی امی کے ہمراہ آئی تو شعیب کو محسوس ہوا کہ گھر میں نور آ گیا ہے۔ گھر کے ہر کونے میں اجالا سا پھیل گیا ہے۔ سامنے شہنا کی امی بیٹھی تھیں۔ دونوں بچیاں شہنا کو مستقل طور پر رک جانے اور رہنے کو کہہ رہی تھیں۔ شعیب کی امی مسکرا رہی تھیں ان کی دلی مراد اس وقت بچیوں کی زبان پر تھی۔ بچیوں نے اپنی بات شعیب سے بھی تو آج پہلی بار بے ساختہ شعیب کہہ اٹھے "ہاں ۔ انھیں تو یہاں رہنا ہی چاہیے۔" شہنا سرخ تمتاتے چہرے کو لیے بڑی سرعت سے کمرے کے باہر نکل گئی۔ مدتوں بعد آج شعیب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔

کافی رات گزر جانے پر بھی شعیب کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ یادوں کے ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ بیتی شام سے ہی وہ تحیر پڑا تھا۔ دھندلی دھندلی سی شام کی تنہائی میں ساری یادیں ایک ساتھ سمٹ آئی تھیں۔ یادوں کے جھروکے میں دو پرچھائیاں تھیں۔ زیبا اور شہنا دونوں ہی اس کی زندگی میں [illegible] کردہ تھیں۔ زندگی نے عجب [illegible] کیا تھا اس کے ساتھ شہنا کو اپنا لیا تو زیبا کی۔ شہنا کی یادوں کو دل میں چھپائے اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور جینے کے لیے جی رہا تھا لیکن زیبا نے خود کو راہ کا پتھر سمجھ کر اس کی خوشیوں کے لیے راستہ خالی کر دیا تھا مگر یہ ساری باتیں سوالیہ نقش بن کر اس کے سامنے ابھر آتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے شہنا اور اس کے درمیان کھڑی دیوار پر بہت سے نقش ابھر آتے تھے۔ جنھیں مٹانے کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوتی تھی۔ ماضی مختلف رنگوں میں بڑی خودسری سے پھر سر اٹھا رہا تھا اور وہ خود لاچاری کی تصویر بن جاتا اور وقت برسوں پیچھے لوٹ جاتا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی ویران ہو چکی تھی۔ چاند کی آرزو میں کبھی وہ خود چکور تھا لیکن وقت اور حالات نے کچھ ایسا رخ بدلا کہ چاند خود اس کے آنگن میں اترنا چاہتا تھا اور وہ آغوش تمنا پھیلائے تھا۔ روزانہ کے معمول کے مطابق ناشتہ کی میز کے گرد بیٹھے گھر کے تمام افراد باتوں میں مصروف تھے۔ بچیوں کا معصوم اصرار تھا "شنا امی جا رہی ہیں تو جائیں مگر خالہ شہنا یہیں رہیں گی۔" شعیب کی امی اپنی دلی خواہش کب تک دبائے رکھتیں بیٹے شعیب سے پوچھ بیٹھیں۔

شعیب نے سامنے بیٹھی شہنا کو دیکھا۔ ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا "میرے لیے ان سونے پن میں جو راحتیں ہیں اسے آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ امی اپنی موجودہ زندگی میں میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شعیب اٹھ کر اسپتال چلا گیا۔ امی کے ساتھ شہنا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چکور نے چاند کو پانے کی ہمیشہ تمنا ہی کی ہے لیکن دونوں کے درمیان فاصلے کب ختم ہوتے ہیں۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب :۔ نیرنگ خیال ۔ شاعر : ڈاکٹر ناظم جعفری
ملنے کا پتہ : حکیم محمد جعفر روڈ۔ وارانسی قیمت :۔ ۱۵ روپئے ۔

اردو شاعری کی کئی اصناف پر مبنی کچھ دیگر کتابوں کے مصنف اور شاعر ڈاکٹر ناظم جعفری کی یہ نئی کتاب سانیٹ نگاری کا لائق اعتراف نمونہ ہے ۔ سانیٹ ایک نو متعارف صنف سخن ہے اس فن میں اطالوی شاعر پیٹرارک کے علاوہ شکسپیر، اسپنسر ملٹن اور ورڈز ورتھ نے بیش بہا اضافے اور تجربے کیے ہیں خصوصاً ملٹن کا ایک سانیٹ "ON HIS BLINDNESS" اور شکسپیر کا " TRUE LOVE " شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اردو میں پہلا سانیٹ اختر جوناگڈھی نے لکھا تھا اس کے بعد اختر شیرانی نے اس کو اپنے رنگا رنگ خیالات سے آشنا کیا اور رومان انگیز کیا اور پھر ن ۔ م ۔ راشد نے تو اپنے سانیٹ زندگی سے اسے ایک نئی زندگی دے دی ۔ یہاں عزیز تمنائی کے وہ ایک سو سانیٹ بھی بھلائے نہیں جا سکتے "جو" برگ نوخیز" کے نام سے منظر عام پر آسکے تھے یا (با قاعدہ طور پر ایک تحقیقی کتاب "اردو شاعری میں سانیٹ" کے نام سے ڈاکٹر حنیف کیفی نے لکھی ہے) ان تمام کاوشوں سے یہ صنف معتبر ہو چکی ہے اور اس کے اعتبار کو دوبالا کرنے میں ڈاکٹر ناظم جعفری نے بھی ایک نمایاں رول ادا کیا ہے ۔

اب تک اردو میں "نغمات" (شائق وارثی بریلوی) اور "برگ نوخیز" (عزیز تمنائی) دو کتابیں سانیٹ کی تعمیری حیثیت رکھتی تھیں ۔ اس سفر کو آگے بڑھانے اور خوبصورت منزل کے حصول کو ڈاکٹر ناظم جعفری نے اپنے مجموعے "نیرنگ خیال" سے تقویت بخشی ہے ۔ سانیٹ کے سہ رنگ انداز فکر نے اسے لائق مطالعہ قرار دے دیا ہے ۔ (تسنیم فاروقی)

★

امانت کی واسوخت نگاری (صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

مجھ کو بیٹھے جو رلائے نہ اسے ہنس ہنس کر
قبر میں مجھ کو اتارے جو چڑھائے اسے سر

مجھ کو سہے ہے کرے فریاد سنے اس کی اگر
پھول میرے کرے گر ہوکے شگفتہ دیکھے

حلوا کھلائے مرا میٹھی جو کرے اس پہ نظر
زندہ دل اس کو جو دیکھے مرا مردہ دیکھے

★

(حواشی)

۱ دیباچہ خزائن الفصاحت دیوان امانت ۔ ۲ قلمی نسخہ سید فخرالدین احمد مملوکہ سید ابوالحسن علی ندوی نبیرۂ مصنف ۔
۳ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج حصہ دوم صفحہ ۲۰، طبع دوم ۱۹۶۸ء نظامی پریس لکھنؤ ۔
۴ گزشتہ لکھنؤ از مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی ۔
۵ گزشتہ لکھنؤ از مولانا عبدالحلیم شرر ۔ ۶ "تاریخ ادب اردو" رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری ۔
۷ منشی فدا علی عیش معروف بہ اچھے صاحب یکے از شیخ زادگان لکھنؤ ۔ ۸ مطبع نول کشور طبع اول سال طبع ۱۲۷۵ ہجری ۔ ۹ قرآن مجید

جلد ۳۶ نمبر ۵

اگست ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

فی شمارہ: پچاس پیسے
سالانہ: پانچ روپے

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

اس سال ہم اپنی آزادی کی ۳۴ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ ہمیں غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوئے ۳۴ سال پورے ہو گئے۔ اس مدت میں ہم نے اپنی آزادی کو نہ صرف یہ کہ مستحکم کیا بلکہ شاہ راہ ترقی پر ثابت قدمی سے برابر گامزن بھی رہے۔ حصول آزادی کے بعد ہمارے رہنماؤں، خاص طور سے ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس ملک میں ایک نیا تجربہ کیا جو پارلیمانی جمہوریت اور سوشلزم کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا تھا۔ دنیا کے اور ملکوں میں سوشلزم جمہوری ڈھنگ سے نہیں آیا، بلکہ آمرانہ یا نیم آمرانہ ڈھنگ سے آیا۔ لیکن ہندستان دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جہاں جمہوریت کے راستے پر چل کر سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس نے تمام عالم کو چونکا دیا اور پھر یہی تجربہ بہت سے ملکوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بن گیا۔ بعد میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی فعال قیادت میں بھی جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کو مستحکم بنانے کے لیے بڑے ہی موثر اور دور رس اقدامات کیے گئے، جن کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ہندستان نے سائنس خاص طور سے خلائی سائنس کے میدان میں نمایاں اور قابل ذکر ترقی کی۔ ہندستان نے زمین کا مشاہدہ کرنے والے دو مصنوعی ذیلی سیارے "آریہ بھٹ" اور "بھاسکر" خلا میں بھیجے پھر گزشتہ سال ایک اور مصنوعی ذیلی سیارہ "روہنی" بھی خلا میں بھیجا گیا۔ اس سال جون میں ایک اور مصنوعی سیارہ "ایپل" خلا میں بھیجا گیا جس کا وزن ۶۷۳ کیلو گرام ہے اس سیارے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر ہندستان ہی میں تیار کیا گیا ہے اس میں استعمال ہونے والے بہت سے پرزے بھی ہندستان کے اندر ہی تیار ہوئے ہیں۔ اس سے قبل "آریہ بھٹ" "بھاسکر" اور "روہنی" کو خلا میں بھیجنے کا مقصد خلا سے متعلق سائنسی صلاحیت کی آزمائش کرنا تھا۔ لیکن "ایپل" ایک تجرباتی مواصلاتی سیارہ ہے۔ ایک مواصلاتی مصنوعی سیارہ بہ یک وقت ۱۲ ٹیلی ویژن پروگرام اور ۱۵ ہزار سے زائد ٹیلی فون کالیں ایک ساتھ ریلے کر سکتا ہے۔ گزشتہ سال نومبر میں سکندر آباد (اتر پردیش) میں مصنوعی سیارہ جاتی مواصلات کے لیے استعمال ہونے والا ایک انٹینا بھی قائم کیا گیا، جو پورٹ بلیئر (انڈمان)، کارنکوبار، منی کوائے اور لیہہ جیسے مقامات کو ٹیلی فون کے ذریعہ نئی دہلی سے براہ راست مربوط کرتا ہے۔ جب ہندستان کا مصنوعی مواصلاتی سیارہ "انسیٹ" تیار ہو جائے گا تو نہ صرف یہ کہ دور افتادہ اور سمندر پار کے شہروں سے ٹیلی فون کالیں آ سکیں گی، بلکہ دور دراز کے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام بھی ہندستان میں دیکھے جا سکیں گے۔ "ایپل" کے ذریعہ جو تجربہ کیا جا رہا ہے، وہ اسی سلسلے میں ہے۔ مصنوعی سیارہ مواصلات کے لیے جب بالکل تیار ہو جائے گا تو خلائی تحقیق سے متعلق ہندستانی ادارہ اور محکمہ ڈاک و تار متعدد تجربے کریں گے، جن سے ملک کے مواصلاتی نظام میں انقلابی تبدیلی لانے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد صنعت کاری، انجینیرنگ، ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس، اور اعلا تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ ہندستان نے خلائی سائنس کے میدان میں بھی خاصی پیش رفت کی ہے جو ایک آزاد ملک کے باشندوں کی حیثیت سے ہم سب کے لیے قابل فخر ہے۔ معاشی محاذ پر جہاں قیمتیں بڑھی ہیں وہیں قوت خرید میں بھی قابل اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمیں اسی پر اکتفا کر کے بیٹھ نہیں رہنا ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے جسے مکمل کرنے کے لیے ہمیں جنگ آزادی والی اسپرٹ سے کام لینا ہوگا۔ ہر کام اور ہر ذمہ داری حکومت پر ہی چھوڑ دینے کا رجحان ہمیں ترک کرنا ہوگا۔ اپنی سطح پر ہمیں خود بھی بہت کچھ کرنا ہوگا اور پھر پارلیمانی جمہوریت میں حکومت ہم سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ حکومت ہم خود بناتے ہیں اور اس کے لیے اپنے درمیان سے ہی افراد کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح حکومت اور اقتدار کی اصل بنیاد تو ہم خود ہیں۔ چنانچہ تعمیری اور ترقیاتی سرگرمیوں میں حکومت کو عملی تعاون دینا ہمارا فریضہ ہے۔ ہمیں ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کرنے والے طبقے کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کرنا ہوگا۔ ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں اور فرقہ وارانہ، لسانی اور علاقائی منافرت پھیلانے والے عناصر کے خلاف ایک سماجی شعور پیدا کرنا ہوگا بلکہ ان طبقوں اور عناصر کا سماجی بائیکاٹ کرنا ہوگا تبھی ہم ان لعنتوں سے اپنے معاشرہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا سکیں گے۔ یہ لعنتیں تنہا حکومت کے اقدامات کے ذریعہ ختم نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح ہمیں ذات پات کی تفریق کے خلاف بھی مسلسل لڑنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ فرقہ وارانہ منافرت، لسانی اور علاقائی عصبیت کے ساتھ ساتھ ذات پات کی تفریق بھی آزادی کی بہت بڑی دشمن ہے۔ آئیے یوم آزادی کے اس مبارک موقع پر ہم یہ عہد کریں کہ ملک سے تعصب اور فرقہ پرستی کو مٹانے، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری جیسی لعنتوں کو ختم کرنے نیز ملک کو مزید ترقی کے راستے پر لے جانے کے لیے حکومت کو اپنا پورا پورا تعاون دیں گے اسی میں ہماری اور ملک کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

——— ایڈیٹر

جعفر ملیح آبادی

داستانِ آزادی

پہلا راوی

یہ دیارِ رنگ و بو، یہ خطۂ جنت نشاں — یہ محبت کا پیامی، آشتی کا ترجماں
یہ اخوت کا گلستاں، ایکتا کا یہ چمن — چشتی و نانک کا مسکن، رام و گوتم کا وطن
معدنِ وحدانیت، سرچشمۂ علم و ہنر — صوفیوں کا دیس، رشیوں کی زمیں، دیویوں کا گھر
محفلِ شعر و ادب، گہوارۂ دانش وری — یہ ضیائے مشعلِ حکمت، چراغِ آگہی
یہ ہمارا دیس، یہ پیارا وطن ہندوستاں — نازشِ عالم، غرورِ ایشیا، فخرِ جہاں
اک زمانے تک رہا ہے تیرہ بختی کا شکار — مدتوں روندی گئی ہے اس کے گلشن کی بہار
اس کے دل پر مدتوں طاری رہی غم کی گھٹا — مدتوں طوقِ غلامی اس کی گردن میں رہا
یوں بچھایا دامِ صد مکر و ریا انگریز نے — اس زمینِ پاک پر قبضہ کیا انگریز نے

دوسرا راوی

آئی جب دستِ فرنگی میں حکومت کی عناں — گھر گیا ادبار کے طوفان میں ہندوستاں
اس بہشتِ رنگ و نکہت پر خزاں چھانے لگی — تیرگی ہی تیرگی ہر سمت لہرانے لگی
حسنِ برگ و بار، کلیوں کا تبسم لٹ گیا — رنگ پھولوں کا، عنادل کا ترنم لٹ گیا
صنعت و حرفت ہوئی برباد دولت لٹ گئی — اپنی عزت، اپنی ثروت اپنی عظمت لٹ گئی

پہلا راوی

بڑھی حد سے جب ہند کی بے کسی — اُٹھا خاکِ گجرات سے اک جری
وہ گاندھی وہ روحِ روانِ وطن — وہ تصویرِ عزمِ جوانِ وطن
بہ فطرت فرشتہ بہ صورت بشر — حق آگاہ، حق آشنا، حق نگر
وہ امن و محبت کا پیغام بر — خلوص و صداقت کا پیغام بر
وہ شانِ وطن، قوم کی آبرو — دلِ مادرِ ہند کی آرزو

عجب ایک ہتھیار لے کر بڑھا — اہنسا کی تلوار لے کر بڑھا
صدا قوم کو دی کہ ہشیار ہو — زبوں خوابِ غفلت سے بیدار ہو
سنو غور سے یہ اٹل بات ہے — غلامی سے بدتر نہیں کوئی شے
غلامی ہلاکت کی اک لہر ہے — حیاتِ بشر کے لیے زہر ہے
غلامی ہے گہوارۂ بزدلی — غلامی ہے توہینِ مردانگی
اگر مرد ہو مرد بن کر جیو — غلامی کے پنجے سے آزاد ہو

دوسرا لڑکا

گونجی جو اُس جری کی یہ آواز دوستو — ہونے لگا نجات کا در باز دوستو
ٹوٹا طلسمِ خوابِ گراں، جاگنے لگے — ہندوستاں کے پیر و جواں جاگنے لگے
حکومت سے ناخوش و بیزار ہو گئے — آزادیٔ وطن کے طلبگار ہو گئے
سینے میں لوؤں کو جگانے لگے عوام — بیداریوں کے راگ سُنانے لگے عوام

کورس

اٹھو اہلِ وطن اب خواب سے بیدار ہو جاؤ — وطن پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاؤ
بڑھو اور توڑ دو بڑھ کر غلامی کی یہ زنجیریں — بدیسی راج سے آمادۂ پیکار ہو جاؤ
جلا کر خاک کر ڈالو جفا و ظلم کا خرمن — جوانو اب خدارا برقِ شعلہ بار ہو جاؤ

پہلا لڑکا

چلے ساتھ گاندھی کے پیر و جواں — اُٹھائے ہوئے حرّیت کا نشاں
ہر اک گام آلام سہتے ہوئے — مصائب کی موجوں پہ بہتے ہوئے
بڑھا جو یہ طوفان جمہور کا — بدیسی حکومت کو غیظ آ گیا
سروں پر کمانیں کڑکنے لگیں — نہتوں پہ تیغیں چمکنے لگیں
فرنگی نے ڈھائے ستم پر ستم — کیا پر نہ جمہور نے سر کو خم
ترنگا فضا میں اُڑاتے رہے — بغاوت کے نغمے سُناتے رہے

کورس

بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو — دلوں میں لیکے ولولوں کی بجلیاں بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو..
یہ زندگی کی مانگ ہے یہ وقت کی پکار ہے — کٹا دو بڑھ کے اپنے سر اگر وطن سے پیار ہے

فرنگیوں کا راج ہے وبالِ جاں بڑھے چلو
بڑھو کہ مدتوں سے ہم اسیر ہیں غلام ہیں
پسے ہوئے عوام کی سنو فغاں، بڑھے چلو
تمھارے انتظار میں ہے انقلاب ساتھیو
قریب آچکی ہے صبحِ زرفشاں بڑھے چلو

بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو
ستم سے سامراج کے پسے ہوئے عوام ہیں
بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو
اُبھر رہا ہے حریت کا آفتاب ساتھیو
بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو

دوسرا [illegible]

یونہی چلتا رہا اِن منچلوں کا کارواں برسوں
یہ بڑھے پھانسی کے تختے پر کبھی جیلوں میں کھیلے
سمایا تھا سروں میں سب کے وہ سودائے آزادی
کسی صورت چراغ حریت بجھنے نہیں پایا
نظر آیا جو وہ جلیان والے باغ کا منظر

رہا مصروف جنگ حُریت ہندوستاں برسوں
جیالے دیس کے دیتے رہے قربانیاں برسوں
فدا کرتے رہے جانیں وطن کے نوجواں برسوں
جفا و ظلم کی چلتی رہیں گو آندھیاں برسوں
رہی مصروفِ ماتم مادرِ ہندوستاں برسوں

پہلا [illegible]

رنگ لاکر ہی رہا آخر شہیدوں کا لہو
سرفروشانِ وطن میں وہ بلا کا جوش تھا
دیو استبدادِ شاہی کی کلائی موڑ دی
قوم کے افسردہ ہونٹوں پر تبسم آگیا
لال قلعے سے جواہر لعل نے دی یہ صدا
اِس صدائے دل نشیں سے مسکرائے بحر و بر
سُن کے آزادی کا مژدہ جھومنے گانے لگے

ہند کی آخر جگرداروں نے رکھ لی آبرو
خاتمہ کر ہی دیا آخر بدیسی راج کا
بڑھ کے جاں بازوں نے زنجیر غلامی توڑ دی
پرچم آزادی ہندوستاں لہرا گیا
آج سے اِس زمیں پر راج ہے جمہور کا
وجد میں آئی فضائیں ناچ اُٹھے بام و در
ہند والے ہر طرف یوں گیت بھی گانے لگے

کورس

سرزمینِ وطن آج آزاد ہے
دام ہی اب ہے باقی نہ صیاد ہے
سرزمینِ وطن آج آزاد ہے

وقت لایا ہے پیغامِ لطف و کرم
ختم ہو کر رہا عہدِ رنج و الم
آج مالک ہیں اپنے مقدر کے ہم
اب وہ جور و ستم ہے نہ بیداد ہے
سرزمینِ وطن آج آزاد ہے

دوسرا راوی

جب ہمارے ہاتھ میں آئی حکومت کی عناں — تھیں ہمارے راستے میں ہر طرف دشواریاں
ہندیوں نے جیت لی تھی جنگ آزادی مگر — توڑنی تھی ہم کو بیکاری و عسرت کی کمر
قحط اور سیلاب کا بھی زور ڈھانا تھا ابھی — آئے دن کی بھکمری کو بھی مٹانا تھا ابھی
مشکل و پیچیدہ راہوں سے گزرنا تھا ہمیں — اک نیا ہندوستاں تعمیر کرنا تھا ہمیں

پہلا راوی

جو تعمیرِ وطن کی اپنے دل میں ٹھان لی ہم نے — تو عفریتِ مصائب کی کلائی توڑ دی ہم نے
کبھی کاٹا پہاڑوں کو کبھی ندیوں کے رُخ موڑے — کبھی بپھرے ہوئے سیلاب کی تسخیر کی ہم نے
کبھی فن زراعت میں کیے انداز نو پیدا — کبھی صنعت کو بخشی ایک تازہ زندگی ہم نے
معیشت کی کبھی الجھی ہوئی زلفوں کو سلجھایا — کبھی کھولے رموزِ حکمت و دانش وری ہم نے
زمینِ مردہ کی رگ رگ کو خونِ زندگی دے کر — بڑھا دی کھیتیوں کی قوتِ بالیدگی ہم نے

کورس

ہماری کاوش و محنت کا ہے اثر یارو — بنا ہے آج وطن جنتِ نظر یارو
ہر اک چمن میں فروکش ہے کاروانِ بہار — حیات رقص کناں ہے نگر نگر یارو
جہاں بھی ہم نے گرایا عرق جبینوں سے — اُگل دیے ہیں وہاں خاک نے گہر یارو
جو دل میں جاگ اٹھے جذبہ ہائے کوہ کنی — تو کہسار کا چھلنی کیا جگر یارو
یہ سچ کہ ہم نے بھلائی یہ ارجنا ساگر — ہمارے نخلِ عزائم کے ہیں ثمر یارو

ابھی کچھ اور مراحل سے بھی گذرنا ہے
ہوا نہیں ہے ابھی ختم یہ سفر یارو

★

ناحمی انصاری
۹۷/۷۱ پریڈ، کانپور

اقبال کے افکارِ آزادی

علامہ اقبال طبعاً مرد قلندر تھے اور فطرتاً آزادی اور آزادہ روی کے دلدادہ ۔

ازل سے فطرت آزاد میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہہ داری

ہندستان کی سیاسی غلامی ان کو خون کے آنسو رلواتی تھی۔ "تصویر درد" جو بانگِ درا کے حصہ اوّل میں شامل ہے، ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہے ۔ اس نظم میں انھوں نے ہندستان کے احوال و آثار پر مفکرانہ نگاہ ڈالی ہے اور ابنائے وطن کو بار بار خوابِ غفلت سے جاگنے اور قعرِ ذلت سے نکلنے کی دعوت دی ہے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ تقریر و تحریر کی آزادی نہ ہونے کے باعث وہ اپنے جذبات کو بھی کھل کر نہیں ظاہر کر سکتے اور اپنے ملک کی محرومی و بیچارگی پر آزادی سے دو آنسو بھی نہیں بہا سکتے۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اور ـــــ

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا

(تصویر درد) شاعر کے اس دلِ گداختہ کی آواز ہے جو وطن کی محبت سے لبریز ہے، نوعِ انساں کی محبت کی شراب روح پرور جس کے لفظ لفظ سے چھلکتی ہے اور جسے ہندستان کی تہذیبی رفعت پر ناز ہے ــ

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
(ترانۂ ہندی)

یہ نظم (تصویر درد) ۱۹۰۵ء سے پہلے کی ہے، اس کے بعد علامہ اقبال مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے۔ وہاں انھوں نے اہلِ یورپ کی دانش و بینش کے بھی کرشمے دیکھے اور ان کے اس جذبۂ وطن پرستی کا بھی بغور مطالعہ کیا جو استعمار کی شکل میں ایشیا اور افریقہ کے غریب اور پس ماندہ ملکوں پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اقبال کے لیے تشویش کا باعث تھی کیونکہ ان کو ہندستان کی غلامی کی زنجیر کے کٹنے کا کوئی سروسامان، دور دور تک نظر نہ آتا تھا۔ اقبال سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب انھوں نے شاعری ہی سے توبہ کر لی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے سر عبدالقادر اور ڈاکٹر آرنلڈ کے اصرار پر وہ اپنی

تو بہ سے باز آ گئے اور شعر کہنے لگے۔ سفرِ یورپ کے بعد علامہ اقبال کی فکر و نظر میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور انھوں نے انسانی ضمیر کو جگانے کی کوششوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ان کا نظریۂ خودی، حیاتِ انسانی کے وسیع بسیط افق پر محیط ہے اور آزادیٔ فکر و نظر اس کا ایک اساسی پہلو ہے یعنی فکر و نظر کی آزادی کے بغیر خودی کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایک غلام ملک کے باشندے کس طرح آزادیٔ فکر و نظر کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور خودی کے نشو و نما کے لیے سازگار ماحول ان کو کیسے میسر آ سکتا ہے! اسی لیے اقبال کو کہنا پڑا کہ ؎

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

(حکیم سنائی کے مزار پر)

اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کا معتد بہ حصہ نظریۂ خودی کی تشریح و تعبیر پر مبنی ہے۔ انھوں نے خودی کی تشکیل و تعمیر کے تصورات کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا ہے اور ہر جگہ انھوں نے حریتِ فکر کے تصور کو بھی ابھارا ہے۔ وہ حکیم سنائی کے مزار پر ہوں یا ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض کی بازیافت کر رہے ہوں، خوشحال خاں خٹک کی وصیت کو یاد دلا رہے ہوں یا غافل افغان کو اپنی خودی پہچاننے کی دعوت دے رہے ہوں، ترکانِ احرار کا خیر مقدم کر رہے ہوں یا خضر کی زبان سے رموزِ جہانگیری و جہانبانی کا انکشاف کر رہے ہوں، حریتِ فکر و نظر اور آزادیٔ کامل کا تصور ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خالقِ کائنات سے بھی شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اور۔۔۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

وہ دلی اور صفاہان اور سمرقند سے صرف اسی لیے برأت کا اظہار نہیں کرتے کہ ان کو اپنے مردِ آفاقی ہونے کا ادعا ہے بلکہ اس لیے بھی کرتے ہیں کہ یہ سب شہر اپنے جذبۂ حریت کو کھو کر غیروں کی غلامی پر رضامند ہو چکے ہیں اور اقبال جیسا مردِ قلندر ان سے وابستہ ہو کر تقدیرِ ازل پر قانع نہیں ہو سکتا۔

اقبال کے دل درد مند میں آزادی کا شعلہ تا عمر روشن رہا۔ "شعاعِ امید" ان کے دورِ آخر کی نظم ہے جس میں ایک نئے اسلوب سے انھوں نے ہند کے مردانِ گراں خواب کو نیند سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کو اس بات کا شدید رنج ہے کہ برہمن بت خانے کے دروازے پہ محو خواب ہے اور مسلمان زیرِ محراب و مسجد تقدیر کو رو رہا ہے۔ تقدیر پر قانع ہو جانے اور تلخیٔ حالات کا زہر خاموشی سے پی لینے کو وہ انسانیت کے منصب سے بہت فروتر سمجھتے ہیں اور حصولِ آزادی کی ہر کوشش کو فرضِ عین جانتے ہیں۔ "شعاعِ امید" اقبال کے دورِ آخر کی اہم ترین نظم ہے جس میں ان کا جذبۂ حب الوطنی اپنے شباب پر نظر آتا ہے ؎

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

(شعاعِ امید)

'ترانۂ ہندی' سے 'شعاعِ امید' تک اقبال کے جذبۂ حب الوطنی کا ذہنی سفر اقبال کے زاویۂ نظر کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے۔ وطن دوستی کے جو نقوش 'ترانۂ ہندی' میں

روشن ہوئے ہیں، 'شعاعِ امید' میں وہی روشن تر ہو گئے ہیں۔ اسلوب کی تازہ کاری اور لالہ کاری نے 'شعاعِ امید' کی دلکشی اور رعنائی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ درمیانی زمانے میں بھی، جب اقبال کی توجہ نظریۂ خودی کی تبلیغ پر پوری طرح مرکوز تھی، وہ بار بار غلامی کے خلاف ہمارے جذبۂ حریت کو مہمیز کرتے اور دلوں کو اک ولولۂ تازہ عطا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

(خضرِ راہ)

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہ سواروں کی گردِ سمند

(خوشحال خاں کی وصیت)

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(ہندی اسلام)

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

(ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض)

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

(لینن خدا کے حضور میں)

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

(ہندی مکتب)

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

(محراب گل افغان کے افکار)

اقبال کے افکارِ حریت صرف سیاسی آزادی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک ایسی آفاقیت ہے جو زندگی کے اندیشہ ہائے گوناگوں پر محیط ہے۔ اقبال کے نظریۂ فقر و خودی میں حریتِ فکر و نظر بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر انسانیت کی ترقی کا تصور تشنہ رہ جاتا ہے۔ وہ فرد کے ذہن و دل میں جو ولولہ، جوش، تڑپ اور قوتِ عمل پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ فرد کی اندرونی صلاحیتیں بیدار اور بار آور ہوں اور وہ ملک و ملت کی عظمت، استحکام اور اعتبار کا ذریعہ بنے۔ مردِ حق، مردِ مومن اور مردِ حر کے مفاہیم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان کی نگاہیں چار سو ان مردانِ خدا بین و خود آگاہ کو ڈھونڈھتی ہیں جن کا فقر ہلاکِ قیصر و کسریٰ تھا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

(حکیم سنائی کے مزار پر)

مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئیے کہ اقبال کا فقر تخریبی قوتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ دراصل قوتِ حیات کا مظہر ہے، ایک ایسی نامیاتی قوت کا جو انسان کو غلام بنانے اور اس کا استحصال کرنے والی قوتوں کی نفی کرتی ہے اور زندگی کے فطری نمو اور ارتقا کے دروازے کھولتی ہے۔ قیصر و کسریٰ

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

غزل

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی وارانسی

تیری موجودگی میں تیری دنیا کون دیکھے گا
تجھی کو سب کے سب دیکھیں گے میلا کون دیکھے گا

تمنا کی جگہ لاشِ تمنا کون دیکھے گا
اب اپنے جیتے جی اپنا جنازا کون دیکھے گا

اگر بادِ مخالف چل گئی تو میں بھی چل دوں گا
چراغِ آرزو کو جھلملاتا کون دیکھے گا

جہاں ہوتی رہی ہے مدتوں نغمات کی بارش
وہاں پر اب خموشی کا بسیرا کون دیکھے گا

اداے مست سے بیخود نہ کیجیے ساری محفل کو
تماشائی نہ ہوں گے تو تماشا کون دیکھے گا

ذرا رکیے ابھی جاتے ہیں کیوں بزمِ مسرت سے
حسیں رات آپ نے دیکھی سویرا کون دیکھے گا

بہر صورت تمہارے حق میں دنیا فیصلہ دے گی
تمہارے سامنے بجا اور بے جا کون دیکھے گا

مجھے بازار کی نیچائی اونچائی سے کیا مطلب
ترے سودے میں سستا اور مہنگا کون دیکھے گا

اگر دیدار کا معیار دیوانے گرا دیں گے
تو پھر سولی پہ چڑھ کر تیرا جلوا کون دیکھے گا

نذیر آتی ہے آنے دو سفیدی اپنے بالوں پر
جوانی تم نے دیکھی ہے بڑھاپا کون دیکھے گا

ایس۔ ایم۔ عباس (ایڈوکیٹ)
مقام وڈاکخانہ۔ مانی کلاں
ضلع جونپور۔ یو۔ پی

امن، اتحاد اور آزادی

امن، اتحاد اور آزادی یوں تو مفہوم کے اعتبار سے الگ الگ لفظ ہیں لیکن ان الفاظ کی افادیت اور معنویت پر غور کیا جائے تو معنوی اعتبار سے الگ رہتے ہوئے بھی یہ ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتے ہیں یہ ایک دوسرے کے معاون ہی نہیں بلکہ (COMPLEMENT) ہیں، امن کائنات کی ایک ہمہ گیر آرزو ہے۔ اتحاد، تمام انسانی اور اخلاقی قدروں میں اعلیٰ ترین قدر ہے اور آزادی، پرسکون اور ترقی پذیر معاشرہ کی ایک اہم ضرورت۔

دنیا کو امن کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے وقت کے نشیب و فراز نے اس ضرورت کو گھٹایا اور بڑھایا ہے لیکن یہ ضرورت کبھی ختم نہیں ہوئی ہے اور شاید کبھی ختم نہ ہوگی۔ بات صرف کم و بیش کی رہی ہے۔ چنانچہ آج وقت کی رفتار نے اس ضرورت کو اور شدید بنا دیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا دنیا کے سیاسی افق پر جو بھی اثر مرتب ہوا ہو لیکن نیوکلیائی ہتھیاروں نے ساری دنیا کو شدت سے متاثر کیا۔ ایٹم کے وجود، اس کے استعمال کے خطرناک نتائج اور اس کے اثر سے پیدا شدہ تباہ کاریوں کو دنیا نے نہایت شدت سے محسوس کیا۔ ایٹم کی تباہ کاریوں سے لرز کر تمام انسانیت اسی وقت سے اس کوشش میں ہے کہ اس عظیم جنگ کا انسداد ہو اور امن قائم و دائم رہے۔ ان مسلسل کوششوں کے نتیجے میں آج تقریباً ہر ملک میں پائیدار اور مستحکم امن کے لیے انجمنیں قائم ہیں جو اس سلسلے میں برابر سرگرم عمل ہیں۔

مگر یہ بھی کچھ عجیب بات ہے کہ ایک طرف امن عالم کے قیام کی کوشش ہے تو دوسری جانب مفاد پرستی، طاقت کے زعم اور آمریت کے ناپاک ارادوں نے عالمی افق کو مکدر کر دیا ہے ایک طرف تعصب، تنگ نظری، بیگانگی اور مفاد پرستی ہے تو دوسری جانب نفرت کا پھیلتا ہوا زہر اور اضطراب و انتشار ہے۔

ظاہر ہے جہاں ہر قدم پر جنگ کا خطرہ سوار ہو رہا ہو وہاں زندگی کا چہرہ کس قدر زرد حال ہوگا۔ حیات کتنی مضمحل اور افسردہ ہوگی۔ ایک حساس دل ان حالات پر یقینی طور سے تڑپ اٹھے گا۔ زندگی کی برکتوں کے لیے حیات کی خوشیوں کے لیے، انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے حضرت وامق جونپوری کی زبان سے امن کی اپیل ملاحظہ فرمائیں ؎

ہم اس لیے امن چاہتے ہیں۔
کہ آج ظلمات جنگ میں آب زندگی مل نہیں رہا ہے
اور امن ہی خضر زندگی ہے
حیات بے کیف ہو رہی ہے
کہ جنگ کی گھن گھنا ہٹوں میں ہمارا سنگیت کھو گیا ہے
وہ جنگ پرور عناصر سے یوں مخاطب ہیں ؎
جو ایٹم بم لیے ہوئے ہیں
ڈبو دو ان کو سمندروں میں

کہ جنگ دشمن ہے زندگی کی
رخِ سحر سے نقاب اٹھادو
ہمیں ضرورت ہے روشنی کی

یہ تو ہوئی عالمی سطح پر جنگ کی بات، جس سے ظاہر ہے کہ جنگ زندگی کی دشمن ہے اور اسی لیے دنیا کو جنگ سے نفرت ہے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ ایک دوسری جنگ بھی ہے جو اپنے وجود کے اندر بھی جاری ہے۔ اور وہ لڑائی ہے مذہب و فرقہ کی، رنگ و نسل کی، زبان و تہذیب کی، امیر و غریب کی، اونچ نیچ کی، کمزور اور طاقتور کی اور ان جنگوں کے شعلوں نے بھی نہ معلوم کتنے گھر جلائے ہیں۔

یہ بات بیجا نہ ہوگی کہ نہ معلوم وہ کون سی منحوس ساعت تھی جب ملک کی تقسیم اور قومیت کی علاحدگی کا سوال پیدا ہوا تھا۔

عہد قدیم سے ہندستان مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ یہاں مختلف قومیں بستی رہیں جن کی الگ زبانیں تھیں۔ رسم و رواج تھے اور الگ الگ مذاہب تھے لیکن اس ملک کی خو اور اس کی ساخت ہی کچھ ایسی رہی کہ ہر قوم کی زبان اور ادب، تہذیب اور مذہب یکساں طور پر اس کی آغوش میں پروان چڑھتے رہے۔

تاریخ کے بعد جغرافیہ پر نظر ڈالیے تو رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی کشمیر کی گل پوش وادیوں سے لے کر کنیا کماری تک پھیلا ہوا یہ طویل و عریض اور عظیم ملک اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا کے کئی چھوٹے بڑے ملکوں کو ملا کر بھی تنہا ان سب کے برابر ہے۔ اتنے بڑے ملک میں جغرافیائی ضرورتوں کی بنا پر تبدیلیوں کا ہونا لازمی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں جن کی زبانیں الگ تہذیبیں جداگانہ، طرز زندگی منفرد، رسم و رواج علاحدہ ہیں۔ اس کے باوجود ملک کی گنگا جمنی، تہذیبی روایت آج بھی جاری و ساری ہے اور ہر زبان، ادب اور تہذیب کو آب و رنگ عطا کر رہی ہے۔

اس وسیع و عریض سرزمین کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ہم آہنگی جسے کثرت میں وحدت کہنا بے جا نہ ہوگا یقینی طور پر ہم ہندستانیوں کے لیے ایک معجزہ ہے۔ یہی نہیں طبقے، گروہ اور فرقہ کی تہذیب و تمدن، زبان و ادب کی نہ صرف حیثیت تسلیم کرنا بلکہ انھیں ترقی کرنے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع بہم پہنچانا بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے ہمارے دستور کا ڈھانچہ کچھ اس طرح کا تیار کیا گیا جس میں طبقے اور ہر فرقہ کو اپنی تہذیب و روایت کو فروغ دینے کا مناسب موقع مل سکے۔ اس کے علاوہ ہم آہنگی کی ایک فضا تیار کرنا اور سبھی کی بقا و تحفظ اور تعمیر و ترقی کے لیے یکساں مواقع مہیا کرنا، یہ اس ملک کا دوسرا معجزہ ہے۔ دستور کے تیسرے باب میں جہاں مطمئن اور باوقار زندگی بسر کرنے کے لیے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، وہیں ہر طبقے اور فرقے کو اپنے طور پر تمام مذہبی امور کی آزادانہ انجام دہی۔ تبلیغ و اشاعت ترویج و ترقی کے لیے بھی حقوق دیئے گئے ہیں۔

قانون کی نگاہ... میں عقائد و مذہب، ذات پات قبیلہ جنس اور مولد کی بنیادوں پر کسی بھی شخص کے ساتھ کوئی امتیاز نہ رکھ کر اور فرد کو مواقع کے اعتبار سے برابری کا درجہ دے کر جہاں قومی اتحاد کے تصور کو واضح اور مستحکم کیا گیا وہیں ملک کی سالمیت، قوم کی اقتصادی، سماجی و معاشرتی فلاح و بہبود کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جغرافیائی ضروریات اور اختلافات کے باوجود ہر شخص کی قانون کے نزدیک برابری اور سبھی کے لیے یکساں قانونی تحفظ کے تصور نے ہمیں اس مقام تک پہنچادیا جہاں ذہن خود بہ خود ایک قوم ہونے کے پاکیزہ جذبہ سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے اور یہ یقینی طور پر اس عظیم اور مقدس سرزمین پر بسنے والے ہر فرد کے لیے فخر کی بات ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات

بھی ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ ہمارے آئین کی یہ خصوصیت بھی لائق ستائش ہے کہ اس میں آزادی کی بقا و تحفظ اور قومی یکجہتی کے چشمے ساتھ ساتھ پھوٹتے ہیں اور یہی ہمارے جمہوری نظام کی اساس ہیں۔ آزادی زندگی کو ایک معنویت عطا کرتی ہے اور خوش آئند کل کی ضامن ہوتی ہے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ لیکن یہ راز بھی جان لینا ضروری ہے کہ آزادی کبھی اور کہیں بے لگام نہیں ہوتی۔ قانون ہمیشہ اس پر نظر رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آزادی کا کارواں کچھ پابندیوں کی چھاؤں تلے بڑھتا ہے۔ اس لیے آئین میں تمام حقوق کی دوڑ فرائض کے ساتھ باندھ دی گئی ہے۔ جہاں حقوق کی گارنٹی دی گئی ہے۔ وہیں فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے۔

فرائض حقیقتاً حقوق کی اصل ہیں۔ جن کی انجام دہی ایک نازک مسئلہ ہے۔ اگر فرائض نظر انداز کیے جائیں گے تو حقوق کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا اور اس حالت میں آزادی کا تصوّر بھی محال ہو جائے گا۔

چنانچہ حقوق اور فرائض جمہوری نظام میں قوم کا ایک قیمتی ورثہ ہوتے ہیں اور جب تک قوم اس ورثہ کی محافظ رہے گی قومی یکجہتی، جمہوریت اور ملک کی سالمیت برقرار رہے گی۔

یہ بات ویسے تو عجیب سی لگتی ہے کہ حقوق آزادی دیتے ہیں جبکہ فرائض پابندی عائد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی میں زندگی "بحرِ بیکراں" بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بحر بیکراں کہیں حیات کے تمام تر نقوش و آثار سمیٹ نہ لے جائے اس لیے قانون نے حقوق کی شاہراہوں میں جا بہ جا فرائض کے سنگِ میل قائم کیے ہیں، قانون بہتر نظامِ حیات کے لیے معاشرہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ حقوق و فرائض کے درمیان حدیں مقرر کر کے عوام کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی لیے مفکرین نے آزادی اور قانون کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔

دراصل سماج مختلف طبقے کے لوگوں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں امیر و غریب، طاقت ور اور کمزور، ترقی یافتہ اور پسماندہ ہر قسم کے لوگ بستے ہیں اور ایک منظم و مستحکم سماج کے لیے تمام طبقوں کے درمیان تال میل اور ہم آہنگی قائم رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ طاقت ور طبقہ کمزور کی اور امیر طبقہ غریب کی آزادی کو سلب نہ کر سکے۔ اور طاقت ور طبقہ، کمزور طبقوں پر ظلم و تشدد اور ان کے استحصال کو اپنا حق آزادی نہ تصوّر کر بیٹھے۔

اس طرح امن، اتحاد اور آزادی کا یہ رشتہ بڑا نازک ہے۔ اس نازک رشتہ کو استوار کرنے کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ آزادی قربانیوں کی دین ہے۔ خاک و خون میں غلطاں ہو کر، موت کی وادیوں سے گزر کر ہم آزادی کی منزل تک پہنچے ہیں۔ ہم آزادی کے لیے صدہا سال تک لڑتے رہے ہیں۔ ہم نے اسے دار و رسن کے مراحل سے گزر کر حاصل کیا ہے۔ لیکن ہمارا کام ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ آزادی ہمارا مقدس قومی ورثہ ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے ساتھ ہی اس کی بقا و تحفظ کے لیے ہمیں ابھی قربانیاں دینی ہیں۔ یہ قربانی جان و مال کے بجائے خود اپنے نفس اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی ہوگی۔ ہمیں سرمایہ پرستی، ذخیرہ اندوزی اور بیجا منافع خوری کے رجحان سے لڑنا ہوگا۔ باہمی نفاق کو مٹانا ہوگا۔ تعصب اور منافرت کے خلاف جنگ کرنا ہوگی اور اپنے قلب و نظر میں وسعت پیدا کر کے ایک ایسا کردار بنانا ہوگا جو دوسروں کے لیے مثالی ہو۔

ہم ایک عظیم ملک کے آزاد شہری ہیں آزادی امن اور قومی یکجہتی ہمارا مقدس ورثہ ہیں۔ ہمیں اپنے اس ورثہ کی حفاظت کے لیے اپنی خامیوں کو دور کرنا ہوگا اور سوشلزم سیکولرازم جمہوریت، آزادی اور مساوات کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھنا اور انھیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں برتنا ہوگا۔

ایک مقام پر فائر بریگیڈ والوں کا ایک اشتہار دیکھا تو اس کی معنویت پر جی خوش ہو گیا اس ایک جملہ میں جو کچھ ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔
آگ کے شعلوں کے درمیان یہ عبارت بہت کچھ یاد دلا گئی ــــ

"آگ لگنے نہ دیجیے تاکہ آگ بجھانی نہ پڑے"۔

اور کسی کا یہ شعر بھی ذہن میں بار بار ابھرتا ہے کہ ؎

منائو جشنِ بہاراں اس احتیاط کے ساتھ
کسی چراغ کی لو سے کسی کا گھر نہ جلے!

بہروپیا کون : ص ۳۹ کا بقیہ

بھرتا ہے۔ کس کی عورتیں شاہی لباس پہن کر ملکہ اور شہزادی بنتی ہیں۔ انسان بہروپیا بنے تو واہ وا۔ عورتیں ملکہ بنیں تو سبحان اللہ! کوا ہنس بنے تو لعنت اللہ! کوے نے ہنس کے پر نوچ کر پھینک دیے۔ بہروپیا بننا انسان ہی کو مبارک ہے ؎

باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

اقبال کے افکارِ آزادی : ص ۹ کا بقیہ

کی علامتیں، انسان کے استحصال کرنے والی قوتوں کی مظہر ہیں ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبال کا تصورِ آزادی مفرد نہیں مرکب ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ تمام عناصر شامل ہیں جن سے زندگی میں ترفع پیدا ہوتا ہے اور یہ دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

★

شوکت عمر
معرفت قومی آواز
قیصر باغ لکھنؤ

غزل

(جنگِ آزادی کے شہیدوں کی نذر)

اسیرِ شوقِ سرِ انجمن کچھ اور بھی ہیں
"ستم گرو! ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں"

ابھی کچھ اور چلو سر بلندیٔ اہلِ جنوں
کہ راہِ شوق میں دار و رسن کچھ اور بھی ہیں

سنوارنے کو سنواری نئے سرے سے حیات
مٹے مٹے سے نقوشِ کہن کچھ اور بھی ہیں

میرے ہی خون سے رنگیں نہیں قبائے حیات
لہو میں ڈوبے ہوئے پیرہن کچھ اور بھی ہیں

یہیں یہ ختم نہیں خسروی کا افسانہ
بدستِ تیشہ ابھی کوہکن کچھ اور بھی ہیں

بھتیں نہیں ہو میری تیرگی کا چراغ
رہِ حیات میں آتش بدن کچھ اور بھی ہیں

یہ دورِ جام رہے تھوڑی دیر اے شوکت
کہ تشنہ لب ابھی ساغر شکن کچھ اور بھی ہیں

"امن کا پرچم لہرایا"

تسنیم فاروقی
سی۔ ۱۸۴/۲۹۲
تلسی داس مارگ
نزد ہاسپٹل لکھنؤ

پھر یادوں کے پرچم نکلے
اغیار کی شاہی یاد آئی، ماضی کی تباہی یاد آئی
سولی کے لیے پھندے لٹکے پھر بھوری سڑکیں سُرخ ہوئیں
زنداں کی سلاخیں تھرائیں
ہندو مسلم "ہم" ہو کے چلے ماؤں نے کفن بیٹوں کو دیے
سچائی کو شعلے چاٹ گئے بارود کو لوہا پھانک گیا
دھرتی کی قسم کھانے والے معتوب ہوئے
مصلوب ہوئے
زنجیروں کی موسیقی پر دیوانوں نے نغمے چھیڑے
ہاتھوں میں لیے سر پھاند پڑے توپوں کے دہانے موڑ دیے
اور ملک دھوئیں میں ڈوب گیا
زنجیریں پگھل کر موم ہوئیں جیلوں کے دریچے باز ہوئے
اور مل کے کمزوروں ہاتھوں نے جبروت کے خیمے پھونک دیے
افرنگ کے شانے ٹوٹ گئے ہر ظلم کے چھکے چھوٹ گئے
کہرے کی طرح بادل سمٹے سیلاب رُکا طوفان تھما
صدیوں کی غلامی دور ہوئی
تب جا کے وطن آزاد ہوا
یوں امن کا پرچم لہرایا

نظر مرفی
سی ۳۳۴/ بٹلہ ہاؤس۔
جامعہ نگر۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵

شمشیرِ برہنہ مجاہدِ آزادی: مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت مجموعہ صفات تھی۔ جنھوں نے افقِ سیاست پر ایک تابندہ ستارہ بن کر ہندستانی عوام الناس کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ان کی ہمہ جہت کشش نے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں پر ایسے نقوش قائم کیے ہیں جن کو وقت کی گرد آسانی سے فنا نہیں کرسکتی۔ وہ ایک صاف گو، بیباک اور صاحبِ طرز صحافی کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی "معنوی اولادیں" ـــ "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی تحریروں کے نمونے آج بھی ہندستانیوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی طرزِ خطابت انفرادی نوعیت کی تھی۔ اس کی دل نشینی کا خیال آتا ہے تو لاکھوں انسانوں کا جمگھٹ ہماری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے جو اپنے محبوب رہنما کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔ کیا مجال تھی کہ سننے والوں کے لاکھوں کے جمِ غفیر میں کوئی شخص ٹس سے مس ہو جائے۔ ان کی علمیت اور شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا اس میدان کے بھی صف اول کے شہسوار تھے ـــ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہو یا خلافت کانفرنس کا جلسہ، مکتوب نگاری ہو یا اخبار کی ایڈیٹری، وفد میں شمولیت کا مسئلہ ہو یا قرارداد کی تیاری، مولانا محمد علی کی جودتِ طبع اور ذہن ہر موقع و محل پر چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ ان تمام صفات سے بالاتر جس چیز نے محمد علی کو اپنا لوہا منوانے اور قومی رہنمائی کا تاج پہنانے کے لیے مجبور کیا، وہ تھا ان کا جذبۂ حریت جس کی لپٹوں نے پورے ہندستان میں تہلکہ مچا دیا۔

مولانا محمد علی کی تقریروں میں نہ صرف روانی اور برجستگی ہوتی تھی بلکہ ان میں پُرمغز مواد اور گہری نکتہ آفرینی بھی ہوتی تھی۔ وہ دورانِ تقریر ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے جو پہلے کبھی سننے میں نہیں آتے تھے۔ لندن میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ:

"مجھے یہ شکایت نہیں کہ مسٹر ریڈنگ نے مجھے جیل کیوں بھیجا۔ میں تو صرف یہ انسانی حق چاہتا ہوں کہ اگر مسٹر ریڈنگ غلطی کریں تو میں بھی انھیں جیل بھیج سکوں۔"

علی برادران اور مہاتما گاندھی تحریکِ آزادی کے ایسے سپہ سالار تھے۔ جنھوں نے باہمی اشتراک سے ہندستان کی تقدیر بدلنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ انھوں نے قوم کے ہر فرد و بشر کے دل میں حریت و قومیت کی ایسی جوت جلائی جو رفتہ رفتہ شعلۂ جوالا بنتی چلی گئی۔ تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کو عوام نے قومی جہاد سمجھ کر قبول کیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء کے سیاسی حالات پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت آشکارہ ہو جاتی ہے کہ یہ علی برادران کا ہی فیضان تھا جس نے مہاتما گاندھی کو پوری قوم کا محبوب اور ہر دلعزیز لیڈر بنا دیا۔ علی برادران جب بھی مسلمانوں میں جاتے تو گاندھی جی کو بھی اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ کان پور کی مسجد کا قضیہ ہو یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا مسئلہ تینوں لیڈر ایک ساتھ مل کر قدم بڑھاتے۔ ملک میں اس وقت تین نعرے گونجتے تھے۔ ایک اللہ اکبر، دوسرا محمد علی شوکت علی زندہ باد، اور تیسرا گاندھی جی کی جے۔ خلقت کے دلوں میں ان تینوں کی جو قدر

تھی اس کا اندازہ قوم کے ہر فعل سے کیا جا سکتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت نہیں بلکہ ان "بے تاج بادشاہوں" کی حکمرانی تھی کیوں کہ یہ رہنمایان وطن قوم سے جو کچھ کہتے قوم نے ہمیشہ اس پر لبیک کہا۔

ہندستان کے اسی "بے تاج بادشاہ" کو ملت اسلامیہ، "رئیس الاحرار" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کے وطن کے بارے میں بعض محققوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ رام پور میں نہیں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کی تاریخ میں البتہ کوئی اختلاف نہیں ہے اور تمام لوگ ان کی تاریخ ولادت ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء ہی کو صحیح مانتے ہیں۔ وطن کے بارے میں رئیس احمد جعفری رقمطراز ہیں:

"محمد علی کا اصل وطن کیا ہے؟ اس میں محمد علی کے واقف کاروں اور شناساؤں کا خفیف سا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا اصل وطن مراد آباد ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ بجنور کی طرف کے تھے۔ لیکن ترجیح آخری قول کو ہے۔ خود مرحوم نے ایک مضمون میں ضمناً اپنے وطن کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اسے تسلیم کیا ہے کہ وہ نجیب آباد (بجنور) سے وطنی خصوصیت رکھتے ہیں۔"

یہاں لفظ "وطنی خصوصیت" کو کھنگال کر دیکھا جائے تو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نجیب آباد (بجنور) مولانا محمد علی کا اصل مولد تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اس کو وطن کی سی "خصوصیت" حاصل تھی۔ خود مولانا محمد علی نے "ہمدرد" کے ۲۴ر فروری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں اپنی وطنیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے دادا علی بخش ایک عرصہ تک نجیب آباد (بجنور) میں نواب نجیب الدولہ بہادر کے یہاں ملازم تھے۔ نواب صاحب کا اصل نام نجیب خاں تھا جو مردان (افغانستان) سے روہیلکھنڈ (یوپی) ہجرت کر کے آئے تھے۔ اور افغانستان کے حکمراں احمد شاہ ابدالی نے ان کو نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ نواب احمد سعید خان بہادر کے زمانے میں علی بخش رام پور آئے جہاں وہ ریاست کے ولی عہد نواب یوسف علی خاں بہادر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ محمد علی کے دادا منشی علی بخش اور والد عبد العلی بھی ریاست رام پور سے وابستہ ہونے کے باعث ہمیشہ یہیں پر رہے منشی علی بخش نے اپنی سرکاری وفاداری اور حسن کارکردگی کی بدولت انگریزی حکومت کو اس قدر متاثر کیا کہ اس نے انھیں مرادآباد اور سنبھل کے آس پاس ایک چھوٹی سی جاگیر بھی عطا کر دی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اس جاگیر میں کبھی نہیں جھانکے اور ریاست رام پور کی خدمت میں ہی مصروف رہے۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی ذہنی تربیت میں ان کی والدہ "بی اماں" کو جو دخل حاصل تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ کیوں کہ عبد العلی کا انتقال اس وقت ہو گیا جبکہ ابھی محمد علی کم سنی کے عالم میں تھے۔ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی خوبی دونوں بھائیوں کو "بی اماں" کے واسطے سے ملی۔ مولانا نے اپنی خود نوشت میں بی اماں کے بارے میں ایک دل چسپ بات لکھی ہے کہ انھوں نے شادی کے بعد اردو کی تعلیم کیوں کر حاصل کی اور یہ کہ ان کا حافظہ کس بلا کا تھا؛ عبد العلی (مولانا محمد علی کے والد) پرانی وضع قطع کے آدمی تھے لہٰذا ان کی شادی بھی ایسی خاتون سے ہوئی جو صرف گھریلو تعلیم سے آراستہ تھیں یعنی صرف دینی تعلیم اور عربی میں کلام پاک کی شد بد۔ اردو کے ناول یا افسانوں کی اردو کتاب کا ان کے گھر میں کیا کام؟ لیکن مولانا کے والد فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ گھر سے خوشحال تھے۔ اس لیے ان کا سارا وقت یا تو مطالعہ میں گزرتا تھا یا دوست احباب سے بات چیت کرنے میں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانے میں اسی خیال سے ناول کو اپنے ساتھ لے آئے کہ سونے سے قبل وہ اسے پڑھ کر ختم

کردیے گئے مگر وہ رات میں اسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اپنے ہمراہ اسے لے جانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچا زاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک ناول تھا۔ انھوں نے بی اماں کو اس کے بعض حصے سنائے جو بے حد عجیب معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سو گئیں تو سوتے میں ان کے منھ سے اس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہو گئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے۔ انھوں نے جب سوتے میں بیوی کے منھ سے اردو ناول کے وہ اقتباسات سنے تو دنگ رہ گئے۔ بعد میں بی اماں نے مولانا کے چچا زاد بھائی سے اتنی اردو پڑھ لی تھی کہ شوہر کی زندگی ہی میں ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنے پڑھنے لگی تھیں۔ انھوں نے پھر بعد میں باقاعدہ اردو پڑھی اور تحریک خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرّروں میں ہونے لگا۔

محمد علی عہد طفلی سے ذہین اور ہونہار واقع ہوئے تھے اور ہمیشہ اپنی جماعت میں امتیاز حاصل کیا۔ ابتدائی مراحل میں ہی انھوں نے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ دوسرے علوم دینی و دنیوی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کا حافظہ بے حد تیز تھا۔ وہ جس مضمون کو ایک بار پڑھ لیتے تھے تو وہ انھیں حفظ ہو جاتا تھا۔ علی گڑھ کالج کے اکثر طلبا محمد علی کی اس خوبی سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ بی اماں اور شوکت علی نے مولانا محمد علی کے اس تعلیمی شوق اور خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ انھیں تعلیم کی غرض سے انگلینڈ بھیجا جائے تاکہ ان کی ذہنی نشوونما کو چار چاند لگ جائیں۔ آکسفورڈ پہنچ کر محمد علی نے تاریخ کے مضمون میں آنرز پاس کرلیا۔ یہاں انھوں نے آئی سی ایس کا امتحان بھی دیا تھا مگر اس میں انھوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور ناکام رہے۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد مولانا محمد علی نے اپنے بزرگوں کی روش پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور ریاست رام پور میں سررشتہ تعلیم ہو گئے۔ لیکن قدرت کو ان سے کچھ اور ہی کام لینا تھا۔ یہاں ان کا دل نہ لگ سکا اور وہ ریاست بڑودہ چلے گئے جہاں انھیں راجکمار کی اتالیقی اور انتظامی امور کی ذمہ داری سونپی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کا فطری رجحان سرکاری ملازمت کی طرف مائل ہی نہ تھا اور اور وہ "کچھ اور ہی" کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت جلد اس ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور صحافت کو نہ صرف اپنا ذریعہ معاش بنایا بلکہ اس کو اپنے مخصوص انداز فکر کا وسیلہ بھی بنا دیا۔

محمد علی نے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے ایک اہم ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" کے نام سے جاری کیا جو بہت جلد مقبولیت کے بام پر پہنچ گیا۔ جب انگریزوں نے اپنا پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی منتقل کیا تو "کامریڈ" کو بھی نقل وطن کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ دہلی آنے پر مولانا نے اردو کا ایک ہفتہ وار "ہمدرد" بھی نکالنا شروع کیا جو بعد میں روزنامہ بن کر دنیائے صحافت میں مقبول ہونے لگا۔ "ہمدرد" صرف ایک روزنامہ ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک تحریک تھا۔ ایک پیام، ایک مقصد تھا، ایک انقلاب تھا، ہمہ گیر اور ہمہ جہت انقلاب۔

آج سے ساٹھ سال بیشتر اردو زبان میں "ہمدرد" نے جس طرح صحافت کا آغاز کیا تھا، وہ اسی پر ختم ہو گیا۔ اس اخبار کے مقالات، وقائع، اداریے، مراسلات، عالم اسلام سے متعلق تخلیقی و تاریخی مضامین اور سب سے بڑھ کر اس کا وہ انداز بیان جس کی "سنجیدہ شوخی" اور "شوخی سنجیدگی" اپنا ایک ایسا نقش قائم کر گئی ہے جو امتداد زمانہ کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔

"کامریڈ" نے اپنے معیار اپنی زبان کے لحاظ سے انگریزی داں طبقہ کو بے حد متاثر کیا حتیٰ کہ یورپین طبقہ میں بھی اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ شائقین اس کے ہر شمارہ کا بے چینی

کے ساتھ انتظار کرتے تھے۔ لیکن حکومت کو محمد علی کا یہ جذبۂ حریت ناپسند تھا۔ ارباب حکومت اس موقع کی تلاش میں تھے کہ اس اخبار کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ جنگ بلقان شروع ہوتے ہی "کامریڈ" بھی حرکت میں آ گیا۔ اس نے انگریزوں کی شاہنشاہوں کو طشت از بام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی بس پھر کیا تھا۔ یہ آزاد خیال اور حریت پسند اخبار حوادث و طلاطم کا شکار بن گیا اور "کامریڈ" پریس سے پہلی مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت اور دوسری بار دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی۔

اخبار کو مجبوراً بند کرنا پڑا لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اس کا دوبارہ اجرا ہو گیا۔ اس کے معاونین میں راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق وغیرہ شامل تھے۔ اس بار پرچہ جنوری ۱۹۲۶ء تک جاری رہا مگر مولانا محمد علی آل انڈیا کانگریس کی صدارت قبول کر چکے تھے اور اکثر و بیشتر بیمار ہی رہتے تھے۔ اس لیے "کامریڈ" کو کچھ عرصہ بعد خود ہی بند کر دیا۔

"ہمدرد" کی مدت اجرا کافی طویل ہے کیونکہ جب مولانا دلی آئے تو ...... ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو اس پرچہ کا اجرا عمل میں آیا لیکن مولانا کی سیاسی مصروفیات اور متواتر گرفتاریوں کے باعث پرچہ کی اشاعت خطرے میں پڑ گئی۔ اور وہ ، مئی ۱۹۱۵ء کو بند ہو گیا۔ پھر ۹ نومبر ۱۹۲۴ء کو دوبارہ جاری ہوا اور محمد علی کی وفات (۴ جنوری ۱۹۳۱ء) کے بعد بھی عرصے تک نکلتا رہا۔

مولانا محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ تحریک خلافت کا قیام ہے کیونکہ اس تحریک کو لبیک کہنے والوں نے ترکی کی زبردست حمایت کرتے ہوئے سامراجی حکومت سے ٹکر لی اور انھیں وطن خالی کرنے کے لیے مجبور کیا۔ مہاتما گاندھی نے اپنی تحریک ترک موالات کو علی برادران کی تحریک خلافت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کی صلاح دی اور ان دونوں تنظیموں نے انگریزوں کے حوصلوں کو پسپا کر دیا۔ اس اتحاد و تعاون کی بدولت ہندو مسلم اتحاد کے ایسے روح پرور مناظر دیکھنے کو ملے جو آج حصول آزادی کے بعد بھی کمیاب ہیں۔

محمد علی کا ایک بڑا کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس بھی ہے۔ جب ملک میں سودیشی تحریک زوروں پر تھی اور کانگریس نے یہ تجویز پاس کی کہ انگریزی اشیاء اور انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کیا جائے۔ تو قومی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ محمد علی علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن ان کو ٹرسٹیوں کا انداز فکر اور طرز عمل پسند نہیں تھا۔ وہ اس کالج کے انتظام میں تطہیر کے خواہاں تھے۔ اس لیے سنہ ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے قومی تعلیم کا ریزولیوشن پاس کر دیا تو انھوں نے علی گڑھ کالج (جو اس وقت تک مسلم یونی ورسٹی بن گیا تھا۔) کے انتظام کو ملت اسلامیہ کے ہاتھوں میں پہنچانے کا نعرہ بلند کیا لیکن ٹرسٹیوں اور وائس چانسلر ضیاء الدین احمد کی شاطرانہ موشگافیوں کے باعث انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مولانا محمد علی اپنی شکست پر بوکھلا اٹھے اور انھوں نے غضب ناک صدائے احتجاج بلند کی جس کا غلغلہ پورے ملک میں گونجنے لگا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو انھوں نے مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر یونی ورسٹی کی مسجد میں طالب علموں اور قوم پرستوں کا جلسہ کیا اور "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے ایک قومی یونی ورسٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ یونی ورسٹی ایک مشن تھی، تحریک تھی اور آزادی کے دیوانوں کے جوش و ولولہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھی۔ محمد علی نے کھلے عام اعلان کیا کہ اس تعلیمی ادارہ کا بندوبست ہندستانی عوام کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اور ہم حکومت سے کوئی امداد لینا نہیں چاہتے۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء کے سیاسی حالات پر نگاہ ڈالیے تو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو قوم کا ہیرو بنا دیا۔ گاندھی جی اس زمانہ میں افریقہ سے لوٹ کر آئے تھے اور ہندستان میں کانگریس کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ علی برادران بڑے ہی مردم

شناس تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کو اپنے ہمراہ "ایک رُوح دو قالب" کی طرح شریک کار کرلیا۔ وہ مسلمانوں میں جاتے تو اپنے ساتھ گاندھی جی کو ضرور لے جاتے تھے۔ کان پور کی مسجد کا قضیہ ہو یا امرت سر کے جلیان والا باغ کی فائرنگ، کانگریس کی صدارت ہو یا خلافت کانفرنس، مولانا محمد علی اپنے چہیتے گاندھی جی کے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ مولانا نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ کانگریس میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں کیونکہ انگریز جیسی شاطر و ظالم قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے اور ان کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے دونوں اقوام کو یک جان و یک قالب ہوکر جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ علی برادران جب جیل سے رہا ہوئے تو اس وقت امرتسر میں کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ دونوں بھائی رام پور جانے کی بجائے سیدھے امرتسر پہنچے اور انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ اب تک مسلمان بحیثیت من القوم کانگریس میں شریک نہیں ہوئے تھے محض چند گنے چنے نیشنلسٹ مسلمان ہی اس کے اراکین تھے۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ علی برادران شریک اجلاس ہوئے۔ گویا ان دونوں بھائیوں کی شکل میں ساری قوم ہی اس اجلاس میں شریک تھی۔ بہرحال اس کے بعد مسلمان جوق در جوق کانگریس میں شامل ہونے لگے۔

امرتسر کے اجلاس کے بعد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دہلی واپس آئے اور ان کا قوم نے تاریخی استقبال کیا۔ دہلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ ٹاؤن ہال پر جلسہ ہوا جس کا اسٹیج بھی آراستہ و پیراستہ تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے علی برادران اور ان کی شان میں تہنیت نامہ پڑھ کر سنایا اور اسی جلسے میں شیو پرشاد (سی آئی ای اور جی ای) رئیس اعظم دہلی کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش ہوا جس کو مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے پڑھا تھا۔

۸/ ۹ اور ۱۰ رجولائی ۱۹۲۱ء کی آل انڈیا خلافت کانفرنس اس اعتبار سے اہم سمجھی جاتی ہے کہ اس میں پہلی بار ہندستان کے لیے آزادیِ کامل اور جمہوری طرزِ حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا، کراچی کے اس جلسے کی صدارت مولانا محمد علی جوہر نے کی اور دوسرے مقرروں میں ڈاکٹر کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی، شنکراچاریہ اور مولانا نثار احمد کان پوری کے نام بھی شامل ہیں۔

اس جلسے کے اختتام پر تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا اور خالق دینا ہال (کراچی) میں نظر بند کردیا گیا۔ مقدمہ چلایا گیا جس میں جھوٹی شہادتیں پیش ہوئیں اور یہ الزام ثابت کرنے کی کوششیں ہوئیں کہ ملزمین نے ہندستانی فوجیوں میں اشتہارات تقسیم کیے تھے اور جن میں سپاہیوں کو فوج میں ملازم رہنے سے روکا گیا تھا۔ ایک نظم اس موقع پر بے حد مقبول ہوئی جو درج ذیل ہے:

ہے یہ حکمِ خدا حکمِ حضرت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
دے چکی ہے یہ فتویٰ شریعت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
کیوں نمک کھاتے ہو ظالموں کا — خون پیتے ہو کیوں بھائیوں کا
کالا منھ ہوگا روزِ قیامت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
کر رہے ہیں فرشتے بھی لعنت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
کافروں کی جو عزت کروگے — کیا خدا کو جواب اس کا دوگے
مصطفیٰ کی نہ ہوگی شفاعت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
شانِ اسلام کی گھٹ گئی ہے — فوجِ سلطان کی کٹ گئی ہے
لٹ گئی دین کی بادشاہت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
کی مدینہ پہ تم نے چڑھائی — سبز گنبد پہ گولی چلائی
کیا خدا کو دکھاؤ گے صورت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
مٹ گئی کعبۃ اللہ کی حرمت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
قتل ترکوں کا تم نے کیا ہے — تختِ سلطان کا تم نے لیا ہے
تم نے چھینا ہے تاجِ خلافت — نوکری چھوڑ دو فوج والو
بعد مرنے کے پچھتاؤ گے تم — سانپ بچھو سے گھبراؤ گے تم
پسلیاں توڑ ڈالے گی تربت — نوکری چھوڑ دو فوج والو

۱۹۲۴ء کا سال انڈین نیشنل کانگریس کے لیے بہت اہم ہے

کیوں کہ اس سال مولانا محمد علی کو اس اجلاس کے لیے صدر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ بات قابلِ لحاظ تھی کہ ملک کی تمام ریاستی کمیٹیوں نے مولانا کے نام کی تجویز کی تھی۔ اس اجلاس میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ اپنی طوالت اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی غیر معمولی تھا۔

لیکن مولانا کی یہ قوم پرستی اس وقت لرزہ براندام ہو گئی جبکہ ملک کے کونے کونے سے فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں موصول ہونے لگیں۔ سوراج پارٹی کی تشکیل کے بعد جس کی رہنمائی پنڈت موتی لعل نہرو، لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس کر رہے تھے، لکھنؤ میں زبردست فساد ہوا جس میں کئی مسلمانوں کی شہادت ہوئی اور املاک کو نقصان پہنچا۔ ادھر سوامی شردھا بھی مولانا کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور تعصب و فرقہ پرستی کا زہر گھول رہے تھے۔ انھوں نے ترک موالات سے لاتعلقی کر کے شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ ہندو مہاسبھا کے ممبران نے راجپوتانہ میں جا کر ناواقف مسلمانوں کو تشدد کے ذریعہ ہندو بنانا چاہا۔ اس پر وہاں سے مسلمانوں میں شدید ردِ عمل ہوا اور فسادات کی آگ چاروں طرف پھیل گئی۔ مہاتما گاندھی کو یہ طرزِ عمل سخت ناپسند تھا اور اس سے انھیں دلی صدمہ پہنچا۔ ان کو ترک موالات کی تحریک کے پاؤں اکھڑتے نظر آئے اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک طرف ہندو مسلم آویزش، دوسری طرف مولانا محمد علی کی جان لیوا علالت (دونوں) نے مل کر قوم کے اس جری عظیم مجاہد کو مبتلائے آزمائش کر دیا۔ ذیابیطس کی وجہ سے ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ یوں تو انھوں نے حالات سے بددل ہو کر کانگریس سے علاحدگی اختیار کر لی تھی لیکن آزادی کی تڑپ اور وطن کی محبت ان کے دل میں آخر تک قائم رہی جس کا سب سے بڑا اور آخری مظاہرہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں کیا جہاں انھوں نے علالت کے باوجود نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ انھوں نے اپنی نوکیلی اور پر مغز و مدلل تقریر کے ذریعہ انگریزوں کے ایوان کو دم بخود کر دیا۔ انھوں نے انگریزوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ میں ایک غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا۔ یا تو آپ میرے وطن کو اس کانفرنس میں پروانہ آزادی یا اپنے ملک (انگلستان) میں دفن ہونے کے لیے دو گز زمین فراہم کریں۔ محمد علی کی پہلی آرزو تو پوری نہ ہو سکی البتہ دوسری تمنا ضرور پوری ہوئی۔ جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے:

"—— جب ہمارے بہت سے لیڈر جیل میں تھے اور ترک موالات زوروں پر تھی تو مولانا محمد علی نے کانگریس کے فیصلوں کے منافی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی۔ مجھے ان کے جانے کا بے حد افسوس ہوا مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی جانا نہیں چاہتے تھے اور یہ ان کی لندن کی بعض سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ مولانا جانتے تھے کہ ملک بیدار کر انگریزوں سے جنگ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ چہ جائیکہ لندن کے کانفرنس ہال میں گفت و شنید کی جائے۔ اگر وہ وطن واپس آ جاتے تو مجھے یقین تھا کہ وہ از سر نو جنگ آزادی میں ہمارا ساتھ دیتے۔"

افسوس صد افسوس! مشرق کا یہ سورج ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مغرب کے سمندر میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا اور پوری قوم ایک عہد ساز شخصیت کا ماتم کرتی رہی ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

★

تنویر اعظمی
موضع و پوسٹ: بھولی پور، ڈاکخانہ بھگا
ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)

یہ پندرہ اگست ہے کہ موسم بہار ہے

سیہ گھٹا کی چھاؤں میں نسیم خوشگوار ہے
گلے میں شاخ شاخ کے گلوں کا سرخ ہار ہے
وطن کے گاؤں گاؤں میں خوشی کا آبشار ہے
یہ پندرہ اگست ہے کہ موسم بہار ہے

گلی گلی رواں دواں زمیں پہ موج آب ہے
سفر میں خار و خس بھی ہیں خزف بھی ہمرکاب ہے
نہ خوفِ طولِ راہ ہے نہ ماندگی کا خواب ہے
یہ پندرہ اگست ہے کہ موسم بہار ہے

وطن کے مست نوجواں قطار در قطار ہیں
علم لیے ہیں دوش پر لباس زرنگار ہیں
لبوں پہ گیت دیش کے بصورت ہزار ہیں
یہ پندرہ اگست ہے کہ موسم بہار ہے

الٰہی ان کو مل کے رہنے کا چلن نصیب ہو
ترقیوں کے اوج کا حسیں چمن نصیب ہو
محبتوں کی پُرخلوص انجمن نصیب ہو
یہ پندرہ اگست ہے کہ موسم بہار ہے

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ۔۳

آزادیِ وطن

تاریک شاہراہوں کے منظر بدل گئے
کہرا چھٹا، ہوائیں تھمیں، دیپ جل گئے
جو لڑکھڑا رہے تھے مسافر سنبھل گئے
کوسوں غبارِ راہ سے آگے نکل گئے
معجز نما وہ نقشِ وفا تھے حیات میں
روشن ہوئے چراغِ عمل کالی رات میں

سر سے کفن کو باندھ کے نکلے وطن کے لوگ
وہ گیروے لباس ہرے پیرہن کے لوگ
ہر گام ساتھ ساتھ تھے ہر انجمن کے لوگ
مقصد تھا ایک، ایک تھے گنگ و جمن کے لوگ
مٹنے کا تھا خیال نہ مرنے کا کوئی غم
آواز آ رہی تھی فقط بندے ماترم

وہ بندے ماترم کی صدا وہ سبھوں کا جوش
ٹکرا گئے پہاڑ سے غازی و سرفروش
حیرت سے دیکھتی رہی دنیا علم بدوش
اک مردِ باوفا کا وہ اندازِ فکر و ہوش
پسپا کیا حریف کو ہر ہر محاذ پر
لڑتا رہا نہتا وہ دشمن سے بے خطر

توڑی کلائی ظلم کی زنداں کے در کھلے
زنجیر کٹ کے گر گئی باب اثر کھلے
برسوں کے بعد بت شکن و حق نگر کھلے
تھے جس کی آرزو میں وہ رازِ سحر کھلے
خوشبو گھلی فضاؤں میں دل شاد ہو گئے
گلشن کے پھول قید سے آزاد ہو گئے

کاظم علی خاں

۲۰۱، وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اردوے معلی حصہ اول: طبع اول میں خطوط غالب کی تاریخیں

اردوے معلی (حصہ اول): اسد اللہ خاں غالب ۔ اکمل المطابع دہلی طبع اول مطبوعہ ۶ر مارچ ۱۹۶۹ء میں خطوطِ غالب کی تاریخوں کے اندراج میں فروگذاشتوں کی متعدد مثالیں روشنی میں آچکی ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں

(۱)

مکتوب غالب بہ نام غلام بابا خاں (ص ۸) پر سہ شنبہ ۳۰ر اپریل ۱۸۶۷ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے۔ تقویم ۳۰ر اپریل ۱۸۶۷ء کو چہار شنبہ بتاتی ہے۔ میں اس خط کے لیے سہ شنبہ ۲۳ر اپریل ۱۸۶۷ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔ ۲۳ر اپریل کی جگہ ۳۰ر اپریل کا اندراج میرے نزدیک سہو کتابت ہے۔ مجھے اس خط کے مطالب مکتوب غالب بہ نام سیاح مورخہ ۲۳ر اپریل ۱۸۶۷ء (مشمولہ اردوے معلی (حصہ اول) طبع اول ص ص ۳۲ تا ۳۳) کے مندرجات کے مماثل ملتے ہیں۔ ان حالات میں میرے نزدیک غلام بابا خاں کے نام غالب کے اس زیر بحث خط کی تاریخ ۳۰ر اپریل کے بجائے سہ شنبہ ۲۳ر اپریل ۱۸۶۷ء ہو سکتی ہے۔

(۲)

غلام بابا خاں کے نام غالب کے ایک خط (ص ۸) پر چہار شنبہ ۶ر اپریل ۱۸۶۸ء کا اندراج خلاف تقویم ہے۔ تقویم میں ۶ر اپریل ۱۸۶۸ء کو دو شنبہ بتاتی ہے۔ میرے خیال میں اس خط کی تاریخ تحریر چہار شنبہ ۶ر مئی ۱۸۶۸ء ہو سکتی ہے جو از روے تقویم غلط نہیں۔ چہار شنبہ ۶ر مئی ۱۸۶۸ء کی جگہ چہار شنبہ ۶ر اپریل لکھا جانا غالباً کتابت کا سہو ہے۔

(۳)

اردوے معلی، طبع اول (ص ۱۲) میں مکتوب غالب بنام غلام بابا خاں پر یک شنبہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۵ء کی تاریخ میرے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ خط میں غالب کا بیان بتاتا ہے کہ یہ رقعہ برسات کے موسم میں لکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ۱۷ر دسمبر کو برسات کا موسم نہیں ہوتا۔ میں اسے یک شنبہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء کا مکتوب مانتا ہوں۔ ۱۷ر ستمبر سے برسات کے موسم کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں اس خط کے مطالب کو مکتوب غالب بہ نام سیاح مورخہ یک شنبہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء (مشمولہ اردوے معلی طبع اول ص ص ۲۶ تا ۲۷) کے مضامین سے بڑی حد تک مماثل پاتا ہوں۔ دونوں خطوں کا باہم تقابلی مطالعہ میرے خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس خط کے لیے مولانا غلام رسول مہر نے ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء کی تاریخ درج کی ہے مگر موصوف نے اس سلسلے میں تائیدی شواہد پیش نہیں فرمائے ہیں (خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر۔ لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۲۰۲) اردوے معلی طبع اول (ص ۱۲) میں اس خط کے سنہ ۱۸۶۵ء میں "۵" کا ہندسہ اس قدر مختصر ہے کہ وہ صفر سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب کی بعد کی بعض اشاعتوں میں اس خط کی تاریخ غلطی سے

یک شنبہ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۰ء درج ہوئی ہے جو خلاف تقویم ہے [رک : (۱) اردوے معلیٰ ، (حصہ اول) مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ۹ (۲) اردوے معلیٰ شائع کردہ رام نرائن لعل تک سیلر مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد ص ۷]۔ غلام بابا خاں کے نام غالب کے اس خط کا سال تحریر ۱۸۶۰ء اس لیے بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ میری اطلاع کے بموجب غالب اور غلام بابا خاں کے درمیان خط و کتابت کا آغاز یک شنبہ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۸ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۸۶۲ء کے خط [مشمولہ اردوے معلیٰ ط۱ طبع اول ص ص ۶ تا ۷] سے ہوا تھا جیسا کہ اس خط میں غالب کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔

(۴)

اردوے معلیٰ ط۱ طبع اول (ص ۲۰) میں مکتوب غالب بنام میاں داد خاں سیاح پر سہ شنبہ ۲ ذی قعدہ و مئی معاً" سنہ نامکمل اندراج ملتا ہے۔ غالب شناسوں نے تقویم کی مدد سے اس خط کا سنہ تحریر ۱۲۷۸ھ ۔ ۱۸۶۲ء متعین کیا ہے لیکن تقویم ۲ ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سہ شنبہ کے بجائے جمعہ بتاتی ہے۔ اگر دن سہ شنبہ صحیح مانا جائے تو میرے نزدیک اس خط کے لیے سہ شنبہ ۶ مئی ۱۸۶۲ء یا سہ شنبہ ۲۰ مئی ۱۸۶۲ء کی دو امکانی تاریخیں ہو سکتی ہیں۔ ۶ مئی یا ۲۰ مئی کا ۲ مئی ہو جانا کاتب کا معمولی سہو معلوم ہوتا ہے۔

(۵)

اردوے معلیٰ ط۱ طبع اول (ص ۲۱) میں مکتوب غالب بنام سیاح پر سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۶ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے۔ تقویم کی مدد سے اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اول جلد اول، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب لاہور طبع ۱۹۶۹ء (ص ۷۷، حاشیہ ۱) میں اس خط کے لیے سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء کی تاریخ شک کے ساتھ تجویز کی گئی ہے۔ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر (ص ۳۷۶) میں اس خط کے لیے یکم مارچ ۱۸۶۶ء کو برقرار رکھتے ہوئے سہ شنبہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ میں اس خط کے لیے استاد محترم مولانا فاضل لکھنوی کی تجویز کردہ تاریخ سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء کو درست سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے جو تائیدی شواہد ملے ہیں وہ یہ ہیں۔ اس خط میں غالب کے بیانات بتاتے ہیں کہ غالب کو بہت دنوں کے بعد سیاح کا خط ملا تھا اور غالب ایک عرصے تک سیاح کا خط نہ آنے سے ملول تھے۔ ان حالات میں خط یکم مارچ ۱۸۶۶ء کا اس لیے نہیں ہو سکتا کہ غالب کو سیاح کا خط ۲۰ فروری ۱۸۶۶ء کو مل چکا تھا جیسا کہ مکتوب غالب بہ نام سیاح مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۶۶ء [مشمولہ اردوے معلیٰ ط۱ طبع اول ص ص ۲۴ تا ۲۵] سے ظاہر ہے ۲۰ فروری ۱۸۶۶ء کو سیاح کا خط موصول ہونے کے بعد یکم مارچ ۱۸۶۶ء کے خط میں غالب کی یہ شکایت کہ "بہت دن سے ...... مولانا سیاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا......" بے محل معلوم ہوتی ہے۔ یہ خط سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء کا ماننے پر غالب کی یہ شکایت درست ثابت ہوتی ہے کیونکہ خطوط غالب بہ نام سیاح و بہ نام غلام بابا خاں کے تاریخ وار مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب اور سیاح کے درمیان اگست ۱۸۶۲ء بلکہ ۶ ستمبر ۱۸۶۲ء تک خط و کتابت ہونے کے بعد اکتوبر ۱۸۶۲ء سے اواخر فروری ۱۸۶۴ء تک خط و کتابت بند رہی تھی۔ ان حالات میں یکم مارچ ۱۸۶۴ء کے خط میں غالب کی مذکورہ بالا شکایت درست ثابت ہوتی ہے اور میرے نزدیک اس خط کے لیے مولانا فاضل لکھنوی کی تجویز کردہ تاریخ سہ شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء درست قرار پاتی ہے۔

(۶)

اردوے معلیٰ ط۱ طبع اول (ص ۳۸) میں مکتوب غالب بنام حبیب اللہ ذکا پر جمعہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ ۔ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کا اندراج خلاف تقویم ہے۔ تقویم میں ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو جمعہ ۱۱ مئی ۱۸۶۶ء کی تاریخ ملتی ہے۔ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر (ص ۳۹۱) میں اس خط پر اردوے معلیٰ کی تقلید میں جمعہ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کی خلاف تقویم تاریخ ہی
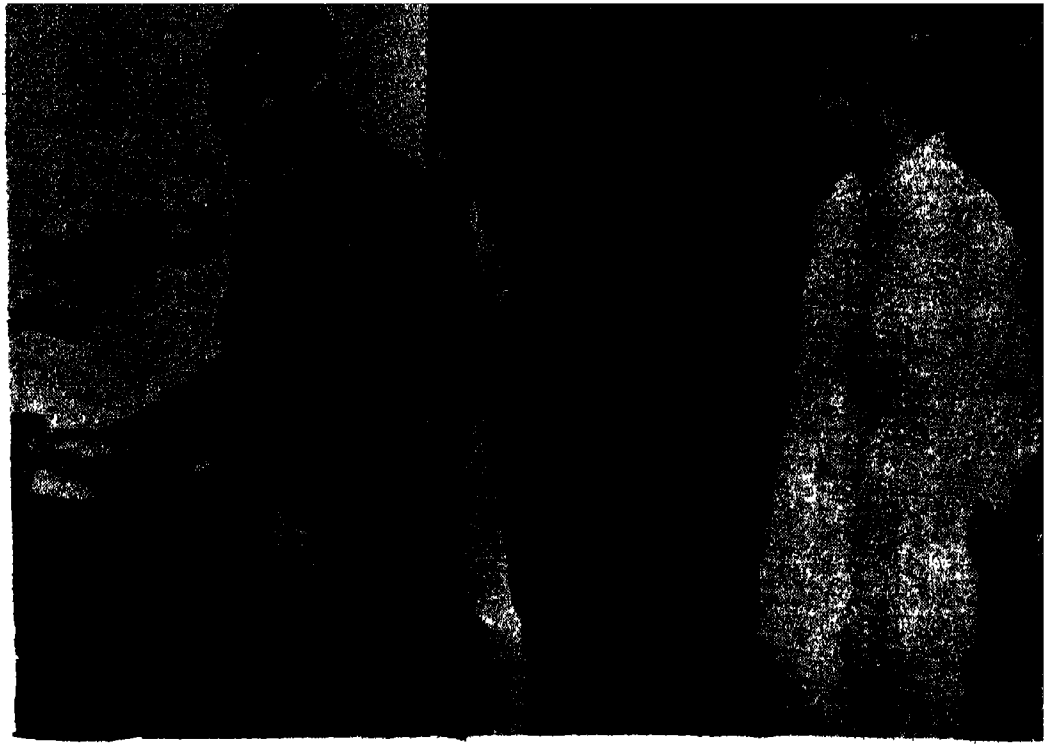
وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۵ جون ۱۹۸۱ء کو
رویندرالیہ لکھنؤ میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے زیر اہتمام منعقدہ
عوامی تعاون پندرھواڑے کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے
تصویر میں ڈائرکٹر اطلاعات شری ٹھاکر پرشاد سنگھ بھی نظر آرہے ہیں۔
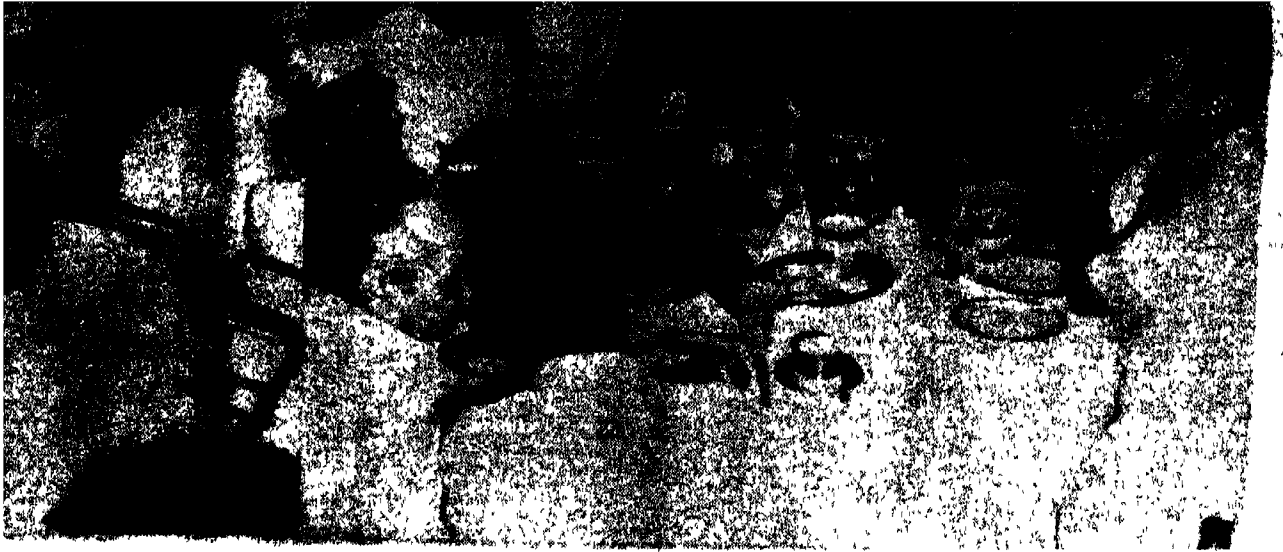
گورنر اتر پردیش شری سی۔پی۔ این سنگھ کی جانب سے راج بھون [illegible] افطار پارٹی کا ایک منظر
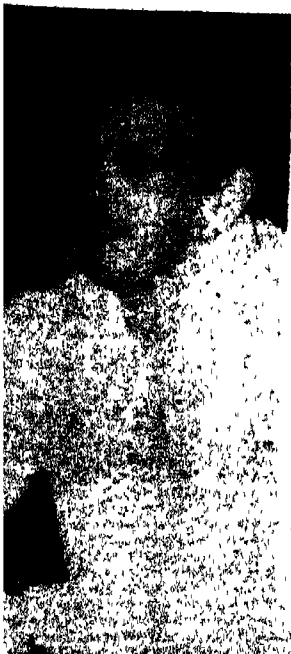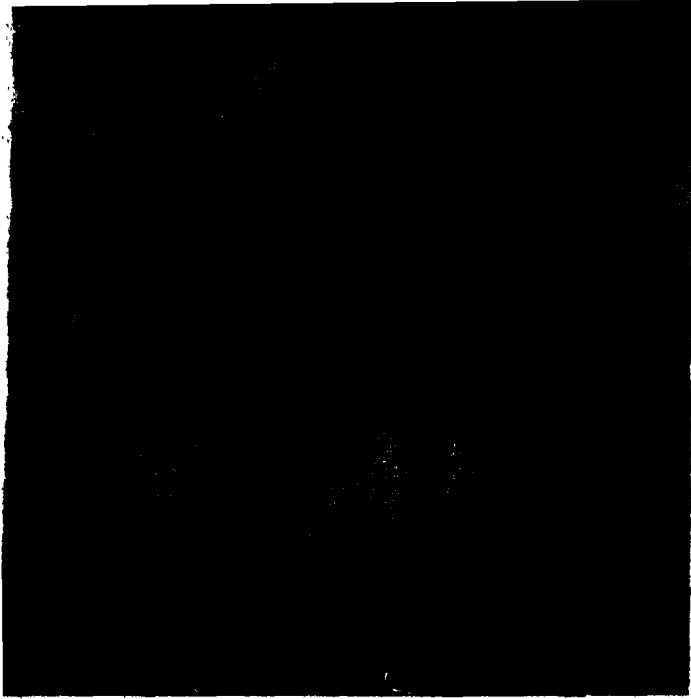
سہبی فوڈ فیکٹری، دلت پور، مرادآباد۔

جمنا ین بجلی پراجکٹ ڈہرہ دون

وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۲ اپریل ۱۹۸۱ء کو سوچنا بھون لکھنؤ میں محکمۂ اطلاعات و
رابطۂ عامہ اترپردیش کے زیر اہتمام منعقدہ اردو صحافیوں اور ناشروں کی ایک ریاستی کانفرنس
سے خطاب کرتے ہوئے
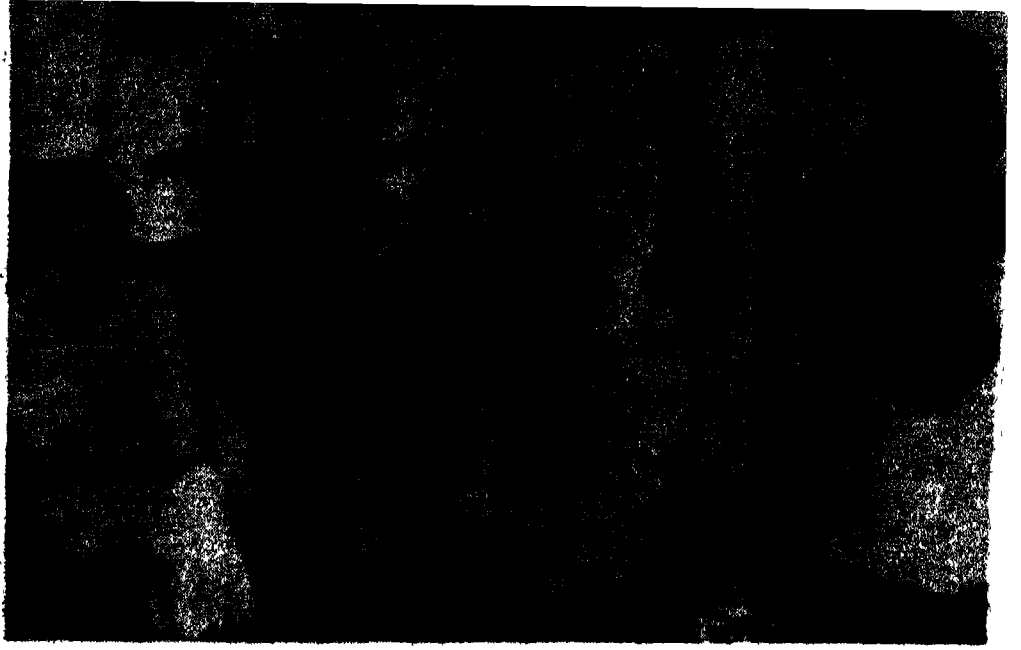
وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی رہائش گاہ
پر افطار پارٹی کا ایک منظر۔

ڈیزل لوکو موٹیو، وارانسی۔
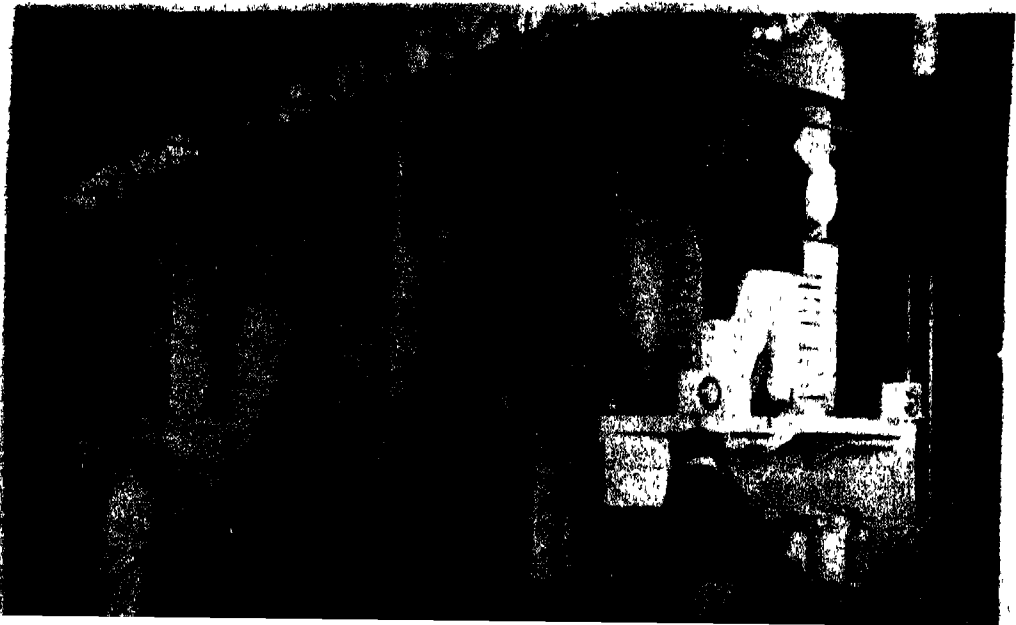
مرقوم ہے لیکن مولانا فاضل لکھنوی نے اردوئے معلی کی اس فروگذاشت کی اصلاح کی ہے [اردوئے معلی صدی ایڈیشن حصہ اول جلد اول ص ۱۰۸ مع حاشیہ ۱]

(۷)

اردوئے معلی ۱ طبع اول (ص ۴۸) میں مکتوب بنام تفتہ پر "یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۲۵۸ء" کا اندراج سہو کتابت کا دلچسپ کرشمہ ہے۔ غالب شناسوں نے "۱۲۵۸ء" کی اصلاح کر کے ۱۸۵۸ء لکھا ہے لیکن تقویم ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو دوشنبہ بتاتی ہے۔ تقویم کی مدد سے اس خط کے لیے یہ دو امکانی تاریخیں نکلتی ہیں: (الف) یکشنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۸ء (ب) دوشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء۔ مہیش پرشاد، مالک رام اور مولانا فاضل لکھنوی نے اس خط کے لیے یکشنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۸ء کی صرف ایک امکانی تاریخ درج کی ہے [رک: (۱) خطوطِ غالب (جلد اول) مرتبہ: مہیش پرشاد ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، طبع ۱۹۴۱ء ص ۳۳ (۲) خطوطِ غالب حصہ اول: مرتبہ مالک رام، سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۶۲ء ص ۳۸ (۳) اردوئے معلی صدی ایڈیشن حصہ اول: مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ۱۲۵ حاشیہ ۳] خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر (ص ۱۲۶) میں اس خط کے لیے یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کی خلافِ تقویم تاریخ ہی مرقوم ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں میں بھی زیر بحث خط پر یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کا خلافِ تقویم اندراج نظرثانی کا محتاج ہے:

(۱) اردوئے معلی (حصہ اول) مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ۳۵

(۲) اردوئے معلی۔ مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد ص ۲۸

(۳) روحِ غالب: مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، افضل برقی پریس حیدرآباد دکن طبع ۱۹۵۰ء ص ۱۰۲۔

(۴) محاسنِ خطوطِ غالب: غلام حسین ذوالفقار۔ مکتبہ خیابانِ ادب لاہور طبع دوم ۱۹۶۹ء ص ۱۲۱

(۸)

اردوئے معلی ۱ طبع اول (ص ۶۱) میں تفتہ کے نام ایک خط پر "جمعہ ۷ ستمبر" کا نامکمل اندراج تھا۔ مگر خط میں ۱۸۵۸ء کا ذکر ہے جس سے اس خط کی تاریخ جمعہ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء ہوتی ہے لیکن تقویم ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کو سہ شنبہ بتاتی ہے اسی لیے تقویم کی روشنی میں مہیش پرشاد نے اس خط کے لیے جمعہ ۱۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کی تاریخ تجویز کی ہے۔ [خطوطِ غالب ۱: مرتبہ مہیش پرشاد ص ۵۲]

(۹)

اردوئے معلی ۱ طبع اول (ص ۹۰) میں مکتوب بنام تفتہ پر "سہ شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء" کا اندراج خلافِ تقویم ہے۔ تقویم یہاں ۶ مئی ۱۸۶۰ء کو یکشنبہ بتاتی ہے۔ مندرجہ ذیل کتابوں میں اس خط پر سہ شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء کی خلافِ تقویم تاریخ محلِ نظر ہے:

۱۔ اردوئے معلی (۱) مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ۶۷

۲۔ خطوطِ غالب: مرتبہ مہیش پرشاد ص ۵۰

۳۔ خطوطِ غالب (۱) مرتبہ مالک رام ۴۲

(۴) خطوطِ غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۱۵۶

۵۔ محاسنِ خطوطِ غالب: غلام حسین ذوالفقار ص ۱۳۲

اردوئے معلی صدی ایڈیشن حصہ اول جلد اول مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی (ص ۱۹۲ مع حاشیہ ۱) اس غلطی سے محفوظ ملتی ہے۔

(۱۰)

اردوئے معلی ۱ طبع اول (ص ۹۵) میں خط بنام تفتہ پر جمعہ اکتوبر ۱۴، ۱۸۶۲ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ میں اس خط کے لیے تقویم کی مدد سے جمعہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۲ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔ مہیش پرشاد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا فاضل لکھنوی نے اسے جمعہ ۱۴ اکتوبر

۱۸۶۲ء کا خط قرار دیا ہے لیکن خط میں برسات کی غیر معمولی تباہ کاری کا ذکر ہے وہ ۱۸۶۲ء کی برسات معلوم ہوتی ہے۔

(۱۱)

اردوے معلی ؎۱ طبع اول (ص ۹۹) میں مکتوب بنام تفتہ پر دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کی خلاف تقویم تاریخ ملتی ہے۔ تقویم ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کو سہ شنبہ بتاتی ہے اور تقویم میں دوشنبہ کو ۲۷ نومبر ۱۸۶۵ء ملتی ہے۔ اس خط پر مہیش پرشاد مالک رام اور مولانا غلام رسول مہر نے دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کی خلاف تقویم تاریخ ہی برقرار رکھی ہے۔ اردوے معلی صدی ایڈیشن (ص ۲۰۵) اس غلطی سے محفوظ ہے۔

(۱۲)

اردوے معلی ؎۱ طبع اول (ص ۱۱۳) میں مکتوب بنام تفتہ پر دوشنبہ ۳ مئی ۱۸۵۳ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے۔ میں اس خط کے لیے دوشنبہ ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء کی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔ میرے اس نظریے کے لیے تائیدی شواہد کی تفصیل میرے مضمون "اردوے معلی طبع ۱۸۶۹ء" میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہ مضمون میری کتاب خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ میں شامل ہے۔ مہیش پرشاد، مالک رام اور مولانا فاضل لکھنوی نے اس خط کو ۲ مئی ۱۸۵۳ء کا مکتوب سمجھا ہے ملاحظہ ہوں:

(۱) خطوطِ غالب (۱) مرتبہ مہیش پرشاد ص ۱۴
(۲) خطوطِ غالب (۱) مرتبہ مالک رام ص ۲۲
(۳) اردوے معلی صدی ایڈیشن حصہ اول جلد اول، مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ۲۲۶ مع حاشیہ ۲

مولانا غلام رسول مہر نے خطوطِ غالب لاہور ۱۹۶۸ء (ص ۱۱۳) میں اس خط پر دوشنبہ ۳ مئی ۱۸۵۳ء کی خلاف تقویم تاریخ ہی درج فرمائی ہے

(۱۳)

اردوے معلی ؎۱ طبع اول (ص ۱۱۹) میں مکتوب بنام تفتہ پر "پنجم جون ۱۸۵۳ء روز پنج شنبہ" کی خلاف تقویم تاریخ مرقوم ملتی ہے۔ تقویم اور خط کے متن میں غالب کے بیان کی بنیاد پر اس خط کی تاریخ یک شنبہ ۵ جون ۱۸۵۳ء متعین ہوتی ہے۔ خطوطِ غالب (۱) مرتبہ مہیش پرشاد (ص ۱۶)، خطوطِ غالب (۱) مرتبہ مالک رام (ص ۲۳) نیز اردوے معلی صدی ایڈیشن حصہ اول جلد اول مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی (ص ۲۳۸) میں اس خط پر پنجم جون ۱۸۵۳ء روز پنجشنبہ کا خلاف تقویم اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔ خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر (ص ۱۱۴) اس غلطی سے محفوظ نظر آتی ہے۔ اردوے معلی حصہ اول مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء (ص ۸۹) نیز اردوے معلی مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد (ص ۱۱۲) میں اس خط پر پنجشنبہ ۵ جون ۱۸۶۳ء کی تاریخ خلاف اصل اور خلاف تقویم ہونے کے باعث محل نظر ہے۔

(۱۴)

اردوے معلی ؎۱ طبع اول (ص ۱۲۶) میں مکتوب بنام شاہزادہ بشیر الدین پر دوشنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۸ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے۔ میں نے اس خط کے لیے دوشنبہ ۱۱ مئی ۱۸۶۸ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کی ہے تفصیلات کے لیے میرا مضمون "اردوے معلی طبع ۱۸۶۹ء" [مشمولہ خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ کاظم علی خاں] ملاحظہ ہو۔ خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر (ص ۴۸۱) میں اس خط پر دوشنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۸ء کا خلاف تقویم اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔

(۱۵)

اردوے معلی ؎۱ طبع اول (ص ۱۶۱) میں مکتوب بنام مجروح پر پنجشنبہ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے میں نے اس خط کے لیے تقویم کی مدد سے پنج شنبہ ۷ اکتوبر

۱۸۵۰ء کی ایک امکانی تاریخ متعین کی ہے [ملاحظہ ہو میرا مضمون اردوئے معلیٰ طبع ۱۸۶۹ء مشمولہ خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ] ۔ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد (ص ۲۳۸) میں اس خط پر پنج شنبہ ۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کی تاریخ توم ملتی ہے۔ محاسنِ خطوطِ غالب : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (ص ۱۵۶) میں اس خط پر بہ تقلید اردوئے معلیٰ پنج شنبہ ۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کا غلافِ تقویم اندراج محلِ نظر ہے۔

(۱۶)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ص ۲۰۱ تا ۲۰۲) میں مکتوب غالب بہ نام شاہ عالم کے خاتمے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہوئی ہے۔ اردوئے معلیٰ صدی ایڈیشن حصہ اول جلد اول، مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی (ص ۲۹) میں اس خط کے لیے یک شنبہ ۲۵ راگست ۱۸۶۰ء - ۸ صفر ۱۲۷۶ھ کی تاریخ تجویز کی گئی ہے جو خلافِ تقویم ہے۔ میں نے اس خط کے لیے غالب کے بیان اور تقویم کی بنیاد پر یک شنبہ ۲۵ راگست ۱۸۶۱ء مطابق ۱۸ ر صفر ۱۲۷۸ھ کی ایک امکانی تاریخ متعین کی ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "اردوئے معلیٰ صدی ایڈیشن حصہ اول - مرتبہ فاضل لکھنوی میں خطوط کی تاریخیں" یہ مضمون میری کتاب "خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" میں شامل ہے۔

(۱۷)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ۲۳۷) میں مکتوب بنام ابراہیم علی خاں وفا پر جمعہ ۷ راگست ۱۸۶۸ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے میں نے اس خط کے لیے جمعہ ۷ راگست ۱۸۶۰ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کی ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون "اردوئے معلیٰ طبع ۱۸۶۹ء" مشمولہ خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ]

(۱۸)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ۲۹۲) میں مکتوب بہ نام شہاب الدین احمد خاں ثاقب پر یک شنبہ ۱۱ راپریل ۱۸۵۸ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ تقویم میں ۱۱ راپریل ۱۸۵۸ء کو دوشنبہ ملتا ہے اور یک شنبہ ۱۰ راپریل ۱۸۵۸ء ملتی ہے۔ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد (ص ۲۹۲) میں اس خط کو یک شنبہ ۱۱ راپریل ۱۸۵۸ء کا مکتوب مانا گیا ہے۔

(۱۹)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ۳۱۷) میں مکتوب بہ نام میرن صاحب پر دوشنبہ ۹ رنومبر ۱۸۵۰ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ میں نے اس خط کے لیے دوشنبہ ۲۹ رنومبر ۱۸۵۹ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کی ہے۔ میرے نزدیک دوشنبہ ۲۹ رنومبر کو اردوئے معلیٰ کے کاتب نے غلطی سے دوشنبہ ۹ رنومبر لکھ دیا ہے۔

(۲۰)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ۳۲۹) میں مکتوب بہ نام حسین مرزا پر سہ شنبہ ۱۳ ردسمبر ۱۸۵۹ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ تقویم ۱۳ ردسمبر ۱۸۵۹ء کو شنبہ بتاتی ہے اور خط کے متن میں خود غالب کے بیان سے بھی شنبہ ۱۳ ردسمبر ۱۸۵۹ء کی تصدیق ہوتی ہے۔ [اردوئے معلیٰ حصہ اول طبع اول ص ص ۳۲۷ تا ۳۲۸] ۔ اردوئے معلیٰ صدی ایڈیشن حصہ اول جلد دوم : مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی (ص ۶۳۲ حاشیہ ۱) میں اس غلطی کی اصلاح کر دی گئی ہے۔

(۲۱)

اردوئے معلیٰ طبع اول (۳۴۲) میں مکتوب بہ نام شیو نرائن آرام پر چہارشنبہ ۲۶ راپریل ۱۸۵۹ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے......... تقویم ۲۶ راپریل ۱۸۵۹ء کو سہ شنبہ بتاتی ہے اور تقویم میں چہارشنبہ کو ۲۷ راپریل ۱۸۵۹ء ملتی ہے اردوئے معلیٰ کی اس فروگذاشت پر مولانا فاضل لکھنوی وغیرہ روشنی ڈال چکے ہیں۔

(۲۲)

اردوئے معلیٰ طبع اول (ص ۳۴۷) میں مکتوب بہ نام شیو نرائن آرام پر سہ شنبہ ۲۰ رجولائی ۱۸۵۹ء کی تاریخ خلافِ

تقویم سے ہے۔ میں اس خط کے لیے تقویم کی مدد سے سہ شنبہ ۱۲ار جولائی ۱۸۵۹ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔

(۲۳)

اردوے معلیٰ (۱) طبع اول (ص ۳۸۰) میں مکتوب بہ نام آرام پر سہ شنبہ ۳ر مارچ ۱۸۶۰ء کا اندراج خلاف تقویم ہے میں اس خط کے لیے سہ شنبہ ۱۳ر مارچ ۱۸۶۰ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔ ۱۳ر مارچ کا ۳ر مارچ بن جانا میرے نزدیک سہو کتابت کا ایک معمولی سا کرشمہ ہے۔

(۲۴)

اردوے معلیٰ (۱) طبع اول ص ص ۳۹۸ تا ۴۰۲) میں مکتوب غالب بہ نام علاء الدین احمد خاں علائی تاریخ تحریر سے محروم ملتا ہے۔ اس خط کا اصل نسخہ (بہ قلم غالب) لاہور میوزیم میں موجود ہے اور اس پر شنبہ ۸ر جون ۱۸۶۱ء مرقوم ہے۔

(۲۵)

اردوے معلیٰ (۱) طبع اول (ص ۴۱۴) میں مکتوب بنام علائی پر یک شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء کی تاریخ خلاف تقویم ہے۔ تقویم یکم مارچ ۱۸۶۲ء کو شنبہ بتاتی ہے۔ خط میں غالب کا بیان ہے:

"...... کل جمعہ کے دن نواب کا مسہل تھا ....."

غالب کے اس بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ خط شنبہ کے روز لکھا گیا تھا۔ میں اس خط کو شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء کا مکتوب قرار دیتا ہوں۔ اس خط پر یک شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء کی خلاف تقویم تاریخ مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل ہوتی رہی ہے:

(۱) اردوے معلیٰ (حصہ اول)۔ مطبع مجتبائی دہلی، طبع ۱۸۹۹ء ص ۳۱۱

(۲) خطوط غالب: (جلد اول)۔ مرتبہ مہیش پرشاد، طبع ۱۹۴۱ء ص ۳۳۷

(۳) خطوط غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، طبع ۱۹۶۸ء ص ۶۴

(۴) خطوط غالب (۱): مرتبہ مالک رام طبع ۱۹۶۲ء ص ۳۸۴

(۵) اردوے معلیٰ صدی ایڈیشن، حصہ اول جلد دوم مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع ۱۹۶۹ء ص ۷۶۴

(۲۶)

اردوے معلیٰ (۱) طبع اول (ص ص ۴۱۴ تا ۴۱۵) میں مکتوب بنام علائی تاریخ تحریر سے محروم ہے۔ اس خط کا اصل نسخہ بہ قلم غالب لاہور میوزیم میں موجود ہے جس پر دو شنبہ نہم رجب ۱۲۸۰ھ کی تاریخ مرقوم ہے۔ تقویم یک صد و دو سالہ منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء [مملوکہ رضا لائبریری رام پور] کی رو سے نہم رجب ۱۲۸۰ھ کو دو شنبہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کی تاریخ ملتی ہے۔ یہ خط مندرجہ ذیل کتب میں بے تاریخ ملتا ہے:

(۱) خطوط غالب (۱) مرتبہ مہیش پرشاد طبع ۱۹۴۱ء ص ۳۲۲

(۲) خطوط غالب (۱) مرتبہ مالک رام طبع ۱۹۶۲ء ص ص ۲۸۰ تا ۲۸۱ [خط نمبر ۴۴]

(۳) خطوط غالب: مرتبہ غلام رسول مہر طبع ۱۹۶۸ء ص ۶۰ (خط نمبر ۱۳)

(۴) اردوے معلیٰ (حصہ اول) مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ص ۳۱۲ تا ۳۱۳۔

(۵) اردوے معلیٰ، مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد ص ۲۹۹

(۲۷)

اردوے معلیٰ (۱) طبع اول (ص ۴۱۹) میں مکتوب غالب بہ نام علائی ["میری جان! ناسازیِ روزگار و بے ربطیِ اطوار... الخ"] بے تاریخ ملتا ہے۔ اس خط کی اصل (بہ قلم غالب) لاہور میوزیم میں موجود ہے جس پر "سہ شنبہ ۱۸ر شعبان ۱۲۸۱ھ" کی تاریخ ملتی ہے جو از روے تقویم یک صد و دو سالہ ۱۷ر جنوری ۱۸۶۵ء کے مطابق ہے۔ خطوط غالب کے وہ تمام مطبوعہ مجموعے جو میرے مطالعے میں رہے ہیں اس خط کی

تاریخ بتانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

(۲۸)

اردوئے معلیٰ ۱ طبع اول (ص ۲۰۴) میں مکتوب غالب بنام علاء الدین خاں علائی پر شنبہ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۴ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ اس خط کی اصل (بہ قلم غالب) لاہور میوزیم میں موجود ہے جس پر شنبہ ۱۰ر جنوری ۱۸۶۴ء کی تاریخ مرقوم ہے[6] لیکن تقویم میں ۱۰ر جنوری ۱۸۶۴ء کو یک شنبہ ملتا ہے اور تقویم شنبہ کو ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء بتاتی ہے۔ یہاں بظاہر غالب سے دن یا تاریخ کے اندراج میں سہو ہوا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر، مہیش پرشاد اور مالک رام وغیرہ[5] اب تک اس خط کو جولائی ۱۸۶۴ء کا مکتوب قرار دیتے رہے ہیں حالانکہ یہ خط ۱۸۶۴ء کے ماہ جنوری کے عشرۂ اول میں لکھا گیا ہے۔

(۲۹)

اردوئے معلیٰ ۱ طبع اول (ص ۲۲۴) میں مکتوب غالب بنام علائی ["مرزا علائی مولائی نے لاہور سے خط لکھا ....."] پر چہار شنبہ ۳ر نومبر ۱۸۶۴ء کی تاریخ خلافِ تقویم ہے۔ ۳ر نومبر ۱۸۶۴ء کو پنج شنبہ بتاتی ہے۔ میں اس خط کے لیے چہار شنبہ ۲۳ر نومبر ۱۸۶۴ء کی ایک امکانی تاریخ تجویز کرتا ہوں۔

خطوط غالب (۱) مرتبہ مہیش پرشاد (ص ۲۶۱) میں اس خط کو چہار شنبہ ۲ر نومبر ۱۸۶۴ء کا مکتوب مانا گیا ہے۔ خطوط غالب غلام رسول مہر (ص ۸۳) میں اس خط پر چہار شنبہ ۲ر نومبر ۱۸۶۴ء کا خلافِ تقویم اندراج نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔

★

حواشی

[1] رک : (۱) مکتوب غالب بنام سیاح مورخہ ۹ر اگست ۱۸۶۲ء مشمولہ اردوئے معلیٰ ۱ طبع اول ص ۳۰

(۲) مکتوب غالب بنام غلام بابا خاں مورخہ ۶ر ستمبر ۱۸۶۳ء مشمولہ اردوئے معلیٰ ۱ طبع اول ص ص ۶ تا ۷

[2] رک : (۱) خطوط غالب (جلد اول)، مرتبہ مہیش پرشاد ہندستانی اکیڈمی الہ آباد طبع ۱۹۴۱ء ص ۴۹

(۲) خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر علمی پرنٹنگ پریس لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۱۴۰

(۳) اردوئے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اول جلد اول، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مجلس ترقی ادب لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۱۹۸۔

[3] رک : خطوط غالب (حصہ اول)، مرتبہ مالک رام۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۶۲ء خط نمبر ۳۹ نیز خط نمبر ۵۴

[4] رک : (۱) خطوط غالب (۱)، مرتبہ مہیش پرشاد ص ۱۰۲

(۲) خطوط غالب (۱)، مرتبہ مالک رام ص ۹۹ [خط نمبر ۱۱۸]

(۳) خطوط غالب : مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۱۴۶

[5] [6] [7] یہ بحوالہ استاد محترم مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی [مقیم حال لاہور]

معین کوثر
باغ پاتو - پٹنہ ۶

پھولوں سے سنگ ریزوں تک

وہ ایک "شعلہ" جو بھڑکا بسِ حجابِ جمال
خدا گواہ کہ اک التہاب دے کے گیا
اودھ کی شام نے دیکھا بڑے ادب سے جسے
ستم کی رات کو اِک آفتاب دے کے گیا

ہوائے دامنِ افرنگ بھی بجھا نہ سکی
دلوں کو گرمیٔ صد انقلاب دے کے گیا
وطن کے لوگوں کو بخشا ہے حرّیت کا شعور
نظر نظر کو تمنّا کا خواب دے کے گیا

ہزار ابرِ ستم بھی جسے بجھا نہ سکا
بھڑک اٹھا تو اجالوں کا خواب دے کے گیا
چمن میں جتنے بھی کانٹے تھے ان کو پھونک دیا
نگارِ وقت کو تازہ گلاب دے کے گیا

وہ "شعلہ" جس کو بجھایا ہے اپنے لوگوں نے
لہو سے لکھ کے وفا کی کتاب دے کے گیا
وہ لکھنؤ سے ہمالہ کی گود میں پہنچا
وطن کو جنّتِ فردا کا خواب دے کے گیا

"پری محل" سے ہمالہ کے سنگ ریزوں تک
خود اپنی روح کو غم کا عذاب دے کے گیا
تمام عیش و طرب فرض پر کیے قرباں
بجھا تو نورِ شہِ بوتراب دے کے گیا

وہ "شعلہ" جس کو کہ حضرت محل کا نام ملا
بہت دنوں پہ سہی آج اک مقام ملا

رام لعل
"شانتی نکیتن"
ڈی ۲۲۹۰ رام ساگر مسرا نگر
لکھنؤ

(افسانہ)

ایک شہر دربند

اچانک اس نے اپنے پتی کے زور سے پکارنے کی آواز سنی ——— وہ باتھ روم میں نہانے کے لیے گھسا ہوا تھا اور اکثر تولیہ یا کوئی پہننے کا کپڑا بھول جاتا تو اسی طرح چلانے لگتا تھا۔ چلانا اس لیے تھا کہ وہ نل بند کرکے کبھی آواز نہیں دیتا تھا۔ گرتے ہوئے پانی کے شور پر حاوی ہونا اس کے لیے بہت ضروری ہوتا تھا۔ اور اس بات کا احساس تو وہ کبھی نہیں کرتا تھا کہ اس کی چلاّہٹ پانی کے شور سمیت ہی اس کی بیوی تک پہنچے گی جو عموماً وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی کسی کمرے یا کچن میں کام کر رہی ہوتی تھی۔ کچن میں اگر اسٹوو جل رہا ہوگا۔ یا کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوں گی جہاں سے باہر سڑک پر جانے والے موٹروں، ٹیمپوؤں اور موٹروں کا بے پناہ شور ہر وقت اندر آتا رہتا تھا تو وہ اس کی آواز سننے میں دیر ہی لگائے گی۔!

تارنی آہوجہ اس وقت اپنی میز پر ڈرائنگ کی کاپی بچھائے ساڑی کے ایک ڈیزائن میں رنگ بھر رہی تھی۔ وہ جلدی سے برش رکھ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے وہ آج باتھ روم میں صابن کی نئی ٹکیہ رکھنا بھول گئی ہو! لیکن جب اس نے پوچھا ——— "کیسے ———؟" تو وہ اسی اونچی آواز سے بولا ——— "آج شام کو تین مہمان آئیں گے۔ تینوں نان ویجیٹیرین ہیں سب تیار رکھنا۔"

یہ بات وہ باتھ روم سے باہر آکر بھی کہہ سکتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اکثر بہت ضروری باتیں بھول جاتا تھا۔ اور بھول جانے کے ڈر سے ہی جہاں بھی ہوتا فوراً اس سے کہہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ گھر سے نکلتے نکلتے اسے بتا دیتا یا پھر سڑک پر پہنچ کر بھی کہہ دینے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتا تھا۔

وہ اندر ہی اندر کچھ پریشانی سی محسوس کرتی ہوئی پلٹ آئی۔ پہلے سیدھی فرج کی طرف گئی۔ ایک تھیلی میں رکھے ہوئے قیمے کا جائزہ لیا۔ اس میں آدھا کلو مٹر ملا دینے سے ایک ڈش تو یہی بن جائے گی۔ کچھ انڈے بھی موجود ہیں۔ انڈا اکری یا انڈا پلاؤ بھی بن سکتا ہے۔ پھر جلدی سے گیٹ کے پاس بنی ہوئی کوٹھری کی طرف گئی۔ متیا داس کی بیوی کھٹیا پر پڑی سو رہی تھی۔ متیا داس ورکشاپ سے چھ بجے سے پہلے کبھی نہیں لوٹتا تھا۔ وہ صرف چھٹی کے روز ان کا اندر باہر کا کچھ کام کر دیتا تھا۔ تارنی نے اس کی بیوی کو جگا کر کہا ——— "ذرا جا کر آدھا کلو گوشت تو لا دو کونے والی دوکان سے۔ نہ ملے تو اسٹور میں چلی جانا۔ اتنے ہی وزن کی فریز کی ہوئی مرغی ہی لے لینا۔ یہ لو پیسے۔"

یہ کہہ کر اس نے بلاؤز میں سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی نکالی جس میں کچھ نوٹ تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اسے روپے دے کر وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ پھر اسی میز پر بیٹھ گئی۔ اور برش کو رنگ میں ڈبو کر اپنا بنایا ادھورا ڈیزائن پورا کرنے لگی۔

ساڑیوں اور چادروں کے نئے نئے ڈیزائن بنانا اس کی ہابی تھی۔ اس نے اپنے شوق کو تجارت کے لیے کبھی نہیں استعمال کیا تھا۔ یہ اس کے لیے گھر میں وقت کاٹنے کا ہی ایک مشغلہ تھا۔ اس کی ایک الماری اسی قسم کے ڈیزائنوں کی سینکڑوں کاپیوں سے

بھری ہوئی تھی۔ لیکن یہ شوق صرف اسی تک محدود تھا۔ اس کے دونوں بچے ـــــ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ سائنس کے اسٹوڈنٹس تھے جو دہلی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس کے اس مشغلے سے اس کے پتی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے ہی کاروبار میں مست رہتا تھا۔ اسکے پاس سیمنٹ اور بجلی کے خاص خاص آلات اور چند پیٹنٹ قسم کی دوائیوں کی ایجنسیاں تھیں۔ زیادہ تر اس کا کاروبار کاغذ پر ہی رہتا تھا۔ مال رکھنے کے لیے اس نے کوئی گودام بھی نہیں لے رکھا تھا۔ ریلوے یارڈ ویز سے بلٹیاں آتے ہی وہ تھوک دوکان داروں کے پاس پہنچ جاتا اور اپنا نفع حاصل کر کے بلٹیاں ان کے نام کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مارکیٹ کو بھی ہر وقت سونگھتا رہتا تھا۔ کہاں کس چیز کی کمی ہے اور کون سی چیز کہاں سے منگا کر سپلائی کی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنا بزنس سنٹر ایک بہت بڑی مارکیٹ کے اندر ایک چھوٹی سی دکان کے اندر بنا رکھا تھا جس کے اندر فون بھی تھا اور ایک ٹائپ رائٹر بھی۔ اس کے پاس نہ کوئی کلرک تھا نہ چپراسی سارا کام وہ خود ہی کر لیتا تھا۔

تارنی نے ایک بوڑھے کو ابھی ننگا کبھی نہ تھا کہ دیانند ایک پرنٹڈ لنگی شرٹ پہنے اور تولیہ باندھے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس کی پنڈلیاں اور جانگھیں سیاہ بالوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس کے پورے جسم پر گھنے سیاہ بال ایک جنگل کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ کپڑوں کے بغیر تو وہ بالکل ایک بن مانس ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا صرف چہرہ انسانوں جیسا تھا۔ تارنی نے اس کے سر کے بالوں سے ٹپکتا ہوا پانی دیکھا تو جلدی سے میز سے اٹھ کر کمرے کے وسط میں چلی آئی۔ ورنہ وہ اکثر اسی طرح اس کے اوپر آکر جھک جاتا تھا اور پانی کی بوندیں اس کے ڈیزائن کا ستیاناس مار دیتی تھیں۔

وہ پنکھے کے نیچے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جھٹکنے لگا۔ اور بولا۔ "ایک تو برلا سیمنٹ انجینیر کا اکاؤنٹنٹ ہے جو پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکا ہے۔ دوسرا کچے پلاسٹک کا ایک بیوپاری ہے جس سے میری ملاقات بمبئی میں اچانک ہو گئی تھی۔ تیسرا ان ہی کا کوئی دوست ہے۔ جسے میں نہیں جانتا۔"

تارنی نے کہا ـــــ "واپسی پر آپ صرف ایک درجن کباب پیک کرا کے لیتے آئیے گا۔ باقی سب کو تیار ملے گا۔ اگر رومالی روٹیاں کھلانے کا شوق ہو تو وہ بھی دو درجن لے لیجیے گا۔"

دیانند آہوجہ نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے پہننے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کچن میں جا کر اس کا ٹفن بند کرنے لگی۔ دوپہر کا کھانا وہ ہمیشہ ساتھ لے کر جایا کرتا تھا۔

اسی وقت دودھ والا دودھ اور دھوبی کپڑے لے کر آ گیا اس نے کچن اور برآمدے کے درمیان جلدی جلدی کئی چکر لگائے۔ دیانند نے چلا کر بوٹوں پر پالش کرنے کے لیے کہا تو اس نے جلدی سے یہ کام بھی کر دیا۔ اب وہ من ہی من منا رہی تھی کہ یہ جانور گھر سے باہر نکلے تو وہ اطمینان سے پھر سے اپنی میز پر جا بیٹھے۔ لیکن دیانند نے گھر سے نکلتے نکلتے بھی ایک گھنٹہ اور لے لیا۔ نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر وہ کچھ دیر تک وشنو ماتا کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا۔ اس گھر میں پوجا پاٹھ میں صرف اسی کا وشواس تھا۔ تارنی نے کبھی بھول کر بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں الگ الگ دنیا کے باشندے ہیں اور ذہنی طور پر ایک دوسرے سے میلوں دور ہیں۔

وہ اپنے اور اس کے درمیان ایک فاصلہ سا محسوس کرتی تھی لیکن کبھی زبان نہیں کھولتی تھی۔ کھول بھی کیسے سکتی تھی دیانند ایک جابر ترین پولیس آفیسر کا بیٹا تھا جس نے اپنے زمانۂ ملازمت میں لوگوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے تھے۔ کئی مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے سے پہلے مار مار کر اپاہج بنا دیا تھا۔ اور بڑے فخر سے گھر کے افراد کے سامنے اپنے قصے سنایا کرتا تھا کہ "چوروں، ڈکیتوں اور جیب تراشوں کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے پہلے میں اپنے سپاہیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں اور گھٹنوں کے جوڑ تڑوا دیتا ہوں۔ ان کے جوڑوں پر کمبل لپیٹ کر اور نیچے ایک اینٹ رکھ کر اوپر سے دوسری

اینٹ سے ایسی احتیاط سے ضربیں لگواتا ہوں کہ پور پور ٹوٹ جائیں لیکن بیرونی طور پر کوئی زخم نہ لگے۔ تاکہ وہ لوگ آئندہ کوئی جرم کرنے کے قابل ہی نہیں رہ جائیں۔"

اس گھر میں بھی اس نے اپنے سسر کا دبدبہ دیکھا تھا۔ اس کی ساس شوہر کے سامنے کبھی دم نہ مار سکی۔ اس کی گالیاں کھاتی تھی، اس کے ہاتھوں زد و کوب بھی ہوتی تھی لیکن اُف نہ کرتی تھی۔ آخر وہ اپنے جنم کو کوستی ہوئی چل بسی۔ اس کے شوہر کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ وہ خود بھی جب مرا تو کسی کے چہرے پر افسوس کا تاثر نہیں تھا۔ لوگ چپ تھے لیکن مطمئن بھی۔ اسے اس کے بڑے بیٹے نے گولی ماری تھی اور وہ ۔۔۔ پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ دیانند اس کا دوسرا بیٹا تھا۔ اگرچہ اپنے ۔۔۔ باپ کا بے حد لاڈلا تھا لیکن وہ بھی باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے دور دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ دیانند نے کسی اور شہر میں جاکر اپنی تعلیم پوری کی تھی۔ اس پر اپنے باپ کی چھاپ تو نہیں تھی پھر بھی گھر کے بارے میں بعض فیصلوں میں اس کا رویہ ویسا ہی ہوتا تھا۔ صرف اپنی مرضی ٹھونسنے کا۔ تارنی نے گزشتہ بیس سال میں ایک لمحہ کے لیے بھی وہ مسرت اور فخر محسوس نہیں کیا تھا جس کی حق دار ایک بیوی ہوتی ہے۔ اس شادی نے اس کے شخصی وقار کو بالکل مجروح کر رکھا تھا۔

وہ فرصت پاکر پھر اپنی میز پر جا بیٹھی اور ساڑی پرنٹس کے خاکوں میں رنگ بھرنے لگی۔ ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے اسے اس ہابی میں ایک قرار حاصل ہو جاتا تھا۔ خوب صورت رنگوں اور نئے نئے ڈیزائنوں کا انتخاب درحقیقت اس کی ناآسودہ زندگی کے خوابوں ہی کی ایک تکمیل تھی۔

مِنیا داس کی بیوی بازار سے سبزی لے آئی اور ڈاک بھی۔ ایک خط اس کی بیٹی ریتا کا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کے پیپر اچھے ہو رہے ہیں۔ لیکن اس نے دو ذاتی الجھنوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ ایک الجھن ایسی تھی جس کے بارے میں وہ صرف اپنی ماں ہی سے مشورہ لے سکتی تھی۔ اور اس قسم کا مشورہ عموماً پڑھی لکھی لڑکیاں اپنی ماؤں ہی سے لیا کرتی ہیں یا مائیں خود ان کی کیفیت کا کچھ اندازہ کرکے پوچھ لیتی ہیں۔

جب تارنی اپنی اٹھارہ برس کی خوب صورت بیٹی کا خط پڑھ رہی تھی تو وہ من ہی من میں اس کے ہر فقرے کا جواب بھی سوچتی رہی تھی کہ خط کا پڑھنا ختم کرکے وہ اسے کیا کیا لکھ بھیجے گی۔ ریتا کی دوسری الجھن نے اُسے چونکا دیا۔ بلکہ اسے خود ایک الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"۔۔۔ ممّا! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی بلکہ تم سے اجازت لینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم پاپا سے زیادہ سمجھ دار اور رئیلسٹک ہو۔ میں ایک لڑکے کو پسند کرنے لگی ہوں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پچیس سال کی عمر سے پہلے اس بارے میں کبھی سوچوں گی بھی نہیں۔ لیکن وہ سب سوچا اور طے کیا ہوا بدل کر رہ گیا ہے۔ ممّا تم سمجھ سکتی ہو میں ایسا کیوں محسوس کرنے لگی ہوں۔ تم اگر اس لڑکے کے بارے میں کچھ جاننا چاہو تو وہ تمھیں اگلے خط میں لکھ دوں گی۔ میں چاہتی ہوں تم اس سلسلے میں دھیرے دھیرے پاپا کو راضی کر لو یہ صرف تم ہی کر سکو گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے لیے تمھیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن کیا تم اپنی پیاری بیٹی کے لیے اتنا بھی نہیں ۔۔۔"

تارنی کتنی دیر تک بالکل خاموش بیٹھی رہ گئی۔ اس کی نظریں اپنے ادھورے ڈیزائن والی سفید شیٹ پر گڑی ہوئی تھیں۔ جن میں اسے ابھی کئی رنگ بھرنے تھے۔

رات کو کھانے پر تینوں مہمان آگئے، اب تک وہ ریتا کو کوئی جواب دینے کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اس کا خط اسی طرح اس کی میز پر کھلا ہوا پڑا تھا۔ وہ کئی گھنٹے کچن میں خود کو مصروف رکھ کر بھی یہی سوچتی رہی تھی کہ اس کی بیٹی ریتا نے ایک غلط باپ کے گھر میں جنم لے لیا ہے۔ اس گھر میں جو گھٹن ایک بیوی کے لیے ہے وہی اولاد کے لیے بھی ہے۔ یہ گھٹن پشت در پشت منتقل ہوتی آ رہی ہے۔ یہ سلسلہ ٹوٹے گا ضرور لیکن پتہ نہیں کب؟

مِنیا داس نے اس کی ہدایت پر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا اور مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اس کے پتی نے غلاقاً ان لوگوں سے اس کا تعارف کرایا تو ایک مہمان جس کا نام منگل پوار تھا۔ کمرے کے اس کونے میں یونہی ٹہلتا ہوا پہنچ گیا جہاں میز پر تارنی

آہوجہ کے ڈیزائن کی کاپی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس پر بڑی حیرانی سے جھک گیا اور پچھلے پتے بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"یہ ڈیزائن کون بناتا ہے؟" اس نے یکایک پلٹ کر پوچھا۔

تارنی اور دیا نند ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کہ جواب کون دے۔

وہ دونوں کے چہروں پر توقف کی کیفیت دیکھ کر بولا "میں بھی سورت کی ایک بہت بڑی کپڑا مل میں چیف ڈیزائنر ہوں۔ نئے نئے ڈیزائن تلاش کر کے مل کو فراہم کرنا ہوتے ہیں۔ اسی مقصد سے میں کھجوراہو جا رہا ہوں۔ اس کے لیے میں اب تک دکھنی اور جنوبی ہند کے کتنے مندروں اور گھپاؤں میں گھوم چکا ہوں، شمال میں کشمیر، پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں بھی میں نے آوارہ گردی کی ہے۔ ہر علاقے کے لباس کی ایک اپنی صدیوں پرانی روایت رہی ہے۔ کہیں کہیں تو کپڑوں پر چھپے ہوئے یا کڑھے ہوئے بیل بوٹے ان ہی علاقوں کی بیلوں، پھولوں اور پیڑوں وغیرہ کا اثر لیے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر لباس اپنی سجاوٹ میں اپنے ہی ماحول کی چھاپ قبول کرتا ہے۔ لیکن ان کے رنگ اور آرٹسٹک انداز سے کھینچی ہوئی قوسیں اور دائرے، آرٹسٹ کی اپنی شخصیت کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان ڈیزائنوں میں بھی ایک شخص پر تو جھلکتا معلوم ہوتا ہے۔ میں کچھ اور ڈیزائن بھی دیکھنا چاہوں گا۔ اگر ہوں تو!"

تارنی نے دیا نند کا اشارہ پا کر اسے بے شمار کاپیوں سے بھری ہوئی اپنی الماری دکھائی۔ وہ ڈیزائنوں کا اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور بولا۔

"آپ چاہیں تو ان کے معاوضے میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ رقم حاصل کر سکتی ہیں۔ اب مجھے ایک مدت تک کہیں اور جا کر گھومنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ کے اندر تو ایک ایسا چھپا ہوا آرٹسٹ موجود ہے جو کپڑوں کے رنگوں میں ایک بہت بڑا انقلاب لا سکتا ہے۔"!

تارنی خاموشی سے اپنی ڈرائنگ بکس کے انبار کو دیکھتی رہی۔ منگل پوار کے لہجے میں اسی اعتماد کی جھلک تھی جس کے سہارے اس نے لاشعوری طور پر برسوں سے اپنا یہ شغل جاری رکھا تھا۔ اسے جیسے ایک نیا وشواس حاصل ہو گیا، اپنی صلاحیتوں اور امنگوں کو بروئے کار لانے کے لیے، اور اس نے ایک ذہنی سکون و مسرت سی محسوس کی۔ یہ مسرت اس کی اندرونی آسودگی کی بھی غماز تھی۔ جس کے لیے وہ ایک مدت سے ترس رہی تھی۔

اس نے منگل پوار کی طرف سر گھما کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے پتی کی طرف دیکھا جو اس کی کونے والی میز پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ریا کا وہی خط تھا۔

تارنی ڈر گئی اس کے پتی کو یہ خط ابھی نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ وہ خود موقع پا کر اس کے ساتھ بات کرتی تو زیادہ بہتر ہوتا لیکن دیا نند خط اٹھا کر اس کے پاس چلا آیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "ہماری بیٹی اب بالغ ہو چکی ہے۔ اسے دکھو کہ اس لڑکے کو آئندہ چھٹیوں میں اپنے ساتھ لے آئے۔ اسی بہانے ہم بھی اسے دیکھ لیں گے۔"

اس کے لہجے میں وہی جانا پہچانا تحکم تھا۔ جن سے وہ بیس برس سے واقف تھی یعنی اب بھی اس نے اپنا یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ اس نے تارنی کی رائے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ تارنی نے ایک صدمہ سا محسوس کیا۔ لیکن پھر سوچا وہ اگر اسے سمجھا بجھا کر راضی کر لیتی تب بھی تو وہ لڑکے کو دیکھنے کے لیے اصرار کرتا۔!

اس نے بڑی اداس آنکھوں سے اپنے پتی کی اور دیکھا جو منگل پوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ تارنی کی ڈیزائنوں کی کاپیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے میں منہمک ہو گیا تھا۔

★

مہدی پرتابگڈھی

آج ہے پندرہ اگست

گیت یک جہتی کے گاتے جائیں
ملک کی شان بڑھاتے جائیں
پیار کی فصل اگاتے جائیں
جام خوشیوں کے لنڈھاتے جائیں
آج ہے پندرہ اگست

ڈھونڈلیں مسئلۂ وقت کا حل
جس سے تقدیر وطن جائے بدل
ہر طرف سجنے لگے بزم غزل
حسن تعمیر کے کھل جائیں کنول
آج ہے پندرہ اگست

یوں ہو بہبودی انساں کا خیال
زندگی کو نہ کوئی سمجھے وبال
ایک اک فرد یہاں ہو خوشحال
چہرۂ ہند کا بڑھ جائے جمال
آج ہے پندرہ اگست

خوش ہو مزدور تو سرشار کسان
فارغ البال ہو ہر ایک جوان
پُرسکوں شہر ہوں گاؤں کے مکان
سمجھے ہر شخص محبت کی زبان
آج ہے پندرہ اگست

ہو گیا دیش میں آغاز بہار
ہر طرف سج گئی پھولوں کی قطار
مٹ گئے ذہنوں سے سارے آزار
یوم آزادی ہے قومی تہوار
آج ہے پندرہ اگست

انجم عرفانی
مہارانی لال کنور مہاودیالیہ
بلرام پور (یو، پی)

پندرہ اگست

شجر ہے مست، ثمر مست، پھول مست ہے آج
ہوائے کیف چلی، پندرہ اگست ہے آج
نئے سرے سے دکھانا ہے پھر یہ دنیا کو
کہ قطرے قطرہ میں ہم دیکھتے ہیں دریا کو
ملی ہیں رفعتیں کچھ ایسی چشم بینا کو
عروج مہر و مہ و نجم پست پست ہے آج
ہوائے کیف چلی پندرہ اگست ہے آج
ہوائے گل کا کرم آج عام ہے سب پر
نظام مے کدۂ زیست آج ہے ڈھب پر
نہیں شکایت تشنہ لبی کسی لب پر
کچھ اس طرح کا ہر گام بند و بست ہے آج
ہوائے کیف چلی پندرہ اگست ہے آج
یہ روز جشن مسرت، وہ موسم گل ہے
کھلا دریچۂ نکہت، وہ موسم گل ہے
سفیر گل کو بھی حیرت، وہ موسم گل ہے
ردائے گل پہ سر گلکدہ نشست ہے آج
ہوائے کیف چلی پندرہ اگست ہے آج
ہر ایک رنگ عیاں ہو، روش روش انجم
بہار گل کا سماں ہو، روش روش انجم
جواب کاہکشاں ہو، روش روش انجم
وہ اہتمام کریں پندرہ اگست ہے آج
ہوائے کیف چلی پندرہ اگست ہے آج

(انشائیہ)

سید اظہر حسین ہاشمی
معرفت جلیس اینڈ کو بشمٰی نئی سڑک
کانپور۔

بہروپیا کون: کوّا یا انسان؟

پرندوں میں کوّے کو جو شہرت حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ کوّا چالاک ہے چور نہیں۔ دوسروں کی چیز نظر کے سامنے اٹھالے جاتا ہے۔ غیرت مند ہے دھمکائیے تو اڑ جاتا ہے پھر مڑ کر نہیں دیکھتا۔ کوّے اور انسان کا روز ازل سے ساتھ ہے۔ دونوں میں اُنس ہے۔ یہ اُنس عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ جس طرح عاشق مزاج صبح صبح محبوب کے گھر کا طواف کرنے پہنچ جاتے ہیں کوّے انسان کے گھر کا طواف شروع کر دیتے ہیں ؎

صبح چوں مردم بہ کاروبار روند
بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

لیکن کوّے بلاکشانِ محبت بھی ہیں اور ہمدرد انسانیت بھی۔ وہ سحر خیزی کا پیغام بھی پہنچاتے ہیں ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو

کوّے اپنے اور انسان کے بچوں میں امتیاز نہیں رکھتے۔ انسان کے بچہ کے ہاتھ میں کھانے کی چیز دیکھ پائیں تو لے اڑتے ہیں اور لے جاکر اپنے بچوں کو پہنچا دیتے ہیں۔ بچے بچے سب کے برابر انسان کے ہوں یا کوّوں کے!

کوّے شر اور کینہ سے پاک ہیں، انسان سے خواہ کتنا ہی دکھ پہنچے، حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ ان کا اتحاد قابل رشک ہے۔ ان کی باہمی ہمدردی بے مثل کھانے کا سامان کہیں دیکھ پائیں تو آواز دے دے کر بلا لیتے ہیں اور شریک دسترخوان کر لیتے۔ کوئی کوّا اگر گرفتار نظر آئے تو چیخ چیخ کر رہائی کی دعائیں کرتے۔ اگر انا للہ ہو جائے تو والہانہ وار آہ و زاری کرتے اُڑے چلے جاتے ہیں۔ جب تک میّت نہ اُٹھ جائے ماتم کرتے رہتے ہیں۔ ماتم کرنے کا چلن انسان نے کوّوں سے سیکھا ہے۔

ایک کوّے کو ہنس بننے کا شوق غالب کی حرص میں پیدا ہوا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ غالب جن دنوں بلّی ماران گلی قاسم جان میں رہتے تھے ایک کوّا صبح کے ناشتہ کی امید میں اُن کے مکان کی چھت کی منڈیر پر جا بیٹھتا تھا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ انھوں نے خط نویس کا روپ بھرا۔ غالب کا محبوب دوسروں سے خط کتابت کرتا تھا، ان سے بات تک کرنے میں عار سمجھتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے محبوب کو خط لکھنے کا یہ وسیلہ اختیار کیا کہ سر پر پگڑی باندھی۔ انگرکھا پہنا۔ کلک کا لمبا سا قلم کان پر رکھا۔ بغل میں کاغذ اور پوسٹ کارڈ، ایک ہاتھ میں داوات لیے دلّی کی گلیوں میں آواز لگاتے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

چنانچہ کوّے نے اپنے پنکھ میں ہنس کے پر پیوست کر لیے اور بہت خوش ہوا۔ لو میں ہنس بن گیا۔ خوش خوش تالاب پر گیا، پانی میں عکس دیکھا، ہو بہو ہنس نظر آرہا تھا۔ خوشی سے اچھلا کودا کچھ دیر کائیں کائیں کا نغمہ الاپا۔ مزید اطمینان

کے لیے چیل کے پاس گیا۔ چیل کا گھونسلا قریب تھا۔

(۱)

کوّے نے چیل کو سلام کیا، مزاج پرسی کی۔ پوچھا۔
خالہ اماں کیا کر رہی ہو؟

جیتے رہو چیل نے جواب دیا۔ بوٹی لائی ہوں بچوں کا پیٹ بھر رہی ہوں۔

چیل نے کہا۔ بیٹے تم نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ پڑوسی کا بھی حق ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آجایا کرو۔ مجھے فرصت کہاں کھانے کی جستجو میں بہت دور آسمان پر اڑتی ہوں تب غذا پاتی ہوں۔ تم خوش قسمت ہو کہ گھروں ہی سے حاصل ہو جاتی ہے۔

کوّے نے جواب دیا۔ واقعی پڑوسی کا حق ہوتا ہے، یہی سوچ کر آپ کے پاس خوشخبری سننے آیا ہوں۔

کیسی خوشخبری۔ چیل نے پوچھا؟

خالہ اماں! میں کل رات سویا۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا میں ہنس بن گیا۔ ہنس کے خوبصورت پر نکل آے۔ کوّے نے چیل کو ہنس کے پر دکھائے پوچھا کیا میں آپ کو ہنس نظر آرہا ہوں ۔۔؟

چیل ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ کوّا پاگل ہے ہنس کے پر لگا لینے سے ہنس نہیں بن جاتا۔ گدھا شیر کی کھال اوڑھ لے تو گدھا ہی رہتا ہے۔ میاں کوّے احمقوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہاری شکل کالی پر کالے چونچ اور پنجے کالے جو آواز سنے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ تم کو ہنس کون کہے۔ میری نصیحت مانو ہنس بنو گے تو کوّے برادری سے نکال دیں گے اور ہنس بھی منہ نہ لگائیں گے۔ تم نہ تین میں رہو گے نہ تیرہ میں تین تیرہ ہو جاؤ گے۔

کوّا چیل کی نصیحت سننے نہیں گیا تھا ہنس بننے کی خوشخبری سنانے گیا تھا۔ چیل ہنس مان لیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ آسمان سے بوٹی نظر آجاتی ہے میں اتنا قریب پھر بھی ہنس نظر نہ آیا میرے لیے آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

کوّے کو چیل کا فیصلہ پسند نہ آیا۔ اس کی عقل پر فاتحہ پڑھتا ہوا اڑ گیا۔

(۲)

چیل کی بہ نسبت گدھ سمجھدار ہے، عبادت گذار ہے، عبادت کی مشقت سے سر کے پر گرگئے چونچ اور پنجے پیلے پڑ گئے۔ ایسے خدا پرست کو ہنس ماننے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ کوّا گدھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گدھ آنکھیں بند کیے دھیان گیان میں بیٹھا تھا۔ آہٹ پائی تو آنکھیں کھول دیں۔ کوّے نے ادب سے سلام کیا۔ گدھ نے گردن کے اشارہ سے دعا دی۔ آنے کا سبب پوچھا۔

کوّے نے کہا۔ دادا جان! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر نوح عطا فرمائے۔ آپ کی بزرگی کا چاردانگ عالم میں بول بالا ہے، میں ایک عرض لے کر حاضر ہوا ہوں اجازت دیجیے کہ پیش خدمت کروں۔

گدھ منھ سے پھر بھی نہ بولا اشارہ ہی سے پوچھا۔
کہو کیا کام ہے۔

کوّے نے عرض کیا۔ دادا جان۔ میں کل رات سویا صبح آنکھ کھلی دیکھا میں سچ مچ ہنس بن گیا ہنس کے پر نکل آئے ہیں۔ اس نے گدھ کو بھی ہنس کے پر دکھائے۔ محترم بزرگ آپ کو میرے ہنس بننے میں کوئی شبہ تو نہیں؟ آپ کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا۔

گدھ کے پاس فضول باتوں کے لیے وقت کہاں؛ اس کی عبادت میں خلل پڑا۔ بولا۔ نورچشم طول العمرہٗ یہ خدا کی مصلحت ہے کسی کو کوّا کسی کو ہنس پیدا کیا جو جیسا ہے ویسا اس کے لیے بہتر ہے دوسرے کا روپ بھرنے سے اصلیت نہیں بدل جاتی۔ پیتل پر ملمع کرنے سے سونا نہیں بن جاتا۔ تمہاری خوش فہمی ہے کہ ہنس کے پر لگا لینے سے تم ہنس بن گئے۔ کون ہے جو تم کو ہنس کہے۔ میری نظر سے ہٹ جاؤ ورنہ ایسی

بد دعا دوں گا کہ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

کوا گدھ کی نا منصفانہ باتیں کیوں برداشت کرے۔ گدھ عبادت تو کیا کرتا ریاکاری کرتا ہے۔ چوپایوں میں گدھا پرندوں میں گدھ ایک جیسے ہیں۔ دونوں عقل سے کورے۔ دونوں کے نام میں مماثلت ہے۔ دونوں منحوس مانے گئے۔ کوئی جانور مرتا ہے تو گدھ نظر آتے ہیں۔ گدھا جہاں رہے وہ آباد جگہ ویران ہو جائے۔

(۳)

کوا گدھ پر لعن طعن کر کے اڑ گیا۔ چیل اور گدھ کی بہ نسبت فاختہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق ہے۔ نورانی شکل ہے۔ پاکیزہ طینت ہے۔ دانہ کھاتی ٹھنڈا پانی پیتی ہے۔ نہ بو تی سونگھے نہ مردار کے پاس جائے۔ خدا کی حمد و ثنا کرتی اور مگن رہتی ہے۔ ایسے پرند کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا۔

کوا فاختہ کے پاس گیا اور سلام پیش کیا۔ کوے اور فاختہ میں ان بن چلی آتی ہے۔ کوے کا جانا ناگوار گذرا اخلاقاً سلام کا جواب دیا۔ پوچھا۔ آج ادھر کیونکر آنا ہوا، کوئی مطلب ہے تو بے تکلف کہو میں بسر و چشم تیار ہوں۔

کوے نے کہا ممانی جان۔ میں کل رات سویا صبح آنکھ کھلی تو دیکھا ہنس کے خوبصورت پر نکل آئے ہیں۔ اس نے فاختہ کو بھی پر دکھائے۔ پوچھا۔ کیا میں آپ کو ہنس نظر آ رہا ہوں؟

فاختہ کوے کی فریبی باتیں سن کر برہم ہو گئی۔ یہ فریب کسی اور کو دینا میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں۔ ہنس کا روپ بھرنے سے کوا ہنس نہیں بن جاتا۔

کوا فاختہ کی باتیں کیوں برداشت کرے۔ وہ بھی برہم ہو گیا۔ تم کو بھی دن لگے ہیں مجھے ہنس مان لیتیں تو کیا نقصان تھا۔ وہ دن بھول گئیں جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے اور فاختہ کے انڈے کوے کھاتے تھے۔

کوا فاختہ کو کھری کھری سنا کر اڑ گیا۔ پرندوں میں حسد بہت ہے کسی کی خوبی ایک آنکھ نہیں بھاتی، البتہ ان میں اگر سمجھدار ہے تو چمگادڑ ہے، یہ پرند بھی ہے اور چوپایہ بھی۔ اڑتا ہے لیکن انڈے نہیں دیتا۔ بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں۔ خدا پرست بھی ہے .... دن کی گھا گھمی میں مشغول عبادت رہتا ہے۔ بلا شبہ اس کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا۔

(۴)

کوا چمگادڑ کے پاس گیا۔ چمگادڑ درخت پر الٹا لٹکا آسن کی مشق کر رہا تھا۔ کوے کو دیکھا ہنس کے پر لگائے ہے۔ اس کا بے ساختہ قہقہہ چھوٹ گیا۔ کوے میاں۔ ہنس کے پر لگا کر ہنس بننا چاہتے ہو۔ مجھ سے عبرت حاصل کرو۔ میرا شمار نہ چوپایوں میں ہے نہ پرندوں میں دونوں کی آنکھ کا خار ہوں۔ دن دن بھر ڈر کے مارے منہ چھپائے رہتا۔ رات میں پیٹ بھرنے کی خاطر نکلتا ہوں تمہارا ابھی میرا جیسا حشر ہوگا۔ اگر ہنس بنو گے تو زندگی ضیق میں پڑ جائے گی۔

کوا چمگادڑ کے پاس ہنس بننے کی خوشخبری سننے گیا تھا عبرت اور نصیحت حاصل کرنے نہیں۔ اس نے جواب دیا ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

انصاف پسند ہوتے تو دن میں آنکھوں کی روشنی کھو نہ جاتی۔ تمہاری ناانصافی کی یہی سزا ہے کہ دن بھر الٹے لٹکے رہو۔

(۵)

کوا چمگادڑ کو الٹی سیدھی سنا کر درخت پر جا بیٹھا۔ کوئی ہنس ماننے پر تیار نہ تھا۔ پرندوں سے فیصلہ ممکن نہیں۔ اب انسان ہی سے توقع ہے وہ حق بات کہتے ہیں۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ کا بندہ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اللہ کے بندوں کو آنچ نہیں دیا ہے۔

حق گوئی وبیباکی سرشت ہے، چیل اور چمگادڑ کی طرح کور چشم نہیں کہ میں ہنس نظر نہ آؤں!

غرض کوّا آخری امید لے کر انسان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام عرض کیا پھر اس کی شان میں قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا ؎

بالائے سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

میرے شفیق ومحترم! اجازت ہو تو خدمت اقدس میں ایک عرضداشت پیش کروں؟

انسان کو حیرت کہ کوّے کو میرے پاس آنے کی کیونکر ضرورت پیش آئی۔ کوّے میاں وہ کون سی ضرورت ہے جس کی وجہ سے تم میرے پاس آئے؟ تم کو مجھ سے کیا غرض؟

کوّے نے پرامید لہجہ میں کہا۔ میرے غریب نواز! مدت کے بعد قسمت نے یاوری کی کہ منھ مانگی مراد بر آئی۔

انسان نے پوچھا وہ کیا؟

کوّے نے عرض کیا۔ میں کل شب میں سویا، صبح بیدار ہوا تو دیکھا ہنس کے پر نکل آئے۔ انسان کو بھی اس نے ہنس کے خوشنما پر دکھائے۔ پھر پوچھا آپ کو میرے ہنس بن جانے میں شبہ تو نہیں ہے۔

کوّے کی باتیں سن کر انسان چیں بہ جبیں ہو گیا۔ کسی کا روپ بھرنے سے اصلیت نہیں بدل جاتی۔ ہنس کے پر لگا لینے سے ہنس نہیں بن گئے؟ بہروپیا پن اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھاؤ۔ میری نظر کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ وہ مار دوں گا کہ عمر بھر یاد رہے۔

کوّا انسان کے حقارت آمیز جواب سے طیش میں آگیا۔ انسان نا منصف نہ ہوتا تو جنت سے نکالا کیوں جاتا — شیطان کا بہکایا ہوا انسان در در ٹھوکریں کیوں کھاتا؟ اس کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر کیوں نظر نہیں آتا۔ انسان سے بڑھ کر بہروپیا کون ہے۔ تھیٹر اور سنیما میں آکر جہانگیر شاہ جہاں کا روپ کون

(باقی صفحہ پر)

شعور بریلوی
معرفت کرانہ مرچنٹ عابد
گولہ گنج لکھنؤ

غزل

چارہ سازو مرضِ غم کی دوا کچھ بھی نہیں
دردِ فرقت میں تڑپنے کے سوا کچھ بھی نہیں

چاند تارے مرے حالات پہ گھبرا سے گئے
کاسۂ شب میں مرے غم کے سوا کچھ بھی نہیں

میں نے سوچا تھا سنور جائے گی تقدیرِ حیات
ان کے غم نے بھی سنوارا پہ بنا کچھ بھی نہیں

آپ مجبور ہیں ناحق مری بربادی پر
مجھ کو اس دل کی تباہی کا گلہ کچھ بھی نہیں

ان سے اظہارِ محبت کو خطا کہہ لیجے
ورنہ اس دل کی تباہی کی بنا کچھ بھی نہیں

دور سناٹے سے آواز سنی تھی جو شعور
ان کی آواز کا دھوکہ ہوا تھا کچھ بھی نہیں

ڈاکٹر ضمیر الحق ضمیر میرٹھی
۲۳۹-لساڑی گیٹ-بھومیہ کا پل-میرٹھ

عِید کا چاند

دیکھ وہ نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
وہ سرِ بامِ فلک کون نمودار ہوا
کس نے یہ شام ڈھلے جھوم کے انگڑائی لی
کون بادل کے دریچوں سے ضیا بار ہوا

میری محبوب! چناروں سے ذرا دور وہ دیکھ
ایک پُر نور پرندے کا گماں ہو جیسے
عید کا چاند ہے اس درجہ نحیف و نازک
ایک معصوم شکاری کی کماں ہو جیسے

ان گنت نظروں نے پھر آج تجھے دیکھا ہے
کتنے رنگین خیالوں نے سلامی دی ہے
تو نے جب روئے مسرت سے اٹھایا ہے نقاب
برملا زہرہ جمالوں نے سلامی دی ہے

کتنی یادوں کی جوانی پہ نکھار آئے گا
کتنے ارمان ترے دم سے نکل جائیں گے
سیکڑوں دل تری آمد کا سہارا لے کر
بادۂ عشقِ طرب زا سے بہل جائیں گے

مشتاق لکھنوی
این-بی-آر-آئی سکندر باغ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

جشنِ آزادی

اٹھو بیدار ہو اے طالبِ اسرارِ آزادی
لٹانا چاہتے ہیں ہم زرِ افکارِ آزادی

صدا دیتا ہے چابکدستی افکار کا عالم
رہے گا حشر تک ہمیز اب رہوارِ آزادی

کچھ اس انداز سے توڑا ہے زنجیرِ غلامی کو
ہمارے دل کی دھڑکن بن گئی رفتارِ آزادی

ہمیں نے گل کیے یارو چراغِ نظمِ پابندی
دمکتا ہے ہمارے دم سے ہر رخسارِ آزادی

ہماری کاوشوں نے وہ نمو کو قوتیں بخشیں
جہاں تک دیکھیے نظروں میں ہے گلزارِ آزادی

ہمارے ہاتھ میں مشتاق تیغیں تھیں نہ خنجر تھے
اہنسا کی بدولت جیت لی پیکارِ آزادی

صباح الدین عمر
نعمت اللہ روڈ - امین آباد لکھنؤ

اتر پردیش کے بڑھتے قدم

لڑکپن میں میں نے ایک کہانی پڑھی تھی۔ آپ نے بھی شاید پڑھی یا سنی ہو۔ کہانی کچھ اس طرح کی ہے کہ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ ایک دن وہ شکار کھیلنے گیا تو شکار کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ جنگلوں میں ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اسے انار کا ایک باغ دکھائی دیا وہاں پہنچ کر ایک لڑکی نظر آئی۔ بادشاہ تھکن اور پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ لڑکی سے پانی مانگا لڑکی اپنی جھونپڑی میں گئی اور بہت جلد گلاس میں انار کا شربت لے آئی۔ بادشاہ نے پیا۔ بڑا لذیذ تھا مگر پیتے ہی یہ بھی سوچنے لگا کہ اتنے اچھے انار والے باغ پر اور ٹیکس لگنا چاہیئے۔ بہرحال شربت پی کر اس نے اور مانگا۔ لڑکی پھر جھونپڑی میں گئی۔ مگر نہ آنے نکلتی ہے نہ کل۔ کافی دیر بعد آئی بھی تو صرف آدھا گلاس لے کر۔ بادشاہ نے اس مرتبہ شربت پیا تو وہ مزہ بھی نہ تھا۔ اب اس نے لڑکی سے پوچھا کہ تم پہلی مرتبہ تو بہت جلد بھرا ہوا گلاس لے کر آئی تھیں اور اب اتنی دیر کے بعد آدھا گلاس وہ بھی بے مزہ لے کر کیوں آئیں۔ لڑکی نے بہت رنجیدہ لہجے میں کہا کہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے بادشاہ کی نیت میں کچھ کھوٹ پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک اس کی نیت اچھی تھی دو اناروں میں گلاس بھر جاتا تھا اس بار یہ ہوا کہ کئی انار استعمال کیے۔ لیکن جیسے ان میں رس ہی نہ رہ گیا ہو، مزہ الگ خراب۔

بادشاہ یہ سن کر دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا اور طے کر لیا کہ وہ نہ تو باغ پہ ٹیکس بڑھائے گا نہ اپنی نیت، رعایا کے معاملات میں، خراب کرے گا۔

ریاست اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ سنگھ شاید اس کہانی کو پڑھ چکے ہیں اور اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے اسی کے مطابق انھوں نے اپنی زندگی ڈھال لی ہے۔ اور جب سے اتر پردیش کے دس کروڑ نواسیوں کی سیوا کرنے کا انھیں موقع دیا گیا ہے وہ خلوص، لگن، محنت اور ایمان داری کے ساتھ اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر طرح کی سہولتیں ملیں، جن دشواریوں کا انھیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ دشواریاں جلد سے جلد دور ہو جائیں۔ کھانے کو روٹی، رہنے کو مکان اور پہننے کو کپڑا ہی نہ ملتا رہے۔ بلکہ ان کے رہن، سہن کا معیار اور بلند ہو جائے۔ پردیش میں امن چین رہے، نہ چوروں کا کھٹکا ہو، نہ ڈاکوؤں کا اور ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب مل جل کر ہنسی خوشی اپنا جیون بتائیں اور اپنے دیش اور پردیش کو مضبوط بنانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ ان کی اسی خوش نیتی کا نتیجہ ہے کہ پردیش میں زندگی کے ہر شعبے میں ایک چہل پہل نظر آ رہی ہے اور ترقی کی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ غذا ہو یا صنعت، کھیتی باڑی ہو یا سینچائی، دوا علاج کی سہولتیں ہوں یا پچھڑی جاتیوں، کمزور طبقوں، ہریجنوں اور اقلیتی فرقوں کو ملنے والی آسانیاں پہاڑی علاقوں کی ترقی ہو یا پوربی ضلعوں کی، سرکاری ملازموں کے معاملے ہوں یا مزدوروں کے، ہر میدان میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی ہدایتوں

پر عمل ہو رہا ہے۔ پرانی اسکیمیں بروئے کار آرہی ہیں اور نئی اسکیمیں چلائی جارہی ہیں۔ حکومت کے مختلف محکموں میں جو کام ہو رہا ہے جو پرانی اسکیمیں چل نکلی ہیں اور جو نئی اسکیمیں چلائی جارہی ہیں، ہر شعبے میں جو کامیابی ہو چکی ہے اور ایک سوشلسٹ سماج کی تشکیل کے لیے جو قدم بڑھائے جارہے ہیں ان کی اگر تفصیل بیان کی جائے تو ایک دفتر درکار ہوگا، اس لیے وزیر اعلا وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور ان کی حکومت کی کچھ سرگرمیوں کا ذیل کی سطروں میں بہت مختصر طور سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بجٹ

آئیے، سب سے پہلے ریاستی حکومت کے سال رواں کے بجٹ پر نظر ڈالیے۔ اس بجٹ کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ گزشتہ چودہ برسوں میں پہلی مرتبہ مارچ ۸۱ ختم ہونے سے پہلے ہی پورا بجٹ ہر دو مجالس قانون ساز نے منظور کر لیا اور اس سلسلے کے سارے احکام بھی اپریل ۱۹۸۱ء میں جاری ہو گئے۔ بجٹ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چھٹا پنج سالہ منصوبہ (۸۰ — ۸۵) تیار کر لیا گیا ہے اور اس منصوبہ کے لیے ۶۲۰۰ (چھ ہزار دوسو) کروڑ روپے کا سرمایہ رکھا گیا ہے۔ پچھلی حکومت نے پنج سالہ منصوبہ صرف ۴۸۰۰ (چار ہزار آٹھ سو) کروڑ روپے کا رکھا تھا۔ موجودہ حکومت کے اس منصوبے میں کمزور طبقوں کی جن میں مندرجۂ فہرست ذاتیں اور قبائل شامل ہیں، فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اترپردیش کا پہاڑی علاقہ بھی پچھڑا علاقہ ہی ہے مگر ابھی تک اترپردیش کے منصوبوں میں اس علاقے کے لیے جو رقم مخصوص کی جاتی تھی، وہ ہماچل پردیش ایسی چھوٹی ریاست کے پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں بھی کم ہوتی تھی۔ موجودہ وزیر اعلا کو چونکہ اترپردیش کے ہر علاقے اور ہر فرقے کی ترقی کا خیال ہے۔ اس لیے پہلی مرتبہ پہاڑی علاقوں کے لیے بجٹ منصوبے میں ۵۷۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ جو ہماچل پردیش کی مقررہ رقم سے زیادہ ہے۔ حکومت ہند نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ یو پی کے پہاڑی علاقوں کے لیے اس مرتبہ زیادہ امداد دے گی اور اس امداد سے ۹۰ فی صدی بطور عطیے دیئے جائیں گے اور صرف دس فی صد رقم قرض کی حیثیت سے ملے گی۔

زراعت اور گنّا

سال رواں میں اناج کی پیداوار کا ایک ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ قیاس ہے کہ ۸۰-۱۹۷۹ء کے ۳۴ لاکھ ٹن کے مقابلے میں خریف کی پیداوار ۸۰ لاکھ ٹن ہوگی۔ غالباً یہ وزیر اعلا کی خوش نیتی کا بھی نتیجہ ہے۔ جہاں تک ربیع کی فصل کا سوال ہے — امید ہے کہ پچھلی فصل کے ۱۱۹ لاکھ ٹن کے مقابلے میں اس مرتبہ ۱۵۰ لاکھ ٹن پیداوار ہوگی۔ گیہوں کی پیداوار تو ۱۲۵ لاکھ ٹن ہونے کی امید ہے۔ یہ پیداوار ۷۹-۱۹۷۸ کی ریکارڈ پیداوار ۱۱۴ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہے۔

گنّے کی کاشت کرنے والوں کو مدد دینے کی غرض سے حکومت نے اس سال خریداری کا جو کم سے کم نرخ متعین کیا ہے وہ دوسرے برسوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ مشرقی اضلاع کے لیے قیمت خرید ۲۲ روپے فی کوئنٹل مقرر کی گئی ہے اور مغربی اضلاع کے لیے ۲۳ روپے فی کوئنٹل۔ اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ جو خریداری کی جائے اس کی قیمت بھی بہت جلد ادا کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء تک ۲۷۸ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کا گنّا خریدا گیا تھا۔ اس میں سے ۲۶۹ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے کی ادائی ہو چکی ہے۔ شکر کی قلت بھی دور کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کوششوں میں کامیابی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۹۱.۹۷ لاکھ ٹن شکر تیار ہوئی مگر ۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء تک ۱۲۰.۰۶ لاکھ ٹن تیار ہو گئی۔ ستارگنج، سیمی، گوشتی، نانپارہ، مورنیا مظفرپور میں شکر کے پانچ نئے کارخانے کھولنے کی بھی منظوری حاصل کرلی گئی ہے۔

بجلی

بجلی کی کمی اور بار بار بجلی فیل ہو جانے کی عام شکایت ہے

اور یہ ہے بھی صحیح۔ لیکن شاید یہ کم لوگ جانتے ہوں کہ اس کمی کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہو رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں ۲۰۰ میگا واٹ کا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن ۸۱-۱۹۸۰ء میں یہ اضافہ بڑھ کر ۴۴۳ میگا واٹ ہوگیا ہے۔ مزید اضافے کے لیے اونچاہار پروجیکٹ پر کام شروع ہوگیا ہے۔ برتابی کے تین مزید پروجیکٹوں پر عمل درآمد کی بھی منظوری حاصل ہوگئی ہے۔ دیہات اور ہریجن بستیوں میں اور نل کنوؤں کے لیے بجلی فراہم کرنے کے ریکارڈ بھی ۸۱-۱۹۸۰ء میں قائم ہوئے ہیں۔ اس سے قبل سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۲۶۱۴۵ پرائیویٹ نل کنوؤں کو بجلی پہنچائی گئی تھی۔ لیکن سنہ ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۸۷۹۳ نل کنوؤں کو بجلی مہیا کی گئی۔

سال سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۲۲۷۹ مواضعات میں بجلی پہنچائی گئی مگر ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۳۲۶۰ گاؤں بجلی سے جگمگا اٹھے۔ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں صرف ۱۵۶۱ ہریجن بستیاں بجلی سے منور ہوسکیں مگر ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۳۲۰ ہریجن بستیاں روشن ہوگئیں۔ جون سنہ ۱۹۸۰ء میں جب وشوناتھ پرتاپ سنگھ جی نے اتر پردیش کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، تھرمل بجلی گھروں کا لوڈ ۳۸ فی صد تھا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں یعنی ایک سال سے کم مدت کے اندر یہ لوڈ بڑھ کر ۵۴،۶ فی صد ہوگیا۔ گزشتہ سال (سنہ ۱۹۸۰ء) میں جب بارش بے انتہا کم ہوئی تھی تب بھی دیہاتوں میں خاص طور سے بجلی پہنچانے کے انتظامات کیے گئے تھے۔

بنکروں کی ہمت افزائی

بنکروں کی ہمت افزائی کے لیے فیض آباد، بارہ بنکی، مرادآباد اور رام پور میں نئے پروجیکٹ چلائے گئے ہیں جن سے دس ہزار بنکروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ہینڈلوم کارپوریشن کی مختلف اسکیموں کے تحت سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۲۹ ہزار بنکر فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۴۲ ہزار بنکر ان اسکیموں سے فیض یاب ہوئے۔

جنتا کپڑا اسکیم کے تحت ۸۱-۱۹۸۰ء میں دس کروڑ مربع میٹر کنٹرول کا کپڑا تیار ہوا جب کہ سنہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ مربع میٹر تیار ہوا تھا۔ ٹسر کا ریشم تیار کرنے کے لیے فیض آباد میں ایک کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کارخانے میں ۳۰ ہزار میٹر ٹسر روزانہ تیار ہوگا۔ مغربی علاقے میں بھی ایسا ہی ایک کارخانہ اس سال قائم ہو جائے گا۔ ریشم کا دھاگہ تیار کرنے کے لیے بھی کئی پروجیکٹ چلائے جارہے ہیں۔

غذا اور رسد

پہلی مرتبہ ۶ لاکھ ٹن دھان براہ راست کسانوں سے خریدا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چاول کی مل والوں سے دو لاکھ ٹن چاول خریدا گیا۔ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے ذریعہ بھی سستے داموں والی دکانیں دیہی علاقوں میں کھولی جارہی ہیں۔ ایسی ۱۰۴۰۶ دکانیں کھل چکی ہیں۔ کرایہ مکان کے قانون میں ایسی تبدیلی کر دی گئی ہے کہ نئے مکان بنانے والوں کی ہمت افزائی ہو۔ چوربازاری اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف برابر چھاپے مارے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں ۶۶۰۰ افراد گرفتار کیے جاچکے ہیں۔

امن عامہ

ملک میں امن قائم رکھنا حکومت وقت کی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر ملک یا اس کی کسی ریاست کے باشندوں کی جان و مال کو ہر وقت کوئی نہ کوئی اندیشہ رہے تو ملک کی زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن امن صرف حکومت کے سہارے قائم نہیں رہ سکتا۔ عوام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایک طرف خود پُرامن ڈھنگ سے رہیں، قانون کا احترام کریں اور دوسری طرف سماج دشمن اور شرپسند افراد کے بہکانے میں نہ آئیں بلکہ ایسے لوگوں کو قانون کے حوالے کرنے میں تکلف نہ کریں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے لوگ ہمیشہ سے رواداری، قومی یکجہتی، بھائی چارے کو پسند کرتے آئے ہیں۔ نہ ان کا مذہب دوسروں سے جھگڑا

کرنا سکھاتا ہے نہ ملک کے قدیم روایات۔ اس ملک نے ہر مذہب اور اس کے بزرگوں کا احترام کیا۔ یہاں آستک کا بھی سمان کیا گیا اور ناستک کا بھی! اس لیے اب اگر کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو اس کے پیچھے صرف کچھ سماج دشمن عناصر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عوام اب بھی لڑنا نہیں چاہتے۔ مگر یہ مٹھی بھر شر پسند اور وطن دشمن لوگ آگ لگا کر خود الگ ہو جاتے ہیں اور سارا علاقہ فساد کی زد میں آجاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر لینا اور یہ سمجھ لینا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں آسان نہیں ہوتا۔ حکومت کے لیے بھی پہلے سے اس کا پتہ لگا لینا آسان نہیں ہے۔ اس لیے اگر کہیں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے تو حکومت کو اس کا ذمے دار قرار دے دینا مناسب نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فرقہ وارانہ فساد ہو یا دوسری سماج دشمن سرگرمیاں، حکومت یا اس کے افسروں نے ان کی فوری روک تھام کے لیے کیا کارروائی کی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت کے متعلق یہ یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے فرقہ وارانہ فسادات پر بڑی حد تک قابو پا رکھا ہے۔

پچھلے سال مراد آباد کا فساد یقیناً بہت بڑا المیہ تھا جس پر ہماری اور ہمارے ملک کی نگاہیں جھک گئی تھیں لیکن اس فساد کے بعد اتر پردیش میں اس قسم کا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وزیر اعلا شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ نے، جو نہایت ہی صاف ذہن کے آدمی ہیں اور جن کی شرافت، بے تعصبی، فراخ دلی، انسان دوستی اور انصاف پسندی کے ان کے سیاسی مخالفین اور دوست دشمن سبھی قائل ہیں، حکام اور عوام سبھی پر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

ادھر حال میں ڈکیتیوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل و غارت کے چند بھیانک واقعات ضرور ہوئے لیکن ان کے سدباب اور روک تھام کے ہر ممکن اقدام اور کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ شری وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ خود صورت حال کا برابر جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور پولیس کے افسران سے اس سلسلے میں بات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی دل چسپی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جرائم میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ وزیر اعلا اتر پردیش اور ان کی حکومت کے کچھ خاص خاص کاموں اور سرگرمیوں کا۔ ابھی ان کی حکومت کو ایک سال سے کچھ ہی زیادہ کا عرصہ ہوا ہے اور یہ مدت نظم و نسق کے سدھار کے لیے کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی۔ مگر اس قلیل عرصے ہی میں شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ کی خوش نیتی نے سارے پردیش میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں ایک حیاتِ نو کے آثار نمایاں ہیں۔ شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ بچن دے چکے ہیں کہ انھوں نے پردیش کے باشندوں کی سیوا کرنے کے لیے وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ قبول کیا ہے۔ بہت پہلے تلسی داس جی نے رامائن میں لکھا تھا کہ:

رگھو کل ریت سدا چلی آئی
پران جائے پر بچن نہ جائی

(رگھو کے خاندان میں یہ رسم سدا سے چلی آئی ہے کہ چاہے جان چلی جائے مگر جو وعدہ کر لیا گیا ہے اُسے پورا کیا جائے۔)

وشو ناتھ پرتاپ سنگھ کا تعلق بھی رگھو کے ونش سے ہے۔ انھوں نے جو بچن دیا ہے وہ اسے پورا کریں گے!

سیلاک سیتی

زندگی ہے تو کوئی بات نہیں
ہاں مگر موت سے نجات نہیں

لمحہ لمحہ سمٹ رہی ہے حیات
اس سفر میں کسی کا ساتھ نہیں

آپ اتنے پراغ پا کیوں ہیں
اس میں شامل تو میری ذات نہیں

وقت یکساں نہیں رہے ہیں کبھی
دن خوشی کے غموں کی رات نہیں

مٹ گئے جد و جہد میں جو کہیں
فتح سمجھیں گے اُس کو مات نہیں

جتنی لمبی ہے رات سیلانی
اتنی لمبی مری حیات نہیں

سید رشید حسین اثر
۱۶۶ ایس۔ ایم۔ ایسٹ اپر
ایس ایس ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

تضمین
بر غزل مولانا محمد علی جوہر

ہر دم درِ زنداں جو کھلا میرے لیے ہے
واللہ یہ انعام خدا میرے لیے ہے
عشق شہدا کا یہ صلا میرے لیے ہے
"تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے"

ملتا نہیں اوجِ رسن و دار سبھی کو
عزت یہ ملا کرتی ہے لاکھوں میں کسی کو
اس لطف کے قرباں کہ نوازا ہے مجھی کو
"پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے"

اے کاش وہ شاہ دوسرا حشر میں کہہ دے
تھا خاک رہِ آلِ عبا حشر میں کہہ دے
یہ مومن مسلم ہے مرا حشر میں کہہ دے
"توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے"

دیتا ہے ندا ہر سحر و شام یہ ہاتف
مرنا رہِ حق میں ابدیت کے مرادف
کیوں عشرتِ دنیا کے لیے ہوں متأسف
"کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے"

صدیوں سے ہو تم لوگ اہنسا کے پجاری — اس بات سے شہرت ہے زمانے میں تمہاری
تم نے ہی کبھی کاکلِ الفت تھی سنواری — جب وقت پڑا دیش پہ تو جان بھی ہاری

اب سلسلۂ دار و رسن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

دعویٰ ہے تمہارا یہ زمیں خلدِ بریں ہے — اس جیسا وطن سارے زمانے میں نہیں ہے
ہے ناز تمہیں وادیٔ کشمیر یہیں ہے — تم فخر سے کہتے ہو یہ گاندھی کی زمیں ہے

لیکن اُسی گاندھی کا مشن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

نہرو نے رکھا تھا تمہیں اس طرح ملا کر — جیسے کوئی مالی رکھے پھولوں کو سجا کر
اس دور میں لیکن سبھی اقدار بھلا کر — تخریب پسندوں کے حسیں دام میں آکر

تعمیرِ چمن اہلِ چمن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

کیوں یاد نہیں تم کو روش اپنی پرانی؟ — کیوں ہو گئے تم لوگ فسادات کے بانی؟
کیوں خون کو انساں کے سمجھنے لگے پانی؟ — اب کون سنائے گا محبت کی کہانی؟

جب تم ہی محبت کا چلن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

ہندو کا نہ سکھ کا نہ مسلمان کا خوں تھا — جو تم نے بہایا وہ اک انسان کا خوں تھا
پنڈت کے دھرم شیخ کے ایمان کا خوں تھا — سچ پوچھیے تو ہند کی سنتان کا خوں تھا

اس بات کو تم اہلِ وطن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

تفریق کے دھارے میں کبھی ہم نہ بہیں گے — دشمن کا ہر اک وار سبھی مل کے سہیں گے
ہر دور میں ہر حال میں یہ بات کہیں گے — ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

اس دور میں لیکن یہ بچن بھول گئے ہو
اقدارِ وفا رسمِ کہن بھول گئے ہو

کھاؤ یہ قسم پیار کی تصویر بنو گے — یہ عہد کرو ہند کی تقدیر بنو گے
نہرو کی طرح پیکرِ تعمیر بنو گے — باپو کے حسیں خواب کی تعبیر بنو گے

ایسا ہے تو پھر تم پہ وطن ناز کرے گا
پھولوں سے مہکتا یہ چمن ناز کرے گا

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب :- جبران خلیل جبران ۔ فن اور شخصیت (تحقیقی مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی) ۔ مصنف ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی، لیکچرر شعبہ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ قیمت :- پندرہ روپے

بیسویں صدی کے سحر نگار ادیب، شیریں نوا شاعر جبران خلیل جبران پر تحقیق کرنے کی جرات وہی کر سکتا ہے جس کا مطالعہ، مشاہدہ وسیع ہو اور ذوق ادب و شعور پختہ ہو، جو تجسس و تلاش کی پرخار وادی کو مستانہ وار طے کرے ۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے جبران خلیل جبران فن اور شخصیت جیسے اہم موضوع کا انتخاب اسی لیے کیا کہ جدید عربی ادب ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، اور جبران کی دل موہ لینے والی تحریروں سے وہ بے حد متاثر ہوئے ہیں انھیں کے الفاظ میں

"چونکہ جدید عربی ادب ہمیشہ سے ہی میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے اس لیے مختلف موضوعات کے درمیان سے میں نے اپنے مقالہ کے لیے بیسویں صدی کے نئے دماغ، سحر قلم اور آتش بیاں مفکر اور جدید عربی ادب کے ماہر فن کار "جبران خلیل جبران" کا ہی انتخاب کیا کہ اس صاحب طرز کا طرز مجھے بے حد پسند ہے۔"

پسندیدگی کی خاص وجہ جدید عربی ادب سے لگاؤ، جبران کے اسلوب نگارش سے مماثلت ہے، جبران کی سحر نگاری نے اشفاق کو شگفتہ نگار بنا دیا، ان کے قلم میں بڑی روانی، دلاویزی اور شگفتگی ہے ۔

مقالہ، نو ابواب پر مشتمل ہے ۔

پیش لفظ، پروفیسر محمد رضوان علوی صاحب صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی نے تحریر فرمایا ہے ۔ اور مقالہ نگار کو مبارک باد دی ہے کہ انھوں نے "اپنا مقالہ برائے پی ۔ ایچ ۔ ڈی مترجم شکل میں پیش کر کے ہجری عربی ادب کی ایک وسیع خدمت انجام دی ہے ۔ یہ مقالہ زبان و بیان اور مندرجات کے اعتبار سے ایک عظیم علمی کارنامہ ہے۔"

مقالہ کے پہلے اور تیسرے باب میں تاریخی پس منظر اور جبران کے عہد اور ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ دوسرے، پانچویں اور چھٹے باب میں جبران خلیل جبران کی پیدائش اور خاندانی حالات شخصیت اور حب الوطنی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ چوتھے اور ساتویں باب میں طرز نگارش اور شاعری کا تنقیدی و تحقیقی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے ۔ مقالے کے ان دونوں ابواب میں جبران کی شاعری نثر نگاری، اور اس کے فن کے نکات و محاسن اور اثرات کی متوازن انداز میں توضیح و تشریح کی گئی ہے جدید عربی ادب میں جبران کی اولیت و اہمیت اور خصوصیت کو ثابت کیا گیا ہے ۔ وہ رومانی تخیل آمیز رمزیت، فلسفیانہ رمزیت اور افسانوی رمزیت کا خالق ہے، رومانیت، امثالی خطوط نویسی ڈرامہ نگاری، افسانہ نگاری، طویل افسانہ نگاری، ناول نگاری میں جبران کا آرٹ اپنے نقطۂ عروج پر ہے ۔ مقالہ نگار نے جبران کی خامیوں اور معترضین کے اعتراضات سے بھی بحث کی ہے، الفاظ، جملوں اور قواعد کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"ان تمام خامیوں کے باوجود اگر واقعی یہ خامیاں ہیں تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال جبران کے اپنے طریقہ تعبیر کا ایک جداگانہ ڈھنگ ہے جو نہ تو اس کی تحریروں کی اہمیت کو کم کرتا ہے اور نہ ہی اس مرتبے کو جو اسے اپنے ہم عصروں میں حاصل ہو چکا ہے ۔"

اسی طرح جبران کی شاعری کا منصفانہ تنقیدی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ :

"جبران شمالی امریکہ میں جدید عربی شاعری کے جدید طرز کا سرخیل تھا جس کی شاعری میں سچی رومانیت، وطن پرستی، طوفانی خیز زندگی، جذباتیت، شاعرانہ تصوف، انسان دوستی انقلاب و بغاوت، روایات سے آزادی، قومیت پر شخصیت کی برتری،

فطرت کا گہرا شعور ملتا ہے"۔ ... "دنیائے شعر میں اپنی کم مائیگی کے باوجود اس نے جدید شعرا کو ایک نئی راہ دکھائی اور ان میں اپنا ایک بلند مقام حاصل کیا"۔ ص ۲۲۳

آٹھواں باب جبران کی تصانیف پر مشتمل ہے۔ اس باب میں جبران کی ہر تصنیف کے موضوع اور اسلوب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخری باب اختتامیہ میں مقالہ نگار نے جبران کی حیات اور اس کے شعری و نثری کارناموں اس کی ہشت پہل شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی محرومیوں اور ناکامیوں کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر حرف بہ حرف جبران پر بھی صادق آتا ہے۔

صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں، جسے کچھ ہنر آوے

لیکن جس طرح میر کا فرمانا مستند سمجھا گیا اور وہ صاحب عالم پہ چھا گئے، اسی طرح جبران بھی جدید عربی ادب کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ جبران مشرق کا وہ پہلا ادیب ہے۔ جس کی یاد کو غیر فانی بنانے کے لیے حکومت لبنان کی مدد سے، باشندگان بشری نے جبران کے نام سے ایک میوزیم کی تعمیر کرکے اس کی تمام باقیات محفوظ کر دی ہیں۔

"جبران خلیل جبران ۔ فن اور شخصیت" اردو کے تحقیقی ذخائر میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ ادب اور تحقیق کا ہر طالب علم اس سے مستفید اور مستفیض ہوتا رہے گا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد کی تحقیقی بصیرت اور ادبی لطافت نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب: باقیات اسلم ۔ مرتبہ ۔ سلیم عمر،
قیمت: ۲۰ روپے، ملنے کا پتہ: علوی پبلشرز، لکھنؤ۔ ۳

محمد اسمٰعیل اسلم لکھنوی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے جگر کی شفقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی اور جن کی زندگی ایثار و قربانی، جہد و عمل اور ابتلاء و آزمائش سے عبارت ہے۔ اسلم لکھنوی "آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی" کی جیتی جاگتی تصویر تھے، وہ گفتار کے غازی نہیں، کردار کے غازی تھے، ان کی زندگی یقین محکم اور عمل پیہم کا نمونہ بھی۔ انھوں نے وطن عزیز کی خاطر مصائب و آلام کا سامنا بھی کیا، قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور قربانیاں بھی دیں۔ ان کا کلام بھی ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور بے لوث قربانیوں کا آئینہ دار، ان کے جذبات و احساسات کا مظہر اور ان کی حب الوطنی اور انسان دوستی کا ترجمان ہے۔ مرحوم کی قومی نظموں کے مجموعے "ترانے" اور "مشعل" جو کئی برس پیشتر شائع ہوئے ان کے جذبہ شوق، جذبۂ جہاد اور جذبہ حب وطن کے عناصر اور ان کی شاعرانہ عظمت کے شاہد ہیں۔ باقیات اسلم میں مرحوم کا وہ کلام یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا جسے ان کے فرزند جناب سلیم عمر نے بہت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مجموعہ کی غزلوں اور نظموں میں ایک سچے محب وطن اور انقلاب بداماں شاعر کی روح جلوہ گر ہے۔

کلام اسلم میں دردمند اور حساس دل کی دھڑکنیں بھی ہیں بہادر اور حوصلہ مند سپاہی کی گھن گرج بھی، نعرۂ انقلاب بھی ہے اور نعرۂ جہاد بھی سرفروشی کی تمنا بھی ہے، امن و آشتی کا پیغام بھی حریت و آزادی کا جذبہ بھی ہے، فرقہ پرستی اور مفاد پرستی کے خلاف للکار بھی اور ایک حرماں نصیب انسان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی بھی۔

ہر ذرہ وطن کا ہے خورشید منور
اسلم کی دعا اب سحر و شام یہی ہے
اسلم کہو تم آمیں اور ہم دعا یہ مانگیں
آزاد ہو الٰہی ہندوستاں ہمارا

مجموعہ کی کتابت و طباعت دیدہ زیب اور گٹ اپ دل کش ہے۔ توقع ہے کہ "باقیات اسلم" قدر و منزلت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

— سعادت علی صدیقی

نیا دور

جلد ۳۶ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شایع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ ڈسٹرکٹ انفارمیشن نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی فعال قیادت میں اتر پردیش کی موجودہ حکومت نے گذشتہ سال جون میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سے اب تک جو کام کیے ہیں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں جو دور رس اقدامات کیے ہیں، ان کے مثبت نتائج نمایاں طور سے سامنے آنے لگے ہیں۔ ریاستی حکومت نے اس وسیع و عریض ریاست کے مسائل حل کرنے اور اسے شاہراہ ترقی پر تیز رفتاری کے ساتھ گامزن کرنے کے سلسلے میں جو پالیسیاں اور جو طریقہ کار اختیار کیا، وہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ یہ حکومت محض پالیسیاں وضع کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ عمل اور ٹھوس نتائج پر یقین رکھتی ہے۔

موجودہ حکومت نے گذشتہ سال جون میں جب اقتدار سنبھالا تو اتر پردیش کی بہت سی ملیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں، بند پڑی تھیں اور مل مالکان انھیں کھولنے پر تیار نہ تھے۔ اس صورت حال میں ایک ایسی حکومت جس نے غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا ساتھ دینے کا عزم کر رکھا ہو، خاموش کیسے رہ سکتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے یہ واضح فیصلہ کیا کہ وہ مزدوروں کی حمایت کرے گی۔ حکومت کے اس فیصلے کے نتیجے میں وہ ملیں بالآخر کھل گئیں۔ اسی طرح جب ملوں اور کارخانوں کے انتظامیہ میں مزدوروں کی حصے داری کا سوال آیا تو حکومت نے اس سلسلے میں بھی ایک واضح فیصلہ کیا۔ وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ابھی حال ہی میں محنت کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ "یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو محنت سے جتنا دور ہے، اتنا ہی باعزت ہے۔ جو خود پانی کھینچ کر پانی پیتا ہے، وہ اس سے کم عزت دار ہے جو صراحی تک جا کر گلاس سے پانی لے کر پیتا ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ عزت دار ہے جو کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے کہتا ہے کہ گلاس میں پانی تو لانا۔ اس طرح کا جو نظام ہے وہ دراصل محنت کا قاتل ہے اور پیداواری وسائل کو مسدود کرتا ہے۔ محنت رحم کی رہین منت نہیں ہے بلکہ عظمت و وقار کی مستحق ہے۔ چنانچہ ہم سب کو یہی نظریہ اختیار کرنا ہوگا اور محنت کا وقار برقرار رکھنا ہوگا۔ تبھی پیداوار میں اضافہ ہوگا، خوشحالی آئے گی اور غریبی دور ہوگی۔"

مزدوروں کے مسائل پر توجہ کے ساتھ ساتھ حکومت نے ریاست کو ایک صنعتی ریاست بنانے کے لیے بھی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ صنعتوں اور صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کے مسائل حل کرنے کی غرض سے ایک "صنعت دوست سیل" قائم کیا گیا ہے۔ اس سیل میں صنعتوں سے متعلق مسائل آمنے سامنے بیٹھ کر حل کیے جاتے ہیں۔ اس میں متعلقہ وزرا اور افسران کی موجودگی میں صنعت کار اپنے مسائل لے کر آتے ہیں اور سارے معاملات وہیں خوشگوار ماحول میں طے ہو جاتے ہیں۔ اس سے ریاست میں صنعتوں کے لیے ایک نیا ماحول پیدا ہوا ہے۔ صنعت کاری اور صنعتوں کی ترقی پر زور دینے کی غرض سے اس سال کو "صنعتوں کے سال" کی حیثیت سے منایا جا رہا ہے۔ وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کہا ہے کہ "ہماری صنعت کاروں کو کھلی دعوت ہے کہ وہ یہاں آئیں، صنعتیں قائم کریں اور پیداوار بڑھائیں۔"

لیکن وزیر اعلا نے یہ بھی کہا ہے کہ "کامیابیوں کا اندازہ اعداد و شمار سے نہیں بلکہ عوام کے اعتماد کی گہرائیوں سے لگایا جانا چاہیے۔ کیونکہ جمہوریت میں اقتدار کی اصل بنیاد ہے عوام کا اعتماد، جس کا حصول دراصل حکومت کی سب سے بڑی کامیابی ہے" اور یہ بات یقینی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ حکومت کو عوام کا بھرپور اعتماد حاصل ہے جسے حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اتر پردیش کی موجودہ حکومت اور اس کی پالیسیاں ناقابل فروخت ہیں۔ وہ سرمایہ داروں کی دولت کی اسیر نہیں ہیں۔ بقول وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ "وہ اگر کہیں کی اسیر ہیں تو وہ ہے غریب کا دروازہ۔ ہم اسے چاہے کچھ اور نہ دے سکے ہوں، لیکن اتنا اعتماد اسے ضرور دیا ہے کہ ہم اس کے دروازے پر کھڑے ہیں اور ہمیشہ اس کی حمایت کریں گے۔"

آہ، سید نواب افسر!

لکھنؤ کے مشہور و معروف اور بزرگ شاعر سید نواب افسر کا، اگست ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال سے کچھ زائد تھی۔ افسر صاحب شرافت، وضعداری، خلوص، نرم دلی اور انکساری کا پیکر تھے۔ ان کی دلنواز شخصیت لکھنوی تہذیب اور لکھنوی اخلاق کی عملی تصویر تھی۔ انھوں نے اس دور میں بھی جبکہ ہر شے نفع و نقصان کے ترازو پر تولی جا رہی ہے، انسانی و اخلاقی قدروں کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ یہی خصوصیات ان کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کی شاعری لکھنؤ کی مخصوص زبان اور روزمرہ کی آئینہ دار ہے۔ اسی کے ساتھ زبان و بیان کی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں بلند آواز میں گفتگو کرنا ہمیشہ معیوب رہا ہے۔ افسر صاحب نے لکھنوی تہذیب کی اس خصوصیت کو اپنی شاعری میں بھی برتا۔ اسی لیے ان کے یہاں کہیں بھی بلند آہنگی نہیں ملتی۔ وہ اپنی بات بڑے عجز و انکسار اور متانت کے ساتھ دھیمے لہجے میں کہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں غزل لطافت کے ساتھ بڑا ہی سنجیدہ رخ بھی لیے ہوئے ہے۔ گذشتہ سال ہی افسر مرحوم نے اپنا شعری مجموعہ "غم حیات" شائع کیا تھا جس کو ادبی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ادارہ نیا دور ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

غزل

مجروح سلطانپوری
۶ جنائے کالونی، جوہو
بمبئی ۵۴

داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن
کسقدر ملتی ہے شاخِ درد سے شاخِ چمن

فرشِ گل، مینائے مے، شمعِ سحر، سازِ سخن
سب اٹھے لیکن نہ اٹھا میں خرابِ انجمن

مژدہ اے یارانِ تشنہ دل سے پھوٹا پھر لہو
اے شبِ تارِ عزیزاں پھر جلا داغِ کہن

ساز میں یہ شورشِ غم لائے مُطرب کس طرح
اس کی دھن پابندِ نَے نغمہ ہمارا نَے شکن

دیکھیے کب تک بلائے جاں رہے اک حرفِ شوق
دِل حریصِ گفتگو اور چشمِ خوباں کم سخن

سچ تو ہے مجروح نے اُس گل سے کچھ پیماں لیے
یہ خبر لیکن کہاں سے لے اڑا مُرغِ چمن

تاج محل

[illegible] پوری
اختر منزل کشمیری بازار
آگرہ ۳

خالقِ نقشۂ فردوسِ بریں شاہجہاں
تجھ پہ روشن تھے یہ اسرارِ حقیقت شاید
وقت ہے اصل میں اک سیلِ رواں تیز قدم
جس کی اک لہر میں اک موج میں بہہ جاتے ہیں
عزّت و دولت و اقبال و ظفر جاہ و حشم
زندگی۔ حسن۔ توانائی۔ جوانی۔ دم خم
تو نے ان عارضی چیزوں سے تغافل برتا
کچھ نہ سمجھا انھیں رنگین فریبوں کے سوا
اور یہ چاہا کہ اسی کارگہِ فانی میں
تیرے دردِ غمِ پنہاں کو ملے عمرِ دوام
حشر تک زندہ و پائندہ رہے عشق کا نام

(۲)

شوکتِ خسروی و سطوتِ شاہنشاہی
برق و باراں سے زیادہ قہر انگیز بھی
وقت کے ڈوبتے سورج کی کرن کے ہمراہ
وسعتِ دامنِ افلاک میں کھو جاتی ہے
ایک دن موت کی آغوش میں سو جاتی ہے
تو نے ان چھوٹے مراتب کی طرف رخ نہ کیا
عزّت و دولت و اقبال کو دھوکہ سمجھا
یہی چاہا کہ تری آہِ غمِ دردِ فراق
دل سے نکلے تو سرِ عرش ٹھہر کر دم لے
پھر وہی آہِ رسا تیری مجسم ہو کر
تاج کی شکل میں ہو سینۂ گیتی سے بلند
چاند تاروں کی فضاؤں سے بھی آگے بڑھ کر
سینۂ ظلمتِ آفاق پہ یوں چھا جائے
کہ محبت پہ تری دردِ محبت پہ ترے
آسماں جیسے ستم گر کو ترس آ جائے

(۳)

یہ بھی معلوم تھا تجھ کو کہ یہ ہیرے یہ گہر
کچھ نہیں اصل میں ہیں چند چمکتے پتھر
ایک دن ان کی چمک انکی دمک انکی ضیا
ماند پڑ جائے گی مٹ جائے گی اڑ جائے گی
آج کی چیز ہے کل کام نہیں آئے گی
اس لیے تو نے شہنشاہ یہی خواہش کی
کہ ترے دیدۂ خونبار کا رنگیں آنسو
لوگ کہتے ہیں جسے تاج بالفاظ دگر
ہے محبت کی جو معراج بالفاظ دگر
وقت کے عارضِ رنگیں پہ دمکتا ہی رہے
حشر تک اشک محبت کا چمکتا ہی رہے

(۴)

اے شہنشاہ ۔ اے سلطان کلاکاروں کے
دلِ غمگیں کا ترے عکس حسیں تاج محل
تیرے غم ۔ تیری محبت کا پیامی بن کر
سنگ دل وقت کے دربانوں کو ٹھکراتا ہوا
مسکراتا ہوا ، اٹھلاتا ہوا ، گاتا ہوا
آج اس محفل صد رنگ کی جانب ہے رواں
نیم وا ، نیمِ چمیلی کے شگفتہ غنچے
چاندنی کی مدبھری کرنوں میں نہاتے ہیں جہاں
ایسی محفل ہے جہاں سلم و زیاں کچھ بھی نہیں
بام و در کچھ بھی نہیں راہ و مکاں کچھ بھی نہیں
تیری محبوب شفق رنگ دوشالہ اوڑھے
منتظر ہے ترے پیغام کو سننے کے لیے
اور یہی تاج محل بن کے پیامی تیرا
بڑھتا جاتا ہے بلندی کی طرف گاتا ہوا
تیری الفت، ترے انداز نہیں بھولا ہوں
میں تجھے اے مری ممتاز نہیں بھولا ہوں

(۵)

یہ حقیقت ہے کہ تو آج نہیں دنیا میں
سلطنت رہ گئی اک خواب پریشاں ہو کر
وہ ترے طبل و علم، خنجر و شمشیر و سپاہ
جن کی شہرت کا شجاعت کا زمانہ ہے گواہ
مٹ چکے آج فقط گرد ہے باقی ان کی
وہ بھی اڑتی ہوئی بکھری ہوئی آتی ہے نظر
اکبر آباد کی سنسان گذرگاہوں میں
نہ وہ دربار نہ وہ رقصِ کنیزانِ حرم
نہ وہ جمنا کی روانی کا اچھوتا سرگم
ایسے محلات کہ شہنائیاں بجتی تھیں جہاں
چند ابابیلیں ہیں جھینگر ہیں وہاں مرثیہ خواں
آسماں دیکھ کر یہ شوکت و عظمت کا مآل
سسکیاں بھرتا ہے، روتا ہے فغاں کرتا ہے
پھر بھی یہ تاج محل تیرا پیامی بن کر
گنگناتا ہے یہی آج بھی گاتا ہے یہی
میں تجھے اے ہمہ تن ناز نہیں بھولا ہوں
میں تجھے آج بھی ممتاز نہیں بھولا ہوں

★

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

غزلیاتِ نظیر اکبر آبادی

ایک تنقیدی جائزہ

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظیر اکبر آبادی کی مجموعی قدر و قیمت کے تعین میں ہمارے تذکرہ نویس اور تنقید نگار جس قدر افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں اس کی مثال ہماری ادبی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ ان لوگوں کو جانے دیجیے جن کے معیار نقد و نظر پر نظیر کا کلام پورا نہیں اترا اور وہ یہ تاثر دے کر گزر گئے کہ وہ ایک ملائے مکتبی، صحت الفاظ سے معرا، عوام الناس بلکہ جہلاء کی زبان لکھنے والا تھا اور اس کے بیشتر اشعار سوقیوں کی زبان پر جاری رہتے تھے، یہاں پر ذکر میں نظیر کے ان طرفداروں کا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کے مناقب و فضائل کے سلسلہ میں زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دیئے ہیں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظیر کے شاعرانہ کمالات کا احاطہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے پیش نظر صرف نظیر کی منظومات کو رکھا ہے اور اس کی غزلوں کو نظر انداز کر کے وہ نہ صرف غیر متوازن تنقید نگاری کا شکار ہوئے ہیں بلکہ ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس میں نظیر کا تصور صرف ایک نظم گو شاعر کا تصور بن کر ہمارے سامنے ابھرتا ہے اور اس کی وہ غزلیں جن کے بعض اشعار محمد حسین آزاد کے الفاظ میں میر سے پہلو مار جاتے ہیں ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ نظیر کے ابتدائی مداحوں کا ایک حلقہ تو مختلف چھاپہ خانوں کے مہتمم حضرات کا ہے جن کی تنقیدی بصیرت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ان کے پیش نظر کاروباری مصلحتیں یقیناً رہی ہوں گی اور وہ اپنے مطبع کی جملہ مطبوعات کے بارے میں عموماً ایک ہی طرح کی رائے دیتے رہے ہوں گے۔ اس گروہ میں محمد وزیر خاں مہتمم مطبع احمدی آگرہ، شیخ نور الدین ابن جیوا خاں مہتمم مطبع صفدری بمبئی اور سید تصدق حسین مصحح مطبع اودھ اخبار لکھنؤ کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو "کلیاتِ نظیر" کو کتاب لطف آب پسند ہر صغیر و کبیر کہہ کر اپنی تنقیدی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ میں سید تصدق حسین نے کسی قدر تفصیل سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے:

"مصنف باکمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصائح کو چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرمایا ہے۔ خواب غفلت سے دنیا کی میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس طرح حسن ادب سے جگایا ہے ...... یہی کلیات ہے کہ اگر چشم ظاہر سے اس کو دیکھو تو طرح طرح دل لگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہے اور اگر دیدۂ حق بیں سے بغور و تامل ملاحظہ ہو تو سراسر دنیائے ناپائیدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا گویا بہ سبو ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ اقتباس بھی ایک مجموعی تاثر پیش کرتا ہے اور غزلوں کے بجائے نظیر کی نظموں کا اشاریہ ہے۔ حکمت یار خاں ابن حافظ احمد خاں شاگرد منشی نثار احمد بریلوی بھی جب کلیات کی تعریف کرتے ہیں تو مجموعی طور پر صرف تقلید گذشتگان کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"کتاب لاجواب، سر دفتر شعرائے زماں، سرمشق قلوب عاشقاں کہ جس کو سیاح دریائے فصاحت بیانی و غواص بحر فہم و معانی جناب شیخ ولی محمد اکبر آبادی متخلص بہ نظیر نے اپنی

صاف طبع سے نکال کر رشتۂ بحورِ زنگارنگ میں منسلک کر کے جوہریان و نقادان بازارِ معانی کو مستفیض کیا۔"

اس اقتباس سے اگر بحورِ رنگارنگ کو خارج کر دیا جائے تو تنقید و تبصرہ کی نگاہوں میں اس کی وقعت محض ایک قصیدہ کی مدح کی ہوگی اور بس۔

یہاں پر نظیر کے شاگردِ رشید میر قطب الدین باطن کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے "گلستانِ بے خزاں" میں نظیر کا ذکر کرتے ہوئے سارا زورِ بیان صرف کر دیا ہے اور ان کو مختلف خطابات سے نوازنے کے بعد لکھا ہے:۔

"خیاطِ ازل نے قبائے مضامینِ نادران کے عقل کے جسم پر قطع کی۔ دبیرِ فلک نے بیاضِ سخن پردازی و مضمون طرازی ان کے نام لکھی۔ بلاغت میں سلمان ساوجی بسم اللہ خوانِ دبستان فصاحت میں سحبان بن وائل طفلِ مکتب ایشان۔ ان کے حسنِ فکر میں اس طرح گلہائے مضامین کھلے ہیں کہ اگر عین خزاں میں بلبل تصور کو اس باغ میں لے جائیے تو ان پھولوں کی بو کا نفسِ عیسوی کرے۔ نغمہ سرائی اگر عندلیبِ طبع کی طوطیٔ بے جان سنے تو ہزار جان سے توصیف و مدح ہو کر ان کا دم بھرے ..... شاعر اس کو کہتے ہیں کہ واقف ہو زمانے کے امورات نیک و بد سے بہرہ ور شیریں بیان ہو حد سے شعر گوئی کے دقائق سے خوب ماہر ہو۔ شاعری کے سب نکتوں کا قاعدہ اس پر ظاہر ہو، شاعری کے علموں کا عالم ہو، ہر طرز میں مہارت کامل ہو جیسے ہادیٔ شعراء، شاعرِ نامدارِ عالی مقدار جن کے کلماتِ شائستہ نے گوشِ فہمِ عالم کو عقلِ سماعت بخشی ...... کلامِ نظیر شعرائے عصر کے لیے نظیر ہے۔ تقریر عامی بے نظیر ہے۔"

یہ اقتباس اس بات کا شاہد تو ہو سکتا ہے کہ تقریر عامی بے نظیر ہے" مگر نظیر کی غزلوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا اور صرف حقِ شاگردی ادا کرتا ہے، بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ فرہنگِ آصفیہ کے مولف منشی سید احمد دہلوی نے جب نظیر کو ہندوستان کا شیکسپیر کہا یا مولوی نذیر احمد نے جب ان کے اشعار کو ترجمۃ القرآن میں شامل کیا تو ان کی نظروں میں نظیر کی غزلوں کے بجائے ان کی نظمیں تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر فیلن نے جب نظیر کی شاعری کو اہلِ فرنگ کے نصاب کے مطابق سچی شاعری سے تعبیر کیا یا جب اس ضمن میں چوسر اور شیکسپیر کا ذکر کیا تو ان کا بھی ذہن بنیادی طور پر نظیر کی نظموں پر مرکوز تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ باطن سے لے کر شہباز تک اور شہباز سے لے کر عصرِ حاضر تک جب نظیر کے افہام و تفہیم کے نہ جانے کتنے نئے گوشے سامنے آئے اور سماجی پس منظر میں ان کے کلام کی نئی معنویت دریافت کی گئی، ہمارے صاحبانِ نقد و نظر کا بنیادی طور پر ذہنی جھکاؤ نظیر کی نظموں کی طرف رہا اور ان کی غزلوں سے سوتیلے پن کا برتاؤ کیا گیا۔ وہ چاہے ابو القاسم میر قدرت اللہ ہوں یا سعادت خاں ناصر، محمود ہوں یا فرحت اللہ بیگ نظامی بدایونی ہوں یا اجودھیا پرشاد پاٹھک سب نے بنیادی طور پر اپنے پیشِ نظر، نظیر کے کلام کے اس حصہ کو رکھا جو ان کی منظومات پر مشتمل تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی غزلوں پر اس وقت تک بھرپور توجہ، جس کی وہ مستحق تھیں، نہیں کی گئی۔

ان لوگوں میں جنھوں نے ابتداءً ہماری توجہ نظیر کی غزلوں کی طرف مبذول کرائی سید محمد آزاد کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان دنوں ناسخ کے کلام کا مزا دل میں سمایا ہوا تھا نظیر نگاہ میں جچتا ہی نہیں تھا..... اب جو دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں نظیر کسی طرح میر وغیرہ اساتذۂ قدیم سے کم نہیں ـــــ"

ناسخ، میر اور دیگر اساتذۂ قدیم کا تذکرہ نظیر کے سیاق و سباق میں کرنا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ سید محمد آزاد کے پیشِ نظر نظیر کی غزلیں بھی رہی ہوں گی شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی جنھوں نے ایک روایت کے مطابق نظیر کو REALISTIC POET کے خطاب سے نوازا، ان کو نظیر کی غزلوں کے اشعار یاد تھے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں "نگار" کا نظیر نمبر، نظیر فہمی کی ایک

سے دور کا آغاز تھا۔ کچھ دیگر مضمون نویسوں کے علاوہ، نیاز فتح پوری نے جب نظیر کے سلسلہ میں مرزا مظہر، شاہ حاتم سودا، میر سوز، قائم حسرت، رنگین، نصیر، ممنون، مومن، غالب، ذوق، جرأت انشار، مصحفی اور ناسخ وغیرہ کے نام لیے اور یہ لکھا:

"اس لیے اگر اس کے کلام میں وہ سب کچھ پائیں جو اس کے ہم عصر شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے تو تعجب نہ کرنا چاہیے ...... وہ بیک وقت متقدمین، متوسطین و متاخرین تمام شعراء کی صف میں جگہ پا سکتا ہے ——"

تو ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ نیاز نے نظیر کی غزلوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ "تذکروں سے لے کر" نگار" کے نظیر نمبر تک اور نظیر نمبر سے لے کر ہمارے معاصرین تک چند مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر لکھنے والوں کی توجہ نظیر کی منظومات ہی پر رہی جو واقعتاً اردو کی شعری تاریخ میں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہیں مگر ان کی غزلوں کا کوئی تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا اور اگر لیا بھی گیا تو محض ضمنی اور ثانوی حیثیت سے۔ اس تغافل اور تجاہل کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نظیر کی غزلیں ناقابل اعتنا تھیں، بلکہ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ نظم نگار نظیر اکبر آبادی نے غزل گو نظیر اکبر آبادی کو اس تمام تر عرصہ میں دبائے رکھا اور صاحبان نقد و نظر کی نگاہیں ان کی نظموں کی اجتہادی شان میں اتنا خیرہ ہو گئیں کہ وہ ان محاسن کو نہ دیکھ سکے جو نظیر کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نصف نظیر کے مطالعہ کا اطلاق نظیر کے مکمل فکر و فن پر کیا گیا اور جزو سے کل کو ناپنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی غزلوں کا تفصیلی جائزہ پہلے لیا جاتا کیوں بقول حالی ہماری سماجی زندگی میں غزلوں کا عمل دخل اور اس کے اثرات نظموں سے کہیں زیادہ ہیں۔

نظیر کی غزلوں کا سب سے اہم پہلو جو ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے وہ روایتی تصور حسن و عشق ہے جس کی بنیاد محض روایتی رسمی اور تقلیدی مفروضات پر قائم تھی مکمل انحراف یا بغاوت کا نام ہے۔ یہ ہماری قدیم اردو شاعری کا المیہ رہا ہے کہ وہ اپنے تمام تر اکتسابات اور کمالات کے باوجود زندگی کو اس انداز میں آئینہ نہ دکھا سکی جس انداز میں اسے دکھانا چاہیے تھا۔ اس کا ایک بڑا سبب مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں یہ رہا ہے کہ اس نے اپنے تمام تصورات و مفروضات، اپنے روایات و صور، اپنے اصول و اسالیب غرض کہ تمام معیار اور تخیل ایران سے لیے اور فارسی شاعری سے اپنا دستور مرتب کیا اور اپنے ملک و معاشرت سے نہ مواد لیے نہ اسالیب بلکہ ایک دور از خیال موہوم زندگی کو اپنا ماخوذ رکھا اور اسی کو اپنا موضوع بنایا۔ نظیر پڑھے لکھے آدمی تھے اور انھوں نے اپنی ساری عمر درس و تدریس میں گزاری تھی۔ اس لیے وہ قدیم شاعری کے اس عاشق کی کوتاہیوں سے خاطر خواہ واقف تھے جو تصورات میں رہ و رسم عاشقی کے نہ جانے کتنے قلعے سر کر لیتا تھا مگر جب محبوب کو سامنے پاتا تھا تو اس کی زبان پر قفل لگ جاتے تھے اور وہ پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ انھیں عاشق کے اس منفعل رویے کا شدید احساس تھا جو شوق کی بلندی اور ہمت کی پستی کے تضادات کا شکار ہو کر شجر ممنوعہ کے ثمر کو چکھنے کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔ عاشق کا یہ تصور جو اس عہد کی شاعری میں ابھر کر سامنے آ رہا تھا، زندگی کے مظاہر اور گرد و پیش میں ہونے والے واقعات کی تردید کر رہا تھا۔ نظیر چونکہ روایات و خیالات کے نہیں بلکہ واقعات و حادثات کے شاعر تھے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں نہ تو محبت کی سنی سنائی روداد بیان کی اور نہ عاشق کی اس ناتجربہ کاری اور شرمیلے پن کو ابھارا جو اس عہد کی اردو غزلوں کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ایک حساس اور زندہ انسان تھے اور انسانی زندگی میں جنس اور جذبہ کی جو اہمیت تھی اس کا عرفان رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ محض حسن بیان اور عروض کے معیارات کسی ادب کی پرکھ نہیں بن سکتے، بلکہ ادبی تجربات کی ہمہ جہت کلیت جس میں گہرائی، ہیئت اور اصل جوہر تک رسائی شامل ہے اچھے ادب کا معیار و میزان

ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں محبت کا وہ فرضی اور تخیلی پہلو جس میں کم ہمتی اور مجبوریوں کا نام شرفائے ادب نے پاکیزگی رکھ لیا تھا پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ محبت کا جنسی پہلو اپنے سارے مدوجزر اور شدت کے ساتھ ان کی غزلوں میں نمودار ہوا۔ ان کی محبوبہ گوشت و پوست کی بنی ہوئی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے جس کی شریانوں میں گرم خون دوڑ رہا ہے۔ وہ نہ تو تخیل کی پیداوار ہے نہ روایات کی پروردہ۔ یہ اردو غزل کے مثالی محبوب کی وہ ہمزاد ہے جس کا ہر عمل اور ردعمل جنس اور شباب کے فطری تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ نظیر اپنے محبوب سے مکمل ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اسی ہم آہنگی کے لیے حیلے اور وسیلے تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسن و عشق کی مکمل ہم آہنگی کا نام پارسائی بھی ہے اور محبت بھی اور مکمل ہم آہنگی سے جنس کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا روایتی مزاج نظیر کی زندگی کے اس واقعہ پر شرافت کا پردہ کیوں ڈال دیتا ہے کہ کناری بازار کے ایک کوٹھے سے ایک مہوش نے مسکرا کر کہا: "میاں ہم کو اپنا کلام سناؤ۔ یاد کر لیں گے، گائیں گے اور کمائیں گے۔" اس فرمائش پر میاں نظیر بہت جز بز ہوئے۔ اس کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ اور وہ ماننے والی نہ تھی کہنے لگے ؎

نکلیں ہم عیش کی تختی پہ کس طرح لے جا
قلم زمین کے اوپر دوات کوٹھے پر

دنیا کی بے ثباتی پر نظیر کے اشعار دیکھ کر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ نظیر کی عمر کا بڑا حصہ عیش و نشاط کی محفلوں میں گزرا تھا۔ اور رنڈیوں کے کوٹھوں پر بھی ان کی آمد و رفت جاری تھی ان کی بہترین غزلیں میاں موتی کی وجہ سے مشہور ہوئی تھیں جو ایک مشہور کلاونت اور ان کا شاگرد تھا۔ اور جس نے ان کے ارشاد کے مطابق ان کی دھنیں قائم کر کے دل فریب طور پر گایا تھا۔ ہمیں یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ نظیر نے ایک پوری کتاب اپنے پہلے طلباؤں میں شریک ہونے کے سلسلے میں "بزم عیش" کے نام سے نظم بند کی تھی گانے بجانے اور بزم نشاط کی دھوم کے تذکرہ میں نظیر کا محاکاتی انداز میں ایسے الفاظ اکٹھا کر دینا کہ معلوم ہو کہ محفل سجی ہوئی ہے اور پکھاوج اور جوڑی کی جوش انگیز آواز ہمارے کانوں میں آ رہی ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ محض ساحل کے تماشائی نہ تھے بلکہ انھوں نے اس دنیا کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا زندگی کے یہ سارے واقعات اور مشاہدات نظیر کو غزل کے مروجہ رسم و رواج سے انحراف پر آمادہ کرتے ہیں اور وہ اپنے لب و لہجہ اور انداز بیان سے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ زندگی اور زمین ہی کے قریب ہیں اور ان تخیلی طاہر اور پاکیزہ فضاؤں میں نہ جائیں جہاں فانی اور گنہگار انسان پر بھی نہیں مار سکے۔ اس کی دنیا حسن کے ان وفاداران ازلی اور غلامان کہن کی دنیا نہ تھی جو ایفائے عہد کے انتظار میں ساری ساری عمریں گذار دیتے تھے بلکہ یہ ان خوش دل جوانوں اور مستانوں کی دنیا تھی جو موجود لمحہ میں زندگی کی لذتوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پی جانا چاہتے تھے۔ نظیر کی نظمیں ممکن ہے کہ ہمارے بچپن اور بڑھاپے کو متاثر کرتی ہوں، مگر جوانی کی اصل فطرت اور جنس کے فطری تقاضے جس پر زمانے کی رفتار نے تہذیب و مدنیت کے ریشمی غلاف نہ چڑھا دیے ہوں، نظیر کی غزلوں میں نظر آتی ہیں جس میں حسن و عشق کی ہم آہنگی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے یہ نظیر کا کارنامہ ہے کہ اس نے بغیر کسی نفسیاتی الجھن کے، ایک دل کے اچھے اور سچے آدمی کی طرح بڑی صداقت اور بے نفسی کے ساتھ بے جھجک ہو کر زندگی کے تجربات بغیر کسی حذف و اضافہ کے بیان کر دیے ہیں۔ ؎

کتنا ہی اس نے تن کو چھڑایا جھڑک جھڑک
پر میں بھی کھینچی باندھ کے ایسا چمٹ گیا
کشمکش ہوئی کہ گریباں مرا ادھر
ٹکڑے ہوا ادھر اس کا دوپٹہ بھی پھٹ گیا
آخر اسی بہانے ملا یار سے نظیر
کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا

لپٹ کے سوئے جو اس گلبدن کے ساتھ نظیر
تمام ہو گئیں حل مشکلات کو ٹھے پر

اگر ہے منظور یہ کہ ہووے ہمارے سینے کا داغ ٹھنڈا
تو آ لپٹ جا گلے سے اے جان جھمک سے کر جھپ چراغ ٹھنڈا

چڑھا کو ٹھے پہ دروازے کو مونداور کھول کر پردے
لگا جھاتی لیے بوسے کیا ہت بیسر آندھی میں
وہ کوٹھے کا مکان، وہ کالی آندھی، وہ ستم گرد
عجب رنگوں کی ٹھہری آکے سیرا بیسر آندھی میں

اٹھا کر طاق سے شیشہ، لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیے دل سیر آندھی میں
کبھی بوسہ، کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر
لگے لٹنے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں
نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

صفائی اس کی جھلکتی ہے گورے سینے میں
چمک کہاں ہے یہ الماس کے نگینے میں
پڑا جو ہاتھ مرا سینے پہ تو ہاتھ جھٹک
پکاری "آگ لگے اوئی اس قرینے میں"
کبھو مٹک کبھو بس بس، کبھی پیالہ پٹک
دماغ کرتی تھی کیا کیا شراب پینے میں
چڑھی جو دوڑ کے کوٹھے پہ وہ پری اک بار
تو میں نے جا لیا اس کو ادھر کے زینے میں
وہ پہنا کرتی تھی انگیا جو سرخ لاہی کی
لپٹ کے تن سے وہ تر ہو گئی پسینے میں

ہم تو کیا ہیں دل فرشتے کا بھی کافر چھین لے
ٹک جھمک دکھلا کے پھر انگیا چھپالی آپ نے
دیکھو کہنا مانو مت خالی سلائی سے رکھو
ورنہ کوسے گی ہمیں یہ سرمہ دانی آپ کی

میں نے یہ چند اشعار غزلیات نظیر سے بغیر اس اہتمام کے کہ ان میں ادبی وقار اور فنی رموز و نکات ہیں کہ نہیں اس لیے منتخب کر لیے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ نظیر نے اپنی شخصیت اور فن پر تہذیب و تربیت کے وہ ریشمی غلاف نہیں چڑھائے ہیں جو اس کو ریاکار اور حقیقت فراموش بنا دیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار آپ کے معیار اخلاق پر پورے نہ اتریں اور آپ بھی شیفتہ کی طرح انھیں مبتذل سمجھیں مگر بقول مجنوں گورکھپوری "جس چیز کو ہم ابتذال بتاتے ہیں وہی نظیر کا فن ہے۔" خواص کے مرتب کردہ اصول اور اسالیب کی خاطر وہ عوامی زندگی کے اس گرد و غبار کو جسے وہ اپنے فن اور فکر کا غازہ بنائے ہوئے تھا قربان کرنے کو تیار نہ تھا۔ کاروبار شوق کے یہ مراحل جن کو نظیر نے اپنی غزلوں میں طے کیا ہے، ہمیں ان کی فارسی تصنیف "طرز تقریر" کی یاد دلاتے ہیں جس میں انھوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ معشوقوں سے چھیڑ چھاڑ کیوں کر کی جاتی ہے۔

تصور حسن و عشق کی یہ تبدیلی صحت مندی تھی یا مضر، میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر اس پر دو رائے نہیں ہو سکتی کہ یہ اشعار زندگی کے جذب و شوق اور مد و جزر کی آئینہ داری کرتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ معاشرہ کی اکثریت کا ایمان اسی طرح کے جذبات و احساسات پر اعمال و افعال کی حد تک قائم تھا۔ بقول ایک تنقید نگار اگر ہمارا ملک ایک جمہوری معاشرہ بننا چاہتا ہے تو ہمیں ادب کے ہمہ جہتی مطالعہ سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ نقد ادب کے فریضے سے ہم اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جب ہم [illegible]

تخلیقات کے اندر جاری وساری روح کے سماجی اور سیاسی فلسفے سے آگہی پیدا کریں۔ اور اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواص کے تہذیبی شبستانوں اور ادبی شیش محلوں پر عوامی طرز فکر کی یہ پہلی سنگ باری تھی جو میر کے آخری عہد سے شروع ہو کر غالب کے ابتدائی دور تک ہوتی رہی مگر ان نگار خانوں کی فصیلیں اتنی بلند اور مضبوط تھیں کہ اسے مسمار کرنے میں خود نظیر کی جان تلف ہو گئی۔ نظیر خواص کے اقلیم سخن طرازی اور سخن سنجی کا دستور تو نہ بدل سکے مگر عوام کے دلوں اور سماج کے ضمیر پر ان کی گرفت جس قدر شدید اور مضبوط رہی اس کا عشر عشیر ہمارے عہد کے ان ترقی پسند شعراء کو بھی نہ مل سکا جو ادب اور زندگی کے رشتے کو ایک شعوری تحریک سے استوار کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے عہد کے ترقی پسندوں نے عوامی مسائل پر جتنے اشعار کہے اس کو عوام نے کم اور خواص نے زیادہ سراہا یہ سعادت صرف نظیر کے حصہ میں آئی کہ خواص ان کی شاعری سے بدظن اور مشکوک ہوئے مگر عوام نے اس کو اپنے دل میں جگہ دی۔ ان کے کلام کے عاشقوں میں حلوائی اور کنجڑے، قلندر اور خوانچے والے، ترکاری اور چنا جور گرم بیچنے والے سبھی شامل ہیں۔ ان کی وفات پر سنیوں اور شیعوں نے اپنے اپنے طریقہ سے نماز جنازہ ادا کی۔ ہندو مزار کی چادر تبرکاً لے گئے۔ شاگردوں نے قبر پختہ کروائی۔ غلام رسول کی مسجد میں قرآن خوانی ہوئی اور عوام نے جو میلہ قائم کیا وہ آج تک جاری ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں نظیر کی غزلوں کے جس مخصوص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ نظیر کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کرنے والے خواص کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کلیات نظیر میں ایسے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جن کے موضوعات میں [illegible] کا ذکر شامل ہے مگر ان اشعار میں [illegible] انفرادیت [illegible] ہے

اور اپنا رشتہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے منقطع نہیں ہونے دیا ہے، انھوں نے اکثر غزلوں پر اپنی تشبیہات و استعارات کو زندگی میں ہونے والے اور نگاہوں کے سامنے گزرنے والے مظاہر سے ماخوذ کیا ہے۔ ان کی غزلوں کا بیشتر حصہ خارجیت کے مفہوم میں آتا ہے مگر جب کبھی وہ داخلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں تو اس کو ان خارجی علامتوں میں ظاہر کرتے ہیں جو عوامی زندگی اور مشاہدہ کا جزو لاینفک ہوتی ہیں۔ ولی دکنی کی اکثر تشبیہات غیر مبہم سے مبہم اور واضح سے غیر واضح کی طرف سفر کرتی ہیں اسی باعث محبوب سے ان کا تخاطب جو عموماً واحد حاضر کے صیغے میں ہوتا ہے اور مادہ کو آتش گیر بناتا ہے اپنی تشبیہات کی بدولت ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور وہ جمال دوست کے دعاوی اور غزلوں میں سب سے بڑے سراپا نگار ہونے کے باوجود جنس کی بھینی بھینی خوشبو سے محروم ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے نظیر اپنے غیر جنسی اشعار میں بھی عوامی زندگی کی ایسی تشبیہات اور استعارات لاتے ہیں جو انھیں خواص کے موضوعات سے قریب تو کرتے ہیں مگر عوام سے دور بھی نہیں ہونے دیتے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں اور روضہ تاج گنج کی زندگی سے اپنی علامتوں کا پیکر لے کر ادب اور جمالیات کی ان قدروں سے ہم آہنگ ہو جانا جو قلعہ معلٰی کے مخصوص ادبی جمالیاتی ماحول میں پروان چڑھ رہی تھیں صرف میر اور نظیر کا کارنامہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں
چاہا ادھر گھٹا دیا، چاہا ادھر بڑھا دیا

موم ہوں [illegible] وقت [illegible] ہے [illegible] بکھر [illegible]
[illegible] تم [illegible] میں تو پگھل جاؤں گا

[illegible]
[illegible]

محفل میں ہوئی ہوگی یاد اس کو بہت میری
جب شمع کے شعلے پر پروانہ جلا ہوگا

اور اب یہ تشبیہیں بھی ملاحظہ ہوں:

جھکائے سر کو چپ ہوں یوں میں بحرِ غم کی لہروں میں
کوئی کھیلے ہے جیسے بازیٔ شطرنج پہروں میں

اس کے چہرے پہ نہیں کاکلِ شکیں کی نمود
یہ پٹارے کے نہیں توڑ کے کالا نکلا

اشک کی نوکِ مژہ پر شیشہ بازی دیکھیے
کیا کلائیں کھیلتا ہے بانس پر یہ نٹ بڑا

جو وہ بعد بوسہ کے ناز سے ذرا جھڑکے ہے تو نظیر کو
کبھی مصری ہے کبھی قند ہے کبھی شہد ہے کبھی راب ہے

اگر وہ شعلہ رو پوچھے مرے دل کے پھپھولوں کو
تو اس کے سامنے اک خوشۂ انگور رکھ جانا
رقیب روسیہ کے حال کا گر ماجرا پوچھے
تو اس کے سامنے جنگل سے اک لنگور لے جانا

ان اشعار میں نفس موضوع کے اعتبار سے وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جن پر نظیر سے قبل اردو اور فارسی کے زمانے کتنے شعرا خامہ فرسائی کر چکے تھے، محبوب کے التفات اور تغافل پر عاشق کی دلی کیفیات کا ردعمل آتش عشق کا سینے میں فروزاں ہونا، محبوب کے غصہ پر عاشق کا رام ہوجانا، شمع کے شعلوں پر پروانہ کا جلنا، غم آگیں لمحات میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ جانا، عارض و گیسو کی بات، نوکِ مژہ پر اشکوں کا فروزاں ہونا، بعدِ بوسہ محبوب کی جھڑکیاں دل کے پھپھولے اور رقیب روسیہ کا ماجرا — یہ سارے عنوانات ایسے ہیں جن سے ہماری اردو شاعری نظیر سے قبل یا نظیر کے دور میں ناآشنا نہیں تھی۔ لیکن نظیر نے ان موضوعات کو جن روزمرہ کی زندگی کی علامتوں میں برتا ہے اور تشبیہات و استعارات کی جو عوامی دنیا سجائی ہے وہ نظیر کا اپنا انفرادی رنگ اور امتیازی جوہر تھا۔ نظیر شعوری طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا رشتہ فنی التزامات میں بھی عوام کی زندگی اور ان کی نگاہوں کے سامنے والے مظاہر سے منقطع نہ ہو۔ پتنگ بازوں کا اڑانے والے کے اشارات پر گھٹنا بڑھنا، آتش بازی کا تماشا، لوہے کا گرم ہو کر پگھلنا، شطرنج کی بازی میں کھیلنے والوں کا انہماک، پٹارے سے سانپ کا نکلنا، بانس پر نٹوں کا کرتب، شہد اور راب کا مزہ، خوشۂ انگور اور بے ننگم لنگور — یہ سب معاشرہ کے ایسے مظاہر اور عوامی زندگی کے ایسے مناظر ہیں جن سے سماج کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی واقف ہے نظیر کا یہ آرٹ اگر ایک طرف ان کی غزلوں کو مقامی رنگ عطا کرتا ہے تو دوسری طرف ایسے خواص کی مہذب اور مصنوعی زبان سے انتقام بھی لیتا ہے جو بقول مجنوں گورکھپوری اپنے کو خدا کی خاص مخلوق سمجھتے ہیں اور عوام کو ادنیٰ اور ذلیل سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نظیر یہ جانتے تھے، کہ ادب خلا کی پیداوار نہیں ہوتا اور حقیقت اور خیر کی طرح حسن کا تصور بھی ملکوں ملکوں مختلف عہد میں بدلتا رہتا ہے اور ماحول کے تقاضوں اور سماج کے مطالبات کے پس منظر میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے گردوپیش کی دنیا اور اس عہد کا سماج ان چند خواص ہی پر مشتمل نہیں تھا جنھوں نے ادب اور جمالیات کی قدریں متعین کی تھیں بلکہ نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی وسیع اور بیکراں کائنات میں وہ عوام بھی بستے ہیں جن کی اپنی شادکامیاں اور محرومیاں معاشرہ میں مدوجزر پیدا کرتی ہیں۔ اور جو اپنے جذب اور شوق کی آسودگی کے لیے ہمیشہ ایک نظیر

کے منتظر رہا کرتے ہیں"۔

نظیر نے نہ صرف اپنے فکری میلانات اور فنی اجتہادات سے اردو غزل کو متاثر کیا بلکہ الفاظ کی کثرت اور ترنم، مرادفات کی فراوانی اور موسیقی آمیز بحروں سے اردو غزل کی لسانی جمہوریت کو بہت زیادہ وسیع کیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس میں کوئی دوسرا شاعر ان کے قریب نہیں آتا۔ الفاظ کا شاید اتنا بڑا ذخیرہ میرانیس اور جوش ملیح آبادی دونوں کو شامل کرکے ماضی اور حال میں کسی شاعر کے پاس موجود نہیں رہا ہے۔

نظموں میں عوامی بول چال کے الفاظ کی شمولیت کا مسئلہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا غزلوں میں پیش آتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل چھوئی موئی کی طرح [illegible] شرمیلی صنف سخن ہے۔ بلکہ نامانوس [illegible] غزل کے چہرے پر [illegible] ڈال دیتا ہے۔ یہ نظیر کا کمال ہے کہ ان کے [illegible] اور محاورے جب اشعار کے پیکر میں ڈھلتے ہیں تو نہ صرف غزلوں کی موسیقی کو رواں دواں کرتے ہیں بلکہ محاکاتی کیفیت کو ابھار کر پورا منظر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور وہ الفاظ جو اپنی تنہا ذات میں نامانوس ثقیل اور کھردرے نظر آتے ہیں مصرعوں میں شامل ہونے کے بعد ایسا وجد پیدا کرتے ہیں اور اتنا روشن اور تابناک ہو جاتے ہیں کہ ان کی [illegible] چھوٹ سے غزل کا پیمانہ بھی جگمگانے لگتا ہے۔ ذرا ان الفاظ کو دیکھیے جن کا انتخاب نظیر کی صرف غزلوں سے کیا گیا ہے کیا ہماری غزل سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ان الفاظ کی متحمل ہو سکے گی۔ مگر جب آپ نظیر کی غزلوں کو پڑھیں گے تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ فن کار کا طلسمی ہاتھ جہاں بھی لگ جاتا ہے وہاں فعل متحرک اور اسم روشن ہو جاتے ہیں۔

بھنگ۔ چھٹین۔ ملائی۔ رکھاوٹ۔ ہتھ پھیر۔ کھرکھری دان۔ بغزلی۔ کھٹمل۔ کرن پھول۔ دگو نگے کا گڑ۔ فیلبان۔ دیگ کا چاول۔ کھنی۔ گدھ لسا۔ لات۔ بیہودہ۔ کبڑی۔ کلیاں تہان، چڑیل، پھانسی، گندھاوٹ، جھکڑ، رڑاکا، جھنجلاہٹ، جھڑاکا، اکھٹ، عنٹ، دہلوان، گھلوں کمڑی، جالا، سرہانہ، پانسٹی، بھان متی، چھل بلیا، بادلیا، سانولیا، ڈلیا، پلاؤ، تلیا، بلیا، دلیا، کچوڑی، پھٹک، مراۃ لقا، گلچھڑی، ہموارہ، چوپٹ، کلائی، بانس، نٹ۔ پٹ۔ لب لباب، خلطہ، تکل، سربیج، جھوک، جھنڈ بند، نیمے، منجھولا، امولا، جھکولا، بولا، کلف، چھل بل، اٹکل، قدوم، گوکھرو، جنگ جو، قتال، ککڑوں کوں، ٹٹڑوں ٹوں، اکن، سڑن، خبطن، بالین، مزیداری، چپتی، رتجگا، سوت، دھاگا، چرخہ، الھیرن، اشیرا، منکا، پہونچی، گٹھری، کیو، جھکڑا، کنگنی [illegible]، ترو بڑا، [illegible] رباب، چلکن۔ [illegible] کڑاکوس۔ پلنگ [illegible] باز۔ تندی۔ کوندن۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ چند الفاظ ہیں جن کا انتخاب نظیر کی نظموں سے نہیں بلکہ غزلوں سے کیا گیا ہے۔ مرکزیت، معیار کی بلندی، اور دربار سے وابستگی نے اصلاح زبان کے نام پر غزلوں کی لفظیات اور لسانیات کو محدود کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ مگر نظیر کی لامرکزیت اردو غزل کی لسانیات کو محدود نہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی غزلوں میں بھاشا، سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی، پنجابی اور پھر اپنے خانہ ساز اور خود ساختہ الفاظ کو بڑی بے تکلفی سے غزل میں کھپا رہے تھے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ حقیقتیں منجمد لسانی پیمانوں میں مجروح ہو سکتی ہیں اسی لیے ایک حقیقی فنکار کی طرح انھوں نے اپنی سانسوں کی گرمی سے غریب اور نامانوس الفاظ کو پگھلا کر نہ صرف جیتا جاگتا پیکر عطا کیا بلکہ حقیقتوں کی اس طرح مرقع نگاری کی کہ اسطور کی خالی جگہیں بھی پُر ہو گئیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بقول علامہ سیماب اکبر آبادی موسیقی کو قائم رکھنے کے لیے اگر انھیں عروض یا لسانی قانون کو توڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں

اس کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ مصرعوں کے آہنگ، الفاظ کے زیروبم، لہجے کے ترنم اور شعروں کی داخلی اور خارجی غنائی کیفیت کو مجروح و مضروب کر کے عروض اور قواعد کا حق ادا نہیں کرنا چاہتے بلکہ اپنے لفظی اجتہادات اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے غلط تلفظات سے ایسی لے پیدا کر دیتے ہیں کہ قواعد اور عروض دونوں منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظیر نے لسانی نقطہ نظر سے نہ صرف اپنی آزادی کا اعلان کیا بلکہ ان بازاری محاورات اور روزمرہ سے جن کو استعمال کرتے اور شعرا ڈرتے تھے ایک بولتا چالتا اچھا خاصا اردو بازار بسا دیا۔ الفاظ و لغات کی کثرت۔ جدت استعمال۔ اور مختلف صیغوں کے الفاظ کو نظیر نے جس طرح غزل میں داخل کیا ہے اس کی مثال اردو کی پوری شعری تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ یہاں پر اتنی گنجائش تو نہیں کہ مذکورہ الفاظ اور مرادفات کے استعمال کی مکمل مثال پیش کی جا سکے۔ پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ یکتائی، یہ یک رنگی، تس اوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

شب مہ میں دیکھ اس کا وہ جھک جھک کے چلنا
کیا انتخاب مہ نے یوں چمک چمک کے چلنا

گرنے فریب روز جو آتے ہو تم میاں
ہم کو بھی کتنے یاد ہیں اس ڈھب کے چھند بند

میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج
وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اکھڑ گیا

نہ مہ نے کوند بجلی کی نہ شعلے کا اجالا ہے
کچھ اس مکھڑے سے مکھڑے کا جھمکڑا ہی نرالا ہے

ہزار گل کی بہاریں نہ ہو سکیں ہمسر
تمہارے ایک کرن پھول کی بہار کے ساتھ

نہ جل میں آوے نہ بھڑک کے نکلے نہ پاس بیٹھے نظیر اک دم
بڑا ہی پُرفن، بڑا ہی سیانا، بڑا ہی شوخ اور بڑا ہی چنچل

سبھی تو ہنس کر شتاب آجا نظیر کی بھی طرف ٹک اے جاں
بنا کے سج دھج، بھڑا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

دکھا کر اک نظر دل کو نہایت کر گیا بیکل
پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا چنچل
بدن میں جامۂ زرکش سراپا جس پہ زیب آور
کڑے، بندے، چھپڑے، چھلے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل
سراسر پُر فریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے
شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا چھل بل

فرو کچھ ہو چلا تھا شعلۂ دل
دیا جھپکوں نے پھر مژگاں کی بھڑکا

یہ چند شعر نمونتاً یہاں پیش کر دیے گئے ورنہ غزلیات نظیر میں مرادفات اور نامانوس عوامی الفاظ کے خوب صورت استعمال کی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔

نظیر کی غزلیں ان حضرات کے لیے خصوصیت کے ساتھ طمانیت قلب کا باعث ہوں گی جو غزل کی ریزہ خیالی کے شاکی ہیں اور اسے ایک نیم وحشی صنف سخن گردانتے ہیں اس لیے کہ مسلسل غزلوں اور قطعہ بند اشعار کی جو فراوانی کلیات نظیر میں ہم کو ملتی ہے اس سے ہمارا سابقہ کسی اور شاعر کے دیوان میں نہیں پڑتا۔ ان قطعہ بند اشعار میں عموماً شاعر اور محبوب کے درمیان مکالمہ کا انداز اختیار کر کے ڈرامائی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ مسلسل غزلوں اور قطعہ بند اشعار

کی فراوانی اس بات کی بھی علامت ہو سکتی ہے کہ شاعر نے تنگنائے غزل کو بقدر ظرف نہیں پایا اور اسی لیے اس نے ایک خیال کو کئی کئی اشعار میں ادا کیا اور اس ریزہ خیالی کو برت نہیں سکا جو غزل کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ مگر نظیر کے قطعہ بند اشعار اور مسلسل غزلیں ایک دوسری کہانی سناتی ہیں جو بہر صورت عجز بیان کی کہانی نہیں ہے بلکہ اپنا تخلیقی رشتۂ نظیر کی نظموں سے جوڑتی ہیں۔ اور ان اثرات کی نشاندہی کرتی ہیں جو شاعر نے اپنے پیش رووں خصوصیت کے ساتھ سودا سے قبول کیے ہوں گے۔ ان اشعار میں شوخی، طراری اور معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ [illegible]مسائل و تاملات، نصائح اور عبرت بھی کچھ ہمیں مل جاتا ہے۔ چند قطعہ بند اشعار کلیات نظیر کی صرف ردیف الف سے ملاحظہ ہوں سے

کھول دی چاہ دیدۂ تر نے
یاں نہ لازم پلک بھگونا تھا
اور جو ایسا ہی تھا تو گوہر اشک
ہٹ کے اغیار سے پرونا تھا
یا چھپانا نظیر تھا بہتر
یا تعشق سے ہاتھ دھونا تھا

رات آیا وہ تو کیا کیا کچھ
اہل محفل کو اضطراب ہوا
مے ہوئی خون دل صراحی میں
جام مے دیدۂ پر آب ہوا

رات کوٹھے پہ چڑھا وہ تو کہوں کیا یارو
منظر بام سے اس کے وہ اجالا نکلا
برق جوں چمکے ہے یا چھوٹے ہے جیسے مہتاب
وہ اجالا تو کچھ اس سے بھی نرالا نکلا

دل دیکھنے کو آیا یارو تو اس صنم نے
ناطاقتی میں اس کے اطوار کو نہ دیکھا
تیر نگہ لگایا ایسا نظیر جس کی
پیکاں تو کیا کہ ہم نے سوفار کو نہ دیکھا

نظیر اب سنا ہے کہ اس تند خو نے
کیا بن کے خونخوار بھیس قصد یاں کا
جو آتا ہے آنے دو اس تیغ زن کو
ڈرے وہ میاں جس کو خطرہ ہو جاں کا

بیٹھے کے نزدیک اس کے جو اک دن پاؤں کو ہم نے چوم لیا
اس نے ہمیں بیباک سمجھ کر لطف جتانا چھوڑ دیا
پھر جو گئے ہم ملنے کو اس کے دیکھ کے اس نے ہم کو نظیر
یوں تو کہا ہاں آؤ جی لیکن پاس بٹھانا چھوڑ دیا

دیا دل نظیر اس کو یوں کہہ کے لے جاں
کہو گے تو یہ پاسبانی کرے گا
پڑھے گا یہ اشعار بیٹھو گے جب تک
جو لیٹو گے افسانہ خوانی کرے گا
بٹھاؤ گے در پہ تو ہو گا یہ دربان
لڑاؤ گے تو پہلوانی کرے گا
اطاعت میں خدمت میں فرمانبری میں
غرض ہر طرح جاں فشانی کرے گا

نظیر ہم کو آگے ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دھیان یہ بھی تھا
تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشین کفن تھا معطر بدن تھا

[illegible] کہیں اس کی انگڑی تو دیکھا
یعنی وہ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

یہ چند قطعہ بند اشعار، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے میں نے کلیاتِ نظیر کی صرف ردیف الف سے منتخب کر لیے ہیں۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے بند دیوانِ نظیر میں بکھرے پڑے ہیں اور مسلسل غزلوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن [illegible] واردات و عیش، بصارت و تاملات اور کاروبارِ عشق کو موضوعِ شعر بنایا گیا ہے نظیر کے اکثر قطعہ بند اشعار میں مکالماتی اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جس کی بنا پر وہ محاکاتی اور ڈرامائی عنصر جو نظیر کی نظموں میں ہمیں ملتا ہے ان کی غزلوں میں بھی در آیا ہے۔ شاعری سے اگر محاکاتی عنصر خارج کر دیا جائے تو یہ مفروضوں کا ننگا دھڑنگا بیان بن جاتی ہے اور بیانِ محض کی میکانیت زبان میں یک رنگی پیدا کرتی ہے۔ نظیر کا محاکاتی اور ڈرامائی انداز نہ صرف ان کو زبان کی یک رنگی سے بچاتا ہے بلکہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے متحرک بنا کر پیش کرتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ ایک محاورے یا ضرب المثل کو نظم کرنے کے لیے نظیر نے پوری پوری غزل اس طرح کہہ ڈالی ہے کہ محاورہ کا مفہوم بالکل اجاگر ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس طرح کے اشعار پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ غزل صرف قطرہ میں دجلہ ہی نہیں دکھلاتی بلکہ قطرہ کو وسعت دے کر دجلہ بھی بنا سکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نظیر کی طبیعت مربوط اور مسلسل کلام کی طرف مائل رہتی ہے اور وہ اپنے کلام سے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ غزل میں بھی ایک مسلسل تجربہ بیان کیا جا سکتا ہے۔ محمود ہاشمی نے نظیر کی مسلسل غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ "نظیر پہلے ایک پیکر تخلیق کرتے ہیں اور پھر اس کے وجود کی تمام تر لطافت کو زندگی کا تحرک اور مکالمے کا اعتبار عطا کرتے ہیں۔ ان کی غزل "میں" کے وجود سے شروع ہوتی ہے اپنے مقابل ایک دوسرا جمالیاتی پیکر تخلیق کرتی ہے اس سے مخاطب ہوتی ہے۔ اور اس طرح دو شعری پیکروں کے درمیان مکالمہ تصادم، ملاپ، لمحۂ موجود کی لذت اور کیفیت جنم لیتی ہے اس طرح نظیر کا تخلیقی عمل پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔"

نظیر نے اگر ایک طرف اپنی سراپا بیان کرنے والی غزلوں میں اردو شاعری کے مروجہ تصورِ حسن سے انحراف کر کے ایک ایسی عورت کو موضوعِ گفتگو بنایا جو کوئی شریف زادی نہیں بلکہ طوائف ہے اور جس کے وجود کا مقصد تمام تر لذتیت کے ساتھ شہوانی جذبات کی آسودگی فراہم کرنا ہے تو دوسری طرف ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی بے مائگی کو اجاگر کیا گیا ہے اور پند و نصائح کے دفتر کھولے گئے ہیں اس تضاد کی بظاہر وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظیر نے میلوں ٹھیلوں، طوائفوں اور تماش بینوں کے علاوہ درویشوں اور فقیروں کی بھی صحبت اٹھائی تھی۔ ان کے مکان ہی کے قریب مولوی احمد شاہ قادری الجعفری رہا کرتے تھے۔ اور مسجد میں شاہ غلام رسول موجود تھے جن کی خدمت میں نظیر وقت کا بڑا حصہ گزارتے تھے۔ ذکر و فکر، تسبیح و مصلی سے کام رہا ہو یا نہ رہا ہو، مگر شیخ کی صحبت میں مضامینِ تصوف اور حیلہ صوفیانہ صفات سے متصف ہو جانا خارج از قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر ان دو عناصر کے علاوہ ان کی تشکیلِ فکر میں اس تہذیب و تمدن، معیشت اور معاشرت، مشاغلِ زندگی اور ضروریاتِ انسانی کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے جو گرد و پیش عالمِ محسوسات میں بکھری ہوئی تھیں۔ نظیر کے کلام کا وہ حصہ جسے مادی زاویۂ نگاہ کا بھی نام دیا جا سکتا ہے اور جو خوش باش زندگی گزارنے اور جسم کے تقاضوں کو اہمیت دینے سے عبارت ہے ہماری سرزمین کی قدیم ترین ارضی تہذیب سے پھوٹتا ہے جس نے "تن کی دنیا" اور زمین کی خوشبو کو تمام تر اہمیت بخشی ہے۔ مگر ان کے کلام کا وہ حصہ جس میں تصوف اور دنیا کی بے ثباتی پر زور دیا گیا ہے ان آوارہ خرام قبائل کے مخصوص میلانات کا آئینہ دار ہے جو تاریخ کی صبح کاذب سے ہمارے ملک کی جانب سفر کرتے رہے اور یہاں کی زندگی تہذیب اور معاشرت کا ایک حصہ بن گئے اس دھارے نے ایک

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ایم کوٹھیاوی راہی
قاضی پورخورد ۔ گورکھپور

پرندے

رات کے سفر میں ہم
ساتھ ہیں ستاروں کے
کیا حسین نقشے ہیں
نقرئی غباروں کے!

نقرئی غباروں کا
اک طویل افسانہ
ہے کنول کے ہونٹوں پر
جھیل جھیل افسانہ

ہم نئی امنگوں کی
زندگی کا حاصل تھے
گاہ صبح کے دشمن
گاہ شب کے قاتل تھے

گو کہ ہم اکیلے تھے
وادیٔ عزیزاں میں
ساعتوں کے جگنو تھے
ثبت جیب و داماں میں

سنگسار ہونا تھا
شمع سر بریدہ کو
کوچۂ ملامت کی
اک ہوس رسیدہ کو!

راس جب نہیں آیا
آسماں، چلے آئے
مجمعٔ فقیہاں میں
ناگہاں چلے آئے

کیوں گناہ کا الزام
اپنے سر لیا ہم نے
دل کی سادہ لوحی کا
امتحاں دیا ہم نے!

ٹھیک ہے خطاکارو
سنگ اچھالتے جاؤ
شیشۂ غباراں میں
ہم کو ڈھالتے جاؤ

پیکرِ تجلی ہیں
روح کے مکیں ہوں گے
کہکشاں کی باہوں سے
ہم جدا نہیں ہوں گے

عدل کے مناروں پر
خوف کے پرندے ہیں
پیار کے شوالوں میں
پاپ کے درندے ہیں

ہم نے سب کو دیکھا ہے
سب کو ہے دکھایا بھی
سب نے یاد رکھا ہے
سب نے ہے بھلایا بھی

تا سحر یہی منظر
جھیل جھیل پاؤ گے
ہم سے دوستی کرکے
خود بھی ڈوب جاؤ گے

رات کے سفر میں ہم
ساتھ ہیں ستاروں کے
کیا حسین نقشے ہیں
نقرئی غباروں کے

شمامہ بلال
۱۰۱ ۔ ذاکر نگر جامعہ نگر
نئی دلی ۔ ۲۵

کرشن چندر اور ان کا فن

عرصے کی بات ہے کہ ناگپور میں بھارت ساہتیہ پریشد کا اجلاس ہوا تھا اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو، منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالحق اور اختر رائے پوری وغیرہ کے دستخط سے ایک اعلانیہ جاری ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ زندگی مکمل وحدت ہے۔ اسے ادب، فلسفہ اور سیاسیات وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ادب زندگی کا آئینہ ہی نہیں بلکہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہے، وہ کیا کہے، کس سے کہے اور کس طریقے سے کہے ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر اور تبدیل کی کہانی ہے۔ زندہ اور سچا ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے۔ اور تمام انسانوں کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر ٹیگور نے اپنے پیغام میں لکھا تھا "ہمارا ملک آج ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام و نشان نہیں ہے ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم و اندوہ کو مٹانا ہے۔ اور از سرِ نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیئے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے بیداری اور جوش کے گیت گائے۔ ہر ایک انسان کو امید اور مسرت کا پیغام پہنچائے۔ کسی کو ناامید نہ ہونے دے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو ناکام و نامراد ہے"۔

اصلاح اور انقلاب کی یہ آواز بلند کرنے والے آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے پیغام نے بے شمار نوجوانوں کی زندگی بدل دی اور ادب کے دھارے کا رخ بدل گیا۔ اب ادیب اپنے ناظرین کو طلسمات کی سیر نہیں کراتا، نہ ہوش ربا داستانیں سناتا ہے، نہ نشاط آفریں اور خواب آور افسانے پڑھاتا ہے۔ بلکہ زندگی کے حقائق ان کے سامنے رکھتا ہے۔ اور مصیبت کی ماری انسانیت کو غم و اندوہ سے نجات دلانے کی دعوت دیتا ہے۔

ہمارے ان الفاظ سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نئے شاعروں اور ادیبوں نے شعر و ادب کو چھوڑ کر واعظ و ناصح کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اب بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کرنے میں ندرتِ بیان اور رعنائی خیال سے کام لیا جاتا ہے۔ اور نئے ادیب اپنے ناول، افسانے اور شعری مجموعے پیش کرنے میں ادبی نزاکتوں اور فن کی باریکیوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اور ان کے شہ پارے قدیم ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے اثر و نفوذ اور سوز و گداز کے اعتبار سے کہیں زیادہ پر اثر ہیں۔

کرشن چندر ان نئے ادیبوں میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے وہ مختصر افسانے لکھنے لگے تھے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی عکاسی بھی ہوتی تھی زبان اور بیان کا لطف بھی ہوتا تھا اور ایک نیا زاویۂ نظر اور دلکش اسلوبِ تحریر بھی ہوتا تھا۔ ان کے چند افسانے ہی پڑھ کر لوگوں کو تقریباً تیس پینتیس ۳۵ برس پہلے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ آگے چل کر یہ اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔ انھوں نے شروع میں کچھ

طنزیہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن کا مجموعہ "ہوائی قلعہ" کے نام سے ۳۰۔۳۲ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ افسانے بھی لکھتے رہے اور پھر متعدد ناول بھی لکھے۔ اور ان کی ہر کتاب نے ان کی شہرت میں اضافہ کیا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی کتاب "اَن داتا" ہے یہ ان کے چند طویل افسانوں یا ناولچوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں علاحدگی کے باوجود ایک طرح کا ربط بھی پایا جاتا ہے۔

پہلا افسانہ یا ناولچہ کا عنوان "ان داتا" ہے جو تین ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے "وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے"۔ دوسرے باب کا عنوان ہے "وہ آدمی جو مر چکا ہے" اور تیسرے باب کی سرخی ہے "وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے"۔ دوسرے ناولچہ کا نام ہے "دو بیٹی" تیسرے کا "بھگت رام" اور چوتھے کا "شمع کے سامنے"۔

"ان داتا" کے شروع میں ڈاکٹر اقبال کا ایک مصرعہ 'بال جبرئیل' سے نقل کیا گیا ہے۔

"تیری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور"

یہ ناولچہ بنگال کے اس قحط سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے جو ۱۹۴۳ء میں بڑے ہولناک طور پر سارے بنگال میں ہوا تھا۔ اور جس میں لاکھوں آدمی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دوسری عالمگیر جنگ دنیا میں چھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس تھے اور دوسری طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان تھے۔ جرمن فوجیں سارے مغربی یورپ کو روند کر انگلستان پر بمباری کر رہی تھیں اور مشرقی یورپ میں روس کی حدود میں بھی ان کی فوجیں داخل ہو رہی تھیں۔ شمالی افریقہ میں برطانوی فوجیں اطالوی لشکر کے مقابل تھیں۔ مسولینی کے بڑے دعوے تھے لیکن جنگ کے میدان میں مسولینی کی ساری لن ترانیاں ہوا ہو گئیں۔ اور جنگ کے پہلے دور میں اٹلی کی شوکت و عظمت کا جنازہ نکل گیا۔ اور اس کی نعش جرمن کو اپنے کندھوں پر اٹھانی پڑی۔ شمالی افریقہ کے محاذ کو سنبھالنے کے لیے جرمنوں کو اپنے مشہور جرنیل رومیل کو بھیجنا پڑا۔ جس کے حیرت انگیز کارناموں نے اسے "صحرا کے جادوگر" کا نام دیا۔ کئی بار وہ برطانوی فوجوں کو ڈھکیلتا ہوا مصر کے حدود میں داخل ہو گیا۔ بعض اوقات تو خیال ہوتا تھا کہ چند ہی دن میں اسکندریہ اور قاہرہ جرمن ہوا بازوں کی زد میں آ جائیں گے۔ لیکن اٹلی کا جنازہ اتنا وزنی تھا کہ رومیل جیسے مضبوط جرنیل کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ اور جیتی ہوئی بازی ہار جانی پڑی۔

جاپان نے بغیر اعلان جنگ "پرل ہاربر" پر حملہ کر کے امریکن بیڑے کو تہس نہس کر دیا پھر بے روک ٹوک آندھی کی طرح آگے بڑھتا گیا۔ ملایا، انڈونیشیا، انڈو چائنا اور برما کا تختہ الٹ کر اب ہندوستان کی سرحد پر دستک دے رہا تھا۔ آسام میں اس کے ہراول دستے داخل ہو چکے تھے اور کلکتے میں اس کے بمبار پہنچنے لگے تھے۔ کبھی کبھی بہار اور یو پی کے شہروں تک خطرے کے سائرن بج جاتے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے ایک نیا رُخ اختیار کیا تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے آزادی کی آخری لڑائی شروع کر دی تھی۔ "کوئٹ انڈیا" تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور بڑے بڑے لیڈر جیلوں کے اندر تھے۔ ورکنگ کمیٹی پوری کی پوری احمد نگر کے قلعہ میں بند تھی۔ جو لوگ کسی طرح پولیس کی گرفت سے بچ سکے وہ انڈر گراؤنڈ ہو کر کچھ نہ کچھ تحریک آزادی کے چراغ میں تیل پہنچا رہے تھے۔ اور بعض اوقات ان کے کارنامے برطانی سامراج کو سراسیمہ کر دیتے تھے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ روس پر جرمن حملہ تیز ہو گیا تھا۔ اور ماسکو لینن گراڈ اور اسٹالن گراڈ جرمن فوجوں کے محاصرے میں تھے۔ روسی بڑی بے جگری کے ساتھ ایک ایک انچ زمین کی مدافعت کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ روس اگرچہ اصولی طور پر امریکی اور برطانی سامراج کے خلاف تھا لیکن اس ناگہانی جرمن حملے نے اسے بھی چار و ناچار اتحادیوں کی صف میں شامل کر دیا۔ اس کا اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی جو آزادی کی تحریک میں کانگریس کے ساتھ دوش بدوش کام کر رہی تھی اب وہ روس کی ہمدردی میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی ہوا خواہ ہو گئی۔ اور پیوپل وار (People War) کہہ کر اتحادیوں کی حمایت

میں کام شروع کر دیا۔ یہ واقعات کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس لیے لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ وہ پس منظر سامنے آجائے جس کو پیش نظر رکھ کر کرشن چندر نے "موبی" اور "ان داتا" لکھے ہیں (ان داتا کے عنوان باب بنگال کے قحط سے متعلق ہیں اور موبی کا تعلق دوسری عالمگیر جنگ سے ہے۔ "ان داتا" کے پہلے باب یعنی "وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے" میں ایک غیر ملکی سفیر کے وہ خطوط ہیں جو اس نے کلکتہ سے اپنے افسر اعلیٰ کو لکھے ہیں۔ یہ خطوط فرضی ہیں لیکن ان فرضی خطوط [illegible] اس وقت کے ہندستانی اسماج، ہندستانی لیڈروں اور ہندستانی صوبوں کی حکومتوں کا ایک عجیب انداز میں پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ بنگال میں تاریخ کا سب سے بڑا قحط پڑا ہوا ہے۔ لوگ دانے دانے کو محتاج ہیں۔ ہزاروں آدمی سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ لیکن اس عام مصیبت میں بھی لوگ اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں ہیں۔ سرمایہ دار ضروریات زندگی پر قابض ہیں غلے کے ذخیرے زمین دوز ہو چکے ہیں۔ منھ مانگے دام دینے والوں کو نہ صرف بقدر ضرورت اناج مل رہا ہے بلکہ وہ اللّے تللّے سے خرچ کر رہے ہیں۔ شاندار دعوتیں ہو رہی ہیں۔ جن میں انواع واقسام کے کھانے کھائے جا رہے ہیں۔ لیکن غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ دیہاتوں میں جب گھاس پھوس بھی کھانے کو نہیں رہی تو لوگ گھبرا کر صوبہ کے صدر مقام کلکتہ کی طرف دوڑتے ہیں کہ شاید وہاں کچھ زندگی کی آس بندھے کلکتہ حکومت کا بھی مرکز ہے اور چوٹی کے سرمایہ دار بھی وہاں رہ رہے ہیں۔ غیر ملکی امداد کے مواقع بھی ہیں لیکن ان غریبوں کو یہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ امیروں اور وزیروں کے دروازوں پر ان غریبوں کی نعشیں پڑی ہیں مگر پھر بھی لوگوں کے دلوں میں کوئی ہلچل نہیں پیدا ہوتی۔ اور عیش و تفریح کے سارے کاروبار جاری ہیں۔ مدتوں یہی فیصلہ نہیں ہوتا کہ قحط ہے بھی یا نہیں۔ اخبارات کی صدائیں بھی ان کے کان نہیں کھولتیں۔ اور بنگال اسمبلی یہ تسلیم نہیں کرتی کہ بنگال قحط زدہ علاقہ ہے لوگ چند سکوں پر اپنی اولاد فروخت کر رہے ہیں۔ بردہ فروشی کا بازار عروج پر ہے۔ برطانوی حکومت اور اس کے نمائندے ہندستان کے مطالبۂ آزادی سے ناراض ہیں۔ اسی (قونصل) سفیر کے خطوط میں اس مصیبت پر طنز کے ایسے تیر ونشتر ہیں جو دلوں کو چھید ڈالتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سفیر کو حالات کا صحیح اندازہ ہے کبھی کبھی اس کے ضمیر میں کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کی بربادی پر کڑھتا بھی ہے لیکن پھر بھی ہندستانیوں کے ساتھ تحریک آزادی کی وجہ سے جو نفرت ہے اس کی بنا پر ضمیر کی آواز کو دبا کر طنز کے تیر چلاتا ہے ایک جگہ کہتا ہے کہ "میں نے قحط کی اپیل پر کلکتہ کے میئر کو اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا لیکن یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ قحط ہندستان کا اندرونی مسئلہ ہے ہماری حکومت کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی ہم جمہوریت پسند ہیں آپ کی آزادی سلب کرنا نہیں چاہتے ہر ہندوستانی کو جینے یا مرنے کا اختیار ہے" ایک اور جگہ کہتا ہے کہ "ہندستان اور چوہوں کی شرح پیدائش دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور اکثر حالتوں میں ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی جلد پیدا ہوتے ہیں اتنی جلد مر جاتے ہیں۔ بہر حال جب تک چوہے اپنے بل میں رہیں اور دنیا کو پریشان نہ کریں ہمیں ان کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں" ایک موقعہ پر کہتا ہے "اگر امن پسندی کے لیے نوبل پرائز کسی قوم کو مل سکتا ہے تو وہ ہندوستانی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر جاتے ہیں لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے"۔ ہماری خود غرضی اور منافع خوری پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے "خبر آئی ہے کہ مختلف صوبائی حکومتوں نے رعایا میں اناج تقسیم کرنے کی جو اسکیم بنائی ہے اس میں انہوں نے کئی لاکھ روپیہ کا منافع حاصل کیا ہے۔"

"وہ آدمی جو مر چکا ہے" اس میں ایک عیاش راحت پسند سرمایہ دار کا ذکر ہے جو اس مصیبت کے زمانے میں اپنی تفریح سے باز نہیں آتا کبھی کبھی اس کے دل میں اس مصیبت میں قوم کی مدد کرنے کا کچھ خیال آتا ہے تو زندگی کی راحتیں اور لذتیں دل کی آواز کو دبا دیتی ہیں اور اٹھتے قدم رک جاتے ہیں اور رنگ رلیوں میں پھر کھو جاتا ہے یہ شخص آرام طلب عافیت پسند اور عیاش سرمایہ داروں کی نہایت اور قابل نفرت تصویر پیش کرتا ہے۔

"وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے" میں ایک مردے کی زبان

ہے اس قحط کی دلدوز اور جگر سوز داستان بیان کی گئی ہے وہ کیسا دردانگیز سماں تھا جب لوگ دانے دانے کو ترس رہے تھے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ خاوند بیویوں کو مائیں لڑکیوں کو بھائی بہنوں کو فروخت کر رہے تھے۔ اور بے شرم سرمایہ دار اپنے بھائی بہنوں کی خرید و فروخت میں دولت کے ڈھیر جمع کر رہے تھے۔ نہ ان کی آنکھ سے ہمدردی کا ایک قطرہ گرتا تھا نہ ان کے دل میں مدد کا خیال آتا تھا۔ یہ شخص مر گیا لیکن وہ پوچھتا ہے کیا تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں؟ لوگ نئی دنیا کی تعمیر کا اعلان کر رہے ہیں لیکن کیا ان کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی کوئی ہاتھ ہوگا۔" وہ کہتا ہے جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے یہ دنیا بھوکی رہے گی۔ جس طرح ستار کا ایک تار بھی بے آہنگ ہوتا ہے تو سارا نغمہ ہی بے آہنگ بے ربط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی سماج کا حال ہے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے۔"

"موبی" ایک امریکن ہے جو جاپان کے ہندوستان پر حملے کے زمانے میں ہندوستان کی مدافعت کے لیے امریکن فوج کے ساتھ آسام آیا تھا وہ فوجی ہونے کے باوجود اپنے اندر ہمدردی سے بھرا ہوا دل رکھتا ہے۔ امریکی سیاست کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس کی ملاقات یہاں کچھ ہندوستانی فوجیوں سے ہوتی ہے۔ اور ان کے مکالموں میں ہندوستانی افتراق کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں کوئی غیر پنجابی کسی پنجابی کو "پنجابڑا" کہہ کر دل خوش کرتا ہے۔ کہیں مشرقی کو "پُربیہ" کہہ کر مسرور ہوتا ہے۔ کہیں ہندوستانیوں کی زبان سے ہندوستانیوں کی بے غیرتی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر "موبی" کو کسی افغان چوکیدار نے اسٹوڈیو میں جانے سے روکا وہ اسے مارنا چاہتا تھا مگر یہ کہہ کر رک گیا" مجھ سے کہا گیا ہے کبھی کسی ہندوستانی کو چانٹا نہ مارا جائے۔"

پردیز بولا "اچھا ہوا کہ وہ ہندوستانی نہیں افغان ہے۔" "دونوں میں کیا فرق ہے" موبی نے معصومیت سے پوچھا۔ پرویز نے کہا" وہ ہندوستانی ہوتا تو چانٹا کھانے کے بعد دن بھر تمہاری جوتیاں سیدھی کرتا۔ اور شام کو تمہیں سلام کر کے تم سے بخشش کا طالب ہوتا لیکن یہ چوکیدار تو افغان ہے۔ افغانی اور ہندستانی میں یہ فرق ہے کہ افغان کے پاس چھڑی ہوتی ہے اور ہندستان کے پاس سلام۔" موبی نے پوچھا" تم نے اپنے اسٹوڈیو کی حفاظت کے لیے ایک افغان کو کیوں مقرر کر رکھا ہے؟" ہماری قوم کا یہی دستور ہے" پردیز بولا۔ "ہم اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انگریزی گورکھے ہیں اور اپنے اسٹوڈیوز کی حفاظت کے لیے افغانیوں کو۔" "موبی نے کہا" کیا تم اپنے اسٹوڈیو کی حفاظت نہیں کر سکتے "پردیز نے کہا" اگر ایسا کر سکتے تو تمہیں سمندر پار سے یہاں آنے کی دعوت کیوں دیتے۔"

اسی طرح جابجا ہندستان کی اس وقت کی حالت پر تبصرہ ہے۔ ایک جگہ جنگ کے مقصد کا ذکر آ جاتا ہے۔ اور اس موقع پر ایک ہندستانی فوجی خیام کی زبان سے کرشن چندر اپنی پارٹی کی ترجمانی اس طرح کراتے ہیں "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگ نہیں دو سپنوں کی لڑائی ہے۔" موبی کہتا ہے" ہاں ہم اس سپنے کے خلاف لڑ رہے ہیں جو فسطائیت کے دعویدار ہٹلر اور ٹوجو (جاپان) دیکھ رہے ہیں"۔ دوران گفتگو بنگال کے قحط کا ذکر آ جاتا ہے تو موبی کہتا ہے" یہاں کیسے لوگ ہیں۔ جو اپنے سامنے اپنے بھائیوں کو روتے دیکھتے ہیں اور ان کی مدد نہیں کرتے۔ نہ ان کے ہاتھ میں ایک چاول کا دانہ ہوتا ہے نہ آنکھوں میں ایک آنسو۔" آگے چل کر کچھ اور سیاسی اور تاریخی واقعات پر گفتگو ہوتی ہے موبی اپنی قومی ڈپلومیسی کے تحت اکثر خاموش رہتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کوئی ایسا فقرہ کہہ دیتا ہے جس سے خیام بھڑ جاتا ہے اس سلسلہ میں موبی کہتا ہے"آزادی دی نہیں جاتی حاصل کی جاتی ہے" خیام الجھ الجھ پڑتا ہے۔ ایک موقع پر کھیل کا ذکر ہوتا ہے۔ اور خیام باکسنگ وغیرہ پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے" ہندی پہلوانی کے مقابلے میں نہ باکسنگ چلتی ہے نہ جوڈو۔" لیکن موبی نے مسکرا کر کہا۔" مگر تمہارے ملک کے تو کسی کام نہ آئی یہ پہلوانی۔" پھر اس فضا کو بدلنے کے لیے سیر و تفریح کی سوجھتی ہے جھاڑی میں موبی کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا اس موقع پر

ایک آسامی جنگلی لڑکی موہنی کا ایک عجیب منظر سامنے آتا ہے اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنا منھ زخم سے لگا دیا اور سارا زہر چوس کر تھوک دیا۔ لڑکی نے اس کے بعد کلی کی اور کوئی جنگلی بوٹی کھالی تو بی بھی بچ گیا۔ یہاں پہلی بار موبی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ محبت کا کوئی رنگ کوئی مسلک کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کا آخری اور ابدی آدرش ہے۔

جنگ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو بی اور پرکاش کو [illegible] پرجانا پڑا اور دونوں وہاں معرکے میں کام آگئے۔ موبی کی [illegible] کا حال اس کی ماں کے خط سے پردیپ وغیرہ کو معلوم ہوا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں نے موہنی سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور موبی کی جگہ اسے اپنی لڑکی بنا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کو موبی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا: "جس روز موہنی نے میرے ٹخنوں سے زہر چوس لیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا موہنی نے یہ زہر میرے جسم سے نہیں بلکہ میری روح سے چوس کر باہر نکال دیا۔ وہ زہر جو کالے کو گورے سے غریب کو امیر سے اور آدمی کو آدمی سے جدا رکھتا ہے۔ اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا کہ محبت ہر خوبصورت انسانی سماج کے لیے پہلی اور آخری شرط ہے۔ اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی انسانی سماج تا دیر نہیں چل سکتا۔"

تیسرے ناولچہ کا نام "بھگت رام ہے" بھگت رام ایک اکھڑ اور غیر مہذب نوجوان ہے جسے آج کل کی زبان میں گنڈا کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس کے بھائی لالہ کاشی رام اونچے کھتریوں کا نمونہ ہیں۔ منجھلا بھائی بانسی رام سکھ ہو گیا تھا — مذہبی فرق کے علاوہ ان دونوں کا مزاج یکساں تھا۔ دونوں اپنے اپنے دھرموں کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی نظر میں کاشی رام کی بڑی اہمیت تھی۔ ان لوگوں نے انھیں اپنا مکھیا بنا رکھا تھا۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتے تھے مگر اپنا مفاد دیکھ کر۔ کرشن چندر نے اس ایک جملہ میں ان کے کیریکٹر کی تصویر کھینچ دی ہے "گاؤں کا ہر فرد اپنی مصیبت میں چاہے وہ خود لالہ کاشی رام کی پیدا کردہ ہی کیوں نہ ہو، لالہ کاشی رام ہی کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہیں کیا۔" بانسی رام برہمن دھرم کو تیاگ کر سکھ ہو گئے تھے۔ گرودوارہ بھی بنایا تھا گرنتھی بھی لے آئے تھے۔ اپنے مذہب کا پرچار بھی کر رہے تھے۔ مگر مذہب کی حقیقی روح ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ مذہب کے ظاہری رسوم کے ساتھ اختلافی جھگڑے نکل آتے تھے۔ ناول نگار نے ایک سطر میں ان کی دینداری کو بے نقاب کر دیا۔ "لالہ بانسی رام کے سکھ بن جانے سے گاؤں میں جھٹکے اور حلال کا سوال پیدا ہو گیا تھا مسلمانوں اور سکھوں کے لیے تو وہ ایک مذہبی سوال تھا لیکن بھیڑ بکریوں اور مرغے مرغیوں کے لیے زندگی اور موت کا۔"

تیسرا بھائی بھگت رام بظاہر بدمعاش تھا وہ اپنی آوارگی میں بدنام تھا لیکن اس کے اندر ہمت تھی اور جو دل میں آجائے اسے کر گزرنے کی جرأت تھی۔ وہ جو کام کرتا تھا ڈنکے کی چوٹ پر۔ نقیرنی سے شادی کر لی اور اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا۔ لوگوں نے نفرت کا اظہار کیا گاؤں میں بڑی ہلچل مچی مگر بھگت رام نے مسجد کے مینارے پر چڑھ کر اذان بھی دے دی پھر جب بیوی مر گئی تو ایک راجپوت چمارن کو گھر میں بٹھا لیا۔ بھائی اور گاؤں والوں نے اس پر رزق کے دروازے بند کر دیے تو وہ سپیرا بن کر تماشے دکھانے اور جڑی بوٹیاں بیچنے لگا۔ اور آخر میں ناول نگار نے اس کی محبت کا ایسا واقعہ لکھا ہے جس سے ایسا لگتا ہے کہ اس کے سارے پاپ دھو دیے "ندی بڑھی ہوئی تھی بھیڑ کے بچے اس میں بہے چلے جا رہے تھے۔ ان کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ فوراً وہ ندی میں کود گیا اور بھیڑ کے بچوں کو بچانے میں اپنی جان دے دی۔"

کرشن چندر نے آخر میں [illegible] کی زبان سے اپنے تاثرات ادا کیے ہیں۔ چند فقرے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے —
"بھگت رام شاید تم ان بڑے آدمیوں سے بڑے ہو اور بہتر ہو جو رلیں بناتے ہیں اور لوگوں کو بھوکا مرجانے دیتے ہیں

جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور خدا کی مخلوق کو گلیوں میں ننگا پھرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو جو ٹریکٹر، ہوائی جہاز، اسکول، مشین گن، تھیٹر سینما، بنک، یونیورسٹی، سلطنت، تخت طاؤس، اینٹینڈ فلسفہ اور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور آدمی کی نسل کو کائنات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیران و پریشان چھوڑ دیتے ہیں۔"

اس موقع پر مجھے ایک جج کا یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ بدمعاش ڈاکو قاتل جنھیں ہم لمبی لمبی سزائیں دیتے اور جن کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے ہیں وہ دراصل سوسائٹی کے نچلے اور باہمت لوگ ہوتے ہیں جن میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے مگر غلط سماج کے ہاتھوں وہ غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں اگر کسی طرح ان کا رخ موڑ دیا جائے تو ایک گنڈہ (غنڈہ) ہزاروں پر امن شہریوں سے بڑھ کر سماج کی خدمت کر سکتا ہے۔

آخری افسانہ "شمع کے سامنے" ہے۔ اس میں ایک خانہ بدوش لڑکی شمع اس کے قبیلے کے لوگوں اور ایک گاؤں کے زمیندار لڑکے کا کیریکٹر دکھایا گیا ہے۔ اس میں بھی کرشن چندر نے اجڈ وحشیوں کے کیریکٹر کو مہذب شہریوں سے بلند و بالا دکھایا ہے۔ ان کی زندگی سادگی سچائی اور خدمت کی لازوال تصویر ہوتی ہے۔ لیکن مہذب شہری نیت کے کھوٹے۔ ارادہ کے کچے طبیعت کے کمزور اور پست ہمت ہوتے ہیں۔ ان کے اندر راحت طلبی عافیت پسندی اور عیش کوشی ہوتی ہے۔ نہ فیصلے کی قوت ہوتی ہے نہ زندگی کی راہ پر بیباکانہ بڑھنے کی جرأت۔ شمع نے کیا صحیح تبصرہ کیا ہے زمیندار کے لڑکے شاہ زماں پر:۔

"میں نے تمھیں غلط سمجھا تم وہ آدمی نہیں ہو۔" شاہ زماں پوچھتا ہے "کون سا آدمی" وہ کہتی ہے۔ "جانے دو تم نہیں سمجھو گے۔"

ترقی پسند تحریک سے پہلے ادب میں کسی بھی بات کو طول دے کر لطیف پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن بقول اقبال

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ترقی پسند تحریک کے بعد ادب کا دھارا بدل گیا جس کا عکس

(باقی ص ۲۸ پر)

قطعات

غزل

(ذو وزنین)

کوثر جائسی،
کرنیل گنج۔ کانپور

جوہرِ خوں سے جو تقدیرِ چمن لکھتے رہے
برق کی رَو کو امیدوں کی کرن لکھتے رہے

حسن تھا سادہ مزاج اس کو مگر اہلِ ہوس
فتنہ گر لکھتے رہے، وعدہ شکن لکھتے رہے

قد و گیسو ہی کے سائے میں اماں جن کو ملی
قد و گیسو کو وہی دار و رسن لکھتے رہے

حال سے اوروں کے نہ رکھتے تھے سماہی لگاؤ
خط مگر اپنے بزرگانِ وطن لکھتے رہے

قتلِ الفاظ و معانی کا تسلسل تھا جہاں
چند دیوانے نوامیسِ سخن لکھتے رہے

صاحبِ نقد و نظر سمجھے انھیں اہلِ ادب
خار و خس کو جو گل و سرو سمن لکھتے رہے

حسنِ فطرت کی پرستش کا ہمیں ہے وقار
روندے ذرّوں کو بھی پروینِ پرن لکھتے رہے

تجھ سے اے روحِ وطن کتنی عقیدت ہے ہمیں
اپنے آنسو کو دلِ گنگ و جمن لکھتے رہے

شعلے برسائے انھیں ہونٹوں نے ہنگامِ کلام
ہم جنھیں برگِ گل و لعلِ یمن لکھتے رہے

زندہ دل کتنے تھے وہ شعلہ نوا اہلِ قلم
عہدِ پیری میں بھی جو عمر کو دلہن لکھتے رہے

تیتے موسم میں بھی کوثر تھا وہی عطرِ نفس
ہم سراپائے غزالانِ ختن لکھتے رہے

ن وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نیسار (سیناپور) تشریف لائیں تو عوام نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔
یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

وزیر اطلاعات شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ اقلیتی کمیشن کے صدر شری ایچ۔ ایم بیگ سے محوگفتگو ہیں۔

نائب وزیر شری ظفر علی نقوی کی رہائش گاہ پر منعقدہ افطار پارٹی کا ایک منظر۔ تصویر میں وزیر اعلا
شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ساتھ شری نقوی اور لکھنؤ کے مشہور و معروف 'نامی پریس' کے مالک
خواجہ انور الدین نظر آرہے ہیں۔

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ لکھنؤ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

مرادآباد کا ایک کاریگر پیتل پر نقاشی کرتے ہوئے۔

بھدوہی (وارانسی) میں قالین سازی کا ایک مرکز۔

مصنوعی کھاد تیار کرنے کا کارخانہ (گورکھپور)

پینے کے پانی کی پائپ لائن (چترکوٹ باندہ)

دوائیں تیار کرنے کا کارخانہ (رشی کیش، سہارنپور)

گورنر اتر پردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ
"ون مہوتسو" کی تقریب کے سلسلے میں راج
بھون کے احاطے میں پودا لگاتے ہوئے۔
تصویر میں نائب وزیر شری ظفر علی نقوی بھی
نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ
چنہٹ (ضلع لکھنؤ) کے قریب
ایک گاؤں میں پودا لگاتے ہوئے۔

صابر ندیم
۲۹/۷ جی نارتھ ٹی ٹی نگر
بھوپال ۳

(ڈرامہ)

گھنگرو اور سسکیاں

صہبا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی کوئی گیت گنگنا رہی ہے، گیت کے درمیان کبھی کبھی اس کی شگفتہ ہنسی بھی سنائی دے جاتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایرپورٹ کے اناؤنسر کی طرح اس انداز سے بولنے لگتی ہے جیسے کچھ لکھنے میں مصروف ہوگئی ہو۔

صہبا: YOUR ATTENTION PLEASE -- YOUR ATTEN--TION PLEASE بمبئی سے آنے والا طیارہ موسم کی خرابی کی وجہ سے پانچ بج کر پندرہ منٹ کے بجائے پونے چھ بجے (بیچ میں بڑبڑا کر) دھت تیرے کی، یہ پونے چھ تو جچتا ہی نہیں (کچھ سوچنے کے انداز میں) پھر کیا ہونا چاہیے۔ (جیسے یاد آگیا ہو) ہاں، پانچ بج کر پندرہ منٹ کے بجائے پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر لینڈ کرے گا۔ تھینک یو! (ہنستی ہے) بہت خوب، اب میری ہیروئن اپنے بمبئی سے آنے والے ہیرو کا ایرپورٹ پر کھڑی انتظار کرے گی اور پھر... (ہنس پڑتی ہے) یہ افسانہ ضرور مقبول ہوگا۔ بہت مقبول ہوگا۔ (گنگنانے میں مصروف ہو جاتی ہے)۔ (دور کسی جیپ کے رکنے کی آواز ——— کچھ دیر بعد دروازہ پر دستک ہوتی ہے) (صہبا گنگنانا بند کر کے ایک دم جھنجھلا پڑتی ہے۔)

صہبا: ستیاناس! میں جب بھی کسی افسانے کا پلاٹ تیار کرنے بیٹھتی ہوں، کمبخت کوئی نہ کوئی آمرتا ہے (غصہ سے) ارے کون ہے۔؟ (دروازہ پر دستک تیز ہو جاتی ہے) ارے آتی ہوں بابا، کیوں دروازہ توڑے ڈال رہے ہو۔ (میز پر زور سے کاغذات وغیرہ پٹکتے ہوئے) چل بھیا افسانے تیری قسمت میں تو ادھورا رہنا ہی لکھا ہے، اسی میز پر پڑا رہ کر اپنی قسمت کو رو دے جا اور انجام تک پہنچنے کا انتظار کر۔ (جیسے گردن جھٹکی ہو) اوں، بھائی جان کے علاوہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ جناب عالی رات ایک بجے مستی مار کر کلب سے لوٹ رہے ہیں، بس ایک میں ہوں بیچاری صہبا اس گھر میں گھٹنے کے لیے (زور سے) ارے کیا بھائی جان ہی ہو۔؟

کامران: (بھاری آواز میں) ہاں میں ہی ہوں صہبا، جلدی دروازہ کھولو۔

صہبا: (غصہ سے) کھول رہی ہوں بابا، دروازہ مت پیٹو، ٹوٹ جائے گا۔

(دروازہ کھلنے کی آواز ——— دروازہ کھلتے ہی

ساغر شرابی حالت میں اندر داخل ہوتا ہے)

ساغر : مائی سیلف خدا... (زور سے) مائی سیلف خدا

صہبا : (سہم کر چیخ پڑتی ہے) بھائی جان -!

ساغر : (غصہ سے) مائی سیلف خدا، تم کون ہو؟ (چیخ کر) کون ہو تم -؟ (صہبا کی سہمی ہوئی چیخ)

کامران : (پریشان آواز میں) یہ میری چھوٹی بہن ہے ساغر چھوڑ دو اسے۔

ساغر : (چیخ کر) آئی ایم ناٹ ساغر — مائی سیلف خدا (کھانستا ہوا گر پڑتا ہے)

صہبا : (ڈرنے انداز میں) یہ ... یہ گر پڑے بھائی جان۔

کامران : (پریشان ہو کر) ہاں صہبا — اوہ، یہ تو بیہوش ہو گیا، صہبا پلیز اسے میرے کمرے تک اٹھوا کے لے چلو، صہبا پلیز ہیلپ می۔

صہبا : (گھبرائی آواز میں) ہاں بھائی جان چلیے۔

(قدموں کی آہٹ دھیرے دھیرے فیڈ آؤٹ ہوتی ہے اور اس کے ساتھ دیوار گھڑی کی آواز دھیرے دھیرے ابھرتی ہے۔ کچھ لمحے خاموشی رہتی ہے صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے)

کامران : (پیار سے) صہبا -!

صہبا : (چونک کر ڈری آواز میں) ج .. ج .. جی!

ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ میرا دوست ہے۔

صہبا : (نفرت سے) یہ شرابی -؟

کامران : (ہنس کر) صہبا تم ایک افسانہ نگار ہو نہ؟

صہبا : جی۔

کامران : تم نے اپنے افسانے میں کئی کرداروں کو پڑھا ہوگا۔

صہبا : جی۔

کامران : اچھے کرداروں کو بھی، بُرے کرداروں کو بھی۔

صہبا : جی۔

کامران : کردار، کردار ہوتا ہے صہبا؟ اچھا بھی، بُرا بھی - کیوں ہوتا ہے اچھا بُرا — ؟ ...... یہی پیش کرنا ایک اچھے افسانہ نگار کا فن ہے۔

صہبا : (بھولے پن سے) میں سمجھی نہیں۔

کامران : (ہنس کر) میں سمجھتا ہوں، تم ایک افسانہ لکھنے کے لیے سماج کے ماحول میں گھوم آتی ہو گی، وہاں کئی کرداروں میں کئی کہانیاں نظر آتی ہوں گی۔

صہبا : جی۔

کامران : تم ان کئی کرداروں کو اپنے ذہن میں بسا کر واپس لوٹ آتی ہو گی - ان کئی کرداروں کے جال سے تم ایک نیا افسانہ تعمیر کرتی ہو گی - ایک بہروپ اپنے الفاظ میں باندھ کر سماج کو بتاتی ہو گی کہ یہ وہ نہیں جو تم سمجھتے آ رہے ہو بلکہ یہ وہ ہے جو تم سمجھ نہیں پائے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بس انہی کرداروں کی طرح اس کردار کو سڑک سے اٹھا کر یہاں لے آیا ہوں صہبا، اس سے نفرت مت کرو (ساغر کی چیخ سنائی دیتی ہے، شیشہ ٹوٹنے کی آواز)

ساغر : (چیخ کر) نہیں -! (مسلسل کراہتا ہے)

صہبا : (کانپ کر) وہ پلنگ سے نیچے گر گئے بھائی جان!

کامران : (گھبرا کر) اف! میرے خدا۔

ساغر : (کراہ کر) موت ہو تم ... یہ سماج موت ہے)

کامران : کیا ہوا ساغر۔

ساغر: (بڑبڑاتے ہوئے) سلمیٰ ... سلمیٰ (چیخ پڑتا ہے) سلمیٰ (کھانستا ہے)

کامران: کسے پکار رہے ہو ساغر۔؟

ساغر: (ڈری آواز میں) تم سب موت ہو (چیخ پڑتا ہے) یہ سارا جہاں موت ہے .... سارا جہاں موت ہے (کھانستا ہے)

صہبا: لگتا ہے ان کے سینے میں بہت درد ہے بھائی جان، آپ کسی ڈاکٹر کو بلا لیجیے نا۔

کامران: ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں، تم اس کے پاس رہو۔ (جاتا ہے) اس کے پاس سے ہٹنا مت صہبا۔ (ٹیلی فون پر نمبر ڈائل کرنے کی آواز)

کامران: (فون پر) ہلو۔ جی۔ آپ کون بول رہے ہیں؟ ڈاکٹر مسز ڈیسوزا، دیکھیے ڈاکٹر مسز ڈیسوزا دیکھیے ڈاکٹر، میرے گھر میں ایک مریض بہت سیریس کنڈیشن میں، (گھبرا کر) سنیے (جھنجھلا کر) اف! فون رکھ دیا۔

(پھر نمبر ڈائل کرتا ہے) ... ہلو۔ کون ڈاکٹر رمن؟ رمن صاحب میں انکم ٹیکس انسپکٹر کامران بول رہا ہوں، میرے گھر ایک مریض بہت سیریس کنڈیشن میں ہے، پلیز ڈاکٹر آپ جلدی آجایئے۔

(ریسیور رکھ دیتا ہے، صہبا کی ڈری ڈری چیخ سنائی دیتی ہے)

صہبا: (روتے ہوئے) بھائی جان۔ بھائی جان جلدی آیئے۔

کامران: (دور سے گھبرا کر) کیا ہوا صہبا (قریب آکر) صہبا کیا ہوا۔؟ (چونک) ارے یہ خون کہاں سے آیا تمھارے کپڑوں پر؟

صہبا: ابھی انھوں نے خون کی الٹی کی تھی اور بیہوش ہو گئے۔

کامران: (پریشان ہو کر) اف! میرے خدا، یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔

صہبا: آپ نے ڈاکٹر کو فون کیا بھائی جان۔؟

کامران: ہاں ڈاکٹر رمن کو کیا تھا، وہ آنے ہی والے ہوں گے۔

(وقفہ)

(دور جیپ رکنے کی آواز۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

کامران: شاید ڈاکٹر رمن آگئے۔

صہبا: ٹھہریے، میں دیکھتی ہوں،

کامران: نہیں تم یہیں رکو، میں دیکھتا ہوں۔

صہبا: جی، بہت اچھا۔

(قدموں کی آہٹ فیڈ آؤٹ۔ دروازہ کھولنے کی آواز)

ڈاکٹر رمن: مریض کہاں ہے۔؟

کامران: جی اندر کمرے میں ہے! آیئے

ڈاکٹر رمن: چلیے۔

(قدموں کی آہٹ — (وقفہ)

کامران: آیئے ڈاکٹر — یہ ہے مریض۔

ڈاکٹر رمن: اوہ! یہ بستر پر خون وغیرہ کیسا پڑا ہے۔؟

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خون کی قے کی تھی ڈاکٹر۔

ڈاکٹر رمن: اوہ! (وقفہ) کب سے بے ہوش ہیں یہ۔؟

کامران: کوئی تین منٹ سے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر رمن: حالت کب سے خراب ہے ان کی۔؟

کامران: بچپن سے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر رمن: (چونک کر) جی۔؟

کامران: جی ہاں ڈاکٹر صاحب، ایک لمبی کہانی جڑی

ہوئی ہے، اس کے ساتھ ابھی تو صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ میرا دوست ہے ۔۔۔۔۔
۔۔۔ اور میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے ۔ بچپن سے آج تک صرف رنج و غم ہی سمیٹے ہیں اس نے ۔ میں انھیں ایک دوست کی شادی میں چھوڑتا ہوا کلب چلا گیا تھا، کلب سے واپس لوٹ رہا تھا تو دیکھا یہ سڑک پر پڑا بری طرح بڑبڑا رہا ہے ۔ "مائی سیلف خدا ۔۔۔ الاؤ کی طرح اس کا جسم بخار سے جل رہا تھا ڈاکٹر ۔

ڈاکٹر رمن: ہوں اس سے پہلے بھی کبھی یہ اتنے بیمار ہوئے تھے ؟

کامران: ہاں ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ بیمار تو یہ اکثر ہی رہتا ہے لیکن اتنی خراب حالت اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی، ہاں جب کبھی بھی اس کا ذہن پریشان ہوا اٹھتا تھا تو یہ ناسکوں کی طرح خدا کو برا بھلا کہنے لگتا تھا اور مائی سیلف خدا، مائی سیلف خدا بڑبڑانے لگتا تھا ڈاکٹر ۔

ڈاکٹر رمن: اوہ! دیکھئے میں انھیں ابھی دوا انجکشن دے رہا ہوں یہ کچھ دوائیں وغیرہ میں نے لکھ دی ہیں انھیں آپ بازار سے منگا لیجیے گا ۔

کامران: ڈاکٹر صاحب کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟

ڈاکٹر رمن: مجھے ایسا لگتا ہے مسٹر کامران کہ انھیں ٹی بی شروع ہو چکی ہے ۔

کامران: (تڑپ کر) ڈاکٹر!!

ڈاکٹر رمن: نو مائی ڈیئر، گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ٹی بی کا علاج ہمارے ملک میں بخوبی کر لیا جاتا ہے، لیکن مسٹر کامران، ٹی بی کے علاج کے لیے دواؤں کے ساتھ پیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، آپ انھیں جتنا زیادہ ہو سکے پیار دیجیے، پیار ایک ایسی دوا ہے مسٹر کامران جس سے بڑے سے بڑا روگ ٹھیک کر لیا جاتا ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ جہاں پیار ہے وہاں کوئی روگ نہیں اور جہاں پیار نہیں وہاں سینکڑوں روگ ہیں ۔

کامران: ہاں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر رمن: دیکھیے، ویسے تو میں یہاں روز آتا رہوں گا اگر ابھی بیچ میں ان کو کوئی شکایت پیش آئے تو مجھے فون کر لیجیے گا ۔

کامران: جی بہتر ہے ۔

ڈاکٹر رمن: اچھا میں چلتا ہوں ۔

کامران: اچھا ڈاکٹر صاحب ۔ (قدموں کی آہٹ فیڈ آؤٹ ہوتی ہے)

—CHANGE OVER—

(پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی ہے)

صہبا: (دروازہ پر دستک دے کر) ساغر صاحب! کیا میں اندر آسکتی ہوں ۔؟

ساغر: (چونک کر) آں! کون صہبا؟ آیئے آیئے ۔

صہبا: (قریب آ کر) نہیں نہیں آپ اٹھیے مت ۔ لیٹے رہیے ۔

ساغر: (کراہ کر) تھوڑی دیر کے لیے تو بیٹھ جانے دیا کیجیے ۔

صہبا: آج پورے آٹھ دن کے بعد آپ کے چہرے پر رونق آئی ہے، بس کچھ دن اور آرام کر لیں گے تو پوری طرح کھل جائیں گے آپ ۔

ساغر: آپ لوگوں کی عنایت ہے جو ایک مردے میں جان پھونک رہے ہیں ۔

صہبا: عنایت نہیں ساغر صاحب، یہ تو ایک فرض ہے ایک انسان کا دوسرے انسان کے لیے ۔ جسے ہم نے قبول کیا ہے ۔

ساغر: (آہ بھر کر) کاش اس قرض کو پہلے کوئی قبول کر سکتا ہے۔ خیر چھوڑیے (ہنس کر) لگتا ہے گلاب بہت پسند ہے آپ کو۔؟

صہبا: (ہنس کر) کیسے جانا آپ نے۔؟

ساغر: آپ کے بالوں میں جو لگا ہے۔

صہبا: ہاں صاحب، پسند ہی ہے۔

ساغر: کیوں پسند ہے۔؟

صہبا: (سنجیدہ ہو کر) اس لیے کہ یہ غریب کانٹوں میں کھلتا ہے، پھر بھی مسکراتا رہتا ہے۔

ساغر: کانٹوں میں رہنا پسند ہے آپ کو؟

صہبا: بہت زیادہ!!

ساغر: (حیرت سے) کیوں۔؟

صہبا: اس لیے کہ کانٹوں سے تڑپ ملتی ہے۔

ساغر: اور گلاب سے۔؟

صہبا: مسکراہٹ۔

ساغر: اور دونوں سے۔

صہبا: تڑپ کر مسکرانا اور مسکرا کر تڑپنا، لیکن فریاد نہ کرنا، زیادہ اکتاہٹ ہے اور اکتاہٹ موت۔

ساغر: (ہنس کر) آپ کوئی رائٹر وغیرہ تو نہیں ہیں۔؟

صہبا: جی ہاں۔ ہوں تو، کبھی کبھی کوئی افسانہ وغیرہ لکھ لیا کرتی ہوں۔

ساغر: کبھی کبھی کیوں صاحب۔؟

صہبا: (قہقہہ لگا کر) افسانہ لکھنا کوئی شراب کا گھونٹ نہیں جو غٹ سے گلے میں اتار لیا جائے، اس کے لیے کہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تھیم کی ضرورت ہوتی ہے، تھیم اور کہانی سوچنے کے لیے وقت خرچ ہوتا ہے جناب۔ (ہنستی ہے)

ساغر: (قہقہہ لگاتا ہے)

صہبا: (چونک کر) میں پاگل ہوں کیا۔؟

ساغر: (ہنستے ہوئے) نہیں تو۔

صہبا: پھر اس طرح میری بات پر ہنسنے کا مطلب۔؟

ساغر: (ہنسی روک کر) آپ بات ہی ایسی کر رہی ہیں، آپ کا کہنا ہے کہ افسانہ کے لیے سوچنا پڑتا ہے، موڈ بنانا پڑتا ہے، اس کا مطلب ہوا آپ اپنے افسانے صرف تصور پر تعمیر کرتی ہیں۔ حقیقت کچھ نہیں ہوتی ان میں۔

صہبا: کیوں؟ تصور پر تعمیر افسانہ، افسانہ نہیں ہوتا کیا۔؟

ساغر: یہ میں نے کب کہا میرا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ، صرف تصور پر مبنی خیالات لوگوں کو راہ کم گمراہی زیادہ دیتے ہیں اور حقیقت پر مبنی خیالات میں ایک راہ ہوتی ہے بڑھنے کے لیے ایک راہ ہوتی ہے چھوڑنے کے لیے، بڑھنے کی راہ جس میں انجام ہوتا ہے فلاح کا اور چھوڑنے کی راہ جس میں طوفان ہوتا ہے ہلاکت کا۔

صہبا: (بھولے پن سے) حقیقت والے افسانوں کے لیے بھی تو موڈ بنانا پڑتا ہے بابا۔

ساغر: ہاں موڈ کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے لیکن ساتھ میں ضرورت ہوتی ہے زندگیوں میں اترنے کی، انھیں پرکھنے کے لیے نظروں کی۔ یہاں ہر چہرہ ایک کہانی لیے ہے صہبا، ہر دھڑکن ایک تھیم لیے ہوئے ہے (ہنس کر) جیسا ابھی ابھی آپ نے کہا ہے، افسانہ لکھنا کوئی شراب کا گھونٹ نہیں ہے جو غٹ سے گلے میں اتار لیا جائے (آہ بھر کر) اب یہ شراب

کے گھونٹ گلے میں کیوں اتارے جا رہے ہیں'
اس "کیوں" میں بھی تو ایک کہانی ہو سکتی ہے
صہبا۔

صہبا: تب تو آپ کے چہرے پر بھی ایک کہانی پڑھ سکتی ہوں میں۔

ساغر: (حیرت سے) میرے چہرے پر۔؟

صہبا: (سنجیدہ ہو کر) جی ہاں آپ کے چہرے پر آپ کا شراب کے نشے میں سڑک پر پایا جانا' آپ کے ہونٹوں سے پھسلتا نام سلمیٰ۔ "مائی سلیف ھدا" سسکیاں، چیخیں، کیا ان سب میں ایک کہانی نہیں ہو سکتی۔۔۔ ایک عظیم نہیں ہو سکتی۔؟

ساغر: (پریشان ہو کر) کیوں ؟ کیا میری زندگی پر بھی کہانی لکھنے کا ارادہ ہے؟

صہبا: جی ہاں، اگر آپ کچھ بتانا پسند کریں تو یقین جانیے ساغر صاحب، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے' جیسے ایک چھوٹا سا افسانہ نگار جو ابھی تک دبا پڑا ہے ایک دم ابھر آئے گا۔

ساغر: (سانس بھر کر) ٹھیک ہے، بتاؤں گا سب کچھ بتاؤں گا۔ اگر میری زندگی پر قلم اٹھا کر ایک افسانہ نگار ابھر سکتا ہے تو ضرور بتاؤں گا صہبا۔

صہبا: میں سب کچھ سننے کے تیار ہوں۔

ساغر: (سانس بھر کر) اچھا تو سنو۔ ربن کا وہ کنارہ بہت خوش گوار لگتا تھا مجھے، مٹتی بنتی لہروں پر رقص کرتے شکارے، ماجھی کے ترنم میں ڈھلے نغمے، نہ جانے کیسی کیسی داستانیں سنا دیا کرتے تھے، کبھی ترنم میں سوگ ہوتا تو کبھی مسرت یہ سب کیوں ہوتا تھا؟ ان سب سے بے نیاز تھا میں۔ بس وہ نغمے اچھے لگتے تھے مجھے، مجھے بھی اور سلمیٰ کو بھی۔۔۔ سلمیٰ۔۔۔ میری بہن۔ میرے بچپن کا معصوم پیار، سلمیٰ میرے ساتھ اکثر اس ندی کے کنارے پر چلی آتی تھی اور گھنٹوں ان نغموں کو میرے ساتھ سنا کرتی تھی۔ چنچل نوجوان اکثر ریت پر آکر گھروندے بنایا کرتے تھے، مجھے یہ سب بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ان گھروندوں میں کتنی آرزوئیں بسی تھیں، کتنے خواب سجے تھے۔ ان سب سے انجان ہو کر میں ان گھروندوں کو اپنے ننھے ننھے پیروں سے روند ڈالا کرتا تھا۔ سلمیٰ کو شاید میری یہ حرکت پسند نہ تھی وہ ہر بار میری پیٹھ پر مکا لگا دیا کرتی تھی اور میں ہر بار اپنی یہ حرکت دوہرا دیا کرتا تھا۔ دن ایسے ہی ہنستے کھیلتے بیت رہے تھے کہ۔۔۔
(ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے چلا جاتا ہے۔ پانی کی کل کل کرتی آواز کے ساتھ دور کسی کے گانے کی گونج سنائی دیتی ہے)

[فلیش بیک شروع]

رامو: (دور سے گھبرائی آواز میں) ساغر بیٹا۔

ساغر: ارے سلمیٰ۔ دیکھ تو یہ رامو ہی ہے نا۔؟

سلمیٰ: ہاں رامو ہی لگتا ہے۔ ارے ہاں، رامو ہی تو ہے۔ وہ آرہا ہے۔

رامو: (قریب آکر) ساغر، جلدی گھر چل بیٹا۔

ساغر، سلمیٰ: (ایک ساتھ) کیوں کیا ہوا؟

رامو: وہ تمھاری ماں مر گئیں بیٹا اور تمھارے بابا کو تمھارے تاؤ جی گھوڑے سے باندھ کر بری طرح گھسیٹ رہے ہیں۔

ساغر، سلمیٰ: (ایک ساتھ چیخ کر) نہیں (روتے ہوئے بھاگتے ہیں) بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ بابا۔۔۔!!!
(ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے اور گزر جاتا ہے)

[فلیش بیک ختم]

ساغر: (بھرائی آواز میں) ہم بے تحاشہ بھاگتے ہوئے اس مقام پر جا پہنچے تھے، ہم نے وہاں دیکھا کہ ہمارے ماں باپ کی لاشیں، بری طرح خون میں لتھڑی زمین پر پڑی ہیں (سسک کر) صہبا، ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا، زمین اور پیسے کی ہوس میں ہمارے اس تاؤ نے سب کچھ ختم کر دیا (سنبھلتے ہوئے) تاؤ تو جیل چلا گیا۔ لیکن ماں باپ کا سایہ اٹھنے کے بعد ہمیں کسی نے پناہ نہ دی، ہم دربدر بھٹکتے رہے کبھی بھیک مانگ کر، کبھی پتھر کوٹنے کی مزدوری کر کے ہم اپنے جینے کا جتن کرتے رہے۔ بہت محنت کرنے پر بھی ہم اپنے تن کو پوری طرح ڈھک نہیں پاتے تھے، ہم اکثر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر سو جایا کرتے تھے، ایک دن آدھی رات گئے اچانک میری نیند ٹوٹی، میں نے دیکھا کہ سلمیٰ میرے پاس سے غائب ہے۔ میں بے تحاشہ سلمیٰ سلمیٰ پکارتا سڑک پر دوڑنے لگا، اسے ڈھونڈتا رہا، ایک شہر سے دوسرے شہر۔ اور اس طرح میں عمر کی سیڑھی در سیڑھی چڑھتے ہوئے ایک دن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سلمیٰ اب اس دنیا میں نہیں ہے (زور سے سانس بھر کر) محنت مزدوری کر کے میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی تھی اور اسی تعلیم کی وجہ سے مجھے قسمت نے ایک کلرک بنا دیا۔ اُس آفس میں جہاں کامران افسر ہے۔ ایک دن کامران نے میری کہانی سن کر کلرک اور افسری فاصلہ ختم کر کے مجھ سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیا (سانس بھر) اور ایک دن قسمت نے پھر پلٹا کھایا، میں اپنے ایک دوست امجد کی شادی میں شریک ہونے اس کے گھر پہنچا، میں نے وہاں دیکھا، ایک طوائف کچھ عزت داروں کے بیچ ناچ رہی ہے، جیسے ہی میری نظریں اس طوائف کے چہرے پر پڑیں میری آنکھیں پتھرا گئیں (رو پڑتا ہے) وہ سلمیٰ تھی۔۔۔ میری بہن۔

(غمگین موسیقی کی ایک تیز لہر سی آ کر گھنگروں کی چھم چھم میں جا کر کھو جاتی ہے۔ سلمیٰ کی شگفتہ ہنسی کے ساتھ آپس میں جام ٹکرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کئی مردانہ قہقہے ابھرتے ہیں، گھنگروں کی چھم چھم ایک دم تیز ہو کر مسلسل دھیمی دھیمی سنائی دیتی رہتی ہے)

[فلیش بیک شروع]

پہلی شرابی آواز: انگ انگ میں مدرا ہے۔

دوسری: ڈوب جائیے دوار کا داس جی۔

(تیز قہقہوں کے درمیان جام ٹکرانے کی آواز۔ گھنگروؤں کی آواز دھیمی دھیمی سنائی دینے لگتی ہے)

تیسری شرابی آواز: اماں یہ بوٹی کون چھانٹ لائے ہو امجد میاں۔

چوتھی: دیکھیے اڑا کر نہ لے جائیے گا مسٹر فلپس، واللہ قیامت ہے قیامت۔

پانچویں: باہوں میں بھر لو چھٹن میاں۔

(پھر تیز قہقہے۔ جام ٹکرانے کی آواز گھنگروؤں کی چھم چھم تیز ہو کر دھیمی ہو جاتی ہے)

چھٹی آواز: ارے گھنگرو سنبھال کے سلمیٰ بائی۔

ساتویں: ارے تو بائی کے پیروں میں کیوں گھسا جا رہا ہے منڈے۔

(قہقہے۔ جام ٹکرانے کی آواز۔ گھنگرو دھیمی

رفتار سے بجتے ہیں۔ غمگیں موسیقی کی ایک تیز لہر آکر تھتھوں اور گھنگروؤں کی جھنکار دباتی ہوئی پس منظر میں کھو جاتی ہے،
(فلیش بیک ختم)

ساغر: (سسک کر) وحشی درندوں میں میری بہن کو بازار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ صہبا، میری آنکھوں کے سامنے میری بہن کو سکوں میں خریدا جارہا تھا۔

صہبا: (بھرائی آواز میں) آپ نے اسے اس گندے ماحول سے نکالا نہیں؟

ساغر: نہیں صہبا میں اسی وقت وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ذہنی طاقت چھن جانے سے میں اپنی بہن کو پکار بھی نہ سکا تھا، اس کے گھنگرو سسک سسک کر مجھے آواز دیتے رہے لیکن میں پھر بھی بھاگ آیا صہبا... میں پھر بھی بھاگ آیا۔ (جوشیلی آواز میں یقین کے ساتھ) لیکن... لیکن میں اسے گندے ماحول میں نہیں رہنے دوں گا صہبا (چیخ کر) اپنی بہن کو اس گندے ماحول میں نہیں رہنے دوں گا (کھانسنے لگتا ہے)

کامران: (قریب آتے ہوئے) تمھاری بہن اس گندے ماحول میں نہیں رہے گی ساغر، میں اسے نئی زندگی دوں گا۔

ساغر: (سسک کر) کامران۔! (کھانستا ہے)

کامران: (بھرائے گلے سے) میں نے سب کچھ سن لیا ہے ساغر، میں سچ کہتا ہوں، میں اسے نئی زندگی دوں گا۔ اپنی دلھن بنا کر اس گندے ماحول سے نکال لاؤں گا تمھاری بہن کو۔

ساغر: (کانپ کر) کامران۔! (کھانستا ہوا) کامران، میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا (کھانستا ہے)۔

کامران: احسان کا نام لے کر میری دوستی پر کفن تو مت ڈالو۔ میرے دوست، دیکھو۔ کیا تمھیں میری آنکھوں میں ایک فرض نظر نہیں آتا، میری دوستی میں اپنے کامران کا پیار نظر نہیں آتا؟

ساغر: کامران! (سسکتا ہے)

کامران: ہمت سے کام لو ساغر، اپنے کامران پر بھروسہ رکھو۔

ساغر: کامران... میرے رہبر.. (سسکتا ہے)

کامران: سلمیٰ ہمارا انتظار کر رہی ہوگی ساغر۔

صہبا: آپ کی بہن آپ کو پکار رہی ہے ساغر صاحب، پلیز جائیے۔ جلدی کریے۔

ساغر: صہبا۔ (سسکتا ہے)

صہبا: جائیے ساغر صاحب.... پلیز...

ساغر: (سنبھل کر).... ہاں... ہاں صہبا.... کامران چلو۔

(موسیقی کی تیز جھنکار آکر گزر جاتی ہے)

— CHANGE OVER —

(شہنائی کی آواز تیز ہو کر دھیمی دھیمی سنائی دینے لگتی ہے)

ایک آواز: پیارے بھائی ایک بات تو بتاؤ۔؟

دوسری: ہاں، ہاں بولو۔

پہلی: کیا کامران کو کوئی اپنی لڑکی نہیں دیتا جو ایک طوائف سے شادی کر رہا ہے۔

دوسری: ارے میرے یار، فرسٹ کلاس پرسنالٹی اور فرسٹ کلاس خاندان کا فرد ہے، ایک کیا سینکڑوں لڑکیاں مل سکتی تھیں اسے، خدا جانے پھر یہ داغ کیوں لگا بیٹھا۔؟

پہلی آواز : اوں، مرنے دو یار اپنے کو کیا لینا دینا۔

دوسری : ارے کیا مرنے دو یار، کم سے کم اپنی بہن کا تو خیال کر لیا ہوتا اس مردود نے۔ طوائف کی نند کو کون اپنے گھر لے جانا پسند کرے گا بتاؤ؟

پہلی : بھئی سچ پوچھو تو اپنے جیسا تو کوئی تیار نہیں ہوگا۔

تیسری آواز : (اونچی آواز میں) ہمت کا، اماں دل گردے کا کام ہے کسی طوائف کو اپنی دلھن بنا کر گھر لے آنا۔

چوتھی آواز : یو آر رائٹ مائی ڈیر، تم سچ کہتے ہو، کامران نے ایک طوائف کو اپنا کر دل گردے کا کام تو کیا ہی ہے، ساتھ میں ہم سب کو ایک پیغام بھی دیا ہے، اور وہ پیغام ہے، لہو سے لہو کی پہچان، ہماری نبضوں میں جو لہو بہہ رہا ہے وہی لہو اس طوائف کی رگوں میں بھی بہہ رہا ہے، فرق صرف اتنا ہے اس کے اور ہمارے لہو میں مائی ڈیر..... کہ اگر ہمارا لہو کراہتا بھی ہو تو ہم سسک پڑتے ہیں اور اس کا لہو سسکتا بھی ہے تو ہم اس کی سسکیوں کو گھنگرو کی چھم چھم میں دبا کر قہقہہ لگا اٹھتے ہیں اور اس قہقہے کے ساتھ اس کے آنسوؤں کا جام اچھال کر پی جاتے ہیں۔

تیسری آواز : یعنی اپنے ہی آنسو اپنے ہی ہاتھوں میں اچھل کر اپنے ہی ہونٹوں پر برس جاتے ہیں۔؟

چوتھی آواز : ہاں مائی ڈیر، اپنے ہی آنسو اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی ہونٹوں پر برستے ہیں، یہ ساری کائنات آدم و حوا کی سنتان ہے، آدم و حوا کی سنتان ہونے کے ناطے ہمارا اس طوائف سے کچھ نہ کچھ رشتہ تو ہوتا ہی ہے۔

تیسری : سچ ہے یعنی لہو ایک ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارا لہو محفلیں سجاتا ہے اور اس کا لہو رقص کرتا ہے اپنے ہی لہو کے درمیان۔

چوتھی : یعنی رشتوں کے بیچ رشتوں کے گھنگرو، رشتوں کے قہقہے، رشتے کی سسکیاں، اف کتنا بدل جاتا ہے انسان۔

تیسری : ان گھنگروؤں کو اپنا کر واقعی کامران نے ایک مثال پیش کی ہے ہمارے سامنے، کامران کو کیا کہا جائے، الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔

چوتھی : (سانس بھر کر) ہاں بھائی، الفاظ تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔

(شہنائی کا ساز تیزی سے ابھر کر دھیرے دھیرے عورتوں کے گانے بجانے کی آواز میں مدغم ہو کر پس منظر میں کھو جاتا ہے)

صہبا : (پیار سے) ساغر صاحب۔

ساغر : (بھرائی آواز میں) ہاں صہبا۔

صہبا : سرخ پیرہن میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں سلمیٰ بھابی۔

ساغر : ہاں صہبا... تمھارا بھائی... تمھارا بھائی فرشتہ ہے صہبا۔ تبھی تو اس نے میری بہن کے پیروں سے بندھے گھنگروؤں کو سہرے کی کلیوں میں پرو کر اپنی پیشانی پر باندھ رکھا ہے، تمھارا بھائی واقعی فرشتہ ہے صہبا۔

صہبا : خوشی کے موقع پر غمگین ہو جانا زیب نہیں دیتا ساغر صاحب... پلیز رو کیے اپنے آپ کو۔

ساغر : میں... میں یہ احسان کیسے اتار پاؤں گا صہبا؟

صہبا : آپ چاہیں تو اتار سکتے ہیں۔

ساغر : کیسے صہبا۔؟

صہبا : (شرما کر) آپ اپنی سسکیاں، میری مسکراہٹوں میں پرو کر میری پیشانی پر باندھ دیجیے۔

ساغر: (تڑپ کر) صہبا... یہ ... یہ ... یہ تم ...

صہبا: (بات کاٹ کر) یہ التجا ہے ساغر صاحب۔

ساغر: صہبا... صہبا یہ تم ... نہیں ... نہیں نہیں ... یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔

صہبا: کیوں نہیں ہو سکتا۔؟

ساغر: میری زندگی ٹی بی کی بیساکھیوں پر جھول رہی ہے، ایک دن لڑکھڑا کر گر جائے گی صہبا۔

صہبا: ڈاکٹر رمن نے ایک دن کہا تھا، ٹی بی کا علاج پیار ہے، اور یہ علاج کرنے کا حوصلہ ہے مجھ میں ساغر صاحب۔

ساغر: نہیں صہبا، یہ نہیں ہو سکتا۔

صہبا: کیا وہ افسانہ نگار جو ابھی تک اپنے کرداروں کو پیار کی سوغات دیتا چلا آیا ہے، اپنے لیے کچھ نہیں مانگ سکتا؟

ساغر: صہبا۔

صہبا: کیا اس افسانہ نگار کا اپنے کردار پر ذرا بھی حق نہیں۔؟

ساغر: صہبا۔

صہبا: کیا اس بدنصیب افسانہ نگار کو اپنے کردار سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔؟

ساغر: (سسک کر) صہبا میں ٹوٹ چکا ہوں۔ میری زندگی بہت کم ہے۔۔ میں ٹوٹ چکا ہوں۔

صہبا: زندگی سے اکتا کر اپنے آپ کو اندھیروں میں ڈھکیل دینا بزدلی ہے، خودکشی ہے، انسان وہ ہے ساغر صاحب، جو زندگی بسر کرنے کے لیے نئے ہمراہی، نئے خیرخواہ تلاش کر کے اپنے غموں پر مسکراہٹیں بکھیر لیتا ہے۔

ساغر: لیکن میرے نصیب میں صرف سسکیاں ہیں صہبا، مسکراہٹیں نہیں!

صہبا: نصیب ایک تصور ہے اور اس تصور کی زد میں انسانی وجود کو ڈبو دینا ایک گناہ ہے۔

ساغر: میری سسکیوں میں اپنی زندگی کا سفینہ مت ڈالو صہبا... ڈوب جائے گا۔

صہبا: اپنی سسکیوں کو روک لیجیے ورنہ واقعی سفینہ ڈوب جائے گا۔ میرے افسانے کو سسکیوں کا نہیں مسکراہٹوں کا انجام دیجیے ساغر صاحب۔

ساغر: صہبا۔

صہبا: مسکراہٹوں کا انجام دیجیے ساغر صاحب۔

ساغر: (ڈوبتی آواز میں پیار سے) صہبا۔

صہبا: (ڈوبتی آواز میں پیار سے) ساغر صاحب۔

(کچھ دور سے کامران تالیاں بجاتا ہوا آتا ہے)

کامران: بہت خوب، بہت خوب ۔۔ یہ چپکے چپکے آغاز بھی ہو گیا اور انجام تک بھی جا پہنچے آپ لوگ۔

صہبا: (سہم کر) بھائی جان۔

کامران: نا... نا... نا... گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بالکل ٹھیک جا رہی ہو، ارے بھئی مجھے کیا معلوم تھا ورنہ میں اپنے ساتھ تمہارا بھی نکاح پڑھوا دیتا۔

صہبا: (خوشی سے) بھائی جان۔

کامران: (ہنس کر) چلو آج نہیں تو کل تمہارا نکاح پڑھوا دیں گے۔

(سب ہنستے ہیں۔ شہنائی کا ساز عورتوں کے گانے بجانے کی آواز دلہے کے ساتھ دھیرے دھیرے تیز ہوتا جاتا ہے)

★

بیاد جناب سیّد نواب افسر لکھنوی

ہو نہ زحمت تو کوئی بتلائے
کیوں ہے خاموش شاعری کی فضا
لکھنؤ میں یہ کس کا ماتم ہے؟
درد آگیں سکوتِ پیہم ہے؟

کیا کہا؟ چل بسے نواب افسر؟
شعر سادہ تھے، زندگی سادہ
ترجمانِ "غمِ حیات" تھے جو
سادگی ہی کی کائنات تھے جو

اللہ اللہ! ان کے شعروں میں
سحر کاری کے ساتھ پرُکاری
کیا سلاست تھی، کیا روانی تھی
حق بیانی سی حق بیانی تھی

لفظ تابع تھے فکرِ روشن کے
فکر ارفع مقام کے ہمراہ
سادہ لفظوں میں بانکپن بھی تھا
اُن کے شعروں میں اوجِ فن بھی تھا

دوستو! ان کی شعر گوئی میں
تجرباتِ حیات کا اظہار
روز مرّہ کا لطف آتا تھا
سازِ شعری کو تھر تھراتا تھا

ان کے مدِ نظر رہیں تا عمر
اُن کے آئینۂ تغزّل میں
شاعری کی بلند تر اقدار
ان کی تہذیبِ فن کے ہیں انوار

اُن کی آواز میں گداز بھی تھا
اُن کے اشعار میں جھلکتے تھے
اور اک عالمِ ترنم بھی
کہیں آنسو، کہیں تبسم بھی

چشمۂ فیضِ شعر سے اُن کے
اُن کے انوارِ علم و دانش سے
کئی اصحاب فیض یاب ہوئے
ذرے، خورشید کا جواب ہوئے

یاد آئیں گی خوبیاں اُن کی
مشرقیت کا، لکھنویت کا
وہ مرنجاں مرنج انساں تھے
نظر افروز ایک عنواں تھے

دے جگہ ان کو، یا رحیم و کریم
اُن کو مل جائے راحتِ جاوید
یہ "تلطف جوارِ رحمت میں
تیرے سائے میں تیری قربت میں"

باوا کرشن گوپال مغموم
۱۴۴۳، سیکٹر نمبر ۲۰۔ ڈی،
چنڈی گڑھ

نقّال رضوی
کشمیری محلہ لکھنؤ ۳

یادِ افسر

زمانہ آیا اور ایسا زمانہ آیا ہے
جو اپنے ساتھ غم بے پناہ لایا ہے

ہوا، ہوا، وہ ادب کا رخِ جمیل اُداس — لٹا لٹا وہ زبان و بیاں کا کاشانہ
بڑھا بڑھا وہ ملالِ جدائی افسر — بھرا بھرا وہ مئے رنج و غم کا پیمانہ
کیا کیا وہ ستم دستِ موت نے افسوس — ہوا ہوا وہ مرا بے خودی سے یارانہ
ملا ملا وہ شعورِ الم پسِ افسر — دیا دیا وہ مری چشمِ نم نے نذرانہ
گرا گرا وہ منارِ جمیلِ قصرِ غزل — بنا بنا وہ حزیں دوست ہو کہ بیگانہ
چھٹا چھٹا وہ بہت پاک نفس مخلص دوست — ملا ملا وہ مرے دل کو غم کا پروانہ
پڑھا پڑھا وہ بہ ہمراہ اشک و آہ پڑھا — لکھا لکھا وہ قضا کے قلم نے افسانہ
بجھا بجھا وہ چراغِ محلسرائے غزل — کھلا کھلا وہ غمِ زندگی کا سے خانہ

تبا رہے ہیں غزل کے یہ گیسوئے برہم
ہوئی ہے مصحفِ اردو سے ایک آیت کم

رضیہ صلاح الدین
۴/۲ اسٹبل یحییٰ گنج لکھنؤ

(افسانہ)

ادھورا خواب

دروازے پر پوسٹ مین کی آواز سن کر میں خود دروازے کی طرف لپکی۔ مجھے ہمیشہ ہی پوسٹ مین کی آواز سن کر ایک طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ عزیزوں اور دوستوں کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ خطوط بقول غالب میرے لیے بھی نصف ملاقات سے کم نہیں۔ پل بھر کے لیے میرے ماں، باپ میرے بھائی بہن اور میرے دوست گویا میرے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی کے خط کا انتظار رہتا ہے۔

اس وقت بھی میں اسی خیال سے دوڑی کہ دیکھوں کس کا خط آیا ہے؟

دروازے پر ایک حسین لفافہ پڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ تو کسی کی شادی کا کارڈ ہے۔!

کس کی شادی ہوسکتی ہے؟

کہاں سے آیا ہے یہ کارڈ؟

لفافہ اٹھاتے اٹھاتے کتنے سوالات نے سر ابھارا۔

لفافہ میرے ہاتھوں میں تھا اور اس پر تحریر دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔

ایک عجیب سی خوشی میری رگ رگ میں سما گئی یہ خوبصورت تحریر جس کو دیکھنے کے لیے میں دس سال سے انتظار کر رہی تھی۔

لیکن یہ تو! یہ تو شادی کا کارڈ ہے"

کیا راحیل شادی کر رہا ہے۔؟

لفافہ کھولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ــ میں خیالوں میں گم کھڑی تھی کہ اتنے میں بڑا لڑکا آیا اور میرے ہاتھ سے لفافہ لے کر سوالوں کی بوچھار ہی تو کر دی۔

ممی یہ کس کا کارڈ ہے؟

کہاں سے آیا ہے؟

کس کی شادی ہے۔؟

چلیں گی ممی،

راحیل کون ہے۔؟

سامیہ کون ہے۔؟

سامیہ؟

میں نے دوہرایا۔

اچھا تو سامیہ سے شادی کر رہا ہے راحیل

ابھی تک میں نے ٹھیک سے لفافہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے سامنے لفافہ نہیں بلکہ آج سے دس سال پہلے والا معصوم اور بھولا بھالا راحیل کھڑا تھا۔

راحیل کی شادی کی خبر سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ مجھے دکھ بھی کیوں ہونے لگا۔ اچھا ہے اگر راحیل کا گھر آباد ہو جائے۔ میں اسے مبارکباد کا خط ضرور لکھوں گی۔ اور پھر میرے ہاتھ میں قلم تھا۔

راحیل!

آج میرا یہ خط دیکھ کر یقیناً تمھیں تعجب ہوگا۔ لیکن تم تو شاید میری تحریر پہچانتے بھی نہیں ہوگے۔ پہچانو گے بھی کیسے۔ کیونکہ میں نے تمھیں کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ کبھی تمھارے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ یہی نہیں بلکہ تمھارے سارے خطوط نذر آتش کر دیے۔ جانتے ہو کیوں؟

اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ جس طرح مشرق اور مغرب کا ملاپ ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارا ملاپ ممکن نہیں۔ ہمارے درمیان بہت سی دیواریں تھیں۔ میں ایک دولت مند ماں باپ کی تنہا اور اکلوتی بیٹی تھی اور تم ایک معمولی کلرک کے غریب لڑکے۔ میں تعلیم یافتہ تھی، اور عالم ہوتے ہوئے بھی تمھارے پاس علم کی کوئی ڈگری نہ تھی۔ میں جانتی کہ ان دیواروں کو میں توڑ نہیں سکتی تھی۔ محبت نامہ لکھ لکھ کر میں تمھارے آتش شوق کو بھڑکانا بھی نہیں چاہتی تھی اسی لیے میں ہمیشہ تم سے گریز کرتی رہی۔ ہمیشہ یہی دکھانے کی کوشش کی کہ مجھے تم سے کوئی لگاؤ نہیں، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر بھی نہ جانے کس طرح تم یہ جانتے تھے کہ اس تمام بے رخی کے باوجود میں تم سے محبت کرتی ہوں، یہ حقیقت بھی تھی۔

شاید ہی کسی نے کسی کو اتنا چاہا ہوگا جتنا میں نے تم کو، لیکن میں بزدل تھی جو دل میں تھا اس کا زبان سے اظہار نہ کر سکی جس کا مجھے اقرار ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے۔ نہیں بلکہ مجھ پر تمھارا یہ احسان ہے کہ وہ تعلق جو ہمارے تمھارے درمیان تھا اس کو تم نے افشا نہ کیا۔ وہ راز ہی رہا۔

مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب تم نے شاید اپنی محبت کے بھروسے اپنی والدہ کے ذریعہ میرے لیے پیغام بھیجا تھا اور میری امی نے یہ کہہ کر کہ میری شادی پہلے سے ہی کسی انجینیر سے طے ہے تمھاری امی کو جواب دیدیا تھا۔ اس بات کا جتنا صدمہ مجھے ہوا اس کا تمھیں اندازہ نہیں! کیونکہ میں سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہی اور ضبط کرتی رہی۔

اس کے بعد جلد ہی میری شادی ہوگئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے دور ہوگئی اور ایک موہوم سی جو امید تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ تم نے مایوس ہو کر شہر چھوڑ دیا اور کلکتہ جاکر رہنے لگے۔

یہ بھی سنا کہ تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ تم کبھی شادی نہیں کروگے۔

زندگی کے دس سال اسی طرح گزر گئے۔ تم اُدھر تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اِدھر میں جیسے زندگی کی ہر خوشی میسّر تھی، دو خوبصورت بچے تھے، چاہنے والا شوہر اور دولت کی ریل پیل اور سب سے بڑھ کر یہ خوشی، یہ احساس کہ میرا ایک ایسا چاہنے والا ہے جس نے میرے لیے دنیا کو بھلا دیا ہے۔ میری تمام بیوفائیوں کے باوجود وہ اب بھی میرا ہے اور صرف میرا — سچ پوچھو تو میرے دل کو اس سے بڑی تقویت تھی۔ لیکن آج جب مجھے تمھاری شادی کا دعوت نامہ ملا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دل دھڑکا اور بغیر کسی آواز کے پاش پاش ہوگیا۔ میں لٹ گئی ویران ہو گئی، سب کچھ خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے آج تم مجھ سے بچھڑ رہے ہو۔

لیکن نہیں آج جب تم ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو تو میں اپنے جذبات کا اظہار کر کے تم کو کیوں پریشان کروں۔ وہ بات جو ہمیشہ سے پوشیدہ تھی وہ راز ہی رہے گی۔ آج تک میں تمھارے خطوط جلاتی آئی تھی۔ آج میں صرف اپنا پہلا اور آخری خط جلانے جا رہی ہوں۔ تم خوش اور رہو آباد رہو۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی یہ خاموش دعائیں ضرور تم تک پہنچ جائیں گی۔ یہ میرا ایمان ہے۔

تمھاری؟

کوئی نہیں۔

حنیف کیفی
۳۳۷ ۔ سی/۳ باٹلہ ہاؤس
جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

غزل

کس کی ہو تعمیں ہر اک کا تقاضا مختلف
ایک میں بے چارہ اور میرے شناسا مختلف

اپنے اپنے ظرف اپنی اپنی حد کی بات ہے
ورنہ کس پہلو سے ہے قطرے سے دریا مختلف

بڑھتا جاتا ہے تصادم ٹوٹتا جاتا ہوں میں
میرا عالم مختلف، ماحولِ دُنیا مختلف

کیا رہے پہچان باقی دھول میں ملنے کے بعد
ورنہ ہے اپنی جگہ پر ذرہ ذرہ مختلف

آدمی کو گھٹتی بڑھتی دھوپ سے مت ناپیے
قد وہی رہتا ہے، ہو جاتا ہے سایا مختلف

ایک چہرے پر پڑی ہے کتنے چہروں کی نقاب
ظاہر [illegible] سے ہے کتنا اصل چہرا مختلف

شکوہ یکساں [illegible] ہے کیفی غلط
[illegible] والے کی ہر سمت ہے دنیا مختلف

حامد جعفری
بورڈ آف اسٹڈیز ان ہسٹری
بھوپال یونیورسٹی، بھوپال

جنوں میں ہم نوا کوئی نہیں ہے
کہ ہم سا دوسرا کوئی نہیں ہے

بڑا اک جرم ہے دل توڑنا بھی
مگر اس کی سزا کوئی نہیں ہے

کھلی آنکھوں سے کب تک خواب دیکھیں
یہاں تو جاگتا کوئی نہیں ہے

گھرا ہوں صورتوں کے جنگلوں میں
مرا غم آشنا کوئی نہیں ہے

مجھے مکتوب اس کے نام بھیجو
مرا اپنا پتا کوئی نہیں ہے

یہ مایوسی، یہ پاگل پن، ترا غم
مرا ان کے سوا کوئی نہیں ہے

غزلیں

فاروق شفق
جی ۱۲۰ دھان کیتی
گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴

اک تماشہ بن گئے تھے بھیڑ میں باہر سے ہم
اس لیے بہتر ہوا خود ہٹ گئے منظر سے ہم

مسئلوں کی تیز آندھی اور اک سوکھا شجر
خود کو گویا ڈھانپتے ہیں اک پھٹی چادر سے ہم

جانے کیا مطلب نکالیں لوگ اپنے طور پر
ہنس کے کھل کے اب ملتے نہیں اس ڈر سے ہم

شام اتنی جلد کیسے راستوں میں گر گئی
صبح کی پہلی کرن لے کر چلے تھے گھر سے ہم

[illegible] آئینہ تسکیں دیتے ہیں لوگ
شور [illegible] خاموش ہیں اندر سے ہم

[illegible] اپنے دوست ہی تو ہیں شفق
[illegible] ہیں اپنے ہی لشکر سے ہم

طیبہ کاظمی
نزد مسجد دولہا صاحب
کرہ ابو تراب خاں لکھنؤ

تحقیق کے سفر میں کوئی ہمسفر نہ تھا
میں اجنبی ضرور تھا نا معتبر نہ تھا

پہلے بھی سربلند تھا اب بھی ہوں سربلند
دہلیز وقت پر جو جھکا میرا سر نہ تھا

لمحوں کا گرد باد اڑا لے گیا تو کیا؟
میرے سوا کوئی بھی سر رہگذر نہ تھا

احباب کی نوازشِ پیہم کے باوجود
جب درد بڑھ گیا تو کوئی چارہ گر نہ تھا

میرا وجود ٹھوس حقیقت تھا اس لیے
پرچھائیوں کے شہر میں میرا گزر نہ تھا

اے آفتاب شام تمدن کی روشنی
تیرا یہ رنگ وقت طلوعِ سحر نہ تھا

ماہیتِ غزل بھی بدلنا پڑی مجھے
اس دور کے تقاضوں سے میں بےخبر نہ تھا

طیبہ فرازِ دار پر اک لمحۂ قیام
کہنے کو مختصر تھا مگر مختصر نہ تھا

فضل حسنین
۲۸۔ گلاب باڑی
الہ آباد

(طنز و مزاح)

مہمانِ خصوصی

مہمان کے بارے میں تو خیر ہم بہت کچھ جانتے تھے۔ یہاں تک کہ کائنات کی تمام موجودات ہی یہاں بطور مہمان قیام پذیر ہیں لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک نئی مخلوق یعنی مہمانِ خصوصی کا ذکر بار بار سنا تو اس کے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا۔

جہاں تک ہمارے قیاس کی رسائی ہو سکی اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بہت بھیانک قسم کی چیز ہوگی اور مہمان خصوصی جہاں کہیں ایک بار مہمان بن کر پہنچ جاتا ہوگا، اپنی باقی ماندہ زندگی وہیں گزار دینے کے چکر میں رہتا ہوگا۔ یا پھر مہمان خصوصی اس مخلوق کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ جو تمام عمر دوسروں کی مہمان نوازی کا امتحان لینے کی غرض سے وجود میں آتا ہو۔

جب ہمارا اشتیاق حد سے تجاوز کرنے لگا تو ہم نے اس کا ذکر اپنے دوست کریم اللہ سے کر ہی دیا۔ پہلے تو موصوف نے ہمیں سر سے پاؤں تک اس انداز سے دیکھا کہ جیسے ہمارے جسم میں جا بجا سینگ نکل آئے ہوں۔ پھر مذاق اڑانے والے انداز میں بولے "یار تم مہمانِ خصوصی کو نہیں جانتے تو پھر جانتے کیا ہو"؟ ہم نے اپنی نا اہلی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا "یار کریم بھائی! مرے ہوئے کو کیا مارنا! میں تو مہمان خصوصی کے بارے میں قیاس آرائی کرتے کرتے یوں ہی نڈھال ہو رہا ہوں۔ اس لیے اب دیر نہ کرو اور مجھے فوراً کسی مہمانِ خصوصی کے پاس لے چلو کہ اس کی ایک جھلک دیکھ لوں اور دل کو قرار آئے۔" ارشاد ہوا ــــ

"اماں یہ کون سی بڑی بات ہے۔! اگر ذرا سی ہمت باندھو تو تم خود ہی مہمان خصوصی بن سکتے ہو۔" ہم نے چونکتے ہوئے عرض کیا "یار کریم بھائی! ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے مہمان بننا بھی نہیں آتا۔ بھلا میں مہمان خصوصی کیا بن پاؤں گا؟" موصوف ہماری معصومیت پر مسکرائے اور پھر سینہ تانتے ہوئے بڑے تحکمانہ لہجے میں فرمایا ــ "اب تو میں تمھیں مہمان خصوصی بنا کر ہی دم لوں گا۔" ہم نے کریم اللہ کی لاکھ منت و سماجت کی لیکن موصوف ان میں سے نہیں تھے جو کوئی بات کہہ کر اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔

اور پھر تیسرے روز ہی کریم اللہ ایک عدد دعوتی کارڈ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ فاتحانہ انداز میں کارڈ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا "یہ لو!"

کارڈ پڑھ کر تو ہمارے ہوش ہی جاتے رہے۔ کیونکہ اس میں ہمارا نام جلی حروف میں بطور مہمانِ خصوصی چھپا ہوا تھا۔ عرض کیا۔ "یار کریم اللہ! یہ کیا کیا تم نے؟ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا جو آج اس کا بدلہ اس طرح سے لے رہے ہو؟" موصوف کی مسکراہٹ زور پکڑ گئی۔

بولے۔ "یار اتنا نروس کیوں ہو رہے ہو؟ تمھیں مہمان خصوصی ہی تو بنا رہا ہوں۔ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر تو بنا نہیں رہا ہوں۔ جو اس طرح پسینہ پسینہ ہو رہے ہو۔ اور پھر میں تو ہوں ہی تمھارے

منافقہ۔ میری تو عمر ہی اس طرح کے نیک کاموں میں گزر رہی ہے۔"

ہم نے بےبسی کے عالم میں عرض کیا "کریم اللہ! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

کہنے لگے "تم ذرا بھی ہلکان نہ ہو۔ بس اللہ کا نام لے کر تیاری شروع کر دو۔" مجبوراً ہمیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ عرض کیا۔

"تو پھر جلدی سے کہہ ڈالو کہ مجھے کیا کیا تیاری کرنا ہے۔؟"

بولے۔ "ارے بھئی کوئی خاص تیاری نہیں کرنا ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ تمھیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ تمھیں اسٹیج پر مسند سے چپکا دیا جائے گا۔ بس اس کا خیال رکھنا کہ زیادہ ہلنا ڈلنا نہیں ورنہ پھر کمزور قسم کے مہمانِ خصوصی سمجھے جاؤ گے اور آئندہ کے لیے چانس کھو بیٹھو گے۔" ہم نے دست بستہ عرض کیا۔

"کریم بھائی! تو پھر جلسے میں ہمارا مصرف ہی کیا رہے گا۔؟"

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟" کریم اللہ جلدی سے بول اٹھے۔ "ارے بھئی آخر میں سب کا شکریہ کون ادا کرے گا۔ اور لگے ہاتھ دو ایک جملے انکساری کے بھی بول دینا۔" ہم نے پس و پیش کے عالم میں کہا۔

"لیکن میں تو یوں ہی بہت کم بول پاتا ہوں بھلا اسٹیج پر کیسے بول سکوں گا۔" کریم اللہ جھلاتے ہوئے بولے۔

"ارے بھئی اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ میں تمھیں ایک مختصر سی تقریر لکھ دوں گا۔ اسے حفظ کر لینا اور اگر وہ پوری نہ یاد ہو سکی تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ تمھاری تقریر کا وقت آتے آتے جلسہ گاہ تقریباً خالی ہو چکی ہو گی۔"

غرض کہ موصوف نے ہمیں کہیں سے نکلنے نہ دیا اور ہم نے بھی سوچا کہ جہاں زندگی میں اتنی رسوائی اٹھائی ہے، ایک تجربہ اور سہی۔ چنانچہ ہم نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ کریم اللہ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ ہمارے مسلسل انکار سے وہ کچھ فکرمند سے ہو گئے تھے۔ کارڈ پر ہمارا نام جو چھپ چکا تھا۔

اس کے بعد موصوف نے بڑی خوشی سے ایک تعویذ نما کوئی چیز ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم نے دریافت کیا۔ "یہ کیا ہے کریم بھائی؟" ارشاد ہوا۔

"ارے بھئی وہی تقریر ہے۔" عرض کیا۔

"یہ تو کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔"

فرمایا۔ "ہاں بھئی! بار بار تھوڑے ہی کوئی لکھ کر دے گا۔ اس تقریر سے جانے کتنے مہمانِ خصوصی کو نپٹا چکا ہوں۔" ہم نے پرزے کو واقعی تعویذ جیسی ہی تعظیم دی اور اسے اسی وقت حفظ کر لیا۔ اس کے بعد موصوف نے اندر جا کر ہمیں مزید تیاری کا حکم دیا۔ ہم ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح حکم کی تعمیل میں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ اب ہم میں بھی ایک نیا عزم پیدا ہو چکا تھا۔

اندر پہنچ کر ہم نے شیروانی زیب تن کی، قدِ آدم آئینے کے سامنے تقریر کی مشق شروع کر دی۔ بیگم نے یہ انوکھا منظر دیکھا تو بھاگی ہوئی آئیں اور بولیں "خیریت تو! یہ کیا ہو گیا آپ کو؟"

"تم اپنا کام کرو جی!" ہم نے ان کی بات کا ذرا بھی نوٹس نہ لیتے ہوئے کہا۔

"آخر آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" بیگم نے استفسار کیا۔

"بھئی میں ایک جلسہ میں مہمانِ خصوصی بن کر جا رہا ہوں؟" ہم نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"واپسی کب تک ہو گی؟" شاید بیگم نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ "بھئی کوئی ٹھیک نہیں۔ جب جلسہ ختم ہو گا تو آؤں گا۔" میں نے مزید اکڑتے ہوئے کہا۔ بیگم اتفاق سے آج کچھ زیادہ ہی مہربان تھیں، بولیں۔

"تو کھانا نکالوں"؟

اب ہمیں غصہ آ گیا۔ "بیگم! کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ بتا رہا ہوں کہ میں مہمان ہی نہیں بلکہ مہمانِ خصوصی بن کر جا رہا ہوں۔ پھر بھلا گھر سے کھا کر جانے کا کیا سوال"؟ اتنے میں کریم اللہ نے آواز لگائی اور ان کے ہمراہ خراماں خراماں چل پڑا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اور فوراً اسٹیج پہ گاؤ تکیے کے سہارے ٹکا دیا گیا جلسے کا آغاز ہوا۔ مقررین اپنے اپنے دل کی حسرت نکالنے لگے۔ تقریروں کا سلسلہ ختم ہونے کو ہی نہ آرہا تھا اور ہماری بھوک تھی کہ چمکتی جاتی تھی۔ لیکن کھانا تو درکنار اس مہمانِ خصوصی کو پانی کے لیے بھی کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ اب ہم نے دل ہی دل میں کریم اللہ کو کوسنا شروع کیا کہ کمبخت نے آج اچھا پھنسایا۔ خدا خدا کر کے جلسہ اختتام کی منزل پر پہنچا اور ہمارے بولنے کا موقعہ آیا۔ بھوک کی شدت سے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا اور پھر کس دل سے میں کمبخت میزبان کا شکریہ ادا کرتا۔ بہر حال کسی طرح میں نے رٹی رٹائی تقریر پڑھ ڈالی۔ بلکہ احتجاج کے طور پر میں نے اس مختصر تقریر میں سے کچھ الفاظ بھی ہضم کر لیے۔ اسٹیج سے اتر کر فوراً کریم اللہ کا گریبان تھاما اور انھیں گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔ موصوف ہمارا خونخوار چہرہ دیکھ کر حیرانی کے عالم میں بولے ـــ

"اماں یار! اتنے کامیاب تو رہے پہلا ہی پرفارمنس اتنا شاندار! مبارک ہو۔" ہم نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا ـــ

"کریم اللہ بس خیریت اسی میں ہے کہ کچھ بولو مت! لاؤ کچھ پیسے نکالو۔ پیٹ کی خندق تو بھر دوں۔ گھر تک چلنے کی سکت تو پیدا ہو" ـــ کریم اللہ نے حیرت سے تکتے ہوئے پوچھا "کیا گھر سے کھا پی کر نہیں چلے تھے۔؟" جی تو چاہا کہ ان کو ہی چبا جاؤں لیکن غصہ کی وجہ سے میں کچھ بول ہی نہ سکا ـــ موصوف پھر خود ہی بول اٹھے۔ "یار پیسہ تو بالکل نہیں ہے"۔ یہ سن کر تو اور بھی خون کھول اٹھا۔ "پرسوں جو پچاس روپے مجھ سے لے گئے تھے وہ کیا ہوئے؟" موصوف نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"ارے بھائی اسی روپے سے تو تمھیں مہمانِ خصوصی بنوایا تھا۔"

"کیا؟" ہم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ لیکن موصوف کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی، بولے۔

"ہاں اور کیا۔ بغیر عطیہ دیے کون مہمانِ خصوصی بن سکتا ہے"

ہم نے کریم اللہ کا ہاتھ دور جھٹکا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر پہنچے۔ بیگم بے خبر سو رہی تھیں۔ انھیں جگا کر کھانے کی فرمائش کی۔ بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھا اور بولیں۔

"دعوت والا کھانا ہضم ہو گیا کیا؟" بیگم کے طنز کو سمجھتے ہوئے ہم نے کہا۔

"بیگم مجھے غصہ مت دلاؤ۔ تم ابھی مجھے جانتی نہیں ہو۔"

"خوب جانتی ہوں۔" بیگم نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ وہی مہمانِ خصوصی تو ہیں؟"

★

غزل

سراج تنویر
۱۳ رفیع کمپاؤنڈ سول لائن جھانسی

ڈھلے یہ رات تو پیشانیِ سحر اُبھرے
فضا سے دُھند چھٹے اور شہر گھر اُبھرے

نہ کاٹ پائے طلسمِ حصارِ تاریکی
چراغِ فکر لیے کتنے باہنر اُبھرے

فضائے ذہن میں اے دوست کتنے خواب حسیں
حباب جیسے کہ دریا کی سطح پر اُبھرے

فصیلِ صبح پہ تاریکیوں کے پہرے ہیں
کہو یہ وقت کے سورج سے دیکھ کر اُبھرے

وجود برف سمجھتے تھے تجھ کو ہم تنویر
تہوں سے تیری مگر شعلہ و شرر اُبھرے

منوہر لال ہادی
۱۲۷ - سیکٹر III
آر - کے - پورم
نئی دہلی - ۲۲

اختر شاہجہانپوری
محلہ رنگین چوپال خلیل غربی خاں کا پل
شاہجہانپور

غزلیں

وہ آدمی تھا، فرشتہ تھا یا کہ پتھر تھا
نہ بے قرار نہ شکوہ بہ لب نہ مضطر تھا

جلا دیا ہے اسے آتشِ حقائق نے
جو خواب گلستاں سا میرے اندر تھا

کوئی اُچھال رہا تھا کسی کی بام پہ آگ
میں دیکھ دیکھ کے حیرت زدہ تھا ششدر تھا

تمام لوگ چراغوں کے بجھنے پر خوش تھے
اگر اداس تھا کوئی تو دیدۂ تر تھا

مرے نیام میں کوشش بھی تھی جہاد بھی تھا
بہت ہی تیز مگر خنجرِ مقدر تھا

جب اپنے آپ کو دی تھی سزا جزا میں نے
وہی تو صبحِ قیامت تھی، روزِ محشر تھا

بچی گئی نہ کوئی منزلِ عظیم تو کیا
کہاں میں تیرا نہ ہادی صدف میں گوہر تھا

دعائے نیم شب بیکار کر دی
تری یادوں کی خوشبو ایسی مہکی

انھیں یہ ضد کہ بیگانے بھی آئیں
کہ محفل میں ذرا ہل چل تو ہو گی

حسیں چہرے بھی کمھلائے ہیں اب تو
قیامت ہے نسیم صبح گاہی

تصور میں تمھیں محفوظ کر لوں
ملن کی یہ گھڑی آئی نہ آئی

زمانے میں ہمارے تذکرے ہیں
تری قربت نے وہ شہرت عطا کی

در زنداں پہ ہنگامے ہیں برپا
یہ کس نے آگ گلشن میں لگا دی

مجھے چھوڑا تھا طوفانوں میں جس نے
کنارے پر اسی کی لاش نکلی

گلے مل کر ہوئے سیراب دونوں
اُسے بھی پیاس تھی پیاسے تھے ہم بھی

تمھیں بھی ناز ہے اختر کسی پر
مگر یہ بات تم کھل کر کہو بھی

غزلیں

سید رفعت رضا
موضع نسوہ تحصیل فرید پور
ضلع بریلی

تجھ کو بہتر ہے کہ منجملۂ اغیار ہی رکھ
قرب جنت ہے تو جنت کا طلبگار ہی رکھ

پھول سی سُرخ لبی میرا مقدّر نہ سہی
میری قسمت کی ہتھیلی پہ کوئی خار ہی رکھ

تو مری دید کی طفلانہ تمنا پہ نہ جا
اپنے جلووں کو پس پردۂ اسرار ہی رکھ

مفت مل جاؤں گا جس کو وہ گنوا دے گا مجھے
میرے حصے میں کوئی میرا خریدار ہی رکھ

تو مجھے کوئی خوشی دے نہیں سکتا تو نہ دے
لا مرے دوشِ مروّت پہ کوئی بار ہی رکھ

شاہدہ بیگم
نزد نہرو بوائز اسکول
کھنڈوہ (ایم۔ پی)

تجھ سے بچھڑ کے ایک مصیبت سی ہو گئی
خود سے بھی دور رہنے کی عادت سی ہو گئی

وابستہ چشم ناز سے کیا ہو گئی حیات
تھی زندگی جو خواب حقیقت سی ہو گئی

گزرے دنوں کی یاد رُلا تو گئی مگر
اتنا ہوا کہ روح کو راحت سی ہو گئی

محفوظ رہ سکے نہ خد و خالِ زندگی
آج آئینہ سے مجھ کو ندامت سی ہو گئی

سچ کی سزا یہ پائی کہ جلنے لگے ہیں ہونٹ
ہاں عمر بھر کو ایک نصیحت سی ہو گئی

دل ہو لہو لہو، کہ جگر پاش پاش ہو
ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی ہو گئی

آنسو، چراغ، تارے، اندھیرے، فراقِ شب
ان سب سے شاہدہ مجھے نسبت سی ہو گئی

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: **قدم قدم** (قومی نظموں کا مجموعہ) نام شاعر: نازش پرتاب گڈھی۔ قیمت: دو روپے۔ ملنے کا پتہ: بزم ادب و ادب۔ بیگم وارڈ پرتاب گڑھ۔

نازش اپنی بسیار گوئی کے لیے مشہور ہیں اور یہ حقیقت ہے بھی ہے کہ قومی اور وطنی موضوعات پر دس پندرہ شاعروں نے مل کر بھی اتنی نظمیں نہ لکھی ہوں گی جتنی تنہا نازش لکھ چکے ہیں اس بسیار گوئی اور زود نویسی کے باوجود ان کا ذہن ہنوز تر و تازہ ہے اور ان کا تخیل اب بھی بلند پروازی کے مظاہرے کر رہا ہے۔ قومی اور وطنی موضوعات پر لکھی جانے والی نظمیں عموماً سطحی اور سپاٹ ہوا کرتی ہیں جن میں شعریت کا فقدان ہوا کرتا ہے۔ لیکن اپنے طرز ادا، ندرت فکر، خلوص جذبات کی بنا پر نازش صاحب کی نظمیں پڑھنے اور سننے والوں پر بار نہیں گزرتیں بلکہ دعوت فکر دیتی ہیں اور ان کا ہر مجموعہ پہلے سے زیادہ مشاقی، قادر الکلامی اور معیار کی بلندی کا ثبوت دیتا ہے۔ زیر نظر کتاب نازش صاحب کی بیس قومی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ قومی موضوعات نہ صرف یہ کہ نازش کے محبوب موضوعات ہیں بلکہ انھوں نے اس دیار میں بڑی احتیاط، علمیت اور خلوص کے ساتھ فکر و فن کے چراغ روشن کیے ہیں انھیں ایک اچھے شاعر کی طرح خوشنما اور حسین الفاظ، ذہن اثر دوز تراکیب، تشبیہہ و استعارہ کے انتخاب اور استعمال کرنے کا مکمل شعور حاصل ہے اور بقول اعجاز صدیقی "موضوعات اور خیالات و اسلوب کے اعتبار سے جوش کے بعد ہونے والی نظریہ شاعری کے اعلیٰ اور معیاری نمونے نازش کے یہاں پائے جاتے ہیں۔"

نازش صاحب اس اعتبار سے اردو کی منفرد شاعر ہیں کہ ان کے یہاں قومی مسائل سے متعلق صحیح اور مثبت نقطۂ نظر ملتا ہے، جو خلوص اور جذبات سے بھرپور ہونے کے ساتھ ہی ساتھ انتہائی جرأت انگیز بھی ہے۔ نازش صاحب زہر ہلاہل کو قند کہنے کے لیے کبھی اور کسی وقت بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ثبوت کے طور پر ان کی نظمیں "یقین ہے مجھ کو" اور "ہم جویانِ وطن" پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کی نظم "محبانِ وطن" کے یہ اشعار دیکھیے ؎

وہ سارے تنگ ذہن انساں ملائیں اب نظر ہم سے\
وطن کے واسطے جو ہم کو اب خطرا سمجھتے ہیں\
ہر اک پہلو سے نکھرے ہیں محبانِ وطن پھر تو\
کھرے اترے ہیں ہم ہر آزمائش کی کسوٹی پر

نازش صاحب کی نظم "خواب آں عزیزم" اپنے لب و لہجہ وسیع النظری اور جمہوری نظریے پر مکمل اعتقاد و یقین کے لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یقیناً یادگار رہے گی جسے نصابی کتابوں کا ایک ضروری جزو قرار دیا جانا چاہیے اپنے عزیز وطن کی اہمیت و عظمت کا ذکر کرتے ہوئے نازش صاحب کے جذبات کی فراوانی اور فخر و انبساط کی توانائی دو بالا ہو جایا کرتی ہے ایسے موقع پر نازش صاحب ہمیشہ شعریت کی اعلا مثالیں پیش کرتے ہیں۔

یہ اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ لب جو\
کہ جیسے شیو نے بکھیرے ہوں دوش پہ گیسو

غلط کہا جو کسی نے کہا ہمالا ہے\
نثار کرنے کو دھرتی نے دل اچھالا ہے

یہ تیری سانولی جمنا نگار مست خرام\
کہ جیسے کرشن کی نظروں میں پریت کا پیغام

کچھ اس بہار سے آتی ہے اس جوار میں شام\
کہ جیسے زاہد کے لب پہ رباعی خیام

ان اشعار میں سادہ تشبیہیں خوبصورت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ خالص ہندوستانی بھی ہیں اور یہی نازش صاحب کے کلام کی خصوصیت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

میں حیات اللہ انصاری صاحب کے اس قول سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ سیاسی نظریہ عقیدہ کی پختگی اور ان دونوں کے ساتھ شدت احساس اردو کے کسی اور شاعر میں نہیں ہے۔

زیر نظر مجموعہ "قدم قدم" ہماری قومی شاعری کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ محمد عبدالقدوس

نام کتاب: نورِ عرفاں۔ نام شاعر: بسنت کمار بسنت۔ قیمت: بیس روپیہ۔ ملنے کا پتہ: دانش محل امین آباد لکھنؤ۔

بسنت کمار بسنت کی شاعری کی عشقیہ منزلیں زندگی کے تب و تاب کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی لیے ہوئے ہیں ان کے تغزل میں ایک انوکھا بانکپن نمایاں ہے جس میں جنسیات کے بہترین عناصر بھی موجود ہیں۔ عشق کی تاثیر، حسن کی برہمی معشوق کی بے وفائی کو بسنت نے اپنی غزلوں میں ایک انوکھے انداز سے سمویا ہے مثلاً ؎

شکن یہ کس کی جبیں پر ہے کون برہم ہے
دھواں دھواں نظر آیا ہے کائنات کا رنگ

بہت خلوص و ادب سے جو دیکھتا ہے مجھے
ہے اجنبی وہ مگر آشنا لگے ہے مجھے

ان کے دامن پر ہر آنسو داستاں ہو جائے گا
اپنے دامن پر گرا تو رائیگاں ہو جائے گا

دشمن ہو کائنات ہماری تو غم نہیں
اے دوست ڈر رہے ہیں تری برہمی سے ہم

ہما را حال عیاں تھا ہمارے چہرے سے
بچا کے سب سے نظر اس نے جب کیا آداب

خفا ذرا جو ہوئے ہیں نکھر گیا ہے جمال
بہت عزیز ہے ایسی ہی برہمی ہم کو

بسنت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نہایت خوبصورتی سے غم دوراں میں غم جاناں کو ڈھال دیا ہے

مزا تو جب ہے سزائیں بھی خوبصورت ہوں
کیے ہیں جرم بڑے ہی حسین حسین ہم نے

مفلس کے لہو سے ہے زردار کا گھر روشن
مظلوم کے اشکوں سے ہر سمت چراغاں ہے

جو امن جنگ سے حاصل ہوا اس سے کیا حاصل
دعائیں موت سے مانگو نہ زندگی کے لیے

بسنت کی شاعری کا دوسرا نمایاں پہلو ہندو مسلم اتحاد اور وطن پرستی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں حب الوطنی کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔

چمن میرا، چمن کے پھول میرے پتیاں میری
مگر یہ بات کہتے کانپتی ہے کیوں زباں میری

گرتے ہوئے اقوام کے کردار ملے ہیں
سب حق کے پرستار خطاوار ملے ہیں

کرتا نہیں اُف تک کوئی معصوم کے خوں پر
قاتل کے ہر سمت طرفدار ملے ہیں

بسنت کے کلام میں زبان کی شیرینی اور روانی ناقابل فراموش ہے۔

پہلو میں مسرت کے ہے الم، اس وقت کا عالم کیا کہیے
ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ پر گرتی ہوئی شبنم کیا کہیے

عشق نے آج پا لیا حسن کی دلکشی کا راز
اٹھی نگاہ دن ہوا، نظریں جھکیں تو آئی رات

'نورِ عرفاں' مجموعی طور پر حسن و عشق کا ایک شاہکار ہے جس میں غم دوراں بھی نمایاں ہے۔ کتاب کی ظاہری صورت بھی اچھی ہے۔ کاغذ بھی اچھا استعمال کیا گیا ہے لیکن کتابت کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ خلیل اللہ خاں

نام کتاب: موج در موج۔ شاعر: راجندر بہادر موج فتح گڈھی، قیمت ۲۰ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ دانش محل لکھنؤ۔ موج فتح گڈھی ہسپتال روڈ۔ فتح گڈھ

موج اردو زبان کے ناواقف سنگاپور میں منہمک کہنہ مشق و معروف شاعر ہیں۔ وہ کئی سال قبل "طوفان" اور "موج و ساحل" پیش کرکے اہلِ نظر سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ذوقِ شاعری ان کا ورثہ نہیں ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ وکیل ہیں اور انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی ذاتی محنت و کاوش سے حاصل کیا ہے، نہ شاعری ان کا ذریعہ معاش ہے نہ ذریعہ نام و نمود۔ اپنی پیشہ ورانہ سیاسی و سماجی خدمات سے متعلق مصروفیات کے باوجود تسکینِ ذوق کے لیے وقت نکال لیتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ان کا کلام ان کی فکر و نظر کا آئینہ ہے اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

"موج در موج" ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک اچھے شاعر کے یہاں ہونا چاہیے۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ ان کی غزلوں میں فنی نزاکتوں اور لطافتوں کے علاوہ وارداتِ عشق، زندگی کے اہم حقائق و مسائل، درد و اثر، زبان کی سادگی، فکر کی گہرائی اور قدیم و جدید اسالیبِ شعر کے حسین امتزاج کی خوبیاں موجود ہیں۔

ہمارے کلام کے علاوہ مجموعہ میں حمد و نعت، قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں جو شاعر کی مختلف اصنافِ شاعری پر دسترس کا واضح ثبوت ہیں۔ ان کی نعتیں بھی اظہارِ عقیدت کا اچھا نمونہ ہیں، چند اشعار دیکھیے:-

خالق نے سنوارا ہے ہر کام محمدؐ کا — گمراہوں کا سہارا ہے اک نام محمدؐ کا
حضرتؐ کی صداقت کی عالم نے گواہی دی — پیغامِ الٰہی ہے پیغام محمدؐ کا
ہر مذہب و ملت پر فیضان ہے کرم جاری — ممنون نہیں تنہا اسلام محمدؐ کا

اے موج سہارے کو طوفانِ حوادث میں
اک نام خدا کا ہے اک نام محمدؐ کا

——— عرفان عباسی

★

کرشن چندر اور ان داتا — صفحہ ۲۲ کا بقیہ

ہمیں کرشن چندر کے ناول "ان داتا" میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناظرین کو طلسمات کی سیر نہیں کرائی اور نہ ہوش رُبا داستانیں سنائی ہیں، بلکہ زندگی کے حقائق کو ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور ضعیت کی ماری انسانیت کو غم و اندوہ سے نجات دلانے کی سعی کی ہے۔

غزلیاتِ نظیر اکبر آبادی — (صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

تنقید نگار کے الفاظ میں" ارضی میلان کے مقابلے میں ایک آسمانی یا ماورائی اندازِ فکر کو اپنایا" اور دنیا اور اس کے لوازم کو چند روزہ اور غیر حقیقی قرار دے کر فقیری درویشی، مراقبہ، گیان دھیان اور ترکِ دنیا کی طرف ہمیں مائل کیا۔ انھیں دونوں عناصر کے اتصال اور امتزاج نے ہمارے ملک کی تہذیب کو جنم دیا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ شعری اور ادبی سطح پر اس تہذیب کی بھرپور انداز میں نظیر اکبر آبادی نے مکمل نمائندگی کی، ہندو دیوی دیوتاؤں کی طرف نظیر کا ذہنی جھکاؤ بلاوجہ نہیں ہے۔ کرشن سے ان کی ہم آہنگی اس لیے ہے کہ وہ وزیر آغا کے الفاظ میں" زرخیزی کی بھی علامت ہے اور علم و آگہی کا سرچشمہ بھی۔" اپنی پہلی حیثیت میں وہ گوپیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے اور دوسری حیثیت میں ارجن کے ساتھ رتھ کی باگیں سنبھالے اسے حیات و کائنات کے سربستہ راز دل سے آشنا کرتا ہے۔ شیو ایک طرف کیلاش کی چوٹی پر بیٹھ کر گیان دھیان میں مستغرق رہتا ہے اور دوسری طرف زمین پر اتر کر ناٹراج کا خطاب پاتا ہے۔ نظیر کی غزلوں کے دو اہم متضاد موضوعات جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے غزل کی ریزہ خیالی کے ساتھ ساتھ تہذیب اور معاشرت کے متضاد دھاروں کو بھی ہم آہنگ کرتے ہیں جن کی بہت سی مثالیں قدیم ہندوستانی علم الاصنام کی اساطیری شخصیتوں کی عظمت کی شاہد ہیں۔

بہادر شاہ ظفر نمبر

نیا دور

جلد ۳۶ نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

سرورق: آغا محمد حسن

عنوانات

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ جسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

بہادر شاہ ظفر نمبر پیش خدمت ہے۔ یہ نمبر بڑی عجلت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی تیاری کے لیے زیادہ وقت نہیں مل سکا۔ چنانچہ اسے نیا دور کے دیگر نمبروں کے ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی ضخامت بھی کم ہے۔ پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی حیات اور فن سے متعلق جو خاص خاص پہلو ہیں وہ اپنے تاریخی حوالوں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ نمایاں ہو جائیں۔ یہ نمبر جیسا بھی ہے اب آپ کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق ہمیں آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آپ نے نیا دور کے ہر نمبر کی قدر اور ہماری ہمت افزائی کی ہے۔ چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ یہ نمبر بھی بہر حال آپ کو پسند آئے گا۔

● جہاں تک بہادر شاہ ظفر کی حیات کا تعلق ہے، اس کے سلسلے میں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ وہ ایک عظیم الشان اور وسیع و عریض سلطنت کے آخری تاجدار تھے۔ لیکن ان کا دائرۂ اختیار اور ان کی سلطنت لال قلعے تک محدود رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی سازشوں اور مکر و فریب نیز اپنوں کی مفاد پرستی اور غداری نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ وہ بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ ان کی شاہانہ عظمت، شان و شوکت اور جاہ و جلال سب ختم ہو گیا اور ایسی کس مپرسی کے دن آ گئے کہ انھیں قرض تک لینا پڑتا تھا۔ وہ ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے بس میں کیا تھا، ان کے اختیار میں کیا تھا۔ ان کے پاس نہ دولت تھی نہ طاقت۔ سب کچھ تو چھن گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹوں کے سر قلم کر کے ان کے سامنے پیش کیے گئے پھر ایک دن انھیں اپنے پیارے وطن ہندستان سے دور رنگون بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے جلا وطنی کی زندگی بڑے ہی کرب میں گزاری اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا اور ساری بے بسی، کرب، کس مپرسی اور تمام ذہنی اذیتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی۔ لیکن جب تک وہ حیات رہے اور دلی میں رہے، ان کی حیثیت جنگ آزادی کے سالار اعظم کی رہی۔ تمام ملک نے انھیں اپنا رہبر تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح ان کی ذات ملک کے تمام مجاہدین آزادی کے لیے سر چشمۂ تحریک تھی۔ آزادی کے متوالے انھیں سے عزم و عمل کی تحریک لیتے تھے۔

ہندستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد دیکھنے کی ان کی تمنا محض مغلیہ سلطنت کی بازیابی اور عظمت رفتہ کے حصول سے ہی عبارت نہیں تھی، بلکہ خلوص دل سے وہ ایک آزاد اور متحد ہندستان کے آرزومند تھے، جس میں ہر شعبۂ حیات میں، ہر قدم پر مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا مظاہرہ ہو اور قومی و جذباتی ہم آہنگی کو فروغ حاصل ہو۔ اگر ایمانداری سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس وقت مغلیہ سلطنت کی بازیابی یا بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا مطلب تھا انگریزوں کے تسلط سے پاک ہندستانیوں کی اپنی حکومت کا قیام۔ لیکن انگریزوں کی چالوں اور اپنوں کی غداری نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اپنے ذاتی مفاد اور عارضی عیش و آرام کی خاطر ملک تک کو فروخت کر دینے والے عناصر انگریزوں سے مل گئے، جس کے نتیجے میں بہادر شاہ ظفر اور حریت پسندوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ لیکن ایثار اور قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ یہ قربانیاں اور شہیدوں کا خون رنگ لایا اور بہادر شاہ ظفر نیز تمام حریت پسندوں کا خواب بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو شرمندۂ تعبیر ہوا۔

جہاں تک بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا تعلق ہے، وہ ان کے تمام کرب اور ذہنی اذیتوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں جو کرب ہے، وہ تہہ در تہہ محسوس ہوتا ہے۔ افسردگی اور سوز نے ان کی شاعری کو اس دور کے معاشرے کا مرثیہ بنا دیا ہے۔ اس افسردگی اور سوز میں ایک ایسی نغمگی ہے جو دل کے تاروں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس تمام کرب، اذیتوں، افسردگی اور سوز کے باوجود انھیں قنوطی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ انھوں نے کہیں بھی مایوسی اور تھک کر بیٹھ رہنے کی بات نہیں کہی — یہ شعری اظہار ہی ان کی آخری پناہ گاہ تھی۔ اگر یہ وسیلہ بھی انھیں میسر نہ ہوتا تو شاید وہ گھٹ گھٹ کر بہت پہلے ختم ہو گئے ہوتے اور یہی شعری اظہار انھیں آئندہ بھی زندہ رکھے گا۔

● میں کل ہند بہادر شاہ ظفر اکاڈمی (وارانسی) کو مبارکباد دینا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں، جو ظفر کی یاد کو زندہ کیے ہوئے ہے۔ وارانسی میں ظفر کا مجسمہ نصب کرا کے اس اکاڈمی نے ایک مستحسن اقدام کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکاڈمی بہادر شاہ ظفر کی حیات اور ان کی شاعری کو نمایاں طور سے سامنے لانے کے سلسلے میں اور بھی قابلِ قدر خدمات انجام دے گی۔

—— ایڈیٹر

RAJ BHAVAN
LUCKNOW

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہے کہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش کی جانب سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ نیا دور بہادر شاہ ظفر کی یاد میں اپنا ایک خصوصی نمبر نکالنے جا رہا ہے۔

بہادر شاہ ظفر سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار اور اردو کے ایک ممتاز شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ملک کی پہلی جنگ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے۔ ایک ایسے سپہ سالار جو اس وقت آزادی کے لیے لوگوں کی تڑپ اور قومی اتحاد کے مظہر بن گئے تھے۔ اگر ہمیں اپنی آزادی اور اتحاد کو محفوظ رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، جو کہ ملک کی طاقت اور ترقی کی اولین شرط ہے تو ہمیں بار بار اپنے ان رہنماؤں کی زندگی کے اوراق الٹنا ہوں گے اور ان سے تحریک حاصل کرنا ہوگی جنہوں نے ملک کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں گریز نہیں کیا۔

بہادر شاہ ظفر دیش کے ایسے ہی رہنما تھے۔ ان کی یاد میں نیا دور کے خصوصی نمبر کی اشاعت پر میں محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کی کامیابی کے لیے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

چندریشور پرشاد نرائن سنگھ

پیغام

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کا ماہانہ اردو جریدہ نیا دور بہادر شاہ ظفر کے سلسلے میں ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کے رہبر تھے۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہاں تک کہ آزادی کی راہ میں ان کے بیٹوں کی جانیں بھی گئیں۔ ان کا سب کچھ چھن گیا۔ شاہانہ جاہ و جلال شان و شوکت، کچھ بھی باقی نہ رہا۔ انھیں ایک قیدی کی سی زندگی گذارنا پڑی۔ اس کے باوجود ان کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی، ان کے قدم کبھی ڈگمگائے نہیں اور انھوں نے آزادی کی قیمت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انھیں ہندستان سے دور رنگون جلاوطن کر دیا گیا اور وہیں انھوں نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ اس طرح اپنے وطن عزیز میں انھیں دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہیں مل سکی۔

وطنِ عزیز کے لیے انھوں نے جو ایثار کیا اور جو قربانیاں دیں، اس نے ان کی شخصیت کو بحیثیت ایک عظیم مجاہد آزادی لافانی اور قابل تقلید بنا دیا۔ لیکن ان کی شخصیت یہیں تک محدود نہیں تھی۔ وہ ایک فن کار اور شاعر بھی تھے اور فن شناس نیز فن کے قدردان بھی۔ اس طرح ان کی عظمت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کی اس عظمت کے سامنے اپنا سر خم کرتے ہوئے انھیں اپنا پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور نیا دور کے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

وشو ناتھ پرتاپ سنگھ

پیغام

میرے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش، کا اردو ماہنامہ نیا دور جنگ آزادی کے عظیم مجاہد اور سالار اعظم بہادر شاہ ظفر پر ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے مادر وطن کو فرنگیوں کے تسلط غلامی سے آزاد کرانے کے لیے ملک کی تمام حریت پسند قوتوں کو اپنے پرچم تلے متحد و منظم کیا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں بیداری کی روح پھونک دی۔ دلی انقلابیوں اور حریت پسندوں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن گئی اور سارے ملک کی نگاہیں دلی پر مرکوز ہو گئیں اگر حالات ان کا ساتھ دیتے اور قوم فروشوں اور وطن دشمن عناصر کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں ان کی راہ میں مزاحم نہ ہوتیں تو فتح و کامرانی یقیناً ان کے قدم چومتی۔ بہر حال وطن کے لیے ان کی بے مثال قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں اور اہل وطن کے دلوں میں آزادی کی وہ تڑپ اور حرارت پیدا کر گئیں جو نسل در نسل تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور بالآخر ہندستان کی آزادی کا ان کا خواب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو شرمندہ تعبیر ہو کر رہا۔ بہادر شاہ ظفر ایک عظیم انقلابی اور ہندستان کی اولین جنگ آزادی کے سالار اعظم اور روح رواں ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر، رواداری اور حب الوطنی کا پیکر، ہندستانی موسیقی کے رمز آشنا، قومی یکجہتی کے علمبردار اور پاکیزہ کردار اور اعلا اوصاف و اقدار کے حامل تھے۔ ملک ان کی عظیم قربانیوں کے لیے ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا۔ آزادی کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

میں بہادر شاہ ظفر پر شائع ہونے والے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

کاشی ناتھ مشر

(وزیر ریاست برائے اطلاعات و منصوبہ بندی
اتر پردیش)

حسرت الاکرام

بہادر شاہ ظفر

زندگی جس کی تھکی باہنوں کی بیباک صلابت پہ ہے نازاں وہ ظفر
زندگی جس کی فقیرانہ جلالت پہ ہے نازاں وہ ظفر
سرخرو جس کی حنا پاش قیادت سے ہوا معرکۂ آزادی
سرفروشانِ تمنا کا وہ پہلا سالار
جس کے پرچم تلے یکجا ہوئے لیلائے وطن کے عشاق
لیے سینوں میں دہلی کی آواز
جاں سپاری کا غرور اپنی جبینوں پہ لیے
نور آنکھوں میں لیے دلبریٔ فردا کا،
گردنوں — ہاتھوں — سروں کے لشکر
تختۂ جبر الٹنے کو بصد جرأت پیکار بڑھے
سیلِ جولاں کی طرح — قہرِ خراماں کی طرح
لیکن، افرنگ کی مذموم سیاست کا دغا پیشہ عتاب
جس کے ہاتھوں میں تھیں بندوقیں — دلوں میں چھریاں
سرفروشانِ تمنا پہ گرا برقِ بلا کی صورت
شیوۂ جبر کا انداز وہ تھا جیسے کسی آئینہ خانے میں کوئی دیوانہ
دونوں ہاتھوں میں سنبھالے پتھر
محوِ فریاد تھا ہر کوچہ و بازار کہ دلی میں قیامت آئی
اس قیامت کا نشانہ تھا دلِ افگارِ ظفر
وہ دلِ افگار — جگر دار ظفر
نذرِ تاریخ کیا جس نے لہو بیٹوں کا
کتنے سر صورتِ فانوس ہوئے آویزاں

جن کی تیکھی لویں محفوظ ہیں نادیدہ دفینوں کی طرح
بھاگتی صدیوں کے نہاں خانوں میں
چیخ کیا ـــــ بین کہاں ـــــ اشک فشانی کیسی !
فاتحے کی بھی سعادت نہ ہوئی جن کو نصیب
جن سے منھ پھیر کے بے مہر زمانہ گزرا

وہ ظفر ختم اک اک کر کے ہوئی جس پہ یزیدانہ جفاؤں کی مکمل فہرست
بے وطن جس کو کیا حب وطن کی غضب انجامی نے
کوچۂ یار میں دو گز نہ ملی جس کو زمیں
من سے رن تک جو رہا اپنی امنگوں کا حریف
رن سے من تک جو رہا اپنی امیدوں کا قتیل
وہ کہ تیمور کے ناموس کا تھا ایک نگہدارِ عظیم
ایک آنکھ ہندو کو ـــــ اک آنکھ مسلماں کو بنانے والا
مہرباں سب پہ تھا جو موتیاں برساتی گھٹاؤں کی طرح
مہرباں سب پہ تھا جو صبح کی معصوم ہواؤں کی طرح
بوجھ نے عظمتِ رفتہ کے، کیا جس کے کلیجے کو دونیم
خسروی جس سے پشیماں تھی [کوئی دکھ بھری تہمت جیسے]
لال قلعے نے جسے ایک زبوں کار سیاہی کے سوا کچھ نہ دیا
روز و شب کے الم لاتناہی کے سوا کچھ نہ دیا
ارجمندی نے کیے وار پہ وار
سربلندی رہی محوِ یلغار
ٹوٹی اس طرح کماں سطوتِ دیرینہ کی
تیر جتنے تھے، وہ پیوست ہوئے سینے میں
زخم ہی زخم تھے لمحوں کے چٹختے ہوئے آئینے میں
حریت جس کی ثنا خواں ہے، وطن مرثیہ خواں ہے جس پر
زندگی جس کی فقیرانہ جلالت پہ ہے نازاں وہ ظفر
وہ سخنور کہ غزل لکھے تو نوحہ بن جائے
تاجور ایسا کہ خود اپنا جنازہ بن جائے

اور دلّی کی تباہی

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے موضوع پر دستیاب مواد کا میں نے اپنی لیاقت کے بموجب مطالعہ کیا ہے اور اسے تحریری شکل میں پیش بھی کیا ہے، اس انقلاب کے خاص ابواب کو ڈرامائی شکل میں بھی میں نے ہندستان میں شاید پہلی بار پیش کیا تھا چنانچہ اس معاملہ میں میرے پیش کردہ تمام جواز و دلائل پر تاریخی اختلافات بھی پیدا ہوئے، البتہ اس سلسلہ میں متعدد تحقیقی امور سے میری تحقیق بھی بعض باتوں میں مطابقت رکھتی ہے۔

اگر نانا راؤ گھونت کو اپنے باپ کی نو لاکھ روپیہ کی پنشن مل گئی ہوتی، یا مہارانی لکشمی بائی کے متبنیٰ بیٹے کو جھانسی کا راجہ انگریزوں نے تسلیم کر لیا ہوتا تو وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل تھا کہ انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت اتنے بڑے پیمانہ پر رونما ہوتی۔ لیکن یہ امر مسلمہ تھا کہ انقلاب آ امر در اس لیے میرٹھ کی فوج کی بغاوت ناگزیر تھی۔ بہادر شاہ ظفر دلی کے تخت نشین ہوتے ہوئے اپنی لاچاری پر پیچ و تاب کھا رہے تھے، خاص طور سے انھیں انگریزوں سے شدید نفرت تھی۔ اسی نفرت نے کہ وہ دلی (ہندستان) کا تخت و تاج کسی کو بھی جو ہندستان سے انگریزوں کو باہر کر دے، حوالے کر دینا چاہتے تھے۔ میری یہ تحریر میرے اپنے خیالات و نظریات کی ترجمان ہے۔

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر

لارڈ کلائیو کے زمانہ میں بوڑھے مغل بادشاہ شاہ عالم کی جس طرح مٹی پلید ہوئی تھی اس کی دردناک کہانی سنانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اگر شاہ عالم گوالیار کے راجہ مہادجی سندھیا کے سایۂ عاطفت میں رہتے تو ان کو بہت فائدہ پہنچتا۔ در اصل شاہ عالم یا مغل سلطنت کی کمر مرہٹوں نے نہیں، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس وقت توڑ دی تھی جب بنگال کی دیوانی ان سے لکھا لی گئی تھی، بہرحال کسی طرح ردیٹ کر شاہ عالم بادشاہ بنے رہے، ان کے بعد اکبر شاہ تخت پر بیٹھے، اس وقت انگریز اپنے کو بادشاہ کا خادم قرار دیتے تھے اور دلی میں مقیم انگریز ریذیڈنٹ مسٹر سٹین بادشاہ کے حضور میں تسلیم، کورنش اور مجرا کیا کرتا تھا سکے بھی بادشاہ کے نام سے چلتے تھے اور ان پر کمپنی کا ذکر محض "بادشاہ کے فدوی خاص" کی حیثیت سے ہوتا تھا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ جس وقت وہ تخت پر بیٹھے، مغل سلطنت تقریباً آخری سانسیں لے رہی تھی۔ بادشاہ اکبر شاہ کے وقت میں ہی انگریزوں نے ان کے وہ سب حقوق غصب کر لیے تھے جن کا کمپنی نے شاہ عالم سے اقرار کیا تھا۔ اسی اقرار نامہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے اکبر شاہ نے راجہ رام موہن رائے جیسے معروف شخص کو اپنا وکیل بنا کر لندن بھیجا تھا لیکن راجہ صاحب کا وہیں انتقال ہو گیا لہٰذا لندن سے بھی کوئی امید باقی نہ رہی جس سے انگریز اور بھی دلیر ہو گئے اور دھیرے دھیرے وہ بادشاہ کی تحقیر و توہین بھی کرنے لگے، اکبر شاہ مرزا سلیم کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتے

اور مردہ ہو چکے تھے۔

میرٹھ میں ۱۰ مئی کو جب قبل از وقت انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی تو فرنگی کیسے رک سکتے تھے۔ کارتوس نہ لینے کے جرم میں تقریباً ۸۵ سپاہیوں کے ہتھیار رکھوا دیے گئے تھے۔ وہ قید کر لیے گئے۔ کچھ دیسی سپاہی جب شہر گھومنے آئے تو بنگھٹ پر پانی بھرنے والی عورتوں نے ان کو پھٹکار سنائی کہ تمھارے بھائی قید ہو گئے ہیں اور تم کو شرم نہیں آتی۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ جاہل عورتوں نے ہی میرٹھ میں انقلاب برپا کرا دیا۔ اور انقلابی فوج نے دلی کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت مذہب کا جوش تھا اور پھر لوگوں کے دلوں میں فرنگیوں کے لیے نفرت بھر گئی تھی۔ دلی کو ۱۶ مئی کو آزادی حاصل ہو گئی، بزرگ بادشاہ ہندستان کے بادشاہ بن گئے۔ اور پھر تو وہ دیوانوں کی طرح گھوم گھوم کر بغاوت کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ ہاتھی پر بیٹھ کر دلی کی گلیوں میں گھوم گھوم کر وہ خود جنگ کا اعلان کرتے تھے اور عوام کو سمجھاتے تھے کہ یہ لڑائی فرنگیوں کے خلاف ہے۔ اس وقت انگریزوں نے ایک گہری چال چلی جس کا اعتراف دلی کے اس وقت کے ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف نے کیا ہے۔ پنجاب میں بہادر شاہ کے نام سے ایک جعلی فرمان جا بجا چپکا دیا گیا اس میں شاہ نے مسلمانوں کو ہدایت دی تھی کہ سکھوں کو جہاں دیکھو، مار ڈالو، یہ جعلسازی کام کر گئی اور حب الوطنوں کے لاکھ سمجھانے پر بھی سکھوں کی غلط فہمی دور نہ ہوئی۔ کمپنی نے ایک اور جعل سازی کی۔ انگریز بہت زیادہ شرح سود پر پنجاب میں سکھوں اور کھتریوں سے روپے لینے لگے جس کے باعث فرنگیوں کا وہاں قدم جمانا اہل پنجاب کے تجارتی مفاد میں ہو گیا۔ ایک کام اور کیا گیا۔ پنجاب میں جہاں کہیں ہندستانی پلٹنیں تھیں ان کے ہندو یا مسلمان سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے گئے اور ایسی بغیر ہتھیار کی پلٹنوں کی کافی بری حالت ہوئی۔ کئی ہزار سپاہی گھر بھی نہ لوٹ پائے اور بیچ ہی میں مار ڈالے گئے۔ کئی سو سپاہیوں کا ایک دستہ دہلی آ رہا تھا۔ انگریزوں نے یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے کہ وہ بغاوت میں حصہ لیں، سیکڑوں سپاہیوں کو بری طرح بھون ڈالا اور ایک کنویں میں ان کی لاشیں پھینک دی گئیں۔ انبالہ کا یہ حادثہ آج بھی ہمارے اندر سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ انبالہ میں انگریزوں کے کالے کرتوتوں کی کہانی بڑی خوفناک ہے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۵۷ء کو انبالہ میں ۲۶ نمبر کے ایک دستے کے ۵۰۰ نہتے . . . .
سپاہیوں کو جس بے دردی سے انگریزوں نے بھون ڈالا تھا اس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔

بہادر شاہ بہت ہی نیک اور ذہین آدمی تھے۔ انھوں نے دلی میں ایک بھی انگریز عورت اور بچے پر ظلم نہ ہونے دیا۔ غدر کے بعد انگریزوں نے اس کے بڑے بھونڈے اور جھوٹے قصے گڑھ کر ولایت میں پھیلائے تھے اور دلی کی ہار کے بعد انھوں نے وہاں پر جو بہیمانہ اور انسانیت سوز کشت و خون کیا تھا اس کی گواہی جھوٹی گواہیوں سے دی جا رہی لیکن کسی بھی مستند مورخ نے اس کو سچ نہیں مانا ہے۔ انقلاب کے بعد جو سرکاری جانچ کمیشن بیٹھا تھا اس نے بھی پورے ملک میں ایک بھی مثال ایسی نہیں پائی جہاں کسی انگریز عورت کے ساتھ کوئی بدسلوکی ہوئی ہو۔ ہندستانی کردار کی اس بلندی کی غیر ملکی مورخین نے کھل کر تعریف کی ہے۔ اس وقت کی کمپنی کی خفیہ پولس کے چیف سر ولیم میور کہتے ہیں کہ دلی میں یا اور کہیں کسی انگریز عورت کی بے عزتی نہیں ہوئی۔ دلی میں ایک ایک انگریز پکڑ کر مار ڈالا گیا لیکن کسی عورت یا بچے کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ افسوس اس کا بدلہ انگریزوں نے ہمیں یہ دیا کہ دلی فتح کرنے کے بعد ہر گلی کوچے میں ہندستانی عورت، بچے بوڑھوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔

دلّی کے نشیب و فراز

اس طرح بہادر شاہ نے دلی پر پورا اختیار ہوتے ہی بڑی ہوشیاری سے مناسب ڈھنگ سے حکومت شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس وقت بھی ہمارے دماغ میں کسی اچھے خاندان والے کی ماتحتی میں کام کرنے کی عادت

تھی اور اگر چھوٹی حیثیت کا آدمی افسر بن جاتا تو لوگوں کو ناگوار ہوتا اور حکم ماننے میں پریشانی ہوتی۔ لیکن شہزادے سے کام نہیں چل رہا تھا۔ رسد کا سامان اکٹھا نہیں ہو پاتا تھا، شہر میں کمپنی کا بارود کا کارخانہ تھا۔ اس میں آگ نہ لگا کر اس کا سامان قبضہ میں لیا جا سکتا تھا۔ دلی کے بچاؤ کے ساتھ ہی شہر کے باہر دور دور جا کر انگریزی فوج کو بھگانا چاہیے تھا۔ تحفظ کے لیے حملہ کرنا ضروری تھا لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ جون کے اواخر تک دلی کی اندرونی بدحالی کافی بڑھ گئی تھی۔ قیمتی وقت چھوٹی باتوں میں برباد ہو چکا تھا۔ بزرگ بادشاہ سے زیادہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی خوش قسمتی سے بہادر محمد بخت خاں روہیلکھنڈ سے ایک بڑی فوج لیکر ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دلی آ پہنچے۔ وہ اپنے ہمراہ ۴ لاکھ روپے نقد بھی لائے تھے یہی نہیں۔ اپنی پندرہ ہزار کی فوج کو خوش رکھنے کے لیے اسے چھ ماہ کی پیشگی تنخواہ بھی دے چکے تھے، بادشاہ کو ڈوبتے میں تنکے کا سہارا ملا، انھوں نے بخت خاں کو دلی کا گورنر مقرر کیا لیکن ہندستان کی بدقسمتی سب پر سوار تھی۔ اس چھوٹی حیثیت کے آدمی کی حکومت لوگوں کو ناگوار ہوئی اور ہر مشکل وقت پر اس کے کام میں رکاوٹیں ہی پڑتی تھیں۔ اسے بڑے بڑے سرداروں کا تعاون نہ مل سکا۔

لیکن بہادر بخت خاں نے ۹ جولائی کو انگریزی فوج کو ایسی زبردست شکست دی کہ ان کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ وہ شاید کچھ اور کامیاب ہوتے لیکن ہندستان کی بدقسمتی انگریزوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ انگریزوں نے نہایت ہوشیاری سے بہادر شاہ کے دیوان اور سمدھی الٰہی بخش خاں کو ملا لیا۔ اس مکار نے بہادر شاہ کو ایسا زبردست دھوکہ دیا کہ اس کی کہانی بڑی دردناک ہے۔

پھر بھی دلی بخت خاں کی اہلیت و صلاحیت کے باعث کافی عرصے تک انگریزوں کے شکنجے میں نہ آ سکی۔ اگر بخت خاں کی بات تسلیم کر لی گئی ہوتی تو فوج نے میدان میں باہر نکل کر انگریزوں کو دور تک بھگا دیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ وہ گھیرے میں پڑ گئے۔ دلی محصور تھی، بار بار حملے ہوتے رہے، بڑی مشکل کا وقت تھا لیکن پھر بھی عوام بہت صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے اور اپنے اوپر حملے برداشت کر رہے تھے۔

اس وقت انگریز بھی بڑی مصیبت میں تھے۔ انہی دنوں لارڈ کیننگ نے پنجاب کے حکمراں جان لارنس کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے رونا رویا تھا کہ دیناج پور کو چھوڑ کر، جہاں ایک کمزور انگریزی پلٹن ہے، کلکتہ سے دلی تک ۷۵۰ میل میں ایک بھی انگریزی سپاہی نہیں ہے۔ اس وقت صرف یہی ہو سکتا تھا کہ بہادری سے لڑا جائے اور جتنی جلد ہو سکے فوج تیار کی جائے۔ اگر آگ پھیلنے سے قبل ہی دلی کے بلوائی کچل دیے جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ اس کے صحیح استعمال پر ہی سب کچھ منحصر ہے۔ دیر ہونے سے کانپور، بنارس، اور اودھ پر برا اثر پڑے گا۔

اسی لیے سب سے پہلے دلی کی بغاوت اور انقلاب کے مرکز کو ختم کیا کہ انگریز بغاوت کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے چنانچہ دلی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی جا رہی تھی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر میرٹھ میں بغاوت نہ ہوئی ہوتی تو دلی میں آگ نہ لگتی یا لگتی بھی تو کیسے۔ وقت بعد کارتوس کے ہی معاملہ کو لے کر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس وقت میجر جنرل ہوٹ وہاں کمانڈر تھے۔ بغاوت کی شروعات تیسری ملکی گھوڑ سوار فوج اور گیارھویں اور بارھویں نمبر کی پیدل فوج میں ہوئی اور کارتوس لینے سے انکار کرنے پر ۸۵ سپاہیوں کو طویل قید کی سزا دی گئی تھی، ان کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ ۱۰ مئی کو اتوار تھا، اسی دن شام کے وقت جب کہ انگریز اپنے گرجا میں جمع ہو رہے تھے، ان پر حملہ ہو گیا۔ گیارھویں نمبر کی پلٹن نے اپنے کرنل کو مار ڈالا۔ بغاوت کا رخ دلی کی طرف ہو گیا۔ ۱۴ مئی کو یہ فوج دلی پہنچی اور اس نے وہاں کی فوج پر حملہ کر دیا۔ کشمیری دروازہ اور قلعہ کے بیچ میں بارود خانہ تھا، باغی اسے اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ انگریزی فوج کے سپہ سالار نے

بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھا تو جان پر کھیل کر اس میں آگ لگا دی۔ اندر کے سبھی انگریزوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن حملہ آوروں کے ۲۰ ہزار سپاہیوں کی لاشیں بھی ہوا میں اڑنے لگیں۔ پھر بھی انقلابیوں کو تین ہزار من بارود ملا۔ شام تک انگریز بھاگ گئے یا ختم کر دیے گئے۔ شہنشاہ بہادر شاہ بادشاہ تسلیم کر لیے گئے۔ دلی آزاد ہو گئی۔

اس وقت دلی سے ۱۲۰ میل کی دوری پر انبالہ میں جنرل برنارڈ اپنی فوج سمیت موجود تھے۔ دلی کی خبر سنتے ہی انھوں نے اس کے تحفظ کے لیے ۱۷ مئی کو شری انیسن کی زیر نگرانی فوج روانہ کر دی۔ وہ بڑے قابل فوجی تھے۔ کریمیہ کی جنگ میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انبالہ سے چل کر انیسن دلی سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع کرنال ۲۴ مئی کو پہنچے۔ یہیں پر ان کو ہیضہ ہو گیا اور ۲۷ مئی کو انتقال کر گئے۔ اگر انیسن کو موت نے اپنے شکنجے میں نہ لیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ دلی پر جلد جوابی حملہ کر دیتے۔

لیکن دلی پر انگریزی حملہ کا تانتا جلد ہی بندھ گیا۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں برنارڈ وغیرہ کو دلی کی فوج نے تین بار شکست دی لیکن پانسہ جلدی پلٹ گیا۔ ۴ جون ۱۸۵۷ء کو جھانسی میں انقلاب شروع ہوا تھا۔ اور اس کے چار دن بعد ہی یعنی ۸ جون کو بہادر شاہ کی ایک بڑی فوج کو بندیل کی سرائے کی لڑائی میں زبردست شکست کھانی پڑی۔ اس شکست کا محض ایک سبب تھا دلی میں رہنماؤں کی کمی۔ شہنشاہ کے بیٹے مرزا مغل سپہ سالار تھے لیکن وہ اپنے عہدے کے بالکل نااہل ثابت ہوئے تھے۔ مدد کے لیے بہادر شاہ نے جے پور، جودھپور، بیکانیر سب کو خط لکھے لیکن ٹمٹماتے چراغ کا ساتھ کون دیتا ہے۔ کسی طرح شہنشاہ دلی کو ان شکستوں کے بعد بھی بچائے رہے۔ ۲۳ جون کو پلاسی کی جنگ کی صدی تھی۔ اسی جنگ میں انگریزوں نے ہندستان میں قدم جمائے تھے۔ انگریزی فوج کو اسی دن شکست فاش دینے کا شہنشاہ کی فوج نے عہد کیا۔ جم کر جنگ ہوئی۔ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے، وہ ہار کر بھاگنے والے تھے کہ ایک ہندستانی پلٹن ان کی مدد کے لیے پہنچ گئی اور اس طرح جیتی بازی ہم ہار گئے۔

شہنشاہ کے ساتھ غداری

بخت خاں کے آ جانے سے بوڑھے شہنشاہ کو بڑا اطمینان ہو گیا تھا، بڑا سہارا مل گیا تھا، بخت خاں بھی بڑا قابل سپہ سالار تھا لیکن بدقسمتی سے بادشاہ اس مشکل وقت میں اس سچے ہمدرد کی صلاح نہ مان کر اپنے سمدھی الٰہی بخش کی باتوں میں آ گئے۔ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو روہیل کھنڈ سے چودہ ہزار کی فوج لے کر محمد بخت خاں دلی آئے تھے جس سے دلی کی فوج مضبوط ہو گئی تھی لیکن الٰہی بخش انگریزوں کا مخبر بن گیا تھا جو دلی کا سب راز دشمن کو پہنچایا کرتا تھا۔ انگریزوں کو اتنا بڑا مخبر مل جانے کے سبب بہت آسانی ہو گئی۔ ۷ ستمبر کو انھوں نے پھر حملہ کر دیا۔ ۱۳ ستمبر تک بخت خاں انھیں برابر شکست دیتا گیا۔ انگریز خوب پٹے اور اگر موقع پر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہوتا تو ان کی کمر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتی۔ ۱۴ ستمبر کو زبردست جنگ ہوئی۔ انگریزوں کی طرف سے نکلسن دلی میں داخل ہوئے تھے ان کے پاس اس وقت ۱۰۷۴۸ انگریز سپاہی تھے باقی سکھ اور گورکھے وغیرہ تھے۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے شدید جنگ ہوئی تھی یہ جنگ ۲۴ ستمبر تک جاری رہی۔

۱۹ ستمبر کو بخت خاں نے بادشاہ کو دلی سے بھاگ چلنے پر راضی کر لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ انھیں محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے اور اطمینان سے دلی میں لڑائی ہو۔ شہر کا محفوظ بنانا ممکن نہ تھا انگریزوں کے پاس کافی پلٹن تھی۔ اس میں سکھ تھے، گورکھے تھے نوکری کے لالچی کافی ہندو اور مسلمان بھی تھے۔ دلی چاروں طرف سے گھر گئی تھی، عوام بھوکے مر رہے تھے۔

بادشاہ کی دلی چھوڑنے کی خواہش انگریزوں کو معلوم ہو گئی انھوں نے الٰہی بخش کو سکھا پڑھا دیا کہ بوڑھے بادشاہ کو دلی مت چھوڑنے دو، شہر سے باہر مت جانے دو۔ اس مکار نے خوب سمجھایا کہ آپ کی بھلائی دلی میں مقیم رہنے میں ہی ہے۔ یہ یقین دلایا کہ بادشاہ پر بھی انگریزوں سے سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حفاظت اور

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

آخری تاجدارِ زمینِ وفا

وقار خلیل

مرکزِ علم و دانش کا تھا رہنما
مغلیہ سلطنت کا وہ پیرِ جواں
جس پہ سایہ فگن تھے مہ و کہکشاں
آخری سانس تک سامراجی لٹیروں سے لڑتا رہا
آج یہ بات جیسے کہانی ہوئی
اک صدی سے زیادہ زمانہ ہوا

دشتِ تیرہ میں تھا، عزم کی روشنی
پستیوں میں بلندی کا رازِ نہاں
جس کی مجبور آنکھوں کی پہلی کرن
صبحِ نو کی بشارت کی مظہر بنی
قلعۂ سرخ[1] پر پوری قوت سے ہے
آج بھی پرچمِ حریت سربلند
اک صدی سے زیادہ کا ہے واقعہ

اک شہنشاہ نے اپنی تقدیر کو!
یوں پشیماں کیا زندگی رو پڑی
شہرِ دلی سے بہت دور رنگون میں
آخری تاجدارِ زمینِ وفا
نقشِ عبرت کی صورت نہاں ہو گیا
جاوداں ہو گیا
اک صدی سے زیادہ زمانہ ہوا:

وہ کہ تنویرِ صبحِ بہاروں کی ضو
اس کی فکر و نظر، روشنی روشنی
اس کی پرچھائیاں، زندگی زندگی
جادۂ نور پر پوری سرعت سے ہے
اس کا ہندوستاں اب رواں اور دواں
خاورِ صبح: تیری اشارت سے ہے
جام برکف، سبو در بغل ضوفشاں
اک صدی سے زیادہ کا ہے واقعہ

---

[1] لال قلعہ دلی

خضر برنی

بہادر شاہ ظفر

مظلوم شہنشاہ، مغموم شاعر

بہادر شاہ ظفر غالب کی طرح محشر خیال نہیں تھے وہ ذوق کی طرح معمار بھی نہیں تھے اور مومن کی طرح پاکبازی کی منزل پر گامزن بھی نہیں تھے۔ تاہم ایک گداز دل کی فریاد ماتم مایوسی اور بے بسی کو منظوم کرنے میں طاق ضرور تھے۔

بہادر شاہ ظفر کا سارا عہد شباب تخت نشینی کی آرزو میں کٹ گیا پھر جس عمر میں وہ بادشاہ بنے مسرت و شادمانی سے دور تھکن کی منزل تھی۔ حکومت محدود و آرزو میں ناکام "دہلی تا پالم" چہار دیواری کے اندر۔ سکون قلب اور اطمینان تو جیسے ان کے لیے تھا ہی نہیں اس طرح ان کی زندگی سوز و الم کی علامت بن گئی تھی۔

ایک طرف ظفر کے کچھ پرستار یا مفاد پرست ظفر کی مدح سرائی کے لیے قصیدہ خوانی کر رہے ہیں، ان کی فضیلت بیان کر رہے ہیں تو دوسری طرف خود ظفر اپنی کم مائیگی، اپنی بے بسی، اپنی مظلومیت اور اپنے حالات کی ترجمانی کے لیے المیہ غزلیں کہہ رہے ہیں ؎

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

ظفر کو ان کے رنگ تغزل کے اعتبار سے منفرد مان بھی لیا جائے تو بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے شاہ نصیر اور ذوق جیسے استاد فن اور قادر الکلام شعراء کا بعض جگہ اتباع کیا ہے البتہ ظفر نے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ظفر کے چاروں دواوین میں ایسے ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو اپنے اندر کمالِ فن کے علاوہ احساس کی تڑپ اور تخیل کی ندرت لیے ہوئے ہیں۔

شاہ نصیر کی شاعری اپنے کمال فن کے علاوہ احساس کی تڑپ اور تکلفات اور اپنی آرائش و زیبائش سے کچھ دیر کے لیے ہمارے ذہن کو متاثر ضرور کر دیتی ہے تاہم ایسی شاعری دلوں میں گرمی نہیں پیدا کر پاتی۔ ظفر اپنے استاد سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے خاکستر میں کچھ چنگاریاں ضرور رکھتے ہیں۔ اپنی آگ میں جلنے کی جو کیفیت ظفر کے یہاں ملتی ہے وہ مثالی ہے۔ ظفر کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو صدیوں سے شعر و ادب کا گہوارہ تھا، مگر بعد میں "شمشیر و سناں" کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی اور نغموں کی بہار سے ماحول عطر بیز ہو گیا تھا۔ رنگا رنگ محفلوں میں شعر و ادب کا بول بالا تھا۔ اس دور کے بعد بہادر شاہ ظفر کو وہ دن بھی دیکھنا پڑے جن میں سراسیمگی، دہشت، ظلم و تشدد اور بربریت کا بازار گرم تھا اور فرنگیوں کا جال ہر طرف بچھ چکا تھا۔

اس ماحول میں جو کشمکش، کرب اور اذیت تھی، اس نے ظفر کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ جہاں تک ان کی شعری و فنی خصوصیات کا تعلق ہے، انھوں نے فن کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور مشکل قافیے استعمال کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت بھی دیا۔ اپنی مشکل پسندی کے سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں ؎

ظفر مشکل پسندی تیری سی اب کس کو آتی ہے
سخن ور دیکھ کر یہ طرزِ مشکل ہاتھ ملتا ہے

محمد حسین آزاد گو ہر چند کہ ظفر کی شاعرانہ حیثیت کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے لیکن انھوں نے ظفر کی اس خصوصیت کی داد دی ہے کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ کہلانے کا مستحق ہے۔ بندش کی خوبی، ترکیب کی حلاوت اور سنگلاخ زمین میں پھول کھلانا ظفر کی خصوصیت تھی۔ منفرد اور انوکھے قافیوں کا استعمال خشک اور طویل ردیفوں کی ایجاد میں ظفر شاہ نصیر اور ذوق سے کم نہیں ہے

جس روز ٹھہری آنے کی اس برق وش کی یاں
گھر کا مرے چراغ سرِ شام ہنس پڑا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

آشنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

ظفر کو اگرچہ تصوف سے کوئی گہرا شغف نہیں تھا لیکن ان کی بعد کی شاعری میں کہیں کہیں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے، شاید اس لیے کہ ظفر کو میاں کالے خاں نبیرۂ مولانا فخر الدین سے بیعت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ اپنے اشعار میں مولانا فخر الدین سے عقیدت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں ؎

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ کو جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

لیکن ان اشعار میں محویت، وجدانی کیفیت اور وارفتگی ظاہر نہیں ہوتی۔ محویت "پرستاری اور عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" والی تڑپ بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ ظفر کے رنگ سے ظاہر ہے کہ ان کا عاشق ارضی اور مجازی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن سراپا، معاملہ بندی، شکوے گلے، ہجر و فراق سب کچھ نمایاں طور سے موجود ہے ؎

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
پسِ مرگ میرے مزار پر کوئی فاتحہ بھی پڑھے کہاں
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

ظفر اپنے احساسات کا آزادانہ اظہار بھی کرنے سے معذور تھے قلعے کے اندر اور باہر جاسوسوں کے جال بچھے ہوئے تھے، وہ پرچہ نویسوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی باخبر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اشعار کے ذریعہ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کیا۔ غزل کے تیکھے پن حرارت آمیزی، شدت بیانیہ، رمزیت اور ایمائیت اور "بادہ و ساغر کی آڑ میں" مشاہدۂ حق کی گفتگو" کی صلاحیت سے ظفر نے جس خوبی سے کام لیا وہ مثالی ہے۔ انھیں آنے والے طوفان و حوادث اور حالات کی ابتری کا علم تھا۔ تاہم قفس کا پرندہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ پنجرے میں پھڑپھڑائے، چلائے کون سنتا ہے۔ پنجرے سے سر ٹکرائے، بال نوچے، دل خراش نغمے بکھیرے اور خاموش ہو جائے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بہادر شاہ ظفر پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ وہ افغانستان اور روس سے ساز باز رکھتے تھے اور یہ کہ انھوں نے حریت پسندوں کی بالواسطہ حمایت کی تھی۔ فرنگیوں کے خلاف ظفر کا غم و غصہ اور ان کی بے بسی اور معذوری ان کے ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے ؎

قفس کے ٹکڑے اڑا دوں تڑپ تڑپ کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم قفس یدل ہے

اور بکھیڑا یہیں کا سب یہیں
ایک تیرا داغ ہم لے کر چلے

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

★

کاظم رضوی

ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کے

مجاہدِ اعظم

ہندستان نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو صدیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ دیں اور غیر ملکی تسلط سے آزادی حاصل کرلی۔ آج ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اسے ترقی پذیر ممالک میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے جس پر ہمیں فخر ہے لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندستان کی آزادی کا ل کی داغ بیل ۱۸۵۷ء کی اولین جنگ آزادی کے دوران پڑ چکی تھی جس کے سپہ سالار اعظم آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہندستان کی اولین جنگِ آزادی کی کمان سنبھالی اور اپنے پرچم تلے سرفروشانِ وطن کو جمع کرکے ملک کو فرنگیوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے۔ انھیں ملک گیری یا کشور کشائی کی ہوس نہ تھی، نہ ان کے سامنے کوئی ذاتی مفاد تھا، وہ تو مادر وطن کو غلامی کی زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ یہی وہ عظیم جذبہ تھا جس نے انھیں حریت پسند عناصر کی قیادت سنبھالنے پر مجبور کیا۔ اگر حالات ان کا ساتھ دیتے اور وطن فروشوں اور غداروں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں ان کی راہ میں حائل نہ ہوتیں تو یقیناً کامیابی ان کے قدم چومتی۔ بہرحال ان کی یہ کوشش ناتمام اور جہد ناکام رائیگاں نہیں گئی اور محبان وطن کے دلوں میں آزادی کی وہ تڑپ اور حرارت پیدا کر گئی جو نسل در نسل فزوں سے فزوں تر ہوتی گئی۔

درحقیقت بہادر شاہ ظفر اور دیگر انقلابیوں کی عظیم قربانیوں نے ہندستان کی آزادی کی راہ ہموار کی اور بالآخر فرنگیوں کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ملک اپنے اس آبرو سورما اور مجاہد اعظم نیز مادر وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دینے والے دیگر انقلابیوں کا ہمیشہ ممنون رہے گا۔

ہندستان کی جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد، قومی اتحاد کی علامت اور اردو کے ممتاز شاعر ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو دہلی کے لال قلعہ میں بیگم لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے اس وقت ظفر کے دادا شاہ عالم دہلی کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملے سے سلطنت مغلیہ کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بادشاہ کے تمام اختیارات چھین لیے تھے بہادر شاہ نے یہ تمام واقعات دیکھے تھے اور ان کے دل پر ان سب کا گہرا اثر پڑا تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے ۳۰ دسمبر ۱۸۳۷ء کو سلطنت مغلیہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ سلطنت کی زبوں حالی سے پوری طرح باخبر تھے اور انھیں حالات کی سنگینی اور ابتری کا پورا علم تھا جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

جوں بوئے گل رفیقِ نسیم چمن ہیں ہم
اے دوستو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تمام اہل وطن نے مغل سلطنت کے اس ٹمٹماتے چراغ کو اپنا بادشاہ

تسلیم کر لیا۔

اس موقع پر بہادر شاہ ظفر نے خود اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک خط لکھ کر جے پور، بیکانیر، جودھپور، الور اور دیگر متعدد راجاؤں کے پاس بھیجا تھا۔ یہ حسرت سے بھرا خط دلی کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی پورے ہندستان کے لیے ان کی عقیدت اور وسیع القلبی کا آئینہ دار ہے۔

بہادر شاہ کے احساسات و تاثرات کے آئینہ دار اس خط کا متن حسب ذیل ہے:

"میری دلی خواہش ہے کہ جس طرح سے اور جس قیمت پر بھی ہو سکے فرنگیوں کو ہندستان سے باہر نکال دیا جائے۔ میری یہ زبردست خواہش ہے کہ تمام ہندستان آزاد ہو جائے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے جس انقلابی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایسا شخص، جو اس تحریک کے تمام بار کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے، اور خود کو تمام قوم کا نمائندہ کہہ سکے، میدان میں آ کر اس انقلاب کی قیادت اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔ انگریزوں کو نکال دیے جانے کے بعد اپنے ذاتی فائدہ کے لیے ہندستان پر حکومت کرنے کی مجھ میں ذرا بھی خواہش باقی نہیں ہے۔ اگر آپ سب ملک کے بادشاہ کے دشمن کو نکالنے کی غرض سے اپنی تلوار کھینچنے کے لیے تیار ہوں تو میں اس بات کے لیے راضی ہوں کہ اپنے تمام شاہی اختیارات اور حکومت دیسی راجاؤں کے کسی ایسے گروہ کے ہاتھ میں سونپ دوں جسے اس کام کے لیے چن لیا جائے۔"

شہنشاہ نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو ہٹا کر دلی کی افواج کی سپہ سالاری بخت خاں کو سونپ دی اور کہا۔

"بہادر! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے، اس لئے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ میں نہیں، میرے خاندان میں نہیں، نہ سہی، تم یا اور کوئی ہندوستان کی لاج رکھے، ہماری فکر نہ کرو اپنے فرض کو انجام دو۔"

بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں یہ اولین جنگ آزادی یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی اگر چند وطن فروش اور غدار اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اس سپہ سالار اعظم کے منصوبوں پر پانی نہ پھیر دیتے۔ بہرحال ان ملک دشمن عناصر کی سازشوں کے باعث میجر ہڈسن نے مکر و فریب سے بہادر شاہ ظفر کو قید کر لیا۔ نام نہاد فرنگی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں جلاوطنی اور تاعمر نظر بندی کی سزا دی گئی۔ ظفر کو قید کر کے ان کی بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کے علاوہ ۳۴ دیگر افراد کے ساتھ رنگون لے جایا گیا۔

بہادر شاہ جب جیل کی آہنی سلاخوں کے اندر قید تھے تو ان کے شہزادوں کے سر کاٹ کر ان کے سامنے لائے گئے تھے۔ سروں کو پیش کرتے ہوئے ہڈسن نے بہادر شاہ سے کہا۔

"کمپنی کی جانب سے یہ آپ کی نذر ہے جو برسوں سے بند تھی۔"

بہادر شاہ ظفر نے جوان بیٹوں اور شہزادوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز صبر و استقلال کے ساتھ منہ پھیر لیا اور کہا،

"الحمد للہ! تیمور کی اولاد ایسی ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی۔"

رنگون کی قید و بند میں ہی زندگی کے آخری ایام فقر و فاقہ اور انتہائی عسرت و تنگدستی کے عالم میں بسر ہوئے۔ رنگون کے ایام اسیری کی متعدد تصنیفات ان کی یادگار رہیں۔ آخر رنگون کے

زنداں میں ہی، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو اس پیکرِ عظمت، ہندستان کی جنگِ آزادی کے دلیر اور جانباز سپاہی، قومی جذبات کے ترجمان زندۂ جاوید شاعر، ہندستانی موسیقی کی باریکیوں کے رمز شناس ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اس طرح مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا۔

آج بھی ان کی یہ غزل اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں ہندستان سے کتنی محبت تھی اور وہ اس کی آغوش کو اپنی آخری آرام گاہ بنانے کے کتنے آرزومند تھے ؎

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اگرچہ ظفرؔ کی یہ خواہش اس وقت تو پوری نہ ہو سکی لیکن بعد میں کل ہند بہادر شاہ ظفر اکاڈمی نے وارانسی میں ان کا ایک مجسمہ نصب کرا کے تقریباً سو سال بعد ان کی یہ شکایت دور کر دی۔

اسی سالارِ جنگِ آزادی، بہادر شاہ ظفرؔ کے رنگون میں واقع مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہندستان کے عظیم انقلابی سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا تھا:

"ہم تمھارا بدلہ چکائیں گے، ہم نے دلّی کے ان خون آشام شب و روز کو فراموش نہیں کیا ہے۔"

حیرت انگیز مماثلت تو یہ ہے کہ ہندستان کے آخری شہنشاہ کی لاش برما میں سپردِ خاک کی گئی، اور برما کے آخری شہنشاہ کی لاش سرزمینِ ہند میں دفن کی گئی۔

ہندستان کی جنگِ آزادی کے اس امر سورما کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں، وہ آدمیوں میں بادشاہ تھا اور بادشاہوں میں آدمی۔

آج ہم نے اپنی آزادی کی لڑائی شروع کر دی ہے اور ہم اس قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عہد کرتے ہیں کہ موت بھی ہم کو اپنے راستے سے نہ ہٹا سکے گی۔ برما اور ہندستان کے باشندے مسلح بغاوت کے ذریعہ اپنی آزادی حاصل کر کے انسانیت کے تحفظ کے پیشِ نظر قدم سے قدم ملا کر چلیں گے۔ تقریباً سو سال قبل بہادر شاہ اور ان کے ساتھی انقلابیوں نے ہمیں دکھا دیا ہے کہ ظلم کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔

یہ ایک سنجیدہ موقع ہے اور اس وقت اپنے جانباز سپاہیوں کو میں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ آزادی کی جنگ محض جسم کی نہیں روح کی بھی ہوتی ہے۔ ہم کو وہ شعر یاد رکھنا ہوگا جو بیٹوں کے کٹے ہوئے سر دیکھنے کے بعد بہادر شاہ نے ہڈسن سے جواب میں کہا تھا ؎

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تخت لندن تک چلے گی تیغ ہندستان کی

اور آسمان کو چیرتے ہوئے "آزاد ہند فوج" کے سپاہیوں کی فلک شگاف آواز گونجی — "ہم دلّی چلیں گے۔"

★

تاریخ کو بیٹوں کا لہو بخش دیا

گو چھوڑ چکی ہے عمرِ فانی تجھ کو
اے قوم و وطن پہ جان دینے والے
حاصل ہے حیاتِ جاودانی تجھ کو
کرتی ہے سلام زندگانی تجھ کو

جو ملک میں تھا جمود، توڑا تونے!
چمکا آخر چراغِ منزل بن کر
پنجے کو غلامی کے مروڑا تونے
جو نقشِ قدم راہ میں چھوڑا تونے

گلزار میں صد برگ و ثمر ٹانک دیے
جس شاخ پہ حریت کے غنچے نہ کھلے
ٹانکے تو نہ جاتے تھے مگر ٹانک دیے
اس شاخ پہ بیٹوں ہی کے سر ٹانک دیے

تخئیل کی راہ ہے نظر تک پہونچا
ماحول نے تیرے جب پکارا تجھ کو
محبوب کا غم غمِ بشر تک پہونچا
تو زخمِ جگر سے زخمِ سر تک پہونچا

گفتار کی بے پناہ دولت پائی
وہ محفلِ امن ہو کہ میدانِ جہاد
کردار کے ملک کی حکومت پائی
شاعر نے ہر ایک جگہ امامت پائی

دیوانوں کو اک نعرۂ ہو، بخش دیا
تہذیب کو دی اپنے تخئیل کی بہار
مستانوں کو گل رنگ سبو بخش دیا
تاریخ کو بیٹوں کا لہو بخش دیا

ہر دور میں دافعِ سیاہی ٹھہرا
ہے ذکرِ ظفر اس ایک فقرے میں نہاں
ہر عہد میں نازِ کج کلاہی ٹھہرا
وقت آنے پہ شاعر بھی سپاہی ٹھہرا

خود اپنے لیے اور خدائی کے لیے
ابھری جب بھی کوئی عوامی تحریک
دکھ جھیلے ہیں دنیا کی بھلائی کے لیے
شاعر اٹھا ہے رہنمائی کے لیے

خلوت میں دف و رباب ٹھہرا شاعر
لیکن آیا جو سن ستاون کوئی
خلوت میں حسین خواب ٹھہرا شاعر
پیغمبرِ انقلاب ٹھہرا شاعر

ڈاکٹر اکبر حیدری

بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری

بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں جنگ آزادی کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں بادشاہ کی تصویر الم بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی سیاسی زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں ادبی تذکروں کی بنا پر ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ عالم نے ۱۸۰۶ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اکبر شاہ ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ان کی وفات ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر انہی کے صاحبزادے تھے۔ وہ ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے "ابوظفر" تاریخی نام ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد برائے نام تخت سلطنت پر بیٹھے۔ شیخ کرامت علی اظہر شاگرد نصیر نے تاریخ جلوس کہی ہے

> از یمن جلوس خسرو عہد
> افزود بہار باغ دہلی
> گر فکر تراست بہر تاریخ
> اظہر تو بگو "چراغ دہلی"
> ۱۲۵۳ھ

بہادر شاہ نے سکے پر یہ شعر کندہ کیا تھا ۔

> بسیم و زر زدہ شد سکۂ بفضل اللہ
> سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

ہنگامۂ غدر میں بادشاہ نے جب دوبارہ سراج الدین غازی کا لقب اختیار کیا اور سکے پر ذیل کا شعر رائج کیا تو انگریز ان سے بگڑ گئے ۔

> بزر زد سکۂ نصرت طرازی
> سراج الدین بہادر شاہ غازی

اس جنگ آزادی میں بہادر شاہ کو انگریزوں کے ہاتھ جو ذلتیں اور صعوبتیں اٹھانا پڑیں خدا وہ دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ سلطنت مغلیہ کے اس آخری تاجدار کو ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو فوجی کمیشن کے روبرو ایک مجرم کی طرح پیش کیا گیا جس میں تین گرد ملکہ معظمہ کی طرف سے تھے اور دو کمپنی بہادر کی جانب سے۔ بادشاہ پر چار خصوصی الزام تھے۔ ایک الزام یہ تھا کہ ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کی تحریک سے قلعے میں انچاس ۴۹ انگریز مارے گئے۔ پورے ۳۱ روز ظفر شاہ بہادر کمیشن کے سامنے بڑی بے عزتی کے ساتھ حاضر کیے گئے۔ ان کے خلاف گواہوں کی کیا کمی تھی خود حکیم احسن اللہ خاں وزیر (متوفی ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) بادشاہ کے روبرو کھڑے تھے۔ یوں سمجھیے کہ زمین آسمان اور اپنے دست و بازو تک دشمن تھے۔ لسانی شہادت کے علاوہ دستاویزی شہادت کا ایک طومار تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ بادشاہ نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے پانچ شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بادشاہ، ان کی بیگم نواب زینت محل اور شہزادہ جواں بخت قلعے میں نظر بند کیے گئے۔ آخر کار اس بدنصیب ٹوٹے ہوئے مختصر قافلہ کو اکتوبر ۱۸۵۸ء میں رنگون میں جلاوطن کیا گیا۔ جہاں خاندان تیموریہ کا یہ چشم و چراغ سسک سسک کر ۱۴ جمادی الاول

۱۲۷۹ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا
کسی نے حسبِ حال تاریخ کہی ؎

سراج الدین ظفر بہادر جو سوئے جنت ہوئے روانہ
کہ جن کے باعث مئے خوشی سے چھلک رہا تھا ایاغ دہلی
جلوس ان کا "چراغ دہلی" سو اب یہ دیکھو مطابق اسکے
سروشِ غیبی نے سالِ رحلت کہا "بجھا ہے چراغِ دہلی"

۱۲۷۹ھ

قبر کے سرہانے یہ عبرتناک کتبہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ
حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ۔
۱۸۳۷ء جلوس تا ۱۸۵۷ء

آج تاریخ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ جمعہ کو وہ روح جو ۸۹ سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی۔ زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاری کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا ہے اور دن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا جس نے جہان آباد میں جنم لیا وہ وطن سے ہزار کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے سکرات طاری ہے، سانس اکھڑ چکی ہے جس کی زندگی سیج پہ میلہ تھی، جس نے زندگی کا ہر لمحہ جگمگھٹوں میں گزارا۔ آج صرف تین آدمی ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔

آفتاب بھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عبرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہجہاں آباد کا یہ گوہر ابد از رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔"

تاریخ وفات

چودہ جمادی الاولیٰں، جمعہ کا روز وقت عصر
حالتِ قید و بیکسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے "ظفر جلا وطن"

۱۲۷۹ ہجری

مشیتِ ایزدی دیکھیے کہ ظفر شاہ بہادر کا سرداب قطب صاحب میں اپنے دادا شاہ عالم اور والد اکبر شاہ ثانی کے پہلو میں ان کی زندگی میں ہی یعنی دورِ شاہی میں بنایا گیا تھا جو اب تک خالی پڑا ہے اور ہمیشہ پڑا رہے گا۔ ان کی قسمت میں یہ سرداب نہ تھا بلکہ رنگون کی مٹی مقدر میں لکھی تھی۔

شاعری

سرور "عمدۂ منتخبہ" ص ۲۱۱ تا ص ۲۱۳ (سال تصنیف ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء) میں لکھتے ہیں:۔

"ظفر تخلص۔ مرشد زادۂ جہانیان ولی عہد مرزا ابوظفر بہادر، تعریف و توصیفِ فصاحت و بلاغت کہ در اشعارِ طبع زاد آں گوہر والائے دریائے سلطنت مندرج باشد۔ کارِ قلمِ حقائق نگار نیست کہ ثبت نماید۔ بلکہ ازاں بالاتر است کہ کسے در خیال آرد۔ اکثر تصانیفش ناخن زدن دل بدست وسوائے ایں بسبب ذہن رسائے کہ بہ عنایت الٰہی در جمیع امور شائستہ ولائق جہان داری باشند۔ دخلے کلی دارند"

قاسم "مجموعۂ نغز" صفحہ ۲، ۳ تا ص ۳۷۵ (سال تصنیف ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء) میں لکھتے ہیں:۔
"ظفر تخلص۔ دُرِّ ثمین دریائے سلطنت و شہریاری کوکب دری آسمان رفعت و بختیاری صورت انتظام خلافت و فرمانروائی معنی نظام

مملکت و ملک آرائی لائق سرا پا لیاقت دیہیم
خسروی و ظلِ الٰہی محقق بالاستحقاق تخت
ہمایونی و اکبر شاہی وارث سریر گورگانی صاحب
سند، صاحب قرانی، شاہزادۂ والا قدر
مرزا ابو الظفر بہادر خلف الصدق مرشد زادہ
ولی عہد والا جاہ مرزا اکبر شاہ بہادر است ادام
اللہ تعالیٰ اقبالہا و استمر اجلالہا ذات ملکی صفات
آن گل سر سبد چمنستان حشمت و اقبال اکبر شاہی
نہال سرسبز و شاداب بوستان جاہ و جلال قرۃ
العین ظل الٰہی بہ تہذیب اخلاق حمیدہ حلیہ مہذب
و بہ تادیب آداب پسندیدہ، بغایت مودب بلند
فطرۃ، عالی ہمت ارجمند فطنت والا نہمت خوش
طبع، صاحب وضع، سر بسر مہربانی و رافت یکسر
قدر دانی و عنایت آدم شناس، صاحب قیاس
ہوشیار، ستودہ کردار، اعلیٰ منش، والا روش
واقع شدہ۔ شعرے کہ از طبع دربار جناب ایشان
می تراود، لولوئے باشد لالا نسخے کہ از فکر
صائب حضرت شان سر بر آرد، درے باشد اکسیر
صفا و سر بسر بہا شوق این فن شریف بسیار در
سر دارند۔ و اکثرے از اوقات ہمایون بہ سخن
سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند۔ اگرچہ
دُر ہائے رنگینہ طبع صافی خویش کم و بیش گاہ گاہ
بہ بعضے جوہریان جوہر شناس می نمایند۔ اما
از برخوردار کامگار میر عزت اللہ عشق مد عمرہ
و زاد قدرہ کہ ارشاً سر رشتۂ استادی این دیوانِ
عالی شان وارد اکثر استشارہ می فرمایند
(دہر کیف) شعر لہذا نتائج طبع گوہر بار آن ہمین اختر
فلک خلافت و بہین دُرتے آسمان سلطنت
در سلک آراستہ تحریر خود می کشم۔

بہادر شاہ ولی عہدی کے زمانے میں جبکہ ان کے والد زندہ
تھے۔ مرزا ابو ظفر خاں بہادر کہلاتے تھے اسی مناسبت سے انھوں
نے اپنا تخلص ظفر رکھا تھا۔ اور شعر و شاعری کا مشغلہ تھا جو عنفوان
شباب سے لے کر مسند آرائی اور غدر کے ہنگامے تک برابر جاری
رہا۔ ظفر کے دادا شاہ عالم شاعر اور صاحب دیوان تھے، آفتاب
تخلص کرتے تھے۔ ان کے چچا سلیمان شکوہ بھی ایک ممتاز شاعر اور
صاحب دیوان تھے سلیمان تخلص کے تحت لکھتے تھے۔ ظفر نے شعر
گوئی میں اپنے دادا اور چچا کی تقلید بڑی خوبی سے کی اور ان کے
نقش قدم پر چل کر کمال پیدا کیا۔ وہ اوائل عمر ہی سے شعر کے دلدادہ
تھے۔ پھر دھیرے دھیرے ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا۔
ان کے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے ان میں حکیم ثنا اللہ خاں
فراق۔ مرزا غالب، علی خاں ستید، عبد الرحمان خاں احسان
برہان الدین خاں راز، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، ان کے صاحبزادے
حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبائی شاگرد میر تقی میر، مرزا
عظیم بیگ شاگرد سودا، میر قمر الدین منت (ف ۱۲۰۸ھ) ان کے
صاحبزادے میاں نظام الدین ممنون وغیرہ بھی شامل تھے ذوق
کو بھی دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔

ابتدا میں ظفر شاہ بہادر شاہ نصیر (ف ۱۲۵۴ھ) سے
اصلاح لیتے تھے ان کے دکن چلے جانے کے بعد انھوں نے میر کاظم
حسین بے قرار سے رجوع کیا۔ ان کے بعد ذوق سے اصلاح لی،
ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب کی شاگردی قبول کی۔

ڈاکٹر اسپرنگر، محمد حسین آزاد اور دوسرے لوگوں کا یہ کہنا درست
نہیں ہے کہ ذوق اور غالب ظفر کو غزلیں لکھ کر دیتے تھے۔ قاسم
سب سے پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ۱۲۲۱ھ میں مجموعۂ نغز
ترتیب دے کر مکمل کیا تھا۔ تذکرہ میں ذوق کا نام درج ہی نہیں ہے۔
یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجموعۂ نغز کی ترتیب کے وقت ذوق اس
قابل نہیں تھے کہ ان کا ذکر تذکرے میں کیا جاتا۔ برعکس اس کے قاسم
نے ظفر کی شعری خوبیوں کو سراہا ہے۔ سرور نے بھی عمدۂ منتخبہ میں ظفر
کے طبع رسا اور اشعار کی خوب داد دی ہے۔ یہ بات قرین قیاس بھی

کو سرور نے ظفر کا ترجمہ ۱۲۱۶ھ سے پہلے لکھا ہوگا۔ شیفتہ کے مطابق ذوق کی شاعری کا آغاز ۲۰ - ۱۲۱۰ھ میں ہوا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"از مدت سی سال بہ مشق سخن می پردازد"

ظفر کا ضخیم دیوان اول ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کی تاریخ تصنیف انھوں نے خود کہی ہے ؎

یہ دیوان رشک گلشن کیوں نہ ہو گلہائے مضموں سے
کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابانِ معانی ہے
ظفرؔ سے تام مصرعِ تاریخ لکھا اس پر
مرا اب یک قلم دیوان بستانِ معانی ہے

۱۲۱۴ھ

قاسم نے مجموعہ نغز میں ظفر کے ۱۵ شعر کا انتخاب ردیف وار دیا ہے اس میں ل، ت، نہ، س، ن، و، ہ اور ے کی ردیفیں آ چکی ہیں۔ یہ سبھی اشعار ظفر کے دیوان اول میں درج ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظفر کا دیوان اول ۱۲۲۱ھ تکمیل مجموعہ نغز سے بہت پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ قاسم نے ۱۲۰۷ھ میں تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور کم و بیش ۱۵ سال کے بعد اسے مکمل کیا۔ ظفر کے حالات انھوں نے کب لکھے تھے یہ کہنا مشکل ہے۔ بہر حال معترضین کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انھیں ذوق یا غالب غزلیں دیتے تھے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ظفر کے کلام میں ان کا رنگ پایا جاتا ہے۔

مولوی کریم الدین نے جو خود بھی شاعر اور تذکرہ نویس تھے ظفر کی جودت طبع اور شاعرانہ عظمت کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بقول قاسمی، یہ بزرگوار ظفر کو اپنے عصر کے شعرا کی صف اول میں جگہ دیتے ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ ظفر کی شاعری میں خاص جدت پائی جاتی ہے۔ ان کا کلام زبان کے اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ حالی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں کہ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے۔

مولوی کریم الدین نے "گلدستۂ نازنینان" جولائی ۱۸۴۵ء میں شائع کیا۔ اس میں ظفر کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام اچھا خاصا دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب کے کتاب خانے میں راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ مولوی صاحب نے دوسرا تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" دہلی میں ۱۸۴۷ء میں مرتب کیا اور ۱۸۴۸ء میں شائع کیا۔ یہ بھی مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں ہے۔ ہندستان میں نایاب ہے۔ اس میں مولوی صاحب ظفر کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"ظفر، تخلص بہادر شاہ دہلی کا ہے۔ چند صفات حمیدہ جن سے متصف وہ ذات عالی مقدار ہے بیان کرتا ہوں۔ خط نستعلیق اور خط نسخ خوب لکھنا آتا ہے۔ دونوں خط بادشاہ کے بہت اچھے ہیں۔ اکثر تعلیمیں (کذا) اور آیات قرآنی جامع مسجد میں بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میں نے دیکھی ہیں۔ شعر ایسے کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا — ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں۔ ان ایام میں ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے۔ تمام ہندستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتی ہیں۔ ہر ایک قسم کے شعر کہنے کی ان کو قدرت ہے۔ ایک دیوان بہت بڑا بادشاہ کا چھپا ہے۔ اس میں ہر قسم کے شعر ہیں۔ ایک شرح گلستاں کی بھی بادشاہ کی تصنیف سے ہے وہ بھی مدت ہوئی کہ چھپ گئی۔ ان کے شعر بہت اچھے ہوتے ہیں۔ چونکہ تذکرہ سابق میں بہت حال مع غزلیات حضور والا کی لکھ چکا ہوں اس لئے اب حاجت تحریر کی نہیں"

ناسخ کہتے ہیں کہ ظفر نہایت شیریں اور نمکین شعر کہتے تھے

چار دیوان نظر سے گذرے ہیں۔" اصل بات یہ ہے کہ چوں کہ بہادر شاہ ظفر کمپنی بہادر کے ماہانہ وظیفہ خوار تھے اور ان کی حیثیت شطرنج کی بادشاہ جیسی تھی۔ سلطنت کا کام کاج نہیں تھا اس لیے زیادہ تر وقت شعر گوئی میں صرف کرتے تھے۔

ظفر کا کلام بہت دل کش، صاف اور شگفتہ ہے۔ کلام میں سادگی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کلام کی سب سے بڑی خوبی سوز و گداز ہے۔ ذاتی درد و الم اور زمانے کے پر آشوب حالات نے ان کی شاعری کو یاس و حرماں کا مرقع بنا دیا۔

کلیاتِ ظفر

ظفر کو جملہ اصنافِ سخن میں قدرت حاصل تھی۔ ان کے کلیات میں غزلیات کے علاوہ قصائد، مرثیے، نوحے، سلام، مستزاد، مخمس، مسدس، تضمین، شہر آشوب، نعت، قطعات اور رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ چونکہ انھیں موسیقی سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے انھوں نے ہولی، ٹھمری، جھجن، خیال، اور گیتوں میں اس فن کا مظاہرہ کیا۔

مولوی کریم الدین نے "طبقات شعرائے ہند" میں ظفر کے دیوانِ ضخیم کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔ اس وقت تک حقیقتاً ظفر کا ایک ہی دیوان چھپا تھا۔ عبدالغفور خاں نساخ نے "سخن شعرا" ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں ترتیب دے کر مکمل کیا تھا۔ "سخن شعرا" اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ تذکرہ پہلی مرتبہ رمضان ۱۲۹۱ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ نساخ غالباً پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ظفر کے چار دیوانوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی نظر سے چاروں گذرے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) یعنی سخن شعرا کے ترتیب کے زمانے میں ظفر کے چاروں دیوان چھپ چکے تھے۔

راقم الحروف کی نظر سے ظفر کے چاروں دیوان گذرے ہیں۔ پہلا دیوان جو ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں ترتیب دیا تھا وہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں پہلی مرتبہ مطبع سلطانی واقع قلعہ معلی میں چھپا تھا۔ یہی نسخہ مولوی کریم الدین صاحب کے پیشِ نظر ۱۸۴۶ء میں رہا تھا۔ ظفر کا دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں مطبع سلطانی قلعہ معلی سے چھپا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شیخ قادر بخش مالک مطبع اودھ گزٹ محلہ حسین گنج واقع لکھنؤ در کوٹھی غلام حسین ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا۔

ظفر کے چاروں دیوان سب سے پہلے ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں مطبع مصطفائی دہلی میں یکجا چھپ گئے۔ اس کے بعد مطبع مصطفائی کے مالک کی اجازت خصوصی حاصل کرنے کے بعد کلیات کا دوسرا ایڈیشن یعنی چاروں دیوانوں کو ایک ہی جلد میں منشی نول کشور نے ۱۸۶۵ء میں منشی امیر اللہ سے تصحیح کرا کر اپنے مطبع میں ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد منشی صاحب نے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۸۷ء میں اس کے کئی ایڈیشن شائع کیے۔ یہ نسخے ندوۃ العلماء لکھنؤ، راجہ صاحب محمود آباد اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ پانچویں بار کلیاتِ ظفر ۱۹۱۸ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ اس میں غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مروجہ دیوان بھی ان غلطیوں کا شکار رہا ہے۔

ہماری اطلاع کے مطابق ظفر کا دیوانِ اول مولوی محمد حسین آزاد کے والد گرامی مولوی محمد باقر (متوفی ۱۸۵۷ء) کے مطبع دہلی اردو اخبار سے شائع ہوا تھا۔ اس پر تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"یہ دیوانِ اول مطبع سلطانی میں چھپا تھا۔ مگر اکثر جگہ صحت کو نہ پہونچا تھا۔ سو اب مکرر۔ تصحیح جناب افصح الفصحاء، ابلغ البلغاء، خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دام برکاتہم باہتمام بندۂ خاکسار پنڈت موتی لال پرنٹر و پبلشر مطبع دہلی اردو اخبار مکان مولوی محمد باقر صاحب میں چھپا۔"

اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کلیات کا ایک اور ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں انوار المطابع بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ سے "دیوانِ ظفر" کے

نام سے ایک مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اگست ۱۹۱۲ء
میں مجیدی پریس کانپور سے دیوانِ اول شائع ہوا تھا۔
اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے۔ تقسیمِ ہند سے
کچھ عرصہ قبل دیوانِ اول مطبع جیون پرکاش دہلی اور شیخ
غلام علی ناشرانِ کتب لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔ غالباً یہ
ایڈیشن مطبع راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور مطبوعہ ۱۹۱۶ء کا
نقشِ ثانی تھا۔ ان کے علاوہ کلیاتِ ظفر کا انتخاب بھی وقتاً فوقتاً
چھپتا رہا۔ آخری مرتبہ جناب خلیل الرحمان اعظمی مرحوم نے ظفر کے چاروں
دیوانوں کا انتخاب "نوائے ظفر" کے نام سے انجمن ترقی اردو
ہند سے ۱۹۵۸ء میں شائع کرایا۔ اس کے آخر میں "دکھنی بچار"
کے تحت انھوں نے ظفر کا وہ کلام بھی یکجا کیا ہے جو رنگون
میں ایامِ اسیری کی یادگار ہے اور کلیات میں شامل نہیں ہے۔

کلیاتِ ظفر کے قلمی نسخے نادر و نایاب ہیں۔ صرف تین
نسخوں کی اطلاع ہے۔ دو نسخے قومی عجائب گھر کراچی میں اور ایک
نسخہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے
میں تفصیلات یہ ہیں:

نسخۂ کراچی:-

نمبر مخطوط، ۶۳۱، ۱۹۶۸ء، سائز ۳۲½×۲۰½ س م
اوراق ۲۴۴، سطور ۱۵، تاریخ کتابت نہ دارد، دیوانِ اول ہے۔

کیفیت:- نسخہ مجلد ہے لیکن ابتدائی اور آخری اوراق
جلد سے الگ ہو چکے ہیں۔ جلد پر نہایت عمدہ نقش و نگار بنے
ہیں۔ کاغذ ولایتی، باریک، آسمانی رنگ کا ہے۔ متن ورق
۱، ب سے شروع ہوتا ہے۔ ورق الف پر مخطوطے کے سابق
مالک کا نام "میر عباس علی بیگ حیدرآباد" درج ہے۔ یہ سندھ
کے تالپور کے حکمرانوں کے کتب خانہ کا نسخہ ہے۔

آغاز ؎

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا
بس جائے بے زباں ہے دہن قال و قیل کا
پانی میں اس نے راہبری کی حلیم کی
آتش میں وہ ہوا چمن ار خلیل کا

اختتام ؎

بہت دِنَن میں ہاتھ لگے ہو کیسے جانے دوں گی
آج ہے پھگوا تو سوں کا نا بھیّہ پکڑ کے لوں گی
دیر آمدی اے نگار سرمست
زود نہ رہم ز دامنت دست
شوق رنگ ایسے ڈھیٹھ لنگرے کھیلے کون اب ہوری
مکھ موڑے اور ہاتھ مروڑے کرکے وہ برجوری

مندرجات — غزلیات ورق ۱، ب تا ۴۰۴، الف
مخمسات — ورق ۴۰۴، الف تا ۴۲۵، الف
مسدسات — ورق ۴۲۵، الف تا ۴۲۹، الف
مثلثات — ورق ۴۲۹، الف تا ۴۴۱، ب
ہندی فارسی اشعار — ورق ۴۴۲، الف و ب

خصوصیات — نسخۂ ہذا خاص اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ تاہم
کتابت کی غلطیاں ہیں۔

نسخۂ دوم کراچی:-

نمبر مخطوط ۹۷۵/۴، ۱۹۵۷ء، سائز ۲۴½×۱۵½ س م،
اوراق ۴۴۸، سطور ۱۵، تاریخ کتابت درج نہیں ہے، دیوان
اول ہے۔

کیفیت:- مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔ کاتب نے صفحوں پر
غلط نمبر دیے ہیں۔ اس میں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، کاغذ دبیز
مٹیالا ہے۔ ہر صفحے پر سُرخ اور نیلی جدولیں ہیں۔

آغاز ؎

رات بھر مجھ کو غمِ یار نے سونے نہ دیا
صبح کو خوفِ شبِ تار نے سونے نہ دیا
شمع کی طرح گئی رات مجھے سولی پر
چین سے یادِ قدِ یار نے سونے نہ دیا
یہ کراہا ترا بیمارِ الم درد کے ساتھ
کسی ہمسائے کو بیمار نے سونے نہ دیا

اے دلِ زار تو سوتا گیا آرام سے رات
مجھے پل بھر بھی دلِ زار نے سونے نہ دیا
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

خاتمہ۔ رین دنا میں لکی پھردی بیکل مینڈی جان
لیکن جس دے کارن گلی پھردی او دینا ہی ضیان
الٰہی کیا ہوا، تھا وہ جو ناوں میں آ رہے
پھند لیا دل اس نے میڈا مار رہ دا جال
اب کب چھٹ اس پھند سے نے چھٹنا بڑا محال
جو کچھ ہونا تھا سو وہ ہو چکا ہے اے ظفر بہلے

یہ مثلث کے دو بند نقل کیے گئے ہیں ہر بند کے پہلے دو مصرع پنجابی میں ہیں اور تیسرا اردو میں۔

نسخۂ دہلی: صفحات ۸۸، ۱۵ سطر، کاتب محمد علی قادری گنگنی۔ اس میں غزلیات، مخمس، مثلث، مسدس، اور متفرقات شامل ہیں۔ مخطوطے میں کہیں تاریخِ کتابت درج نہیں ہے۔ نسخہ ناقص الاول ہے۔

بنارس یونی ورسٹی اور مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال میں انتخابِ ظفر موجود ہے۔

نمونۂ کلام۔ ذیل میں ظفر کے چاروں دیوانوں میں سے مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے ؎

ہم نے دنیا میں آ کے کیا دیکھا
دیکھا جو کچھ سو خواب سا دیکھا
ہے تو انسان خاک کا پُتلا
لیک پانی کا بُلبلا دیکھا
خوب دیکھا جہاں کے خوباں کو
ایک تجھ سا نہ دوسرا دیکھا
ایک دم پر ہوا نہ باندھ حباب
دم کو دم بھر میں یاں ہوا دیکھا
سامنے اس نگاہ کے دل کو
ہدفِ ناوکِ قضا دیکھا
نہ ہوئے تیرے خاکِ پا ہم نے
خاک میں آپ کو ملا دیکھا
اب نہ دیجے ظفر کسی کو دل
کہ جسے دیکھا بے وفا دیکھا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھکو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

قدر اے عشق رہے گی تری کیا میرے بعد
کہ تجھے کوئی نہیں پوچھنے کا میرے بعد
زخم پر دل کے گوارا ہے مجھی کو یہ نمک
کون چکھے گا محبت کا مزا میرے بعد
در جاناں سے مری خاک نہ کرنا برباد
دیکھ جانا نہ اُدھر بادِ صبا میرے بعد
اے ظفر کیوں کے محبت کو نہ ہو غم تیرا
کوئی غمخوارِ محبت نہ رہا میرے بعد

تجھ کو بہکا دیا کسی نے ہے
ہائے یہ کیا کیا کسی نے ہے

آشنا آشنا ہیں سب کہتے
دیکھا کبھی آشنا کسی نے ہے

ہم نے دیکھا ہے جو ستم تیرا
نہیں اب تک سنا کسی نے ہے

کیا مزے میں گزرتی تھی لیکن
کر دیا بے مزہ کسی نے ہے

سبب رنجش ان کا دل کے سوا
نہیں مجھ سے کہا کسی نے ہے

خوبرویوں سے کیا امید وفا
کبھی کی بھی وفا کسی نے ہے؟

اے ظفر رو دیا ہے جب میرا
کچھ سنا ماجرا کسی نے ہے

نہ تو کچھ کفر ہے نہ دیں کچھ ہے
ہے اگر کچھ ترا یقیں کچھ ہے

ہے محبت جو ہم نشیں کچھ ہے
اور اس کے سوا نہیں کچھ ہے

دیر و کعبہ میں ڈھونڈتا ہے کیا
دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہے

برق کانپے نہ کیوں کہ تجھ میں ابھی
تاب اے آہ آتشیں کچھ ہے

واہ دنیا عجب ہے رنگا رنگ
کہ کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ ہے

صبح رو رو کے شام ہوتی ہے
شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے
سامنے چشم مست ساقی کے
کس کو پروائے جام ہوتی ہے

کوئی غنچہ کھلا کہ بلبل کو
بے کلی زیر دام ہوتی ہے

تھی جو خدمت جنوں کی مجنوں کو
سو وہ اب میرے نام ہوتی ہے

پانی پانی لبوں سے اس کے ظفر
کیا مئے لالہ فام ہوتی ہے

مخمس بر غزل میر

گل زخود عالم آشنا ہیں ہم   ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا ہیں ہم
کہہ چکے تم سے بارہا ہیں ہم   گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک رنگ چلنے کو بلا ہیں ہم

جرم ثابت ہوا ہے کیا ہم پر   نہیں کھلتا یہ ماجرا ہم پر
روز اک ظلم ہے نیا ہم پر   اے بتو! اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

گرچہ ہوتی رہی جفا پہ جفا   پھر نہ سرکے وہاں سے ایک ذرا
ہم پہ احسان یہ وفا نے کیا   تیرے کوچے میں تا بہ مرگ رہا
کشتۂ منتِ وفا ہیں ہم

ہوئی ہم کو نصیب جتنی عمر   تھی وہ تھوڑی سی یا بہت سی عمر
ہم نے اس طرح سے بسر کی عمر   آستاں ہی پہ تیرے گزری عمر
اسی دروازے کے گدا ہیں ہم

جیسا تھا شاعری میں اچھا میر   پاتا اگر قدرداں بھی ایسا میر
اس طرح [illegible] کہتا میر   کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا اک جنس ناروا ہیں ہم

شہر آشوب

کیا پوچھتے ہو بحر دیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
کرتا ہے تمہارا [illegible]

اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

باد صبا اڑائے چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دم بدم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خوار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہو وے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

کیا کیا جہاں میں ہو چکے شاہانِ ذی کرم
کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم
کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
پھر اے ظفر رہے تو کوئی یہاں رہے

دوہے:

نا کوئی آیا ساتھ ہمارے نا گیا کوئی ساتھ
دیکھ کے ایکا آپ تو کہدے مل مل اپنے ہاتھ
جس کے پیچھے جگ وچ اپنا سب کچھ کھویا
انت سمے نیں ان اپنوں میں سے کوئی نہ ہوا
سب کے من میں کھوٹ ہے اور سب کی کھوٹی چال
کون لگا دے جیا اپنا ان لوگوں دے نال

ہو وے اپنی قسمت کہاں جو تم سے لگاؤں آگ
آپ ہی تم نے موہے لگا یا دھن دھن میرے بھاگ
اچھا اپنا ٹھور لگا دو پھر و نہ ڈانوا ڈول
تھے وہ لوگ سیانے جنھانے اکھے یہ دو بول

بھجن:

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنی ہی پھیلاؤ کہ جس کے سکھ سے دکھ نہ پاؤ جی
اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے جانو تم ان میں نہ من الجھاؤ جی
پڑا ہے مورکھ تو ابھی تک سب ہی یہ للچائے ہے
جاگ ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی
عمر اکارت تم نے کھوئی کچھ تو ادھر کا دھیان کرو
بہت گئی اور تھوڑی ہے یہ بھی یوں ہی گنواؤ جی
سدھ بدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر نا کچھ
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پچھتاؤ جی
کہئے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بھولا سانجھ کو آئے
چھوڑ کے سگرے جھگڑے اپنا رب کے دھیان لگاؤ جی

ہولی

کیوں مورے یہ ماری رنگ کی پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی میں گاری
بھاگ سکوں میں کیسے موسوں بھاگا نہیں جات
ٹھاڑی اب دیکھوں او کون جو سنمکھ آت
سب کو مکھ دے دیت ہے گاری بھوری سجا من آج
جب میں آپ نہ کھیلوں تو کس کی تو ہے لاج
بہت دنوں میں ہاتھ لگے ہو کیسے جانے دوں
آج میں پھگوا تو سوں کاہنا پیٹھ پکڑ کے لوں
شوق رنگ ایسے ڈھیٹھ لنگر سے کھیلے کون اناڑی
مکھ موڑے اور ہاتھ مروڑے کر کے برجوری

سلام

باندھی کمر ہے شہ نے شہادت کے واسطے
اے مجرئی شفاعت امت کے واسطے
سر کاٹا اُس جناب ہدایت مآب کا
بلوا کے گمرہوں نے ہدایت کے واسطے
کھانا ہے اگر زخم تو پانی ہے تیغ آب
مہمانِ کربلا کی ضیافت کے واسطے
زین العباد آبروئے دوجہاں کی ہے
دُرِّ یتیم بحرِ امامت کے واسطے
جاتا ہے ہائے دھوپ میں پیاسا برہنہ پا
کوئی نہیں ہے جائے اقامت کے واسطے
کرتے تھے آپ خنجر و شمشیر سے وضو
شبیرؑ قتل گہ میں عبادت کے واسطے
روحِ نبیؐ و روحِ علیؑ روحِ فاطمہؑ
تھی لاشِ شہ کے گرد حفاظت کے واسطے
شبیرؑ سے یہ عرض کی حرؑ نے کہ یا امام
آیا ہے یہ غلام بھی خدمت کے واسطے
گر حکم ہو تو پہلے ہوں میں آپ پر فدا
حاضر ہے جان تک مری حضرت کے واسطے
کھو بیٹھے اپنا دولت ایمان و دیں لعین
دنیا میں چند روز کی ثروت کے واسطے
اے دل غمِ حسین میں شورابۂ سرشک
شربت ہے تشنگئ قیامت کے واسطے
رکھو نظر یہ لطف و عنایت کے واسطے
شاہا جناب شاہِ ولایت کے واسطے

مرثیہ

آئے مجرا جو شاہِ دوجہاں ہے
جھکا مجرے کو جس کے آسماں ہے
وہ سرور دیں شاہِ شہیداں دو جگ کا اجیارا
اللہ کا محبوب ہے وہ اور ہے وہ نبیؐ کا پیارا
علی کا ہے جگر زہراؑ کی جاں ہے
ستم ہے ساقئ کوثر کا جانی
نہ پائے تین دن اک بوند پانی
پانی کی اک بوند نہیں اور سوکھی جائے زبان
مارے پیاس کے گرمی کے ہونٹوں پہ آئی جان
لبوں پہ پھیرتا سوکھی زباں ہے
ہوا دن بیاہ کے قاسمؑ جو رن میں
جدائی ہو گئی دولہا دلھن میں
کیسی مہندی کا عطر سہاگ اور کیسی رنگیلی رات
دولہا کے تو ہاتھ کٹیں اور دلھن ملتی ہاتھ
غمِ قاسمؑ ہے یہ شادی کہاں ہے

گرا اکبرؑ تو برچھی رن میں کھا کر
ہوا عباسؑ بھی دریا پہ جا کر
مارے گئے سب ساتھی سنگاتی اکبرؑ اب نرا سے
خیمہ جلا گھر بار لٹا اور اہلِ حرم سب بیلے
جدھر دیکھو ادھر شور فغاں ہے
گئے اصغرؑ کو شہ گودی میں لے کر
کہ پانی سے کروں اس کا گلو تر......
پیاسے گلے میں اس کے اترگیا ہے تیر کی بوند
دیکھ کے اس نے باپ کی صورت آنکھیں لیں موند
گلا ہے خشک و چشم خوں چکاں ہے
لہو میں دیکھ کر بھائی کو غلطاں
کہا زینبؑ نے بہ چشمِ گریاں
ہے یہ جس کو پیار سے اپنے زہراؑ گودی پالے
اس کے تن پر گھوڑا ڈالا گئے بہتے لہو کے نالے
سر اب اس کا ہے اور نوکِ سناں ہے
جسے زہراؑ نے گودی میں کھلایا

ندوۃ المصنفین لکھنؤ (۳۶) دیوان ظفر (دوم) مطبع سلطانی قلعہ مبارک
۱۲۶۶ھ کتب خانہ محمود آباد (۳۷) کلیات ظفر (چاروں دیوان
یک جا) مطبع نول کشور ۱۸۶۹ء (۳۸) دیوان فائز نسخہ عرشی
ص ۲۲ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی (۳۹) قاموس المشاہیر ص ۱۲۴
جلد دوم ۱۹۲۶ء مرتبہ نظامی بدایونی (۴۰) کلاسکی ادب ص
ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۷۰ء (۴۱) گارساں دتاسی (خطبات)
ص ۱۱۵ تا ص ۲۲۲ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۳۵ء (۴۲) مجمع
الاشعار ص ۲ مطبع نول کشور بار ششم ۱۸۹۶ء (۴۳) مرآۃ الشعرا
ص ۲۹۶ جلد اول۔ محمد یحییٰ تنہا (۴۴) مثنوی مرزا نوشہ غالب
کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی (۴۵) مثنوی شیاں علی در رد
مثنوی حیلی و ملہار میر دوست علی خلیل (۴۶) مثنوی رسالہ علم
حیدری در عقائد سلاطین تیموری۔ مرزا حیدر شکوہ ۱۲۷۰ھ مملوکہ
سید مسعود حسن رضوی (۴۷) مثنوی شوکت حیدری ۱۲۷۰ھ کتب خانہ
سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ (۴۹) مثنوی خطبات فاضل از مفتی
سید محمد عباس مطبع مجمع البحرین لدھیانہ ۱۲۸۶ھ (۵۰) نگارشات
ادیب ص ۱۹۳ تا ص ۲۰۳ سید مسعود حسن رضوی ۱۹۲۹ء (۵۱)
واقعات دارالحکومت دہلی ص ۶۳۳ تا ص ۶۹۰ حصہ اول۔ بشیر الدین
احمد دہلوی ۱۹۱۹ء (۵۲) یادگار غالب حالی ص ۶۹ تا ص ۷۰ مطبع
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔
معارف مطبوعہ اپریل ۱۹۲۳ء اعظم گڑھ۔

★

بہادر شاہ ظفر اور دلی کی تباہی : صفحہ ۱۲ کا بقیہ

تحفظ کے خیال سے بادشاہ ۲۰ ستمبر کو ہمایوں کے مقبرے میں
پہنچا دیے گئے۔ انھیں سمجھایا گیا کہ بخت خاں پٹھان ہے۔ پٹھانوں
کی مغلوں سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے وہ اس موقع پر بادشاہ کو دھوکہ
دے کر اپنا بغض نکالنا چاہتا ہے۔ بخت خاں آئے اور بادشاہ
سے بھاگ چلنے کی التجا کرنے لگے۔ آخر میں بادشاہ نے کہا:

"بہادر! مجھے تیری ہر بات پر یقین ہے۔ میں
تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ مگر جسم
کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ اس لیے میں
اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے
حال پر چھوڑ دو، اور بسم اللہ کرو، یہاں سے جاؤ
اور کچھ کام کر کے دکھاؤ۔ میں نہیں، نہ سہی، تم یا
اور کوئی ہندستان کی لاج رکھے"

کتنی قلبی تکلیف ہوئی ہوگی، یہ الفاظ ادا کرتے وقت
ان کو۔ بخت خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ سر جھکایا اور مشرقی دروازے
سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہی مغربی دروازہ سے انگریز
گھس آئے۔ زنجیروں کو دیکھ کر بادشاہ [illegible]
سمجھ گئے۔ انھوں نے اس مکار کی طرف دیکھ کر کہا:

"تم نے مجھے بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا... خیر"

بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو ایک ساتھ لال قلعہ
میں قید کر دیا گیا۔ ان کے دو فرزند مرزا مغل اور مرزا خضر اور پوتے
ابوبکر کو گرفتار کر کے انگریز لے چلے۔ راستے میں ظالم ہڈسن مل گیا
اس نے رستہ روک کر تینوں کو گولی مار دی۔ ان کا سر کاٹ کر بزرگ
بادشاہ کے پاس لے گیا اور ان سے کہا،

"کمپنی کی جانب سے یہ آپ کی نذر ہے جو برسوں
سے بند رکھی تھی"

بادشاہ نے نذرانے کی طرف بڑے صبر و تحمل سے دیکھا
اور منھ پھیر لیا۔ ان کی زبان سے یہ نکلا:

"الحمد للہ! تیمور کی اولاد ایسے ہی سرخرو ہو کر
باپ کے سامنے آیا کرتی تھی"

ہندستان کی حکومت لوٹنے والوں نے کس بے عزتی کے
ساتھ بوڑھے بادشاہ کو رنگون بھیجا۔ اس کی دردناک کہانی لکھنے کا
محل نہیں ہے۔

اس طرح ۱۳۴ دن آزاد رہنے کے بعد دلی پھر غلام ہو گئی

بہادر شاہ ظفر

بالکرشن گوپال مغموم

شکر صد شکر! کہ پھر یادِ ظفر آئی ہے
مغلیہ دور کا وہ آخری اورنگ نشیں
غم شناسائے جہاں، خوگرِ الطاف و کرم
مطلقاً جس کو نہ تھی ہند و مسلم میں تمیز
جس کو درویش صفت، صوفیِ صافی کہیئے
شعر میں ایک نئی راہ نکالی جس نے
سرپرستِ ادبا و شعرا و علمار
لال قلعے کی تقاریب کی وہ روحِ رواں
کاتبِ خوش خط و نقاشِ دلآرا کہیے
وہ نمازی، وہ متقی، وہ بشرِ عدل پسند
جس کے شعروں سے اخوت کی صدا آتی تھی
جس کے اشعار سے تاثیر کے چشمے پھوٹے
جس کی غزلوں میں تھے ہندی کے بکثرت الفاظ
جس نے شعروں میں سنائے تھے وطن کے نغمے
جس کے دربار سے وابستہ تھے فاضل کیا کیا
جس جگہ ذوق کی، غالب کی نوا سنجی تھی
جس جگہ مومن و آزردہ کے نغمے بکھرے
ایسے دربار پہ چھا جائے مصیبت کی گھٹا!
جب فرنگی کی سیاست نے اٹھائے فتنے
جب بدیسی کی حکومت سے ہوئے سب بیزار
ہندی فوجیں اسی قائد کا سہارا پاکر
یہی کوشش تھی کہ آزاد وطن ہو اپنا
ظلمِ افرنگ کا افسانہ بیاں ہو کیسے؟
جس نے شہزادوں کے ترشے ہوئے سر دیکھے تھے
قیدِ افرنگ وہ رنگون کے ویرانے میں
شعر لکھنے کے لیے تھا کوئی کاغذ، نہ قلم
قبرِ سازہ کو بھی گھوڑ دوڑ سے پامال کیا

ایک تصویر تصور میں ابھر آئی ہے
آدمیت کا مبلغ، وہ محبت کا امیں
مظہرِ ظرفِ شہاں، پیکرِ الطاف و کرم
"ایکتا" اور "مساوات" رہیں جس کی کنیز
ہر مریضِ غم و اندوہ کا شافی کہیے
طرحِ نو سادگیِ شعر کی ڈالی جس نے
قدر دانِ فصحا و حکما و فضلار
شعر و موسیقی کا وہ قدر شناسِ ہمہ داں
سر بسر جسکو نفاست ہی کا پتلا کہیے
ذات سے جس کی نہ پہنچا کسی انساں کو گزند
سازِ جس کے محبت کی نوا آتی تھی
سادہ الفاظ سے لفاظی کے افسوں لوٹے
جس کی غزلوں میں تھے کیا جانِ لطافت الفاظ
سبزہ زاروں کے، گھٹاؤں کے، چمن کے نغمے
علم کے نیرِ تاباں، یہ کامل کیا کیا
جس جگہ شعر کے گلشن کی حنا بندی تھی
غزلِ طرزِ نوی کے جہاں تیور بکھرے
ایسے ماحول کو کھا جائے ہلاکت کی گھٹا!
مکر و تزویر نے ہر سمت جگائے فتنے
قوم کے دل میں بھڑک اٹھے بغاوت کے شرار
رزم آرا ہوئیں غیرت کا اشارا پاکر
ہو نہ صیاد تو دل شاد چمن ہو اپنا
جو ظفر کی تھی زباں، میری زباں ہو کیسے؟
گردن و چہرہ و سر خون میں تر دیکھے تھے
جیسے بلبل کوئی محبوس سیہ خانے میں
ظالموں کا یہ زمانے سے نرالا تھا ستم
انقلاباتِ زمانہ نے یہ کیا حال کیا!

گوشِ دل سے سنو، ہے اسکا ترانہ باقی
لب پہ ہے مردِ مجاہد کا فسانہ باقی

ڈاکٹر جمیلہ خاتون

نواب زینت محل

سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تحریک نے تاریخ عالم کو جن خواتین کے تابناک کرداروں سے روشناس کرایا ان میں اودھ کی بیگم حضرت محل جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور ہندستان کی ملکہ بیگم زینت محل کے نام سرِفہرست ہیں۔ بیگم حضرت محل اور لکشمی بائی نے سرِ میدان انگریزوں سے مقابلہ کرکے اپنی شجاعت اور فہم و فراست کا لوہا دشمنوں سے بھی منوالیا، تو زینت محل نے بھی دانائی، ہمت و استقلال اور زبردست قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا جس پر دنیا نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

بیگم زینت محل کابل کے بادشاہ احمد شاہ درّانی کے ایک قریبی عزیز نواب احمد قلی خاں ابن نواب عباس قلی خاں کی دختر تھیں۔ آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے حرم میں داخل ہونے سے پہلے بھی ان کی زندگی عیش و تمول کے ماحول میں گذری تھی، اور جب وہ "زینت محل" بن کر لال قلعہ میں داخل ہوئیں تو ان کی خدمت گذاری کے لیے کنیزوں اور باندیوں کی ایک کثیر تعداد بھی ساتھ تھی۔

زینت محل بادشاہ سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں لیکن اس کے باوجود انھیں بادشاہ سے بے انتہا محبت تھی، خود بہادر شاہ بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی نیک سیرتی اور شوہر پرستی کے سبب اس قابل تھیں کہ انھیں دل میں جگہ دی جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔

بیگم زینت محل نے اپنے حسنِ سلوک سے بادشاہ کے دل کو موہ لیا تھا۔ بادشاہ ان کی فہمیدگی کے قائل تھے۔ اس لیے انھوں نے زینت محل کو خصوصی اختیارات عطا کیے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں تمام کارپردازوں کے نام ایک خاص فرمان جاری کرکے انھیں آگاہ کیا تھا کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل کی مہر نہ ہوگی وہ غیر معتبر سمجھی جائے گی۔

قلعہ کی رہائش کے دوران ایک دن بیگم زینت محل نے قلعہ سے باہر شہر میں ایک مکان خریدنے کی خواہش بادشاہ کے روبرو ظاہر کی۔ بادشاہ کو زینت محل کی جدائی گوارا نہ تھی اور وہ ان کی خواہش کو رد بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے بیگم سے فرمایا ؎

کہتا ہے کون مول مکاں مہ جبیں نہ لو
پر جب تلک نہ ہو میرے گھر کے قریں نہ لو

زینت محل نے بادشاہ سے اجازت ملنے کے بعد کارپردازوں کی معرفت لال کنویں سے متصل گلی قاسم جان میں ایک قطعہ آراضی خرید کر اس پر ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی۔ بادشاہ کو جب اس حویلی کی تیاری کی اطلاع ملی تو خود اس کی تاریخ تعمیر کہہ کر اپنے دستِ خاص سے زیبِ قرطاس کرکے زینت محل کو دی۔

؎ کرواے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل
شد بر محل سال بنا ایں خانۂ زینت محل ۱۲۶۲ھ

حویلی کی تعمیر کے بعد بادشاہ اکثر زینت محل سے ملاقات کے لیے

قلعہ سے اپنی مخصوص سواری پر تشریف لے جایا کرتے تھے وہاں
قیام بھی فرمایا کرتے تھے۔ سر ٹامس مٹکاف راوی ہے۔

"حضرت محمد ابو ظفر شاہ پانچ روز سے ملکہ زینت محل کے
مکان پر تشریف رکھتے ہیں۔ جب سواری لال قلعہ سے شہر
کے اندر بیگم صاحبہ کے مکان پر گئی تو راستے میں حافظ داؤد،
شادی رام اور بابو سورج نرائن اور کنور دیبی سنگھ،
مالک رام اور حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے اپنے مکانوں
کے سامنے آداب بجا لانے کی عزت حاصل کی اور پانچ
پانچ چار چار روپیہ نذر کے پیش کیے۔"

"حضور پر نور نے بیگم مذکور کے ہاں خاصہ تناول فرمایا
اور نوکروں کو کھانے تقسیم کرائے اور طوائفوں کا ناچ دیکھا"
بیگم زینت محل کے حسنِ سلوک کا اظہار اس واقعہ سے بھی
ہوتا ہے

"تین روز سے بادشاہ سلامت شہر میں قاسم جان
کی گلی میں زینت محل بیگم صاحبہ کے مکان میں تشریف
رکھتے ہیں۔ بیگم مذکور نے طرح طرح کے فرش حضور والا
کے قدموں کے نیچے بچھائے تھے اور ان کو بطور خیرات
کے لٹوا دیا تھا اور ایک سو روپیہ حضور والا کے سر پر
تصدق کر کے خیرات کیے تھے۔ اور سات اشرفیاں اور
ایک سو ایک کشتیاں پوشاک کپڑوں کی اور شالوں
کی نذر میں پیش کی تھیں اور ہاتھی اور گھوڑے
بھی نذر کیے تھے۔"

ناصر نذیر فراق ناقل ہیں کہ ایک دن جبکہ وہ اور ان کی ساس
قلعہ میں چلمن کے پیچھے موجود تھے اور بادشاہ خاصہ نوش فرما رہے
تھے اس وقت بیگم زینت محل نے ان سے دریافت کیا کہ
"حضور یہ جو گرگِ باراں دیدہ کہلاتا ہے تو کیا بھیڑیے
کے بارہ آنکھیں ہوتی ہیں؟" اس بات کو سن کر بادشاہ
سلامت خوب ہنسے اور فرمایا "نہیں۔ نہیں یہ بات غلط
ہے بلکہ بڑوں سے ایسا سنا ہے کہ جب برسات برستی ہے
اور جھل تھل بھر جاتے ہیں۔ جنگل اور میدانوں میں پانی
ہی پانی ہوتا ہے تو گیدڑ، لومڑیاں، بھیڑیے اپنے اپنے
بھٹوں میں اور اپنے اپنے کھوؤں میں چھپ جاتے ہیں۔
ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ ایک کھوہ میں دس پندرہ بھیڑیے
گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور مینھ اور پانی کے مارے باہر
نہیں نکل سکتے۔ بھوک کے مارے بولاتے ہیں اور ان میں
جو نڈھال ہو جاتا ہے اور ناتوانی کے مارے آنکھیں بند
کر لیتا ہے تو اور بھیڑیے اسے تکہ بوٹی کر کے کھا لیتے ہیں اور
اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز ایک بھیڑیا ادھ
مرا ہوتا رہتا ہے اور بھیڑیے اسے کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں
تک کہ ان میں سے بچ بچا کر ایک بھیڑیا رہ جاتا ہے اور
اب مینھ بھی کھل جاتا ہے جھڑی موقوف ہو جاتی ہے
اور وہ اپنے سایہ سے بھی بھڑکتا ہے پتے سے بھی بھڑکتا
ہے اور جب کوئی آدمی ایسی ہی ہوشیاری کر لیتا ہے
تو کہتے ہیں گرگِ باراں دیدہ ہے۔

اسی طرح بھیڑیا اور اس کی مادہ پانچ بچے جنگل
میں ان کے ساتھ پھرتے ہیں اور شکار ڈھونڈتے ہیں تو
ستامار دہن کہلاتے ہیں۔ یہ سب کے سب داؤں کرتے
ہیں اور جا بجا چھپ جاتے ہیں اور ہرنی بچاری کو پکڑ لیتے
ہیں اور مل جل کر کھا جاتے ہیں۔ کوئی آدمی بے بلائے اپنے
جورو بچوں کو لے کر کسی کے ہاں مہمان آجاتا ہے تو طعن
سے کہا جاتا ہے موا ستامار دہن آ پہنچا۔"

لال قلعہ میں بیگم زینت محل کے اشارے پر جملہ امور انجام
پاتے تھے۔ اس لیے ان کے مقابلے میں شہزادوں کا کوئی بس نہ
چلتا تھا۔ اخراجات کی کثرت کی بنا پر اکثر شہزادے خرد برد
کر لیتے تھے، مرزا مغل جو بادشاہ کی اولاد تھے بادشاہ کی طرف
سے امورِ سلطنت انجام دیتے تھے لیکن زینت محل کے مقابلے
میں خود کو بے بس پاتے تھے۔ ان کی تعلیم بھی بس واجبی سی تھی
اور اکثر مال سرکار میں خیانت کر کے اپنے شوق پورے کرتے

تھے۔ ایک بار چند بیش قیمت جواہرات اِدھر سے اُدھر کر دیئے جس کا راز فوراً ہی فاش ہوگیا۔ اس لیے مرزا مغل قلعہ سے نکال دیے گئے۔ ان کی جگہ پر زینت محل کی سفارش سے قلمدانِ وزارت لکھنؤ کے ایک شریف زادے حامد علی خاں کے سپرد کر دیا گیا اور اعتماد الدولہ خاں بہادر کا خطاب بھی مرحمت کیا گیا۔ حامد علی خاں بیگم زینت محل کے مزاج شناس تھے۔ اس لیے قلعہ کا انتظام بخیر و خوبی انجام پانے لگا۔ جب کچھ عرصے کے بعد حامد علی خاں کو وطن کی یاد نے گھیرا تو وہ رخصت لے کر لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت بیگم زینت محل نے قلعہ کے سارے انتظامات اپنے اختیار میں لے لیے اور محبوب علی خاں خواجہ سرا کی معرفت جملہ امور انجام دینے لگیں۔

فراقؔ کا بیان ہے کہ "جب ملکہ زینت محل کی مہربانی سے محبوب علی خاں خواجہ سرا ابو ظفر بادشاہ کے وزیر ہوئے تو انھیں دھیان آیا کہ میں اَن پڑھ ہوں اور وزارت کے لیے علم درکار ہے کیونکر کام چلے گا۔ ان کے ایک خیرخواہ نے خبر دی کہ تیلی واڑے میں ایک معلّم رہتے ہیں جو بادشاہ زادوں اور امیروں کو ٹھیکہ لے کر فارسی پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں جس رنگ کی انشا رکھیے اس رنگ کی شاگرد لکھنے لگتا ہے۔ ٹھیکے کی دستاویز قاعدہ کے ساتھ لکھوا لیتے ہیں اور اگر معیاد مقررہ میں شاگرد نامراد رہے تو روپیہ جو پیشگی لیا ہے ہنسی خوشی واپس کر دیتے ہیں۔ مگر اس پچاس برس میں یہ شکایت ایک شاگرد نے بھی نہیں کی کہ میں تعلیم میں ہیٹا ہوں اور استاد کو پیشگی رقم واپس کرنی پڑی ہو۔ ان کا نام مولوی امام علی صاحب ہے۔ شاہجہاں آباد کی فصیل سے باہر تیلی واڑہ میں رہتے ہیں۔

محبوب علی خاں یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور بادشاہی سواری بھیج کر مولوی صاحب کو لال قلعہ میں بلوایا اور بہت تعظیم سے بٹھایا اور اپنا مدّعا سنایا۔ مولوی صاحب نے کہا پانچ ہزار لوں گا۔ ایک برس میں آپ اتنے قابل ہو جائیں گے کہ فارسی عبارت منشی عنایت اللہ کی (بہار دانش) جیسی لکھنے لگیں گے اور وزارت کے تحریری کام میں کسی طرح بند نہ ہوں گے۔ بعد ردّ و کد تمسک گواہی شاہدی سے لکھا گیا اور ڈھائی ہزار روپیہ نقد پیشگی وزیر صاحب نے مولوی صاحب کو دے دیا۔

مولانا کے واسطے وقت مقررہ پر سواری جاتی اور مولانا لال قلعے میں تشریف لے جاتے۔ ایک گھنٹہ شاگرد کو پڑھواتے لکھواتے اور چلے جاتے۔ مولانا نے محبوب علی خاں کو ایک قلمی انشا بھی اپنی تصنیف سے دے رکھی تھی۔ جس سے بہت سے نکتے حل ہوتے تھے۔ ایک سال میں چھ مہینے گذرے تھے جو محبوب علی خاں قابل ہو گئے۔ برس دن پورا ہوا تو مولوی صاحب نے اپنے باقی روپیہ کا تقاضا کیا شاگرد صاحب روپیہ کا نام سن کر بگڑ گئے انھوں نے کہا استاد مجھے فارسی وارسی کچھ بھی نہیں آئی پیشگی جو ڈھائی ہزار روپیہ آپ نے لیے ہیں وہ بھی واپس دیجیے۔

مولانا جانتے تھے کہ "اصل بد از خطا خطا نکند" سال بھر کے سودے شاگرد کے ہاتھ کے ان کے پاس محفوظ تھے۔ ان کے ذریعہ سے شاگرد پر انگریزی عدالت میں ڈھائی ہزار روپے کی نالش کر دی۔ مقدّمہ نے طول کھینچا۔ شاگرد برابر انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ مولوی امام علی صاحب کی تعلیم سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

عدالت نے مجبور ہو کر مرزا نوشہ، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی، منشی نرائن داس صاحب پٹواری کو جو فارسی کے خاقانی و انوری تھے اپنی طرف سے پنچ بدا اور مدّعی و مدعا علیہ کو لاچار کیا کہ جو کچھ نہیں گے اس فیصلے کو انھیں منظور کرنا ہوگا۔ پنچوں نے غور اور پچھان بین کے بعد لکھ دیا کہ مولوی امام علی صاحب کو مدعا علیہ سے ڈھائی ہزار روپیہ دلوایا جائے۔ مدعا علیہ منشی عنایت اللہ کے رنگ کی عبارت فارسی لکھتا ہے اور استاد کا کمال بیشک اس شاگرد میں اثر کر گیا ہے۔ چنانچہ عدالت انگریزی نے ڈھائی ہزار

روپیہ محبوب علی خاں سے مولوی صاحب کو دلوائے مگر اس نے دغا بازی سے مولوی صاحب کی انشاء مار لی۔ کیونکہ نہ مولوی صاحب نے اپنے دعوے میں شامل کیا تھا۔ اور زبانی تذکرہ اس کا آیا تھا۔ جب مولوی صاحب نے اس سے کتاب منگوائی تو شاگرد نے کہلا بھیجا کہ محض آپ کی دل آزاری کے لیے کتاب نہ دوں گا۔ ورنہ وہ انشاء بے حقیقت ہے۔ مولوی صاحب نے کہا اس نس کٹے سے کہہ دینا ؎

کمینہ خداوند ہستی مباد
جواں مرد را تنگ دستی مباد

تو کتاب نہ دے مگر انشاء اللہ میری دل آزاری کر کے ایمان سلامت نہ لے جائے گا۔ آخر وزیر صاحب مرض استسقا میں مبتلا ہوئے اور سمجھے صاحب کتاب کی بد دعا کا اثر ہے۔ زچ ہو کر مولوی صاحب کی خدمت میں بھیج دی اور معافی چاہی۔ مولانا نے جواب میں کہلا بھیجا۔ مردوں کا وار خالی نہیں جاتا۔ میرا تیر ہدف پر پہنچ گیا۔"

حامد علی خاں وطن سے واپس آئے تو منصب مختاری دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ملکۂ دوراں کی خوشامد کی۔ ان کے فرزند شہزادہ جواں بخت کو ایک سو تلنے کے کھلونے اور کپڑے نذر کیے۔ پندرہ ہزار روپیہ بطور نذرانہ اور پانچ اشرفی بطور شکرانہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کر کے اپنے عہدے پر بحال ہوئے لیکن انتظامات بدستور ملکۂ عالم کے قبضۂ قدرت میں رہے اور وزیر السلطنت بادشاہ کے مختار نہیں بلکہ نواب زینت محل کے کارپرداز تھے۔

حامد علی خاں کی غیر حاضری کے زمانے میں بیگم زینت محل محبوب علی خاں خواجہ سرا کی معرفت مختاری کے فرائض انجام دیتیں اور بادشاہ کے دستِ خاص سے جاری کیے گئے ایک شقے کے مطابق بخشی گری کی تنخواہیں اپنے روبرو تقسیم کراتیں۔ پس پردہ رہ کر ریذیڈنٹ سے ملاقات اور گفتگو کرتیں چنانچہ ۱۸ جون ۱۸۴۷ء کو بھی آپ نے بادشاہ کی موجودگی میں نواب صاحب کلاں کو حسب معمول شرف نیاز بخشا۔

"نواب صاحب کلاں نے اطلاع بھیجی کہ میں شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ امور سلطنت کے مختار المہام وکیل شاہی کو حکم ہوا کہ استقبال کے لیے جاؤ، صاحب کلاں بہادر شرفِ حضوری (بادشاہ) سے مشرف ہوئے۔ بہت دیر تک بعض نمک حرام ملازموں کی بابت گفتگو ہوتی رہی۔ پس پردہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ تشریف رکھتی تھیں۔ انھوں نے صاحب کلاں بہادر کے لیے ایک بٹوہ جس میں الائچیاں وغیرہ تھیں تواضع کے طور پر بھیجیں۔"

مغل شاہزادوں کی شادیوں کا انتظام بھی ملکہ زینت محل کے سپرد تھا۔ اس کے لیے روپیہ کی فراہمی اور جملہ اسباب شادی کا مہیا کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

"دیوان دھوکل سنگھ سے ارشاد ہوا کہ بعض شاہزادگان کی شادی کے لیے نواب زینت محل بیگم صاحبہ کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہے۔ قرضہ کی ادائیگی کی نسبت اشامی کاغذ پر لکھ دیا جائے گا اور یہ قرضہ ۲ ہزار روپیہ سالانہ کی قسط کے حساب سے ان دیہات کی آمدنی سے ادا کیا جائے گا جو شاہی تولیت اور اقتدار میں ہیں۔"

اس کے علاوہ نواب زینت محل کو خانگی ضروریات کے لیے روپیہ کی جب بھی ضرورت پیش ہوتی تھی تو بادشاہ فوراً اس کے بندوبست کے لیے احکام جاری فرماتے تھے۔

"محبوب علی خواجہ سرا کو ارشاد ہوا کہ ایک ہزار روپیہ کا بندوبست کر کے بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیج دو۔"

"۲۵ ستمبر ۱۸۴۶ء کو عرض کیا گیا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی دادی نواب نوازش علی خاں کی زوجہ محترمہ فوت ہو گئیں حکم ہوا کہ ایک سو پچاس روپیہ تجہیز و تکفین کے لیے اور خلعت ماتمی کے طور پر تین دوشالے ان کے

وارثوں کے پاس بھیج دیے جائیں۔"

۱۸۴۶ء کے آغاز میں بیگم زینت محل کثرت کار کی بنا پر بیمار ہوگئیں۔ مرض نے زور پکڑا تو بادشاہ نے گورنر جنرل کو ان کے علاج کے سلسلے میں ایک عریضہ بھیجا۔ گورنر جنرل نے نواب صاحب فرخ آباد کے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں کو بغرض علاج دہلی بھیجنے کی تجویز کی۔

"یکم مئی ۱۸۴۶ء کو نواب صاحب فرخ آباد نے گورنر جنرل کی ہدایت کے بموجب اپنے خاص طبیب حکیم امام الدین خاں کو زینت محل صاحب کے علاج کے لیے دہلی بھیجا ہے۔ آج نواب فرخ آباد کا مختار امداد علی ملاحظۂ شاہی میں پیش ہوا۔"

ابھی حکیم امام الدین کے علاج سے بیگم صاحبہ تندرست نہ ہوئیں تھیں کہ نواب صاحب فرخ آباد کے بیمار ہونے کی اطلاع صاحب کلاں بہادر کو ملی۔ انھوں نے چاہا کہ حکیم امام الدین کو ان کے علاج کے لیے فرخ آباد بھجوادیں۔ چنانچہ بادشاہ سے گزارش کی گئی لیکن بادشاہ نے اسے منظور نہیں کیا اور ــــ

"۸ مئی ۱۸۴۶ء کو صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ روانہ کیا گیا کہ حکیم امام الدین خاں بہادر نواب زینت محل کے علاج معالجہ میں مصروف ہیں ان کو نواب صاحب فرخ آباد کے معالجہ کے واسطے روانہ نہیں کیا جاسکتا اگر ان کو رخصت کردیا جائے تو بیگم صاحب کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی۔"

غرض حکیم صاحب کی توجہ اور علاج سے بیگم زینت محل صحت یاب ہوگئیں اور وہ طبیب شاہی بن کر سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے لگے۔

۲۵ جون ۱۸۴۷ء کو نواب زینت محل بیگم نے دس ہزار روپیے طلب کیے۔ چنانچہ بادشاہ نے صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ،

"نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے محبوب علی خاں خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار روپیہ قرض لیا ہے۔ یہ قرض دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے قسط وار ادا کیا جائے۔ ۴ ہزار روپیہ میاں کالے صاحب پیرزادہ کی صاحبزادی کی شادی کے خرچ کے لیے۔ ۱ ہزار روپیہ بادشاہ کی منھ بولی بیٹی کی شادی کے لیے ۱ ہزار روپیہ خضر سلطان کے لیے ۱ ہزار روپیہ مرزا احمد بہادر کے لیے للعہ ہزار للعہ سو ۵، روپیہ مُرلی دھر اور رام پرشاد مہاجنان کے قرض ادا کرنے کے لیے ضرورت تھی جو روپیہ بچا ہے وہ جیب خاص میں خرچ ہوگا۔"

منشی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق حویلی کی تعمیر کے بعد زینت محل قلعہ میں نہیں رہتی تھیں۔ "وہ دن کے آٹھ بجے قلعہ میں جاتی تھیں اور سہ پہر کو اپنی حویلی میں واپس آتیں۔ ان کی سواری کے ساتھ آنے جانے میں گھوڑے پر ڈنکا بجا ہوا جاتا تھا۔"

"نواب زینت محل کی بگھی میں ۸ گھوڑے لگائے جاتے تھے جب کہ کسی بھی شہزادے اور رئیس کو چو گھوڑی سے زیادہ کی اجازت نہ تھی۔"

نواب زینت محل کا قلعے سے الگ رہنا بے سبب نہ تھا۔ زینت محل اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ انگریز قلعہ پر دانت لگائے ہیں اور غداروں کی بدولت وہ اپنی سازشوں میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔ ان کی یہ دوراندیشی بھی بادشاہ کو انقلاب زمانہ سے بچا کر گوشۂ عافیت بہم نہ کرسکی۔ ۱۸۵۷ء کی تیز و تند ہواؤں نے بہادر شاہ کو اس طرح دربدر کیا کہ انھیں دلی تو دلی ہندستان کے کسی گوشے میں پناہ نہ مل سکی۔ اس آڑے وقت میں بھی ایک شوہر پرست زوجہ کی حیثیت سے نواب زینت محل نے بادشاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور وہ بھی قید و بند کی مصیبتوں میں شریک ہونے کے لیے بادشاہ کے ہمراہ رنگون چلی گئیں۔

★

تسنیم فاروقی

وہ محافظ تھا اپنی دھرتی کا

باادب با ملاحظہ ہشیار
قد بہ قد صف بہ صف عصا بردار
شمع دانوں میں روشنی کی قطار
برگِ گل بھی اگر زمیں پہ گرے
سن لے ماحول اس کی بھی آواز
آہٹ آہٹ سکوت کے سجدے
مسندِ تخت و تاجِ ہند پہ ہے
آخری تاجدار کی آمد
گونج اٹھے سازہائے رزم نواز
رقص، نغمے، بہار، موسیقی، ایک سے ایک شاہکار فنون
مجلسِ ذوق و غالب و مومن ادبِ عالیہ کا زریں دور
چشمکیں، رنجشیں، نشاط و خمار
اور پھر!
غدر غدار ظالم و جارح چارسو سامراج کے عتاب

سازشیں بندشیں زوال قرار
سولیاں بیڑیاں حصار غبار
کشت و خوں جنگ پنجۂ افرنگ
اور اک جانب!
جاں نثاری مجاہدہ ایثار
بیگمیں شاہزادیاں، کانٹے، جلتے پتھر مہیب سناٹے
اپنی صدیوں کے غم میں گریہ کناں قلعۂ سرخ کے در و دیوار
طشت میں سر شہید بیٹوں کے ننھے معصوم شاہزادوں کے
اور پھر حسرتِ بہادر شاہ!
یعنی خاکِ وطن کا جسم و ضمیر
ہو کے قیدِ آہنی سلاسل میں ارضِ رنگون کا ہوا پیوند
وہ محافظ تھا اپنی دھرتی کا
تم اسے آخری مغل نہ کہو

زاہدہ خورجوی

ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

جنگِ آزادی کا بگل ۱۸۵۷ء میں تیسری بار بج اٹھا۔ میرٹھ نے اس مرتبہ خاص رول ادا کیا اور تلنگوں کی پوری بٹالین انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہوگئی۔ باغیوں کی یہ بٹالین ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی روانہ ہوئی اور چھاؤنی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس بٹالین کے فوجیوں کے جوشِ آزادی نے دہلی کی ہر رجمنٹ کو متاثر کیا جس میں ۳۰ ویں، ۵۴ ویں اور ۷۴ ویں رجمنٹ بھی شامل تھیں۔

رات کا پرہول سناٹا، کتوں کے بھونکنے اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازوں سے ٹوٹنے لگا۔ میرٹھ کے تیسرے رسالے کے سپاہی سر سے کفن باندھ کر دہلی روانہ ہوئے اور رات کے جھٹ پٹے میں جمنا کے پل پر پہنچ گئے۔ اب ان کے سامنے لال قلعہ تھا جہاں سے آزادی کا نعرہ بلند ہونے میں چند گھنٹے کی دیر تھی۔ سلیم پور میں جن انگریز کارکنان نے مزاحمت کی ان کو جہنم رسید ہونا پڑا۔ چونگی کا کلکٹر بھی اس تصادم میں ٹھکانے لگ گیا۔ آٹھ بجے کے قریب جمنا کی کشتیوں کے پل کو چند سواروں نے عبور کرلیا۔ ایک انگریز افسر نے مواصلاتی تاروں کو درست کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی باغیوں کے غضب کا شکار ہوگئے۔ کلکتی دروازہ بند کردیا گیا۔

بہادر شاہ ظفر نے باغیوں کے نعروں کو سن کر حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ حکیم احسن اللہ خاں نے بتایا کہ یہ میرٹھ کی باغی پلٹن کے سپاہی ہیں جو بادشاہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے چند افراد کو شرفِ باریابی بخشا اور ان کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا:

"بادشاہ جہاں پناہ سلامت، آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے۔ تمام ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت شمار ہوتی ہے۔ آج تک ملک میں جو منادی پھرتی ہے۔ اس میں یہی کہا جاتا ہے، خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا۔ انگریز آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، انصاف کے امیدوار ہیں، ہم ملازم انگریزی ہیں۔ ہم نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لے کر کابل تک فتح کر کے چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرا دی۔ یہ ولایت سے کوئی فوج لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ و تسلط انگریزوں کا ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہیں رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور آ گیا ہے اور ہمارے دین و مذہب کے تخریب کے درپے ہیں اور چاہتی ہے کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں اور اس کی ابتدا فوج سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ باہم صلاح سے ایک قسم کی ایسی بندوق ایجاد کی گئی ہے کہ جس میں کارتوس دانتوں سے کاٹ

کرنیدوقوں کے منھ میں دینا پڑے اور اس
کارتوس کو جانوروں کی چربی سے سنڈھوایا گیا
ہے وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئی ہیں کہ تم
کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں بھرو۔"
انگریزوں کی اسی حرکت نے ہندستانی حریت
پسندوں کو انگریزی سامراجیت کے خلاف مورچہ بنانے کی
ہمت دلائی۔ کمشنر اور سائمن فریزر نے گھوڑوں پر سوار ہوکر
تلنگوں کے جوش بے پایاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جنھوں
نے اپنی سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔
کوتوالی پر انگریز افسروں کا جماؤ تھا۔ کمشنر، کپتان، ڈگلس
سر تھامس، مٹکاف وغیرہ خاص طور پر اپنی فوج کی نگرانی کر رہے
تھے۔ ایک بار تو ڈگلس باغیوں کے نرغے میں آگیا تھا لیکن وہ
ڈلعیدٹ قلعہ کی خندق میں کود گیا۔ سخت چوٹیں آئیں لیکن چپراسیوں
کی مدد سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ فریزر چالبازیوں کے
باوجود خود کو بچا نہ سکا اور مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا۔
شہر کا کاروبار ٹھپ ہو گیا، مجاہدین کا پلڑا بھاری ہونے
لگا، دہلی گزٹ، دہلی بنک، دہلی کالج اور ٹیلی گراف کی عمارتیں
نذر آتش ہو گئیں اور محافظین لقمۂ اجل ہو گئے۔ کشمیری دروازے
پر مجاہدین کا تسلط ہو گیا۔
درحقیقت کشمیری دروازے کی فتح یابی باغیوں کی فتح دہلی
کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ۱۳ مئی سے انھوں نے اپنے بادشاہ
کی بادشاہت کا اعلان شروع کر دیا۔ دہلی کی فتح یابی کا اثر پورے
ملک پر پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ملک کے دوسرے حصوں سے بھی خوش
آئند خبریں موصول ہونا شروع ہو گئیں۔ بہادر شاہ ظفر نے
ہندستان کے جملہ نوابوں اور راجاؤں کے نام جہاد کرنے کا
فرمان جاری کر دیا۔
بریلی سے بھی یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک فوجی دستہ
روانہ ہوا جس میں تیس ہزار سپاہی اور چھ ضرب توپیں تھیں،
اور چھ لاکھ روپے نقد۔

انگریز معطل ہو کر رہ گئے بلکہ بعض اہم افسران یا تو مارے
جا چکے تھے یا باغیوں کی قید میں تھے۔ جنرل بخت خاں نے مسلمانوں
کو متحد کرنے کے لیے علماء کی طرف سے ایک فتویٰ جاری کرا دیا۔ یہ
فتویٰ ۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوا۔
اس فتوے کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں انگریزوں کے
خلاف جوش بڑھتا ہی گیا لیکن انگریز بھی خاموش نہیں بیٹھے رہے
وہ خاموشی سے ایک فیصلہ کن لڑائی کی تیاری میں مصروف تھے
کشن گنج، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں مجاہدین اور انگریزی فوجوں
کے درمیان مڈبھیڑ ہوئی جن میں جانی نقصان تو ہوا لیکن حکومت
باغیوں کے ہاتھ میں ہی رہی۔ مجاہدین نے اپنی شجاعت کے جھنڈے
گاڑ دیے۔ مٹکاف اور نکلسن نے اپنے سپاہیوں کو ہمت دلانے
کی کوشش کی جو بے سود رہی۔ ہر محاذ پر شکست ان کا مقدر بنتی جا رہی تھی۔
ہڈسن نے جب کمان سنبھالی تو لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور
باغی فوجیوں کو بھی شکست ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر کو دہلی کے اہم
مقامات ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرہ
میں پناہ لینی پڑی۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو منع کیا لیکن
بادشاہ نے ان کا مشورہ نہیں مانا۔ ہڈسن مقبرے پر پہنچا اور
بادشاہ کو جھوٹے وعدے کرکے گرفتار کر لیا۔
نومبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کو رنگون کے لیے روانہ کر دیا
گیا۔ زندگی کے آخری دن انھوں نے وہیں گذارے۔ آخری لمحوں
میں ان کے پاس زینت محل، جواں بخت اور دو ایک عزیزوں
کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ شاہوں کے مقبروں سے دور
رنگون ہی میں دفن ہوئے۔
وہ خود بھی کہہ گئے تھے ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو
ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

★

تجمل اعجازی

بہادر شاہ ظفر اور مرزا جواں بخت

ولی عہد
جواں بخت

حکومت مغلیہ کا آفتاب لب بام آچکا تھا اور اس کی نقرئی کرنیں طلائی رنگ اختیار کر لینے کے بعد کجلانے لگی تھیں اولوالعزم سلاطین کے وارث بہادر شاہ کی حکومت دلی کے ایک گوشے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ لال قلعہ کے در و بام حسرت و یاس کے مرقع بنے ہوئے تھے انگریز لال قلعہ اور خطاب شاہی پر قبضہ کرنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے آخری مغل حکمراں کی "نورجہاں" نواب زینت محل شوہر کی غمگساری کے ساتھ شاہی اقتدار کو قائم اور مستحکم بنانے کی فکروں میں غلطاں رہ کر زندگی کے شب و روز گزار رہی تھیں۔ ولی عہد دارا بخت کو چھوڑ کر سبھی شہزادے اور حرم شاہی زینت محل کے سامنے سرنگوں تھے ۶ فروری ۱۸۴۷ء کو ولی عہد کی پچپنویں سالگرہ ہو چکی تھی۔ ولی عہد دارا بخت ایک زمانہ پرست انسان کی حیثیت سے زمام حکومت سنبھالنے کے لیے وقت کے منتظر تھے لیکن زینت محل انھیں اس منصب جلیل کا سزاوار نہیں سمجھتی تھیں۔ اس سلسلے میں خود بادشاہ بھی زینت محل کے ہم خیال تھے اور اپنے فرزند سے شاکی بھی تھے لیکن انھوں نے ایک بار بھی ولی عہد سلطنت نامزد ہو جانے کے بعد دارا بخت کی مخالفت نہیں کی تھی اور نہ ولی عہد سلطنت کے منصب سے اسے معزول کرانے کی کوئی تحریک چلائی تھی۔

مرزا شاہ رخ بہ اعتبار عمر دارا بخت سے چھوٹے تھے لیکن اپنے اوصاف ذاتی اور جذبۂ خدمت کی بنا پر بادشاہ کے منظور نظر تھے، وہ جفاکش بھی تھے اور خداداد ذہانت کے مالک بھی۔ باپ کے مزاج شناس ہونے کی وجہ سے زینت محل کی تعظیم اور خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور جملہ شہزادوں میں زینت محل کے فرزند جواں بخت کو فائق جان کر ہر امر میں اس کا پاس کرتے تھے اور اس کی خاطر مدارات کا بھی ہمیشہ خیال رکھتے تھے البتہ بادشاہ کے خیال سے قطع نظر ولی عہد کے قضیے میں اپنی ذات کو ملوث کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اسی لیے خدمت سلطانی کے بعد جو وقت بچتا تھا اسے قلعہ سے دور رہ کر سیر و شکار میں گزار دیا کرتے تھے۔

۱۸۴۷ء میں آغاز میں شاہ رخ نے شکار کھیلنے کی غرض سے رام پور اور بریلی کے اطراف کا رخ کیا۔ جہاں انھیں بواسیر کا مرض لاحق ہو گیا اور دلی واپس پہنچتے پہنچتے مرض نے اتنا زور پکڑا کہ جانبر نہ ہو سکے اور اپریل کے مہینے میں ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شاہ رخ کے انتقال کے بعد بادشاہ کی تسکین خاطر کا واحد ذریعہ زینت محل بن گئیں اور ان کی شفقتوں نے مرزا جواں بخت کو اپنا مرکز بنا لیا۔ زینت محل نے موقع مناسب دیکھ کر بادشاہ سے مرزا جواں بخت کو ولی عہد سلطنت بنوا دینے کی خواہش کا اظہار کیا جسے بادشاہ نے قبول کر لیا۔ اس سلسلے میں ابھی کوئی عملی قدم اٹھانے کی نوبت آنے نہیں پائی تھی کہ نامزد ولی عہد سلطنت کا ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو انتقال ہو گیا۔ اب بادشاہ کے لیے موقع تھا کہ وہ ریذیڈنٹ کے ذریعہ

کورٹ آف ڈائرکٹرز سے جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی تحریک کریں۔

دوسری طرف مرزا جواں بخت کے انتقال سے کمپنی کے ارباب اقتدار کو اپنی ہوس پوری کرنے کا موقعہ فراہم ہو گیا وہ نئے ولی عہد سے قلعہ خالی کر دینے کا معاہدہ کر لینے کی تجویز پر عمل درآمد کے لیے تیار ہو گئے

بادشاہ، زینت محل اور انگریزوں کی خواہشیں متصادم ہو کر رنگ لائیں۔ لال قلعہ میں سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ بادشاہ کے دوسرے سب سے بڑے فرزند فتح الملک مرزا غلام فخر الدین انگریزوں کی شہ پر انگلستان کے قانونِ وراثت کا سہارا لے کر میدان میں آ گئے اور انھوں نے آہستہ آہستہ اندرونی طور پر مختلف طریقوں سے اپنے ہوا خواہوں کی تعداد میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف بادشاہ کے سہارے پر زینت محل نے مرزا جواں بخت کے لیے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا قلعہ سے لے کر ریذیڈنٹ کی کوٹھی تک زینت محل کے فرستادے بھی دوڑنے لگے۔ ترغیب و تحریص اور اعمال و وظائف سے کام لیا جانے لگا۔ لیکن اس کشمکش میں بیگم کے مقابلے پر غلام فخر الدین کا پلہ گراں رہا۔ انھوں نے اقتدار کی خوشی میں "گھاٹے کے سودے" کو ترجیح دی اور کمپنی کے پیش کیے ہوئے شرائط کو قبول کر کے ولی عہد سلطنت کا منصب حاصل کر لیا۔ اخبار کوہ نور لاہور نے ان کی ولی عہدی کی خبر اہتمام سے شائع کی۔

خبر دھلی

"ہم ایک بڑی خوش خبری سے اپنے اخبار کو زینت اور آرائش دیتے ہیں بمعتبروں سے سنا گیا کہ پیش گاہ کورٹ آف ڈائرکٹرز سے منظوری ولی عہدی کی بنام نامی فخر دین والمیال فروغ دودہ گورگاں طراز و سادہ جہانبانی زینت مسند صاحبقرانی جناب صاحب عالم و عالمیان مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہم و زاد اجلالہم کی آگئی ہے۔ اس خوشخبری سے تمام شہر میں عید سے پہلے عید ہو گئی۔ خوشی کا یہ عالم ہے کہ پیران کہن سال جوانی کا دم بھرتے ہیں۔ غرض اس قدر پایا الہے کہ محرومان ازلی شب فراق کو روزِ وصال سمجھتے۔ دن عید رات شب برات ہے۔ غالب معلوم ہوتا ہے کہ ذات بابرکات سے ہر خاص و عام دعا گویان مخلصین کو فائدہ تام حاصل ہو، آئندہ جو کچھ معلوم ہوگا درج اخبار کیا جاوے گا۔"

(جلد سوم۔ شمارہ نمبر ۵۔ مطبوعہ ۲۸ ستمبر ۱۸۵۲ء بروز شنبہ)

اخبار کوہ نور نے اپنی اگلی اشاعت میں حسب وعدہ مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیں۔

منادی است بہر سو کہ اے خواص و عوام
مے نشاط حلال و شراب غصہ حرام

"ہفتہ گذشتہ میں درج اخبار ہوا تھا کہ منظوری ولی عہدی کی کورٹ آف ڈائرکٹرز سے آگئی ہے اب ہم ناظرین کو بشارت دیتے ہیں کہ تاریخ نہم ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ روز جمعہ پیش گاہ حضور والا سے جناب صاحب عالم و عالمیان مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہم کو خلعت سات پارچہ کا مع چپکن زربفت اور دو رنگ دوشالہ سفید، گوشوارہ، مرصع دستار سربستہ، جیغہ سرپیچ بالائے سر دار کلغی پیچ رقم جواہر سپر و شمشیر نوبت و نقارہ فیل و اسپ مع عماری ناکی پالکی کرسی متصل تخت ہوادار ماہی مراتب وغیرہ جلوس مع اس خطاب کے ...... مرحمت ہوا اور دوسرے دن خدام ذی احتشام جناب گردوں رکاب ولی عہد بہادر باوجود ناسازی طبع اعلا کے واسطے ادا کرنے دوگانہ عید عیدالضحیٰ کے رونق افروز عیدگاہ ہوئے اور بکمال شان و شوکت و فیض بخشی و فیض رسانی داخل قلعہ معلیٰ ہو کر دعا گویوں اور خادمین اور تابعین کو علی قدر مراتبہم انعام مرحمت فرما کر ممتاز و سربلند فرمایا اور یکشنبہ کے دن امیدواران پرورش کو خلعت ہائے فاخرہ مرحمت ہوتے، فیض رسانی اس مرتبے پر ہے جو کہ سے

سے محتاج تھے اب اہل خوان کو نوبت گاری
میں نوکر رکھا جاتے ہیں۔ ادنیٰ ادنیٰ بے نوا
شاہی کا دعویٰ کرتا ہے جن کے ہاں مصیبت
کی شام رہتی تھی اب روز عیش رہتا ہے۔ جو اہل
احتیاج کے قافلے میں پس ماندہ تھے۔ اب کاروانِ
امارت کے قافلہ سالار ہیں۔ غرض بڑی خوش
نصیبی اس شہر کی ہے کہ یہ عہد دولت اس
کو میسر آیا۔ سنا جاتا ہے کہ حضور والا نے اس
اقرار نامہ پر کہ پانچ ہزار روپیہ ماہیانہ مرزا جواں
بخت بہادر کو ہمیشہ ملتے رہیں اور دو گانو
اور دو باغ ملکہ زمانی زینت محل صاحبہ کی جاگیر
میں رہیں۔ جناب ولی عہد بہادر سے مہر کرالی ہے۔"
(جلد سوم۔ شمارہ [illegible] مطبوعہ ۵ اکتوبر ۱۸۵۶ء روز شنبہ)

جب مرزا غلام فخرالدین اور جواں بخت کے درمیان ولی
عہدی کے منصب پر کشمکش پیدا ہوئی تھی اور اہالیانِ قلعہ کا
عام طور پر یہ خیال تھا کہ بادشاہ اور زینت محل کی کوششوں کی
بدولت مرزا جواں بخت کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی زمانے میں
زینت محل نے اس خیالِ خوشی کو دو آتشہ کرنے کے لیے جواں
بخت کی شادی کی تجویز بادشاہ کے سامنے پیش کی اور رشتہ
ناکت کے لیے نواب ولا گوہر کی بھتیجی کو منتخب کیا۔ بادشاہ
سے شادی کی منظوری ملتے ہی نواب زینت محل کا دل خوشیوں
سے بھر گیا۔ ان کے تصور میں جواں بخت کا چہرہ شادی کی کلغی
کے سہروں میں لپٹا ہوا چمک رہا تھا۔

بادشاہ نے نواب زینت محل کے اصرار پر لال قلعہ کی شکست
و ریخت کی مرمت، اس کی صفائی، رنگ و سازی اور اس میں
جابجا چراغاں کے لیے آخری بار شاہی احکامات کیے۔

دیوانِ خاص جو ایک مدت سے بے ترتیب [illegible]
سامان کا انبار خانہ بنا ہوا تھا، جہاں خالی صندوق جا بجا
پڑے ہوئے تھے اور تخت طاؤس پر جواہرات کی جگہ گرد

کی بیٹ پر کثرت سے بیٹھی ہوئی تھی ایک بار پھر توجہ کا مرکز بن گیا
اسے پاک و صاف کر کے جشنِ شادی کے لیے آراستہ کیا گیا۔
بجھتے ہوئے چراغ کا شعلہ جوان تابی کا منظر پیش کرنے لگا۔
یہ شہزادہ جواں بخت کی شادی کا جشن نہ تھا بلکہ لال قلعہ
میں گذشتہ سلاطینِ مغلیہ کی طرب آگیں محفلوں کو آخری بار جلال
درخشاں کر دیا گیا تھا۔ اور مغل بادشاہ کی ڈوبتی ہوئی نبضوں میں
زندگی کی حرارت اور خون کی روانی دوڑائی گئی تھی۔ اخبار کوہِ نور
نے اس شادی کی خبر تفصیل کے ساتھ شائع کی:

"شہر دہلی میں چند روز سے بڑی رونق اور دھوم
ہے کیونکہ شاہزادہ میرزا جواں بخت بہادر خلف
الرشید حضرت جہاں پناہ کی شادی نواب ولا گوہر
کی بھتیجی سے ہوئی اور بڑی دھوم دھام رہی جس
روز برات چڑھی حضرت ظلِ سبحانی بھی تشریف
لے گئے اور گھوڑے ہاتھی، شتر اور دیگر سواران
شمار سے زیادہ تھے اور دروازہ قلعہ سے لے کر
تا بہ لاہوری دروازہ تمام شہر میں روشنی ہوئی کہتے
ہیں کہ قلعہ دہلی کے دربارِ عام کی جگہ جہاں شاہانِ سلف
دربار فرمایا کرتے تھے اور تخت طاؤس رہا کرتا
تھا پھر مرمت ہوئی ہے اور نہایت آراستہ ہوا
اور اس میں بھی خوب روشنی ہوئی اور جب تک شادی
کی دھوم دھام رہے گی ہر شب کو وہاں جلسہ
ناچ تماشا کا رہے گا۔"
(جلد سوم۔ شمارہ [illegible] مطبوعہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۶ء روز شنبہ)

مرزا جواں بخت کی شادی جو ٹھاٹ باٹ سے ہوئی "جہاں پناہ" کے لیے
بھی یہ پہلا موقع تھا جب وہ کھل کر اپنی مسرت کا شاہانہ اظہار کر سکتے
تھے اس لیے جشنِ شادی میں انتہائی تکلفات سے کام لیا گیا۔
ساچق، مہندی اور برات کے موقعوں پر دل کھول کر فیاضی کا ثبوت
دیا گیا [illegible] جنہیں بادشاہ کی خدمت
میں حاضر ہونے کا شرف حاصل تھا بیان کرتے ہیں:

"قرینۂ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئیں تھیں، ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا، ملازمین معززین کی انجمن جدا، فرقہ سپاہ کی بزم جدا، شاگردپیشہ کے لیے جدا۔ اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہل شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں۔ رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و انداز تھے اور مہ جبینان ناہید نواز زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔"

کل ملازمین شاہی اور روسائے شہر کے واسطے توڑہ جات کا حکم تھا جس کا جی چاہے پچاس روپیہ توڑہ کی قیمت لے خواہ توڑہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو توڑے تقسیم کیے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا توڑا جدا، میرے نام جدا میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا، وہ بھی نوکر تھا، میری والدہ کے نام جدا، کیونکہ ایک تنخواہ ان کے نام بھی تھی۔

میں نے مہتمانِ توڑہ بندی سے کہلا بھیجا کہ "آٹھ روز بعد ایک توڑہ بھجوا دیا کرو۔"

اس دریا دلی سے تقسیم توڑہ جات ہوئی تھی کہ جس روز توڑہ آتا تھا تمام عزیز و اقارب، دوست، احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک توڑہ میں طعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھائے میرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار، پانچ پانچ طرح کے پلاؤ۔ رنگ برنگ کے میٹھے چاول سرخ، سبز، زرد، اودے، پانچ سیر کی باقرخانی، ایک شیریں، ایک نمکین اور بھی ہر قسم کے نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شئے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جن شعراء نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے وخلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگردپیشہ کو جوڑے تقسیم کیے گیے۔"

غالب مرحوم کی رسائی دربار شاہی میں ہو چکی تھی۔ نواب زینت محل کے ایماء سے انھوں نے یہ سہرا لکھ کر زرنگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں نذر گزرانا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

رخ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگ ابر بہار
لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کی خدمت میں جب یہ سہرا پیش ہوا تو مقطع دیکھ طبیعت بدمزہ ہوگئی۔ مقطع میں بادشاہ کے استاد ذوق پر کھلی ہوئی چوٹ تھی۔ بادشاہ نے اسی وقت وہ سہرا استاد ذوق کی خدمت میں بھیج کر اسی طرح دوسرا سہرا کہنے کی فرمائش کی۔ ذوق نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں بعجلت سہرا لکھ کر پیش کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید
رخِ پرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ، یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بھی زیب رہے اخلاص ہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھر کی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ کو اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کی،
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

بادشاہ نے سہرے کی نقلیں اربابِ نشاط کو بھجوا دیں جو سرکار میں ملازم تھے اور ذوق کا سہرا دلی کے ہر گلی کوچے میں پھیل گیا۔

بادشاہ کی ناراضگی کی اطلاع ملتے ہی غالب نے بگڑی ہوئی بات بنانے کے لیے ایک منظوم معذرت نامہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا ؎

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات

مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی، پہ طبیعت بری نہیں

ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالبؔ کے معذرت نامے کے بعد بادشاہ کا دل ان کی طرف سے صاف ہوگیا۔

اپریل ۱۸۵۲ء میں جواں بخت کی شادی کی تمام رسمیں بخیر و خوبی انجام پاگئیں۔ ابھی نواب زینت محل شادی کے ہنگاموں سے فرصت پاکر چین کی سانس بھی لینے نہ پائیں تھیں کہ ستمبر ۱۸۵۲ء میں مرزا غلام فخر الدین کی ولی عہدی کا اعلان سن کر ان کی ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں لیکن جلد ہی حالات نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا غلام فخر الدین کا ہیضے کے مرض میں انتقال ہوگیا اور نواب زینت محل ایک بار پھر جواں بخت کو ولی عہد بنوانے کے خواب دیکھنے لگیں۔ لیکن اس بار مقابلہ مرزا قویش سے تھا جو بادشاہ کی موجودہ اولادوں میں سب سے بڑے تھے۔

اس اثنا میں سر طامس مٹکف ایجنٹ دہلی بادشاہ کی ملاقات کے لیے آئے تو بادشاہ نے ان کو ایک محضر نامہ پیش کیا جس میں ان کے آٹھ بیٹوں کے دستخط اور مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں درج تھا کہ "ہم خوشی کے ساتھ زینت محل کے بیٹے کو جو دانائی، لیاقت، علم اور خوش اخلاقی کے صفات کا مالک ہے ولی عہد مقرر کرتے ہیں: ...... محضر کے ساتھ ایک پرچہ بھی تھا جس میں انھوں نے گزشتہ درخواست کا اعادہ کیا تھا۔ اس محضر نامہ اور پرچے کو پیش کیے ہوئے دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ مرزا قویش نے ایک خط ریذیڈنٹ کو تحریر کیا کہ:

"ہمارے والد ماجد نے اضافہ تنخواہ اور زر دینے کا وعدہ کرکے محضر نامے پر دستخطیں اور مہریں کرالی ہیں۔ میں باپ کا حکم ٹالنا نہیں چاہتا تھا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ زینت محل کی سازش سے مجھے ولی عہدی سے محروم کیا جارہا ہے تو میں آپ سے رجوع کرتا ہوں کہ ولی عہدی کا اصل مستحق میں ہوں کیونکہ میں بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوں۔ حافظ قرآن اور حاجی بھی ہوں۔"

کمپنی جو لال قلعہ پر قبضہ حاصل کرنے اور خطاب شاہی کو ختم کرنے کا پہلے ہی سے منصوبہ بنائے ہوئے تھی اور چند سیاسی مجبوریوں کی بنا پر خاموش تھی، اسے مرزا قویش کی تحریر سے مکمل کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس نے گزشتہ ولی عہد سے کیے گئے معاہدے کی بعض شرطوں کی تجدید کے ساتھ مرزا قویش سے یہ شرط بھی منظور کرالی کہ لقب شاہی بہادر شاہ کے بعد بالکل موقوف کردیا جائے گا۔ صرف شاہزادے کا خطاب باقی رہے گا اور بادشاہ کے ماہانہ زر پیشکش کی رقم جو ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ کے قریب ہے اس میں تخفیف کرکے شاہزادے کو صرف پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ خرچ کے لیے دیا جائے گا۔

بادشاہ کو جب مرزا قویش کی حرکت اور معاہدہ کا علم ہوا تو انھیں مغلیہ خاندان کی بادشاہت کے بالکل مٹ جانے کا یقین ہوگیا۔ اسی غم و افسوس کے عالم میں انھوں نے ایک انتہائی اندوہناک نظم کہی جس کا ہر شعر بذات خود ایک مرثیہ تھا ؎

اے ظفرؔ اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت

بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

بادشاہ کی پیشین گوئی قبل از وقت ہی سامنے آگئی جب ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی ناکام تحریک نے ولی عہد کے خوابوں

کو بھی منتشر کر دیا۔ بہادر شاہ ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار کر کے انگریزی عدالت کے سامنے انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ پیش کیے گئے۔

بادشاہ پر مقدمہ کا آغاز ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہوا اور ۹ مارچ ۱۸۵۸ء تک مقدمہ کی نمائشی کارروائی ہوتی رہی آخر کار فرد جرم لگا کر بادشاہ کو جلا وطن ہونے کا حکم سنا دیا گیا۔ عدالت نے شہزادہ جواں بخت زینت محل اور ان کی ناز پروردہ بہو کو بھی نہیں بخشا اور نومبر ۱۸۵۸ء میں سب کو جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔[1]

رنگون کے زمانہ اسیری میں کئی بار بہادر شاہ کے انتقال کی افواہیں ہندوستان میں پھیلیں۔ آخر کار نومبر ۱۸۶۲ء میں رنگون کی دل خراش فضاؤں میں مایوسیوں کے زریں چراغ کا شعلہ آخری بار لہرایا اور زینت محل و جواں بخت کی نگاہوں کو اندھیروں میں غرق کر گیا۔[2]

اودھ اخبار نے چند روز بعد ایک چوتھائی کالم میں بغیر کسی ماتمی حاشیے کے خبر وفات شائع کی۔

خبر وفات شاہ دہلی

اخبار جام جہاں نمائے کلکتہ مصدرہ ۴ نومبر ۱۸۶۲ء میں بحوالہ دہلی گزٹ انگریزی وارد و گائڈ کلکتہ درج ہے کہ شاہ دہلی جو جزیرہ رنگون میں مقید تھے اور ان کی وفات کی خبر کئی بار شہرت پا چکی تھی اب کی مرتبہ تحقیق بقضائے الٰہی فوت ہوئے عمر ان کی قریب نوّے برس کے ہوگی کیونکہ تاریخ پیدائش ابو ظفر (۱۱۸۹ھ) ہے اور اب مادہ تاریخ فوت یہ تخرجہ ایک عدد کے ابو ظفر نام (۱۲۷۹ھ) ہوتا ہے۔ کسی شاعر کا شعر حسب حال شاہ متوفی درست آتا ہے۔ شعر

---

[1] یکم اپریل ۱۸۵۹ء

[2] مورخین نے تاریخ انتقال ۷ نومبر تحریر کی ہے جبکہ اودھ اخبار نے اپنی ۱۲ نومبر کی اشاعت میں خبر کے ساتھ اخبار کی جس اشاعت کا حوالہ دیا ہے وہ ۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو شائع ہوا تھا۔

میر کا ہجر میں وصال ہوا
آج قصہ ہی انفصال ہوا

(اودھ اخبار جلد ۴، شمارہ نمبر ۴۶۔ مطبوعہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۹ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ روز چہار شنبہ)

اسی بے کسی کے عالم میں ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو زینت محل نے اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ ان کے انتقال سے قبل ۱۸۸۴ء میں وہ شہزادہ جواں بخت جس کی شادی کے سہرے استاد ذوق اور مرزا غالب نے لکھے تھے اس طرح پیوند زمیں ہوا کہ نشان لحد بھی باقی نہ رہا کہ جس پر کوئی دو پھول چڑھا سکے۔

★

مومن خان شوق

بہادر شاہ ظفر

وہ پہلا سورما
جس کی بزرگانہ قیادت نے
وطن کو بیکراں عظمت عطا کی
اور آزادی کی دولت سے نوازا
وہ ایسا حکمراں
جس کی دلوں پر حکمرانی تھی:
شرافت کا نمونہ اور رواداری کا سرچشمہ
فقیر و بادشاہ، شاعر
جسے غربت میں بھی یادِ وطن رنجور کرتی تھی:
حدیثِ دل کو زنداں کے در و دیوار پر لکھ کر
بہادر شاہ نے ہندوستاں کی آبرو رکھ لی
ظفر کو ہم بصد اخلاص ہر دم یاد رکھیں گے

ڈاکٹر نیر مسعود

بہادر شاہ ظفر کا غیر غزلیہ کلام

شاعر کی حیثیت سے بہادر شاہ ظفر کو ان کی غزلوں کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ غزل کے سوا انھوں نے دوسرے اصنافِ سخن میں کم طبع آزمائی کی چنانچہ ان کا مطبوعہ[1] کلیاتِ اردو کئی اہم اصناف سے خالی ہے۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی[2]، واسوخت جو ان کے عہد کے رائج اصناف تھے ان کے اردو کلام میں نظر نہیں آتے تاہم ان کا غیر غزلیہ کلام بھی انھیں ایک مشاق شاعر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

ترکیبی ہیئتوں کے لحاظ سے اس کلام کا بیشتر حصہ مسدس، مخمس، مربع، مثلث پر مشتمل ہے۔ ان سطروں میں اسی کلام کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے۔

مسدس

ظفر کے یہاں مسدس مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ دیوانِ اول کا پہلا مسدس پنجتن کی شان میں ترجیع بند ہے۔ ترجیع کی بیت یہ ہے:

لی خمسۃ اطفی بہا حرالوباء الحاطمہ
المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناھما والفاطمہ

اس مسدس کا مقطع ہے:

ہے گرم گرچہ یہ ہوا جوں نارِ دوزخ بیشتر
لازم ہے تجھ کو جوش پر دریائے رحمت کے نظر
ہرگز خواصِ خمسہ گم تو دم سے اپنے نہ کر
بعد از نمازِ پنج وقت اس کو پڑھا کر اے ظفر

لی خمسۃ اطفی بہا حرالوباء الحاطمہ
المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناھما والفاطمہ

ایک اور ترجیع بند میں اپنے اس فارسی شعر کی تضمین کی ہے:

اے ظفر آمدہ بہار بہ جوش
موسمِ توبہ نیست بادہ بنوش

بعض مسدس تین زبانوں میں ہیں۔ پہلے دو مصرعے اردو میں پھر دو مصرعے پنجابی میں، پھر فارسی کا شعر۔ مثلاً:

گرچہ بسمل کی طرح خاک میں غلطاں ہوں میں
دل سے پر تیرِ نگہ کے ترے قرباں ہوں میں
دل وچ تیرے تیر نظر دے ایسے گہرے گھاؤ
بھر بھر مرہم مرہم جاواں تو بھی نہ ہو بھراؤ
بود در ناوکِ ناز تو چہ لذت کہ نہ شد
لب ہر زخم بہم چوں لبِ سوفار ہنوز

اسی طرح کے ایک مسدس میں فارسی مثنوی کے شعروں کی تضمین ہے:

دم آنکھوں میں ہے لب پر جاں آئی ؛ تری صورت نہیں دیتی دکھائی
کہاں تک تیری سونڑاں راہ تکاں ؛ ترے دیکھے بنا پھر رہ نہ سکاں
بیا از دردِ دوری بے قرارم
نہ دارم تابِ مہجوری نہ دارم

ایک مرثیہ بھی مسدس ترجیع بند کی صورت میں کہا ہے جس کا مطلع اور مقطع حسبِ ذیل ہے:

نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ
وظیفہ چاہیے ذکرِ غمِ امام کے ساتھ

---

[1] کلیاتِ ظفر، مطبع نول کشور، ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء۔ [2] دیوانِ چہارم میں "رباعیات" کے زیر عنوان جو مصرعے ہیں وہ رباعی کی بحر میں نہیں ہیں (نیر مسعود)

اگر ہے دوستی اس سرورِ انام کے ساتھ
تو وردِ صبح کے ساتھ اور وردِ شام کے ساتھ
سلام شہ پہ صلوٰۃ علی الدّوام کے ساتھ
کہ ہر نماز ادا ہوتی ہے سلام کے ساتھ

غمِ حسین میں جو تیری چشم ہے پُرنم
سیاہی اس میں نہیں، روشنائی ہے کچھ کم
ہر ایک شاخِ مژہ سے ظفر بنا کے قلم
یہ دل کے پرچے پر آنکھوں سے کر ہمیشہ رقم
سلام شہ پہ صلوٰۃ علی الدّوام کے ساتھ
کہ ہر نماز ادا ہوتی ہے سلام کے ساتھ

مخمّس

ایک اچھا مخمس ترجیع بند خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں ہے :

تم ہو اے خواجہ معین سرورِ روانِ حق پرست
تم ہو رمز آگاہِ کُن اور واقفِ سرِّ الست
تم مددگارِ ظفر ہو کیوں ظفر کو ہو شکست
پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں ہاد دست
یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

گھر رہے ہیں کوہ سے سر پر مرے بارِ گناہ
اور میں عاجز نحیف و ناتواں مانند کاہ
وقت تاریکی ہے اور ہر گام پر تاریک چاہ
ظلمت آبادِ جہاں میں پھرتا ہوں گم کردہ راہ
یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

بحرِ غم میں یہ ظفر جوں موج ہو کر بے قرار
مارتا ہے دست و پا تا [illegible] جائے کنار
پر [illegible] ہے اور ہے [illegible] بے شمار
چاہتا ہے دستگیری ہے یہ وقتِ اضطرار
یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

مخمس میں ایک مرثیے کے دو بند حسبِ ذیل ہیں :

ستم ہے ساقیِ کوثر کا جانی   نہ پائے تین دن ایک بوند پانی
پانی کی اک بوند نہیں اور سوکھی جائے زبان
مارے پیاس کی گرمی کے ہونٹوں پہ آئی جان
لبوں پہ پھیرتا سوکھی زباں ہے
مُرادن بیاہ کے قاسم ہوے ر[illegible]   جدائی ہو گئی دولہا دلہن میں
کیسی مہندی عطرِ سہاگ اور کیسی رنگیلی رات
دولہا کے تو ہات کٹیں اور دلہن ملتی ہات
غمِ قاسم ہے یہ شادی کہاں ہے

لیکن ظفر کے بہترین مخمس وہ ہیں جن میں انھوں نے غزلوں کی تضمین کی ہے ، ان میں خود ظفر کے علاوہ دوسروں کی غزلیں شامل ہیں ۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

جب تری شمشیر سے کتنے ہی سر اڑ جائیں گے
زنگ سب کے باعثِ خوف و خطر اڑ جائیں گے
ہم نہیں وہ جن کے اوساں دیکھ کر اڑ جائیں گے
اور تو دھمکی میں اے بیدادگر اڑ جائیں گے
پر نہیں ٹلنے کے ہم ٹکڑے اگر اڑ جائیں گے

صبح گلشن میں صبا تیرا اگر ہووے گذر
کہیو بلبل سے ذرا اتنا کہ اے شوریدہ سر
کر رہی ہے چہچے کیا شاخِ گل پر بیٹھ کر
یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

بات جو کرتے نہیں ہرگز فریب و مکر و فن
تو ہوا خواہی کا دعوی معتبر ان کی نہ گن
گل [illegible] جب کہ ہوگا کوئی ان کا ممتحن
رنگ باغِ سبز دکھلاتے تو ہیں پر ایک دن
[illegible] ان کے [illegible] اڑ جائیں گے

گفتگو اردو کے شاعر [illegible]

ہوتی خفت ہمیں ملال کبھی ایسی تو نہ تھی
رہتی اس بزم میں کلبلی کبھی ایسی تو نہ تھی
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

ہوں تو مدت سے ترا شیفتۂ روئے نکو
پر جو اب حال ہوا ہے یہ نہ دیکھا تھا کبھو
بس نظر ملتے ہی دل پر نہ رہا کچھ قابو
تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

جانتا ہے اُسے تو خوب کہ ہے عاشقِ زار
دل تو کیا جان کے دینے میں نہیں ہے انکار
وہ کسی بات پہ کرتا نہیں تجھ سے تکرار
کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

دیکھا جب کچھ حصولِ مقصد و مطلب ہو دل
اور فارغ ساری تشویشوں سے روز و شب ہو دل
آشنا واشد سے اس گلشن میں شاید جب ہو دل
سیرِ گلزارِ جہاں سے یوں شگفتہ کب ہو دل
غنچہ آسا کچھ گرہ میں زر بھی واجب ہے کہ ہو

سوچ لے دل میں کہ اس کی زلف ہے ناگن بلا
جس کو کاٹے نے ڈسا پانی نہیں وہ مانگتا
مان کہنا تو مرا دستِ ہوس کو مت بڑھا
سانپ کالا ہے کھلا نا چھیڑنا اس زلف کا
اے ظفر ہاں یاد کچھ منتر بھی واجب ہے کہ ہو

قدسی کی مشہور فارسی نعتیہ غزل کو کئی شاعروں نے تضمین کیا ہے۔ ظفر کے یہاں بھی اس کی عمدہ تضمین ملتی ہے :

سرورا تو وہ نبی جس کے نہیں بعد نبی
دیکھ کر شان تری عرش کی بھی شان دبی
انبیاء تجھ سے کہیں وقت شفاعت طلبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی

وہ فرشتہ کہ جو ہو حاملِ عرشِ اعظم
آئے در پر ترے آنکھوں کو اگر کرکے قدم
تو ادب سے یہ کہے کھا کے ترے در کی قسم
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

سوزِ عصیاں سے جگر سوختہ جب مخلوقات
آئیں صحرائے قیامت میں طلبگارِ نجات
کہیں سرچشمۂ احساں ہے شہا تیری ذات
ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ ز حد می گذرد تشنہ لبی

ہے ظفر کے دلِ بیمار کا بھی حال وہی
اور اسی طرح سے اب چارہ طلب ہے وہ بھی
گر گیا آگے ثنا میں تری جیسے قدسی
سیدا انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

ذوق، سودا اور میر کی غزلوں کی تضمین خاص طور پر بہت عمدہ ہیں۔ ان غزلوں میں اس طرح مصرعے لگائے گئے ہیں کہ وہ اصل کلام میں پیوست ہو جاتے ہیں اور یہی تضمین کی خوبی ہے۔ ذوق کی ایک غزل کی تضمین کے تین بند حسب ذیل ہیں :

جو عشق باز ہیں وہ رہ دیں پہ آ چکے
سر بازیِ وفا میں وہ یا گھر لٹا چکے
واعظ بہ ربِ کعبہ تجھے ہم جتا چکے
جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

دن کو سنا گئے تھے وہ یہ مژدۂ طرب
آ کر رہیں گے آج یہیں ہم تمام شب

پر کیا کہیں برائی نصیبوں کی ہے غضب
یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ انھیں تو کب
جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے

کہہ دو ظفر برا نہ کہو سے کدے کو ذوق
ہے کچھ تو واں بھی دیکھ تو تو میکدے کو ذوق
تم دیکھ کر نہ دل میں رکو میکدے کو ذوق
نکارو آج خوب چلو میکدے کو ذوق
چھوڑو کہیں وظیفہ بہت پڑھ پڑھا چکے

سودا کی غزل کی تضمین اس طرح ہے:

یہ جانتے سب غنچے بھی ہیں اور گل تر بھی
اور دیتے گواہی ہیں برو برگ و شجر بھی
ہے تیری صدا شام بھی یہ اور سحر بھی
گل بھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

ہم کہتے ظفر ہوتی جو سودا سے ملاقات
کیوں کرتا بسر آہ و فغاں میں تو اوقات
تنگ آکے جو ہم سے ترے کہتے ہیں یہ بات
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

میر کی غزل کی تضمین کا انداز یہ ہے:

گل رخو عالم آشنا ہیں ہم ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا ہیں ہم
گرچہ کہ تم سے بارہا ہیں ہم گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک تک چلنے کو بلا ہیں ہم

جرم ثابت ہوا ہے کیا ہم پر نہیں کھلتا یہ ماجرا ہم پر
روز اک ظلم ہے نیا ہم پر اے ستم اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

جیسا تھا شاعری میں اچھا میر پاتا گر قدرداں بھی ایسا میر
اس طرح اے ظفر نہ کہتا میر کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا جنس ناروا ہیں ہم

مربّع

پیش نظر کلیات میں مربع کا ایک ہی نمونہ ملتا ہے جس میں فارسی کے ضرب المثل شعروں پر مخلوط زبان اور ہندی بحروں میں دو، دو مصرعے لگائے گئے ہیں:

میں نے تینو کیا کہا جو تیسے گاری دینی
بن سوچے نا جانے دونگی ایسی ناہی مینی
نگفتہ نہ دارد کسے با تو کار
ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

سب کو کہہ سے دیت ہے گاری بھری سبھا میں آج
جب میں آپ نہ نچ چلوں تو کس کی تو ہے لاج
یکے کردہ بے آبروئی بسے
چہ غم دارد از آبروئے کسے

بہت دنن میں ہاتھ لگے ہو کیسے جانے دوں
آج میں بھگوا تو سوں کا نھا بیٹھ پکڑ کے لوں
دیر آمدی اے نگار سرمست
زودت نہ دہیم زدامنت دست

مثلّث

مثلث سب تقریباً ایک ہی انداز کے ہیں، یعنی مخلوط زبانوں کے دو مصرعوں کے بعد اردو کا ایک مصرع آتا ہے:

حیرت وجہ بیار تمہارا صورت ہی کو تکرا
کرورش کا کدیو تا اس میں ہل بھی نا ہیں سکرا
کرنہ دیکھا کسی تصویر کو پلٹے کھاتے

نہ جانوں ان بھاگاں نے کیا مجھ باندھی لاگ
سورج چاند بھی ہیں پھر دے پھرنے نا ہیں بھاگ
عمر گذری فلک پیر کو پلٹے کھاتے

چار دن کے ہیں یہ گاتی چار دن پاؤں ہاتھ

اک دن ایسا آوے تسادی اکٹھے ہوئیے ساتھ
پھر کون آشنا ہو کوئی آشنا نہیں

جن لوگاں ان انکھاں دیکھا کہاں گئے اے رام
وہ تو سانو نجر نہ آوندے کن کن کا لوں نام
پیدا کبھی جہاں میں ہوئے تھے وہ یا نہیں

نا وہ آگ میں نا وہ جل میں   وہ دل میں دل تیری بغل میں
یہ شرطے تو بھی ہو آگاہ دل سے
دل ہے مسجد دل ہے مندر   جو چاہے سو دل کے اندر
نہیں بہتر پرستش گاہ دل سے

پیم نگر کی ریت نرالی اور نرالے طور
ہے تو وہ اس جگ میں لیکن ہے وہ جگ ہی اور
واں زمیں ہی اور ہے واں آسماں ہی اور ہے

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان مثلثوں کے تیسرے مصرعے زیادہ تر (یا شاید سب کے سب) ظفر ہی کی غزلوں کے مصرعہائے ثانی ہیں اور مثلثوں کے پہلے دو مصرعوں ہی میں ان غزلوں کے مصرعہائے اولیٰ کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی مثال کے دونوں بندوں کی غزلیہ شکل یہ ہے:

محو حیرت ترا کس طرح سے بدلے کروٹ
کہ نہ دیکھا کبھی تصویر کو پلٹے کھاتے
بخت برگشتہ عاشق نے نہ کھایا پلٹا
عمر گذری فلک پیر کو پلٹے کھاتے

کمیت کے لحاظ سے ظفر کا غیر غزلیہ کلام ان کے غزلیہ کلام کے مقابلے میں برائے نام ہے، لیکن کیفیت کے لحاظ سے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ظفر کی غزلوں میں جو رنگا رنگی اور اسالیب کا تنوع نظر آتا ہے اس سے ان کا غیر غزلیہ کلام بھی خالی نہیں ہے بلکہ اس کلام میں جو عروضی اور لسانی تجربے کیے گئے ہیں وہ ظفر کی غزلوں میں نہیں ملتے اور اس پہلو سے یہ کلام ظفر کے غزلیہ کلام کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو جاتا ہے ــــ

★

ماسٹر عبدالمنان سیتاپوری

بہادر شاہ ظفر کی یاد میں

اے بہادر شاہ فخر مادر ہندوستاں
یاد کرتا ہے ابھی تک تجھ کو ہر پیر و جواں
تو مغلیہ سلطنت کا آخری سرتاج تھا
صرف دلی پر نہیں ہر دل پہ تیرا راج تھا
لال قلعہ آج تک روتا ہے تیری یاد میں
جامع مسجد ڈھل گئی اک پیکر فریاد میں
تیری آہٹ کے لیے جمنا ہمہ تن گوش ہے
سارا دریا ایک پتھر کی طرح خاموش ہے
حریت کا جوش تھا تیری رگوں میں موجزن
تو نے اپنے لخت دل بھی کر دیے نذر وطن
آتش حب وطن بھڑکی تھی تیرے خون میں
تا دم آخر تجھے رکھا گیا رنگون میں
اف وہ جسم ناتواں اور کالے پانی کی سزا
دی گئی تجھ کو ضعیفی میں جوانی کی سزا
تو نے، اتنی تیز کر دی شمع آزادی کی لو
آج تک ہر دل کو روشن کر رہی ہے جس کی ضو
ذہن و دل بھی مضطرب ہیں جان بھی ہے مضطرب
تیری یادوں میں ترا منان بھی ہے مضطرب

ڈاکٹر آصفہ زمانی

بہادر شاہ ظفر اور ذوق

خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی زندگی عروج و زوال کی ایسی کہانی دہراتی ہے جو ہر ذی شعور کے لیے باعثِ عبرت ہے۔ ؎
دیکھے اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ایک ایسا شخص جس کے سر پر ہندوستان کی حکومت کا تاج ہو، جس کی آنکھ کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر حکومتیں زیر و زبر ہو جاتی ہوں، اسکی آنکھوں کے سامنے نہ صرف یہ کہ اس کی عظیم سلطنت کا شیرازہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے بلکہ تراسی[1] سال کی ڈھلتی عمر میں جسے قیدِ زنداں بھی نصیب ہو ایسے انسان کی آنکھوں میں خون کی بوندیں ٹپکی ہوں تو خلافِ فطرت نہیں۔ ظفر کے چار دیوان[2] میں اگر صرف وہی غزلیں باقی رہتیں جو قیدِ رنگون کی یادگار ہیں تو ان کے عظیم شاعر ہونے سے انکار کی گنجائش نہ تھی لیکن بھلا ہو محمد حسین آزاد کا جنھوں نے اپنے استاد ذوق کے سر پر ملک الشعرا کا تاج رکھنے کی دھن میں ظفر کو "آبِ حیات" میں ایسا گرایا کہ وہ جب ہیں تو اب اگر زندہ ہوتے تو ضرور خون کے آنسو رو پڑتے۔ بہر حال ان کی تنقید نے بحث کے دروازے ضرور کھول دیے اور آنے والی نسلوں کے لیے دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنے کے راستے فراہم کر دیے۔

یہ ایک فطری جذبہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کی داد چاہنے کے لیے اہلِ نظر کی رائے کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس تخلیق کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں وہ اپنے معتمدِ خاص کی رائے کے بموجب اور زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی جانب مائل بھی ہوتا ہے اس لیے جس وقت ظفر ذوق کو اپنا کلام دکھاتے ہوں گے، بہت ممکن ہے کہ وہ ان کی اصلاح قبول کرتے ہوں لیکن کسی استاد سے اصلاح لینے کے یہ معنی تو نہیں کہ کل دیوان استاد کا کہا ہوا مان لیا جائے، جیسا آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے،

> "پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سراپا حضرت مرحوم ذوق کے ہیں۔ کل تاریخیں انھیں (ظفر) کی فرمائش سے ہوئیں اور انھیں کے نام سے ہوئیں"

آزاد نے خود اپنی کئی سولہ غزلیں ذوق کے کلام میں یہ کہہ کر شامل کر دیں کہ یہ ان کے عہدِ طفلی کا کلام ہے۔ اس بات کے پایۂ تحقیق کو پہنچ جانے کے بعد ذوق کے مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آتا تو اگر آج کی تحقیق میں چند اشعار ذوق کے بجائے ظفر کے کلام میں نکل آئیں تو ظفر کے مرتبہ پر کیا آنچ آسکتی ہے ---؟

---

[1] وہ [illegible] میں رنگون پہنچے [illegible] میں انتقال کیا۔ [2] پہلا دیوان زادِ لیمعدی کی تصنیف ۲۲-۱۲۲۳ھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ... حافظ محمود خاں شیرانی۔

ذوق کے کلام کو دیکھ کر ایک سوال اور ذہن میں اٹھتا
ہے کہ اگر ذوق اشعار کہہ کر دیتے تھے اور ظفر اسے اپنے نام سے منسوب
کرتے تھے تو آخر وہ درد و تڑپ اور نشتریت جو ظفر کے کلام میں
موجود ہے خود ذوق کے کلام میں کیوں مفقود ہے۔ یا برخلاف اس
کے جو جوش و خروش اور عالمانہ وسیع النظری اور ندرت آفرینی
ذوق کے قصیدوں میں ہے وہ ظفر کے قصیدوں میں کیوں نہیں؟ اور
ذوق کی لوح مزار پر کندہ ظفر کا کہا ہوا یہ مندرجہ ذیل کتبہ جس سے
تاریخ وفات بھی نکلتی ہے اس کے متعلق طرفداران آزاد کیا کہتے ہیں؟ ؎

طوطیٔ ہند حضرت استاد ذوق نے
لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ
سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر
کہہ ذوق جنتی زسر بخشش الٰہ
۱۲۷۱ھ

ظفر کے کلام میں غزلیں، مستزاد، مخمس، مسدس، تضمین
قصائد، نعتیہ، شہر آشوب، دوہے، ہولی، ٹھمری، جھمجن، گیت
مرثیہ، سلام، مجرا، سہرا، پنکھا، قطعات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے
ان کے کلام میں یوں تو توس و قزح کی سی رنگینی ہے لیکن دو رنگ
زیادہ شوخ، زیادہ صاف اور زیادہ نمایاں ہیں، اول ان کا حزن
و اندوہ، دوئم ان کا عشقیہ رنگ۔

ظفر کا غم ان کا اپنا ذاتی غم ہے۔ دل جب سلگتا ہے تو الفاظ
انگارہ بن جاتے ہیں اور سننے والے کے دل میں پگھلے سیسے کی طرح اتر
جاتے ہیں۔ ظفر کے اس قسم کے اشعار ایک دکھے دل کا مرثیہ ہیں
جو خود روتا ہے اور ساتھ میں سننے والے کو رلاتا ہے ؎

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

کیسی ہوا چلی چمن دل میں اے ظفر
سب برگ و بار نخل تمنا کے جھڑ گئے

لمبی لمبی بحروں میں ظفر نے درد دل کی بے تابی کو جس سوز
و گداز کے ساتھ عریاں کیا ہے وہ انہیں میر سے قریب کر دیتا ہے

ابر برس کر کھل بھی گئے اور نالے چڑھ کر اترے بھی
لیکن جوش دیدۂ پرنم جیسا تھا ویسا ہی ہے
رہی اتنی بھی طاقت و تاب نہیں کہ زمیں سے اب اٹھے خاک نشیں
ترے کوچے کی سمت بلا سے کہیں مرا گریۂ شوق بہا دے مجھے

—

کیا کیا بہلو دیکھے ہم نے گلشن کی پھلواری میں
اب جو پھولے اس میں پھول کچھ اور ہی اس میں باس نہیں

—

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا

—

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

ظفر کے وہ اشعار جو قیام رنگون اور "عہد زنداں" کی دین
ہیں بلاشبہ میر کے بہتر نشتروں کی طرح ہزاروں میں پہچانے
جا سکتے ہیں۔ ان کے اس کلام کو اگر "حبسیات" کا نام دیا جائے
تو بے جا نہ ہوگا جس طرح ادیب صابر، مسعود سعد سلمان، اور
خاقانی وغیرہ کے "حبسیات" فارسی ادب کا سرمایہ ہیں، اسی طرح
ظفر کے یہ اشعار بلاشبہ اردو ادب میں "حبسیات" کا اضافہ ہیں
اور اردو ادب کے طالب علم کے لیے تحقیق کی راہیں ہموار کرتے
ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جس میں زنجیر کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے
اور زنداں کی دیواروں کا عکس نمایاں ہے ؎

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

—

توڑ کر زنجیر کو دیوانہ نہ بھاگا ہو کہیں
دیکھیو غل ہے پڑا خانۂ زنداں میں کیا

—

کیا نکل بھاگے ترے دیوانے زنداں سے کہ ہے

طوق بھی خالی پڑا زنجیر بھی خالی پڑی

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

زنجیر، زنداں، طوق و سلاسل، مجنوں یہ وہ علامتیں ہیں جو اردو کے کسی شاعر کے یہاں ایسے فطری انداز میں اور اتنی کثرت و زیادتی کے ساتھ استعمال نہیں ہوئیں۔ قفس و آشیاں صیاد و عندلیب، جیسے پامال استعارے بھی یہاں نئی علامت بن کر آتے ہیں۔ ظفر نے انھیں جو تاثر دیا ہے وہ بھی اسی اسیری کی دین ہے ؎

اسیرِ کنجِ قفس ہوں میں اے نوا سنجو
بلا سے میری اگر آیا بہار کا موسم

جب پھڑک بھی نہ سکے طاقتِ پرواز کہاں
دریے صیاد نے اس صید کے پر کھینچ کے باندھ

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے
گر کے پھڑکا کیے دیوارِ گلستاں کے تلے

آزاد کب کرے ہمیں صیاد دیکھیے
رہتی ہے آنکھ بابِ قفس پر لگی ہوئی

ان کا ایسا تمام تر کلام یاسیت کے پیکر میں ڈھلا ہوا ہے جس میں ترسنے کی سی کیفیت پنہاں ہے۔ بقول فراق "ظفر کے کلام میں جو سوز و گداز، دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور ایک درماندگی کا کیف پایا جاتا ہے بلاشبہ وہ ظفر ہی کا حصہ ہے:"

۵ میں وہ کشتہ ہوں کہ میری لاش پر اے دوستو
اک زمانہ دیدۂ حسرت سے تکتا جائے گا

ظفر کا یہ درد و غم ہند کی تباہی کا ایسا مرثیہ ہے جس سے اس وقت کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ؎

یہ رعایائے ہند تبہ ہوئی، کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

نہ غنچہ ہے، نہ سنبل ہے پڑا ہے باغ ویرانہ
نہ گل ہے اور نہ بلبل ہے نہ ساقی ہے نہ پیمانہ

اس بے پناہ درد و الم کے علاوہ ان کے یہاں خالص تغزل کی بھی چاشنی موجود ہے جسے ہم خالص عشقیہ کلام کا نام دے سکتے ہیں۔ ظفر کا اس قسم کا کلام اردو کے اس سرمایے سے نزدیک آجاتا ہے جس کی بنیادیں آتش و مصحفی نے قائم کیں۔ ملاحظہ ہو ؎

کیا تو ضبطِ فغاں رات ہم نشیں لیکن
عجب ہے دل پہ مرے اختیار کا ہونا

رات کس گل کو گلے ہم نے لگایا تھا ظفر
پیرہن جو عطر کی خوشبو میں ہے ڈوبا ہوا

سنبلستاں میں سرِ شام ہوئی مشک افشاں
لے کے خوشبو ترے گیسوئے معنبر کی ہوا

کہیں ایسا نہ ہو کھل جائے دل کا راز محفل میں
ہماری آنکھ پھر اس رونقِ محفل سے ملتی ہے

تمھارے نقشِ کفِ پا کے بوسے لینے کو
زمیں پہ سایہ کے مانند آفتاب آیا

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشہ میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے

کسی پردہ نشیں کا ہے شوق لگا، کوئی طرح اسے بتادے مجھے
کہ اٹھا کے وہ پردۂ شرم و حیا، ذرا اپنا جمال دکھادے مجھے

شمشیر برہنہ مانگ غضب، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے

اٹھا گئی میری زباں پہ سے جاں کی لذت
جو مزا عشق میں پایا مرا جی جانتا ہے

محبت چاہیے باہم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو
خوشی ہو اس میں یا ہو غم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

ظفر نے فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے
ایسی غزلیں عموماً سلیس اور عام فہم ہیں سہ

در بتان خود نما زاہد خدا را دیدہ ام
آنکہ از چشم تو پنہاں آشکارا دیدہ ام

اے بت طناز قربانت شوم
اے سراپا ناز قربانت شوم

نیست از انجم شب تاب چراغاں امشب
مگر از خندہ نمایاں شدہ دنداں امشب

ظفر نے پنجابی میں بھی اشعار کہے ہیں یہاں
ان کے ایک اور تخلص "شوق رنگ" کا پتہ چلتا ہے سہ

رین تو ساری غفلت بنی وچ تمنی دینی کاٹ
دن نہ گنوا ؤ دیکھو تا نوجانا او دکھی گھاٹ
کہاں تک سوؤ گی جو نکو سحر ہی
بہت گئی اور تھوڑی رہی اور یہ بھی جانے والی
دیکھو چھانڈی کہاں تو گھڑی گھڑی گرنا لی
کہاں تک سوؤ گی جو نکو سحر ہی
شوق رنگ اس دنیا کا تو ہی سپنی کا سا لیکھا
کیا دیکھو گی سپنی نی میں اور دیکھا تو کیا دیکھا
کہاں تک سوؤ گی جو نکو سحر ہی

ظفر کی زبان اور ان کا لہجہ قلعہ معلی کی دین ہیں یہ وہ بان ہے جو اس وقت سند سمجھی جاتی تھی سر سید نے اسی تعلق سے ذوق کے متعلق فرمایا تھا کہ:

"وہ بادشاہ کا کلام کیا لکھتا قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آگئی"

ظفر کی شاعری وارداتی شاعری ہے، آپ بیتی ہے اسی لیے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر چھوڑ جاتی ہے ۔۔۔

★

کیف احمد صدیقی

بہادر شاہ ظفر

ہر قدم پر جوشِ آزادی ترے ہمراہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

صاحبانِ علم و حکمت تجھ کو کہتے تھے ظفر
دل میں ذوقِ شعر گوئی، ہاتھ میں تیغ و سپر
تو بذاتِ خود شکارِ تیرہ بختی تھا مگر
تیرا ہر نقشِ قدم مثلِ چراغِ راہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

ہے تری عظمت کا شہرہ انجمن در انجمن
جھوم جاتے ہیں ترے اشعار پر اہلِ سخن
تیرے فن پاروں سے روشن کائناتِ فکر و فن
تو جہانِ شاعری میں رشکِ مہر و ماہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

افتخارِ عقل و دانش سب ترے اجداد تھے
کتنے شہرِ علم تیرے ذہن میں آباد تھے
ذوق و غالب جیسے تیرے مستند استاد تھے
کون کہتا ہے دیارِ فن میں تو گمراہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

اے مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ
صاحبِ فہم و فراست، زندہ دل، روشن دماغ
تیرا دل بہلا نہیں پایا فرنگی سبز باغ
تو حصارِ قید میں بھی مردِ حق آگاہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

کتنے کوہِ ظلم تیری ذات پر ڈھائے گئے
تیرے لختِ دل ترے آگے ہی کٹوائے گئے
اور اُن کے سر سجا کر تھال میں لائے گئے
اُف وہ حسرت ناک منظر کس قدر جانکاہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا

تیری مرقد اندرونِ خطۂ رنگون ہے
لیکن اہلِ ہند کے ہر دل میں تو مدفون ہے
حریت کی مانگ میں تابندہ تیرا خون ہے
اب بھی عالی جاہ ہے تو کل بھی عالیجاہ تھا
اے بہادر شاہ تو بے شک بہادر شاہ تھا
ہر قدم پر جوشِ آزادی ترے ہمراہ تھا

شہنشاہ مرزا

ظفر کے کلام میں عصری اور سیاسی آگہی

بہادر شاہ ظفر کا شمار اردو کے ایسے شعرا میں کیا جانا چاہیے جن پر عموماً لوگوں کی نگاہیں بہت کم پڑتی ہیں اور اگر ان کا نام ذہنوں میں آتا بھی ہے تو ان کی چند غزلوں کے سلسلے سے جو اتفاق سے بہت مشہور ہو گئی ہیں۔ ورنہ اردو تنقید نے عموماً اس شاعر کو نظر انداز ہی کیا ہے بہادر شاہ ظفر کے ساتھ سب سے زیادہ زیادتی تو محمد حسین آزاد نے کی کہ وہ ذوق کی فضیلت ظاہر کرنے کی دھن میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ بہادر شاہ ظفر کے تمام کلام کو ذوق کی ملکیت قرار دے بیٹھے۔ آزاد نے اپنی ممتاز تصنیف "آبِ حیات" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کا چلنا دشوار ہے ان میں طبع آزمائی کا شوق ظفر کو تھا۔ مگر کوئی ایک آدھ مصرعہ نکال کر اپنے استاد ذوق کے سپرد کر دیتے تھے اور پھر ذوق "ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی تیلیاں بنا دیتے تھے:

محمد حسین کی کی رائے پر یقین کیا جائے تو یہ باور کرنا پڑے گا۔ کہ بہادر شاہ ظفر کے چار دیوانوں میں سے پہلے دیوان کی بعض غزلیں تو شاہ نصیر کی اور بعض کاظم حسین بیقرار کی دین ہیں۔ باقی غزلیں اور دوسرے تینوں دیوان سراپا ذوق کی دین ہیں۔

لیکن دوسرے تذکرہ نگاروں نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا خمخانۂ جاوید کے مصنف لالہ سری رام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ذوق کے کلام کا جو رنگ ہے اس سے ظفر کا کلام بالکل الگ ہے۔ محمد حسین آزاد کے متعلق یہ حقیقت سبھی کو معلوم ہے کہ ان کو اپنے استاد ذوق سے اس قدر عقیدت تھی کہ ان کا بس چلتا تو وہ ذوق کو اردو ہی کیا دنیا کی تمام زبانوں کا سب سے بڑا شاعر ثابت کر دیتے۔ "آبِ حیات" میں انھوں نے بہت ساری باتیں محض قیاس آرائی کی بنیاد پر لکھدی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نیاز فتح پوری نے محمد حسین آزاد کے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے "انتقادیات" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ذوق کا خصوصی رنگ ان کے قصائد میں نظر آتا ہے، جو جوش و خروش سے بھرے ہوئے ہیں۔ جبکہ ظفر کے کلام میں یہ چیز بالکل نہیں ملتی اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ظفر کا کلام ان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر خواجہ منظور حسین نے ظفر کے فن و شخصیت پر اپنا مقالہ تحریر کرتے ہوئے اس بات کو مضحکہ خیز اور بے بنیاد قرار دیا ہے کہ ذوق نے زیادہ تر غزلیں ظفر کو کہہ کر دیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی نے بڑی محنت سے ظفر کے چاروں دیوانوں سے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور انکا خیال یہ ہے کہ ظفر کے کلام میں ایسی تازگی اور دلکشی ہے جس کا غالب حصہ شاعر کی آپ بیتی پر مبنی ہے اور اس کلام میں ایسی نشتریت اور گداز ہے جو اردو غزل کے سرمایہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

بہادر شاہ ظفر کی شاعری حقیقتاً ان کی آپ بیتی ہی معلوم ہوتی ہے جس میں عصری اور سیاسی آگہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اردو میں ایسے شاعر چند ہی گذرے ہوں گے جنھوں نے عصری مسائل اور سیاسی واقعات کو غزل کے مخصوص سانچے میں ڈھال کر اس قدر پر اثر لہجے میں بیان کیا ہو۔

بہادر شاہ ظفر کی سنہ پیدائش ۱۷۷۵ء بتائی جاتی ہے ان کا انتقال رنگون میں جلاوطنی کے عالم میں ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی بار بار اجڑی اور اجڑ اجڑ کر بسی ظفر نے اپنی آنکھوں

حوادث کا مشاہدہ بذاتِ خود کیا۔ وہ سلاطین تیموریہ کی شاندار وراثت کے امین تھے۔ اسے تباہ و برباد ہوتے ہوئے بھی انھیں کو دیکھنا پڑا۔ سیاسی افراتفری، قتل و غارت گری، خانہ جنگی اور تہذیبی بدحالی کے خوں چکاں واقعات سے اثر قبول کر کے ہی انھوں نے شعر کہے ہیں۔ گویا یوں کہا جائے کہ ان کے دل پر جو گذر رہی تھی وہ خاموشی سے رقم کرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے یہاں زنجیر و زنداں قفس و آشیاں اور صیاد و عندلیب کی مخصوص شعری علامتیں اس تسلسل سے استعمال ہوئی ہیں کہ اس میں ایک جہانِ معنی پنہاں نظر آتا ہے۔ ان علامتوں کے پیرائے میں ہی انھوں نے اپنی آپ بیتی نظم کی ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار پر غور کریں ؎

دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں
کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

ہوا ہے فصلِ گل میں جوشِ وحشت اس قدر پیدا
کہ ہر موجِ ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

اے جنوں توڑ کے زنجیرِ درِ زنداں کی
جی میں ہے کھائیے اب چل کے بیاباں کی ہوا

جب پھڑک بھی نہ سکے طاقتِ پرواز کہاں
دینے صیاد نے اس صید کے پر کھینچ کے باندھ

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی،

اے بلبلو اتنا نہ کرو غل کہ مبادا
دشمن ہے ہوا جان کا صیاد تمھارا

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر ایک طرف تو اپنی مجبوری اور لاچاری کا شدید احساس دلاتا نظر آتا ہے۔ صیاد کی بے رحمی کا خوف، دشتِ وحشت کو آباد کرنے کا عزم اور پھڑک بھی نہ سکنے کی بے بسی ان اشعار میں نمایاں ہے۔ دوسری طرف ان کے یہاں ایسے اشعار بھی کافی تعداد میں مل جاتے ہیں جن میں اس یقین کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر تمام صید مل جل کر عزم کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں تو رہائی ممکن ہے ؎

اگر باندھیں مرغانِ پر بستہ ہمت
تو لیں کھول آپس میں مل جل کے پھندے

دراصل بہادر شاہ ظفر نے اپنے کلام میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی پوری تاریخ دہرائی ہے۔ وہ فطری شاعر تھے اور دلی واردات بیان کرنے پر پورا عبور رکھتے تھے۔ مگر حالات نے انھیں سلطنتِ تیموریہ کا مرثیہ خواں بنا دیا۔ چنانچہ ان کے کلام میں روحِ عصر پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے جو اس دور کے دوسرے شعرا کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں کہیں کہیں خارجی واقعات کے سلسلے میں واضح اشارے بھی ملتے ہیں۔ اردو شاعری میں سیاسی واقعات کو موضوعِ سخن بنانے کی روایت بہت پرانی ہے ذیل کے اشعار اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری،

(رام نرائن موزوں)

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

(میر)

ہندستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

(مصحفی)

لیکن بہادر شاہ ظفر نے اس روایت کو بہت آگے بڑھایا۔ ان کے لہجے میں جو لطیف رمزیہ انداز ہے اس کی مثالیں مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ؎

نہ تنگ یوں ہمیں صیاد کیوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

یہ کہہ دو شمع سے گل گیر چھوڑنے کا نہیں
ارادہ اس نے مرے تاجِ زر کا باندھ لیا

مندرجہ بالا اشعار میں بہت واضح طور پر انگریزی کی مراجعت

کے بڑھتے ہوئے اثرات کی سمت اشارے کیے گیے ہیں اور بادشاہ نے یہ جتا دیا ہے کہ انگریز نے تاجِ زر کو چھین لینے کا ارادہ باندھ لیا ہے اور بظاہر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ تاجِ زر ان کے لیے وبالِ جان ہے گل گیر اسے شمع سے چھین کر ہی دم لے گا۔

شمعِ محفل نے کہا رو رو کے شب گل گیر سے
کیا وبالِ سر یہ میرا تاجِ زر پیدا ہوا

انھوں نے جگہ جگہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ بادشاہ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے عوام کی حفاظت فوج کے ذریعہ کرے مگر ہم ایسے بادشاہ ہیں کہ صلح کل کی ردا اوڑھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یعنی جب ہمارے پاس فوج ہی نہیں ہے تو ہم کس حیثیت سے بادشاہ کہلاتے ہیں، ہمیں تو گدا کہنا چاہیے ؎

کوئی پہچانتا بھی ہے مجھ کو
شاہ ہوں یا گدا ظفر ہوں کون

جوشنِ جنگ و جدل پہنیں تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلحِ کل اوڑھے ہوئے

انھیں اپنے بے بس ہونے کا بھی گہرا احساس ہے۔ اور تاریخی حقائق کے دباؤ کو وہ بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے آخری دن رنگون میں جلاوطنی کے عالم میں گزرے۔ وطن سے دور وطن کی یاد میں تڑپنے والے بادشاہ نے اس کیفیت کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ؎

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا
کہ پہنچی اڑ کے نہ مجھ تک گلِ چمن کی بو

ظفر کے کلام کا بیشتر حصہ اسی روداد پر مشتمل ہے۔ یہ کیفیات چونکہ ان کے دل پر بیتی ہیں اس لیے ان کے اشعار میں تاثیر اور گداز کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں بار بار قفس و آشیاں اور زنجیر و زنداں کا ذکر، جاہ و جلال کا مرثیہ، اہلِ فرنگ کی عیاری اور مکاری کی داستان آتی ہے۔ دوستوں اور مصاحبوں کے بے وفائی کے تذکرے بھی بہت جگہ آتے ہیں۔ انھیں اپنے آشناؤں سے بھی صدمے اٹھانا پڑے تھے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ؎

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

ان کے یہاں جگہ جگہ یاس انگیزی کا انداز بھی نمایاں ہوا ہے انھیں یقین ہو چلا ہے کہ اب وہ جاہ و حشم کے دن پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے اور نہ ہی انھیں ہندستان کے تخت پر دوبارہ بیٹھنا نصیب ہوگا ؎

کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھنا دو دو پہر اب تخت پہ جاتا رہا

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی، روحانی اذیت اور ذہنی کشمکش میں گزری۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والا حزن ان کے دل میں جاگزیں تھا ان اشعار کے مطالعہ کے بعد بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کسی یونانی ڈرامہ کے المیہ کردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے اور ان کی شخصیت میں ایسی بھرپور انفرادیت ہے جو انھیں اردو کے دوسرے شعرا سے جگہ جگہ ممتاز کرتی ہے۔

★

آزادی کا سورما

ظفر

وطن کے درد سے لبریز ہے کلامِ ظفر
ریاضِ فکر میں پایا ہے وہ پیامِ ظفر
ادب شناس نظر میں ہے احترامِ ظفر
بساطِ منزلِ اعلیٰ پہ ہے مقامِ ظفر
وقار و عظمتِ رفتہ چمن کی بات کرو
اسی دلیر، محبِ وطن کی بات کرو

اسیرِ ظلم و ستم حرّیت نشان بنا
جو اپنے مورثِ اعلیٰ کی آن بان بنا
وہ خاکسار جو رفعت میں آسمان بنا
جہاں کے واسطے موضوعِ امتحان بنا
نگاہِ ظلم میں جو لائقِ محن تھا ظفر
وہی مجاہدِ آزادیٔ وطن تھا ظفر

تمام عمر مصائب میں جو گھرا ہی رہا
ہر ایک رنج و الم جس نے مسکرا کے سہا
سلوکِ حلقہ بگوشوں نے کچھ کیا ایسا
کہ جس سے زخمِ جگر تا بہ زندگی نہ بھرا
یقین جن پہ تھا، ان کا شعار کیا کہیے
نوازشِ ستمِ روزگار کیا کہیے

ہر ایک درد کا درماں، وطن کا شیدائی
کھلے وہ گل کہ چمن کی فضا نہ راس آئی
ہوئی وہ ایسی سازش کی کارفرمائی
عنانِ وقت جسے اپنے کام میں لائی
کہ تخت و تاج کے مالک کو گوشہ گیر کیا
خطائے حبِ وطن میں اسے اسیر کیا

نظر میں جس کی تھی ارضِ وطن حسین جنت
تمام عمر رہی جس کی دید کی حسرت
وہ سرزمین تھی جس کو وادیٔ غربت
وہیں پہ نیند تو آئی اسے مگر فطرت
ہوائے تند کے جھونکے جگا نہیں سکتے
زمانے بھر کے ستم اب ستا نہیں سکتے

بہادر شاہ ظفر کی دلی

زمانہ ہمیشہ سے تغیر پسند رہا ہے، نیرنگیٔ انقلاب اس کی فطرت میں شامل ہیں۔ جس طرح پانی کا دھارا خذف و گہر، سنگ و ریت اور خس و خاشاک کو اپنے دوش پر لیے پھرتا ہے اسی طرح زمانے کا انقلاب بھی شریف و ذلیل، حاکم و محکوم اور ظالم و مظلوم کو لمحات کے شانوں پر اٹھائے گھومتا ہے۔ اقتدار کی تقسیمیں عمل میں آتی ہیں۔ کسی کے حصے میں عروج اور کسی کی قسمت میں زوال۔ اورنگ نشینوں کو بوریائے فلاکت اور خانہ بدوشوں کو بسترِ استراحت ملتے ہیں۔ ذات گوت، رنگ و نسل، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت حاکموں کے ساتھ عروج پاتے ہیں اور محکوموں کے ساتھ اپنے بیشتر خصوصیات کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی حال کچھ دلی اور دلی والوں کا بھی ہوا۔ بابر و ہمایوں کے فرزند، اکبر و جہانگیر کے وارث، ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے جنم داتا، ثقافت و تہذیب کے معمار، لال قلعہ کے خالق شاہجہاں نے جس وقت شاہجہاں آباد کو اپنے تصور سے صفحۂ گیتی پر منتقل کیا تو تاریخ کے دامن میں ایک نیا دلی شہر آباد ہوا۔ ایک نئی زبان، ایک نئی ثقافت اور ایک نئی تہذیب نے آنکھیں کھولیں۔ لال قلعے کی فصیلوں کے سائے میں، مسجد جامع کے وسیع و عریض صحن میں اخوتِ اسلامی کے مظاہرے ہوئے، جمنا کے ساحل پر دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے جواں مردوں کے شانہ بشانہ ہندستان کے باشندوں نے بھی صف بندی کی۔ معمولی صوبائی شورشوں اور چند خانہ جنگیوں کے علاوہ دورِ شاہ جہانی بخیر و خوبی گزر گیا لیکن اپنے بعد والوں کے لیے ایک نیا نقش، ایک نئی تہذیب اور ایک نیا زاویۂ حیات چھوڑ گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی ترقیاں آسمان سے ہمسری کرنے لگیں تھیں۔ تاج محل کے بلند مینار آنے والوں کو محبت کا پیغام دے رہے تھے۔ رقص و موسیقی، شعر و ادب خواص و عوام کا مزاج بنے ہوئے صحبتوں کو گرما رہے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد چند پشتیں ہی گذری تھیں کہ نظام سلطنت کی حالت ابتر ہو گئی۔ وہ حکومت جس کا سلسلہ ہمالیہ کے دامن سے راس کماری تک اور آسام کی پہاڑیوں سے مغربی کوہستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کا شیرازہ بکھرتا گیا۔ مغلیہ شان و شوکت خواب پریشاں بن گئی۔ اب نہ وہ لشکرِ جرار کے سردار تھے نہ میدان جنگ کے شہسوار۔ اقتدار کے ساتھ دولت بھی کنارہ کر چکی تھی لیکن مجلسی وضعداری اور درباری معمولات نے اس زمانۂ تنگ دستی میں بھی ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ گذشتہ فرمانرواؤں کے شب و روز ایک وسیع سلطنت کے انتظام میں گذر جاتے تھے لہٰذا عیش و عشرت کے مواقع کم فراہم ہو پاتے تھے لیکن اب وہ سلطنت تھی نہ فکر انتظام گویا فراغت ہی فراغت تھی۔ لال قلعے کے باغوں کی رونق بڑھ گئی۔ میلوں کی رونق دوبالا ہو گئی۔ رقص و سرود کی محفلوں میں جان پڑ گئی، شاعری کا بازار گرم ہو گیا۔ جامع مسجد کے اطراف میں ہمہ وقت کٹورے کھنکنے لگے۔ پھول والوں کی بن آئی، سیر تو ایک بہانہ تھا ورنہ ہند مہ رو جیسے معشوقوں کی دھوم اور عاشقوں کے ہجوم تھے۔ رنگ و رقص

ورس کے مرثیہ نگار

دل پائمال تھے، عاشق مست حال تھے اور کیوں نہ ہوتے بابر ہی نے تو کہا تھا ؎

بابرؔ بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

لیکن تاریخ نے ورق پلٹا۔ عیش کوشی سینہ کوبی میں بدل گئی ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

وہ شاعر جو کل تک بہادر شاہ کے دربار کی رونق تھے ان میں کوئی بہادر شاہ کا استاد تھا اور کوئی استاد زادہ تھا۔ کل جن کی زبانیں کھلتی تھیں تو قصائد کے دریا لہریں لیتے تھے، آج مصروف آہ و بکا تھے۔ بہادر شاہ کے ساتھ قلعے کی عظمت بھی رخصت ہو چکی تھی، باغوں کی روشیں ویران پڑی تھیں — بیر بہوٹیوں کی شیدائی ننھی منی شہزادیاں اُجڑے ہوئے چاندنی چوک میں، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چیتھڑے لگائے دستِ سوال پھیلائے زمانے کی نیرنگیوں کی تصویر بنی کھڑی تھیں۔

پاس کیا ہے پریشاں حالی میں
کچھ لکیریں ہیں دستِ خالی میں

مکان ڈھا چکے تھے، مکین تباہ و برباد ہو چکے تھے، شہزادے پھانسیاں پا چکے تھے، بازار بند تھے، دل دردمند تھے، اہلِ حرفہ اور صاحبِ علم و ہنر کوچ کر رہے تھے۔ ضعیف و نادار دلی میں مر رہے تھے۔

مغربی تہذیب کے نمائندے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرستادے دلی پر وار کر رہے تھے۔ گورے مظلوموں کے گھروں کو مسمار کر رہے تھے۔ مالِ غنیمت تلاش کر رہے تھے۔ مقبرے اور مسجدیں بھی ان کے دستِ ہوس سے نہ بچ سکیں۔ گلی کوچوں، شاہراہوں اور خاص بازار میں ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ قید خانے گوشۂ عافیت اور پھانسی کے پھندے گلے کا ہار بن گئے تھے۔ بھلا ایسے ماحول میں کس کا دل کس کا جگر تھا جو انگریزوں کے ظلم و تشدد کی داستان ان کے روبرو بیان کرتا۔ ہاں چند شاعر تھے جنھوں نے زبان قلم کو جنبش دی اور لٹی ہوئی دلی کا مرثیہ پڑھا۔ اس کی عظمتِ رفتہ پر خون کے آنسو بہائے خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ ان مرثیہ نگاروں میں ہنرؔ دہلوی، غالبؔ، محسنؔ، عابدؔ، عیشؔ، ظہیرؔ، شیفتہؔ، اکرامؔ، سالکؔ، تشنہؔ، آزردہؔ اور داغؔ جیسے سربرآوردہ شاعر بھی ہیں۔ جن میں سے کسی نے قلعے میں پرورش پائی تھی۔ کسی نے قلعہ کے انتظام میں حصہ لیا تھا۔ بیشتر افراد ظلِ الٰہی کے دسترخوان کے پروردہ تھے اور جسے اس ماحول میں زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا اس نے بھی قلعہ کے باہر دلی کے معاشرے میں باوقار زندگی گزاری تھی۔ اس نے بھی آنکھیں کھول کر دلی کی زوال آمادہ بہاروں اور روایتوں کا اپنی نگاہوں سے مشاہدہ کیا تھا اس لیے ان تمام شعراء کے مراثی میں غم واندوہ کی جو فضا اور کرب و بے چینی کے جو مناظر پائے جاتے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس میں شاعرانہ بلاغتِ اظہار سے زیادہ قوتِ احساس کی کرشمہ سازی ہے۔

خود بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام میں جا بجا دلی کی تباہی کا تذکرہ ہے اور ان کی غزلوں کے بعض شعر تو ایک پورے مرثیہ

سکتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا جائزہ لینے والوں میں سے اکثر نے ان کی شاعری کے اس پہلو کو وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اس لیے میں یہاں محض ان کے معاصر شعراء کی "مرثیہ نگاری" کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر رہا ہوں۔

نواب مرزا داغ دہلوی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی ان شعراء میں سے تھے جن کا شعور ۱۸۵۷ء میں بیدار ہو چکا تھا اور جنھوں نے اپنی آنکھوں سے فرنگی ظلم و ستم اور دلّی کی تباہی و بربادی کا مشاہدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ داغ کا دل ان مناظر سے کیسا داغ داغ ہوا ہوگا۔ انھوں نے جو شہر آشوب اس سلسلے میں لکھا ہے وہ گوناگوں شاعرانہ خصوصیتوں کا حامل ہے۔ چند بند ملاحظہ کیجیے:

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض کہ لاکھوں کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجب شکل گل و گلستاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
جب آنکھ تا مژۂ خونچکاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گل رخانِ چمن بہکے پھرتے رہتے ہیں
وہ بلبلانِ خوش الحان سکتے چھپے رہتے ہیں

لہو کے چشمے ہیں چشم پر آب کی صورت — شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت — کہاں یہ حشر میں تو یہ عذاب کی صورت
زبانِ تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بےگناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے — غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے
جو کچھ ہے جوشش طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے — غریب چھوڑ کے اپنا دلی وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں سے بیچارے کس چلن سے چلے — قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت — چڑھتے ہی آتے تھی سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی اک اک گنوار کی صورت — چھپی نہ ان سے پر اہل دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہل قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبانیں بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی — ملیں جو خاک بھی منھ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی — پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے حال سیہ رنگ مہ جمالوں کا — دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زرد آہوں کا لب پر نو شوزالوں کا — عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ داں سے رواں شہسوار صد افسوس — لہو کے گھونٹ پییں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس — ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس
جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پئے محاسبہ پرسش ہو نکتہ دانوں کی — تلاش بہرِ سیاست ہو خوش بیانوں کی
جو نوکری ہو تو اب یہ ہو نوجوانوں کی — کہ حکم عام ہو بھرتی ہو قید خانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

غضب ہو بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں — کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں — جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پییں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

تشنہ دہلوی

تشنہ دہلوی نے بھی دلی کو خون کے آنسوؤں سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا نام محمد علی تھا، وہ بہادر شاہ ظفر

کے استاد بھائی اور ذوق کے ایک لائق شاگرد تھے۔ جرأت و بیباکی اور آزادہ روی ان کے اوصاف ذاتی تھے۔ فکر سلیم کے مالک تھے انھوں نے بھی دلی کا مرثیہ کہا اور خوب کہا استادانہ کمالات ان کے "ترجیع بند" سے ظاہر ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ تختِ سلطنت وہ بارگاہِ سلطانی ۔ کہ جس میں بیٹھتے تھے آکے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی ۔ بجا اس اوج پہ تھا دعویٰ سلیمانی

ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلیٰ کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے کالی ۔ تمام ہو گیا تاراج ملک و مال و جلال
کہ اس سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ ۔ رعیت اس کی ہوئی اب بھی زیادہ تباہ

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں نے ننگوں کو آکے لوٹ لیا

یہاں جو آن کے دیکھی تو وار کی صورت ۔ وہ وار ہے جسے ذوالفقار کی صورت
شادی چشم زدن میں ہزار کی صورت ۔ نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت
برنگ تیر شہاب آگ میں جلے لاکھوں ۔ سپرد دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں
کوئی فقیر جو کوڑی دوکان مانگے ہے ۔ تو اس کو کہتے ہیں کیا تو ہزار مانگے ہے
تری طرح سے یہاں سب جہان مانگے ہے ۔ چل اپنی راہ لے کیا ہم سے دل لگے ہے

جو مال بڑھتا ہی جاتا تھا گھٹ گیا بالکل
دوکان داروں کا طبقہ الٹ گیا بالکل

صدرالدین خاں آزردہ

مفتی صدرالدین آزردہ کا شمار فضلائے دہلی میں ہوتا تھا۔ وہ علم و فضل اور دہلوی تہذیب و شرافت کا ایک ایسا نمونہ تھے جس کے بغیر دلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کوئی ایسا دلی والا تھا جس کی زبان پر ان کا نام نہ ہو، آن بان اور وضعداری ان پر ختم تھی۔ صدر نشین بزم شعرا رہتے۔ آزردہ نے دلی کی جس فضا میں آنکھیں کھولیں تھیں وہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو چکی تھی۔ دوست احباب تباہ و برباد تھے۔ متوسلین بے جرم و خطا نشانۂ ستم بنے تھے۔ مصطفےٰ صہبائی دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں کے سامنے رخصت ہو گئے تھے چنانچہ ان کے دل سے آہ نکلی اور دلی کا مرثیہ بن گئی۔ المیہ نے الفاظ کا جامہ پہن لیا۔ آزردہ کا مرثیہ شدتِ تاثر اور حزن و یاس نگاری کا اعلا نمونہ ہے ؎

زیور و الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا ۔ بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
کام کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا ۔ لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتی ہیں
دو قدم چلتی ہیں مشکل سے تو پھر گرتی ہیں

جسم جو گجنے سے پھولوں کے اذیت پاتی ۔ جن کے ہاتھوں سے تھا سوتی تو کیا گجراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ اس کو آتی ۔ ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

ان کو تکیے کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن وہ کش پرستار نہ چلتے دیکھا ۔ صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا ۔ پاؤں والے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

روک سکتے نہ تھے جن بات پہ وہ ہنستے تھے ۔ صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھی لڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے ۔ آپ کاکل سے نزاکت میں بڑے جھڑتے تھے

ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا تھا
ایک دریا تھا کہ آنکھوں سے پڑا بہتا تھا

روز بیٹھے کے نکلتا وہ جوانوں کا کہاں ۔ بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دکانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے پیروں کی دکانوں کا کہاں ۔ لطف ساقی کا مزہ اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مفتی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
...... کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے ۔ سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے ۔ مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکڑ کے پھرتا جوانوں کا وہ سبز بازار	پہن کے ٹوپیاں ترزیں وہ باندھ کر تتار
کسی کے ہاتھ میں باڑھی کوئی لیے تلوار	کوئی تھا گھوڑا کدا تا کوئی تھا فیل سوار

نہ وہ جوان رہے اور نہ کوئی بھی خوشحال
رہے شہر میں بس اب کھانے والے ماش کی دال

سید حسن علی خاں عابد

سید حسن علی نام عابد تخلص ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کے شاگرد اور سید محمد ابراہیم کے بیٹے تھے ۔ انھوں نے دلی کا مرثیہ ابیات کی شکل میں تحریر کیا ہے جس کا ایک شعر مندرجہ ذیل ہے ؎

خون دل پیتے ہیں اور شکر خدا کرتے ہیں
یوں بسر کرتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

حکیم محمد مرزا خاں اکرام دہلوی

حکیم محمد مرزا خاں اکرام بھی " دلی کے مرثیہ نگاروں " کے گروہ میں شامل ہیں ۔ یہ بھی ۱۸۵۷ء کے مصائب سے دوچار ہوئے اور برسوں فلاح و بہبود کی صورت نہ دیکھی ۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پوچھ مت حالِ زبانِ دہلی
ہائے میں اور بیانِ دہلی
اب تو جز حسرت و افسوس و الم
کون آتا ہے میانِ دہلی
نہ وہ صورت رہی نہ وہ زینت
غدر تھا آفتِ جانِ دہلی

حکیم آغا جان عیش دہلوی

آغا جان نام عیش تخلص ۔ شاہی طبیب تھے علم و کمال سے بہرہ مند ، دلی کی تہذیب کے نمائندہ ، بردبار و خوش مزاج انسان تھے ۔ شاعری سے طبعاً لگاؤ تھا ۔ شعر خوب کہتے تھے اور خوب پڑھتے تھے ۔ انھوں نے دلی کی تباہی و بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ۔ اور اس پر آنسو بھی بہائے تھے ۔ دلی کا مرثیہ انھوں نے بھی کہا ، دو شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں ؎

جل گئی خاک میں شانِ دہلی
نہ رہا نام و نشانِ دہلی
شان و شوکت ہوئی ان کی برباد
جن سے تھی شوکت و شانِ دہلی

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

مصطفےٰ خاں نام شیفتہ و حسرتی تخلص ۔ دلی میں ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے ۔ حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد اور غالب کے دوست تھے ۔ جہانگیر آباد کا علاقہ ذریعہ آمدنی تھا ۔ دلی میں انقلاب آیا تو شیفتہ بھی لپیٹ میں آگئے ۔ جائداد و حویلی ضبط ہوئی ۔ انگریزوں نے باغی قرار دے کر خاندان خانہ تاریک میں جھونک دیا ۔ وہ تو کچھ طبیعت میں بلا کا استقلال تھا ۔ مسلسل نشانۂ مصائب بنے اور زندہ رہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں ایک طویل مسدس شیفتہ نے کہا تھا جس میں اپنے مشاہدات رنج و مصائب نظم کیے تھے ۔ میری نظر سے وہ مسدس نہیں گزرا ۔ لیکن اس سلسلے کے جو شعر نظر سے گزرے ہیں وہ سب جذب و اثر اور تجرباتی صداقت کے حامل ہیں ؎

دہلی اب ہے تنِ بیجاں ، تنِ بیجاں کیا خاک
جان ہے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

اسرار حسین اسیر

مادرِ ہندوستاں کو تجھ پہ کتنا ناز ہے

اے بہادر شہ ظفر اے نازشِ ہندوستاں — سرفروشانِ وطن کے اے امیرِ کارواں
اے کہ تصویرِ مروت پیکرِ خلق و وفا — اے کہ تو مردِ قلندر بندۂ سلطاں نما
گو شہنشاہِ زمن تھا شوقِ دارائی نہ تھا — قوم مشکل میں تھی وقتِ جلوہ آرائی نہ تھا
جبر و استبداد سے تو برسرِ پیکار تھا — جنگِ آزادی کا تو پہلا علم بردار تھا
جانتا تھا خوب زنجیرِ غلامی سخت تھی — قوم پر پھر بھی تصدق آبروئے تخت تھی
تو نے اپنی قوم کے غم سے شناسائی تو کی — تھی شفا مشکل سہی لیکن مسیحائی تو کی
جوششِ حُبِّ وطن تیرے لہو میں موجزن — باندھ کر نکلا تھا سر پر اپنے ہاتھوں سے کفن
اک طرف تو دوسری جانب فرنگی سامراج — سچ اگر پوچھو حریفِ سنگ تھا تیرا زجاج
سایہ افگن تھا سروں پر تیرا تاجِ زرفشاں — مل گیا تھا قوم کو دیر و حرم کا پاسباں
اپنے پھولوں سے تجھے اپنے چمن سے پیار تھا — اپنی دھرتی سے تجھے اپنے گگن سے پیار تھا
تیرے ہمراہِ سفر اپنے بھی تھے غدار بھی — عاشقِ سبحہ بھی تھے اور کشتۂ زنار بھی
وہ شجاعت کہ تبسم تھا لبِ اعجاز پر — سامنے جب طشت میں آئے جگر پاروں کے سر
نانا و ٹیپو کو تو درسِ شہادت دے گیا — لکشمی بائی کو تو مردوں کی عزت دے گیا
جاں نثارانِ وطن میں اب بھی سرافراز ہے — مادرِ ہندوستاں کو تجھ پہ کتنا ناز ہے
ڈس گئی تھی قیدِ تنہائی تجھے رنگون کی — ہم کو اب قیمت ملی تیرے جگر کے خون کی

آسماں میں حریت کا اولیں پرچم ہے تو
آج کے ہندوستاں کا محسنِ اعظم ہے تو

آتی دیکھ کے اپنا مرقع خجل ہوا
جب اس کے سامنے تری تصویر ڈال دی
کیوں کر نہ ہو اثر دلِ عالم میں اے ظفر
تیرے سخن میں عشق نے تاثیر ڈال دی

پہلا راوی ـــــ شاعری کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کو فنونِ لطیفہ سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اچھے خطاط اور خوش نویس بھی تھے۔ نشانہ بازی میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی سلطنت قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھی لیکن عوام کے دلوں پر اب بھی ان کا راج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریزوں کے مظالم اور ان کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر ۱۸۵۷ء میں ان کے خلاف بھی جنگ آزادی لڑی گئی تو عوام نے بہادر شاہ ظفر کو ہی اپنا رہبر بنایا۔

دوسرا راوی ـــــ اس وقت بہادر شاہ کی عمر ۸۲ سال کی تھی لیکن انھوں نے بڑی بہادری کے ساتھ اس تحریک کی قیادت کی لیکن عوام میں نظم و ضبط کی کمی اور اپنے قریبی ساتھیوں کی غداری سے آزادی کی یہ کوشش ناکام ہوگئی اور بہادر شاہ ظفر اپنے ہی لال قلعے میں انگریزوں کے قیدی کی حیثیت سے پیش ہوئے۔

پہلا راوی ـــــ آبا و اجداد کی حکومت چھن گئی اپنے پیاروں کو خاک و خون میں ڈوبتے دیکھا۔ اپنی عزیز رعایا کا قتلِ عام دیکھا۔ انھیں اپنے ہی ملک اور اپنی ہی قوم کا غدار ٹھہرایا گیا اور سخت بڑی سزا یہ ملی کہ اپنے پیارے وطن سے دور ایک قیدی کی طرح ایک ناقابل معافی مجرم اور ایک بےکس و بےسہارا شخص کی حیثیت سے غربت اور فقر و فاقہ کے عالم میں جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے رنگون پہنچا دیے گئے۔
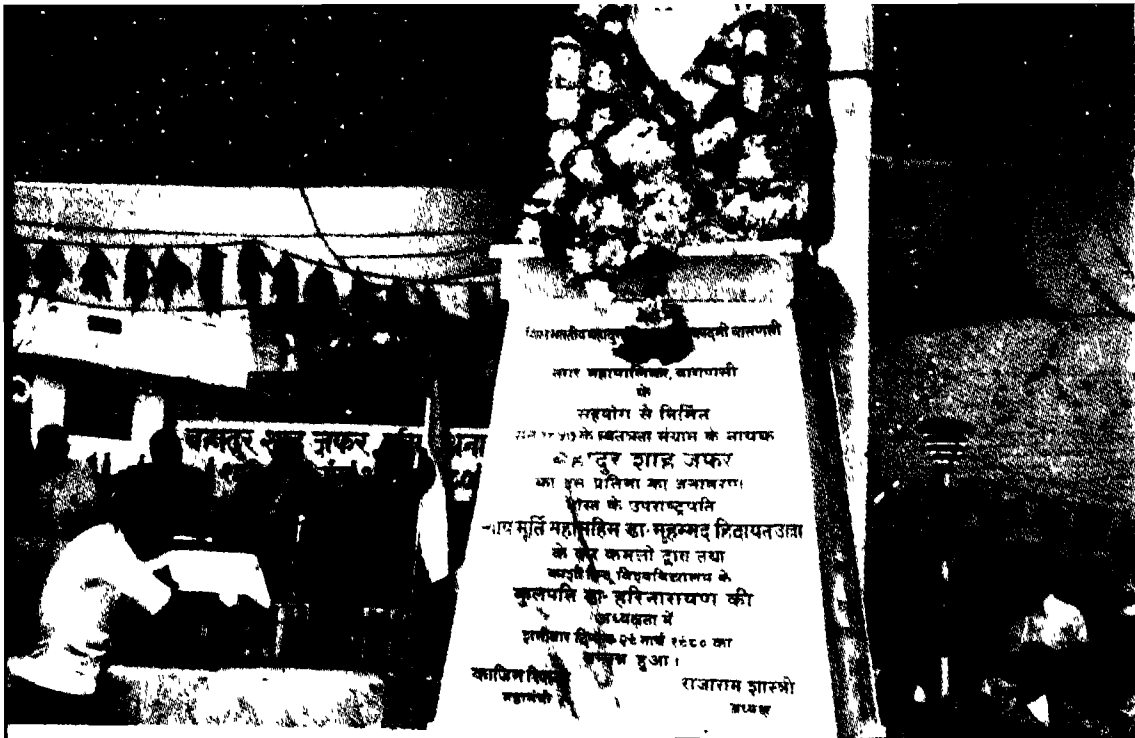
درد بھری آواز (موسیقی کے ساتھ) ـــــ

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

دوسرا راوی ـــــ نومبر ۱۸۶۲ء میں رنگون میں ہی انھوں نے انگریزوں کی قید اور زندگی کی قید دونوں سے نجات حاصل کر لی۔

پہلا راوی ـــــ بہادر شاہ ظفر ناسازگار حالات کا شکار رہے لیکن ان کا دور اپنی ادبی سرگرمیوں، علمی کاوشوں اور فنی و تخلیقی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہے گا اور درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ان کی غزلیں، ان کے مصائب، آلام اور بےبسی و بیچارگی کی یاد دلاتی رہیں گی۔

درد بھری آواز (موسیقی کے ساتھ)

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
نہ تو تاب ہے تن زار میں نہ قرار ہے غمِ یار میں
مجھے سوزِ عشق نے آخرش یونہی مثلِ شمع گھلا دیا
پسِ مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ پڑھے کہاں
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

★

सहयोग से निर्मित
दुर शाह जफर
के उपराष्ट्रपति
कुलपति डा० हरिनारायण की
अध्यक्षता में
हुआ।
राजाराम शास्त्री

Urdu Monthly

NAYA DAUR

Vol. No. 36 No. 7
October 1981
50 paisa

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001.

REGD. No. LW/NP. 17
Annual Subs.
Rs. 5/-

جلد ۳۶ نمبر ۸

نومبر ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو پی، لکھنؤ

اپنی بات

پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد آتے ہی ان کی پرکشش اور دلآویز شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شخصیت اتنی سحر انگیز، ہمہ گیر اور پہلودار تھی کہ اس پر کچھ لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔

اس ماہ جب ہم ان کا یوم پیدائش منا رہے ہیں تو ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہم ان کے افکار و خیالات، ان کے اصولوں اور آدرشوں پر اپنے یقین کا اعادہ کریں اور یہ عہد کریں کہ انھوں نے تعمیر و ترقی کا جو جمہوری راستہ ہمیں دکھایا تھا ہم اس پر گامزن رہیں گے اور سیکولر قدروں کو ہر شعبۂ حیات میں فروغ دیتے ہوئے سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کا جو عزم و حوصلہ انھوں نے ہمیں بخشا تھا، اسے ہر قیمت پر قائم رکھیں گے۔

آج اس ملک کو عالمی برادری میں بین اقوامی سطح پر جو وقار و عزت حاصل ہے، وہ حقیقتاً انہی پالیسیوں کی دین ہے، جو نہرو جی نے اس ملک میں شروع کی تھیں۔ انہی پالیسیوں کی بنیاد پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کی تعمیر و ترقی اور عالمی امن سے متعلق کام کو آگے بڑھایا ہے۔

نہرو جی نے ناوابستگی کے ذریعے عالمی امن کے امکانات کو نہ صرف روشن کیا، بلکہ اسے استحکام بھی بخشا۔ عالمی امن کے سلسلے میں انھوں نے جو گرانقدر خدمات انجام دیں، ان کے پیش نظر دنیا انھیں پیغمبر امن کے نام سے یاد کرتی ہے۔ عالمی برادری میں ہندستان کو جو بلند اور پُروقار مقام حاصل ہے، وہ نہرو جی کی انہی گراں قدر خدمات کا نتیجہ ہے۔ ناوابستگی کے ساتھ انھوں نے دنیا کو جو دو بلاکوں میں منقسم تھی، پُرامن بقائے باہم کا راستہ بھی دکھایا۔ ان کے دکھائے ہوئے پُرامن بقائے باہم کے اس راستے پر چل کر ہی دنیا ابھی تک تیسری عالمگیر جنگ سے محفوظ ہے۔ بین اقوامی سطح پر اتنی اہم خدمات انجام دینے کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنے ملک کی بھی بے مثل قیادت کی۔ حصول آزادی سے پہلے غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑائی میں اور پھر آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے عزم و عمل اور کردار و دانش کی جو شمع ملک میں روشن کی، اس کی روشنی میں ملک تعمیر و ترقی کے راستے پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی فعال قیادت میں آج بھی برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس روشنی کی ضرورت ہمیں آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔

نہرو جی نے ملک کے اندر فرقہ پرستی، تنگ نظری، عصبیت، جہالت اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف بھی ہمیشہ جنگ کی۔ وہ ہندستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر قدروں کی ایک عملی تصویر تھے۔ چنانچہ سارے ملک میں اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی اور یک جہتی قائم رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں و سرگرم رہے۔ آج جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی پر ہم خاص زور دے رہے ہیں اور اس ماہ قومی یک جہتی ہفتہ کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے چنانچہ قومی یک جہتی کے سلسلے میں انھوں نے جو کوششیں کیں، ان کی یاد تازہ کرنے اور قومی یک جہتی سے متعلق ان کے پیغام کو گھر گھر اور گاؤں گاؤں پہنچانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "جو کوئی سائنس اور سائنس کی افادیت پر یقین رکھتا ہے اور آج کے زمانے کی رُوح کو سمجھتا ہے، وہ فرقہ پرستی پر یقین نہیں رکھ سکتا، کیونکہ فرقہ پرستی بیمار اور پس ماندہ ذہنیت کی علامت ہے۔ آج سائنس کی ترقی کی بدولت دنیا سکڑ رہی ہے۔ تنگ نظری کا موجود رہنا قابل فہم نہیں۔ تنگ نظری اور تعصب ہماری راہ ایسے زمانے میں روک رہا ہے۔ جب ہم نئے سماجی اور معاشی نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں۔ قومی یک جہتی کا مقصد نہ صرف یہ کہ لسانی، صوبائی اور مذہبی تعصب اور تفریق کو ختم کرنا ہے، بلکہ اس کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ایسی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے کہ ہر فرد کی ذہنی نشو و نما بچپن ہی سے صحت مند بنیادوں پر ہو۔"

آئیے ان کے ان گراں قدر افکار کی روشنی میں یہ عہد بھی کریں کہ ہم ہر شعبۂ حیات میں ہر قدم پر، ہر سطح پر اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی اور یک جہتی کا ماحول قائم رکھیں گے اور فرقہ پرستی، تنگ نظری، عصبیت اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہیں گے، جب تک کہ یہ لعنتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائیں۔

وفیات ۔ گذشتہ دنوں ہمارے ادب کی تین ممتاز اور نامور شخصیتیں اس جہان فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔ یہ تھے ہندی کے ممتاز ناول نگار اور شاعر شری بھگوتی چرن ورما، مشہور ترقی پسند شاعر جناب خاموش غازیپوری اور جدید غزل کے ایک معتبر اور نمائندہ شاعر جناب راجندر منچندا بانی۔

شری بھگوتی چرن ورما کا انتقال ۵ اکتوبر کو دہلی میں ہوا۔ وہ ہندی کے ایک مشہور ناول نگار اور کوی تھے۔ ان کے متعدد ناولوں اور افسانوں نے انھیں شہرت حاصل کی۔ ان کی سب سے مشہور ناول 'چترلیکھا' ہے۔ بہت سے ناولوں اور افسانوی مجموعوں کے ساتھ ان کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ورما جی ایک ممتاز صحافی بھی تھے۔ وہ ہندی روزنامہ 'نوجیون' کے برسوں مدیر رہ چکے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کا ثبوت ان کا مشہور افسانہ 'دو بانکے' ہے۔

جناب مظفر حسین خاموش غازیپوری کا انتقال غازیپور میں ہی ہوا۔ وہ غزل کے ایک معروف شاعر تھے۔ مشاعروں میں بھی وہ انتہائی ہر دلعزیز تھے۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات نے ان سے نظمیں بھی کہلوائیں اور ان کی نظمیں بہت مشہور بھی ہوئیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر محض ۴۶ سال کی تھی، اتنی کم عمری میں ان کا انتقال بلاشبہ ایک بڑا سانحہ ہے۔

جناب راجندر منچندا بانی کا انتقال ۱۱ اکتوبر کو دہلی میں ہوا۔ وہ نئی حسیت کے ایک معتبر اور نمائندہ شاعر تھے۔ وہ غزل کے نئے اسلوب، نئے ڈکشن اور نئی لفظیات کا ایک ایسا نام بن گئے تھے، جو نئی غزل کی نمائندگی کے سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بانی تنہائی کے کرب اور آدرشوں نیز قدروں کی شکست و ریخت کی دہائی دینے والے فیشن کے شاعر نہیں تھے۔ وہ قنوطی بھی نہیں تھے۔ بلکہ بقول رام پرکاش راہی "غزل کی نیم وحشی پہنائیوں میں حرف و صابت کا فن کار آخری دم تک زندگی کا تمنائی رہا۔"

ان تینوں فن کاروں کے انتقال پر ادارہ نیا دور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پس ماندگان کے تئیں گہری ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

غزل

فراق گورکھپوری
۴/۴ بینک روڈ الٰہ آباد ۲

فسردگیِ محبت پہ مسکرائے جا
اب آگیا ہے تو اِک آگ سی لگائے جا

اسِ ضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

ابھی تو اے غمِ پنہاں جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا

کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق پر
برتِ خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا

پھر اپنے ناز بھی اُٹھتے نہیں محبت سے
ابھی تو ایک زمانے کے ناز اُٹھائے جا

فراقؔ چھیڑ دیا تو نے کیا فسانۂ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سنائے جا

معصوم عزیز کاظمی
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولس
لوہردگا۔ رانچی

اُس کی یادوں میں گلوں کی خوشبو

ہمالہ اور نہرو دنیا کی تاریخ میں دو امٹ نام ہیں۔ تاریخ میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیتی ہیں اور بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے تاریخ شروع ہوتی ہے۔ نہرو بھی ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے جنھوں نے ہندوستان کی ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی اور ان کے ساتھ ہی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم ہو گیا، لیکن ان کی زندگی، ایثار و خلوص اور افکار و خیالات کے نقوش ہندوستانیوں کے ذہن پر اٹل ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ نئے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی جائے اور اس میں نہرو کا ذکر نہ ہو۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے الفاظ میں:

—" جواہر لعل نہرو کی گزشتہ ۴۵ سالہ زندگی اس طرح ناگزیر طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی سے وابستہ رہی اور حصول آزادی کے بعد ملکی حکومت سے کہ عوام کی نظروں میں تو کیا بلکہ ساری دنیا کی نظروں میں اس قوم کی تاریخ نہرو کی سوانح حیات اور نہرو کی سوانح حیات قوم (NATION) کی تاریخ ہے۔ "

نہرو جیسی بے پناہ ہر دلعزیز شخصیت کی زندگی بھی اپنی انفرادیت رکھتی ہے اور اس کے حالات فسانے بنتے جاتے ہیں آج جبکہ نہرو کی داستان زندگی ہر دل میں محفوظ ہے اس کو دہرانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے مختصراً اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ ان کی پیدائش ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء کو ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستانی تہذیب کا بہترین نمونہ تھا اور ان کی شخصیت کی نشو و نما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی کی مدت میں ہوئی انھوں نے قومی تحریک کے مختلف ادوار دیکھے اور ان میں سرگرم حصہ لیا۔ آزادی کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک انھوں نے نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سیاست کے اسٹیج پر ایک اہم رول ادا کیا۔ انھیں ہندوستانی عوام پر بہت اعتماد تھا اور ان سے انھوں نے اٹوٹ پیار کیا جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

—" اگر کوئی شخص میرے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ شخص یہ کہے: یہ وہ شخص تھا جو اپنے دل کی گہرائیوں سے ہندوستانی عوام سے محبت کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں اسے ہندوستان کے لوگوں کا اتھاہ پریم ملا اور وہ اس پر جان چھڑکتے تھے۔ "

لیکن انس و اعتماد کا یہ رشتہ دنیاوی طور پر ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء کو ٹوٹ گیا۔ جٹ رگ پھٹ جانے سے یہ مرد میدان، جس نے تمام عمر ٹھہرنے اور ستانے کا نام نہ لیا اور جس کی زندگی ایثار و قربانی میں گزری دنیا سے رخصت ہو گیا۔ لیکن ذہن آج بھی سوال کرتا ہے کیا نہرو جیسی شخصیت کے لوگ بھی مرا کرتے ہیں؟ بقول سعدیؔ ؂

ع ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

نہرو کی شخصیت بہت تہہ دار تھی۔ ان میں بیک وقت مختلف صلاحیتیں اور انسانی خوبیاں یکجا ہو گئی تھیں۔ عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن جب ہو جاتا ہے تو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کی عظمت کی کون سی حیثیت کو زیادہ اہمیت دی جائے — یوں تو نہرو کی زندگی کے سبھی گوشے اہمیت کے حامل ہیں لیکن

بحیثیت سیاستداں اور دنیا نے انھیں بلاتامل تسلیم کیا اور ان کی عظمت کو سراہا ہے۔

نہرو کی سیاسی زندگی باقاعدہ طور پر سنہ ۱۹۱۸ء سے شروع ہوئی جب وہ ہوم رول لیگ کے سکریٹری اور کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے گئے۔ اس کے بعد نہرو ہندستان کی سیاسی زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ ان کی حیثیت ہندستانی سیاست کی محراب کی درمیانی اینٹ جیسی تھی۔ آزادی کے پہلے نہرو نے اپنا تن من دھن ملک کی آزادی کے لیے قربان کیا۔ اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے کبھی اخلاق اور اصول کا دامن نہیں چھوڑا۔ جوش کی جگہ ہوش۔ تخریب کی جگہ تنظیم کو اپنی سیاسی زندگی کا اصول بنایا جس سے غفلت شعار لوگ جاگے اور آزادی کے لیے ایثار اور مصیبتیں برداشت کرنے کو تیار ہو گئے۔ گاندھی جی کے پیرو کار ہونے کے باعث انھوں نے تشدد کی جگہ اہنسا اور نفرت کی جگہ پیار کے جذبے کو فروغ دیا۔ ان کی ہمدردیاں ہمیشہ سے جمہوری تحریک اور پسماندہ ملکوں کے ساتھ رہیں۔ اس دور غلامی میں بھی انھوں نے ہندستانی سیاست کو بین الاقوامی مسائل کے پس منظر میں دیکھا۔ اسپین کی خانہ جنگی، چین پر جاپانی حملہ اور دوسری جنگ عظیم کے دوران نظریاتی اور عملی تعاون سے انھوں نے ملک کا رابطہ باہری ملکوں سے قائم کیا اور ہندستان کی اہمیت کو واضح کیا۔ اپنے سیاسی تصورات اور تحریکوں میں نہرو نے ہندستانی عوام کو فرقے اور عقیدے کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا بلکہ ایک قوم کی حیثیت سے جگہ دی، گو کہ آزادی اپنے ساتھ ملک کی تقسیم لے کر رونما ہوئی لیکن اس کے باوجود نہرو نے اپنے عقیدے کو متزلزل نہیں ہونے دیا بلکہ اور بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ حقیقت کو آشکار و نمایاں کرنے میں منہمک ہو گئے۔ ہندستان کی تحریک آزادی کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ نہرو نے اپنی ذاتی سیاسی سوجھ بوجھ اور ذہانت کی بنا پر گاندھی جی کی زندگی ہی میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کا بار بار آل انڈیا کانگریس کا صدر چنا جانا اس بات کا بین ثبوت ہے۔ جنگ آزادی کے دوران انھوں نے اپنی ذات سے کبھی بھی قوم کو بدنام نہیں کیا اور آزمائش کے ہر مرحلہ پر اپنے کردار، انکار اور ایثار سے ملک کی رہنمائی کی۔

آزادی کے بعد انھوں نے ہندستانی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندستان کے افلاس زدہ عوام گمنامی اور جہالت کے عمیق غار میں گرے ہوئے تھے۔ درندگی اور بربریت شباب پر تھی۔ فرسودہ نظام کارفرما تھا اور توہم پرستی کا بھوت تمام لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ ایک عرصے کی غلامی نے لوگوں کے ذہن و فکر کو مفلوج کر دیا تھا۔ تعلیمی، تمدنی، معاشی اور تہذیبی قدروں کو انگریزی سامراجیت نے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ملک کی اس حالت زار نے نہرو کے دل پر بہت اثر کیا چنانچہ وہ ایک آہنی عزم کے ساتھ ہندستانی زندگی کے لیے ایک تازہ روح کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۶۴ء تک نہرو بحیثیت سیاست داں نہ صرف قومی بلکہ عالمی سیاست کے ایک روشن مرکز کی طرح نمایاں رہے۔ اس لیے ہمیں دور کو جاننے کے لیے نہرو کی داخلہ و خارجہ پالیسیوں کا جائزہ لینا ہوگا۔

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی امنگوں بھری رات کو نہرو نے بحیثیت وزیر اعظم اعلان کیا۔

"ہمیں ہندستان کا عظیم الشان محل تیار کرنا ہے جس میں بھارت ماتا کے سارے بچے رہ سکیں۔"

اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ہندستان میں ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی۔ انھیں پورے طور پر اس بات کا شعور تھا کہ جد و جہد آزادی کی آغوش میں پلے ہوئے ہندستانی عوام کو کون سا رخ عطا کرنا ہے۔ انھوں نے اس طرز حکومت کی بنیاد ڈالی جس کے سائے میں ایک ایسا سماجی نظام پروان چڑھ سکے جس میں سبھی کو برابری کے حقوق حاصل ہوں، جہاں سماجی ناہمواری کم سے کم ہو، جہاں طبقاتی اونچ نیچ کی کم سے کم گنجائش ہو اور جہاں سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جا سکے۔ فلاحی ریاست کی بنیاد انھوں نے ایک باقاعدہ تنظیم کے ساتھ ڈالی، جس میں عوام کو مادی اور تہذیبی ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہو سکیں۔ وہ فرد کی آزادی

کے زبردست حامی تھے اور سماجی و معاشی آزادی و انصاف کو دورِ حاضر کی سب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں مختلف اخلاقی اقدار مثلاً امداد باہمی کا احساس، جذبۂ خدمت، حق پرستی اور یگانگت کی بڑی اہمیت تھی اور وہ انھیں ترقی و کامرانی کے اہم ستون گردانتے تھے۔

نہرو سیاسی آزادی کو معاشی ترقی کے بغیر نامکمل سمجھتے تھے۔ سوشلزم پر پختہ یقین رکھتے تھے اور اشتراکی سماج کی تعمیر کو اپنے ملک کی معاشی ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن کی تشکیل میں سرگرم حصہ لیا اور پنج سالہ منصوبے کے ذریعہ ملک میں تعمیری کاموں کا ایک جال بچھا ڈالا۔ زراعت، صنعت، تجارت اور گھریلو صنعت کو انھوں نے یکساں فوقیت دی۔ وہ فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے مستقبل کی تعمیر کو مدنظر رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل کو اولیت دی۔ ان منصوبوں میں انھوں نے پرائیویٹ سیکٹر (PRIVATE SECTOR) اور پبلک سیکٹر (PUB-LIC SECTOR) دونوں کی گنجائش رکھی تاکہ ملک کی ساری دولت عوام کی زندگی سنوارنے میں صرف ہو سکے۔

نہرو ملک کی سیاسی اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیمی ترقی کے لیے بھی کوشاں رہے۔ ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ ہندوستانی نظامِ تعلیم میں جدید اور قدیم کا ایک خوشگوار امتزاج ہو جو ملک کی ضرورتوں کو پورا کر سکے جس میں تعصب، توہم پسندی اور قدامت پرستی کی گنجائش نہ ہو۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں انھوں نے سائنس کی اہمیت پر زور دیا۔ اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کا شعور بخشا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی تہذیب میں مختلف عناصر کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے اور کثرت میں وحدت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ملکی آئین میں انھوں نے چودہ زبانوں کو تسلیم کرایا تاکہ ہر ایک کو شانہ بشانہ ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہو سکیں۔ آنے والی نسلوں سے ان کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور اسی لیے انھوں نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

عالمی سطح پر نہرو کی سیاسی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں ایک بین الاقوامی شہری سمجھا گیا۔ اور "پیامبرِ امن" کا درجہ دیا گیا۔ نہرو کے لیے سارا جہان ایک عالمی برادری کا درجہ رکھتا تھا اور اسی لیے انھوں نے افریقہ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کی آزادی کی تمام تحریکوں سے ہمدردی ظاہر کی اور ان کی حمایت کی۔ ان کی غیر جانبدارانہ پالیسی نے نہ صرف عالمی بحران کو کافی حد تک کم کیا بلکہ ہندوستان جیسے نو آزاد اور ترقی پذیر ملک کو عالمی سیاست میں ایک وقار بخشا۔ نہرو عالمی امن پر بڑا عقیدہ رکھتے تھے اور امن کی تلاش کو ہی انسانی سماج کی بقا اور نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ اس ایٹمی دور میں جنگ کے معنی ہوں گے تہذیب و تمدن کی تمام قدروں کا [illegible] جانا۔ وہ اقوامِ متحدہ اور اس کے منشور کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسی لیے انھوں نے اس کو مضبوط بنانے کی ہر کوشش کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ آج جب نہرو اس دارِ فانی میں نہیں رہے تو یہ دنیا عالمی سیاست میں ایک قسم کا خلا محسوس کرتی ہے۔

نہرو اپنی سیاسی زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گئے تھے کہ سیاسی فضا نے دنیا کو یہ جاننے کا موقع نہیں دیا کہ نہرو اگر سیاست داں نہ ہوتے تو دنیا انھیں ایک ادیب اور تاریخ داں کی حیثیت سے جانتی لیکن جو ادبی کارنامے انھوں نے سیاسی مصروفیتوں کے باوجود انجام دیے ہیں وہ اس بات کے ضامن ہیں کہ ایک ادیب وہی خیالات قلم بند کرتا ہے جو ایک انسان کی حیثیت سے اس میں کارفرما ہیں۔ اس کے ذاتی خیالات تحریر کے پردوں سے برابر جھانکتے رہتے ہیں۔ نہرو کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات میں کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں براہ راست ہوتی ہیں جن میں سادگی، قوت اور زورِ بیان ہے جس سے قاری ایک ہی نظر میں ان کا مداح ہو جاتا ہے۔

تصنیفی نقطۂ نظر سے نہرو کی ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۲۸ء میں ہوئی جب انھوں نے روسی نظام کو دیکھ کر اپنے تاثرات ایک مختصر کتابچہ "سویت رشا" میں پیش کیے۔ اس کے بعد ان کی تصنیف "باپ کا خط بیٹی کے نام" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ خطوط رسماً لکھے گئے یا کسی منصوبہ بندی کے تحت ان کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ خطوط کے مقابلے میں اور کوئی تصنیف شخصیت کی اتنی آئینہ دار نہیں ہوتی

ہے۔ کیونکہ مصنف خطوط اس مقصد کے تحت نہیں لکھتا ہے کہ کسی دن ان کی ادبی اور تعمیری حیثیت متعین کی جائے گی۔ اس لیے یہ تحریریں براہ راست اور بلا جھجک ہوتی ہیں لیکن نہرو کے خطوط روایتی نہیں ہیں، جب جس میں باپ اپنی بیٹی سے خلوص و محبت کی باتیں کرتا ہے۔ یہ خطوط بھی واضح منصوبے کے پیش نظر لکھے گئے ہیں اور کوئی عظیم مقصد ان کی تخلیق کا محرک ہے۔ ہر خط ایک سبق یا تعلیمی درس کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان خشک مسائل کے گرد بھی ہمیں مصنف کے ذاتی تاثرات اور خلوص کی بڑی دل کش و نمایاں تصویر نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں مواد کے ساتھ اسلوب کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح موضوع اور مواد، اسلوب اور فن کے اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ایک قول ہے "تاریخ عظیم شخصیتوں کا مزار ہے"۔ اور نہرو کی کتابیں "تاریخ عالم کی جھلکیاں" اور "تلاش ہند" ایسی ہی تاریخ کے اوراق الٹتی ہیں جن سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش اور جستجو ہر انسان کے دل و دماغ میں ہوتی ہے۔ کچھ لوگ تاریخ کو افسانے کی جگہ دیتے ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ حال کو جاننے کے لیے ماضی کا مطالعہ ضروری ہے۔ بعض لوگوں کا تاریخ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ محض واقعات کی طولانی کہانی ہے اور بعض لوگ تاریخ کو معیار بنا کر اپنے عمل کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن نہرو نے اس کے برعکس تاریخ کا مطالعہ ایک طالب علم کی حیثیت سے کیا ہے اور ان کے مطالعے کے دوران ان کے سامنے واضح نقطۂ نظر نہیں تھا۔ اس بات کا واضح ثبوت "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ہیں جو اندرا گاندھی کے نام خطوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نینی جیل اور دہرہ دون کے قید خانوں میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیانی عرصے میں صرف اس لیے زیر تصنیف رہی کہ مصنف اپنے ان نتائج کو جو اسے تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوئے تھے اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کر سکے۔ اس کتاب میں انسانی نشو و نما کا ذکر جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ماضی کی پرشکوہ تاریخ کے مطالعے سے نہرو کو اونچے آدرش، اخوت

محبت اور انسانیت کے بنیادی اصول ملے جن پر ان کی تمام اندرونی اور بیرونی سیاست کا دار و مدار تھا۔ نہرو کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ آج کی یہ دنیا ان حقائق کی طرف قدم بڑھا رہی ہے جہاں رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیاز حاصل کرنے کی گنجائش نہیں۔ آج کا سماج سیاسی و اقتصادی مساوات اور فرد کی آزادی سے عبارت ہے اور اس کتاب میں یہی سبق وہ اپنے ہم وطنوں کو دینا چاہتے ہیں۔

"تلاش ہند" کے مطالعے کے بعد یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب قلعہ احمد نگر میں اپریل ۱۹۴۴ء تک زیر تصنیف رہی۔ اس کتاب سے کسی تاریخ داں کو مایوسی نہیں ہو سکتی ہے لیکن یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ کیا صرف تاریخ کے صحیح واقعات ہی کسی کتاب کو قابل قدر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کیٹس کے الفاظ میں "سچائی ہی صرف خوبصورتی نہیں بلکہ خوبصورتی بھی سچائی ہے"۔ نہرو کی اس کتاب میں ہمیں اس حقیقت کے دونوں پہلو اجاگر نظر آتے ہیں اور ہمیں کسی ایک کی تلاش میں بھی مایوسی نہیں ہوتی۔ وہ خشک موضوع کے باوجود اپنی جمالیاتی حس سے پورا کام لیتے ہیں اور ایک حقیقت پسند ادیب کی حیثیت سے ان باتوں کو لکھنے سے بہرحال گریز کرتے ہیں جن کی سچائی مشتبہ ہو۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان کی روح تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو دب دب کر ابھرتی اور مر مر کر زندہ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی بہت سے مسائل کو چھیڑا ہے جن سے ہم آج بھی دو چار ہیں اور ان کا حل ڈھونڈنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

نہرو نے "آپ بیتی" ۱۹۳۴ ۔ ۱۹۳۵ء میں الموڑہ جیل کے ایام اسیری میں مکمل کی تھی۔ آپ بیتی لکھنا بڑا صبر آزما اور اہم کام ہے جس میں انصاف کے دونوں پلڑے برابر رکھنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان اپنی کامیابیوں کے ساتھ کوتاہیوں کا ذکر نہ کرے تو تصنیف ایک قسم کا قصیدہ بن کر رہ جاتی ہے لیکن نہرو اس مشکل فن میں پورے اترتے ہیں۔ نہرو نے اس کی ابتدا ابراہیم کا

سکے اس قول سے کی ہے:

"اپنے خیالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔
اگر انسان برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اگر تعریف کرے
تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔"

لیکن یہ مشکل اور نازک مرحلہ جس حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ ان کے ہاتھوں سر ہوا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ بقول نہرو آپ بیتی لکھتے ہوئے دو چیزیں ان کے پیش نظر تھیں:

"ایک تو اپنے لیے کوئی کام ٹھہرا لوں اور اسی میں لگا
رہوں کیونکہ بغیر اس کے تنہائی کے پہاڑ جیسے دن کاٹے
نہیں کٹتے، دوسرے یہ کہ ان واقعات کا جائزہ لے ڈالو
جو ہندوستان میں پچھلے زمانے میں پیش آئے۔ اور جن
سے مجھے بھی تعلق رہا ہے، تاکہ انھیں صاف اور سلجھی ہوئی
نظر سے دیکھ سکوں ــــ"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہرو کی "آپ بیتی" ان کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ملک و قوم کی اور ان لوگوں کی داستان ہے جو اس وقت ـــــــــ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ وسیع تجربات سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے جس سے واقعات میں گہرائی اور جذبات میں خلوص کے اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ نہرو بڑی سادگی اور پیار سے اپنی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں اور واقعات قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظریے اور رائے کو بھی بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں بالواسطہ ہوتی ہیں کیونکہ بحیثیت ادیب بھی نہرو زندہ دل اور صاف گو ہیں۔ وہ اپنی کوتاہیوں کو بیان کرنے میں اس طرح سرگرم نظر آتے ہیں جس طرح وہ اپنی کامیابیوں کو واضح کرتے ہیں۔ نہرو کو مشرق نے جنم دیا لیکن ٹیگور کی طرح وہ بھی مغربی انداز سے متاثر تھے اس لیے ان کی تصنیف میں ہمیں جو خیالات ملتے ہیں وہ سب ان کے اپنے نہیں جن کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ یہ اعتراف اس بات کا آئینہ دار ہے کہ نہرو کسی بندھے ٹکے اصول اور آدرش کے اسیر نہ تھے۔

نہرو انسانی برادری کی عظیم ہستیوں میں سے تھے۔ ان کی زندگی سیاسی کارناموں اور تصانیف و تقاریر نے دنیا کے انداز فکر پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کی زندگی کے ساتھ تاریخ کا ایک عظیم دور ختم ہو گیا۔ سچ ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

★

فضاؔ ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن، یوپی

غزل

گرد پہ بیٹھی اور بھی گرد
چہرے سے جب پونچھی گرد

سانسیں اور جیون کا سفر
آگے پیچھے اڑتی گرد

ہم بنجاروں کا توشہ
کنکر، پتھر، مٹی، گرد

جھونک دی میری آنکھوں میں
دنیا نے خواہش کی گرد

رات آئی پلکوں پہ سجا
خوابوں کی چمکیلی گرد

اندر کا موسم ہے سجل
باہر کالی کالی گرد

جامد جامد ہے سب کچھ
کیسی آندھی، کیسی گرد

چھاؤں مرے پیروں کی تھکن
دھوپ، مرے رستے کی گرد

قدریں ٹوٹ گئیں لوگو!
آؤ! سمیٹیں اپنی گرد

میں جو مٹھی تیز ہوا
چاروں سمتیں اپنی گرد

تم بھی کیا ننھی سی کرن
میں بھی کیا اک مٹھی گرد

ہم سے صبا کو کیا ملتا
پھول کی خوشبو ٹھہری گرد

جسم کوئی صحرا تو نہ تھا
لوگ اڑاتے کتنی گرد

میرے آئینے کا دکھ
ساری سچی جھوٹی گرد

اس کا توشہ، پھول، دھنک
میرا حصہ خالی گرد

جانے والے چھوڑ گئے
راہ میں تیری میری گرد

پیاس کا جھونکا تھی ہر موج
دریا دریا بکھری گرد

صبح کے آئینے کو سنبھال
سورج نکلا، پھیلی گرد

ہم بکھرے، تو تو پھوٹی
جیسا صحرا، ویسی گرد

رو لیے دو آنسو ہم بھی
بوند پڑی اور سمٹی گرد

آپ ہوا اپنا وہ ہدف
سورج پر پھینکی تھی گرد

دامن جھاڑ چلے ہم بھی
باتیں تھیں ہونٹوں کی گرد

کیا ہو فضاؔ آرائشِ فن
لفظ دھواں ہیں، معنی گرد

ڈاکٹر ابراہیم سلیم قدوائی
پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ
کشمیر یونیورسٹی سری نگر

جواہر لال نہرو اور کتب بینی

اگر آپ کو تین مورتی ہاؤس نئی دہلی میں واقع جواہر لعل نہرو میموریل میوزیم جانے کا اتفاق ہو اور ان رہائشی کمروں کو دیکھنے کا موقع ملے جہاں جواہر لعل نہرو نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے تاریخی ایام گزارے تھے اور جو آج بھی اسی حالت میں برقرار رکھے گئے ہیں جیسے کہ عظیم رہنما کی زندگی میں تھے، تو آپ یقیناً یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ ہر جگہ خواہ وہ آفس کا کمرہ ہو یا بیڈروم یا گیلری، کتابیں انتہائی سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ اس طرح کتابوں کی ہر جگہ موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نہرو جی کو کتابوں سے والہانہ لگاؤ اور بے پناہ دلچسپی تھی۔

اس کے علاوہ اگر آپ کو نہرو کی تصنیفات خواہ وہ "تلاش ہند" ہو یا "تاریخ عالم کی جھلکیاں" یا "خود نوشت سوانح حیات" یا کسی دوسری تصنیف کے مطالعہ کا اتفاق ہو تو آپ ان کے وسیع اور گہرے مطالعہ کے قائل ہو جائیں گے۔

جواہر لعل نہرو کو مطالعہ کا چسکا ان کے بچپن کے استاد مسٹر بروکس کی عالمانہ صحبت میں پڑا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانہ ہی میں مغرب بالخصوص انگلستان کے ادبی سرمایے سے واقف ہو چکے تھے۔ مطالعہ ہر دور میں ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ رہا۔ بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک وہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کرنے اور اس کی مدد سے قومی اور عالمی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ انتہائی مصروف زندگی گزارنے کے باوجود سونے سے قبل تقریباً ایک گھنٹہ کا مطالعہ ان کے معمولات میں داخل تھا جس پر وہ سختی کے ساتھ کاربند رہے خواہ وہ کتنے ہی تھکے ہوئے کیوں نہ ہوں۔

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہرو کو مطالعہ سے اس قدر دلچسپی کیوں تھی؟ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے؟ ان کے پسندیدہ مصنف کون تھے؟ زیر نظر مختصر مضمون میں ان سوالات کے جواب نہرو کی تحریروں، جن میں ان کے نجی خطوط اور ڈائریاں شامل ہیں، کو پیش نظر رکھتے ہوئے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

نہرو بنیادی طور پر ایک دانشور تھے۔ ان کے خیالات اور نظریات وسیع اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ وہ کتابوں کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ دوسروں کے تجربات اور خیالات سے مستفید ہونا پسند کرتے تھے جیسا کہ انھوں نے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو ۱۹۳۵ء میں ایک خط میں تحریر کیا تھا:

"کتابوں کو محض دل بہلانے یا معلومات بڑھانے کے لیے ہی نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ ان کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارے ذاتی تجربات بہت محدود اور تنگ نوعیت کے ہوتے ہیں اور اگر ہم صرف ان ہی پر انحصار کریں تو ہمارا نقطۂ نظر تنگ اور محدود دائرہ کے اندر محصور ہو کر رہ جائے گا لیکن کتابوں کے ذریعہ ہم کو بے شمار دوسر

لوگوں کے تجربات اور خیالات سے آگاہی ہوتی ہے اور جن میں اکثر اپنے دور کے ذہین ترین افراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح سے ہمارے نقطۂ نظر میں وسعت آتی ہے۔"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں نہرو نے مشہور مصنف جان گنتھر کو ۱۹۳۸ء میں تحریر کیا تھا کہ وہ "سیاسی کتابیں اور موجودہ مسائل سے متعلق کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں اس کے علاوہ تاریخ سے دلچسپی ہے اور سیاحت سے خصوصاً سیاحت کی قدیم کتابوں سے۔ ناول بہت کم پڑھتا ہوں اور وہ بھی چند مشہور مصنفین کے۔ شاعری میرے لیے ہمیشہ پرکشش رہی ہے۔"

اپنی بیٹی اندرا کو جب وہ شانتی نکیتن میں زیر تعلیم تھیں نہرو جی نے ایک خط میں لکھا تھا کہ ان کو کم از کم ۵۰ برس پرانی کتابیں پڑھنا چاہئیں۔ بہتر ہوگا اگر پرانی مشہور کلاسیکی تصنیفات جنہوں نے ایک طویل مدت تک خیالات اور تحریروں کو متاثر کیا، پڑھی جائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم کو نئی کتابوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کے مطالعہ کے بغیر ہم موجودہ زمانے اور اس کے پیچیدہ مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔

نہرو کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاست کی ہنگامہ پرور فضاؤں میں گزرا۔ اس دوران مجموعی طور پر تقریباً ۱۰ برس ان کو دنیا کے ہنگاموں سے دور برطانوی سامراج کی جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے تنہائی میں بھی گزارنا پڑے۔ نظر بندی اور قید تنہائی کے دوران کتابیں ہی نہرو کی مونس و رفیق اور ہمدم و دمساز ہوتی تھیں۔ کتب بینی ان کے دل کے بہلانے کا سامان تھی۔ جس کے ذریعہ نہرو کے لیے تلاش ہند، خود نوشت سوانح اور تاریخ عالم کی جھلکیاں جیسی شاہکار اور بلند پایہ کے تصنیفات قلم بند کرنا ممکن ہو سکا۔

جیل سے لکھے گئے خطوط میں نہرو نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے برابر مختلف قسم کی کتابوں کی فرمائش کی اور ان کا مطالعہ کیا۔ نہرو کی جیل میں لکھی گئی ڈائریوں کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانۂ اسیری کو، جس کا سلسلہ دسمبر ۱۹۲۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۵ء تک درمیانی وقفوں کے ساتھ جاری رہا، ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا، ان میں سے چند کتابوں اور مصنفوں کے نام اس طرح ہیں۔ مئی ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۳ء تک کے دور اسیری میں نہرو نے کل ملا کر ۵۵ کتابوں کا مطالعہ کیا جن میں کنگسلے کی "ہرورڈ دی ویک"، کائی اور میلیسن کی "انڈین میوٹنی"، ای، بی ہیول کی "آرین رول ان انڈیا"، آر، کے مکھرجی کی "فنڈامنٹل یونٹی آف انڈیا"، ٹالسٹائی کی "انا کیرینینا"، وکٹر ہیوگو کی "لے مزرابل"، گبن کی "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر"، رسکن کی "سی سیمز اینڈ لیلیز"، والٹر پیٹرز کی "دی رینائسنس" اور ٹینی سن کی "آئیڈلز آف دی کنگ" شامل تھیں۔

۱۹۳۰ء میں جیل کے قیام کے دوران نہرو نے چھ ماہ کے عرصہ میں کل ملا کر ۴۲ کتابوں کا مطالعہ کیا جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: اپٹن سنکلائر کی "دی پرافٹس آف ریلیجن" مینوئل اگارتے کی "ڈیسٹنی آف اے کانٹی نینٹ" آسولڈ اسپینگلر کی "ڈیکلائن آف دی ویسٹ" وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۳۱ء میں اپنے مختصر دور اسیری کے دوران نہرو نے ۲۴ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں ٹالسٹائی کی "مائی لائف" جارج برنارڈ شا کی "سوویت ازم اینڈ کیپٹل ازم" ہکسلے کی "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" رادھا کرشنن کی "ہندو ویو آف لائف" باب ڈون کی "لبرٹی انڈر دی سوویتس" اور کوٹلیہ کی "ارتھ شاستر" شامل تھیں۔

غرضکہ ان کتابوں کے ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ نہرو کا مطالعہ نہایت متنوع تھا اور وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھتے تھے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نہرو کی پسندیدہ کتابیں اور پسندیدہ مصنف کون تھے، اس کا جواب بھی ہم کو نہرو کی تحریروں سے ہی مل سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں جیل سے لکھے گئے خطوط میں نہرو نے اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے اپنی بہنوں اور بیٹی پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ان کو جارج برنارڈ شا کی "انٹیلی جینٹ ومینس گائڈ ٹو سوشلزم، کیپٹل ازم اینڈ فاشزم"، وکٹر ہیوگو کی "کا تردیں سقردا"، جان گولسورتھی کی "رائز آف دی ڈچ ریپبلک" پڑھنے کا مشورہ دیا۔

مہاتما گاندھی کو لکھے گئے خط میں نہرو نے گاندھی جی کو جارج برنارڈ شا کی "سینٹ جولس" جو جون آف آرک سے متعلق ڈرامہ ہے۔ پڑھنے کا مشورہ دیا۔

اپنی بیٹی کے نام ایک دوسرے خط میں نہرو نے ان کو افلاطون کی "ری پبلک" ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس"، اور ایچ، جی۔ ویلز کی "مین لائک گاڈس" پڑھنے کا مشورہ دیا۔

جارج برنارڈ شا بلاشبہ نہرو کے پسندیدہ مصنفوں میں سے ایک تھے جیسا کہ [illegible] میں نہرو نے جارج برنارڈ شا کو خط تحریر کیا "میری نسل کے بہت سے لوگوں کی طرح، جو آپ کی تحریروں کی رفاقت میں جوان ہوئے۔ مجھے لگتا ہے جیسے کہ میری شخصیت کا ایک حصہ اس سے متاثر ہوا۔"

اس امر کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہرو کو زمانہ اسیری کے دوران جن ہستیوں نے ان کے ذوق اور پسند کی کتابیں فراہم کرنے میں سب سے نمایاں حصہ لیا وہ ان کے قریبی دوست اور ساتھی ڈاکٹر سید محمود اور سروجنی نائیڈو کی بیٹی مس پدمجا نائیڈو تھے۔ وہ دونوں نہرو کے لیے کتابوں کا انتخاب کرتے اور ان کو خرید کر نہرو تک جلد از جلد پہنچا دیتے خواہ نہرو کسی بھی جیل میں ہوں۔

بلاشبہ جواہر لعل نہرو کتب بینی کے دلدادہ تھے۔ مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ سیاست کے ہنگاموں میں گزارنے اور دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کا انتظام سنبھالنے اور اس کے ان گنت اور پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں صرف کرنے کے باوجود وہ مطالعہ کا وقت نکالنے کے لیے ہمیشہ

(باقی ۱۵ پر)

جاوید وششٹ
شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج
اجمیری گیٹ دہلی ۶

رباعیات

سکوت نم

خاموش فضاؤں کا سکوت پیہم
سنگیت کے تاروں کی رسیلی سرگم
چہکا کوئی پنچھی کسی شاخ گل پر
جاوید ہوئی جاتی ہیں آنکھیں پرنم

بھید کی سرحد

آنکھوں میں نمی، لب پہ ہنسی، غم نہ خوشی
ہے کون سے عالم میں وجود ہستی؟
اس جان سے، اس تن سے پرے بھی ہے کوئی
جاوید چلو! بھید کی سرحد تو ملی

آئینۂ اسرار

اسرار کے رخ سے جو اٹھایا پردہ
جھلکے تھا پڑا سامنے اک آئینہ
آئینے میں دیکھا تو ہوئی حیرانی
اس میں بھی نظر آیا ترا ہی چہرا

دامن کو بچا

گلشن میں لگے آگ تو گلشن کو بچا
شعلوں میں گھرے اپنے نشیمن کو بچا
کیا خوب کسی مرد قلندر نے کہا
کانٹوں سے نہیں پھولوں سے دامن کو بچا

نظم و نسق کے استحکام اور صنعت کاری کا ایک نیا باب

اتر پردیش میں

کاشی ناتھ مصرا
وزیر ریاست برائے اطلاعات
و منصوبہ بندی اتر پردیش

اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے ممبران مجالس قانون ساز ممبران پارلیمنٹ نیز سیاسی اور سماجی کارکنوں کی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگراموں میں بیشتر پروگرام بے زمین کسانوں، مزدوروں، ہریجنوں، آدی باسیوں، طالب علموں، نوجوانوں اور درمیانہ طبقہ کے عام لوگوں سے متعلق ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے ریاست کے اندر بے زمین افراد کو دیے گئے پٹے کی زمین سے بے دخل کرنے والے لاقانونیت پسند عناصر کو تین سال کی قید سخت کی سزا دینے کا قانون نافذ کر کے ریاست میں خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے درمیان مربوط دیہی ترقی کی مختلف اسکیموں پر عمل درآمد کی رفتار تیز تر کر کے، ترقیاتی بلاکوں میں دیہی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے خود روزگار تربیتی مراکز قائم کر کے جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ۵۰ روپیہ سے ۱۰۰ روپے ماہانہ تک وظائف دے کر تربیت دی جاتی ہے اور ریاست کے دور افتادہ دیہی علاقوں میں قومی دیہی اسکیم کے توسط سے بے روزگار تندرست و توانا افراد کو روزگار فراہم کر کے ریاست کے عام آدمی کو اپنی جانب مائل و متوجہ کر لیا ہے۔ ریاست کے ترقیاتی بلاکوں میں ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے لوگوں کو رہائشی سہولیتیں فراہم کرنے کے لیے زمین الاٹ کی جا رہی ہے۔ دو ڈھائی ہزار روپیہ کی مالی امداد سے دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کے لوگوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ خود روزگار تربیت مرکزوں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کمبل، دری قالین بننے اور کرگھے پر کپڑا بُننے کی تربیت دی جا رہی ہے جو ہاتھ پہلے گھاس چھیلنے، کدال چلانے کھیت کاٹنے کے لیے ہنیا پر چلتے تھے اب وہی ہاتھ کھرپی، ہنیا اور کدال ہٹ کر سلائی مشین، سویٹر بننے کی مشین، کڑھائی، کرگھا اور کمبل بننے پر چل رہے ہیں جس کے نتیجے میں دیہی علاقوں کے عوام میں ریاستی نظم و نسق اور شریمتی گاندھی کے تئیں اطمینان کی لہر دوڑ رہی ہے۔

شریمتی گاندھی کی جانب عوام کا جھکاؤ اور ان کی حکومت کے تئیں جو استحکام کا جذبہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے ذریعہ سماج کے کروڑوں غریبوں اور ناداروں کو وقار بخشا گیا ہے۔ بے زمین زرعی مزدور، پابند مزدور، قرضے کے بوجھ سے دبے ہوئے آدی باسی اور غریب ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد سے قبل جانوروں جیسی زندگی گزارتے تھے، سماج میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی۔ ملک کے کروڑوں لوگوں کو حیوانوں کی سی زندگی سے نجات دلا کر انھیں انسانی زندگی کی سطح پر عزت کے ساتھ کھڑا کر دینا شریمتی گاندھی کا تاریخی کارنا

ہے شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کے کروڑوں بے زمین اور نادار افراد کو جو اپنی محنت فروخت کرنے کے لیے در بدر بھٹکا کرتے تھے، زمین سے وابستہ کرکے انسانیت کو اعزاز بخشا ہے۔

ہزاروں برسوں کی تاریخ میں شریمتی گاندھی پہلی حکمراں ہیں جنھوں نے ملک کی ملکیت میں عام لوگوں کو حصہ دار بنانے کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اب اس ملک میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاس جھونپڑی ڈالنے بھر کی بھی زمین نہیں ہے۔

اترپردیش کے وزیر اعلیٰ نے بیس نکاتی پروگرام کی عمل آوری کی رفتار تیز کرکے ریاست کے عوام اور غریبوں کی جانب ہمدردی اور مدد کا ہاتھ بڑھا کر اپنی ایمانداری، فرض شناسی اور غیر جانبدارانہ طریقہ کار کے ذریعہ ریاست کے محنت کش عوام کو یہ تاثر دیا ہے کہ وہ غریب کسان، مزدور اور ریاست کے عوام کے ہی آدمی ہیں۔ ریاست کے سرمایہ دار اور جاگیردار انھیں اپنے راستہ سے ہٹا نہیں سکتے۔

ریاست کے مختلف ڈویژنوں کے صدر مقامات پر ڈویژنل وزیروں کی تقرری کرکے شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے نظم و نسق کو عوام الناس سے قریب تر کر دیا ہے تاکہ عام آدمی کی روزمرہ دشواریاں دور ہو سکیں اور ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز ہو سکے۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ پہلے وزیر اعلیٰ ہیں جنھوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کی یہ اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر وقت عام آدمی سے قریب رہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ڈویژنل وزیروں کی تقرری سے ڈویژنوں کے ترقیاتی کمشنروں یا ریاست کی مجلس وزراء کے اراکین اور ڈویژنل وزیروں کے درمیان اختلاف اور کشیدگی میں اضافہ ہوگا لیکن حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ریاستی کابینہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کی رفتار تیز تر کرنا، مربوط اور متحد قوت کے ذریعہ ترقیاتی کاموں کی انجام دہی اور عام آدمی کی روزمرہ مشکلات دور کرنے کے سلسلہ میں نظم و نسق کی سطح پر ڈویژنل افسروں کو فیصلہ کن صلاح و مشورہ دینا ہی ان ڈویژنل وزیروں کا کام ہوگا۔ نظم و نسق سے متعلق یہ انتظام عام آدمی کی سہولت کے لیے ہی کیا گیا ہے۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ اترپردیش کے پہلے وزیر اعلیٰ ہیں جنھوں نے ریاستی منصوبہ بندی کو لامرکزی بنانے کی جانب توجہ کی ہے۔ کسی بھی مجلس [illegible] قانون ساز کو ایک کلومیٹر سڑک یا پلیا بھی اپنے حلقہ میں بنوانا ہوتی تھی تو اسے ادھر سے ادھر سکریٹریٹ، انجینئر اور وزیر اعلیٰ تک دوڑنا پڑتا تھا تب بھی اسے یہ معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ سڑک یا پلیا بن جائے گی یا نہیں۔ اضلاع میں چھوٹی یا بڑی ہر قسم کی تعمیرات کا فیصلہ پہلے لکھنؤ میں ہی ہوتا تھا۔ اب وزیر اعلیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ریاست کے [illegible] عوامی نمائندوں کی مدد سے [illegible] ترجیح کی بنیاد پر حسب ضرورت سڑک، پل، پلیا، اسکول، اسپتال، روزگار مرکز، گھریلو صنعت، چھوٹے بڑے کارخانے، آبپاشی، ذرائع مواصلات، نقل و حمل، تجارت، درآمد برآمد، پیداوار اور فروخت سے متعلق تمام اسکیموں کا خاکہ ضلع اور ڈویژن کی سطح پر ڈویژنل وزراء کی [illegible] میں تیار کر دیا جائے گا اور سالانہ منصوبوں پر ریاست میں خرچ ہونے والی رقم کا ۳۰ فیصد حصہ اضلاع کو الاٹ کر دیا جائے گا۔ معاشی اور صنعتی اعتبار سے پسماندہ اضلاع کا حصہ ترقی یافتہ اضلاع کے مقابلے میں زیادہ ہوگا۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ پہلے وزیر اعلیٰ ہیں جنھوں نے ریاست کے غیر متوازن ترقیاتی بندوبست پر بھی توجہ کی ہے۔ گزشتہ ۳۴ برسوں میں ترقی کے عمل میں اترپردیش کے پہاڑی علاقے، مشرقی اضلاع اور بندیل کھنڈ کا پٹھاری علاقہ پسماندہ رہ گیا۔ اس علاقائی عدم توازن کو دور کرنے کے لیے وزیر اعلیٰ نے موثر اقدام کیا ہے۔ پہاڑی علاقہ کی معاشی ترقی کے لیے پہاڑی ترقیاتی کارپوریشن کے شروع کردہ ترقیاتی کاموں کو اولیت دی جا رہی ہے، اور بندیل کھنڈ اور مشرقی اضلاع

میں ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لیے معیار مقرر کیے گئے ہیں ۔ غازی پور میں سوتی مل قائم کی جا رہی ہے ۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں ایک بڑی صنعت قائم کی جائے گی ۔

اتر پردیش کے تقریباً ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی روزی کا ذریعہ ماہی گیری اور کشتی رانی ہے ۔ چنانچہ مچھیروں اور ملاحوں کی افسوسناک حالت کی جانب بھی وزیر اعلا نے توجہ دی ۔ آزادی کے ۳۴ برسوں میں اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ہی نے ریاست میں نادرن انڈیا فیری ایکٹ ۱۹۱۳ء کو غیر موثر بنا کر ندیوں کے گھاٹوں کا نیلام بند کر دیا اور دریاؤں کے اندر مچھلی پکڑنے اور ندی گھاٹوں پر ناؤ کھینے کے پورے اختیارات ملاحوں اور ماہی گیروں کو سونپ دیے ہیں ۔ درمیانی اشخاص آبی ذخائر میں مچھلی پکڑنے کا ٹھیکہ اور ندی گھاٹوں پر فیری کا ٹھیکہ لے کر ملاحوں کا استحصال کرتے تھے اس نے بندوبست سے درمیانی اشخاص کے ہاتھوں ملاحوں اور مچھیروں کا استحصال بند ہو جائے گا اور ان کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی ۔ برسوں سے ملاح اور مچھیرے یہ نعرہ لگا رہے تھے "ناؤ، بانس اور جال ہمارا ، جل پر بھی ادھیکار ہمارا"۔ یہ نعرہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے دور میں صحیح ثابت ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تنڈواری حلقہ انتخاب سے وزیر اعلا کے مقابلے میں ملاحوں کا نیتا رام ہت اپنی برادری کے ووٹ بھی حاصل نہیں کر سکا ۔

وزیر اعلا نے ریاست کی صنعتی ترقی کے لیے اسکیموں کی مد میں سب سے زیادہ یعنی ۶۲۸۰ کروڑ روپے کی رقم مرکز سے حاصل کی ہے اور سب سے مشکل اور پیچیدہ محکمہ بجلی کی ذمہ داری بذات خود قبول کر کے وہ اتر پردیش کی صنعتی ترقی کے لیے پرعزم اور کمربستہ ہیں ۔

★

جواہر لال نہرو اور کتب بینی : (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

کوشاں رہے اور مطالعہ ہر دور میں ان کے معمولات میں شامل رہا ۔

نہرو کو کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ کتابیں جمع کرنے سے بھی دلچسپی تھی ۔ ان کی کوششوں سے آنند بھون کی لائبریری کا شمار ہندستان کی اچھی اور معیاری نجی لائبریریوں میں کیا جاتا تھا ۔

یہی وجہ ہے کہ نہرو یادگاری میوزیم میں ، جو تین مورتی ہاؤس میں واقع ہے ، ایک نہایت شاندار اور اپنی نوعیت کی منفرد لائبریری قائم کی گئی ہے جو جدید تاریخ ہند پر ریسرچ کرنے کے لیے سب سے اچھی لائبریری کہی جا سکتی ہے ۔ اس لائبریری کی سب سے نمایاں خصوصیت مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ممتاز ہستیوں کے ذاتی نگارشات کا ذخیرہ ہے جس میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے ۔ یہ پرائیویٹ پیپرز، تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں اور ریسرچ کرنے والوں کے لیے بیش بہا اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے دور دراز مقامات سے ان کا مطالعہ کرنے اور ان سے استفادہ حاصل کرنے آتے ہیں ۔

★

ڈاکٹر مظفر حنفی
۵۸ - باٹلا ہاؤس
جامعہ نگر - نئی دہلی

کچھ اور تقاضہ یہ گلہ مند نہ کرتے
لیکن وہ دریچہ تو ابھی بند نہ کرتے

سر دوش پہ تھا بار، جبیں کھینچ رہی تھی
مجبور تھے، سجدہ اسے تا چند نہ کرتے

یہ سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے
حضرت بھی ہمیں عظمتِ پند نہ کرتے

لیکن مرا ہمزاد مرے کام نہ آیا
کاندھے کے فرشتے مجھے پابند نہ کرتے

تو نے کبھی پوچھا نہ ہمیں یار، نہیں تو
مرنے کا کوئی غم تری سوگند نہ کرتے

تلخی مرے لہجے کی اگر بار ہے اُن پر
وہ تذکرۂ شہدِ لب و خند نہ کرتے

بڑھنے کا جو موقع انھیں ملتا تو مظفر
پیدل کبھی فرزیں کا گھر بند نہ کرتے

فصیح اکمل قادری
نمبر ۱۹/۲ سہر گاؤں
ولے پارلے، بمبئی ۵۶

وہ سخن کا خیمۂ دلنشیں جو ہوائے شب سے اکھڑ گیا
مرا حرف حرفِ خفا ہوا مرا لفظ لفظ بچھڑ گیا

جو تھیں دبے رنگ کہاوتیں، جو تھیں لوچ رس حکایتیں
وہ غزل کا سولہ سنگھار سا جو سہاگ تھا وہ اُجڑ گیا

نہ وہ موسموں کی کہانیاں نہ غزالِ چشم جوانیاں
یہ "عجیب وحشتِ گرد" ہے کہ وہ پھول لہجہ بگڑ گیا

ملیں زخم زخم عداوتیں، ہوئیں خواب خواب محبتیں
وہ جو دردِ رشتہ سفر میں تھا وہی دل میں تیر سا گڑ گیا

کوئی گیت عہدِ بہار کا کوئی نوحہ فصلِ غبار کا
وہ فسونِ صوت تو توڑیے جو سماعتوں کو جکڑ گیا

نشاد اعظمی
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی

خلیل الرحمان اعظمی

دیدہ وری، دیانت داری اور سوز دروں کی حامل شخصیتیں اردو ادب میں ضرور مل جائیں گی لیکن بیک وقت یہ تینوں صفتیں اگر کسی ایک فنکار میں مکمل طور پر نمودار ہوئی ہیں تو وہ خلیل الرحمن اعظمی ہیں۔ اپنے ہر کام میں دیانت داری، خلوص اور لگن سے کام لینا ان کا شیوہ رہا ہے۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر تمام کاموں کو سرانجام دینے کے خوگر تھے۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہو، درس و تدریس کی ذمہ داریاں ہوں یا شعر گوئی کا تخلیقی عمل، انھوں نے پابندیوں، حد بندیوں اور بندھے ٹکے اصولوں کو ہمیشہ اپنے مزاج اور طبیعت پر بار جانا۔ روایتوں کی مکمل پیروی بھی انھوں نے نہیں کی اور نہ ترقی پسندی کی سکہ بند شاعری سے ان کی افتاد طبع میل کھا سکی۔ ان کی یہی خصوصیات ان کی انفرادیت کا امتیازی نشان ہیں۔

اعظمی صاحب نے اردو تنقید کے ذریعہ اردو شاعری کی دیرینہ روایتوں اور عظمتوں کی بازیافت کا کام بھی کیا۔ جو رائے بھی قائم کی اسے اپنے ٹھوس دلائل کے ساتھ بڑے سنجیدہ اور پروقار لہجے میں ظاہر کیا۔ دیگر زبانوں کے ناقدوں کے اصول اور نظریات کو اردو زبان پر منطبق کرنے کی بیجا کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کے نام گنا کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

میدان تحقیق میں ذہنی تحقیق و جستجو ذاتی مشاہدے اور تجربے سے حاصل شدہ نتائج کا اظہار کھل کر کیا۔ مصلحت کوشی اور جانبداری کو مطلق روا نہیں رکھا اور غیر جانب دارانہ تحقیق کا ایک معیار قائم کیا۔

شاعری میں ان کے یہاں محسوسات اور افکار و خیالات کا بے ساختہ اظہار موجود ہے۔ ان کی شاعری نے خلوص فن کی آنچ میں تپ کر کاغذی پیراہن اختیار کیا تو ترقی بیں نگاہوں نے محسوس کیا کہ اس فنکار میں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں سوز و گداز، خستگی اور دیودگی کا جو عمل ملتا ہے وہ ان کے اپنے دل کی آواز ہے۔ اگر یہاں یہ بات کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ تہذیب و تمدن کے ٹکراؤ، سماجی اور سیاسی نظریات کے تصادم، روایت اور بغاوت کے مابین کشمکش کا زمانہ یقیناً اردو شاعری کے لیے سازگار رہا ہے جس کی بدولت میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسی قد آور شخصیتیں اردو زبان کے افق پر نمودار ہوئی ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شخصیت بھی اسی زمرے میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔

آیئے ذرا ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھیں کہ خلیل الرحمن اعظمی کا خمیر کس خاک سے اٹھا ہے۔ اور ان کے ذہن و فکر کی تعمیر اور ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں کن خارجی و داخلی عوامل کی کارفرمائی ہے۔

مشرقی یوپی کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور قصبہ سرائے میر ہے۔ اس کے نواحی موضع سیدھا سلطان پور میں خلیل الرحمن اعظمی ۹ اگست ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب مولوی محمد شفیع مدرسۃ الاصلاح کے بانیوں میں

سے تھے۔ اس [illegible] کے علمی وادبی، دینی ومذہبی ماحول میں تربیت یافتہ بہت سی برگزیدہ اور نامور ہستیاں برصغیر ہند و پاک میں اپنے علمی فیوض و برکات سے ایک عالم کو منور کر رہی ہیں۔ خود جناب خلیل الرحمن اعظمی کے بڑے بھائی مولانا عبد الرحمن پرواز اصلاحی بڑے پایے کے مصنف اور عالم ہیں۔ اعظمی صاحب نے اپنی خاندانی روایات و اثرات کے برخلاف نئے علوم و فنون کے حصول کی طرف توجہ کی چنانچہ آپ نے شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ سے ۱۹۴۵ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔

شبلی نیشنل اسکول میں تعلیم کے دوران ایک بار اندرونی کسک اور بے چینی کی بدولت انھیں شعرگوئی کی تحریک ملی جیسا کہ انھوں نے "نیا عہد نامہ" کے دیباچے میں خود لکھا ہے:

"غالباً فروری ۱۹۴۶ء کی بات ہے، میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ایک دن اچانک میں نے اپنے دل میں ایک ایسی خلش محسوس کی جس کا سبب خود مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے محبوبہ کا کوئی وجود نہیں تھا نہ تو اس کی شکل وصورت تھی اور نہ کوئی نام اور پتہ مگر ایک مبہم سی کسک نے میرے اندر ایک تبدیلی سی پیدا کر دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے مجھے ایک گوشۂ تنہائی کی ضرورت ہو جہاں میرے ہم سبق اور عزیز ترین دوست بھی نہ ہوں۔ ایک روز کلاس میں بغیر کسی ارادے کے سب سے پچھلی بنچ پر جا بیٹھا۔ میں اس سے پہلے اس بنچ پر کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ اپنی نوٹ بک پر ساتھیوں کی نظریں بچا کر کچھ لکھنے لگا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد میں نے اپنے چند بے تکلف دوستوں سے یہ انکشاف کیا کہ میں نے ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے۔ نظم کا عنوان تھا "نقش ناتمام" اور وہ اس طرح شروع ہوئی تھی:

پیکرِ حسن و حیا آہ یہ تصویر تری

میری تخئیل کا ہے ایک ادھورا شہکار"

اعظمی صاحب کی یہ نظم بعد میں ممتاز شیریں کے دوماہی رسالہ "نیا دور" بنگلور میں شائع بھی ہوئی۔ انھیں دنوں کچھ اور نظمیں بھی انھوں نے کہیں مثلاً "زلیخا کی آنکھیں" "آوارش" "اجنبی سائے" "تخئیل کے دیوتا" "خیام کے نام" اور "حبس دوام" وغیرہ۔ ان دنوں ادبی دنیا، ہمایوں، نیا ادب، ساقی اور ادب لطیف جیسے ادبی رسائل و جرائد اعظمی صاحب اور ان کے دوستوں کے زیر مطالعہ رہتے اور ان رسالوں میں جدید شاعری کی آوازیں گونج رہی تھیں اور ہیئت و اسلوب کے تحت نئے تجربے کیے جا رہے تھے۔ اعظمی صاحب بھی وقتی طور پر اس نئی روش اور طرز شاعری سے سحر زدہ ہو گئے تھے اور اس رنگ میں کہنے کی انھوں نے شعوری طور پر کوشش بھی کی لیکن وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کا مکمل اظہار و ابلاغ نہیں ہو پاتا تھا۔ چنانچہ جلد ہی وہ اپنے انفرادی لب و لہجہ کی طرف رجوع ہوئے اور نظم گوئی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی کی طرف بھی میلان ہوا۔ ورنہ اس وقت شعرا و ادبا کی تحریریں اور تنقیدیں پڑھ کر خلیل صاحب غزل سے بدگمان ہو چکے تھے کیونکہ ترقی پسندی کے اس دور میں غزل کو خوب خوب مطعون کیا گیا تھا اور اسے گردن زدنی قرار دیا گیا تھا۔ اب جو محبوبۂ غزل کی زلفوں کے اسیر ہوئے تو کلاسیکی شعرا کے کلیات اور دواوین کے مطالعے میں ڈوب گئے۔ ڈوب کے ابھرے تو انھیں جدید تنقیدی رویوں کی کم مائیگی اور کج فہمی کا عرفان شعور ہوا بلکہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قدیم شعرا کی غزلوں کے واسطے سے نئے اور بنیادی نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے۔ چنانچہ اسی تقاضے نے انھیں تنقید نگاری پر بھی آمادہ کیا۔ ویسے اعظمی صاحب کو مضمون نگاری کا شوق طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھا جس کی تربیت ابتدائی طور پر مولوی

عبدالباری آسی کی مرہونِ منت ہے۔ بی۔اے تک پہنچتے پہنچتے
اس ذوق کی تربیت ایسی ہو چکی تھی کہ انھوں نے سب سے پہلے
"مقدمۂ کلامِ آتش" جیسا گراں قدر کارنامہ انجام دیا جس
نے ادبی دنیا سے ان کی تنقیدی بصیرت کا لوہا منوالیا۔ ۱۹۴۶ء
میں یہ مقالہ ماہنامہ "نگار" میں علامہ نیاز فتح پوری کے اس
تعریفی نوٹ کے ساتھ قسط وار شائع ہوا کہ:

"جناب اعظمی جس دقتِ نگاہ و امعانِ نظر سے
کام لے رہے ہیں وہ آتش کے باب میں اس وقت
تک کسی صاحبِ قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔"

شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ سے نکل کر اعظمی صاحب
جب علی گڑھ پہنچے تو وہاں جدید ادب اور جدید افکار و خیالات
رکھنے والے نوجوانوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ چنانچہ شعر و ادب
کے دلدادہ نوجوانوں نے مل کر علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین
کی بنا ڈالی اور ہر ہفتہ اس کے جلسے ہونے لگے۔ اس وقت ترقی
پسندی کا تصور محدود نہیں تھا جیسا کہ بعد میں قرار دیا گیا۔ اسی
وجہ سے انجمن کے جلسوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، اختر
انصاری، معین احسن جذبی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی،
ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام اور اسلوب احمد
انصاری جیسے مستند اہلِ قلم اور مختلف الخیال حضرات بھی
شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں اعظمی صاحب اور ان کے
رفقا اپنی تخلیقات نظم و نثر پیش کرتے تھے جن پر تنقیدیں
اور مباحثے ہوتے تھے۔ اس طرح نوجوان فنکاروں کی
تربیت ہوتی رہی لیکن یہ سلسلہ تادیر برقرار نہ رہ سکا اور
تقسیم کے المیہ نے یہ ساری بساط الٹ دی۔

اسی دوران ستمبر ۴۷ء میں بلوائیوں نے خلیل الرحمن اعظمی
کو دلی سے علی گڑھ آتے ہوئے زد و کوب کرکے اور انھیں مردہ
سمجھ کر ٹرین سے باہر پھینک دیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی
منظور تھا۔ اعظمی صاحب نے بقول خود

"اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس
منظر کی تاب نہ لا سکا، ہوش آیا تو اپنے آپ کو جامع مسجد
کے ایک ریلیف کیمپ میں پایا اور پھر اس کے بعد جامعہ ملیہ
میں تین مہینے تک حیات و مرگ کی کشمکش میں مبتلا رہا۔"

غرض اس ہنگامۂ حیات سے جانبر ہونے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء
میں علی گڑھ واپسی ہوئی۔ لیکن اس سنگین حادثے کا اثر ذہن و
دماغ پر بہت گہرا تھا جو دھیرے دھیرے کم تو ہو گیا لیکن اس
کے اثرات ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے۔ علی گڑھ
واپسی کے بعد اعظمی صاحب کو ایک تکلیف دہ ذہنی تنہائی
کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام اہلِ قلم دوست احباب بچھڑ چکے تھے،
پرانی صحبتیں یادِ ماضی بن چکی تھیں، ایک عجیب ویرانی اور
تنہائی کی ہر چہار سو حکمرانی تھی کہ ع

اس آشیاں میں صدا دی، اُدھر پکار آئے

ذہنی تنہائی کے اس سفر میں اعظمی صاحب کو "کلیاتِ میر" کے
مطالعے نے سہارا دیا۔ وہ کہتے ہیں

"میر سے میری شناسائی ایک اتفاقی حادثہ تھا وہ
ایک خاص کیفیت میں میرے غم گسار بن گئے اور میں
ان کی صحبت میں بیٹھ کر تنہائی کے عذاب سے نجات
حاصل کرنے لگا۔ مجھے ان کے یہاں غم پرستی کے بجائے
غم سے نبرد آزما ہونے اور اس کے زہر سے امرت نکالنے کا
سلیقہ نظر آیا۔ مردم بیزاری اور کلبیت کے بجائے انسان
دوستی، فراخ دلی، وسیع المشربی زندہ رہنے اور زندگی
سے نباہ کرنے کا ہنر دکھائی دیا۔"

اعظمی صاحب نے اپنی تنہائی، اضطراب اور ذہنی انتشار
کے عالم میں میر صاحب کو اپنا مونس و غم خوار تو بنا ہی لیا تھا۔
اسی کے ساتھ یونیورسٹی کے نئے موسم میں ایک بار پھر باذوق
نوجوانوں کے قافلے علی گڑھ پہنچے تو ترقی پسند ادیبوں کی انجمن
از سرِ نو قائم ہوئی جس کی تمام تر ذمہ داریوں کا بار اعظمی صاحب
کے کاندھوں پر ڈالا گیا۔ اس انجمن کے اصول و ضوابط طے کر دیے
گئے تھے۔ چنانچہ اس کا دائرہ کار محدود ہو گیا تھا جس کے اندر

رد کر اعظمی صاحب کی اپنے فنکار کی آزادی اور خودداری خطرے میں پڑ گئی۔ ان کا ذہن اور مزاج ترقی پسندی کے ان اصولوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ فروری ۱۹۴۹ء میں کل ہند انجمن کی پالیسی کے پیش نظر اُسے غیر قانونی قرار دے دیا گیا اس لیے علی گڑھ شاخ کے سکریٹری ہونے کے ناطے اعظمی صاحب کو قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ چار مہینے بعد رہائی ملی بھی تو انھیں پھر تنہائی کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا، زیادہ تر وقت سڑکوں پر بے مقصد پھرنے، راتوں کو دیر تک جاگتے رہنے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے میں گزر رہا تھا۔

اب وقت وہ تھا کہ اعظمی صاحب ایم۔ اے کر چکے تھے اس لیے ذمہ داری کے احساس کے تحت ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ عارضی طور پر "علی گڑھ میگزین" کی ایڈیٹری مل تو گئی لیکن اس کی ذمہ داریاں نبھانا بھی آسان کام نہ تھا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں اعظمی صاحب نے تلاش معاش میں بمبئی جا کر قسمت آزمائی کی لیکن چند ماہ کی آوارہ گردی کے بعد ناکام لوٹنا پڑا پھر ضلع مظفر پور کے ایک گاؤں میں اپنے دوست ناشاد کے ساتھ بے کاری اور بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے کہ تخلیقی صلاحیتوں کے کچھ سوتے موجزن ہوئے۔ اس سے قبل عرصہ سے کاروبار شوق بند تھا۔ انھیں احساس ہوا کہ کچھ کہنے اور لکھنے کی تحریک انھیں مل رہی ہے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شفیق استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کا بلاوا آ گیا کہ تم فوراً یہاں چلے آؤ شعبہ اردو میں ایک عارضی جگہ نکل آئی ہے چنانچہ اعظمی صاحب علی گڑھ پہنچ گئے اور تخلیقی صلاحیتوں کے جو سوتے ابھر ابھر کر دب سے جاتے تھے انھیں بروئے کار لانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔

شعر گوئی میں خلیل الرحمن اعظمی کا لہجہ اپنی ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز، نشتریت اور چبھن کی کیفیت میر تقی میر کی یاد دلاتی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ رجحان غالباً اپنی ذہنی کیفیات کے اندر شکست و ریخت اور زمانہ و ماحول سے نظریاتی تصادم کی بدولت در آیا ہے۔ حالات کی یکسانیت اور ہم آہنگی نے انھیں میر کا ہمنوا بنا دیا تھا۔ مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک شریف النفس خوددار اور غیور انسان واقع ہوئے تھے۔ ذہنی و فکری طور پر وہ ایک ایسی زندگی کے قائل اور آرزومند تھے جس کا ٹکراؤ ہمیشہ سماج اور ماحول سے رہا۔ لیکن تصادم اور کشمکش کے اس ماحول میں وہ سخت سے سخت حالات سے نبرد آزما رہے۔ اپنے اندر کے خوددار اور شریف النفس انسان کو کبھی انھوں نے ایسی جگہ لا کر کھڑا نہیں کیا کہ اُسے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔ آخر دم تک ان کی شان کجکلاہی میں فرق نہ آیا۔ انھوں نے جس وقت شعر و سخن کے گیسو سنوارے اس وقت ترقی پسند ادب کا زمانہ عروج پر تھا۔ کسی حد تک وہ بھی اس کے ساتھ رہے لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ ترقی پسندی ان کے جذبات و خیالات کی عکاسی اور آزادانہ ترجمانی کی راہ میں حائل ہوتی جا رہی ہے تو وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنے فکر و فن کا چراغ علاحدہ روشن کیا۔ دوست احباب نے طرح طرح سے الزام تراشیاں کیں انھیں اپنے ڈھرے پر لگانا چاہا لیکن انھوں نے کبھی فارمولہ اور فیشن کے طور پر شعر و ادب میں کوئی روش آنکھ بند کر کے نہیں اپنایا بلکہ ہمیشہ اپنے جذبات و خیالات کی قدر کی اور اپنی بصیرت کو رہبر بنا کر اپنی راہ چلے اور دوسروں پر اپنے فیصلوں اور نظریوں کو زبردستی لادنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انھیں خصوصیات کی بدولت ارباب فکر و نظر ان کے کلام کی خوشبو تازگی اور سچائی پر جان دیتے ہیں۔

آئینہ خانے میں: اعظمی صاحب کی ابتدائی دور کی ایک طویل نظم ہے جسے انھوں نے بعد میں مسترد کر دیا تھا۔ اس کی تخلیق کا زمانہ ۱۹۵۰ء کا ہے۔ تخلیق نظم سے قبل اعظمی

صاحب کی ملاقات مشہور ترقی پسند شاعر نیاز حیدر سے ہو چکی تھی جن کی شعلہ مزاجی اور جذبۂ حریت سے وہ بیحد متاثر تھے۔ اعظمی صاحب نے ان کی گرفتاری کی خبر سنی تو بیتاب ہو اٹھے اور یہ طویل نظم معرض وجود میں آئی۔ اس نظم میں ٹرین سے باہر پھینک دیے جانے اور قید و بند کی زندگی کے واقعات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ نظم کا انداز بیانیہ اور خطیبانہ ہے، جوش و جذبہ کی فراوانی ہے — کہ اس وقت کے ترقی پسند شاعروں کی تخلیقات میں عموماً یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بہرحال اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

بڑھ کے تاریک صنم خانوں کو مسمار کرو
پھونک دو بڑھ کے کوئی صور کہ آدم کی زمیں جاگ اٹھے
آج دیرینہ خداؤں سے بھی لینا ہے حساب
آج شیطان کے چہرے سے الٹنی ہے نقاب

کاغذی پیرہن: ان کا پہلا مجموعہ کلام جس میں اعظمی صاحب کے داخلی جذبات و احساسات کی فراوانی ہے اور میر کے انداز کی خود کلامی بھی پائی جاتی ہے۔ مجموعہ کلام کی اشاعت کے وقت خلیل صاحب کی عمر زیادہ نہ تھی تاہم وہ زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے، ان کا شعور بالیدہ ہو چکا تھا جیسا کہ خود انھوں نے اس کے دیباچے میں اپنے متعلق تحریر کیا ہے:

"اس کی عمر یہی چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ مگر کوئی اس سے پوچھتا ہے، تو کہتا ہے، کیا کروگے پوچھ کر؟ میرے ہر سال میں کئی کئی عمریں چھپی ہوئی ہیں، میں اب تک اپنی زندگی میں کئی بار مر چکا ہوں۔ نوجوان ورتھر کی طرح میں نے بھی خودکشی کی ہے، رام چندر کی طرح بن باس لیا ہے، یوسف کی طرح زنداں میں ڈال دیا گیا ہوں۔ میرے گھر کی دیوار یں میری راہ تکتے تکتے اندھی ہو گئی ہیں، میرا دامن بار ہا چاک ہو چکا ہے۔ مسیح کی طرح مجھے بھی صلیب پر لٹکایا گیا ہے اور مجھے دیوداس کی طرح ناکامی کے زہر کا پیالہ پینا پڑا ہے۔"

اس مجموعۂ کلام کی دو نظموں کے اقتباس ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں نے اشک بوئے تھے
جن فسردہ آنکھوں میں
اُن سے خون رِستا ہے
اُن سے آگ بہتی ہے

.......(آخری رات)

تمھاری ہر غزل میں میر کا انداز ملتا ہے
ہر اک مصرعے سے جیسے دھیمی دھیمی آنچ آتی ہے
تمھارے شعر پڑھ کر جانے کیا محسوس ہوتا ہے
کہ کوئی ساز پر مدھم سُروں میں گنگناتا ہے

.......(نیا جنم)

نیا عہد نامہ: اعظمی صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۳۷ غزلیں ۲۴ نظمیں اور ۴ ہجویات شامل ہیں۔ اعظمی صاحب کے پہلے اور دوسرے مجموعۂ کلام کے درمیان دس سال کا فاصلہ ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے فکر و فن کی جو راہیں طے کی ہیں اور جو اثرات قبول کیے ہیں اس میں آتش کے بعد میر، ظفر اور فانی سے مطابقت کے انداز پائے جاتے ہیں۔ کچھ غزلوں کے اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:—

نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں
زندگی آج تلک کیسے گزاری ہے نہ پوچھ
زندگی ہے تو ابھی کتنے مزے اور بھی ہیں

ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھر نہ ہو سکا
میرا لہو بھی پی کے نہ دنیا جوان ہوئی
قیمت مرے جنوں کی برابر نہ ہو سکا

تیری گلی سے چھٹ کے نہ جائے اماں ملی
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہو سکا

تجھ سے بچھڑ کے دل کی صدا کو بہ کو گئی
لے آج دردِ عشق کی بھی آبرو گئی
روٹھی تو خوب روٹھی رہی ہم سے فصلِ گل
آئی تو پھر نچوڑ کے دل کا لہو گئی
سینہ لہو لہان تھا ہر ہر کلی کا آج
بادِ صبا چمن سے بہت سرخرو گئی

ہر خار و خس سے وضع نبھاتے رہے ہیں ہم
یوں زندگی کی آگ جلاتے رہے ہیں ہم
شیرینیوں کو زہر کے داموں میں بیچ کر
نغمے حیات نو کے سناتے رہے ہیں ہم

کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرا تھا
یاد آتا ہے کہ اک خواب کبھی دیکھا تھا
جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے اسی مٹی میں مرا سونا تھا

خود چلے آؤ یہاں، یا کہ صدا دو ہم کو
ہم گنہگار تمھارے ہیں دعا دو ہم کو
یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردشِ دوراں سے بتا دو ہم کو

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
وہ فاتحِ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

وہ رنگِ رُخ وہ آتشِ خوں کون لے گیا
اے دل ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا
جو شمع اتنی رات جلی کیوں وہ بجھ گئی
جو شوق ہو چلا تھا فزوں کون لے گیا

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

دل کی رہ نہ جائے نہ دل میں یہ کہانی کہہ لو
چاہے دو حرف لکھو چاہے زبانی کہہ لو
ہم پہ جو گزری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

اعظمی صاحب کے بارے میں اردو کے بلند پایہ ناقد پروفیسر آل احمد سرور کی رائے یہ ہے:

"اعظمی صاحب کی اپنی آواز ہے، اپنا لب و لہجہ اور اپنا آہنگ یوں ان کے یہاں میر کی سی نشتریت بھی محسوس ہوتی ہے مگر یہ اس دور کے مسائل اور معاملات کے شعور نے اس نشتریت میں ایک نئی نوک پیدا کر دی ہے۔ ..... فیشن یا فارمولے سے ہٹ کر اعظمی نے معنی خیز اور قابلِ قدر شاعری کی ہے۔ اس کے اسلوب میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے دلنشیں کی سی روانی ہے۔ اُن کے خوابوں اور دھندلکوں میں زندگی کا چہرہ کچھ اور روشن نظر آتا ہے۔"

شعر و شاعری کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو تنقید و تحقیق کے باب میں گرانقدر اور بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اردو کے صفِ اول کے مستند اور معتبر ناقد و محقق ہیں۔ "زمانہ طالب علمی میں ہی" مقدمہ کلام آتش

لیکن انھوں نے علامہ نیاز فتح پوری جیسے سخت گیر ناقد
سے خراج تحسین وصول کیا۔ ان کا مطالعہ بحید وسیع تھا۔
وہ اردو کے کلاسیکی ادب سے بھرپور آگہی رکھتے تھے۔ اس
کے علاوہ عہد بہ عہد کی تحریکات اور معاصر زبان وادب کے
میلانات ورجحانات پر ان کی گہری نظر تھی اسی کے ساتھ
عالمی ادب کے نشیب وفراز اور میلانات ورجحانات سے وہ
واقف تھے۔ ان کی بیدار مغزی اور بصیرت وبصارت کا یہ
عالم تھا کہ وہ زبان وادب کے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر اپنی
ایک ٹھوس رائے رکھتے تھے۔ موضوعات ورجحانات کے
تمام پہلوؤں پر وہ کھل کر بحث کر سکتے تھے۔ ادب وشعر کے
کسی بھی نئے اور نازک موڑ پر انھوں نے نئی نسل کی رہنمائی
اور تربیت کی ذمہ داریاں کما حقہ ادا کیں۔ ان کے مدلل،
متوازن اور فکر انگیز تنقیدی مضامین پر مشتمل متعدد مجموعے
اہل فکر ونظر سے اپنی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرا چکے ہیں۔

فکر وفن: اعظمی صاحب کے تنقیدی مضامین کا
پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس
میں قدیم وجدید شعراء غالب، ظفر، درد، حسرت، داغ،
مومن، جوش، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی پر مضامین
شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمے میں اعظمی صاحب نے
اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"ماضی وحال کے ادبی کارناموں کی چھان بین اور ان کے
مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی مجھ میں عادت سی رہی
ہے۔ ایسے لمحوں میں اپنے بعض نتائج کو پیش کرنے
کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہے یہ مضامین اسی وقت
لکھے ہیں جب میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس کہنے کے
لیے کوئی بات ہے۔ خارجی دباؤ یا فرمائش پر لکھنے
سے میں ہمیشہ جی چراتا ہوں ——"

علی گڑھ کی چند شخصیتیں: ۱۹۵۶ء میں نقوش لاہور کے
شخصیات نمبر کے لیے اعظمی صاحب نے خاکے بھی لکھے جو اپنی
جگہ پر خاکہ نگاری کی ضروریات کے مطابق بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

نوائے ظفر: بہادر شاہ ظفر کے کلام کا انتخاب کر کے اسے
اپنے فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ شائع کرنا بھی اعظمی صاحب کا ایک
کارنامہ ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے محمد حسین آزاد کے اس
قول کی تردید کی ہے جس میں انھوں نے ظفر کو شعر گوئی کے لیے
نااہل قرار دے کر ان کے سارے کلام کو ذوق کی کاوش اور
نتیجۂ فکر قرار دیا تھا۔ اعظمی صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ
ظفر کا رنگ شاعری بالکل جداگانہ ہے۔ اگر ذوق بھی اس
رنگ میں شعر گوئی کی کوشش کرتے تو ناکام رہتے۔

زاویۂ نگاہ: اعظمی صاحب کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ
ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ غالب صدی تقریبات کے
موقع پر علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اعظمی صاحب کا
ایک قابل قدر مضمون "یک عمر ناز شوخی عنواں اٹھائیے" شامل
ہے جس میں ایسی دو سو کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن
کے نام کلام غالب سے ماخوذ ہیں۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل صاحب کا وہ
تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ایوارڈ
ہوئی۔ اس مقالے کو انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۷۳ء میں
کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس مقالے میں خلوص اور دیانتداری
کے ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک کے تمام پہلوؤں پر روشنی
ڈالی گئی ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

"خلیل الرحمن اعظمی نے اس تحریک کے ادبی تقاضوں
اور اردو شعر وادب پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے
انھوں نے اس موضوع پر یقیناً اہم مواد تاریخی تسلسل
کے پیش نظر جس محنت اور وقت نظر سے جمع کیا ہے
وہ قابل ستائش ہے۔"

اس کتاب کے واسطے سے خلیل الرحمن اعظمی کی طرز تنقید و
تحقیق اور انداز نگارش پر مجنوں گورکھپوری کی رائے
یہ ہے:-

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں پہلی مرتبہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس تحریک کے محرکات و عوامل اور اس کی سمت و رفتار کا مطالعہ بڑی دیدہ وری کے ساتھ کیا ہے اور اس کے ادبی اکتسابات کا بے لاگ اور منصفانہ جائزہ لیا ہے۔

سب سے زیادہ قابل تعریف پہلو اس مقالے کا یہ ہے کہ لکھنے والے کو اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ اس نے مروجہ اور مسلمہ افکار و آرا کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینے کے بجائے انھیں نئی معلومات کی روشنی میں از سر نو جانچا اور پرکھا ہے اور نئے اور بہتر نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید کا یہی اصل مقصد بھی ہے۔ مقالہ نگار نے ہر طرح کی مروت اور مصلحت کو پس پشت ڈال کر بڑی بے خوفی اور جرأت کے ساتھ معاصر ادیبوں اور شاعروں کا جائزہ لیا ہے اور انھیں ان کے صحیح مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا ہے۔

مقالہ نگار کو نثر لکھنے کا قرینہ آتا ہے۔ اسلوب تحریر میں علمی متانت کو برقرار رکھتے ہوئے تازگی و طرفگی اور برجستگی و خوش گفتاری کے نشانات قدم قدم پر ملتے ہیں اور ہم بعض امور میں اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی لکھنے والے کی صحبت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو نوجوان لکھنے والوں میں اب جنس کمیاب کی حیثیت رکھتی ہے۔"

نئی نظم کا سفر: ۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کی اردو نظموں کا ایک انتخاب ہے جسے خلیل الرحمٰن اعظمی نے پروفیسر منیب الرحمٰن اور ڈاکٹر وحید اختر کے تعاون سے ترتیب دے کر ایک جامع مقدمہ لکھ کر شائع کیا جس میں اردو نظم کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مضامینِ نو: ۔ خلیل صاحب کے تنقیدی مضامین کا آخری مجموعہ ہے جسے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے [illegible]ء میں شائع کیا۔ کتاب کے شمولات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ مضامین ۲۔ مسائل ۳۔ تبصرے اور شخصیات۔ اس کتاب کے مطالعے سے خلیل الرحمٰن اعظمی کی گوناگوں علمی، ادبی، تنقیدی و تحقیقی بصیرتوں کا پتہ چلتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ۱۹۴۰ء میں اپنی موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس کی بھیانک شکل ہمیشہ ان کی نگاہوں میں رہی اور فروری ۱۹۷۶ء میں بلڈ کینسر میں مبتلا ہونے کے ساتھ ہی موت کے سائے انھیں نظر آنے لگے تھے۔ زندگی سے نباہ کرنے کا گر تو انھوں نے سیکھ ہی لیا تھا اور زندگی کو اپنی سخت جانی کا یقین بھی دلایا تھا مگر آخری دنوں میں جب ان کی جاں لب زندگی پر موت کے سائے گہرے ہوتے گئے تو زندگی کی عظمت کا اعتراف اور اس سے محبت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔ ایسے عالم میں لکھے گئے گیتوں میں اپنی زندگی کا مرثیہ اور غزلوں میں بانسری پر موت کا نغمہ ایک صدائے جاودانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتبہ

شکستہ ہو چکے اب بادباں سفینے کے
مرے لہو کا سمندر بلا رہا ہے مجھے
مری رگوں میں مچلنے لگے ہیں وہ قطرے
جو دودھ ماں نے مجھے پیار سے پلایا تھا
نہ رت جگوں کی وہ دستک، نہ نیند کی آہٹ
بس اک سکوت صدا ہے جو مجھ سے رہ رہ کر
یہ کہہ رہا ہے کہ لو آ رہی ہے منزل شب
مرے رفیق، مرے ہمسفر کہاں ہیں سب
کوئی یہ جا کے کہے ان سے یہ مرا پیغام
کہ ایک کتبہ بنائیں مری لحد کے لیے
ہو جس پہ درج کہ وہ شخص سو رہا ہے یہاں
کہ اپنا دوست تھا، پر اس کا کوئی نام نہ تھا

وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ اپنی رہائش گاہ پر علماء سے ملاقات کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نانپارہ ضلع بہرائچ میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۰ کو شراوستی دیہی بینک کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں سیلاب زدہ افراد کو پانچ پانچ سو روپے بطور امداد دیتے ہوئے۔ تصویر میں ڈویژنل وزیر شری پرویز کمار شاہی نظر آ رہے ہیں۔

ندوی کے کام کا ایک مرکز (دارانس)

وزیر ریاست برائے اطلاعات و منصوبہ بندی شری کاشی ناتھ مصر لکھنؤ میں مولانا محمد علی جوہر پر شائع ہونے والے ایک سوونیر کی ر
کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے

ناتھ پرتاپ سنگھ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو موضع بہادر پور ضلع بہرائچ میں ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات کا افتتاح کرتے ہوئے

امداد باہمی کتائی مل (اٹاوہ)

وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ گاندھی جینتی کے موقع پر ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو سوچنا کیندر لکھنؤ میں دلہن کے لیے کتاب کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ نے ایک کوی سمیلن کا افتتاح بھی کیا۔

وزیر صنعت شری نیاز حسن ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں اترپردیش پیتل صنعت کارپوریشن (مرادآباد) کے زیر اہتمام منعقدہ ایک نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش دیکھتے ہوئے۔

غزلیں

ڈاکٹر احسن رضوی
صدر شعبۂ انتھالوجی نریندر دیو زرعی
یونیورسٹی، فیض آباد

گردشِ وقت نے دکھلائے زمانے کیا کیا
بوجھ اٹھاتے رہے اک شخص کے شانے کیا کیا

کب جسارت ہوئی اتنی کہ عمل پیرا ہوں
یوں تو سنتے رہے بزرگوں کے فسانے کیا کیا

خود کو آسودہ بنانے کے بہانے یارو
سازشیں کرتا رہے یہ جسم نہ جانے کیا کیا

دن میں پھر تلخ حقائق سے ملانی ہے نظر
رات آنکھوں میں رہے خواب سہانے کیا کیا

ایک جانب ہیں رسائل تو کتابیں اک سمت
میں بھی رکھتا ہوں میاں اپنے سرہانے کیا کیا

عہدِ ماضی کی طرف دیکھوں تو محسوس کروں
میں بھی کرتا رہا جینے کے بہانے کیا کیا

جعفر عسکری
۱۰ نور اللہ روڈ الٰہ آباد

اپنی اپنی ضربتیں ہیں اپنا اپنا درد ہے
بس ہمارے درد میں شامل پرایا درد ہے

ہجر میں بھی قربتوں کا ذائقہ کم نہ ہوا
نقشِ جاں پر اب بھی اس کا میٹھا میٹھا درد ہے

ہم جہاں دیدہ ہوئے کر کے سرابوں کا سفر
اب ہمیں بھی ہے خبر صحرا بہ صحرا درد ہے

اُن کے چہروں پر بھی رقصاں خواہشوں کی ہے دمق
موجِ زن جن کی رگوں میں پیلا پیلا درد ہے

رنگ و روغن جب میسر ہی نہ ہوں پوچھو نہ پھر
کیوں بنی ہر ایک تصویر سراپا درد ہے

کیا بتائیں ضبط کی اپنے بنا ہے پائیدار
ورنہ ہر لحظہ ہمیں بھی انتہا کا درد ہے

مشترک جاگیر ہے سب خستہ حالوں کی تو تم
اب نہ کہنا یہ ہمارا، وہ تمہارا درد ہے

یہ وہ کشتی ہے کہ جو غرقاب ہو سکتی نہیں
بحرِ غم میں بے سہاروں کا سہارا درد ہے

ہے عیاں دونوں کے چہروں سے گرانی جبر کی
ہم نے اس نے ساتھ ہستی کا اٹھایا درد ہے

کون سمجھا اس کے اندازوں کو جعفرؔ سر بسر
ہے کبھی قاتل کبھی اپنا مسیحا درد ہے

شمس تبریز خاں
۵۰/۱۲ مکارم نگر لکھنؤ

مولانا سید فخر الدین خیالی اور اُن کا کلام

اُردو ادب کی تاریخ میں ابھی تک توازن و اعتدال کی روش قائم نہیں ہو سکی ہے، اور صحیح تعمیری تنقید کا بھی فقدان نظر آتا ہے، جس کے باعث جب کسی خاص سبب سے کوئی شاعر و ادیب مشہور ہو جاتا ہے، تو اس کا نام ادبی تاریخ میں شامل کر لیا جاتا ہے ورنہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہمارے ناقدین کے معیار انتخاب میں کسی شخصیت کی "شہرت" سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے جبکہ اصل معیار لیاقت و اہلیت، ادبی خدمات، ذہنی پختگی، وسعت نظر اور تخلیقی صلاحیت اور فنکارانہ عظمت ہونی چاہیے۔ اردو کی عام تنقیدی روش کے نتیجہ میں کلاسیکی دور سے اب تک بہت سے شاعر و ادیب حقیقی قدر دانی اور اپنے کلام کی صحیح و منصفانہ تنقید اور اپنے جائز ادبی مقام سے محروم چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے ایک مستند مفصل اور مثالی و معیاری "تاریخ ادب اردو" کا خانہ خالی ہے۔ اور اردو ادب اپنے صاحب نظر انصاف پسند اور جوہر شناس مؤرخ کے انتظار میں ہے[1] یعنی بقول اقبال ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

تاریخ ادب کے انہی مظلوموں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ کے باکمال فرد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی بھی ہیں جو عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے شاعر و ادیب تھے اور فارسی نظم اور اردو نثر میں ان کی بڑی گرانقدر خدمات ہیں، اس لیے یہاں ان کا تعارف اور ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے[2] مولانا خیالی حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلویؒ (م ۱۰۹۶ھ) کے خاندان میں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد مولانا سید عبد العلی بھی ایک درویش سیرت بزرگ تھے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد لطف نصیر آبادی، مولانا سید محمد ظاہر اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی تھے، اردو شاعری میں منشی امیر اللہ تسلیم (م ۱۳۲۹ھ) کے شاگرد تھے۔ ناگور (مدھیہ پردیش) حیدرآباد بھوپال اور ٹونک میں ملازمت کے سلسلے میں رہے اور وسطی و جنوبی ہند کا دلچسپ سفر نامہ فارسی میں لکھا۔ جس میں وہاں کی تاریخی عمارات اور ممتاز شخصیات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ لکھنؤ کے قیام میں وہ ہفتے میں ایک بار تسلیم کی خدمت میں جا کر اپنے کلام پر اصلاح لیتے اور ان کی صحبت سے مستفید ہوتے اور ہر پندرھویں کو ان کے ساتھ نواب مرزا محمد تقی کے مشاعرے میں نصف شب تک شریک رہتے جس میں منشی فدا علی عیش، میر کے فرزند میر کلو عرش، میر خطا شاگرد ناسخ، میر اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی، میاں عصمت ریختی گو، مرزا پھو بیگ عاشق جیسے اساتذۂ وقت اور دوسرے شعراء شریک ہوتے تھے۔[3]

آخری ایام میں اپنی عزلت پسندی کی وجہ سے خانہ نشین رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے فارسی میں ایک مختصر

اسلامی انسائیکلو پیڈیا" بحر جہاں تاب" کے نام سے تقریباً ۱۴۰۰ صفحات میں لکھی جو پہلی جلد تھی دوسری جلد کے بارے میں ان کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں:

"دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا یہ جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کو زمانے نے ورق الٹ دیا ہے اور چند دنوں میں کوئی اس کا سمجھنے والا بھی باقی نہ رہے گا اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہو گئی چند دنوں کے لیے قلم رکھ دیا پھر اپنی گزشتہ محنت پر تاسف ہوا اور اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا دس بارہ جزو لکھ چکے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔" [۵۹]

ان کی فارسی کتابوں میں 'سیرۃ السادات' اور 'سیرۃ علمیہ' بہت اہمیت کی حامل ہیں، اردو میں 'منتخبات خیالی' ان کی نعتوں کا مطبوعہ مجموعہ ہے، جس سے بامقصد نعت گوئی کا ایک نیا انداز ظاہر ہوتا ہے اس سلسلے کی اور کتابیں 'واردات خیالی' وغیرہ غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک غیر مطبوعہ کتاب 'آئینہ خیالی' ہے جو اردو لغات و محاورات کا فارسی ترجمہ ہے، 'خطرات خیالی' متفرق نعتوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔

مسدس حالی کے جواب میں انھوں نے 'مسدس خیالی' لکھی جس میں مولانا حالی کی دعوت تجدد پر گرفت کی ہے اور مسلمانوں کو راسخ العقیدگی کی دعوت دی ہے زبان و بیان سادہ اور رواں رواں ہے اور اپنے صالح خیالات و جذبات کے لیے بہت قابل قدر ہونے کے باوجود اس کا فنی پایہ مسدس حالی سے کہیں کمتر ہے۔ 'ماہ و خورشید'، 'بہار تسلیم' اور 'دفغان نغز' طویل مثنویاں ہیں جن میں فنی خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی مخرب اخلاق تفصیلات سے پاک ہیں — مثنوی پر ان کی استادانہ مہارت نسیم و تسلیم کی قائم کردہ روایت کا ثمر تھی، انھوں نے اسی قادر الکلامی کے سبب ملا علی قاری کی 'الحزب الاعظم' کا بڑے سائز کے ۴۸ صفحات میں منظوم اردو ترجمہ 'مجمع البحرین' کے نام سے کیا، 'طلسم خیالی' ۱۲ صفحات کا ایک طویل ترکیب بند ہے انھوں نے حمد و نعت کے پانچ مجموعے تیار کیے تھے جن کی مجموعی ضخامت تقریباً پانسو صفحات تھی، ان کی غزلوں، مثنویوں، مسدس، ترکیب بند و ترجیع بند اور قصائد پر مشتمل کلیات کی بھی تقریباً اتنی ہی ضخامت ہے۔ حمد نگاری اور نعت گوئی میں انھوں نے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر نعت گوئی کے حقیقی آداب اور اس کی معنویت اور نزاکتوں کو بخوبی برتا ہے وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر حسنیؒ کے خلیفہ تھے اور ان کی تحریک جہاد، اصلاحی دعوت اور ثقافتی انقلاب سے بہت قریبی واقفیت اور اس سے محبت رکھتے تھے۔ اس لیے حمد و نعت ہی نہیں بلکہ شعر و ادب کی تقریباً تمام اصناف میں انھوں نے صالح، تعمیری اور یقین آفریں خیالات و رجحانات کی ترجمانی کی ہے، اور داغ و امیر کے روایتی انداز تغزل کے کمزور پہلوؤں سے بچتے ہوئے مومن اسکول اور دبستان دہلی کے خلوص و دردمندی، واقعیت و داخلیت اور رعنائی و برنائی کے گل بوٹے کھلائے ہیں —

ہندوستان کی ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک سے متاثر اور عملی طور پر احسان و تصوف کے طریقے پر عمل پیرا ہونے کے سبب ان کی شاعری میں بھی روحانیت و ماورائیت، صداقت احساس، صحت فکر و خیال اور جذبہ و وجدان کی بہت سچی تصویریں سامنے آتی ہیں۔

ان کی قابل قدر اور لائق احترام شخصیت کا اندازہ ان کی سیرت سے ہوتا ہے جس سے ان کا فکری و فنی پس منظر سامنے آجاتا ہے، ان کے لائق فرزند مولانا سید حکیم عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں "مزاج میں خاموشی، متانت، علم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی۔ برادرانہ جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔ ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن اچھی طرح سے ملتے اور

کسی سے [illegible] کہتے۔ صبر و قناعت کی صفت ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی۔ تمکنت اور غرور ان کو چھو نہیں گیا تھا، ایک چادر یا کمبل رات کے وقت آتا تو گھر سے باہر نکل کر اس کا حال پوچھتے اگر وہ کسی مریض کو دکھانے لے جانا چاہتا تو اسی وقت اس کے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اس کو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے۔" ؎ وہ پھر آگے لکھتے ہیں :-

"...... ان کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کسی نے کم جانا اور بااین ہمہ کمالات عملی و علمی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے اور آخر کار ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کو تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر وفات پائی۔" ؎

وہ اردو کے علاوہ فارسی کے بھی قادر الکلام شاعر تھے اور متعدد فارسی قصائد اور غزلیں ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔

اردو کے تمام اصناف کلام پر ان کو استادانہ قدرت حاصل تھی مگر غزل، مثنوی، مسدس، ترکیب بند اور قصیدے پر خصوصی دسترس تھی۔ نعت گوئی سے خاص شغف تھا اور اس میں ان کا مخصوص طرز نظر آتا تھا۔ انھوں نے اس فن شریف میں ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ آپ کے معاصر لالہ سری رام نے اپنے تذکرے میں آپ کا ذکر کیا ہے اور نمونہ کلام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "...... شاعری میں آپ کا انداز کلام نیر سے ملتا ہے، فارسی اور اردو دونوں میں فکر سخن کیا کرتے تھے۔

کلام سے علمی قابلیت مترشح ہوتی ہے۔" ؎

اور بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے مولانا عبدالحئی صاحب کی "گل رعنا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ارثاً ملا ہے جو اردو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور نمونۂ کلام انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔" ؎

ان کے فارسی رنگ سخن کا اندازہ ان کے قصائد کے مطلعوں اور غزلوں کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے، اگر وہ فارسی نثر کی طرح نظم کی طرف بھی متوجہ ہوتے تو اس میں اپنا رنگ پیدا کر لیتے اور اپنے معاصر فارسی گویوں کے مقابل ہوتے۔ ان کے فارسی قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں :

اے بجسم ساتگیں از بادہ جاں انداختہ
مرزباں از نکتۂ اندر زباں انداختہ

رفتم اے آز زباب تو بجز ماں رفتیم
خلعت آرزو آوردم و عریاں رفتیم

فارسی غزلوں کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :

چمن نادیدہ دام صید در با ہم رسید اینجا
تمنائے تماشائے گلم بیخود کشید اینجا

پر و بالم بیک پرواز صیادے شکست اکنوں
کرا باشد بہ پرواز دگر اے دل امید اینجا

زود آئی کہ یاد بت بجبین دل و جاں ست
مشتاق قدوم تو بہر سو نگراں ست

دل پر آبلہ می داشت آب و زبیے کیفی
نگاہ چشم مستش را بدل جا داد و صہبا شد

جاں را بہ برق جلوۂ جانانہ سوختیم
شوقش زبانہ زود مستانہ سوختیم

تاب سخن نماند بس ایں ست مختصر
با شمع ساختیم و چو پروانہ سوختیم

بہ تمنائے تماشش نہ بیند خود را
چلنم جادۂ ایں دیدۂ دیدار طلب

اردو غزل گوئی میں وہ دبستان دہلی اور مومن اسکول کے پیرو ہیں اس لیے ان کے یہاں مرزا مظہر جان جاناں رح، خواجہ میر درد، انعام اللہ خاں یقین، مومن اور تسلیم و تسلیم کی کیفیات و خصوصیات جا بجا ملتی ہیں۔ صاحب سلسلہ صوفی اور درویش صفت ہونے کے سبب سے ان کے کلام میں تصوف کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور خیالات و جذبات میں رفعت و طہارت اور نزاکت و نفاست کا احساس

ہوتا ہے۔

اہلِ کمال کی سنتِ دیرینہ ان کے حصے میں بھی آئی تھی اور وہ اپنی علمی لیاقت کے باوجود عمر بھر بے سروسامانی کے عالم میں رہے۔ اس ذاتی تجربے کے سبب دل گداختگی اور جگر برگشتگی، طبیعت کے سوز و گداز، دنیا کی بے ثباتی و بے بضاعتی اور ابنائے دنیا کی کم نظری و ظاہر داری اور فطرتِ انسانی کی بے چارگی و بے مائیگی کے واضح شعور نے انکے تغزل میں شعوری پختگی اور بالغ نظری پیدا کر دی ہے اور ان کے احساسات درد و کرب، غم و الم، یاس و حرماں اور گردشِ روزگار کی آنچ میں تپ کر نکھر گئے ہیں۔ مگر خوبی یہ ہے کہ ان منفی احساسات نے ان کے ذہن کو ماؤف و مفلوج نہیں کیا ہے بلکہ اسے شعور و بیداری عطا کی ہے جس سے وہ حیات و کائنات کے بہت سے گوشوں کی پردہ کشائی کرتے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک عاشق وعارف کی طرح غم نے انھیں وہ نگاہ بصیرت عطا کی ہے جس سے وہ حیات و کائنات کے مظاہر و مناظر میں الجھنے کے بجائے حقائق و معارف؛ اور باطنی اشارات و کنایات کی طرف متوجہ رہتے اور ایک باشعور اور دردمند انسان کی طرح اپنے واردات و تاثرات کو غزل کی زبان اور شستہ و شائستہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔

ان کے حالات و حسیات نے انھیں دروں بینی اور داخلیت پر مجبور کیا جس میں میر کا سوز و ساز بھی ہے اور مومن کا عرفانِ مجاز بھی۔ ایک دکھے ہوئے دل کی کراہ، زمانہ کے ستائے ہوئے آدمی کی بصیرت، ایک عالم کی حقیقت شناسی، ایک عارف کی دروں بینی اور ایک فنکار کی فکر و نظر نے مل جل کر ان کی غزل میں تاثیر و تسخیر اور گہرائی و گیرائی پیدا کر دی ہے۔ غم دراصل انسان کے لیے ایک چشم کشا، بصیرت افروز اور اوہام شکن قوت محرکہ کا کام کرتا ہے اور اس سے اس کی دنیا بدل جاتی ہے اور وہ حقائق اشیاء کو ان کے صحیح تناسب اور تناظر میں دیکھنے لگتا ہے اور اس کے فکر و عمل میں ایک توازن و اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ مولانا خیالی کے یہاں غم کی ایسی ہی حقیقت افروز تصویریں موجود ہیں جن سے یاسیت و قنوطیت اور نوحہ و ماتم کے بجائے حقیقت سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کے کلام میں صالح تغزل کے دوسرے عناصر بھی جلوہ نما ہوتے ہیں اور فکر و خیال کے ساتھ ذوق و وجدان کو بالیدگی بخشتے ہیں۔ اردو کے اصلاحی و اسلامی ادب کی شروعات مولانا اسماعیل شہیدؒ، حکیم مومن خاں مومنؔ، اور مولانا کرامت علی جونپوریؒ وغیرہ کی تحریروں سے ہوئی جسے وہابی ادب کا بھی نام دیا گیا ہے۔ مولانا خیالی کی تحریریں بھی اسی دبستان فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور خصوصاً تذکرہ نویسی، اردو شاعری اور نعت گوئی میں انھوں نے قابل لحاظ اضافہ کیا ہے، اردو غزل کے مومن اسکول کی روایت کو وسعت و استمرار عطا کیا ہے اور اردو غزل کو پاکیزگی اور شگفتگی کا نیا آب و رنگ دیا ہے۔

ہم اختصار کے خیال سے یہاں مولانا خیالی کے کلیاتِ اردو کے ابتدائی حصہ کا ایک مختصر انتخاب درج کر رہے ہیں جن سے ان کے رنگِ سخن کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

جنوں ہے جامۂ گل داغ میرے جسمِ عریاں کا
ملا وحشت میں پیراہن مجھے صحرا کے داماں کا
رہے ہم ہاتھ ہی ملتے، جنوں نے پاؤں پھیلا کر
نشانِ تار تک چھوڑا نہیں جیب و گریباں کا

ارمانِ وصل کا دلِ شیدا میں رہ گیا
میں عمر بھر فریبِ تمنا میں رہ گیا

مجبور سچ ہے آدمی اس جی کے ہاتھ سے
دل جس پہ آ گیا، جدھر سے پھرا پھرا

دیئے ہیں تجھکو آزادی نے کیا کیا لطف وحشت میں

[خ]انۂ دساماں نہ ہوں محتاج درباں کا
ہے گلے میں طوقِ کاکل پاؤں میں زنجیرِ زلف
کیا پابندِ بلا میں بے سر و پا ہو گیا
آنکھوں میں مستیاں ہیں مئے دیدِ یار کی
دل آج کل نشاط کا میخانہ ہو گیا
آباد ہے خیالِ بتاں سے کنارِ دل
جو دل خدا کا تھا وہی بت خانہ ہو گیا
پڑ گئی جب صفحۂ سینہ کے داغوں پر نگاہ
وہ وصالِ لالہ رویاں وہ چمن یاد آگیا
پی تھی صبوحِ عمر جو کچھ ہم نے دردِ صاف
خمیازہ لائی وہ قدحِ شام میں شراب
ابتلائے ہجر واندوہِ اسیریٔ قفس
لے اٹھا کیا گیا نہ قلبِ ناتوانِ عندلیب
مسافرانِ خیالات گذرے ہیں کیا کیا
ہمارے دل کا بھی ہے حال رہ گزر کی طرح

کروں چشمِ مشتاق کو سرمگیں میں
ملے کاش گر خاکِ کوئے محمد
ہونے پائے تھے نہ پا واقفِ رفتار ہنوز
جب سے جگر میں الم کے ہیں گرفتار ہنوز
جب جل بجھے تو بن گیا داغِ جگر چراغ
ٹھنڈے ہوئے تو دل کا ہوا گرم تر چراغ
دیدہ ہے شعلہ بار ہے وہ انتظارِ دید
ہمتائے چشم کوئی نہیں ہے مگر چراغ
یکساں جلن ہے زخمِ جگر کی دن اور رات
جلتا خلافِ رسم ہے شام و سحر چراغ
جل بجھنے کا مرے نہیں محفل میں کس کو داغ
ہیں اشک چشمِ شمع میں اور نوحہ گر چراغ
روشن بیانی اپنی شبِ تارِ موت ہے
بجھنے سے پہلے جیسے جلے تیز تر چراغ

*

۱؎ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو سے کچھ امید بندھتی ہے کہ اس سے اردو کی تاریخ نویسی کی معتبر روایت قائم ہوگی۔
۲؎ میں نے مولانا خیالی اور ان کی کتاب "مہر جہانتاب" کا تفصیلی تعارف "معارف" اعظم گڑھ کے لیے لکھا ہے جو اس کے اپریل یا مئی ۱۹۸۱ء کے شمارے میں آرہا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تحقیق بھی ہو چکی ہے۔
۳؎ مہر جہانتاب ص ۱۸۰ (قلمی) ۴؎ گلِ رعنا ص ۳۴۰ ۵؎ گلِ رعنا ص ۲۵ ۶؎ ایضاً ص ۳۱ ۷؎ خم خانۂ جاوید ۳/۱۰۰ (دہلی ۱۹۱۷ء) ۸؎ مجلہ اردو، جولائی ۱۹۲۵ء (ص ۸۶)

خورشید اختر بسوانی
بسوال
سیتاپور

رُباعیات

رُکتا نہ ہو ہچکیوں میں پہلو جیسے
انفاس پہ بھی ہے نہ قابو جیسے
کیفے سے جھجک جھجک کے اٹھتا حسن کا
گھر جائے شکاریوں میں آہو جیسے

ڈھلکے ڈھلکے جبیں پہ آنچل ڈھلکے
ہلکی ہلکی گھٹا سے مکھڑا جھلکے
مستی کا سراغ دینے والی آنکھو
چھلکے چھلکے پھر آج ساغر چھلکے

زلفوں کی چلی پون کہ موسم لہکا
وہ آگ لگی کہ اور سینہ دہکا
جادو سی جگا رہی تھی یادوں کی نسیم
جب رات ہوئی تو خوب آنگن مہکا

اک بادہ سی دوڑتی ہے پیکر پیکر
وہ مستی پر ادا ہے منظر منظر
آنکھوں سے نچوڑتی ہے گلابی کرنیں
لہراتی ہے زندگی سی ساغر ساغر

اک مدت سے اِدھر نہ آیا کوئی
لیکن یہ حقیقت ہے کہ سپنا کوئی
بالوں کو مرے سرہانے بیٹھا کل رات
نرم انگلیوں سے چھیڑ رہا تھا کوئی

خوشبو وہ بہاروں سے بسے گیسو لے
کرنوں پہ کھلی فضا میں جھولا جھولے
کل شب ایسی جماہی آئی اس کو
بڑھ کر جو حدود کو دھنک کی چھو لے

لوک گیت کا مطالعہ

ابھی تک ہندستانی دیہی ادب، خصوصاً لوک گیتوں کو جمع کرنے کا ہی کام زیادہ تر ہوا ہے۔ ان جمع شدہ لوک گیتوں کے مطالعہ میں چار زاویوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں فنی نقطۂ نظر سے لوک گیتوں کا مطالعہ زیادہ عام رہا۔ موسم کے مطابق لوک گیتوں کی اقسام کا مطالعہ کیا گیا۔ تیوہاروں اور پوجا وغیرہ کے مقدس مواقع کی بنیاد پر بھی ان کا مطالعہ کیا گیا۔ محنت کی بنیاد پر لوک گیتوں کی اقسام کو غیر سائنسی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح لوک گیتوں کا مطالعہ کسی بھی معنی میں جامع اور مکمل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان گیتوں کی تشریح معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں کی جاتی ہے تب تک ان کا مطالعہ جامع نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ماہر لسانیات، الفاظ کی ساخت و اختراع میں ہی کھو کر رہ جاتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے لوک گیتوں کا مطالعہ کرنے والا، تشبیہات اور استعارات ڈھونڈنے میں ہی مصروف رہتا ہے۔ جاڑا، گرمی اور برسات وغیرہ کے تغیر و تبدل سے بھرپور وقت کو اہمیت دینے والا قاری ہجر اور وصال کے نشیب و فراز کے مشاہدوں میں ہی اپنی ساری صلاحیت صرف کر بیٹھتا ہے۔ مختلف معاشرتی مواقع پر گائے جانے والے گیتوں کو حسن کر دیہی ادب کے بہت سے عشاق انہی کی بنیاد پر لوک گیتوں کی اقسام کا تعین کرتے ہیں، بوائی، کٹائی اور کتائی وغیرہ کاموں کو دیکھنے والے حضرات ان گیتوں کو انھیں کاموں کی بنیاد پر تقسیم کر دیتے ہیں، مگر سادہ دیہی زندگی کی آبیاری کرنے والے جن معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، اور اقتصادی پہلوؤں پر ان لوک گیتوں کے ذریعہ روشنی ڈالی جاتی ہے، جن تلخ حقائق کی طرف سب کی توجہ مبذول کی جاتی ہے جن معاشرتی اور اقتصادی نشیب و فراز کی جلوہ سامانیاں ان میں جھلکتی رہتی ہیں ان کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں ان کے لیے حقیقی خلوص نہیں جاگ پاتا؛ ہم ان گیتوں کے خالق کی بھی درد بھری پکار کو نہیں سن پاتے اور اس طرح ہم ان کے ساتھ معمولی انصاف بھی نہیں کر پاتے۔

جب ہم دیہی ادب اور دیہی فن کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں تو فطری طور پر بہت سے سوالات ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اگر ہم دیہی ادب یا لوک گیتوں کے بارے میں جدید سائنسی نقطۂ نظر سے خیال آرائی کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا استعمال آج کی ہمہ گیر تعمیری سرگرمیوں میں باقاعدہ ہو تو ہمیں ان سوالات کے جوابات بھی تلاش کرنے ہوں گے۔ وہ یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ آج کے سائنسی دور میں جب کہ زمینداری نظام ایک طرح ختم ہو چکا ہے دیہی ادب سے کیا فوائد ہیں؟ دوم یہ کہ دیہی ادب کا پرچار کرنا اور اسے غیر ضروری حد تک اہمیت دینا کیا پیچھے لوٹنے کے مترادف نہ ہوگا؟ کیا اس سے قومی یک جہتی معاشرتی اور تہذیبی ارتقا میں دشواری نہیں پیدا ہوگی؟ سوم یہ کہ دیہی ادب و فن کا مستقبل کیا ہے؟ چہارم یہ کہ اس زمانے میں دیہی ادب کا مطالعہ کیوں شروع ہوا؟ کیا دیہی ادب اور کتابی ادب میں کوئی تعلق قائم ہو سکتا ہے؟ پنجم یہ کہ دیہی ادب کے لیے ہمارا زاویۂ نظر کیا ہونا چاہیے اور اس کا مطالعہ کس طرح ہونا چاہیے۔

سے [illegible] راگنیوں کو سنتے ہیں تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم میں زیادہ مہذب کون ہے؟

دیہی ادب و فن کی یہ درگت ذی علم اور مہذب کہے جانے والے افراد کے ظالم ہاتھوں کے ذریعہ ہوتی رہی ہے، دیہی ادب صرف تفریح طبع کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کبھی بھی اس طبقہ نے نہیں کی، حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہندستانی موسیقی کے راگوں میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب اس دیہی فن کے ذریعہ تخلیق کردہ دھنوں کا ہی زمین منت ہے جس کتھک اور منی پوری رقص کو آج ہم ہندستانی رقص کے بہترین نمونوں کا درجہ دیتے ہیں، کل تک ان کا شمار قبائلی رقص کی حیثیت سے ہی ہوتا تھا۔ ۲۰-۲۵ سال پیشتر منی پوری رقص کو وہی مقام حاصل تھا جو مقام آج ان علاقوں میں پائے جانے والے معمولی رقصوں کو حاصل ہے۔ یہی حال دیگر فنون کا بھی ہے موہن جو ڈرو اور ہڑپا کی کھدائی سے حاصل ہونے والے مٹی کے بتوں اور برتنوں وغیرہ کو دیکھ کر بعد کے فن بت تراشی کی قلعی کھل جاتی ہے، زبان اور ادب کے میدان میں بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔

اس لیے دیہی ادب و فن کے بارے میں خیال آرائی کرتے ہوئے نہ تو کسی گرم زبانی یا احسان کے جذبے سے کام لینا چاہیے اور نہ انھیں سستی تفریح کا ذریعہ اپنانا چاہیے بلکہ یہ ماننا چاہیے کہ ان کے دامن میں گہری اور سنجیدہ انسانی قدریں پوشیدہ ہیں اور یہ بھی قبول کرنا چاہیے کہ دیہی ادب ہمیشہ تغیر پذیر اور ترقی کی منازل پر گامزن رہا ہے۔ زندگی کی طرح اس کی دنیا بھی رکنے والی نہیں ہے۔ اس میں ہمیشہ زندگی کے نئے عناصر کو قبول کرنے کی صلاحیت رہی ہے اور اس میں ہمیشہ ہی عظیم فنی شاہکار دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ اس کے خارجی اور داخلی دونوں پہلو خوب صورت، پرکشش اور پرعظمت رہے ہیں۔

لوک گیتوں کے بارے میں ایک مغالطہ یہ بھی رہا ہے کہ ان کا خالق کوئی ایک شخص نہیں تھا بلکہ ان کی تخلیق اجتماعی کاوش کا نتیجہ ہے، یہ بات بالکل کھوکھلی اور بے بنیاد ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان فن پاروں یا لوک گیتوں کی تخلیق میں اشخاص کا ہاتھ رہا لیکن انھوں نے اپنی روایتی انکساری کی وجہ سے اپنی فنی تخلیقات کے ساتھ اپنا نام کبھی نہیں جوڑا اور نہ ہی انھوں نے اپنی فنی تخلیقات میں اصلاح کرنے سے کسی کو بھی باز رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی طور پر شخص خاص کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی وہ تخلیق پورے معاشرے کی ملکیت ہو گئی۔

ہمارے معاشرہ میں ہزاروں اور لاکھوں گیت عوام کو زبان زد ہوں گے، اگر سارے ملک میں پھیلے ہوئے لوک گیتوں کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد اور ان کی دلآویزی دیکھ کر ہم انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔ اس وقت ہمیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان گیتوں کے خالق کا کوئی پتہ نہیں، یہ بھی نہیں معلوم کہ ان گیتوں کی تخلیق کب ہوئی؛ ان کی بنیادی ساخت کیا تھی؛ ان میں کون کون سی اصلاحات کب اور کس طرح ہوئیں اور کیسے یہ اپنی موجودہ شکل میں پہنچے۔

دیہی ادب میں اصل انسان بولتا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ ہر عصر تغیر پذیر علاقائی زبانوں کا اظہار بھی کرتا ہے اس کی ہمہ گیری میں ذرہ برابر بھی خامی نظر نہیں آتی، اس ادب میں ہندستانی تہذیب کی بنیاد اور دیہی تہذیب اپنا پرکشش چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہی ادب خصوصاً لوک گیتوں میں ہندستان کی روح لہرا رہی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دیہی تہذیب اور شہری تہذیب میں اسی حد تک فرق ہے جس حد تک حقیقت اور استدلال میں یا سادگی اور بناوٹ میں فرق ہوتا ہے۔ دیہی تہذیب فطرت کی آغوش میں ندیوں کی کچھاروں میں، آبشاروں کے کنارے کہساروں، کھیت اور کھلیانوں کے دامن میں نشو و نما پاتی ہے جبکہ شہری تہذیب دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں، چیختی ہوئی مشینوں اور بلبوں کی تیز روشنی کے درمیان پرورش پاتی ہے۔

لوک گیت زندۂ جاوید ہیں جب سے انسانی معاشرہ وجود میں آیا تب سے ہیں یہی وجہ ہے کہ سر رالف ولیمس (RALPH WILLIAMS) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ لوک گیت نہ پرانا ہوتا ہے نہ نیا۔ یہ تو اس جنگلی پیڑ کی طرح ہوتا ہے جس کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں دھنسی ہوتی ہیں مگر جس میں روز نئی شاخیں نئی پتیاں اور نئے پھل آتے رہتے ہیں۔ کوئی وجہ ضرور ہے کہ ہم میتھلی، پنجابی اور مالوی، بھوجپوری اور راجستھانی اودھی اور برج لوک گیتوں میں علاقائی اور لسانی فرق ہوتے ہوئے بھی مساوی روح پاتے ہیں جس طرح دیہی افسانوں کے بارے میں اکثر محققین کی رائے ہے کہ ان میں خارجی فرق کے باوجود داخلی یگانگت کار فرما ہے! وہی بات لوک گیتوں سے متعلق بھی ہے۔ ہمارے لوک گیت ہر زمانہ، ہر علاقہ، ہر قوم کے مزاج سے ہم آہنگ رہے ہیں اس ضمن میں A.G. SHERIF نے صحیح لکھا ہے:

"......The songs are natural and dramatic and abound in pathos and humour, in romance and tragedy. Again and again in reading them one is struck by resemblances to the folk poetry of other countries."

اس طرح ہمارے ملک کی علاقائی زبانوں کے لوک گیتوں میں ہی نہیں بلکہ سکاٹ لینڈ انگلینڈ و جرمنی وغیرہ ممالک کے لوک گیتوں میں بھی اسی قسم کے جذبات ملتے ہیں، کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے جملے کے جملے ترجمہ کی شکل میں رکھ دیے گئے ہیں۔ جزئیات کی یہ مماثلت، خیالات اور نظریات کی یہ یک رنگی حیرت انگیز ہے۔

ہمارے لوک گیتوں میں کہیں برس رہے بادلوں کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ کہیں کھیتوں کی ہریالی پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے، کہیں دھرتی، چاند اور سورج کے لیے تشکر آمیز جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، کہیں دیوی دیوتاؤں کے حضور عقیدت کے پھول نچھاور کیے گئے ہیں، کہیں تالابوں، دریاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں کی پرستش کی گئی ہے۔ کہیں وصال کے موقع پر فخر و انبساط اور ہجر کے موقع پر رنج کا اظہار کیا گیا ہے؛ کہیں بیٹے کی پیدائش پر خوشی ہے؛ کہیں بانجھ پن پر ماتم ہے؛ کہیں خوبصورت دوشیزہ کے جذبات کا رومانی بیان ہے؛ کہیں بھری محفل میں اونچی پگڑی باندھنے والے؛ فراخ سینہ اور سڈول دست و بازو والے شوہر پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے کہیں بے میل شادی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ کہیں بہن کا پیار اور بھائی کی قربانی، کہیں نند اور بھابی کی نوک جھونک کہیں ساس بہو کے جھگڑے، کہیں قومی یکجہتی کی شان میں قصیدے کہیں مذہب اور فرض شناسی کی تعریف اور کہیں لامذہبیت کی تنقید ہے۔ غرض کہ ہمیں ان لوک گیتوں میں زندگی کے لیے بڑا ہی صحت مند، فطری اور مضبوط زاویۂ نظر ملتا ہے۔ قنوطیت اور یاس و فرار کی جگہ رجائیت اور حوصلہ مندی کے جذبات ہمیں ان گیتوں میں ملتے ہیں، کہیں بھی ان گیتوں میں کمزوری یا پھیکا پن نہیں ہے ہمت، حوصلہ اور لگن کی کمی ہم کہیں نہیں پاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان گیتوں کے کردار سارے کے سارے دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں، شدید بارش گرمی اور جاڑے کو برداشت کر کے دھرتی کے سخت سینہ سے سونا اگانے والے لوگ بھی کہیں بے جان، کمزور اور پھیکے ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں۔

ان گیتوں میں ہماری دیہی زندگی اپنی ساری خوبصورتی اور توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان لوک گیتوں کے ساتھ دھرتی گاتی ہے آسمان گاتا ہے، چاند تارے گاتے ہیں فطرت کے سارے عناصر گاتے ہیں۔

★

آفاق احمد فاخری
پوسٹ جلال پور
فیض آباد یوپی

بشیر ...
٥٥ . اکھاڑہ ...
مرزا علی لین، لکھنؤ

سحر کے قتل کا الزام ہے اندھیروں پر
حصار کھینچ دو ان قاتلوں کے ڈیروں پر

کہیں سے کوئی طلبگار ہی نہیں آتا
یہ ناگنیں تو اب اک بوجھ ہیں سپیروں پر

پکار لو کہ خدا جانے ہم کدھر جائیں
پرندے لوٹ کے جانے لگے بسیروں پر

پھر آگئے تری یادوں کے خوشنما پنچھی
پھر اک جشن ہے حالات کی منڈیروں پر

تمام جال سبک مچھلیوں نے کاٹ دیے
عجیب خوف سا طاری ہے اب مچھیروں پر

جو آئینوں کی تمنا میں گھر سے نکلے تھے
وہ محوِ خواب ہیں اب پتھروں کے ڈھیروں پر

بشیر ہم نے دیا ہے لہو اجالوں کو
ہمارا قرض ہے ان دور کے سویروں پر

اداسیوں کا دھواں منظروں میں رہنے دے
پہاڑ جیسا اندھیرا گھروں میں رہنے دے

جلا کے اپنے لہو کے چراغ جی لوں گا
مجھے تو جسم کے اندھے دروں میں رہنے دے

نہ جانے مائلِ پرواز کب ہو ذوقِ سفر
مری اڑان کو میرے پروں میں رہنے دے

گھروں سے نکلو جلائے چراغ شوق مگر
ہجومِ کرب ابھی بستروں میں رہنے دے

محمد اسحاق صدیقی
۱۰۰ اے، گوئن تالاب
لکھنؤ

اجگر

اجگر سنسکرت زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں "بکرے کو نگلنے والا" (اج = بکرا، گر = نگلنا) اسے فارسی میں اژدھا یا اژدر کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور طاقتور سانپ ہے۔ جو ایشیا، جنوبی یورپ، افریقہ، آسٹریلیا اور امریکہ کے گرم خطوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندستان میں اجگر ہمالیہ کی ترائی، آسام، بنگال اور راجستھان میں پائے جاتے ہیں۔

اجگر جنگلوں، پہاڑی علاقوں، دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اچھے تیراک ہوتے ہیں اور پانی کے نیچے ۱۵ منٹ تک رہ سکتے ہیں۔ درختوں پر بھی آسانی سے چڑھ جاتے ہیں۔

اجگر کی لمبائی ۸ سے لیکر ۳۰ فٹ تک اور وزن تین من تک ہوتا ہے۔ کھال کا رنگ بھورا ہوتا ہے اور اس پر کتھئی رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ پیٹ جسم کے برابر چوڑا ہوتا ہے۔ اس پر بھالے کا جیسا نشان پایا جاتا ہے۔ نتھنے جو کافی بڑے ہوتے ہیں اوپر کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ اسی لیے پانی میں تیرتے وقت یہ آسانی سے سانس لے سکتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی اور پتلیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ اجگر دن کی طرح رات کو بھی شکار کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی آنکھیں رات کے اندھیرے میں بخوبی کام کرتی ہیں۔

ایک زمانے میں سانپوں کے پیر ہوتے تھے۔ جب انھوں نے پیروں سے کام لینا چھوڑ دیا تو وہ غائب ہو گئے۔ لیکن اجگر کے جسم میں پچھلی ٹانگوں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں جو دو ننھے ننھے پنجوں کی صورت میں پاخانے کے مقام کے نزدیک نظر آتے ہیں۔ اجگر یا کسی بھی سانپ کے جسم میں، گلے بازو یا سر نہیں ہوتے۔

مشہور ہے کہ جب اجگر کو بھوک لگتی ہے تو وہ منھ کھول کر ایک لمبی سانس لیتا ہے اور سامنے جو بھی چیز ہوتی ہے اس کے منھ میں کھنچ کر چلی جاتی ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جب اجگر بھوکا ہوتا ہے تو گھاس یا کسی جھاڑی میں چھپ جاتا ہے اور جب کوئی جانور پاس سے گزرتا ہے تو اس پر جھپٹتا ہے۔ اکثر اوقات وہ درخت پر چڑھ جاتا ہے اور کسی ٹہنی سے اپنی دم لپیٹ کر سر نیچا کرکے لٹک جاتا ہے اور غور سے جانوروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ جب کوئی جانور ٹھیک اس کے نیچے سے گزرتا ہے تو وہ اس پر جھپٹ پڑتا ہے۔ اس کے بوجھ سے جانور گر پڑتا ہے۔ وہ فوراً اسے اپنے مضبوط اور تیز دانتوں سے دبوچ لیتا ہے۔ اس کے دانتوں سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ اندر کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔ یہ دانت کاٹنے یا چبانے کے لیے نہیں ہوتے، کیونکہ اجگر اپنے شکار کو مسلّم نگلتا ہے۔ دانتوں سے شکار کو پکڑنے اور روکے رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ دانت زہریلے بھی نہیں ہوتے، کیونکہ اجگر کے منھ میں زہر کی تھیلی نہیں ہوتی۔

جب شکار اس کی پکڑ میں آجاتا ہے تو یہ اپنی دم کا سہارا لے کر اپنے طاقتور جسم کو اس کے گرد رسی کی طرح بار بار لپیٹتا ہے۔

پیسنے کے لیے ایک یا دو بل کافی ہوتے ہیں۔ اس عمل میں دو تین سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگتے۔ اس کے بعد وہ اپنے شکار کو کھانا شروع کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ اجگر اپنے شکار کو اتنی زور سے دباتا ہے کہ شکار کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور اس کا جسم لگدی بن جاتا ہے۔ لیکن دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب اجگر کسی جاندار کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد بھینچتا ہے تو اس کا دم گھٹ جاتا ہے پھیپھڑوں میں جو ہوا ہوتی ہے باہر نکل جاتی ہے اور تازہ ہوا اندر داخل نہیں ہونے پاتی۔ ہڈیاں ٹوٹنے سے پہلے ہی وہ مر جاتا ہے اور تب وہ اُسے نگلنا شروع کرتا ہے۔

اجگر کے منہ اور پیٹ میں ربڑ سے بھی زیادہ پھیلنے کی طاقت ہوتی ہے اور وہ شکار کی جسامت کے لحاظ سے پھیل جاتے ہیں جب وہ شکار کو نگلتا ہے تو اس کا منہ حلق تک کھل جاتا ہے حلق کے عضلات کافی لچک دار ہوتے ہیں۔ وہ شکار کو آہستہ آہستہ پیٹ کی طرف دھکیلتے ہیں۔

اجگر چھوٹے بڑے سبھی طرح کے جانور کھاتا ہے۔ چوہے، خرگوش، بندر، بھیڑ، بکری، لومڑی، ہرن، گیدڑ، سؤر، حتیٰ کہ تیندوے تک کو نگل جاتا ہے۔ ایک ۱۸ فٹ لمبے اجگر کے پیٹ سے ۴ فٹ ۲ انچ لمبا (دم کی لمبائی چھوڑ کر) تیندوا برآمد ہوا تھا۔ اجگر کے جسم پر سات زخم تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ تیندوے نے چھٹکارا پانے کے لیے کافی جدوجہد کی تھی۔

اس بے ہاتھ پاؤں کے جانور میں بلا کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ ہاتھی کو چھوڑ کر کسی بھی جانور سے بھڑنے میں نہیں ہچکچاتا۔ چرندے پرندے درندے سبھی اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ انسان پر یہ بہت کم حملہ کرتا ہے لیکن اگر موقع مل جائے تو اسے بھی نگل جاتا ہے۔

عموماً یہ جانور کا پچھلا حصہ پہلے نگلتا ہے۔ نگلنا ایک میکانکی فعل ہوتا ہے جو شروع ہونے کے بعد رکتا نہیں۔ بڑے شکار کو نگلنے میں گھنٹوں لگ سکتے ہیں اور اس کے لیے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔ جب یہ نگلتے نگلتے تھک جاتا ہے تو کراہنے لگتا ہے۔

شکار کو نگلتے وقت اس کے منہ سے رال بہت نکلتی ہے اگر اسے شکار کو نگلنے کے بعد چھیڑا جائے تو اسے اگل دیتا ہے اور وہ رال میں ڈوبا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ غالباً یہ بھاگنے میں سہولت کے لیے ایسا کرتا ہے۔ کیوں کہ جب پیٹ بھرا ہو تو بھاگنا مشکل ہوتا ہے۔

اس کے معدے میں جو ہاضم رس پیدا ہوتا ہے اس میں شکار کے سینگ، کھر، بال، ہڈیاں سب گل جاتے ہیں، بڑے شکار کو ہضم کرنے میں اجگر کو ایک ہفتہ یا کچھ زیادہ وقت لگتا ہے۔

ایک مرتبہ بعض ماہرین علم الحیوانات نے اجگر کی خوراک کو آزمانا چاہا اور ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب وہ ایک باون ۵۲ پاؤنڈ وزنی مردہ بکری پر (جس کے سینگ نکال دیے گئے تھے) بلا پس و پیش ٹوٹ پڑا کیونکہ ابھی اجگر ایک ہفتہ پہلے محض ۵ گھنٹے کے اندر ایک ۲۱ پونڈ وزنی بکری اور ۴۳ پونڈ وزن کے ہرن کو نگل چکا تھا لیکن اس نئے شکار کو حلق کے نیچے اتارنے میں اسے خاصی محنت کرنی پڑی اور وہ کراہنے لگا۔

بڑا شکار کھانے کے بعد یہ سست پڑ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ رینگ کر کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ مدہوش پڑا رہتا ہے۔ اس حالت میں اُسے مارنا یا زندہ پکڑنا مشکل نہیں۔

پیٹو ہونے کے باوجود اجگر برسوں بغیر کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہے۔ جب اُسے زندہ پکڑ لیا جاتا ہے تو مہینوں کے لیے بھوک ہڑتال کر دیتا ہے۔ بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے ایک اجگر نے دس مہینے تک فاقہ کیا۔ مئی ۱۹۲۲ء میں پرنس آف ویلز نے لندن کے عجائب گھر کو ایک اجگر تحفے میں بھیج دیا۔ ہر ہفتے اس کے سامنے راتب لایا جاتا لیکن وہ اُسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ جولائی ۱۹۲۳ء میں اس نے پہلی مرتبہ ایک مری ہوئی مرغی کھائی اور پھر ہر ہفتے دو چار مرغیاں کھاتا رہا۔ پھر ان

کے عجائب گھر میں ایک اجگر ڈھائی سال تک بھوکا رہا،
ضدی اجگر کو زبردستی کھلانا پڑتا ہے۔ سپیرے اُسے آٹے میں دودھ اور انڈا ملا کر کھلاتے ہیں۔ بیشتر اوقات اس کا منھ زبردستی کھول کر کوئی دوسرا سانپ کھلانا پڑتا ہے۔ ایک ضدی اجگر کے کھلانے کے لیے یہ تدبیر کرنا پڑتی تھی کہ ایک آدمی اس کا منھ کھولے رکھتا تھا اور ہر دو فٹ کے فاصلے پر چند لوگ اُسے اُٹھائے رہتے تھے۔ پھر دو مرے ہوئے خرگوشوں کو ایک ساتھ سی کر اس کے منھ میں رکھا جاتا تھا۔ انھیں ایک بانس کے ذریعہ حلق میں ٹھیلتے تھے۔ جیسے جیسے خرگوش حلق سے نیچے اترتے جاتے تھے، نیچے ہاتھوں کو اس کا احساس ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ اس کے پیٹ میں پہنچ جاتے تھے، اور پھر بانس نکال لیا جاتا تھا۔

ہندستانی اجگر کی مادہ ایک جھول میں ۸ سے لے کر ... تک انڈے دیتی ہے، جو بطخ کے انڈے سے کچھ بڑے ہوتے ہیں (۳ ½ انچ لمبے ۲ ½ انچ چوڑے)۔ مادہ ان کے گرد کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ انڈے سینے کے زمانے میں اس کا درجۂ حرارت کچھ بڑھ جاتا ہے، جس سے انڈے سینے میں مدد ملتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی بھی جاندار انڈوں کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرتا، جب بچے انڈوں سے نکلتے ہیں تو وہ دو فٹ یا کچھ زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔

دوسرے سانپوں کے مقابلہ میں اجگر زیادہ جیتے ہیں۔ ہندستانی اجگر عجائب گھروں میں ۱۶ سال تک جیتے ہیں۔ لیکن شاید جنگلوں میں وہ اس سے بھی زیادہ عمر پاتے ہیں۔

اجگر کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے۔ بعض لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں اور لذیذ بتاتے ہیں۔ اجگر کی چربی دواؤں میں کام آتی ہے اور گھی میں ملائی جاتی ہے۔ اجگر کی کھال نہایت خوشنما ہوتی ہے۔ اس کے سوٹ کیس اور جوتے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ کھال حاصل کرنے کے لیے ہر سال ہزاروں اجگر مارے جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تعداد نہ صرف ہندستان میں بلکہ ہر ملک میں تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جب کسی علاقے میں اجگر کم ہو جاتے ہیں تو چوہوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے اور یہ چوہے کھیتی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اجگر چوہوں کو بڑھنے سے روکتے ہیں اس لیے کاشتکاری کے لیے مفید ہیں۔

اجگر کا ڈیل ڈول اس کے لیے رحمت بھی ہے اور زحمت بھی ہے، بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے وہ بڑے سے بڑے جانور پر قابو پا لیتا ہے لیکن جب وہ کھا پی کر غافل ہو جاتا ہے تو خود اس کا شکار کر لیا جاتا ہے۔ بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے وہ بھاگ کر چھپ بھی نہیں سکتا۔ اگر چھوٹا ہوتا تو کسی بل میں گھس جاتا یا تنے کے نیچے چھپ جاتا۔

بندوق سے اجگر کو بڑی آسانی سے مارا جا سکتا ہے۔ ایک یا دو گولی میں اس کا کام تمام ہو جاتا ہے لیکن بندوق سے شکار کرنے میں وہ مزہ نہیں جو زندہ پکڑنے میں ہے۔ سپیرے تماشہ دکھانے کے لیے زندہ اجگر پکڑتے ہیں۔ عجائب گھروں کے لیے بھی انھیں زندہ پکڑا جاتا ہے۔ زندہ اجگر پکڑنا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی ہمت اور ہوشیاری چاہیے۔

عموماً یہ جانور جتنا سست نظر آتا ہے اتنا سست نہیں ہوتا۔ شکار پر جھپٹتے وقت اس کی چستی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے بھاگتا بھی کافی تیز ہے۔ جان بچانے کے لیے اکثر درخت پر چڑھ جاتا ہے اور مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک لمبے بانس کے سرے پر آنکڑا لگا کر چار پانچ آدمی مل کر اسے نیچے گھسیٹتے ہیں۔ اکثر یہ پکڑنے والے پر حملہ کر دیتا ہے۔ زہریلا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے دانتوں کا زخم مہلک تو نہیں ہوتا لیکن کافی گہرا ہوتا ہے اور دیر میں اچھا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے دانت بڑے نکیلے اور اندر کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

فرینک بک نے جو عجائب گھروں کے لیے زندہ جانور پکڑا کرتے تھے، اجگر کے بارے میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا ہے کہ "ایک مرتبہ جنگل میں ایک اجگر نے میری بانہہ پکڑ لی اور بجلی کی تیزی سے میرے ہاتھ میں ایک بل دے کر لپٹ گیا، میں زمین پر گر پڑا۔ میرے

[illegible] نے چاہا کہ رائفل سے اسے مار دے لیکن میں نے اسے روک دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گولی میرے لگ جائے۔ اجگر نے دوسرا بَل دیا اور مجھے پوری طرح لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے بدقت اپنا ریوالور نکالا اور اس پر کئی فائر کیے۔ چند سکنڈ میں وہ مر گیا میرا شانہ بُری طرح سُوج گیا۔ میرے ہاتھ میں اجگر کے ۲۲ دانت چبھ گئے جو بڑی مشکل سے کھینچ کر نکالے گئے۔

اگر انسان اجگر کی لپیٹ میں آجائے تو بغیر کسی دوسرے کی مدد کے چھوٹنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے شکاری سب سے پہلے اس کے منھ کو بس میں کرتے ہیں۔ ایک شخص ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کے سامنے کپڑا ہلاتا ہے اور جیسے ہی وہ اس پر جھپٹتا ہے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن مضبوطی سے دبوچ لیتا ہے۔ دوسرا آدمی اس کی دم پکڑ لیتا ہے تاکہ وہ کسی کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے۔ اس کے بعد اسے بوری یا صندوق میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اجگر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے لیے خاص طرح کے صندوق کام میں لائے جاتے ہیں۔ چار فٹ اونچا اور اتنا ہی لمبا چوڑا صندوق اس کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ اس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے سوراخوں کی قطاریں ہوتی ہیں، دروازہ اکثر اوپر کھلنے والا ہوتا ہے۔ دروازے میں اکثر جالی لگی ہوتی ہے۔

منزل پر پہنچنے کے بعد دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ اندھیرے سے اچانک روشنی میں آنے پر اجگر کی آنکھیں ٹھیک سے کام نہیں کرتیں۔ دس منٹ تک وہ سویا ہوا سا رہتا ہے اور اگر اس حالت میں اسے رہنے کی جگہ میں بند نہ کیا گیا تو ہوش میں آجاتا ہے اور تماشائیوں پر جھپٹتا ہے اور تب اسے بند کرنے کے لیے دس بیس آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اجگر ٹھنڈی جگہ رہنا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی رہنے کی جگہ پر مٹی بچھا دی جاتی ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً پانی چھڑکتے ہیں۔ جب اسے پختہ فرش والے کمرے میں رکھا جاتا

(باقی ۴۹ پر)

غزل

بی اے بہادر محشر بریلوی
(سیکشن آفیسر اکاؤنٹس)
این، ای، ریلوے گورکھپور

فطرتاً فولاد ہوں شیشہ نہیں
اس لیے میں ٹوٹ کے بکھرا نہیں

جو تھا پہلے وہ ترا چہرا نہیں
تو نے شاید آئینہ دیکھا نہیں

جل رہا ہوں گرمیِ احساس سے
آدمی ہوں برف کا ٹکڑا نہیں

جُرم ہے کہنا بُروں کو بھی بُرا
اب وہی اچھا ہے جو اچھا نہیں

سوچتا ہوں کس کو پیغمبر کہوں
کوئی بھی اب آگ پر چلتا نہیں

چھوڑدے پیچھا مرا اے دردِ دل
تجھ سے اب میرا کوئی رشتہ نہیں

پیچھے پیچھے چل رہے ہیں کتنے لوگ
میں نے یہ مڑ کر کبھی دیکھا نہیں

کارواں لوٹے گا میرِ کارواں
خواب میں بھی میں نے یہ سوچا نہیں

ساتھ ہے محشرؔ کے اک غم کا ہجوم
زندگی کی راہ میں تنہا نہیں

حسین علی عرفانی

نازؔ مرزاپوری

احمد علی نازؔ کی پیدائش ۱۷ فروری ۱۹۱۹ء کو اترپردیش کے مرزاپور ضلع کے ویلسلی گنج محلے میں ایک معزز مسلم خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شیخ اسماعیل بخش عرف شیخ جی تھا۔ نازؔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ چنانچہ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انھیں گھر پر اردو، عربی اور فارسی کی مناسب تعلیم بھی ملی۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول اور بی۔ ایل۔ جے ہائی اسکول (اب انٹر کالج) مرزاپور میں حاصل کی۔ دو سال تک سنٹرل ٹریننگ کالج لکھنؤ میں تربیت حاصل کرنے کے بعد آپ شہر کے بی۔ ایل۔ جے ہائی اسکول اور اینگلو سنسکرت جبلی انٹر کالج میں بحیثیت مدرس رہے۔ کچھ عرصے بعد محکمہ تعلیم میں ان کا سلیکشن ہوگیا۔ چنانچہ ان کی تقرری گورنمنٹ کالج بارہ بنکی میں ہوگئی۔ اس کے بعد تبادلہ ہوا تو آپ گورنمنٹ نارمل اسکول چنار (مرزاپور) آگئے۔ لیکن یہاں بھی آپ زیادہ دنوں تک نہیں رہے۔ پھر تبادلہ ہوا تو آپ گورنمنٹ ہائی اسکول مرزاپور آگئے یہیں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے یونیورسٹی امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔

آپ نے اردو کے منشی، کامل، اور دیگر امتحانات میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اردو، عربی اور فارسی زبان و ادب سے ان کے استاد فیض الحسن فیض اعظمی نے انھیں واقف کرایا جن کی شخصیت کا اثر نازؔ صاحب پر ہمیشہ نمایاں رہا۔ [illegible] آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ودیالیہ [illegible] گنج (مرزاپور) ہوگیا۔ وہاں کچھ عرصہ آپ ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ آپ بے حد خوش مزاج، خوش اخلاق، شریف النفس، رحم دل اور انتہائی وسیع النظر انسان تھے۔ غصے کی کوئی علامت تو آپ کے چہرے پر کبھی دیکھی ہی نہیں گئی۔ اپنے انھیں اوصاف کی بنا پر آپ ہمیشہ ہر جگہ مقبول اور ہر دل عزیز رہے۔

ترقی کا ایک سنہرا موقع چھوڑ کر آپ ۱۹۶۳ء میں پھر مرزاپور آگئے۔ جہاں گورنمنٹ انٹر کالج میں آپ کا تبادلہ ہوا تھا۔ اس سے اپنے وطن آنے کی تمنا پوری ہوگئی لیکن کون جانتا تھا کہ اس تمنا کی تکمیل میں قدرت کی ایک مصلحت بھی نمایاں تھی۔ یہیں مرزاپور میں ۱۷ مئی ۱۹۶۴ء کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ادبی زندہ گئے۔

انھوں نے ۱۹۳۵ء کے آس پاس جو غزلیں کہیں انھیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعرانہ صلاحیت ۱۵-۱۶ برس کی عمر ہی میں ظاہر ہوگئی تھی۔ فیض الحسن فیض اعظمی جیسے استاد کی جو خود اعلیٰ پائے کے شاعر اور ادیب تھے، سرپرستی نے نازؔ صاحب کی صلاحیت کو اور جلا بخشی۔ فیض الحسن فیض کے مشوروں اور اصلاح سے نازؔ نے کافی استفادہ کیا۔

نازؔ صاحب کی ابتدائی غزلوں سے ان کی زبردست شاعرانہ صلاحیت اور قدرتِ بیان ظاہر ہوتی ہے۔ ان غزلوں کے دو شعر اس طرح ہیں۔

تجلی بار تیرے حسن کی تنویر ہوتی ہے
نشاطِ روح کی پہلو میں اک تصویر ہوتی ہے

(۱۹۳۵ء)

قتل گہ میں حسن تھا خنجر بکف اس رنگ سے
خود بخود بیتاب ہو کر عشق بیجان گیا

(۱۹۳۶ء)

اپنے استاد جناب فیض اعظمی کے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں

میری نیاز مندیاں حاصلِ کارِ بن گئیں
لطفِ نگاہِ فیض نے ناز مجھے بنا دیا

مشاعروں، ادبی نشستوں احباب کے شاعرانہ ذوق اور ادب نوازی سے بھی انھیں تحریک ملتی رہی اور وہ اردو کے شعری ادب میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کا تخلیقی سفر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۴ء تک جاری رہا۔ جس کے دوران انھوں نے نعت، غزل، نظم، مسدس اور مخمس سب پر طبع آزمائی کی۔ لیکن بہتات غزلوں ہی کی ہے؎

ہائے ناکامِ محبت کا وہ شوقِ ناتمام
ان سے ملنے کا بھی دل میں لیکے ارمان رہ گیا

چھپنے کا نہیں ہرگز اب رازِ جنوں اپنا
ہر وقت کی بےچینی وحشت کی نشانی ہے

یہ جب تلک جہانِ مہر برقرار رہے
تمہارے حسن کی یونہی سدا بہار رہے

جو دل کو یار کے وعدے کا اعتبار رہے
یقیں ہے حشر تلک اس کا انتظار رہے

وہ خار ہے یا گل ہے یا بادِ بہاراں ہے
جو رنگ چھلکتا ہے وہ رازِ گلستاں ہے
اس شوخ کے ہونٹوں پر جو ہیں یہ تبسم کی
یا سبز گلستاں میں اک برق سی لرزاں ہے

ہندستان کو انگریزوں کے تسلط سے جب نجات حاصل ہوگئی تو انھوں نے "نغمہ آزادی" کے عنوان سے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار اس طرح کیا؎

یہ کس نے چھیڑ دیا ہے ربابِ آزادی
اٹھا دیا ہے یہ کس نے نقابِ آزادی

دنیا میں آج ایسے نمایاں ہوئے ہیں ہم
گویا کہ ایک مہرِ درخشاں ہوئے ہیں ہم

باباے قوم مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا؎

اے غریبوں کے سہارے بیکسوں کے چارہ گر
اے علاجِ زخمِ دل اے مرہمِ زخمِ جگر
اے فقیرِ دارِ ہمارے ہند کے درِ ثمیں
تیری ہر اک بات حق کتنی نصیحت آفریں

ان کی شخصیت اتنی پرکشش تھی کہ کوئی شخص ان سے مل کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بے حد ہنس مکھ، پر مذاق اور بذلہ سنج بھی تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان گنت شعرا کو اصلاح اور اصلاحی مشوروں سے بھی مستفید کیا۔ میں نے جناب طالب، تابش اور رحمت مرزاپوری کو بھی ان سے اصلاح لیتے دیکھا ہے جناب سراج مرزاپوری نے ایک ملاقات میں بیان کیا کہ "ناز صاحب نے شعر کے بنیادی لوازمات اس طرح میرے ذہن نشین کرا دیے کہ ان کے بعد مجھے اصلاح لینے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ لیکن اب تو ان کی یاد آتے ہی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں"

ان کی شاعری میں جو ان کے لیے عرفانِ ذات اور تسکینِ ذات کا وسیلہ تھی، ۱۳ جولائی ۱۹۵۶ء کو ایک المناک موڑ آیا۔ یہ موڑ ان کی اہلیہ کے انتقال سے آیا۔ اس سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے غزل کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ پھیر لیا اور مشاعروں میں جانا بالکل بند کر دیا۔

اس المیے پر اپنے محسوسات کا اظہار ناز صاحب نے اس

(باقی صفحہ پر)

خورشید حیات
"الیات" نیو کریم گنج گیا - بہار

(افسانہ)

نروان

ہمارے سامنے وہ جو ایک دائرہ سا نظر آ رہا ہے۔ اپنی معنویت کے لحاظ سے بڑا پُر اسرار ہے۔ میں اس کو دیکھ کر تخیل میں کھو جاتا ہوں، اور جوں جوں میرے تخیل کا سفر آگے بڑھتا ہے۔ دائرہ اپنی پیچیدگی میں بے مثال ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر دائرہ دائرہ رہ جاتا ہے اور میں ......؟

انجانی سی سرگوشی ہوتی ہے۔ دھماکے کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ان میں لہریں اٹھتی ہیں اور پھر بھیانک تاریکی سی پھیل جاتی ہے۔

تاریکی کا راج اور دائرے کی وسعت ..... ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ سو گیا ہے۔ نیند کا غلبہ کچھ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ دماغ کی ساری جوت ختم ہو چکی ہے۔ مگر کبھی کبھی تاریکی ہی روشنی کی ضامن بن جاتی ہے۔ تاریکی اور روشنی کا رشتہ تو بہت پرانا ہے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر جانا نہیں جا سکتا۔ مگر ایک کو دوسرے کے درمیان دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ یہی کشمکش ازل سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔

میں حیرت زدہ کھڑا ہوں۔ نیند کا غلبہ ذہن پر طاری ہے اور اسی درمیان مجھے ایسا لگتا ہے کہ دائرے کے بیچ چراغ جل اٹھا ہے روشنی کا حلقہ تاریکی کو مسحور کر رہا ہے۔ اور پھر نئے سرے سے تاریکی اور روشنی کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ روشنی دائرے کو لپیٹ میں لینا چاہتی ہے۔ تاریکی اپنی وسعت پھیلائے جاتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی روشنی کے حدود تنگ نظر آتے ہیں اور کبھی تاریکی مدھم سی ہونے لگتی ہے۔

وجود کے قیام کا مسئلہ .... جدوجہد کی صورت ...... فضا کی پُر اسرار ہیبت ناکی ۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ..... کیا ہے؟ .... کس کا امتحان ہے؟ .... وجود ازلی نے یہ کیا مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے؟ .... اس کا حل کب ہوگا؟ .... کہاں ہے گوتم نیلا مبر آئے گا .... کون سی نئی دنیا بسائے گا ......!!

نروان کی روشنی مدھم ہو چکی ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے پیپل کا پیڑ بھی خاموش ہے۔ امام مہدی آئیں گے .... پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہو چکا ہے۔ انسان کسی امام موعود کے انتظار میں ہے۔

ہم کہاں ہیں یہ سوال اپنی جگہ ہے۔ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا یہ سب تاریکی ہے۔ اور اگر سب تاریکی ہے تو ہم کیا ہیں؟ ہم بھی تو تاریکی ہیں ......

خاموش رہو! فضا اور پُر اسرار ہوتی جا رہی ہے۔ چیل اور چمگادڑ کی آواز، ہوا کی سنسناہٹ بڑی بھیانک لگ رہی ہے۔

چراغ بجھ چکا ہے اور دائرے کی تاریکی عروج پر ہے۔

ٹھہرو! ٹھہرو! وہاں دیکھ لینے دو۔ ہم مسخ ہو رہے ہیں۔ ہم بجھ رہے ہیں۔ ہم کہاں ہیں؟ ہم کیوں ہیں؟ ...... میرا دماغ بجھ رہا ہے۔ میرا تخیل مدہوش ہوتا جا رہا ہے۔ روشنی روشنی!! روشنی کہاں ہے؟ کوئی روح آواز دے رہی ہے۔ انتظار کرو دائرہ خود روشنی دے گا۔ پھر ہم اور تم ایک ہو جائیں گے۔ تاریکی کا دائرہ روشنی کو اپنے میں سمیٹ لے گا۔ روشنی دائرے کو اپنی گود میں لے لیگی۔ پھر ہم اور تم، تم اور ہم یہ سوال باقی نہیں رہے گا۔ نروان ہمیں بھی مل جائے گا۔ پیپل کا پیڑ پھر ہنسے گا اور برسہا برس ہماری پرستش ہوتی رہے گی۔

*

(افسانہ)

[illegible]
معرفت ایم کیو خان
مومن گنج گیا۔ بہار

تنکے کا سہارا

گرمی کی تعطیل ہونے والی تھی اور وہ عجیب ذہنی کش مکش سے گزر رہی تھی۔ گھر سے لے کر اسکول تک کسی ہی اسٹیشن پر جانے کی بات کا چرچا تھا۔ اس کے لیے یہی کیا کم اذیت کی بات تھی کہ وہ کسی طرح اسکول چلی جاتی تھی۔ کچھ لوگ اُسے دیکھ کر اظہار تاسف کرتے اور کچھ اس کی چال پر ہنستے یا کبھی کبھی اس کی نقل اتارتے۔ اس کی دلچسپی نہ ان لوگوں کے ساتھ تھی جو اسے قابل رحم سمجھتے اور نہ وہ ان سے نفرت کرتی جو اس پر ہنستے یا مذاق اڑاتے۔

وہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کسی نئی جگہ پر نہیں جانا چاہتی تھی وہ گھبراتی اور اپنا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں گزار دیتی۔ جب شام کے سائے بڑھنے لگتے اور سورج مغربی افق کی منڈیر پر بیٹھا تاریکی کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو تیار رہتا تو وہ بالکونی پر چلی آتی۔ اس کے مکان کے سامنے سڑک کے اس پار کھلا میدان تھا جہاں قرب وجوار کے بچے طرح طرح کے کھیل میں مشغول رہتے، دھما چوکڑی مچاتے اور وہ انھیں حسرت سے دیکھتی رہتی۔ کبھی وہ خود بھی ان کھیلوں میں شریک رہا کرتی تھی۔ لیکن آج ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

اس کے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں جنم لیتیں اور وہ مچل کر رہ جاتی۔ وہ بالکونی سے واپس اپنے کمرے میں چلی آتی اور اپنے کو کتابوں کی دنیا میں بھلا دینا چاہتی۔ وہ ارادہ کرلیتی کہ وہ پھر کبھی وہاں نہیں جائے گی مگر دوسری شام آتی اور اس کے سارے آہنی ارادے موم کی طرح پگھل جاتے۔ وہ دیوار و دل کا سہارا لے کر بالکونی پر آجاتی۔ دھیرے دھیرے دوسروں کے کھیل میں بھی اس کی دلچسپی سی ہوگئی۔ وہ اپنی قسمت پر قانع تھی اور حالات جب اختیار سے باہر ہوتے ہیں تو مفاہمت کرنا ہی پڑتی ہے۔

گرمی کی چھٹی جیسے ہی شروع ہوئی گھر کے سارے بچے اور ماں نینی تال کے لیے روانہ ہوگئے۔ گھر میں بس وہ، باپ اور ایک نوکرانی رہ گئے۔ نوکرانی گھر کے کام کاج میں لگی رہتی اور باپ دفتر سے ۸ بجے رات تک واپس ہوتا۔ اس نے ایک ہفتہ میں سارے ہوم ورک پورے کرلیے۔ کتابوں سے اکتا کر وہ بہت جلد بالکونی پر چلی آتی لیکن اب میدان بھی خالی خالی سا رہتا۔ زیادہ تر بچے سیر و سیاحت پر جاچکے تھے۔ وہ آتی جاتی موٹر گاڑیوں کا دور تک نظروں سے تعاقب کرتی، گاڑیاں نظروں سے اوجھل ہوجاتیں اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے بکھرا ان خلا پھیل جاتا۔

ایسی ہی بے کیف و سنسان شام کو وہ بالکونی سے لگی کھڑی تھی کہ نکڑ پر ایک لڑکا نظر آیا۔ کسی انجان جذبے کے تحت وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ جب وہ اس کے مکان کے قریب سے گزر رہا تھا تو اس کے منھ سے بیساختہ آواز نکل گئی "خالد!"

لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے اس عمل پر پچھتانے لگی۔ اس نے اس جانب سے نظریں ہٹالیں۔ اس نے دل میں سوچا ــــ خالد یہاں کہاں سے آئے گا؟ اس کے باپ کا تبادلہ تو کسی دوسری جگہ ہوچکا تھا۔

وہ لڑکا اس کی آواز سن کر رک گیا تھا اور اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ وہ اُسے بلائے یا کچھ اور کہے۔ جب کوئی اشارہ یا آواز نہیں ملی تو وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے پھر اس کی جانب دیکھا۔ لڑکے نے بھی ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ لڑکے نے آواز دی "پروین؟"

پروین اب اس کی جانب دیکھ رہی تھی لیکن اپنی تمام تر دلی خواہشوں کے باوجود اسے بلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کوئی اسے معذور و مجبور حالت میں دیکھے۔

خالد اس کے مکان کے سامنے آیا اور اس نے دریافت کیا "میں اوپر آسکتا ہوں؟"

پروین کی گردن اثبات میں ہل گئی۔ پلک جھپکاتے خالد اس کے پاس آگیا۔

"خالد تم ...... ؟ یہاں کیسے آگئے ؟"

"اوہو! تم شاید نہیں جانتی ہو۔ وہ دیکھو جو سفید مکان نکڑ کے پاس نظر آرہا ہے نا ــ ! وہ میری خالہ جان کا مکان ہے۔ خالہ جان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس سال انھوں نے گرمی کی تعطیل میں مجھے یہاں بلوا لیا ــ میں بھی یہ سوچ کر خوش تھا کہ یہاں آکر پرانے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ لیکن یہاں تو عجیب حال ہے۔ جس کسی کے بارے میں دریافت کیا جواب یہی ملا کہ وہ کہیں نہ کہیں چلا گیا ہے۔ یہاں آکر تو عجیب کش مکش میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ لیکن خالہ جان کا دل توڑ کر جا بھی نہیں سکتا .... ہاں تم اکیلی یہاں کیوں رہ گئیں ؟"

"تم سے ملاقات کیسے ہوتی اگر میں بھی چلی جاتی۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک بہانہ تراشا۔

اسی درمیان خالد کی نظر اس کی ٹانگ پر پڑی اور وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے فوراً جواب دیا "بہت خوش قسمت ہوں میں۔ اب روز ملاقات ہوا کرے گی۔ یہاں اور ہے بھی کون؟"

اس طرح شام کو آنا خالد کا معمول ہوگیا۔ وہ اس جگہ کے اسکول کے لڑکوں، اس شہر کے لوگوں، خاص خاص جگہوں کے بارے میں گفتگو کرتا اور رات ہونے سے پہلے چلا جاتا۔ ایک شام اس نے پروین سے کہا "ہم لوگ کم از کم پارک تک کیوں نہ چلیں وہ تو یہاں سے بہت قریب ہی ہے۔" پروین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظر اپنی ٹانگ کی جانب جھک گئی۔

اس سے پہلے کہ پروین کوئی جواب دیتی خالد نے پروین کو ساتھ دینے پر مجبور کر دیا۔ خالد نے اس حسن و خوبی سے سہارا دیا کہ پروین کو یہ محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ کسی کے سہارے سے چل رہی ہے۔ خالد کے اپنے قدم ایسے اٹھ رہے تھے جیسے پروین اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ پروین تھوڑی دیر بعد بھول گئی کہ وہ خالد کے سہارے چل رہی ہے۔

جب رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تو دونوں واپس لوٹ آئے۔ غرض یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب وہ بالکونی کی جگہ اپنے پھاٹک پر خالد کا انتظار کرتی اور جب وہ آجاتا تو دونوں ساتھ ساتھ پارک تک جاتے، وہاں بات چیت کرتے اور پھر لوٹ آتے۔ وہ بڑی بے چینی سے روز اس کا انتظار کرتی۔

ایک شام وہ انتظار کرتی رہی لیکن خالد نہیں آیا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ابھرنے لگے۔ وہ ٹکٹکی باندھے نکڑ کی جانب دیکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے سرمئی شام تاریک رات کے قالب میں ڈھل گئی۔ لیکن خالد کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ پھاٹک پر کھڑی ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس کے تصور میں وہ شام رقص کرنے لگتی۔ جب اس نے خالد کو بغیر کسی ارادہ پکارا تھا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا وہ خالد کا سہارا لیے پارک کی جانب جا رہی ہے۔

اسی وقت اس نے نکڑ پر لوگوں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھا۔ لوگ زور زور سے شور مچا رہے تھے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے ایک شخص کو ادھر سے آتے دیکھا تو فوراً دریافت کیا "وہاں بھیڑ کیوں اکٹھی ہو رہی ہے؟" اس شخص نے بغیر رکے جواب دیا "ایک حادثہ ہوگیا ہے۔" پروین نے محسوس کیا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ وہاں سے چل پڑی۔ وہ اس نکڑ پر آگئی اور بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندر گھسی۔ جیسے ہی اس کی نظر خون سے لت پت خالد پر پڑی ایک چیخ کے ساتھ وہ دھڑام سے زمین پر آگری اور بیہوش ہوگئی۔ اسی وقت لوگوں کا دھیان اس کی جانب گیا۔ اسے اٹھا کر گھر لایا گیا۔ قریب ایک گھنٹے کے

بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ اس کا باپ تشویش بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی نظر دائیں جانب گئی۔ تو اس نے خالد کو دیکھا جس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

"اب کیسی ہو، پروین؟" خالد نے پوچھا۔

"میں — ؟ مجھے کیا ہوا ہے؟" اس نے خالد کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ چوٹ ....."

"کیا کہوں! آج خالہ جان کو مٹھائی بنانے میں ذرا دیر ہو گئی" اس نے مٹھائی کا ایک پیکٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور جب میں جلدی جلدی یہاں آ رہا تھا تو مجھے ایک بکارے دھکا لگ گیا اور میں گر گیا۔ سر میں معمولی چوٹ آگئی ہے ... لیکن تم ...؟ تم وہاں کیسے دوڑ پڑی تھیں؟"

پروین کو ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ اسے خود حیرت تھی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ وہ بغیر سہارے ایک قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ اس وقت اس کی ٹانگ میں کہاں سے توانائی آگئی تھی کہ وہ دوڑ پڑی!

اب پروین کی ٹانگ کو نہ پٹی کی ضرورت ہے نہ اونچی ایڑی کے جوتے کی۔ اسے تنکے کے سہارے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

★

نازمرزاپوری : (صفحہ ۴۲ کا بقیہ)

طرح کیا ؎

خبر کیا ہے تجھے اے شمع پروانوں پہ کیا گزری
اٹھی جب رونقِ محفل، سیہ خانوں پہ کیا گزری
پیامِ مرگ پر لبیک کہنا ہی پڑا آخر
نہ دیکھا تم نے اس بیکس کے ارمانوں پہ کیا گزری

اس المیے کی خبر جب نازؔ صاحب کے استاد شفیق اعظمی کو ملی تو انھوں نے اعظم گڑھ سے اپنے تعزیتی خط میں یہ اشعار بھی لکھے ؎

شام کے چہرے پہ تھا رنگِ شفق کیا دلفریب
پڑ گئی لیکن پھر اس پر ظلمتِ شب کی نقاب
رونقِ خانہ تھا جو اس بزمِ امکاں میں کبھی
خاک میں مل کر وہ آخر ہو گیا خانہ خراب
ہاں قیامت ہے مگر مرگِ شریکِ زندگی
حق سکوں بخشے دلِ نازؔ حزیں کو اب شتاب

اس المیے کے بعد دنیا کی بے ثباتی اور مذہبیت ان کے ذہن و دل پر حاوی ہو گئی۔ چنانچہ اب نعت ان کے لیے اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ لیکن زیادہ تر نعتیں آپ اپنے شاگردوں یا خواہش مند افراد کو نعتیہ محفلوں میں پڑھنے کی غرض سے دے دیا کرتے تھے۔

اتر پردیش کے سابق گورنر بی گوپالا ریڈی نے نازؔ صاحب کے کلام کا مطالعہ کیا تو کہا "مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کا اندازِ سخن زالا تھا۔"

اگر نازؔ صاحب اور زندہ رہتے نیز اپنی تمام تخلیقات کو منظرِ عام پر لے آتے تو حقیقتاً انھیں بے حد شہرت حاصل ہوتی لیکن وہ اس عالمِ آب و گل سے بہت دور چلے گئے اور یہ کہہ گئے کہ ؎

کسی سے بھی طے ہوئے ہیں اب تک ازل سے لے کر فنا کے جادے
چلے تھے ہم نازؔ جس جگہ سے وہیں سے پھر ابتدا کریں گے

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب : خود کلامی شاعر : اظہر عنایتی رامپوری
قیمت : ۱۵ روپے کتابت طباعت و گرد پوش
دیدہ زیب ملنے کا پتہ : اظہر عنایتی ایڈوکیٹ محلہ شیخ کا چھجہ۔ رامپور

اظہر عنایتی دنیائے ادب میں متعارف، صف شعراء میں ممتاز اور بقول فیض "سچائیوں کے شاعر ہیں" ان کے کلام میں تغزل کی شان پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور چونکا دینے والے لہجے میں ماضی کی قدروں کے ساتھ حال اور مستقبل کی قدروں کا حسین امتزاج ملتا ہے اور ایک نیا اسلوب اختیار کرنے کا رجحان بھی نمایاں ہے۔ اظہر عنایتی ان پختہ کار غزل گو شعراء میں ہیں جن سے غزل کا وقار قائم ہے، ان کی غزلوں میں زلف کے سائے بھی ہیں اور سفر حیات کی کٹھن راہوں کی کڑی دھوپ بھی، وہ ادب کو معاشرتی زندگی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور مادی و سماجی حقیقتوں کو اپنی شاعری میں اجاگر کرتے ہیں۔ وہ روشن ضمیر، بیدار ذہن، حساس اور کہنہ مشق غزل گو ہیں جن کی غزل کا ایک شعر طویل نظم کا کام دیتا ہے مثلاً ؎

راستو کیا ہوے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

اظہر عنایتی بہ لحاظ پیشہ ایک کامیاب وکیل ہیں، حیرت ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ایسی زندہ رہنے والی شاعری کے لیے وقت نکال لیتے ہیں جو سکر دفن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں جدیدیت تجریدی طرز احساس سے نہیں آتی بلکہ جدید طرز احساس کو غزل کی روایات میں کھپانے کی کوشش سے آتی ہے، وہ جدید اردو غزل میں ممتاز حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ "خود کلامی" جدید اردو غزل میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ امید ہے کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

چند اشعار دیکھیے ؎

کسی کی مست نگاہوں میں ڈوبنا اظہر — بڑا حسین سمندر ہے خودکشی کے لیے
سا از خلوص روح کی گہرائیوں میں ہے — یہ جھوٹ میرے عہد کی سچائیوں میں ہے

جانے کیا مانگتے ہیں مجھ سے وہ معصوم ہاتھ — جن کی قسمت کوئی مٹھی کا کھلونا بھی نہیں
اس راستے میں جب کوئی سایہ نہ پائیگا — یہ آخری درخت بہت یاد آئے گا
تو شہر بھر کے جلتے چراغوں کا نسل کر — میں سرپھری ہوا! تجھے بادِ صبا کہوں
حالات یہ کہ اینٹ کا پتھر سے دوں جواب — احساس یہ کہ اپنے جرم کو کیا کہوں

——— عرفان عباسی

ماہنامہ شاعر، بمبئی (ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام)
مدیر اعلا : افتخار امام صدیقی
زر سالانہ : ۲۵ روپے۔ اس نمبر کی قیمت : آٹھ روپے
پتہ : مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸
سہ رنگا ٹائیٹل۔ خوبصورت کتابت و طباعت۔

باون سال سے مسلسل شائع ہونے والا ماہنامہ شاعر اپنے مزاج و معیار کے اعتبار سے منفرد اور محتاط ادبی جریدہ ہے۔ اس کے بانی سیماب اکبرآبادی تھے۔ اسے زندۂ جاوید بنانے کے لیے مرحوم اعجاز صدیقی نے ساری عمر جد و جہد کی اور اب سیماب مرحوم کی تیسری نسل کے فرزند تاجدار احتشام صدیقی کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے کہ ہندستان سے باہر وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اردو کے تمام اہلیان قلم اس کے عام شماروں اور خصوصی اشاعتوں کی حفاظت اور قدر کرتے ہیں، ابتک جتنے بھی پرچے شاعر کے مخصوص جریدے کی حیثیت سے منظر عام پر آئے تحقیق و تخلیق کے اعتبار سے مستند اور تاریخی ثابت ہوئے۔

زیر نظر شمارہ خاص نمبر جو سنہ ۱۹۸۰ء کے نام ہے اسے تاجدار احتشام صدیقی مرحوم کی نظر کیا گیا ہے۔ اردو کے بہترین لکھنے والوں نے اس کو تعاون پیش کیا اس میں معلوماتی اور منفرد مضامین کی بھرمار ہے فلسفہ، عروض، موسیقی، ڈرامہ، افسانہ اور اسی طرح سے اصناف مختلفہ پر تحریریں شامل ہیں سنہ ۱۹۸۰ء میں اردو کے جن مصنفین، ادبا اور صحافیوں نے اس دار فانی کو خیرباد کہا، انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مدیر نے بڑی محنت سے مواد فراہم کیا ہے ۴۰۴ صفحات پر محیط یہ ضخیم نمبر ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔

ظ انصاری کا پریم چند، عزیز اندوری کی تلخیص! "شعلہائے زنداں

رحسرت ... ایمانی) ڈاکٹر مسعود حسین خاں: فلسفۂ اقبال کے بعض مسائل
سید مبارک علی: غالب کی ایک متنازعہ فیہ رباعی، رفیع اللہ انصاری:
ساحر اور ساحری، کالی داس گپتا رضا: ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری
مرحوم، رشید اختر مجیبی: ژاں پال سارتر حیات و فن وغیرہ
کے علاوہ اور بھی دوسرے مقالے یا خاکے جامع ہیں اور حصۂ نظم
بھی جاندار ہے۔

آخر میں کتب و رسائل کے عنوان سے ۱۲ صفحات پر تعارف
اور تبصرہ ہے جس میں ۱۹۸۰ء کی کم و بیش ڈیڑھ سو مطبوعات شریک
ہیں یہ بھی اس پرچے کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ ایک
بڑی تعداد میں لکھنے والے اس سے جڑے ہوئے ہیں۔

ہفت روزہ "بستی کی آواز": قاضی محمد عدیل عباسی نمبر
قاضی نمبر کی قیمت: تین روپے (عام شمارہ ۵۰ پیسے)
پتہ: گاندھی نگر بستی — ۲۷۲۰۰۱

ڈاکٹر اختر حبیب خاں کی ادارت میں ہفتہ وار "بستی کی آواز"
اپنی عمر کے دوسرے برس میں گامزن ہے۔ زیرِ نظر شمارہ ملک کے مشہور
دانشور، اردو کے مخلص اور فعال رہنما قاضی عدیل عباسی مرحوم کے
نام معنون ہے۔ رنگین ٹائیٹل کے ساتھ پچاس صفحات پر پھیلا ہوا یہ
نمبر قاضی عدیل عباسی کی یاد میں ان کی پہلی برسی کے موقع پر
شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی نے اسے خوب صورت ترتیب و
تزئین اور سلیقے سے آراستہ کیا ہے۔ صفحہ ۷ پر اپنے مفصل مضمون میں
موصوف نے قاضی صاحب کے کارناموں اور خدمات پر روشنی ڈالی
ہے۔ صفحہ ۹ پر جناب ڈاکٹر محمود الٰہی (صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی)
نے اپنے مختصر مگر معیاری مضمون میں ان کی شخصیت اور نظریات کو منکشف
کیا ہے۔

جناب حیات اللہ انصاری نے بڑے سادہ و سہل پیرائے میں اپنی
رفاقت کی آمیزش کے ساتھ ان کی تصویر کشی کی ہے
اردو کے سلسلے میں قاضی عدیل عباسی کے علم و عمل اور جد و جہد
پر نہایت تحقیقی انداز میں ایک بہت اچھا مضمون جناب ڈاکٹر اطہر
فاروقی (گورکھپور یونیورسٹی) نے بھی تحریر کیا ہے جو ٹھوس معلومات
فراہم کرتا ہے۔

دیگر لکھنے والوں میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ریاض الدین احمد
رام لعل، خلیل الرب، قاضی جلیل عباسی (ممبر پارلیمنٹ) حکیم ابوالکلام
صدیقی، محمد حامد علی، ڈاکٹر ہنومان پرشاد سری واستو اجگر، قاضی
محمد ارشد عباسی وغیرہ کے مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
آخری صفحات میں قاضی صاحب کی ڈائری کے اوراق سے تحریریں
ڈاکٹر اختر بستوی نے ترتیب دی ہیں۔
مضامین کے درمیان شعرا کا منظوم خراج عقیدت بھی خاصے
کی چیز ہے۔

بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نمبر موجودہ صدی کی عظیم شخصیتوں کے
درمیان اور قاضی عدیل عباسی کے کارہائے نمایاں کے شانہ بشانہ
۱۹۲۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ہندوستان کی زینہ بہ زینہ تبدیلیوں
کی ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اور جو تحریکیں انقلاب یا مجاہدے
اس ساٹھ برس کے عرصے میں رونما ہوئے ان کی عکاسی یا ان کے حوالے
کے لیے بھی یہ نمبر ایک سند رکھتا ہے۔
ادارہ بستی کی آواز واقعی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے
ایک بلند پایہ شخصیت پر اتنے وقار و اعتبار کے ساتھ نمبر شائع کیا۔

——— تسنیم فاروقی

اجگر

(صفحہ ۴۰ کا بقیہ)

ہے تو ایک کونے میں حوض بنوایا جاتا ہے جس میں صاف
پانی بھرا رہتا ہے۔ اس میں اکثر وہ جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ کمرے
کے ایک رخ میں موٹی جالی یا سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ بیچ
میں ایک ہرا درخت لگا دیتے ہیں یا سوکھے درخت کا دو شاخہ
گاڑ دیتے ہیں جس پر چڑھ کر اجگر لٹک جاتا ہے۔ اسے
اکثر قبض کی شکایت ہو جاتی ہے اور یہ حاجت رفع کرنے
کے لیے درخت کی ڈال سے لپٹ جاتا ہے اور اپنی دم کو بار
بار جھٹکتا ہے۔ بسا اوقات اس کے رہنے کے لیے کنوئیں کی
شکل کے گہرے اور چوڑے گڑھے بنائے جاتے ہیں جن کی
دیواریں چکنی ہوتی ہیں تاکہ یہ ان پر چڑھ نہ سکے۔
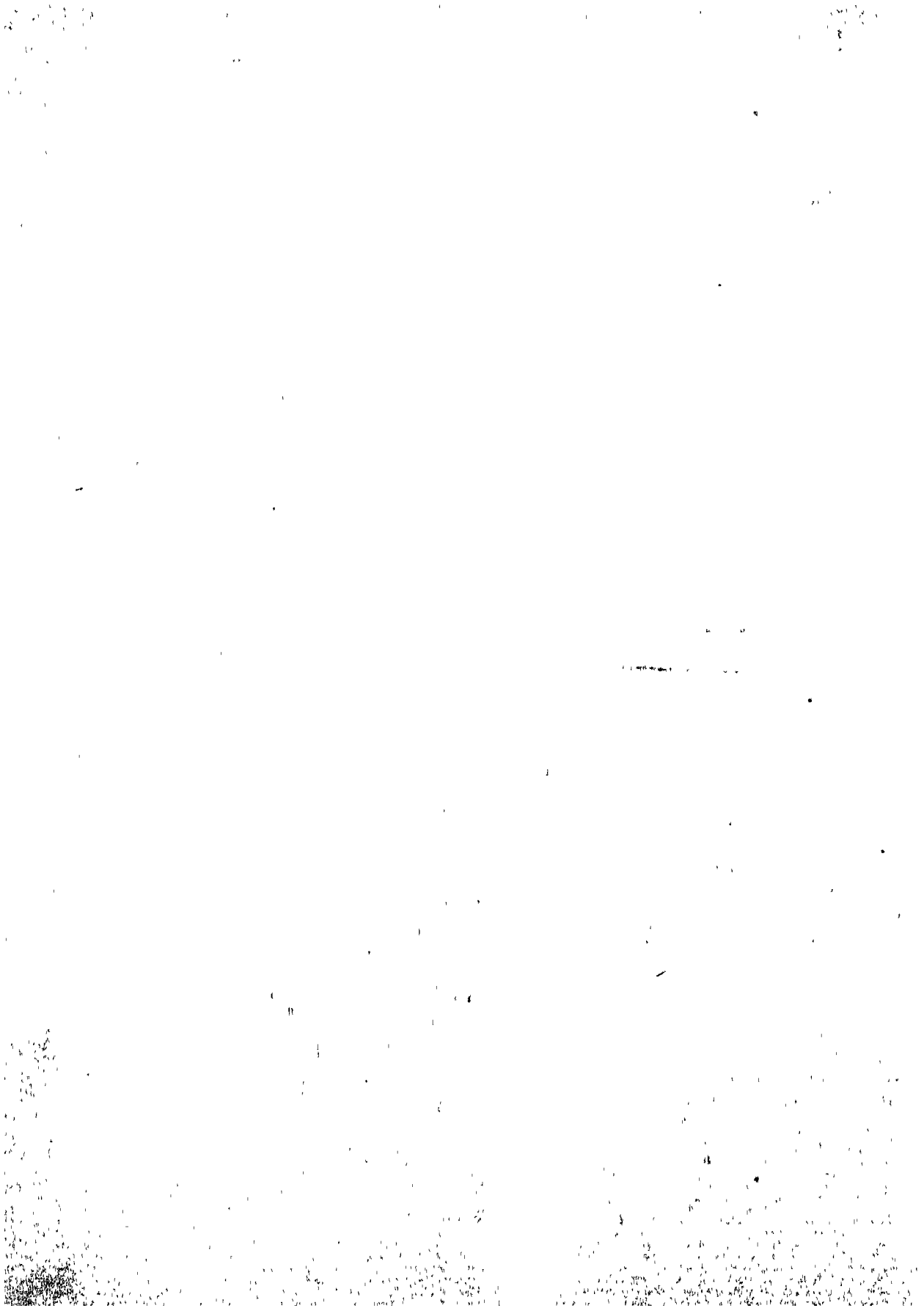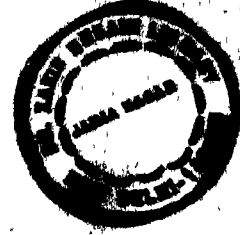
ماہنامہ
نیادور

جلد ۳۶ | نمبر ۹

دسمبر ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

ناشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ ... محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۴۶، لکھنؤ

...: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ... یوپی لکھنؤ

عنوانات
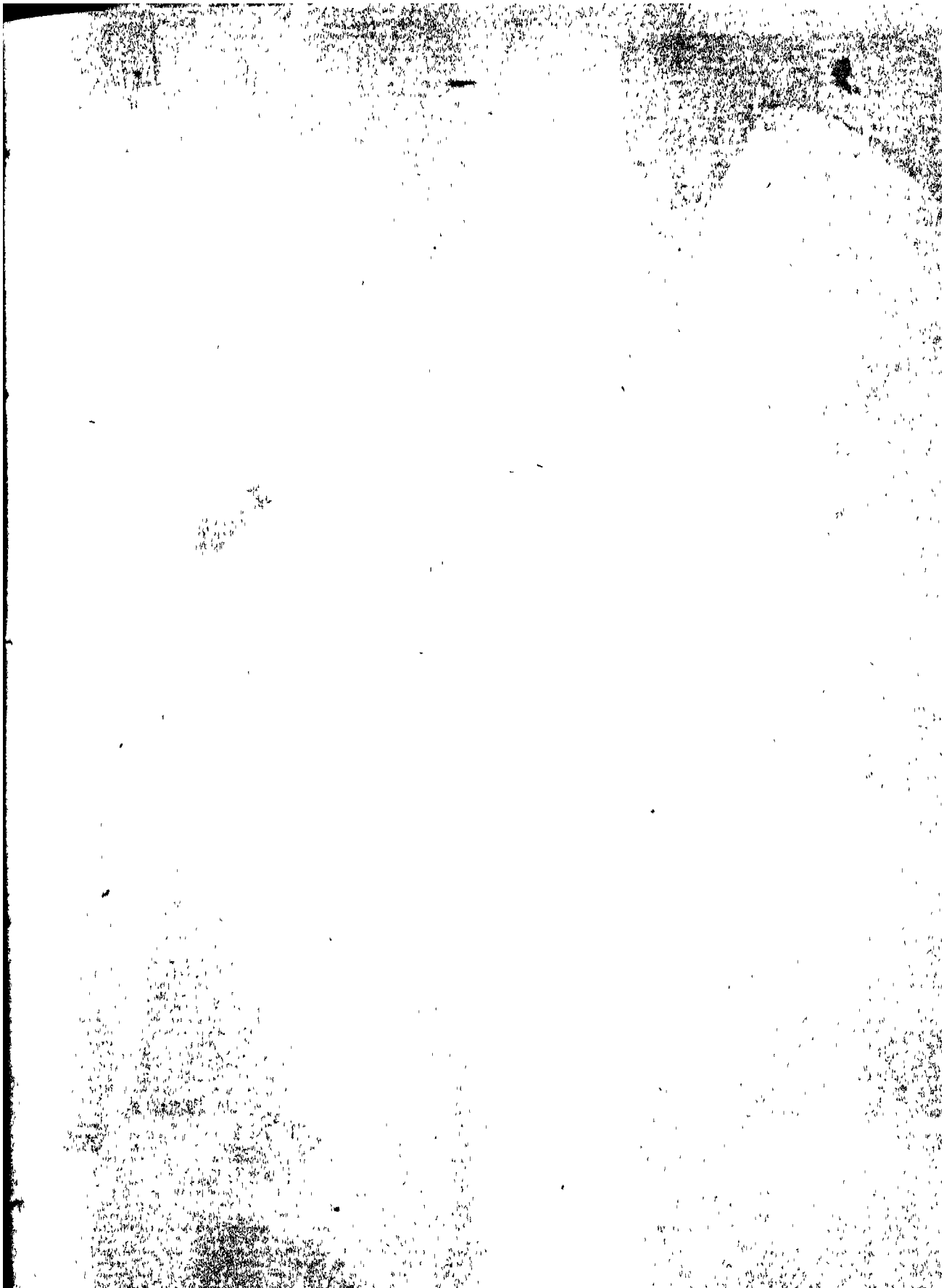
نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت بھی ان سے ہر حال متفق ہو

اپنی بات

اتر پردیش کے ضلع مین پوری کے ایک گاؤں دیولی میں ۱۸ نومبر کو ہریجن برادری کے ۲۴ افراد کے سفاکانہ اجتماعی قتل کے بعد وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۲۴ نومبر کو اپنی ایک پریس کانفرنس میں اس واقعہ پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اگر ایک ماہ کے اندر مجرموں کو ٹھکانے نہ لگا دیا گیا اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کوئی موثر اقدام نہ کیا جا سکا تو وہ ۲۴ دسمبر کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ دیولی کے واقعہ کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان میں نے کافی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس دکھ بھرے واقعہ پر میں نے کافی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا۔ ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ذمہ داری میں نے جذبات کی رو میں قبول کی تھی بلکہ میرے دل و دماغ میں یہ بات تھی کہ میں ریاست کا وزیر اعلیٰ ہوں، عوام حکومت سے اس کی کارکردگی کے اچھے نتائج چاہتے ہیں۔ نہ کہ بہانے اور عذر۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ جمہوری نظام میں صحت مند روایات قائم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور میرے خیال میں عوام کی تمناؤں کو پورا کرنا ہی کسی عہدے کے وقار کی بنیاد ہونا چاہیئے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ میرے سامنے دو ہی راستے تھے پہلا یہ کہ اس اخلاقی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے فوراً مستعفی ہو جاؤں اور دوسرا راستہ یہ ہو کہ مردانگی کے ساتھ چیلنج کا مقابلہ کروں۔ بہت غور و فکر کے بعد بالآخر میں نے دوسرا راستہ اپنایا ہے اس لیے اب میں عوام کی خدمت اور عوام کے تحفظ ان دونوں کاموں میں اپنی آخری طاقت لگانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے میدان میں مرنا قبول ہے۔ میدان سے بھاگنا قبول نہیں۔

وزیر اعلیٰ کا یہ عہد بلاشبہ ڈاکوؤں اور سماج دشمن عناصر کی سرکوبی اور عوام کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں ان کے خلوص اور عزم مصمم کا آئینہ دار تھا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں جاہ و اقتدار کی تمنا نہیں ہے اور وہ عوام کے سچے خادم ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانے اور انہیں تحفظ اور تحفظ کا احساس فراہم کرنے کی خاطر وہ اپنے عہدے سے بھی دستبردار ہو سکتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کے اس عہد نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کی مہم میں ایک نئی جان ڈال دی اور ریاستی پولیس کے حوصلے بلند کر دیئے۔ یہ مہم اپنے پورے زور و شور سے جاری ہے اور ایک ماہ کے اندر ہی اس کے نتائج نے عوام میں تحفظ کا ایک نیا احساس بیدار کر دیا اور وزیر اعلیٰ کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ عوام ریاست کو تحفظ خوشحالی اور ترقی سے ہمکنار کرنے کے لیے ان کی قیادت کو ناگزیر سمجھنے لگے حتیٰ کہ پردیش کانگریس کمیٹی اور پارلیمانی بورڈ نے اپنے ایک مشترکہ جلسے میں ان سے کہا ہے کہ وہ استعفیٰ نہ دیں، اس لیے کہ ان کا عہد پورا ہو گیا ہے۔ دریں اثنا سرکاری اطلاعات کے مطابق ۱۰۳ ڈاکو پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور ۱۰۰ گرفتار کیے گئے۔ دیولی سانحہ کے ذمہ دار ۱۷ افراد میں سے دس کو ہلاک یا گرفتار کیا جا چکا ہے اور تین از خود حاضر ہو چکے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نہ صرف ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے سرگرم ہیں بلکہ وہ اپنی دوراندیشی سے ان معاشی اسباب کا سدباب کرنا چاہتے ہیں جو مجرمانہ رجحان کو جنم دیتے ہیں اور جرائم کی بنیاد بنتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ریاست کے ڈاکوؤں سے متاثرہ ۱۲ اضلاع یعنی ایٹہ، اٹاوہ، مین پوری، فرخ آباد، آگرہ، کانپور (دیہات)، بدایوں، جالون، للت پور، جھانسی، ہمیر پور اور باندہ میں ڈاکے کی لعنت ختم کرنے اور ان علاقوں کو خوشحالی سے ہمکنار کرنے کے لیے ایک اسکیم کا اعلان بھی کیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا ہے کہ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے ایک کمانڈو دستہ بنایا جائے گا جس کو مخصوص فوجی تربیت دی جائے گی اور اس میں سابق فوجیوں اور پولیس اور پی۔ اے۔ سی کے چیدہ افراد کو شامل کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا ہے کہ ایک ماہ کی کارکردگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مہم ختم ہو گئی بلکہ اب تو ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور ہم نے جس علاقہ میں جتنی پولیس لگا رکھی ہے اس کی تعداد گھٹائی نہیں جائے گی بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ اس مہم کا نتیجہ ہے کہ عوام کے جان و مال سے کھیلنے والوں اور بے گناہوں کو پریشان کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ہے اور ان میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔ بہرحال وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں سماج دشمن عناصر اور ڈاکوؤں کے خلاف مہم جس شدت اور جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے اس کے پیش نظر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ریاست کو ان کی بیخ کنی سے نجات ملے گی۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

مجروح سلطانپوری
۱۰، چائے کالونی جوہو
بمبئی

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

راس آئے تو ہر سر پہ بہت چھاؤں گھنی ہے
ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

لوگو مری گلکاریِ وحشت کا صِلہ کیا
دیوانے کو اک حرفِ دلآویز بہت ہے

مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنّا
آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

مجروح سُنے کون تری تلخ نوائی
گفتارِ عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

نجیب [illegible]
٥٥، سروپ نگر ۔ کانپور

مرزا رسوا شخصیت اور فن

اُردو ادب اچھے ناولوں کے لیے ہمیشہ گلہ مند رہا ہے ناول کا فن اپنے خدوخال کے ساتھ اردو زبان میں امراؤ جان ادا سے پہلے نہیں نظر نہیں آتا ہے۔ ناول اور مختصر افسانہ مغربی زبانوں میں اٹھارویں صدی میں نشو و نما پانے لگے تھے۔ صنعتی انقلاب نے بقول اقبال مغرب کو دگرگوں کر دیا تھا سہ

چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی ہے انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

یہ انقلاب اپنے ساتھ انقلاب فکر و نظر بھی لایا تھا جس نے اوقات اور فرصتوں کی طنابیں کھینچ دی تھیں۔ یہ صنعتی پیش رفت، تہذیب تمدن، مذہب اور سیاسی فکر و نظر کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ مسابقت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ادب کی بنیاد سوسائٹی یا سماج پر استوار ہوتی ہے اور ادب ہر تاثر سماج سے قبول کرتا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی مغرب کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں ادب کا ایک نیا تصوّر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عرفان ذات کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ انداز زیست کی ہر ادا کو ادب اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ مختصر افسانہ اور ناول اسی تہذیبی اور بحرانی رست و خیز کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مشرق (جاپان کو چھوڑ کر) آج بھی مادّی لحاظ سے مغرب سے سو سال پیچھے ہے، یہ فرق یا خلاء ہر دور میں برقرار رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کی لہریں ہندوستان میں کم و بیش ڈیڑھ سو سال کے بعد پہنچی تھیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مختصر افسانہ اور ناول یہاں صحیح معنوں میں روشناس ادب ہو سکے تھے۔ ناول کی ابتدا کہنے کو تو انیسویں صدی کے آخر میں ہو چکی تھی مگر وہ ناول، ناول کے آب و رنگ سے خالی تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی کوششوں کو ہم اگرچہ قابل قدر کہہ سکتے ہیں، تاہم ان کے ناول، ناول کے فن پر پورے نہیں اترتے ان میں تمثیلی رنگ بہت گہرا ہے۔ "توبۃ النصوح" ہو یا "ابن الوقت" ان میں کردار کا ارتقاء تو نظر آتا ہے لیکن کردار کے بانکپن کا دامن نظر نہیں آتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ناول دو لخت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اور ان کے دوسرے ہم عصر داستانوں کی گرفت میں تھے۔ اس حصار کو توڑ کر باہر نکلنا بڑی بات تھی۔ مگر یہ اعتراف ضرور کر لینا چاہیے کہ ان لوگوں کے یہاں یہ کوشش ضرور نظر آتی ہے کہ داستانوں کے روایتی طول کو توڑا جائے۔ ابن الوقت میں ڈپٹی صاحب اپنے تمام ناولوں سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ ان کا آخری ناول ہے، اس پر ان کے فن کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک مخصوص پلاٹ یا منصوبہ بندی سے اس ناول میں کام لیا ہے۔ مگر تمثیلی انداز اور ناصحانہ طرز فکر نے اس ناول کی شکل کو جگہ جگہ سے مسخ کر دیا ہے۔ اسی عہد کا دوسرا کارنامہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ضخیم ناول فسانۂ آزاد ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس عہد کا ہر ذہن داستانوں کے بھاری پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔

اس لیے اس کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ داستانیں ہمارا تہذیبی سرمایہ بن چکی تھیں۔ ان کی افادیت چوپالوں سے کر انجمنوں کی محفل تک مسلم تھی۔ ذہن و فکر داستان نویسی اور قصہ گوئی کے اسیر تھے پلاٹ پر کہیں گرفت مضبوط نہ ہو سکی۔ جب ہم رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی صاحب کے ناولوں کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ سب سے بڑی برکت اور سعادت ہمیں ان ناولوں میں یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے کردار کو ارفع و اعلیٰ مقام سے روشناس کر دیا تھا۔ جب پلاٹ پر اور ناول کے دوسرے مبادیات پر ہماری گرفت مضبوط ہوئی تو کردار کا ارتقاء ہمارے ہاتھوں مجروح ہونے لگا۔ اگر رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی صاحب کے ناولوں کو دریا برد کر دیا جائے تو بھی ان کے کردار ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے۔ آج ناول کے فن نے بڑی ترقی کی ہے اور اس کے ڈانڈے دوسری زبانوں کے بہترین ناولوں سے مل چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ کردار کشی بھی ہوئی ہے۔ ہم کردار کے تدریجی ارتقاء کو کاغذ پر منعکس کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اور سرشار کے کردار آج بھی مجسم نظر آتے ہیں۔ اردو ادب کا کوئی بھی طالب علم ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مرزا ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، خوجی اور آزاد وہ ستارے ہیں جو افسانوی ادب کے آسمان پر ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔

موجودہ اردو ناول کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ اس نے ترتیب اور تکمیل فن کی طرف تو پیش رفت کی ہے لیکن اس کی گرفت کردار کی تخلیق پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ پرانے ناول نگار اسی لیے زندہ رہیں گے کہ انھوں نے جاوداں کردار عطا کیے۔ وہ کردار جو ہماری روایت بن گئے ہیں۔ وہ کردار جو ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہماری فکر کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

کردار نگاری کا فن انگریزی ادب میں اپنی ترقی یافتہ شکل میں نظر آتا ہے لیکن اردو میں بھی خوجی، آزاد، ظاہر دار بیگ کے کردار ڈان کیخوٹے (DON QUIXOTE) کو شرماتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم براہ راست امراؤ جان ادا کے حدود و تجزیہ پر اظہار خیال کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو میں ناول کے فن کے ارتقاء اور مشرقی فضا پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔ ماحول اور خارجی رنگ و آہنگ سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔ وراثت انسانی زندگی میں بڑا دخل رکھتی ہے۔ روایتوں کی وراثت وہ تیز نشتر ہے جو نہ جانے کیسے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ وراثت ایک ایسا حصار ہے کہ جس کو توڑنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ کچھ خاص انسان ہوتے ہیں جو ان حصاروں کو توڑنے کی سکت، قدرت کی طرف سے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہم مشرقی لوگ ہمیشہ سے قطرے میں دجلہ دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ دجلہ میں قطرہ دیکھنے کی ہم نے کبھی جستجو ہی نہیں کی۔ گہرے سمندروں کو کھنگالنا ہم نے کبھی پسند نہیں کیا۔ غالب نے کہا ہے۔ ؎

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اسی زاویۂ فکر نے ہمیں اشاریت پسند بنا دیا اور ہماری محبوب صنف سخن غزل ٹھہری۔ ناول کے تذکرے میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اسی بات کو یوں کہتے ہیں:

"ہم چاول کے دانے پر قل ہو اللہ تو لکھ سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کو پوری تفصیل کے ساتھ آئینہ بند نہیں کر سکتے۔"

ہمارے ذہن کی پرورش غزل کی دھن پر ہوئی ہے۔ وہ غزل جس کا ہر شعر اپنے ماسبق سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ جس کے ہر شعر میں ایک جہانِ معنی کو آباد کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ بیانیہ اسالیب فکر میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ تفصیل پر گرفت مضبوط نہیں کر سکے اور جب بھی آنکھ کھلی تو اپنا ہی دامن اپنے ہاتھوں میں نظر آیا۔ خارجی اسباب و علل کو ہم نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ہم دل کے شیدائی رہے ہیں۔ جو کچھ دل کے آئینے میں نظر آیا اسی کو کائنات سمجھے۔ خارجی دنیا سے ہمارا رشتہ دل کی معرفت استوار ہوتا ہے۔ میر صاحب نے بھی اسی کو سب کچھ سمجھا ہے۔ وہ آنکھوں کو دنیا کی طرف نہیں بلکہ دل کی طرف موڑتے رہے۔ ؎

میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور — اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا

دنیا کی طرف ہماری جو متوازن توجہ ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہوسکی۔ ہم نے اس کی بھی جستجو نہیں کی کہ دل اور دنیا ہم رشتہ ہو جائیں۔

ناول کے کچھ نقادوں نے مشرق کے موسم کو بھی اس کیفیت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے موسم ہمارے ذہن کو یکسوئی کے ساتھ سوچنے کا موقع نہیں دیتے۔ گرم موسم ہمیں جلد تھکا دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مشرق میں جہاں کہیں بھی تفصیلی اصناف ادب کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی ہیں وہاں کا موسم نسبتاً خوشگوار تھا۔ یہ بات فردوسی اور مولانا روم کی مثنویوں کے کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ ناول اور مختصر افسانہ دونوں ہی جدید ترین نثری اصناف ادب ہیں۔ مندرجہ بالا مثالیں اور خیالات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ واقعی مشرق آب و ہوا کسی صنف ادب میں ہماری کامیابی اور ناکامی کا پیش لفظ ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ اردو مختصر افسانہ مختصر سی مدت میں ترقی کی ہر منزل طے کر گیا ہے۔ اب اردو مختصر افسانہ سنگ میل اور نشان راہ کا کام انجام دے رہا ہے۔ دنیا کی تمام زبانیں اردو مختصر افسانہ کی اس کامیابی پر حیران ہیں۔ ناول اگر ایک طرف ہمیں تڑپا رہی ہے تو دوسری طرف مختصر افسانہ ہمارے زخم کا مرہم بن گیا ہے۔

لکھنے والوں نے سمجھ لیا ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا ہے کہ مختصر افسانہ کی اس کامیابی کی گرہیں کہاں کھلتی ہیں۔ ہم اس مرحلے پر اس مماثلت کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو غزل اور مختصر افسانہ میں قدر مشترک کی طرح موجود ہے۔ غزل کا ہر شعر زندگی کے کسی ایک پہلو اور کسی ایک رخ کو تابناکی بخشتا ہے۔ ہمارے سینکڑوں برس کے تجربات کا نچوڑ اشاریت کے پردے میں اس مخصوص تجربے یا مشاہدے کی غمازی کرتا ہے۔ یہی کیفیت مختصر افسانے کی ہے جس میں کردار کا تدریجی ارتقا کوئی معنویت نہیں رکھتا بلکہ کسی ایک کردار کا کوئی ایک مخصوص تجربہ، حادثہ، یا سانحہ وقت اور لفظ کی گرفت میں آتا ہے۔ لیکن غزل کے ایک اچھے شعر کی طرح یہ تجربہ یا مشاہدہ تنہا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا رشتہ ہماری ہزاروں سال کی تہذیب اور زندگی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس مطلب اور معنی کی ادائگی کے لیے میر کا ایک شعر پڑھنا ضروری ہے۔ ؎

صد رگ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

اس پوری تمہید کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ہم مختصر افسانہ اور غزل میں اپنی کامیابی، ناول اور طویل منظومات میں اپنی ناکامی کی جہت تلاش کریں۔ بہر حال یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ناول کے فن میں ہماری ناکامی کی بنیادی وجہ ہمارے ذہن کی مخصوص ساخت اور سینکڑوں برس کی تہذیب اور طرز فکر ہے۔

طویل بیانیہ اصناف نثر میں داستانوں سے ہم واقف ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ طویل بیانیہ اصناف داستانوں کی شکل میں ہمارے یہاں موجود ہیں تو پھر ہم ناول کے میدان میں کیوں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہاں میں صرف یہ کہوں گا کہ داستانیں ایک طویل دھوکہ ہیں۔ ان کا شمار ہم طویل بیانیہ اصناف نثر میں نہیں کر سکتے۔ طلسم ہوشربا ہو یا آفتاب عالم کے دفاتر یہ سب طوالت کا الزام اپنے سر پر ضرور رکھتی ہیں لیکن حقیقتاً اپنے آپ میں یہ طویل نہیں ان کی طوالت الف لیلیٰ کی سی ہے جہاں ہزار کہانیاں دامن سے دامن کو جوڑے ہوئے ایک قطار میں کھڑی ہیں۔ داستانیں ظاہری طور پر ہم رشتہ معلوم ہوتی ہیں لیکن باطن میں یہ تعلق نہیں ہے۔ ایک داستان ہزاروں مختصر کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے رہتی ہے۔ یہی چیز ہمیں باغ و بہار میں نظر آتی ہے اور یہی کیفیت فسانۂ عجائب کی بھی ہے۔ فسانۂ آزاد اسی لیے ناول کے زمرے میں نہیں آتا کیونکہ اس میں وحدت کا تاثر قائم نہیں رہ پاتا۔ مختلف سلسلوں کو ایک لڑی میں پرونے کی ناکام کوشش ہر داستان کا بنیادی کردار ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے مختصر افسانہ، داستان اور اردو غزل کے پس منظر میں ناول کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں اپنی کوشش پر شرمندہ نہیں ہوں اس لیے کہ پس منظر کے بغیر ہم اپنی منزل کو تلاش نہیں کر سکتے۔ مندرجہ بالا سطور میں داخلی طور پر ہمارا ذہنی اور سماجی پس منظر زیر بحث لایا گیا ہے۔ لہٰذا

اب ہم پھر ناول کی طرف واپس چلتے ہیں تاکہ امراؤ جان ادا کا بہ حیثیت ناول جائزہ لے سکیں۔

اس مضمون کے شروع میں ہی یہ بات کہی جا چکی ہے کہ اردو زبان میں وہ تحریریں جن پر ناول کا اطلاق ہو سکے، نذیر احمد کی کوششیں ہیں۔ توبۃ النصوح، بنات النعش، مراۃ العروس اور آخر میں ابن الوقت ایسی کتابیں ہیں جنھیں ہم بجا طور پر ناول کہہ سکتے ہیں۔ ناول صرف فکر سے بنتا ہے۔ ایک مستقل سوز ناول کی بنیاد ہے۔ وحدت خیال کو بھی آپ اسی میں شامل کر سکتے ہیں۔ یہاں کردار کا تدریجی ارتقا بھی ہے اور منزل کا تعین بھی۔ پوری زندگی ایک اکائی کے طور پر برتی بھی گئی ہے مگر خامی یہ ہے کہ یہاں تمثیل نے ہر حسن کو عیب کی چادر اڑھا دی ہے۔ تمثیل نگاری سے ناول کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہاں نصیحتوں کے دفتر بھی نہیں کھولے جا سکتے۔ یہاں پر ہم صرف زندگی کو اس کے اپنے خد و خال کے ساتھ متحرک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی پسند یا ناپسند سے بے نیاز ہو کر زندگی کے حقائق کی تلاش کرتے ہیں۔ عیب و ہنر سے ہمیں سروکار نہیں رہتا۔ ابن الوقت میں ذاتی خیالات، ذاتی پسند اور ناپسند کو پوری زندگی پر تھوپنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ ابن الوقت میں پند و نصیحت کے دفتر کو بے کیف طوالت دی گئی ہے۔ قدم قدم پر یہاں مناظرے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دلائل و براہین راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قدیم و جدید کی اس جنگ میں ڈپٹی صاحب اپنے سر فتح کا سہرا باندھنا چاہتے ہیں۔ یہی خواہش سم قاتل ہے۔ اگر یہ جنگ غیر جانبدارانہ انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دی جاتی اور فیصلہ اس کے سپرد ہوتا تو اس ناول کی قدر و قیمت کچھ اور بڑھ جاتی۔

ابن الوقت کے بعد بہت سے ناول لکھے گئے۔ بہت سے ناول نگار سامنے آئے لیکن ناول کے فن کو نظر میں رکھ کر ناول کے مطالبات کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری نے بے شمار تہذیبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، اصلاحی، رومانی ناول لکھے لیکن ناول کا فن ان کوششوں سے چمک نہ سکا نہ اس فن کی ان کوششوں سے نمود ہو سکی۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے شروع میں صرف ایک ناول نگار یقیناً ایسا پیدا ہوا جس نے اردو میں ناول نگاری کی لاج رکھ لی۔ میری مراد مرزا محمد ہادی رسوا سے ہے۔ جب ہم مرزا صاحب کی شخصیت کو بہتر یعنی آئینہ در آئینہ دیکھتے ہیں تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ واقعی ناول کا فن بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ جسے ہر شخص برت سکے۔ مرزا کی شخصیت ان کے فن سے عظیم تر ہے۔ یہی بات ہم گولڈ اسمتھ (GOLDSMITH) اور ہارڈی (HARDY) کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر تجربہ، دنیا کا ہر زہر جب کسی شخص میں جذب ہو لیتا ہے تب زندگی کی تفسیر ہوتی ہے۔ اردو میں صرف رسوا ہی ایسے فنکار ہیں جن کی شخصیت کا مطالعہ ہمیں چونکا دیتا ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں رہتے ہوئے ایک فنکار کو اتنے گونا گوں تجربات و مشاہدات کی اجازت حاصل تھی؟ مرزا صاحب کی شخصیت کا علم یا عرفان ہمارے اس علم کی توثیق کرتا ہے جو ہم نے ایک سچے فنکار کے بارے میں مختلف زبانوں کے مطالعے سے حاصل کیا ہے۔ گولڈ اسمتھ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جب بارہ سفر کر لیے جاتے ہیں تب ایک کہانی جنم لیتی ہے۔ اس بیان سے آپ مبالغہ کو نکال دیں تب بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کا تجربہ اور دنیا کا عمیق مشاہدہ ایک فنکار کے لیے کتنا ضروری ہے۔ کبھی کبھی اخلاقیات کا سبق اور اخلاقی حد بندیاں ہمیں ان دائروں سے پرے رکھتی ہیں جہاں زندگی نسبتاً اپنے مکروہ یا گھناؤنے خد و خال کے ساتھ زیادہ موجود ہوتی ہے۔ مذہب، اخلاق و شرافت کے روائتی سانچے اور اصول ایسے گوشوں کی طرف جھانک کر دیکھنے پر حکم لگاتے ہیں۔ فنکار کس طرح پوری زندگی کو ایک اکائی یا وحدت کی شکل میں دیکھتا ہے، اس کا اندازہ مرزا صاحب سے پہلے نہیں تھا۔ مرزا صاحب کی شخصیت پر ان کے فن سے بہتر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا ہے جس زمانے میں یہ ناول ترتیب پا رہا تھا اس وقت طوائف یا طوائفیت کوئی متروک سی شے یا ادارہ نہیں تھی۔ انہیں آپ مرزا صاحب کا جیتا جاگتا یا مردہ ماحول کہیں کہ انھوں نے

سوسائٹی میں طوائف کے ادارے کے انداز فکر اور طرز معاشرت کے تحفظ [illegible] طوائف کو مرکز و محور بنایا۔ طوائف انیسویں صدی میں سوسائٹی کا ایک ایسا حصہ تھی جس سے صرف نظر [انداز] نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود سوسائٹی کا مطالبہ یہی تھا کہ

"بہ واحمق تر مکن ہشیار باش"

صرف ایک ناول ہے جس کا نام امراؤ جان ادا ہے۔ اس پورے ادارے کو مستقبل کے لیے ایک معتبر اور ناقابل تنسیخ دستاویز کی طرح ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ اب آپ ایک بار پھر اس دور کے پورے ادب عالیہ کو اپنے ذہن میں ترتیب دے لیں اور دیکھیں کہ اس اہم مرکز کو جہاں زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور دکھوں کے ساتھ موجود تھی، کس طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ طوائف کا بھاری پتھر کسی آذر کی تمنا میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا کہ یہ تیشۂ فن زندگی کی جوت اور علامتوں کو ہمارے اندر جگاتا ہے۔ بات پھر وہیں آتی ہے کہ طوائف سوسائٹی کا مرکز نگاہ و نظر ہونے کے باوجود نوک قلم سے کاغذ کے صفحوں پر نہ آسکی۔ داستانیں اس طرح کے اداروں کی اہمیت کی طرف کچھ اشارے ضرور کرتی ہیں لیکن داستان پھر داستان ہے۔ وہاں حقیقت بھی افسانہ بن جاتی ہے۔ اس پورے بیان کا تجزیہ یہ ہے کہ طوائف اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرتی زندگی پر پوری طرح چھائے ہونے کے باوصف سنجیدہ مطالعہ کی چیز نہ تھی۔ فنکار نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ طوائف سے ادب عالیہ کے چشمے ابل سکتے ہیں۔

مرزا ہادی رسوا باقیات الصالحات کی صف میں وہ تنہا شخص تھے جنھوں نے اپنے متعین کردہ راستوں پر بے جگری کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ دین و دنیا، علم و فضل، فکر و فن، لذت گناہ اور شوق ثواب ان کی سرشت کے دسترخوان پر ان کے اپنے حوصلے کے مطابق موجود تھے۔

مرزا ہادی رسوا اپنی دھن کے پکے تھے جو کچھ سوچ لیا اسے کر ڈالا [illegible] کی جو ان کے شوق کی راہ میں حجاب یا پتھر نہ بن سکی۔ وہ اگر اپنے زیچے میں یا لوہار کی بھٹی پر مشغول رہے تو شادی و غم کی کوئی اطلاع انھیں چونکا نہیں سکتی تھی۔ مرزا کے فن پر جب بھی روشنی ڈالی جائے گی، ان کی شخصیت اپنی تعبیر و تشریح کے لیے فنکار کا دامن پکڑے گی۔ ان کی شخصیت سے گزر کر ہی ان کے فن تک پہنچا جا سکتا ہے۔

مرزا کے زمانے میں آج کی نسبت وسائل محدود تھے مگر انھوں نے جستجو کے ہر سنگلاخ جادہ کو ہنستے ہنستے طے کر ڈالا۔ انگریزی کا شوق ہوا تو انگریزی پڑھ ڈالی، فلسفہ و منطق سے شغف ہوا تو تمام متکلمین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اترے تو رڑکی تک پہنچ گئے کبھی اوورسیری کی تو کبھی پروفیسری۔ ایک فنکار کو جیسا دانا و بینا ہونا چاہیئے مرزا صاحب اس سے سوا تھے۔ ان کی مداح اور معشوقہ امراؤ جان نے ان کے بارے میں سچ لکھا ہے، یہ سچ اس لیے ہے کہ ایک دوسرے کے انداز قدر کی آگاہی عاشق و معشوق سے بہتر کون رکھتا ہے۔

"مرزا رسوا کی وجاہت اور طلاقت لسانی میں غضب کی دلآویزی ہے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں عورت مرد سب ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جب یہ باتیں کرتے ہیں تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ کوئی شخص کیسا ہی غمگین ہو، دو گھڑی ان کے پاس بیٹھے، غم غلط ہو جائے۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا ان کی ایک بات ہے۔ خدا کی دی ہوئی ذہانت پر وہ علمیت اور تجربہ کاری۔ ان اوصاف نے ان کے جوہر ذاتی کو اور جلا دی ہے۔ طبیعت کی موزونی شعر و سخن کو حسن پرستی کے مذاق نے چمکا دیا ہے ان سب اوصاف کے ساتھ مزاج میں کچھ سنک ہے، بعض طبیبوں کی رائے ہے کہ دھن کو جنون کے دورے کا خلل ہے کسی کو یہ خیال ہے کہ آپ کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے، غرض کچھ نہ کچھ اسرار ہے"[1]

مختصر یہ کہ ایسی بھرپور شخصیت کسی بھی اردو فنکار کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں جو کچھ تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ ہر چیز کی تکمیل تھی۔ تشنگی کو انھوں نے اپنی شخصیت میں راہ دی ہی نہ تھی۔ فلسفی تھے تو مکمل، شاعر تھے تو مکمل، مولوی تھے تو مکمل، ادیب

[1] بحوالہ اردو ادب۔ دسمبر ۱۹۵٦ء ص ۵۸

انشاپرداز بے مثل کارگاہ ہند میں جیسے تو گئے، وہ علم وشوق کے گلی کوچے سے آسان نہیں گزرے بلکہ اسے بالکل بے حجابانہ انداز کر کے چھوڑا۔ بیٹر بازی سے لے کر زنجی بازی تک کی بیشتر ادر اصطلاحوں سے علمی واقفیت بہم پہنچائی۔ وہ علم کی ردا میں منہ چھپا کر کبھی نہیں بیٹھے: علم کو زندگی میں اور زندگی کو بازاروں میں تلاش کرتے رہے، انھوں نے صرف دل کی ادھر نگاہ نہیں کی بلکہ دل اور دنیا کو ایک دوسرے کا پابند بنا دیا۔

آئیے اب ہم مندرجہ بالا شخصیت کے سایے میں اس فن کا جائزہ لیں جو اس شخصیت کے بطن سے ابھرا ہے۔ اس فن سے میری مراد صرف ناول نگاری ہے۔ شعر و شاعری، علم و حکمت، ہیئت و نجوم ہماری اس تحریر کے دائرے میں نہیں آتے۔ ہمارے اس مطالعے کا محور مرزا ہادی رسوا کا فن ناول نگاری ہے۔ اس آشوب قلم سے مرزا رسوا کس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کا تجزیہ ہمیں کرنا ہے۔ مرزا صاحب کے عہد میں اردو ناول جس ڈگر پر گامزن تھا، تنقید کا دبستان اور تاریخ کا تسلسل ہمیں وہاں تک آسانی سے پہنچا دیتا ہے۔ مرزا رسوا کے سامنے اس راہ کے سنگ میل نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار ہی تھے ان دونوں فنکاروں کا فن ہمیں اس منطقی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ لوگ ناول کے فن پر کامل عبور یا دستگاہ نہیں رکھتے تھے۔ پلاٹ، کردار نگاری اور ناول کے اسلوب پر گہری نگاہ نہیں تھی، داستان اور ناول کے بیچ میں سفر جاری تھا۔ مثالی کردار [illegible] کا تجربے ہو رہے تھے۔ ویسے ہی مثالی کردار جو ہمیں شیکسپیر کے ڈراموں میں نظر آتے ہیں، یہاں بھی موجود ہیں۔ کردار نگاری کا جو معیار کی بھی ہو لیکن اس کمی سے صرف نگاہ نہیں کیا جا سکتا۔

پچھلی سطور میں ہم [illegible] ناول نگاری کے اعلیٰ ترین جوہر ان بزرگوں [illegible] مگر اس عیب کو ہم [illegible] سکیں گے۔ [illegible]

[illegible] مرزا رسوا سے قبل [illegible] اردو [illegible] ان کے [illegible] ناول نگاری کے

اصولوں کا احساس، فنی اور معنوی قدریں، ظرافت، [illegible] بہت کم پائی جاتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس ہماری رائے پر صاد کرتا ہے جو ہم نے پچھلی سطور میں پیش کی ہے۔ بعد کے لوگوں میں عبدالحلیم شرر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بکثرت ناول لکھے — لیکن ان کے ناولوں میں وہ معیار اور توازن نہیں ہے جو کسی تحریر کو وقیع بناتا ہے۔ پھر آدم شیخ کو سنئے: "شرر کے ناولوں سے وہ گروہ تو مطمئن ہو سکتا ہے جس کے لیے ناول نویسی ایک تفریحی مشغلہ ہے۔ مگر ادبی اور فنی قدروں کا مطالبہ کرنے والے گروہ کو ان سے مایوسی ہوتی ہے۔" اسی خیال کا اظہار مختصر لفظوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور یوں کرتے ہیں۔

"ان کے ناولوں میں بہت کم ایسے پارے منتخب کیے جا سکتے ہیں جو ان کے مضامین کی طرح خاصے کی چیز یعنی ادب عالیہ کہلا سکیں۔"

مرزا ہادی رسوا ناول نگاری کے کوچے میں پورے شعور اور فکر کی تیاریوں کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ تہذیبی، عمرانی اور سیاسی قدروں کی ساری گرہیں ان کی چٹکیوں میں تھیں۔ ایک معاشرے کی زوال آمادگی ان کی نگاہ میں تھی اور یہ شعور ان کے دماغ میں تھا کہ اس آفت کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے امراؤ جان کی خود نوشت سوانح کے انداز پر لکھے ہوئے اس ناول میں دکھوں کا درماں تلاش نہیں کیا بلکہ مٹتی ہوئی قدروں کی کمیوں کی طرف واضح اشارے کیے ہیں۔ یہاں سے ہم ایک نئی راہ کی جستجو میں نکل سکتے ہیں لیکن اس راہ کا تعین فنکار نہیں بلکہ قاری کرتا ہے۔ مرزا رسوا کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ نذیر احمد کی طرح مبلغ یا محتسب نہیں ہیں۔ امراؤ جان میں جہاں جہاں سقم پیدا ہو گیا ہے وہاں مرزا رسوا نہیں بلکہ امراؤ جان سامنے آجاتی ہیں۔ یہ حقیقت اس خود پرستی کی ہے جو مرزا رسوا کی ستائش میں امراؤ جان نے سپرد قلم کیا ہے۔

بکھرے سپنے

بلرام پور ۔ گونڈہ

ہم نے کہیں دیکھا ہے
کچھ سپنوں کی گتھائیں
ٹوٹے ہوئے مکانوں سے
ہر طرف ہواؤں کے اک سانسے ٹکرائیں

پھر چھت کا پھٹا سینہ
سینے سے دھواں اٹھا
بکھرے کے گھنے گیسو
پھر مانگ میں کیشوں کی شعلوں کی لکیریں ہیں
دیواروں کے ہونٹوں پہ انگاروں کی لالی ہے
دروازوں کے چہروں پہ سناٹے کا غازہ ہے
منظر سے سہاگن ہے حالات سے بیوہ ہے
ہم نے کہیں دیکھا ہے

کچھ دیپ اندھیروں کی دہلیز پہ بیٹھے ہیں
خود اپنے اجالوں سے کھائے ہوئے زخموں کو
تنقید کی انگلی سے چھو چھو کے سسکتے ہیں
ہونٹوں پہ اندھیروں کے ہیں طنز کی مسکانیں
گھبرا کے سبھی دیپک
دیواروں کے طاقوں پر
خود اپنی زبانوں سے بکھرتے ہیں فریادیں
پھر جاگ کے شہزادے کی نیند اچٹتی ہے
بکھرے ہوئے سپنے ہیں

تصویریں ابھرتی ہیں
شہزادہ یہ کہتا ہے
یہ دیپ نہیں میری مجبوری کے چہرے ہیں
سب رات کے قاتل ہیں
میں دن کی عدالت میں مجرم ہوں اجالوں کا
صدیوں کی شہادت ہے
منصف ہر اک لمحہ ہے
ہم نے کہیں دیکھا ہے

اتہاس کی نگری میں
دھنوان کا مندر ہے
اک رام کا شیدائی
اکثر اسی مندر میں پوجا کیا کرتا ہے
قوموں کے اٹھانے کی تدبیر میں رہتا ہے
یہ بوڑھا سپاہی بھی
سرحد پہ وطن کی جو آہنی پیکر ہے
خود تنہا ہی لشکر ہے
اک شور ہوا ایسا
ہے رام کے کہنے پہ
دم توڑ کے نے توڑا ہے

اک دستِ فسادی کی انگلی کے چھٹنے پر
دھرتی کی رگِ جاں کا ہر قطرۂ خوں چیخا
گمبھیر ہوا دریا ملاح کو نیند آئی
کشتی کی اٹھی ارتھی اور جشن ہے ساحل کا
اب راستے کا چہرہ ناسور ہے منزل کا
"ہر پوت یہاں جیسے ہر باپ کا قاتل ہے"
اس مٹی کے ماتھے پر جملہ یہی لکھا ہے
ہم نے کہیں دیکھا ہے

نوعمر پرندہ ہے
مانگے ہوئے بازو کے بل بوتے فضاؤں میں
اڑتا ہے گگن چھونے
کھاتا ہے قلابازی
اک روز اڑا ایسے
جیسے کسی آندھی کے جھونکوں کی ہتھیلی پر کاغذ کا کوئی ٹکڑا
آکاش کے ہونٹوں تک جاتے ہی پلٹ آیا
گلشن کی طرف لپکا
اک پیڑ کی شاخوں نے چاہا کہ کہیں ٹھہرے
وہ کیسے ٹھہر جاتا
پھلواری کی [illegible] سے [illegible]
ہر شاخ [illegible]
ہر پنچھی [illegible]
پھر [illegible]

آنکھوں سے اٹھے بادل
حنا کی طرح برسے
پھر ضبط نے للکارا
پر نقش [illegible] تھا
اس نقش کو مٹنا تھا
اب بھی بھری آنکھوں میں باغ کا نقشہ ہے
ہم نے کہیں دیکھا ہے

اک پارک کے کونے کی اک بنچ پہ دو سائے
کم فاصلے کرتے ہیں
احساس کی گرمی سے
کچھ پھول کی پنکھڑیوں کا رنگ بدلتا ہے
پھر بنچ کی باہوں میں
سوکھے ہوئے پتوں کی تائید میں شاخوں سے
مل مل کے بچھڑتے ہیں
دو برف کے ٹکڑے ہیں ٹکرا کے پگھلتے ہیں
بھیگے ہوئے شعلے ہیں جو راکھ سے اٹھتے ہیں
پھر جلتے ہوئے سائے [illegible] سمجھتے ہیں
پھر صبح کی [illegible] کی شکنیں ہی [illegible]
[illegible] شفق [illegible] کے پھولوں کو بکھرا دو
پھر بنچ کے بازو میں سیمنٹ کا گملا ہے
گملے کی ہتھیلی میں [illegible] کا [illegible] ہے
ہم نے کہیں دیکھا ہے
یہ خواب حقیقت ہے جو [illegible]

ڈاکٹر [illegible] احمد
صدر شعبۂ اردو
پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی
پٹنہ

پرویز شاہدی : فکر و فن

پرویز شاہدی کے اب تک دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "رقص حیات" ہے اور دوسرا مجموعہ "تثلیث حیات" جسے ادارۂ لوح و قلم کلکتہ نے [illegible] میں شائع کیا۔ ان دونوں مجموعوں کے علاوہ ماہنامہ "مریخ" پٹنہ نے دسمبر ۱۹۶۸ء میں پرویز شاہدی نمبر نکالا۔ "رقص حیات" اگرچہ پہلے شائع ہوا اور اس پر ل احمد اکبر آبادی کا "اشارات" کے عنوان سے پرویز شاہدی کی زندگی اور ان کی شاعری کے متعلق تذکرہ ہے۔ لیکن میں "تثلیث حیات" کے "متاع فقیر" میں پرویز شاہدی نے اپنی زندگی اور اپنی شاعری کا جس طرح تعارف کرایا ہے اس کا ذکر کروں گا۔

پرویز شاہدی "متاع فقیر" میں لکھتے ہیں کہ "میرا نام سید محمد اکرام حسین ہے اور تخلص پرویز شاہدی۔ میں ۱۹۱۰ء میں لودی کٹرہ پٹنہ سٹی میں پیدا ہوا، میرا تعلق اس خاندان اور طبقہ سے ہے جو ایک وقت زمینداری اور درویشی کے راستے پر چلتا رہنا چاہتا تھا۔"

پرویز آگے لکھتے ہیں کہ میں اپنے وجود کی تصدیق کا آرزومند ہوں۔ صرف مطالعۂ نفس ہی کے سہارے نہیں بلکہ خارجی دنیا کی نگہ سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کو سمجھے بغیر باطنی دنیا کے متعلق کامیابی کے ساتھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میں زندگی کے صرف تاثراتی اور ذہنی گوشوں ہی سے متعارف ہونے کا متمنی نہیں۔ میری زندگی ہو یا میری شاعری میں نے دونوں ہی کے سہارے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ دوستوں کو مرعوب کرنے کی دبی ہوئی خواہش نے تاریخ کے پرشکوہ رنگ سخن کی تقلید کا مشورہ دیا۔ میں خیالات اور اسالیب بیان میں ترمیم اور تغیر سے کام لینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

دوسری طرف ل احمد اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ پرویز ۱۹۳۳ء میں ایک فکری انقلاب سے دوچار ہوئے اور ان کو جہل و توہم پرستی کے عقائد سے بیزاری ہو گئی۔ ۱۹۴۲ء میں نظریاتی اشتراکیت کے حجرے سے نکل کر عملی اشتراک کے وسیع میدان میں پہنچے تو بقول پرویز شاہدی کروڑوں ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھے اور کروڑوں آنکھیں روشنی بخشنے لگیں۔ پرویز کہتے ہیں کہ مطالعے کی وسعت تجربوں کا تنوع، سماجی تضادات کی شعبدہ بازیاں، متقدر طبقے کی بے نقاب سازشیں وہ چیزیں تھیں، جنھوں نے میرے شعور کا رنگ بدلا اور شعر و ادب میں اجتماعی شعور کے نقش نظر آنے لگے۔ یہ بات طرح لی۔ احمد اکبر آبادی کا یہ قول صحیح نظر آتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ابتدائی متصوفانہ تربیت اور آخر میں اشتراکیت دونوں کا ہاتھ ہے۔

بہر حال درج بالا باتوں سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پرویز شاہدی جاگیردارانہ ماحول سے متاثر تھے۔ اگرچہ ان کی ابتدائی غزلیں رومانی جذبات سے پر ہیں لیکن کلکتہ جانے کے بعد ان کی شخصیت نے اپنا مخصوص انداز فکر ڈھال لیا۔ اور صوفیت کے باوجود آخر تک شاعری پر

قائم رہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

کتنے دم ساز ان طوفان ندیوں میں جا ڈوبے
ہم تو جس دریا میں اترے تھے اسی دریا میں ہیں

اس کے علاوہ پرویز شاہدی فن کے متعلق بھی اپنا مخصوص نظریہ رکھتے تھے ملاحظہ ہو ــــ

جس کو سب کہتے ہیں تاثیرِ سخن
معتدل رسوائیوں کا نام ہے

کھو نہ جائے پرسشِ تفصیل میں
فن کو خوش ایمائیوں کا کام ہے

ہے شاعری شگفتہ جبینوں کی سجدہ گاہ
اس کو فسردہ خضر سروں سے بچائیے

جس میں ہو تجزیوں سے بھی چھوٹا لباسِ فن
ہے وہ ادب لطافتِ احساس کا کفن

یہ کیا کہ فکرِ جواں خرقۂ کہن پہنے
نیا خیال نیا جامۂ سخن پہنے

یہی ہے سوزِ تمنا یہی گدازِ حیات
کہ آہ بھی جو تبسم کا پیرہن پہنے

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

نظر آتا ہو جس میں زندگی کا عکس شاداب
وہی طرزِ بیاں اچھی وہی رنگِ سخن اچھا

رفعت معنوں ہی سے حاصل نہ ہوگا اوجِ فن
سرفروشی بھی تو سیکھیں نکتہ دانانِ سخن

میرا رنگِ فن کیا ہے میری طرزِ نو کیا ہے
جبینِ وقت کی تحریر پڑھ لو پوچھنا کیا ہے

شعروں میں سب کمال و ہنر دیکھتے رہے
ہم اپنا رنگِ خونِ جگر دیکھتے رہے

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ پرویز شاہدی فن کے نکات و رموز سے بخوبی آگاہ تھے اور ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کبھی فن میں ایمائیت کے قائل نظر آتے ہیں اور پرسشِ تفصیل کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ حقیقت بھی افسانے میں سنور جاتی ہے۔ وہ فن میں زندگی کا عکس شاداب دیکھنا چاہتے ہیں۔ نئے خیالات کو نئے جامۂ سخن میں پیش کرنا چاہتے ہیں آہ کو تبسم کا پیرہن پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن جب وہ کشمکشِ دل و زبان میں مبتلا ہو کر نغمہ افشانی کرنا چاہتے ہیں تو پھر یوں بھی سوچنے لگتے ہیں۔

کبھی نرمی کبھی سختی لہجے کی کیا بات کریں
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اور [illegible] کلاہان سخن کو سنہری سیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور فنکار کو اپنے رنگِ سخن اور طرزِ نوا میں جبینِ وقت کی تحریر پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان باتوں کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ پرویز نے غزلیں بھی کہی ہیں، رباعیاں بھی اور نظمیں بھی لیکن پرویز نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہیں۔ غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمایئے پھر نظم پر اظہارِ خیال بھی ہوگا۔

میں نے دیکھا ہے تیرے حسنِ خود آگاہ کا رنگ
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا
کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہِ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

یا

داستاں جوان کی سنتے ہیں دنیا میں
وہ کبھی نہیں سنتے ہم کبھی نہیں کہتے

غزلوں کے ان اشعار سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پرویز کے یہاں تغزل بھی ہے۔

پرویز کے یہاں ۱۹۶۰ء سے انداز فکر و نظر کے تغیر کا پتہ چلتا ہے اور اس وقت بقول پرویز شاہدی ان کے مواد کی فراوانی ان کی قوتِ اظہار کو مرعوب کر رہی تھی مواد کا سمیٹنا پرویز کے لیے مشکل ہو گیا تھا، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جب مواد کی فراوانی ان کے لیے دردِ سری ہوئی تھی اس وقت ان کی چند خوبصورت نظمیں وجود میں آئیں جیسے:

خوابوں کی سیڑھیاں، آگ کی بحیرۂ بے چہرگی، تضاد اور تثلیثِ حیات۔ نظم "خوابوں کی سیڑھیاں"، پرویز شاہدی کی ایک حسین اور خواب آور نظم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر کا خواب ہے جو سائنس کی حقیقتِ روشن بن کر موجودہ دور میں سامنے آئی ہے۔ اس نظم کے آخری تین بند ملاحظہ ہوں۔

شاعرانِ جمال آرا نے
ماہ و انجم کی پرورش کی ہے
آج کی یہ حقیقتِ روشن
بھی انسانے کی ترقی ہے

ساکنانِ دیارِ حسنِ خیال
شعر کہتے ہیں گیت گاتے ہیں
دے کے ترتیب اپنے خوابوں کی
نو بہ نو سیڑھیاں بناتے ہیں
شاعرانِ حیات ہیں ہم لوگ
ہاتھ سائنس کا بٹائیں گے
زندگی خواب [illegible] جائے گی
سیڑھیاں ہم بناتے جائیں گے

پرویز کی نظم بے چہرگی معرکتہ الآرا نظم ہے۔ اس میں پرویز کا مخصوص اندازِ بیان ملتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہر آدمی کتنے چہرے رکھتا ہے اس کا فنکارانہ بیان پرویز نے کیا ہے۔ نظم 'بے چہرگی'، کے چند آخری اشعار ملاحظہ ہوں جو اس نظم کا حاصل ہیں ؎

نہ کوئی نقشِ منفرد
نہ کوئی عکسِ معتبر
ہزار چہرہ آدمی،
ہزار چہرگی لیے
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو . . . .

چہرہ چاہیے
خود اپنا چہرہ چاہیے
وہ اصلی چہرہ چاہیے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں!

——— ذاتی تجربہ شعری تجربہ کیسے بن جاتا ہے اس کو دیکھنا ہو تو پرویز شاہدی کی نظم تثلیثِ حیات دیکھیے اور جہاں تجربہ صرف تجربہ بن کر رہ جاتا ہے اور شاعرانہ شعری تجربہ نہیں [illegible]

عمر انصاری
۱۲۰ بی [illegible] پارک لکھنؤ

پانی لدا کھڑا ہے، ہوا تیز ہے بہت
دل کے لیے تو اک یہی مہمیز ہے بہت

جادوگروں کے شہر، یہ جادو ذرا بھی دیکھ
وہ جام اٹھائے ہوں کہ جو لبریز ہے بہت

کیسا ہی کیوں نہ ہو دلِ ناداں ہو پُرخلوص
یہ اور بات ہے کہ کم آمیز ہے بہت

اب دیکھیے نکلتی ہے تعبیرِ خواب کیا
جو خوابِ زندگی ہے غم انگیز ہے بہت

وہ راہ پُرخطر جسے کہتے ہیں راہِ عشق
پُرخار ہی سہی، یہ دل آویز ہے بہت

ڈھونڈے جو بات بات میں پہلو ہزار ہا
کھیتی مرے خیال کی زرخیز ہے بہت

سوکھا ہوا شجر ہے غمِ آرزو مگر
جو شاخِ گل ہے آج بھی گلریز ہے بہت

یہ سرد رات، یہ راہیں، عمر اور آپ
تجربے سکھا چکے کہ ہوا تیز ہے بہت

ڈاکٹر عشرت صدیقی بسوانی
ہدایت منزل
بسواں۔ سیتاپور

جگر بسوانی

حیات و شاعری

جگر بسوانی

آپ کا نام حکیم محمد افتخار علی تھا اور جگر تخلص۔ افتخار الشعرا اور یادگار امیر مینائی آپ کے لقب اور خطابات تھے جو حلقۂ ادب کی جانب سے عطا ہوئے۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء آپ کے وطن عزیز قصبہ بسواں ضلع سیتاپور کے ایک شریف باوقار اور ذی عزت زمیندار شیخ خاندان میں ہوئی... آپ کے اجداد کرام عرب سے ہندوستان آئے اور مسلم دور حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز المرام رہے۔
آپ کے مورث اعلیٰ محمد نصرت اللہ قاضی القضاۃ دربار دہلی تھے اور خان زادے کا خطاب مسلم گورنمنٹ سے ملا تھا۔

آپ کے والد کا نام شیخ محمد اسید علی خاں جزا تھا جن کی وفات ۱۳۳۱ھ میں بعمر ۹۰ سال ہوئی اور دادا کا نام اشرف علی خاں تھا۔ شیخ محمد اسید علی خاں جزاؔ خود بھی شاعر تھے اور جزاؔ تخلص تھا جو خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگرد تھے اس موقع پر مناسب ہوگا کہ حضرت جزاؔ کا ایک شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ دو ایک شعر کے علاوہ باقی کلام ضائع ہوگیا ؎

ہمارے پاس جو یوسف کو بیچنے لائیں
وہ بھول ہیں کہ جسے کارواں اٹھا لے گئے

آتش لکھنوی کے ہی سلسلے سے آپ نے بھی خدائے سخن حضرت امیر مینائی کی شاگردی اختیار کی۔
۱۸۷۷ء میں جبکہ حضرت جگر بسوانی کی عمر پانچ سال کی تھی تو آپ کے والد شیخ محمد اسید علی خاں جزا نے آپ کی رسم بسم اللہ بڑی دھوم دھام سے ادا کی اور آپ کو اس عہد کے زبردست مشہور عالم مولوی عنایت علی بسوانی کے سپرد کیا۔ مولوی عنایت علی کے علم و کمال کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مولوی عنایت علی کے پدر بزرگوار مولائی شیخ اعظم علی اعظم بسوانی اودھ کے چوتھے اور آخری بادشاہ نواب واجد علی شاہ اخترؔ کے استاد تھے اور بسواں کی اردو شاعری کے باوا آدم یعنی جنم داتا تھے اور یہ خاندان ہمیشہ علم و فضل و کمال میں ممتاز رہا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت جگرؔ صاحب کے پدر بزرگوار کی نگاہ انتخاب علامہ مولوی عنایت علی پر پڑی اور انھوں نے اپنے ہونہار فرزند کو درس و تدریس کے لیے ان کے سپرد کر دیا۔
مڈل کلاس تک بسواں میں زیر تعلیم رہنے کے بعد سلسلہ تعلیم لکھنؤ میں منتقل ہوا لیکن انٹرنس پاس کرنے کے بعد بعض پریشانیوں کے سبب دل اچاٹ ہوگیا۔ اور تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا اور اپنے وطن عزیز بسواں چلے آئے۔ یہاں آکر طبابت کا شوق پیدا ہوا اور اس زمانے کے مشہور حکیم اور جید عالم و فاضل و علم نجوم کے ماہر عالم و کامل مولوی واجد علی صاحب سے حکمت سیکھی اور پیشۂ طبابت اختیار کیا اور بمبئی جاکر بھنڈی بازار میں اپنا دواخانہ قائم کیا اس طرح پیشۂ طبابت و مشق سخن ساتھ ساتھ جاری رہا۔
آپ کو آغاز شباب سے شاعری کا شوق تھا اور جب

ادب کی آبیاری کرنے کے لیے مشاعرے منعقد ہوتے تھے جس میں نئے نئے گل بوٹے اور شگوفے کھلائے جاتے تھے۔ شاعر کو آج کل کی طرح نذرانہ دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا نہ کوئی شاعر نذرانہ قبول کرتا تھا بلکہ اس کو انتہائی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

بسواں میں اکثر بزم جگر کے سالانہ مشاعرے تین تین دن تک مسلسل شب و روز ہوتے رہے ہیں۔ شرکت کرنے والی مشہور شخصیتوں میں شاگردانِ جگر کے علاوہ جو کہ بمبئی، پونہ، بنگلور، کانپور، لکھنؤ و سیتاپور کے اطراف سے آتے تھے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، قدیر لکھنوی، سراج لکھنوی، مولانا افقر موہانی، بیارے صاحب رشید، عارف لکھنوی، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، صفی لکھنوی، جگت موہن لال رواں اناؤی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت جگموہن لال رینہ شوق الہ آبادی ڈپٹی کلکٹر، منظر مرزا پوری وغیرہم قابل ذکر ہیں۔

حقیقت ہے کہ اس زمانے کی کوئی مشہور ادبی شخصیت ایسی باقی نہ تھی جو بزم جگر کے مشاعرے میں بسواں نہ آئی ہو۔

بسواں کی بہت مشہور شخصیت خان بہادر نواب قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا اسٹیٹ (متوفی ۱۹۳۰ء) بھی آپ کی شاعرانہ و استادانہ قادر الکلامی کے انتہائی معترف تھے اور جب بسواں آتے تھے ضرور ملاقات کرتے تھے انھوں نے کئی بار آپ کو دتیا بلایا مگر آپ نہیں گئے۔

قیام بسواں و سیتاپور کے زمانے میں بہت سی مشہور ہستیوں نے آپ سے استفادہ کیا یا برابر آپ سے ملاقات کرتے رہے چنانچہ علم و ادب کی مشہور شخصیت مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم سیتاپور میں اپنے قیام کے دوران جگر صاحب کے یہاں اکثر آتے جاتے رہے اور یہیں مولانا کی شعر و شاعری کا شوق بھی پروان چڑھا تھا اور مولانا نے بھی کئی غزلیں کہی تھیں اور یہی شوق ان کو جگر اللہ آبادی کے قریب لایا تھا اور بعد میں مولانا عبد الماجد نے شعر و ادب پر بھی جو عبور حاصل کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ سب

فیضانِ جگر تھا جس کے مولانا ہمیشہ معترف رہے۔ اور مولانا کے دل میں جگر بسوانی کی جو عظمت دیرینہ قائم ہو چکی تھی مرتے دم تک قائم رہی وہ اُن کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ صلاحیت کے ہمیشہ گوشۂ دل سے قدرداں رہے۔

اسی طرح نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی جبکہ وہ سیتاپور میں ڈپٹی کمشنر تھے برابر جگر بسوانی سے شرف نیاز حاصل کرنا اپنی عین سعادت سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں بھی جگر بسوانی کی قدر و منزلت بے حد تھی۔ بزم جگر کے مشاعروں کی طرحوں پر اکثر غزلیں اثر صاحب کے دیوان میں موجود ہیں۔ اور اسی طرح زمانۂ حال کے مشہور شاعر شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی اپنے زمانۂ قیام سیتاپور میں جگر بسوانی کی استادانہ و فنکارانہ صلاحیت کا لوہا مانتے تھے اور آج بھی یہ عظمت دیرینہ ان کے دل میں موجود ہے۔ اور اسی طرح حال کے مشہور شاعر سکندر علی وجد جن کا قیام بھی بحیثیت ڈپٹی کمشنر سیتاپور میں رہا ہے اور جناب نادم سیتاپوری مصنف قالب نام آدرم جو مشہور ادیب ہیں اور آج کل پاکستان میں حکومت پاکستان کی جانب سے ایک اردو لغت کی تیاری میں مصروف ہیں یہ سب حضرات جگر بسوانی کی عظمت کے انتہائی قدرداں ہیں۔ اور پنڈت جگموہن لال رینہ شوق الہ آبادی (ولادت [illegible]) مصنف بہارِ گلشن (جس میں پنڈتانِ کشمیر کا تذکرہ ہے) اپنے زمانۂ قیام سیتاپور میں بزم جگر بسواں کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ شوق صاحب [illegible] میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے تھے اور ۱۹۳۰ء میں سیتاپور سے پنشن لی۔ تمام عمر جگر بسوانی کی قدر افزائی فرماتے رہے۔ [illegible] کے مشاعرے بزم جگر بسواں میں شوق صاحب نے یہ شعر سنایا تھا ؎

نازوں سے جسے پالا سینے میں جگر کہہ کر
بیدردا کسی دل کو ہم تجھ سے [illegible]

اور [illegible] کے بعد [illegible] بزم جگر کے [illegible] ملاحظہ فرمائیے ؎

ستا لو جی بھر کے ...... جتنا چاہو کبھی نہ ہم شکوہ کریں گے
مگر اتنا تم سمجھ یہ رکھو کہ ہم غریبوں کا بھی خدا ہے

ایک مشاعرے میں جگر مراد آبادی سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ میں اور حضرت جگر بسوانی میں کیا فرق ہے تو جگر مراد آبادی نے مسکرا کر فرمایا کہ میں صرف شاعر ہوں اور جگر بسوانی شاعر گر ہیں۔

حضرت جگر بسوانی نے اردو میں بہت کچھ کہا ہے اس کے علاوہ فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ موزوں دماغ ہر زبان پر قدرت رکھتا تھا اور غالب آ جاتا تھا۔ آپ کے کلام کا اردو ذخیرہ زیادہ ہے۔ تاریخی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی؛ تمام موضوعات پر نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات وغیرہ ملتی ہیں اور رنگ تغزل میں تو شہنشاہ تغزل ہی تھے۔ آپ کے کلام میں غزل کا درجہ سب پر بھاری۔ آپ کا اب و لہجہ مترنم و با اثر، سوز و گداز میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کے کلام میں انتہائی پاکیزگی، شگفتگی اور سحر آفرینی نمایاں ہے۔ آپ جملہ اصناف سخن میں ایک کامیاب ماہر سخن تھے اور جیدہ و پرگو تھے اور انتہائی کامیابی سے طبع آزمائی کرتے تھے۔ ہر مجلس میں ہر محفل میں معلوم ہوتا تھا کہ اشعار ڈھل ڈھل کر آ رہے ہیں۔ آپ کی شاعرانہ قادر الکلامی مسلم تھی۔ جنہوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ان کی نظروں میں آپ کا مرتبہ اعلیٰ و برتر کوئی بھی استاد نہیں سمجھتا ہے۔

آپ کی مضمون آفرینی، جدت طبع، شوکت الفاظ، نادر تشبیہات، استعارات، صنعت تجنیس آپ کے کلام کا جوہر ہیں۔ جن میں بلا کی شوخی اور شستگی ہے۔ آپ کی شاعری میں خستگی اور سوز و گداز کچھ ایسا سمایا ہے جس میں ایک آفرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دلی جذبات، واردات و تاثرات کو انتہائی سادگی کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ آپ کے کلام میں تصوف کی رنگ آمیزی بھی ہے۔ آپ ایک مسلم الثبوت استاد [illegible] شاعر تھے۔ حضرت جگر مراد آبادی کا یہ فرمانا حقیقت [illegible] تھا کہ جگر بسوانی شاعر گر ہیں۔ آپ نے
ہزاروں کو شاعری سکھائی، بہتوں کو فنکارانہ صلاحیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہزاروں شاگرد موجود ہیں۔ مگر آپ حضرت افقر موہانی کی طرح اپنے شاگردوں کی فہرست کا کوئی رجسٹر نہیں رکھتے تھے بلکہ سب کے نام اپنے خانۂ دل پر لکھ لیتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت جگر بسوانی جملہ اساتذۂ سخن میں ایک انفرادی رنگ رکھتے تھے اور ان کا اپنا ایک الگ مقام تھا مگر آپ کی ذات مجموعۂ صفات تھی۔ آپ کا دیوان جو حضرت فصاحت لکھنوی کا انتخاب کردہ ہے بہت ہی مختصر ہے اور دیوان جگر کے نام سے عرصہ ہوا آپ کی حیات ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے غیر مطبوعہ کلام کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ پانچ جلدوں میں تاریخی، مذہبی مثنویاں ہیں اور کئی جلدوں میں ادبی ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ غزلیات، مفردات، قطعات، رباعیات، قصائد و متفرق نظمیں وغیرہ ہیں جو سب غیر مطبوعہ ہیں۔

آپ کئی رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے۔ بسواں سے رسالہ بزم جگر نکالتے تھے جو مالی پریشانیوں کی وجہ سے عرصہ ہوا بند ہو گیا تھا۔ آپ کا کلام ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ درج ذیل پرانے رسالوں میں آپ کا کلام دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱) ماہنامہ نگار لکھنؤ ایڈیٹر نیاز فتحپوری
(۲) اخبار اودھ پنچ " " منشی سجاد حسین
(۳) ماہنامہ پیشوا دہلی " [illegible] حسن بقائی
(۴) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی ایڈیٹر ملا واحدی
(۵) " عصمت " " رازق الخیری
(۶) " الناظر لکھنؤ " مولانا ظفر الملک علوی
(۷) " دلگداز " " مولانا شرر لکھنوی
(۸) اخبار زمیندار لاہور " مولانا ظفر علی خاں
(۹) رسالہ مخزن " " شیخ عبدالقادر
(۱۰) ماہنامہ شاعر آگرہ " علامہ سیماب اکبر آبادی

[illegible] دنیا ، لاہور ، تاجور نجیب آبادی

حضرت مقصود مرزا پوری جو "مشاطۂ سخن" کے مصنف ہیں اچھی قابلیت، مشاقانہ سخنوری میں حضرت جگر بسوانی کی اصلاحوں کو جو بواسطہ بسوانی شاگرد وہ جگر کے کلام پر ہیں ان کے نمونوں کو پیش کر کے آپ کی استادانہ قابلیت و فنکارانہ صلاحیت کی ثبوت بجا داد دی ہے جو مرتب کتاب کی جوہر شناسی کا ثبوت بھی ہے۔

اسی طرح "گنجینۂ تحقیق" مرتبہ جناب محمود مو ہانی کے صفحہ ۲۶۳ پر تحریر ہے کہ ـــــ ارشاد ناطق لکھنوی ہے کہ جگر بسوانی کی اصلاح اس شعر پر معنی خیز ہے ؎

سمجھے یہ تیرے وعدۂ باطل کی حقیقت
ہے وہم و گماں موجۂ طوفانِ تمنا!

اس کے علاوہ فاضل مرتب نے بھی دوسرے اساتذۂ سخن سے تقابل کر کے حضرت جگر بسوانی کی اصلاحوں نیز اُن کی استادانہ صلاحیتوں کو ممتاز قرار دیا ہے۔ یہ کتاب اعلیٰ قابلیت کے نصاب میں داخل تھی۔

میر عباس حسین فصاحت لکھنوی فرماتے ہیں۔

ہیں جگر میرے اک قدیمی دوست
شعرائے جہاں میں نامور
ہیں بہت سے تلامذہ اُن کے
لائق و فائق ان میں ہیں اکثر
قدرداں ان کی نظم و نثر کے ہیں
صاحبِ ذوق و شوق و اہلِ نظر
سن کے پُر درد ان کی غزلوں کو
ہاتھ معشوق رکھتے ہیں دل پر!

منشی وزیر علی وزیر لکھنوی شاگرد حضرت حکیم لکھنوی فرماتے ہیں۔

نرالی ہے بندش، اچھوتا ہے مضموں
بیاں وصف کیا ہو ہر اک شعر تر کا
غزل عشق سے کوئی خالی نہیں ہے
بجز لالہ ہے نقد تو دل پر اتر کا

سید مجاور حسین تمنا لکھنوی برادر و جانشین حضرت جاوید مرحوم لکھنوی فرماتے ہیں ؎

آسماں ساتوں، بلندی سے مضامیں کے ہیں پست
شاعروں پر سب سے بالا کیوں نہ ہو شانِ جگر!

قاری یعقوب علی خاں نصرت لکھنوی فرماتے ہیں ؎

جنابِ جگر باکمال و ہنر
فصیح اللساں منشی آرائے نظم

اسی طرح بہت سے شعرائے باکمال نے جگر بسوانی کے علم و فن اور شخصیت پر اظہارِ خیال فرمایا ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ جگر بسوانی کی حیات میں اور وفات کے بعد بھی جگر کے ورثا نے اتنی عظیم شخصیت کی ان کے شایانِ شان کوئی قدر افزائی نہیں کی مگر اپنی حیات میں نہ کبھی آپ دل برداشتہ ہوئے نہ حرفِ شکوہ زبان پر آیا۔ آپ کے کلام کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا اور جو کچھ ہے وہ غارت ہو رہا ہے۔ آپ کا ایک مکمل دیوان غیر مطبوعہ آپ کے حقیقی بھائی خلیل مرحوم کے داماد جناب سجاد حسین صاحب کراچی (پاکستان) بھی لے گئے تھے۔

آپ نے بسواں میں ایک گمنامی و گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی اور اسی پر قناعت کی تصنع، ظاہرداری، اپنی شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ آپ کی شاعری اور استادانہ مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندستان کے گوشے گوشے میں آپ کے شاگرد موجود تھے اور اب بھی ہیں جن میں بعض مشہور شعرائے حال بھی شامل ہیں۔

آپ کی بعض آوارہ گرد غزلیں نیز متفرق اشعار کو انتہائی شہرت حاصل ہے اور زبان زدِ عوام ہیں لیکن لوگوں کو یہ پتہ نہیں کہ اس تخیل کا خالق کون ہے۔ بڑے بڑے قوال و مغنی وغیرہ عام طور سے اکثر آپ کی غزلیات گاتے رہتے ہیں۔

بیرانی ملکوں میں بھی آپ کی اور آپ کے شاگرد بواسطہ بسوانی کی غزلیں بھی ملتی ہیں جنھیں [illegible] منسوب کر لیا

ہوگا۔ یہ بات یقینی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ زمانۂ حال کے شعرا کی طرح ادب فروش نہیں تھے۔ ہاں راجہ نوشاد علی خاں کی نوازشیں آپ پر بیحد رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ راجہ صاحب موصوف نے حضرت ذوق کے شعر سے

وہ مول لیتے ہیں جس دن کوئی نئی تلوار
لگا تے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

پر مصرعے لگانے کی فرمائش کی۔ آپ نے فی البدیہہ مصرعے لگا کر سنا دیے جس پر ایک انگوٹھی عنایت فرمائی تھی جس کے صرف نگینے کی قیمت بمبئی کے جوہری نے بارہ ہزار تجویز کی تھی۔ اسی قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو کہاں تک لکھے جائیں۔ ذیل میں جگر بسوانی کا غیر مطبوعہ کلام ملاحظہ فرمائیں ۔

انتخاب کلام جگر بسوانی (غیر مطبوعہ)

کعبے سے دور سامنے کوئے بتاں کے ہیں
دل ہم سے پوچھتا ہے ارادے کہاں کے ہیں
سینے میں سوز، دل میں ہے کاوش جگر میں درد
جتنے کرم ہیں ہم پہ ہیں اک مہرباں کے ہیں
سب پر طواف کوئے خرابات فرض ہے
جتنے مرید حضرت پیر مغاں کے ہیں
مشکل ہے میرے ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنا
سمجھو تو پہلے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

منھ پھیر کر چلے ہیں جگر ان سے پوچھنا
دل خاک میں ملا کے ارادے کہاں کے ہیں

رات پڑی سناٹا چھایا، شیخ حرم بھی سوتا ہے
بت کی یاد میں ایک مسلماں چپکے چپکے روتا ہے
دیتے ہو بیکار تسلی، رونے والا روتا ہے
ہنس کر آنسو پوچھ رہے ہو اور بھی صدمہ ہوتا ہے
جب سے آنکھ لڑی ہے ان سے پہروں سوچا کرتے ہیں
کس سے پوچھیں کون بتائے دل دے کر کیا ہوتا ہے
تو ہی مجھ کو قتل کیا اور خود ہی کہتا ہے ظالم
کوئی نہ کوئی خون ناحق روز مرے سر ہوتا ہے

خدا جانے تمھارے نام سے کیسی محبت ہے کسی کا نام لیتے ہیں، تمھارا نام آتا ہے

کہہ کے یہ دفن کے وقت ان کو ہنسی آتی ہے
یاد کرنا ہمیں اب گوشۂ تنہائی ہے

ہماری قبر سے چن لیجیے پژمردہ گل کوئی
نشانی کچھ تو لیتے جائیے گورِ غریباں سے

کچھ خبر اس کو نہیں پامال کرتا ہے جگر
دل کے ہر ٹکڑے پہ لکھا دل شکن کا نام ہے

وسیم بریلوی
بریلی

غزل

میری آنکھوں کو یہ سب کون بتانے دے گا
خواب جن کے ہیں وہی نیند نہ آنے دے گا

اُس نے یوں باندھ لیا خود کو نئے رشتوں میں
جیسے مجھ پر کوئی الزام نہ آنے دے گا

سب اندھیروں سے کوئی وعدہ کیے بیٹھے ہیں
کون ایسے میں مجھے شمع جلانے دے گا

بھیگتی جھیل، کنول، باغ، مہک، سناٹا
یہ مرا گاؤں مجھے شہر نہ جانے دے گا

وہ بھی آنکھوں میں کئی خواب لیے بیٹھا ہے
یہ تصور ہی کبھی نیند نہ آنے دے گا

اب تو حالات سے سمجھوتہ ہی کر لیجے وسیم
کون ماضی کی طرف لوٹ کے جانے دے گا

کوثر چاندپوری

بھارت نرسنگ ہوم - آصف علی روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

(افسانہ)

سونگھا ہوا پھول

شاھین خوبصورتی سے زیادہ ذہانت کے لحاظ سے دل چسپی کی مستحق تھی وہ ہونہار، ہنس مکھ، حاضر جواب اور بہت زیادہ جدت پرست تھی۔ ہر نئی چیز پر مرمٹنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ نئے انداز سے اپنے گیسو سنوارنا پسند کرتی تھی۔ مشرقی ماحول میں جہاں لمبے بالوں ہی کو خوبصورتی خیال کیا جاتا تھا، اس نے بال کٹوانے کا جرائت مندانہ اقدام کیا۔ طعن و تشنیع کی قطعی پرواہ نہیں کی۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ ملک سے باہر جائے، لندن، امریکہ، روس اور فرانس کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی مسرت حاصل کرے۔ اس کے والد انیس احمد امیر آدمی نہیں تھے۔ بس خوش لباسی اور شرافت کا بھرم قائم کیے ہوئے تھے۔ شاہین کو زمین بیچ کر انھوں نے ایم۔اے تک پڑھایا تھا۔ اب کوئی ایسی جائیداد نہیں تھی، جس کو لڑکی کے حوصلوں پر قربان کر دیتے۔ شاہین نے طے کر لیا کہ کسی افسر یا تاجر کی پرائیوٹ سکریٹری یا پرسنل اسسٹنٹ بن جائے اور کسی بیرونی دنیا کی سیر کرنے والے کسی ایسے شخص کی تلاش میں رہا [illegible] اپنے ساتھ باہر لے جا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ اخبارات میں ملازمت کا کالم دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی مراد پوری ہو گئی۔ اخبار میں پرائیوٹ سکریٹری کے لیے اشتہار تھا۔ اس نے فوراً [درخواست بھیج دی۔ اسے انٹرویو کے لیے طلب کر لیا گیا۔ سوالات] کچھ [illegible] کے جوابات [illegible] جن سے

شاہین کی وسیع معلومات کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکیاں بہت سی تھیں چند نوجوان بھی تھے۔ لیکن کامیابی شاہین ہی کے حصہ میں آئی۔ جب اس نے اپنی چچیری بہن رضوانہ سے ذکر کیا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"جس نے تیرا انٹرویو لیا ہے وہ حسن پرست معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے تیری گوری چٹی رنگت، بڑی بڑی شرابی آنکھوں اور لال بھبھوکا رخساروں پر مرمٹا۔ ورنہ تیری قابلیت سے میں خوب واقف ہوں۔ یقیناً اسے سکریٹری کی نہیں بیوی کی ضرورت ہے۔ لندن جا کر تجھے ریشمی ڈور میں جکڑ لے گا۔"

"وہ ایسا شخص نہیں معلوم ہوتا۔ بہت شریف ہے۔"

"زیادہ تر شریف ہی اس قسم کی شادیاں کیا کرتے ہیں۔"

"میں اس پوزیشن کو پسند نہیں کروں گی رضوانہ۔"

"اگر اصرار ہوا؟"

"تو واپس آ جاؤں گی۔"

"ٹکٹ کے پیسے نہ ہوئے تو؟"

"پھر مجبوراً سب کچھ گوارا کروں گی۔"

"سب کچھ میں [illegible] گنجائش ہے؟"

"میرا مطلب صرف شادی سے ہے۔"

"بہت بیوقوف ہے تو۔ میں پوچھتی ہوں ایسی کیا پڑی ہے یورپ جانے کی کیا لیاقت بڑھ جائے گی؟"

"میری رائے میں تو پہلے یہ تحقیق کر لو کہ تمھارا باس یعنی جس کی سکریٹری بن کر جا رہی ہو وہ بیوی بچوں والا تو نہیں ہے۔"

"ارے ایسا نہیں ہے،" رضوانہ اس کے بھولے چہرے سے ایسا نہیں لگتا۔"

مسٹر امتیاز بہت بڑے تاجر تھے کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا، بدصورت بھی نہیں تھے۔ گندمی رنگ، چمکدار آنکھیں، ریتھا رسیلا لہجہ، وہ سوالات شروع کرنے سے قبل دیر تک شاہین کو دیکھتے رہے تھے۔ ان کی پیاسی نگاہوں میں شرارت بالکل نہیں تھی۔ شوق ضرور تھا۔ دراصل وہ شاہین کی کسی بے نام سی ادا پر فریفتہ ہو گئے۔ جلد ہی تقرر ہو گیا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی روانگی تھی۔ تیاری کے لیے شاہین کو کچھ رقم بھی دیدی گئی۔ سفر ہوائی جہاز سے ہوا۔ سیٹ دونوں کی قریب ہی تھی۔ جہاز نے پرواز کی تیاری کی تو پیٹی امتیاز ہی نے باندھی۔ شاہین اس سے پہلے ہوائی جہاز میں کبھی نہ بیٹھی تھی بالکل ناواقف تھی۔ جہاز اوپر اٹھنے لگا تو اس نے "اوئی" کہہ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ہنس پڑے اور بڑے خاص انداز سے شاہین کو دیکھا جس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کیفیت وہی تھی جس کا اظہار اس مصرعہ میں کیا گیا ہے۔ ع

"آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"

وہ صہبائے محبت سے نہیں صہبائے دہشت سے سرشار تھی، شاہین کو لندن بہت اچھا لگا۔ یہاں سب عورتوں کے اسی کی طرح تھے۔ مگر چہرے پھیکے شلغمی اور بے نمک سے لگے۔ ان میں نمائش زیادہ، دلکشی نام کو نہیں تھی۔ بنفشہ کے پھول کی سی نیلی آنکھیں اسے بالکل اچھی نہیں لگیں۔

امتیاز اپنے دوست جونز کے یہاں مقیم ہوا وہ بالکل نوجوان اور ہمیشہ سے مشرقی عورتوں کا پرستار تھا شاہین کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ امتیاز نے تعارف کرایا۔

"میری پرسنل سکریٹری مس شاہینہ ایم۔ اے۔"

وہ مسکراتا رہا جونز اور امتیاز کا کلکتہ میں ساتھ رہا تھا دونوں کے طرز رہائش میں بڑا فرق تھا۔ لندن میں عیش کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پے انگ گیسٹ بنا لیا بہت آسان ہے جونز شاہین کا بندۂ بے دام بن گیا۔ چاہتا تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ اسی کے ساتھ رہیں۔ امتیاز خودداری کے مریض تھے انھوں نے جلد ہی ہوٹل میں کمرہ لے لیا، بہت چھوٹا تھا اتنے سے کمرے میں میاں بیوی تو بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔ لیکن باس اور سکریٹری کا رہنا ذرا پیچیدہ سا مسئلہ تھا۔ کمرے کو دیکھتے ہی شاہین نے پوچھا

"میں کہاں رہوں گی؟"

"یہیں، یہ لندن ہے مس شاہین"۔

"لندن سہی لیکن میں اس کال کوٹھری میں نہیں رہ سکتی"۔

"کیا ہم دونوں میں اب بھی اتنی غیریت ہے۔؟"

"بالکل ہے"۔ شاہین نے اور اسے دلبری سے جواب دیا۔

امتیاز کے دل میں تیر سا پیوست ہو گیا، وہ دیر تک شاہین کو غور سے دیکھتا رہا۔

حقیقت یہ تھی کہ اندر ہی اندر وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے تھے۔ جی شاہین کا بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی جگہ کو حجلۂ عروسی بنا لیا جائے مگر اس خواہش کا اظہار وہ نہ کر سکتی تھی۔ امتیاز سراپا اضطراب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح شاہین یہاں رہنا گوارا کرلے۔

"سوچتی ہوں کہ مجھے کسی فلیٹ یا ہاسٹل یا پارک کی جستجو کرنا چاہیئے۔"

"لاحاصل"۔ امتیاز نے کہا۔ "یہ بمبئی یا دہلی نہیں، لندن ہے۔ میں کہتا ہوں اتنی انفرادیت پسندی مناسب نہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا"۔

"کون سا راستہ اختیار کیا جائے، بہت سوچنا ہوگا۔" شاہین بولی۔

"اتنا کچھ سوچنے کے لئے وقت نہیں، آپ قبول کریں تو میری تجویز یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں یعنی شادی [illegible]

شاہین چپ رہی، اس کے نزدیک بھی یہی تجویز مناسب تھی۔ اس نے ذرا تذبذب کے بعد اسی کو بہتر سمجھا، زندگی دو تین مہینے نہایت ہموار سطح پر رواں دواں رہی نشیب و فراز سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ امتیاز سارا دن ہوٹل سے باہر ہی رہتا۔ کاروبار کی مصروفیت کے باعث سے مہلت نہ ملتی۔ شاہین نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ امتیاز کے خون میں عشق و محبت کی بجلیاں چمک جانے کے بعد سرد پڑ چکی ہیں۔ وہ محض تجارتی انسان ہے۔ اور میرا اس کا ساتھ بھی ایک طرح کی بزنس ہے۔

دونوں کی ڈاک کمرے میں ہی آجاتی تھی۔ اصول کے مطابق کوئی ایک دوسرے کا لفافہ نہیں کھولتا تھا۔ ایک روز نہ جانے کس موڈ میں شاہین نے امتیاز کا خط چاک کر ڈالا۔ اس کو بھول ہی کہنا پڑے گا۔ پہلا جملہ پڑھتے ہی اس کا سارا وجود بکھر گیا تاہین بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ غصہ میں دانت پیس کر خود کلامی کے طور پر بولنے لگی۔

"فریبی، دھوکہ باز، ذلیل شکاری!"

واقعہ یہ تھا کہ امتیاز بیوی بچوں والا تھا۔ بیوی نے اسے سرتاج ہی کے لفظ سے مخاطب کیا تھا۔ شاہین دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اسے اپنی دوشیزگی کے قتل کا شدید قلق تھا۔ وہ اپنے غم اور قلق کو آنسوؤں کے طوفان میں نہ گھول سکی اور امتیاز کے آتے ہی برس پڑی۔

"دغاباز، مکار، جھوٹا، مجھے برباد کر دیا۔ اب میں کیا کروں کون مسلے ہوئے پھول کو سونگھے گا۔؟"

امتیاز کو سان و گمان بھی نہ تھا کہ یہ راز کھل جائے گا۔ وہ شاہین کو کسی طرح مطمئن نہ کر سکا۔ شاہین نے وہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

"اکیلی؟"

"ہاں اکیلی۔" ؎

مژدہ ہے شرط مسافر نواز بہترے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

یہ کہتے ہی اسے جوزف کا خیال آیا جس کی آنکھوں سے ہمیشہ محبت کی دو آتشہ شراب ٹپکتی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ محض امتیاز کی وجہ سے زبان میں تالا ڈال لیا تھا۔

"سوچتی ہوں جوزف کو لے جاؤں۔"

"وہ نہیں جا سکتا ایسی عورت پر کوئی غیرت دار مرد تھوک بھی نہیں سکتا۔"

"بکواس مت کرو۔" جوزف ضرور جائے گا اور واقعی وہ ایک اشارے میں تیار ہو گیا۔ امتیاز کو اپنے دوست جوزف سے ایسی امید نہ تھی۔ لیکن جس جرم کا ارتکاب وہ شاہین کے ساتھ کر چکا تھا اس کا انتقام جوزف نے بڑی دلیری سے لیا، جوزف شاہین کے ہمراہ چلا گیا پٹنہ میں اسے ایک کمپنی میں بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ بیکاری دور ہوتے ہی اس نے شاہین سے کہا۔

"زندگی کا لطف اسی وقت ہے جب میرا اور تمہارا درمیانی فاصلہ مٹ جائے۔"

"مگر میرا اور آپ کے درمیان مذہب کی آہنی دیوار حائل ہے۔"

"عشق ہمیشہ ایسی ہر دیوار کو گرا دیتا ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ میں سونگھا ہوا پھول ہوں!"

"نور جہاں کی طرح۔؟"

شاہین کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک مردہ تاریخی روایت میں جان ڈال دی۔ اور طاہر (جوزف) نے چھاتی کر کا روپ دھار کر اسے ارمانوں کے ساتھ اپنا لیا۔

پروفیسر مہتا : گئودان کا ایک اہم کردار

کردار زندگی کی ایک ایسی علامت ہے جس کی ہر سانس معاشرے کی حد بندیوں میں محبوس ہوتی ہے۔ اس کی انفرادیت جہاں دنیائے ادب میں نمایاں مقام حاصل کرتی ہے وہیں اس کا عہد اس کی شخصیت کی چلمنوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ لیکن یہ انفرادیت دراصل فنکار کی ذہنی بصیرت کا عکس ہے کہ وہ اپنے عہد سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی عمیق نگہی سماج کے دھڑکتے پیکروں کو اس انداز میں اپنی نظروں کا مرکز بناتی ہے کہ وہ ابدیت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم ناول کے کرداروں کا عمومی جائزہ لیتے ہیں تو نذیر احمد کے کرداری پیکر نصوح، کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ، سرشار کا خوجی، شرر کا علی وجودی، منصور، موہنا اور رسوا کی امراؤ جان ادا ایسے ہی لازوال کردار ہیں۔

ان افراد کے بعد پریم چند ادبی دنیا کا وہ ستارہ ہیں جنھوں نے حقیقت کی ایک نئی دنیا سجائی۔ ان کے کردار ہمارے سامنے چلتے پھرتے اور متحرک صورت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں کہ ان کی سانسوں کی گرمی ہمارے نفس سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے بے پناہ قربت اور لگاؤ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ 'کفن'، 'کا ما دھو'، 'بیوہ' کی بزنا، 'میدانِ عمل' کے امر کانت اور سکھدا۔ نیز 'گئودان' کے ہوری، مہتا، مالتی اور دھنیا گرچہ اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں رہتے ہیں لیکن ان کے محسوسات قاری کے جذبوں سے ہم آہنگ ہو کر بے پناہ کشش کے حامل ہو جاتے ہیں۔ پریم چند کے یہ کردار وقت اور حالات کی چکی میں پستے ہوئے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں

یہ زندگی کی پیچ در پیچ راہوں کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں اپنے اپنے وسائل کے زیر اثر طے کرتے ہیں۔ کوئی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے تو کسی کی زندگی خواہشات کی شکستہ عمارت پر تعمیر ہوتی ہے اور کوئی ناقابلِ تسخیر خیالات کے چمن کی لالہ زاری میں ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا ہے جہاں —

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اس اعتبار سے گئودان کی شہری دنیا کا باسی مہتا اصول و نظریات کا ایسا جیتا جاگتا پیکر ہے جس کے ارد گرد دیگر کردار سرنگوں نظر آتے ہیں۔ افقِ ادب پر اس کی بھرپور اور کامل شخصیت ذہن کی ان گتھیوں کو سلجھاتی ہے جہاں قاری کی سوچیں بھٹکنے لگتی ہیں۔ یہ کردار اپنے ماحول سماج اور تہذیب کے انحطاط سے حد درجہ متاثر، مشرقی اقدار کا قدر داں نیز مغرب کی کورانہ تقلید سے گریزاں ہے۔ اس کا ذہن مغرب کی بیجا آزادروی کو قبول نہیں کرتا بلکہ مشرقیت کے حیا آفریں نظارے اس کے دل و دماغ کو فرحت و تازگی بخشتے ہیں لیکن سماج کی بے راہ روی اس کے ذہن کا ناسور ثابت ہوتی ہے نیز عشرتیوں کی متزلزل زندگی دل کا درد۔ پریم چند کا یہ جذباتی کردار اس معاشرے اور سماج میں سانس لیتا ہے جہاں ایک جانب سرمایہ دارانہ نظام کا دلفریب قلعہ ایستادہ ہے تو دوسری طرف جاگیردارانہ اقتدار کی خود مختار دنیا جو معصوم کسانوں کے جذبات کو پامال کرتی ہے اور ان مشترک حکمرانوں کے درمیان عزادار کی زندگی بے دست و پا ہو کر عضوِ معطل ثابت ہوتی ہے۔ اس کردار کے نظریات پریم چند کے اشتراکی خیالات کا درپن ہیں۔ انسانیت کی دل سوز کراہیں ان کے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ وہ محسوس کر چکے تھے کہ

[illegible] انفرادی ہمدردی کی مجبوری تھی لیکن مہتا اپنے نظریات کی روشنی
میں ان مجبوریوں کو قابلِ اعتنا نہیں گردانتا کیونکہ وہ جانتا ہے
کہ ظالم سے مظلوم ہونا بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امراء سے اس کی
ہمدردی محدود سے چند لمحوں تک محدود ہے۔ کیونکہ جب کھنہ صاحب
مل میں آگ لگ جانے کے بعد اقرارِ جرم کرتے ہیں تو اس کے
جواب میں مہتا اس طرح گویا ہوتا ہے کہ:

"کھنہ جی ذرا صبر سے کام لیجیے۔ آپ کیوں اس قدر اتنا
دل چھوٹا کرتے ہیں۔ دولت سے آدمی کو جو وقار ملتا ہے وہ
اس کا وقار نہیں اس کی دولت کا وقار ہے۔ آپ مفلس رہ
کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور
دشمنوں کی بھی۔ بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن رہے گا ہی نہیں۔"
مہتا کے یہ جملے دولت کے ارزاں ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔
یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی آنی جانی شے ہے جس نے
وفا نہیں کی۔ انسان کو کبھی اس کا غلام نہیں ہونا چاہیے بلکہ
ہمہ وقت تغیر پذیر حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
مہتا اگر چاہتا تو مسٹر کھنہ کو لعن طعن بھی کر سکتا تھا
لیکن چونکہ وہ ہمدرد ہے اسے انسانیت سے پیار ہے اس
لیے جب کھنہ قلاش ہو کر اپنی بے ایمانی اور کمزوریوں کا اعتراف
کرتا ہے تو مہتا ہمدردانہ رویہ اختیار کرکے اپنے چند میٹھے بولوں
سے سہارا دیتا ہے۔ وہ نادم انسان کی کوتاہی کو صدقِ دل
سے معاف کرنے کا قائل ہے۔ اس کی اولین خواہش تھی کہ امیر
طبقہ غریبوں کے ساتھ ہمدردانہ طرزِ عمل اختیار کرے اور ان
کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو۔ غریبوں سے قلبی وابستگی
کا سبب ان کی مجبور و لاچار زندگی تھی۔ اس کی تنخواہ جو ایک
ہزار روپے پر مشتمل تھی غریب طلبا، بیواؤں، مسکینوں اور
یتیموں کی نذر ہو جاتی حتیٰ کہ مکان کا کرایہ قرض کی صورت
میں بڑھتا رہتا اور اتنے روپے بھی نہ بچتے کہ وہ ایک ٹائی خرید
سکے۔ جذبۂ ہمدردی کا یہ عمل ایک نظریے کی جانب اشارہ
کرتا ہے جہاں مشترکہ طور پر مسرت و غم کو بانٹا جا سکتا ہے
اور ہر شخص کو یکساں انداز میں جینے کا حق حاصل ہے۔ اس مقام
پر پہنچ کر سب امیر و غریب کی تفریق مٹ جاتی ہے اور
سب ایک مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

مہتا نئی روشنی کا پروردہ ہے لیکن پرشکوہ ایوان کی چمک
اس کی نگاہوں کو مسحور نہیں کرتی۔ اس کا تجسس گاندھی وادی
کی مصلحانہ روش سے گزرتا ہوا اشتراکیت کی دنیا میں داخل
ہو جاتا ہے۔ اشتراکیت کا یہ انداز مارکسی نظریات کا علمبردار ہے۔
اس کا سبب غریبوں کی دبی کچلی زندگی ہے۔ ان کا درد و کرب
اور غلامی کی پابہ زنجیر قید و بند ہے جس سے نجات کے لیے
ایک ایسے مصلح کی یقیناً ضرورت تھی جو سرفروشی کے جذبے سے سرشار
آزادی کی جوت کو جوالا بنا دے۔ یہاں دراصل پریم چند کا وہ شعور
کارفرما ہے جو فکر و نظر کی تغیر پذیر کیفیت سے عبارت ہے۔
پریم چند کی ادبی زندگی کی ابتدا اصلاحِ معاشرت اور روحانی
پھولوں کے حسین گنج سے ہوئی۔ اس سلسلے میں اسرارِ معابد سے
بازارِ حسن تک کا ادبی سفر طے کیا ہے۔ گوشۂ عافیت میں ان کا
یہ شعور تبدیلی کا خوگر ہوا۔ چنانچہ وہ گاندھی جی کی مصالحانہ روش
کی جانب مائل ہوتے ہوئے رفتہ رفتہ روس کے انقلاب کے زیرِ نگیں
ہو گئے۔

پریم چند کے افکار و نظریات گئودان تک آتے آتے بعض جگہوں پر مہتا
کے خیالات کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ مہتا کے اشتراکی نظریات
خود مصنف اور گئودان کی ہم آہنگی کے ترجمان ہیں۔ مہتا کے روپ
میں اگرچہ انھوں نے اپنی بنیادی فکر و نظر کا عکس پیش کیا ہے لیکن
پروفیسر مہتا نظریاتی اعتبار سے اشتراکیت کا علمبردار ہے۔ اس کا
نظریہ کسی ایک تحریک سے وابستہ نہیں بلکہ کبھی گاندھی ازم سے
قریب ہوتا ہے تو کبھی اصلاح کی جانب قدم بڑھاتا ہے اور کبھی
انقلابِ روس کے زیرِ اثر نظر آتا ہے۔ یہ دراصل [illegible]
بدلتے ہوئے نظریے کا مظہر ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے۔ اس کا خیال ہے کہ
[illegible]

وجہ ہے کہ مالتی کی مغرب زدگی دامنِ دل کو متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش مہتا کے اس جملے میں پوشیدہ ہے۔

" جو دل میں ہو وہی زبان پر ہو، میرے نزدیک رنگ روپ اور ناز و انداز کی قیمت اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیے۔ میں وہ خوراک چاہتا ہوں جس سے روح کی آسودگی ہو، محرک اور جاذب اشیاء کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔۔۔ "

مالتی کے کردار کا ارتقاء اس جملے کا رہینِ منت ہے جو اس کے باطنی حسن کے نکھار میں معاون ثابت ہوا۔ وہ محض دل لگی کی خاطر ربط ضبط برقرار رکھتی ہے۔ مہتا مالتی کے لا اُبالی انداز کو پرکھ چکا تھا، اس کے جذبوں کی صداقت سے لاعلم نہ تھا یہی وجہ تھی کہ اسے گوبندی جیسی ایثار و تیاگ کا مجسمہ بنا کر اپنے معیار کے مطابق ڈھالنے کا خوگر ہوا کہ بالآخر مالتی اس کی شخصیت کا عکس بن گئی۔ مہتا کی دیرینہ خواہش کی تکمیل بے پناہ خوشیوں کی بارات لے کر آئی۔ اس کا اظہارِ محبت وقت کی قید و بند برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے انسان کتنا ہی اپنے خول میں پوشیدہ کیوں نہ رہے لیکن اس کی غیر شعوری حرکات و سکنات اس کے جذبوں کو عریاں کر دیتی ہیں۔ مہتا کا عشق اس وقت تک ذہن کی وسعتوں میں بھٹکتا رہتا ہے جب تک مالتی دنیا کی نیرنگیوں میں مگن نظر آتی ہے لیکن جوں ہی اس کی شخصیت میں تبدیلی جگہ پاتی ہے وہ مہتا کے نظریات کے مطابق شمعِ محفل سے چراغِ خانہ کا روپ دھار کر اس کے جہانِ آرزو میں اس طرح داخل ہوتی ہے کہ مہتا بے خود ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر مہتا اپنی تمناؤں کو حقیقت کے روپ میں دیکھ کر اپنے جذبۂ حیوانیت کا برملا اظہار کر دیتا ہے۔

" ۔۔۔۔۔ مالتی میں پہلا حیوان ہوں اور اس پر لجانے کا کوئی سبب نہیں دیکھتا۔ روحانی محبت اور ایثار آمیز محبت وہ بے غرضانہ محبت جس میں آدمی خود کو مٹا کر صرف معشوق کے لیے جیتا ہے۔ اس کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور اس کے قدموں پر اپنی روح قربان کرتا ہے میرے لیے محض

بے معنی الفاظ ہیں۔ میں نے کتابوں میں ایسی محبت کے قصے پڑھے ہیں جہاں عاشق نے معشوق کے نئے عشاق کے لیے اپنی جان دے دی ہے۔ اس جذبے کو میں حقیقت کہہ سکتا ہوں اطاعت کہہ سکتا ہوں۔ مگر محبت کبھی نہیں۔ محبت سیدھی سادھی گائے نہیں بلکہ خونخوار شیرنی ہے جو اپنے شکار پر کسی کی آنکھ بھی نہیں پڑنے دیتی ۔۔۔ "

لیکن اب مالتی کا کردار جذب و قبول کی ان حدود سے آگے بڑھ چکا ہے جہاں خواہشات کی کرنیں جھروکوں سے آنکھ مچولیاں کرتی ہیں بلکہ ایثار و قربانی کا ایک جھرمٹ یا خدمتِ خلق کے لیے موجزن رہتا ہے جہاں باہمی طلب زندگی کی راہوں میں کلیاں نہیں چنتا بلکہ روحانی پھول دیوی کے مندر میں آرتی اتارتے ہیں۔ وہ محبت کو بدگمانی سے بالاتر سمجھتی ہے:

" ۔۔۔ اس نے دیکھا کہ مہتا کی تیز فہمی محبت کو حیوانیت کی طرف کھینچے لیے جاتی ہے اور اس کی فرشتہ صفتی کی جانب سے آنکھیں بند کیے جاتی ہے ۔۔۔۔ "

مہتا نے جس انداز سے محبت کو روحانیت اور ایثار کی بلندی سے مادیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا وہیں اس کے نئے معیارِ زندگی کو مجھا بھی پہنچایا تھا جس کا تصور وہ کرتی تھی۔ یہ جذبۂ اظہار در اصل ذہنی اس کڑی کی نشان دہی کرتا ہے جہاں خواہشات کی منہ بند کلیاں جنم لیتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ پریم چند جہاں خود فرائڈ سے متاثر ہیں وہیں ان کا آدرش وادی مہتا بھی فرائڈ کی تحلیلِ نفسی کے زیرِ اثر ہے کہ جہاں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی شخصیت کے اجزا جنسی خواہشات سے تربیت پاتے ہیں جن کا لاشعور خواہشات کی وہ آماج گاہ بن جاتا ہے کہ جن کا اظہار ممکن نہیں۔ چونکہ فرائڈ کی نظر میں شخصی انفرادیت کی اہم جگہ ہے جہاں فرد واحد کی زندگی عزت و شہرت اور کلافت کے بل بوتے پر سنورتی ہے۔ اس کی جنسی خواہشات ذہن کی اتھاہ گہرائیوں میں نشو و نما پاتی ہیں لیکن وہ اظہار نہ ملنے کی بنا

(باقی صفحہ پر)

شوکت [illegible]
جمہ باں ۔ ڈیجیٹ پور

غزل

روز اگر پنگھٹ پر گوری ہو جائے گی شام
پردیسی کی پیاس تجھے بھی کر دے گی بدنام

تیری چاہ میں اس کے سوا کیا حاصل ہو انعام
آنگن آنگن کنکر پتھر، گلی گلی دشنام

جیسے پیار کا سپنا ہو سب سپنوں کا سرتاج
سب ناموں سے میٹھا ہے جیسے تیرا اک نام

تیرے قدموں کی یہ آہٹ جیسے بجیں ستار
تیری نظروں کی ہر جنبش جیسے اک پیغام

لوہے کی زنجیریں بن گئیں تیرے نام کی مالا
ہنستے ہنستے پی گئے کتنے جیالے زہر کا جام

کتنے راہی بھٹکے تو پھر پا نہ سکے منزل
کتنے سپنے ایسا بکھرے، ہو گئی نیند حرام

میں نے بھی دیکھا ہے تجھ کو اے سپنوں کی رانی
میرے من کا چور بھی کرتا ہے تجھ کو پرنام

جینت بکل رقیبؔ
۲۹ ٹھٹھیری بازار رکاب گنج لکھنؤ

غزل

ہم غمِ دہر سے اتنے تھے گریزاں اے دوست
جتنا مانوس تھا ہم سے غمِ جاناں اے دوست

کتنے ہی چہرے تھے آئینہ میں لرزاں اے دوست
کتنے ہی چاند تھے پانی میں نمایاں اے دوست

کوئی الفاظ، نہ افسانہ، نہ مضموں نہ خیال
سرگزشت ایسی کہ جس کا نہیں عنواں اے دوست

ہم نے اس شوخ کی انگڑائی کا عالم دیکھا
گویا اک موج ہوئی آب میں جولاں اے دوست

ربط باہم بھی نہیں، ترکِ تعلق بھی نہیں
دل میں پھر بھی ہے ستم کا ترے پیکاں اے دوست

سرفروشانِ وفا موت سے کب ڈرتے ہیں
تیز رو اور ہو تیغِ خمِ مژگاں اے دوست

بیش قیمت ہیں بہت جنسِ وفا جنسِ خلوص
زیست انساں کی بہت ہو گئی ارزاں اے دوست

لوگ کہتے ہیں الگ سب سے ہے انداز جینت
یوں تو دنیا میں بہت ہیں سخنداں اے دوست

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۲۰۲/۰۰۵ قطب پور۔ ڈالی گنج
لکھنؤ

زندگی بسر ہوگی کیسے عمر بھر تنہا
ہم یہاں اِدھر تنہا، تم وہاں اُدھر تنہا

شہر شہر آبادی، روح روح ویرانی
ہے ہر اک بشر تنہا اور کس قدر تنہا

اک سفر پہ جانا ہے، کس طرف نہیں معلوم
جانتے ہیں بس اتنا، ہوگا وہ سفر تنہا

جائے کوئی لے آئے، آفتاب مشرق میں
روشنی نہ ہو جب تک کیا کرے نظر تنہا

راہبر نہیں کوئی، راہزن ہزاروں ہیں
دشت سے گزرنا ہے، راہ کاٹ کر تنہا

یہ خدا کی ہستی بھی اک عجب معمہ ہے
جو شمار سے باہر، کُل تمام تر تنہا

ہر چہار جانب تو ہاشمی اندھیرا ہے
[illegible] کا دیا لے کے تم چلے کدھر تنہا

(مزاحیہ)

عبدالمجیب سہالوی
معرفت دانش محل امین آباد لکھنؤ۔

سستا روئے بار بار

اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے گھنٹوں چھان بین کے بعد گدڑی سے لال تلاش کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لال ہے بھی۔ ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ ہم بھی اس لال کی تلاش میں جاڑے آنے سے پہلے معلوم نہیں کہ کہاں کہاں کی خاک چھان چکے ہیں، نخاس، نظیرآباد، حجم خانہ، لال باغ، لیکن وہ آج تک ہاتھ نہ لگ سکا۔

آپ یقین کیجئے کہ شروع شروع جب ہم اس مہم پر نکلے تو ہماری حالت بھی آپ ہی کی طرح چوروں جیسی تھی۔ جان پہچان کے لوگوں کی نظروں سے کتراتے، دوستوں کی نظروں سے بچتے، الگنیوں پر ٹنگے اونی سوئٹروں، پتلونوں، کوٹوں اور اوورکوٹوں کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بے نیازی سے اس طرح نکل جاتے جیسے کہ ہم دیکھنے والوں سے کہہ رہے ہوں کہ توبہ کیجئے بھلا ہم اور یہ نخاسی مال خریدنے آئیں گے۔

لیکن ایک آدھ چکر لگانے کے بعد ہمارا حوصلہ بڑھا۔ کیونکہ اس ہیرا پھیری کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ ان کم قیمت بالائش اونی کپڑوں کی تلاش میں تنہا ہمیں سرگرداں نہیں ہیں۔ بلکہ آنکھ بچا کر ان کی جستجو کرنے والے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں پیدل سے لے کر سائیکل سوار، اسکوٹر بردار اور موٹر نشین سبھی شامل ہیں جو تھوڑی دور پر کار کھڑی کر کے ان کا جلوہ دیکھنے اور اپنوں سے آنکھ بچا کر خریدنے آتے ہیں۔ اسی طرح اسکوٹر سوار

اپنی پسند کا اچھا اور سستا کوٹ یا پتلون لے کر اور احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ کر پیچھے کیریئر پر اس طرح رکھ لیتے ہیں کہ تاڑنے والی نگاہیں مسکرا کر کہہ اٹھتی ہیں بس

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اور یہ الگ باندھ کر رکھا ہوا مال وہ گھر اس وقت تک نہیں لے جاتے جب تک وہ اسے نیا جنم نہیں دلوا دیتے۔ وہ خریدنے کے بعد فوراً ان جنم داتا ٹیلر ماسٹروں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں جنھوں نے اس کام کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو دیکھ کر نئے کپڑے سینے کے بجائے پرانے کپڑوں میں نئی جان ڈالنے کا نیک کام شروع کر دیا ہے اور رفتہ رفتہ اس کام میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ لمبے تگڑے، موٹے تازے مغربی ممالک کے لوگوں کے ہاتھی مارکہ لمبے چوڑے کوٹ، پتلون اور جیسٹر الٹ پلٹ اور کاٹ چھانٹ کر مشرق کے دبلے پتلے لوگوں کے بدن پر اس طرح فٹ کر دیتے ہیں کہ نئے کوٹ پتلون شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔

مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ یہاں بھی سستا روئے بار بار اور مہنگا روئے ایک بار والی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ ہم آپ اس معاملے میں بھی اس لیے گھاٹے میں رہتے ہیں کہ تنگ جیب کی وجہ سے سستے میں بھی سستا ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ہم پرانے اونی کپڑوں کا پہاڑ کھود کر ہیرا تلاش کرتے ہیں تو عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں چوہا ہی ہاتھ آتی ہے اور جب ہم

پنے دبلے پتلے جسم سے چوگنا لمبا چوڑا سوئٹر، کوٹ یا پتلون لے کر گھر پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنی بیگم کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ دیکھتے ہی ناک بھویں چڑھا کر بولتی ہیں معلوم نہیں کیوں آپ کو یہ کوڑا کباڑ جمع کرنے کا اتنا شوق ہوا ہے۔ یہ جھبل جھول پتلون پہن کر جب آپ باہر نکلیں گے تو ڈر ہے کہ کہیں بھیک شو دکھانے والے آپ کو گیٹ پر کھڑا کرنے کے لیے پکڑ نہ لے جائیں۔ ہم تکان سے چور اور پسینے سے شرابور اپنی چار گھنٹے کی محنت کا یہ پھل پاتے ہیں تو بے اختیار خودکشی کر لینے کو دل چاہتا ہے مگر صرف اس خیال سے کہ بد قسمتی سے اگر

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خودکشی کا خیال دماغ سے نکال دیتے ہیں اور خوشامد درآمد کے ذریعہ اپنا کام نکالنے کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور بڑی محبت سے کہتے ہیں کہ بیگم اب عزت و آبرو تمھارے ہاتھ ہے خدا کے لیے لعن طعن میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان ڈھیلے ڈھالے پتلون کو میرے تن لاغر پر فٹ کرنے کی کوئی تدبیر نکالو۔ وہ بدستور تیوریوں پر بل ڈالے ہوئے بولیں۔ یہ خوب رہی اونٹ پٹانگ چیزیں خرید کر آپ لے آئیے اور ان کی تک تان درست کرنے میں اپنا سر میں کھپاؤں جہاں دس پندرہ روپے کوڑا کباڑ خریدنے میں صرف کیے ہیں وہاں پندرہ بیس روپے اس کی پلٹائی میں درزی کو دیجیے۔ آپ تو انہی فضول باتوں میں ساری تنخواہ جہاں تہاں کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اس پندرھویں کا راشن لانا باقی ہے اور آپ ان ہی پتلون کے شوق میں بچے کھچے روپے بھی تتر بتر کرنے پر آمادہ ہیں۔

میں نے کہا بیگم غلطی ہوئی کان پکڑتا ہوں، اٹھا بیٹھی کرتا ہوں معافی مانگتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی غلطی کبھی نہ ہوگی۔ خدا کے لیے اب اسے کسی طرح مرمت کرو اور مجھے ہونے سے ہنسی

• گردھانی کے لیے ٹیلر ماسٹر کے پاس نہ بھیجو۔

سچی بات یہ ہے کہ ہماری بیگم اوپر سے سخت اندر سے نرم ہیں یعنی جھکنے کے بعد موم کی طرح۔ پگھل جاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے اس طرح گڑگڑانے سے انھیں ترس آ ہی گیا اور وہ قینچی لے کر اس فیل تن پتلون کو میرے جیسے مجنوں صفت انسان کے جسم پر فٹ کرنے کے لیے جٹ گئیں اور کسی نہ کسی جتن سے اسے تیار کر دیا۔ لیکن برا ہو ہمارے دوست نما دشمنوں کا جو ہمیں اونی پتلون پہنے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ انھوں نے ہمیں یہ پتلون پہنے دیکھتے ہی سوالات کی بوچھار کر دی۔ کتنے گز کپڑا ملا، فارن معلوم ہوتا ہے۔ شاید بھائی نے باہر سے بھیجا ہے۔ دوسرے صاحب بولے سلائی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ پھر لٹکی ہوئی میانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جارج پنجم بھی بالکل اسی کٹ کا پتلون پہنتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ جس درزی نے آپ کا پتلون سیا ہے وہ اسی درزی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جو برطانیہ کا شاہی ٹیلر ماسٹر تھا۔

غرض دفتر میں آٹھ گھنٹے گزارنا مشکل ہو گیا اور میں کہ

کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ کے مصداق

جان بچا کر دفتر سے بھاگ کھڑا ہوا جب گرتا پڑتا گھر پہنچا تو پسینے پسینے ہو چکا تھا بیگم نے قبل از وقت دفتر سے واپسی پر تعجب سے پوچھا خیریت تو ہے جلدی کیسے چلے آئے۔ میں نے کہا صورت دیکھو حال نہ پوچھو۔ جب انھوں نے نیچے سے اوپر تک مجھے دیکھا تو لٹکی ہوئی پتلون کی میانی دیکھ کر وہ بھی ہنسی نہ روک سکیں اور کھونٹی سے پاجامہ اتار کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ کے لیے پاجامہ ہی ٹھیک ہے۔ آپ کو پتلون راس نہیں آ سکتا۔

★

ڈاکٹر ابو محمد سحر
[illegible]
بھوپال

غزل

چاند کا رقص ستاروں کا فسوں مانگتی ہے
زندگی پھر کوئی اندازِ جنوں مانگتی ہے

مدتیں گزریں کہ زخم بستہ ہوئے قلب و جگر
غیرتِ عشق مگر سوزِ دروں مانگتی ہے

فیضِ موسم تھا پرندے ہوئے آزاد مگر
خوئے صیاد وہی صیدِ زبوں مانگتی ہے

فصلِ گل کے لیے کیا جان پہ کھیلے کوئی
اب تو ہر موجِ ہوا تحفۂ خوں مانگتی ہے

کچھ تو اے یورشِ آلام مسلسل دم لے
گردشِ وقت بھی تھوڑا سا سکوں مانگتی ہے

عظمتِ فن نہیں پروردۂ آوردِ سحرؔ
رمزِ تخلیق دمِ کن فیکوں مانگتی ہے

ظفر اقبال
سابق جلد، بجنور
(۲۱۲ ۴۶)

غزل

جو دیکھا آئینہ چہرہ لہولہان ملا
اذیتوں کی گھٹن کرب کا نشان ملا

اٹھا کے خاک سے مجھ کو گلے لگا لیتا
کوئی نہ ایسا زمانے میں مہربان ملا

سیاہ رات کے سناٹے میں مجھے اے دوست
اداس اداس سا اک تنہا آسمان ملا

بلا کی دھوپ ہے اور جل رہے ہیں پاؤں مرے
کہیں نہ چھاؤں ملی اور نہ سائبان ملا

بچھڑ گیا تھا جو تاریک راستے میں ظفرؔ
وہ ایک شخص کہ پھر اپنے درمیان ملا

دنیا

شارب لکھنوی
یونانی میڈیکل آفیسر
اسٹیٹ ڈسپنسری
موہان روڈ لکھنؤ

ایک مُردار ہے گندی ہے سڑی ہے دُنیا
دشمنِ ہوش مگر سب سے بڑی ہے دُنیا

اس کا چھونا بھی غضب اور نہ چھونا بھی غضب
وہ چمکتی ہوئی سونے کی چھڑی ہے دُنیا

جب بھی دیکھا ہے غلط وقت نظر آیا ہے
جیسے بگڑی ہوئی مفلس کی گھڑی ہے دُنیا

وہ سہارا نہیں لیتے جو نظر والے ہیں
ہاں فقط عقل کے اندھوں کی چھڑی ہے دُنیا

دوستو! آگ لگاؤ نہ کسی کے گھر میں
خود جہنم کے کنارے پہ کھڑی ہے دنیا

میں یہ بازی کبھی جیتا ہوں کبھی ہارا ہوں
عمر بھر مجھ سے ہر اک گام لڑی ہے دنیا

قبر تک سب کو یہ پہنچا کے چلی آتی ہے
خود کبھی ساتھ گڑے گی نہ گڑی ہے دنیا

کل وہیں خاک اڑائیں گے ہوا کے جھونکے
آج جن کے درِ دولت پہ کھڑی ہے دنیا

ایک مظلوم کی آواز پہ سناٹا ہے
آج شاید تری آواز پڑی ہے دنیا

پھر جنازہ کوئی اٹھے تو سمجھ میں آئے
ایک انسان بڑا ہے کہ بڑی ہے دنیا

پارساؤں کی یہ باتیں ہیں مگر کیا کہیے
دلِ شارب کی نگاہوں پہ چڑھی ہے دنیا

عرفان عباسی
۹۰ باغ منشی کالونی لکھنؤ

عبدالحمید مسعود اختر جمال (خاکہ)

سنہ ۱۹۱۵ء — سنہ ۱۹۸۱ء

فضائے لالہ و گل سرد ہوتی جاتی ہے
جمال سا کوئی شعلہ بیاں نہیں ملتا

میانہ قد، چھریرہ بدن، کھلتا گندمی رنگ، شگفتہ چہرہ۔ دیدہ زیب خد و خال۔ کشادہ پیشانی۔ بڑی خوبصورت اور روشن آنکھیں۔ کھڑی ناک۔ مسکراہٹ پر آمادہ ہونٹ سر پر انگریزی قطع کے بال جن میں ہلکے گھونگھر۔ تیز رفتار نرم گفتار۔ مزاجاً شرمیلے۔ منکسر اور بردبار۔ مسکراہٹ میں گرم جوشی۔ باتوں میں اعتماد، لب و لہجہ میں وقار۔ دردمند انسان، بزلہ سنج دوست، قصباتی روایات کے امین۔ یہ تھے ممتاز و منفرد ترقی پسند شاعر جناب مسعود اختر جمال

۱۸ دسمبر ۱۹۱۵ء کو بنارس میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام محمد کریم تھا جن کا آبائی وطن اودھ کا مشہور قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی تھا اور حضرت مخدوم شیخ سلیمان ردولوی جن کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دادا مولوی فضل الرحمٰن مرحوم حضرت مخدوم شیخ سلیمان کے سجادہ نشین تھے۔ مولوی صاحب کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے اور انگریزوں کے خلاف فتویٰ دینے کی پاداش میں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ کچھ دن نیپال و گورکھپور کے جنگلوں میں گزارنے کے بعد جب ہنگامہ فرو ہوا تو کسی نہ کسی طرح بنارس پہنچے جہاں مولوی خادم حسین صدر الصدور کی مدد اور کوشش سے پھانسی کا حکم منسوخ کرانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن جاگیر

وجاگیر ضبط کرلی گئی اور انھیں بنارس کو ہی وطن بنانا پڑا۔ فضل الرحمٰن صاحب کے دو لڑکے محمد سلیم و محمد سعید تھے۔ محمد سعید صاحب سب رجسٹرار کی اسامی پر فائز، نہایت ہر دل عزیز اور فیاض تھے۔ جمال صاحب کے والد محمد کریم صاحب انھیں کے صاحب زادے تھے۔ کریم صاحب کا شمار عمائدین میں ہوتا تھا وہ بڑے بارسوخ و باثر تھے۔

جمال صاحب کی تعلیم کی ابتدا حسب رواج گھر سے ہوئی۔ ان کی والدہ صوم و صلوٰۃ کی پابند با سلیقہ اور بڑے رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں انھوں نے جمال صاحب کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ کچھ دنوں تک دہلی میں پڑھنے کے بعد جونپور بھیجے گئے وہاں درجہ ششم سے تعلیم کا آغاز ہوا اور سنہ ۱۹۳۴ء میں ہائی اسکول کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ دینی فارسی کی تعلیم ایک مقامی مولوی صاحب سے حاصل کی۔ ہائی اسکول کے بعد علی گڑھ گئے۔ ایف۔ اے میں داخلہ لیا لیکن امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا لیکن ذاتی شوق مطالعہ اور کوشش سے علمی استعداد میں روز افزوں اضافہ کرتے رہے۔ کسب معاش کی فکر دامن گیر ہوئی تو نوعمری ہی میں ملازمت کی تلاش شروع کی اور دور اندیشی انھیں کے بس کی بات نہ تھی۔

ترقی ملازمت کی سختیوں اور شرائط کی پروا کیے بغیر

اور باغیانہ نظمیں کہتے رہے۔ خفیہ پولیس نے وہ نظمیں اعلیٰ فوجی حکام تک پہنچا دیں اور ملازمت ختم ہو گئی۔ کچھ دن کے بعد اسے بریلی میں محکمۂ خوراک و رسد میں ملازمت کی جس کا سلسلہ ۱۹۴۸ء تک چلتا رہا پھر کوئی ملازمت نہیں کی اور ساری زندگی معاشی بدحالی میں صبر و قناعت کے ساتھ گزار دی۔ جمال صاحب فطرتاً آزادی پسند، قوم پرور، غریبوں و مظلوموں کے ہمدرد اور جبر و زیادتی کے خلاف تھے۔ انھوں نے کبھی کسی سیاسی پارٹی کی رکنیت باقاعدہ قبول نہیں کی لیکن جد و جہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جمال صاحب نہایت خلیق اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ان سے مل کر ہر شخص ان کی تواضع و اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ شعر و ادب سے والہانہ دلچسپی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے دادا محمد سعید صاحب اور والد محمد کریم صاحب شاعر تھے اور ان کے نعتیہ کلام کی شہرت تھی۔ اس شاعرانہ آب و ہوا سے متاثر ہو کر جمال صاحب نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا اور پہلا شعر کہا ؎

جامِ جہاں نما مرا جامِ شراب ہے
عالم تمام پیشِ نظر بے نقاب ہے

والد ماجد کو خبر ہوئی تو انھوں نے سخت مخالفت کی لیکن ذہین و طباع بیٹے نے تسکین ذوق کے لیے ایک ایسی راہ نکالی کہ والد کو خبر نہ ہوئی اور وہ دنیائے شعر و ادب میں ایک ممتاز مقام کے مالک بن گئے۔ جب کریم صاحب کو معلوم ہوا کہ معروف شاعر مسعود اختر جمال ان کے عبدالحمید کا ادبی نام ہے اور وہ آسمانِ شاعری پر درخشندہ ستارے کی طرح چمک رہا ہے تو اس کے علاوہ کہ وہ بیٹے کی شہرت و مقبولیت سے خوش ہوں اور کوئی راستہ [illegible]

جمال صاحب کی ادبی سرگرمیاں زمانۂ طالب علمی میں شروع ہو گئی تھیں، انھوں نے جو پہلا مضمون لکھا تھا وہ "غنچہ" میں چھپا تھا اس کے بعد مختلف اخبارات و رسائل میں ان کی تخلیقات جگہ پانے لگیں۔ آخری عمر میں "کارل مارکس" اور "پیغمبرِ اسلام" لکھیں۔ اپنی آپ بیتی "بادشش بغیر" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ جو ناتمام رہ گئی۔ جمال صاحب نے یوں تو ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں لیکن نظم میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے، ان کی تخلیقات "نورس" ۱۹۴۴ء میں "اردو زبان ہماری" ۱۹۵۴ء میں "لالۂ شاداب" ۱۹۶۱ء میں "جشنِ آزادی" ۱۹۷۶ء میں چھپ کر شرفِ مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ جمال صاحب کا شمار اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے کی نمایاں ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو نیا موڑ، نیا لہجہ، نیا آہنگ اور نیا نظریہ دیا۔ وہ بڑی لگن، اخلاص و انہماک سے شعر کہتے تھے اور جذبات کو شعری جامہ پہنانے میں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں وطن سے محبت اور فن دونوں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ وہ بہت مقبول شاعر تھے، ایسی خوش قسمتی اردو شاعر کی زندگی میں کم ہی حاصل ہوتی ہے۔ انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند سے ایک سو پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا۔

جمال صاحب ۱۹۵۷ء میں سخت علیل ہوئے تھے علاج و معالجہ سے فائدہ ہو گیا لیکن صحت بحال نہ ہو سکی، رفتہ رفتہ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ دواؤں کے سہارے تقریباً ۲۴ سال گزرے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۸۱ء کو حالت بگڑ گئی الہ آباد میڈیکل کالج میں داخل کیے گئے۔ پانچ چھ دن امید و بیم میں گزرے، ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء کی رات کو دنیائے شعر و ادب کی یہ معروف شخصیت ہم سے بچھڑ گئی، تدفین الہ آباد میں حسن منزل کے پاس قبرستان میں ہوئی۔ جمال صاحب اپنی بے لوث ادبی خدمات کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

نمونۂ کلام

غزل کے اشعار ؎

سمجھے تھے بے خبر جنھیں ہشیار وہ بھی ہیں | ساقی اس انجمن کے تہی دست اور وہ بھی ہیں
دنیا سمجھ رہی ہے جسے عشق شیخ کو | خوش فکر و خوش مزاج و خوش اطوار وہ بھی ہیں
لعل و گہر کو بے بہا سمجھے ہیں جوہری | یارب متاعِ دل کے خریدار وہ بھی ہیں

چپ جو رہیے تو خموشی ہے گراں محفل پر ۔ رازِ دل کہیے تو اندیشۂ رسوائی ہے

زمانہ میری محبت کا درد کیا جانے ۔ وہ چوٹ دل پہ لگی تھی کہ آہ کر نہ سکا

فن و شعر کا الہام مجھے نذر کروں ۔ ناشنیدہ سا یہ پیغام مجھے نذر کروں

نہ وہ رندانِ خوش اوقات نہ وہ بزم وفا ۔ عشرتِ بادۂ گلفام کسے نذر کروں

کیا کوئی سلسلۂ رنگ جنوں صبحوں کا نسوں ۔ یہ بہاروں کی حسیں شام سے نذر کروں

اٹھ گئے بزم سے رندانِ بلا نوشِ جمال ۔ مئے دوشینہ کا یہ جام کسے نذر کروں

جنونِ عشق نہ کر اضطراب کی توہین ۔ یہ آہ نیم شبی ہے شباب کی توہین

حسنِ انجمن کو بنایا تھا ہم نے رشکِ ارم ۔ وہیں ہوئی دلِ خانہ خراب کی توہین

نظر اٹھا کہ نظارہ دل میں جان پڑ جائے ۔ حجابِ کم نظری ہے حجاب کی توہین

مژدہ اس کو بھی ہے میری نوائے ہستی ۔ وقت کے ہاتھ میں چلتی ہوئی شمشیر بھی ہے

ساز اٹھاتا ہوں مگر یاد رہے اہلِ نشاط ۔ ساز کی لے میں نہاں سوز کی تاثیر بھی ہے

زندگی خواب سہی خواب پریشاں ہی سہی ۔ دل یہ کہتا ہے یہی خواب کی تعبیر بھی ہے

ناشنیدہ سے جو اب تک مرے نغمے ہیں جمال
کچھ زمانے کی خطا کچھ مری تقصیر بھی ہے

نظم "عزمِ جمہور" سے

جھکے گا خاک پہ یہ قصرِ آسماں اک دن ۔ ہمارے زیرِ قدم ہوگی کہکشاں اک دن

بڑھے گا جانبِ منزل یہ کارواں اک دن ۔ فضائے ارض و سما ہوگی ہم عناں اک دن

حیاتِ خضر ملے گی ہر ایک ذرے کو ۔ ہمارا نقشِ قدم ہوگا جاوداں اک دن

ہماری ماؤں ہمارے ہی گیت گائیں گی ۔ انھیں سے دیں گی وہ بچوں کو لوریاں اک دن

انھیں کی لے سے جوانانِ بزم جاگیں گے ۔ انھیں سے ذوقِ جنوں ہوگا کامراں اک دن

انھیں سے منزلِ نو کا ہمیں ملے گا سراغ ۔ انھیں سے راہ پہ آئے گا کارواں اک دن

نظم "زندگی" سے

بے نہایت بے کراں ہے زندگی ۔ فاتحِ کون و مکاں ہے زندگی

ماہ و انجم گردِ راہِ شوق ہیں ۔ کہکشاں در کہکشاں ہے زندگی

انقلابِ نو بہ نو کے ساز پر ۔ شعلۂ عزمِ جواں ہے زندگی

آرزوئے ہر مکاں و لامکاں ۔ مدعائے ہر زماں ہے زندگی

قلبِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا ۔ سجدہ گاہِ آسماں ہے زندگی

جہد و جہدِ ارتقا کی راہ میں ۔ سو یقیں کا اک گماں ہے زندگی

اور میرے فن کے پردے میں جمال ۔ عظمتِ عصرِ رواں ہے زندگی

نعت کے چند اشعار سے

جان پہ لب سوزِ دروں سے ترا سودائی ہے
اے مسیحائے زماں وقتِ مسیحائی ہے

اے رسولِ عربی فخرِ جہاں نازِ بشر
اے کہ نسبت سے تری عشق کی گہرائی ہے

کھینچ کر وقت کی زنجیر دکھایا تو نے
روحِ صدیوں کی بس اک پل میں سمٹ آئی ہے

بے پناہوں کو دیا تو نے پناہِ ایماں
بیکسوں نے ترے دامن میں اماں پائی ہے

ہمسرِ مہرِ درخشاں ہے جہاں ہر ذرہ
نقشِ پا سے ترے منزل وہ نظر آئی ہے

گیت :- سے

یہ دھرتی یہ جیون ساگر یہ سنسار ہمارا ہے
امرت بادل بن کے اٹھے ہیں پربت ٹکرائیں گے
کھیتوں کی ہریالی بن کر جیت اپنی دکھلائیں گے
دنیا کا دکھ سکھ اپنا کر دنیا پر چھا جائیں گے
ذرہ ذرہ اس دنیا کا آج گگن کا تارا ہے
یہ دھرتی یہ جیون ساگر یہ سنسار ہمارا ہے
دکھ کے بندھن کٹ جائیں گے سکھ کا سندیسہ آئے گا
مٹی اب سونا اگلے گی۔ بادل دھن برسائے گا
محنت پر ہے جس کا بھروسا محنت کا پھل پائے گا
اپنے ہی کس بل کا سمندر وقت کا بہتا دھارا ہے
یہ دھرتی یہ جیون ساگر یہ سنسار ہمارا ہے
سپنوں کے سندر آنچل سے آشا نے ہے دکھائی
نئی ہوا آزادی کی لے پر ساری دنیا گاتی ہے
آج ترنگے کی لہروں میں بجلی سی لہراتی ہے
اک ہی وار میں اب اپنے ساتھی دشمن چھٹکارا ہے
یہ دھرتی یہ جیون ساگر یہ سنسار ہمارا ہے

ملک عباس امید
ولبھ بھون، بھوپال

آگہی قید ہوئی، تھم گیا ذہنوں کا سفر
دلبری سو گئی ماحول کی تپتی ہوئی چٹانوں پر
اجنبیت کے جواں نخل میں کونپل پھوٹی
سانس محبوس ہوئی ذات کے زندانوں میں
دور تک ختم جہاں ہوتے ہیں سمتوں کے حدود
کوئی آہٹ ہی نہیں دل کے نہاں خانوں میں

نارسائی کی فضا کیا معنی!
بے نوائی کی گھٹا کیا معنی!!

تپتے ماحول کے صحرا میں بھٹک کر شب و روز
سارے بکھرے ہوئے ماحول کو یکجا کر کے
میں ہر اک سمت صدا دیتا ہوں دلداری کو
اپنے پاؤں میں چبھوتا ہوں ہر اک راہ کے خار
اور پھر ان پہ طلب کرتا ہوں غمخواری کو

اصطلاحوں کی بدلتی ہوئی رنگت کیسی
زندہ لفظوں کی پگھلتی ہوئی صورت کیسی
کیوں ہر اک لمحہ کو درکار ہے جینے کا خراج
قحطِ غمخواری ہے کیوں محفلِ یاراں کا مزاج
پھول پر قطرۂ شبنم تو بجا تھا لیکن
کھاری پانی کی ٹپکتی ہوئی بوندیں کیسی
دور تک — ختم جہاں ہوتے ہیں سمتوں کے حدود
قحطِ امروز بھی ہے (قحطِ شب و روز بھی ہے)
کوئی ایسا نہیں جو چوم لے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی جبیں
تشنگی بھی نہیں بن پاتی ہے سوکھے ہوئے ہونٹوں کی امیں

کاش ٹپکے کبھی ماحول کی آنکھوں سے ندامت کا لہو
بجھتی آنکھوں میں حقیقت کا حسیں نور کھلے
سونے طاقوں میں کئی شمعیں فروزاں ہو جائیں
اور ہم خوں خوں کے ماضی کو پشیماں ہو جائیں

— —

توقیر جمال
سیکریٹریٹ کالونی ٹائپ III
بلاک ۱۱ مہانگر لکھنؤ

غزل

پھر سبق اس کو محبت کا سکھایا جائے
آؤ انسان کو انسان بنایا جائے

چاند تاروں سے ملے جس کو خراجِ تحسین
اک چراغ ایسا محبت کا جلایا جائے

ان کی یادوں کے سکوں یا غمِ محرومی کو
دل کے کاشانہ میں اب کس کو بسایا جائے

مضطرب رہتی ہیں اسی فکر میں موجیں شاید
کیسے دریا کے کناروں کو ملایا جائے

دیکھنا مڑ کے کوئی جرم نہیں ہے لیکن
یادِ ماضی میں نہ فردا کو بھلایا جائے

آدمی پاتا ہے خود کردہ گناہوں کی سزا
کس پہ بہکانے کا الزام لگایا جائے

اے جمال آپ نے دیکھا تو ہے زخموں کو مگر
روح کا کرب مگر کس کو دکھایا جائے

کشور سلطان مرادآبادی
نئی بستی، مرادآباد

غزل

چاند سے دھوپ ستاروں سے گھٹا مانگے ہے
آج کا دور تو عالم ہی جدا مانگے ہے

اس سے پوچھو کہ جراحت کی حقیقت کیا ہے
ہر قدم عشق میں جو زخم نیا مانگے ہے

یہ کسی دور کا سقراط یقیناً ہوگا
آج کے دور میں جینے کی دعا مانگے ہے

حسن ہر موڑ پہ اک عذرِ جفا چاہے ہے
عشق ہر گام پہ اک لغزشِ پا مانگے ہے

جانے کیا دل پہ مشیت کے گزرتی ہوگی
زندگی موت کی جس وقت دعا مانگے ہے

اب آنسو ہیں نہ حسرت نہ تمنا نہ شعور
مجھ سے کیا جانے یہ اب دورِ بلا مانگے ہے

دعوتِ فکر ہے اربابِ تخیل کے لیے
آج پھولوں سے لہو بادِ صبا مانگے ہے

عشقِ خوددار کو یہ کون بتائے کشور
مانگنا چاہیئے کیا حسن سے کیا مانگے ہے

ہاشمی بیگم عفت
ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

غزل

بیگانۂ کونین بنایا نہیں کرتیں
یادوں کو ہوا کیا کہ اب آیا نہیں کرتیں

محفل میں تمہاری نہ مجھے رسوا نہیں کرتیں
آنکھیں بھی اب اظہارِ تمنا نہیں کرتیں

آنے کو تو آجاتی ہیں آہیں بھی لبوں پر
لیکن غمِ فرقت کا مداوا نہیں کرتیں

پتھرائی ہوئی عاشقِ ناشاد کی آنکھیں
رودادِ غمِ ہجر سنایا نہیں کرتیں

چھائی ہے تصور پہ قیامت کی اداسی
یادیں بھی تری دل کو ستایا نہیں کرتیں

کس واسطے بدلی ہیں تری شوخ نگاہیں
کیوں عاشقِ محروم کو چھیڑا نہیں کرتیں

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

● گورنر کے ہاتھوں قومی یکجہتی کانفرنس کا افتتاح ● حکومت نے تنخواہ کمیشن کی سفارشات سے زیادہ دیا ● قوم کی ترقی کے لیے اتحاد ضروری۔ وزیر اطلاعات کے ہاتھوں کیرلے سماجسم تقویب کا افتتاح ● پہاڑی علاقوں میں اطلاعات خدمات کی توسیع ● غازی آباد کے لیے سات کروڑ روپے کی سیاحتی اسکیم ● لکھنؤ کی ترقی کے لیے کابینی ذیلی کمیٹی کی تشکیل ● معذور افراد کے لیے قومی انعامات ●

اتر پردیش کے گورنر شری چندریشور پرشاد نرائن سنگھ نے کہا ہے کہ قومی یکجہتی کو مستحکم رکھنا ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

گورنر نے وارانسی نگر مہاپالیکا کے کانفرنس ہال میں کل ہند بہادر شاہ ظفر اکاڈمی اور نگر مہاپالیکا کی جانب سے منعقدہ قومی یکجہتی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں تفرقہ پھیلانے والے عناصر سے ہوشیار رہنا چاہیے جو اپنے مقاصد کے لیے مذہب اور ذات پات کے نام پر لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔ قومی یکجہتی اس وقت تک پوری طرح سے قائم نہیں ہو سکتی جب تک ہم یہ بات ذہن نشین نہ کریں کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے نیز مذہب اور قومیت دو علاحدہ چیزیں ہیں۔

ہمیں بہادر شاہ ظفر سے سبق لینا چاہیے جنھیں ہندستان کی سرزمین سے اتنی والہانہ محبت تھی کہ ـــــ وہ آخر وقت تک اس کی دو گز زمین کے لیے تڑپتے رہے۔

اس موقع پر وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء میں جس نصب العین کے لیے جنگ شروع کی تھی وہ ۱۹۴۷ء میں ہندستان کی آزادی کی شکل میں حاصل ہوا۔ وہ عظیم مجاہد آزادی تھے اور آزادی کی قیمت انھوں نے اپنے بیٹوں کے خون سے ادا کی تھی۔

ہندستان کے ۶۶ کروڑ عوام کے دلوں میں ان کے لیے آج بھی احترام کا جذبہ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے لیکن انھیں حقیقی خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو قومی یکجہتی کے لیے وقف کردیں اور ایک دوسرے کا خون بہانا بند کردیں۔

اس موقع پر گورنر کو محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ "نیا دور" کا بہادر شاہ ظفر نمبر اور ہندی میں ظفر کی سوانح حیات نیز ان کی ایک بڑی تصویر پیش کی گئی۔ تصویر پر بہادر شاہ ظفر کے متعلق نیتاجی سبھاش چندر بوس کا مقولہ "آدمیوں میں بادشاہ اور بادشاہوں میں آدمی" درج ہے۔

اس خصوصی تقریب کے آغاز میں گورنر نے بہادر شاہ ظفر کی تصویر کی گل پوشی کی اور انھیں اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر قرآنی آیات اور اشلوک پڑھے گئے نیز اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا" بھی گایا گیا۔

وزیر اعلیٰ شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ نے یہاں کہا کہ ریاستی حکومت نے سرکاری ملازمین کو تنخواہ کمیشن کی سفارشات سے ۲۲ کروڑ روپیہ زیادہ دیا۔ یہ اضافہ کسی ہڑتال کی دھمکی کی بنیاد پر نہیں بلکہ حکومت اور ملازمین کے درمیان خوشگوار تعلقات کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

درجہ چہارم کے ملازمین کی اتر پردیش فیڈریشن کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ تنخواہوں میں اس اضافہ کا بار بالآخر عوام پر ہی پڑتا ہے۔ ایک روپیہ کے اضافہ سے تقریباً ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کا فاضل بار پڑتا ہے۔

• • •

وزیر ریاست برائے اطلاعات و منصوبہ بندی شری کاشی ناتھ مسرا نے کہا ہے کہ ریاست اور ملک کی تیز رفتار ترقی کے لیے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مستحکم بنانا اشد ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں سماج کے سبھی طبقوں کو مسلسل کوشاں رہنا چاہیے۔

وزیر موصوف نے یہاں رویندرالیہ میں "لکھنؤ کیرل سماجم" کے جشن سیمین کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آدی گرو شنکراچاریہ نے ملک میں چار دھام قائم کر کے قومی اتحاد کی بنیاد ڈالی اور پوری قوم کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کر دیا۔

• • •

وزیر ریاست برائے اطلاعات شری کاشی ناتھ مسرا نے ضلع چمولی کے چار روزہ دورہ کے دوران محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ کے زیر انتظام بدری ناتھ میں اطلاعات مرکز اور جوشی مٹھ میں محکمہ کا دفتر قائم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے گڑھوال ڈویژن کے سری نگر میں محکمہ کا ایک بڑا دفتر قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے پہاڑی علاقہ میں محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ کی سرگرمیوں کی توسیع پر بھی زور دیا۔

• • •

اتر پردیش کے محکمۂ سیاحت اور نوئیڈا کی مشترکہ کوششوں اور باہمی تعاون سے غازی آباد میں ایک صنعتی و سیاحتی کامپلکس تعمیر کرنے کے لیے ایک وسیع اسکیم وضع کی گئی ہے جس پر تقریباً سات کروڑ روپیہ کے مصارف کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔

• • •

لکھنؤ شہر کی منصوبہ بند ترقی کے لیے وزیر اعلیٰ شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ کی سربراہی میں ایک ذیلی کمیٹی تشکیل کی گئی ہے۔

یہ کمیٹی راجدھانی کے لیے سیوریج، ڈرینیج، سڑکوں وغیرہ کے ماسٹر پلان تیار کرائے گی اور انھیں منصوبہ بند طریقہ سے بروئے کار لائے گی۔

• • •

حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ اس سال معذور افراد کے آجرین، بہترین کام کرنے والے معذور ملازمین اور معذور افراد کو زیادہ سے زیادہ روزگار دلانے والے اعلا درجے کے پلیسمنٹ آفیسر کو قومی انعامات دیے جائیں گے۔ ان انعامات کی تعداد بالترتیب ۱۲، ۲۴ اور ایک ہے۔ یہ انعامات معذوروں کے عالمی دن کے موقع پر آئندہ مارچ میں دیے جائیں گے۔

• • •

(پرویز شاہدی صفحہ ۱۴ کا بقیہ)

بنا پاتا تو اس کے لیے پرویز کی نظم "شیروانی" ملاحظہ کیجیے:

ان تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ پرویز شاہدی نے چند خوبصورت نظمیں، دو کوڑی ٹیک اور ادا اگر ان نظموں کے علاوہ پرویز کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی ایک کامیاب نظم نگار کی حیثیت سے پرویز ادب و شاعری میں زندہ رہتے۔

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام ۔ یادوں کے اُجالے ۔ شاعر : روشن لال روشن
قیمت :۔ بیس روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ بزم میر ۱۰۹۰ کوچہ چیلان دریا گنج ۔ نئی دہلی ۲

یادوں کے اُجالے جناب روشن لال روشن کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو غزلیات متفرقات اور قطعات پر مشتمل ہے ۔ انھوں نے اردو غزل کی طویل روایت کی پاسداری کو ملحوظ رکھا ہے ۔ ان کی غزلوں میں انسانیت اور الفت کی لازوال جھلکیاں ملتی ہیں ۔ ان کی شاعری میں طلوعت پنجاب کی رعنائیاں انگڑائیاں لیتی ہیں ۔ روشن کے لب و لہجہ میں پُرخلوص اور سپردگی ہے اگر انھیں شاعرِ اخلاص کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا ۔

روشن کے قطعات میں اردو قطعات نگاری کی تاریخ اور اس کی روایت کو باقی رکھنے کی بھرپور کوششیں نظر آتی ہیں ۔ انھوں نے اپنے لیے کچھ نئی راہیں بھی نکالنے کی کوشش کی ہے ۔

قطعہ نگاری دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے دراصل وہ اتنی ہی مشکل ہے کیونکہ اس صنفِ سخن کی بنیادی خصوصیت اختصار و جامعیت ہے ۔ مندرجہ ذیل قطعات ان کے فکر و فن کا روشن ثبوت ہیں ۔

راز روشن ہے اہلِ عرفاں پر — کتنی سستی بشر کی ہستی ہے
موت ڈستی ہے ایک بار مگر — زندگی بار بار ڈستی ہے

طفلِ ناداں مسکراتا ہے ابھی — رفتہ رفتہ درد میں کھو جائے گا
خوگرِ آلام ہونے دو ذرا — ہوتے ہوتے آدمی ہو جائے گا

— عابدہ آفریدی

نام کتاب :۔ گُل رنگ ۔ شاعر :۔ جمال قائمی ۔
قیمت :۔ بارہ روپے

ملنے کا پتہ : کادمبری پرکاشن ۵۵/۱ سدرشن پارک نئی دہلی

"گُل رنگ" جناب جمال قائمی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے ۔ اس میں غزلوں کے ساتھ رُباعیات قطعات نظمیں گیت اور سانیٹ بھی شامل ہیں ۔ جمال قائمی کسی دبستانِ فکر اور کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ اپنے ذوقِ شعری کے پیشِ نظر انھوں نے ادب کو بہرحال ادب کے خانے میں رکھا ہے ۔ ان کی غزلوں میں جو یاسیت ہے وہ فرارِ زیست کی تبلیغ نہیں کرتی بلکہ دردمندی اور انسان دوستی کی ترغیب دیتی ہے ۔ جمال صاحب ہر حال میں ناموسِ عشق کو باقی رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان کے نزدیک حرمتِ محبت اور الفت ہی اصل عشق ہے یہی سبب ہے کہ وہ مریضِ غمِ الفت تو ضرور ہیں لیکن ان کا عشق مریضانہ نہیں بلکہ صحت مند جذبے کا ترجمان ہے ۔

فیروز جہاں

نام کتاب : شمعِ فروزاں (حصہ اول) مصنف : نظر برنی ۔
قیمت :۔ دس روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ ادبی سنگم' مولانا محمد علی جوہر مارگ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ۔

نظر برنی محض ایک اچھے شاعر ہی نہیں ہیں ۔ ان کے اندر ایک اچھے نثر نگار کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ بظاہر "شمعِ فروزاں" کسی ناول یا شعری مجموعہ کا نام معلوم ہوتا ہے لیکن اقوالِ زریں پر مبنی یہ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے ۔ ان کے یہ انشائیے جو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے "شمعِ فروزاں" کے عنوان سے نشر ہو چکے ہیں ۔ ان انشائیوں کے موضوعات انسان دوستی' اخوت و مساوات بھائی چارہ انسانیت اور وہ اخلاقی قدریں ہیں جن کو بروئے کار لاکر معاشرہ کو بلند کیا جا سکتا ہے ۔

بقول مصنف زیرِ نظر کتاب میں انسانی زندگی کے بعض اہم اخلاقی نکات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے ۔ چنانچہ اس میں غرور کے ساتھ خاکساری کا' نیکی کے ساتھ بدی کا' دشمنی کے ساتھ دوستی کا' دکھ کے ساتھ سکھ کا' ناکامی کے ساتھ کامرانی کا خوف کے ساتھ اطمینان کا' انتقام کے ساتھ عفو و درگزر کا' محبت

کے ساتھ نفرت کا اور انصاف کے ساتھ نا انصافی کا بیان کیا گیا ہے۔ "ایک انشائیہ "عدل" کا یہ اقتباس دیکھیے :

"انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کی جائے انصاف کی نگاہ میں گدائے بوریہ نشیں اور امیر ابن امیر کی حیثیت یکساں ہے۔ آنحضرت کے سامنے جب بھی اس طرح کا کوئی مقدمہ آیا تو آپ نے فیصلہ کرنے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی "

مصنف "حق گوئی" پر رقم طراز ہیں :

"بھگوان رام چندر نے بھی ایک جگہ تلقین کی ہے کہ دھرم کی حفاظت حق گوئی سے ہوتی ہے۔ آدمی ہمیشہ ایسی کوشش کرے کہ وہ

میں لگا رہتا ہے کہ کسی صورت مسرت حاصل ہو جائے اور چونکہ مسرت ہی "کرم" کا پھل ہوتا ہے اس لیے یہ لازمی طور پر جاننا چاہیے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر؟"

کتاب میں فہرست ابواب کی کمی بہت کھٹکتی ہے۔ چنانچہ عام قاری کو مطالعہ کے لیے انتخاب کرنے میں کافی زحمت ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ خامی دور ہو جائے گی۔ مجموعی طور پر یہ کتاب نئی نسل کے لیے خاص طور سے بے حد مفید ہے چنانچہ اسے کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

جمیل اشرف نعمانی

(پروفیسر مہتا صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

پر الجھنوں کا سبب بن جاتی ہیں۔ وہ ذہن کی تصوراتی دنیا میں ایک ایسے بہترین عالم کی تشکیل کرتا ہے جس کا وہ اہم ترین فرد ہے مہتا چونکہ فرائڈ کے زیر اثر ہے اس لیے وہ شخص کے سدھار کو ضروری سمجھتا ہے کہ شخص سے ہی سماج کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جا بجا رائے صاحب کو ان کے خیالات سے ہم آہنگ ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کھنہ صاحب کی سیرت میں بھی تبدیلی کی محتاج ہے۔ مالتی کا تابناک روپ اس کی کامل شخصیت کا درپن ہے۔

(اپنی بات — صفحہ ۲ کا بقیہ)

مکمل نجات مل جائے گی۔

● آل انڈیا بہادر شاہ ظفر اکاڈمی کے زیر اہتمام بہادر شاہ ظفر کی یاد میں ۱۳ نومبر ۱۹۸۱ء کو ایک کل ہند قومی یکجہتی کانفرنس وارانسی میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے گورنر اتر پردیش شری چندر ریشور پرشاد نرائن سنگھ نے کہا کہ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر پر بڑے ظلم ڈھائے ان کے جوان بیٹے اور پوتوں کے سر کاٹ کر ان کے سامنے پیش کیے لیکن یہ تمام ظلم و ستم بہادر شاہ ظفر کو ان کے راستے سے ہٹا نہیں سکے۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم آزاد ہیں اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ ہم بہادر شاہ ظفر کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر نے ملک کو آزاد کرانے کی بات ایسے زمانے میں سوچی جب اس کا تصور بھی محال تھا بعض مفاد پرست عناصر نے انگریزوں کے ساتھ دھوکا نہ کیا ہوتا، غداری نہ کی ہوتی تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ بہادر شاہ ظفر کی قربانیاں بالآخر رنگ لائیں اور ملک آزاد ہوا اور اب آزادی کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر شعبۂ حیات میں ہر سطح پر ہر قدم پر یکجہتی، اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی کا ثبوت دیں۔ تبھی ہم ترقی کے راستے پر آگے گامزن ہو سکیں گے۔

اس کانفرنس میں ایڈیٹر نیا دور نے نیا دور کا بہادر شاہ ظفر نمبر گورنر اتر پردیش اور وزیر قومی یکجہتی کو پیش کیا۔ بہادر شاہ ظفر کی یاد کو تازہ کرنے نیز قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دینے اور فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کو مستحکم کرنے کی غرض سے منعقدہ اس کانفرنس کے لیے بہادر شاہ ظفر اکاڈمی اور اس کے جنرل سکریٹری شری کاظم رضوی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ اکاڈمی بہادر شاہ ظفر کی قربانیوں، ان کے ایثار اور ان کی خدمات پر انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ دیگر علاقائی زبانوں میں بھی کتابچے، فولڈر اور پمفلٹ وغیرہ شائع کرائے تاکہ بہادر شاہ ظفر کا پیغام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکے اور تمام ملک میں نئی نسل ان کی قربانیوں اور خدمات سے واقف ہو سکے۔
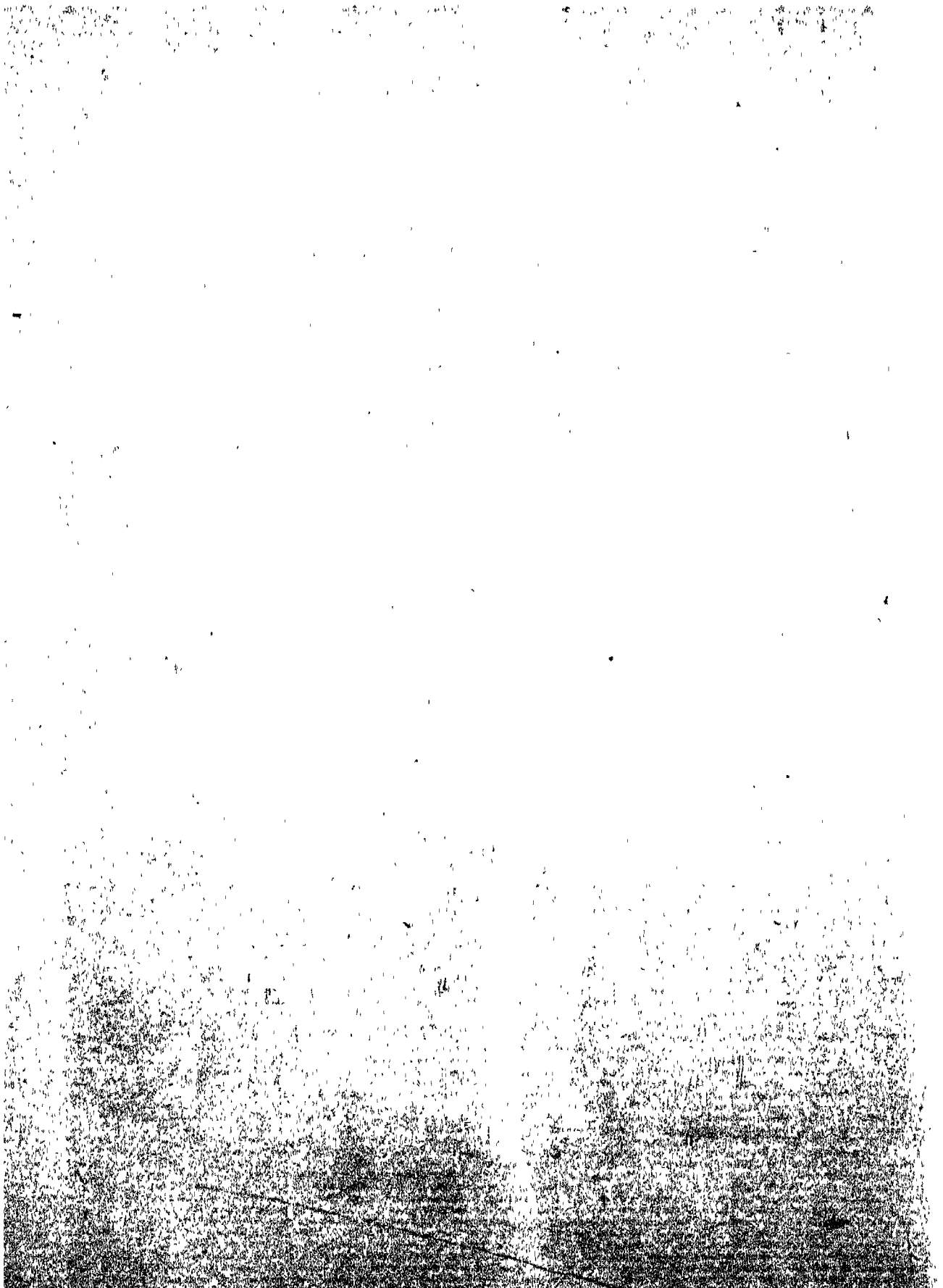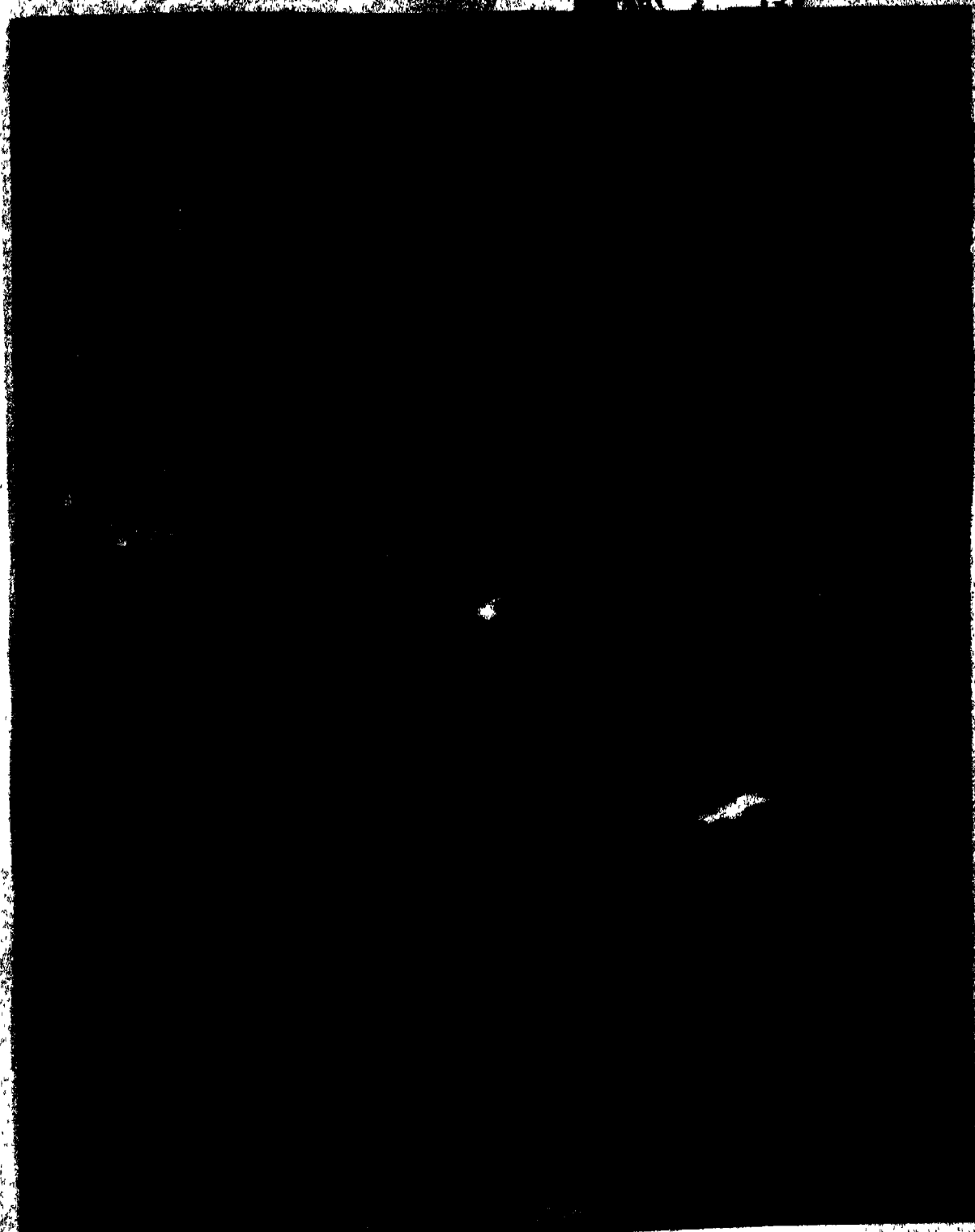
—— ایڈیٹر

نیا دور
Re 1-00.

فہرست عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو
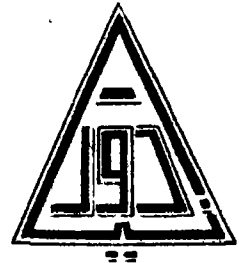
جلد ۳۶ نمبر ۱۰-۱۱

جنوری-فروری ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

مراجعہ رسالہ: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

اپنی بات

ہمارے ملک میں دستور اساسی کا نفاذ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس طرح ہماری جمہوریہ کے قیام کے ۳۲ سال مکمل ہو گئے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں ہماری جمہوریت مختلف دشوار گذار مراحل، صبر آزما حالات اور سنگین چیلنجوں سے گزری ہے جس نے ہمارے جمہوری نظام کو نیا استحکام اور نئی آب و تاب بخشی ہے۔ ہمارا جمہوری طرز حکومت وقت کی کسوٹی پر کھرا اترا ہے اور جمہوریت نواز ممالک کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا ہے۔ دراصل ہمارا جمہوری نظام سماجی اور معاشی انصاف، مظلوموں کی دادرسی، پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود، عوام کی خوشحالی اور ملک کی ہمہ گیر ترقی کا ضامن ہے۔ ملک نے اس عرصہ میں ہر شعبہ میں نمایاں ترقی کی ہے اور ترقی کا کارواں نئی منزلوں کی جانب تیز رفتاری سے گامزن ہے۔ اس ہمہ جہت ترقی کا ہی نتیجہ ہے کہ بیرونی ممالک میں بھی ہمارا وقار بلند ہوا ہے۔ اس موقع پر وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی فعال اور دانشمندانہ قیادت میں اتر پردیش کی گزشتہ ایک سال کی ترقی کا ایک مختصر جائزہ لینا بے محل نہ ہوگا۔ درحقیقت اتر پردیش کے لیے ۱۹۸۱ء کا سال عوام بالخصوص کمزور پسماندہ اور غریب طبقوں کی فلاح و بہبود اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے عزم سے عبارت رہا ہے۔ وزیر اعلا کا یہ زریں اصول کہ "غریب ہی ہماری توجہ کا مرکز ہے" ریاستی حکومت کی پالیسیوں کی بنیاد اور روح رواں رہا ہے جس کی کارفرمائی ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ تعمیر و ترقی کی مہم کو تیز رفتاری بخشنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اولین ضرورت عوام کو تحفظ اور تحفظ کا احساس فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ ریاست میں ڈاکوؤں کی بیخ کنی اور سرکوبی کی مہم ایک تاریخی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے اس اعلان نے کہ اگر ڈاکوؤں کے خلاف موثر اقدامات نہ کیے گئے تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے، جہاں ایک طرف بنفس نفیس عوام کا سچا خادم ثابت کر کے ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا، وہیں دوسری طرف پولس فورس کے حوصلے بلند کر دیے اور اس مہم میں ایک نئی جان ڈال دی۔ پولس کے افسروں اور جوانوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک نئی روایت قائم کر دی اور بیشتر بڑے ڈاکو گروہوں کا صفایا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ریاست کی ہمہ گیر ترقی کی مہم کو ریاست کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے اور دور افتادہ علاقوں کو بھی اس کے ثمرات سے بہرہ مند کرنے کے لیے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے نظم و نسق کو لامرکزی بنانے کا فیصلہ کیا۔ ڈویژن کی ترقی کی مہم کابینہ کے ممبروں کے سپرد کی گئی اور ریاست کی مجموعی منصوبہ جاتی رقم کا ۳۰ فیصد اضلاع کے تعمیراتی کاموں کے لیے مختص کر دیا گیا۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ریاست گیر پیمانہ پر تعمیر کا کام نئے عزم و حوصلہ اور جوش و خروش کے ساتھ شروع کیا گیا۔ زیر نظر سال کے دوران زرعی اور صنعتی زمرہ میں بالترتیب "کسان دوست" اور "ادیوگ بندھو" سیل کا قیام ایک اہم اقدام ہے جس نے کسانوں اور صنعت کاروں کو متعلقہ ذمہ داروں کے روبرو اپنے مسائل حل کرنے کا نادر موقع فراہم کیا۔ سال ۱۹۸۰ء کے دوران ربیع اور خریف کی مجموعی پیداوار ۲۴ر۵۴ لاکھ ٹن ہوئی جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔ زیر نظر سال کے دوران نومبر تک بڑے اور درمیانہ درجہ کی ۱۲ صنعتوں کا قیام عمل میں آیا۔ پسماندہ اضلاع کی معاشی نابرابری دور کرنے کی غرض سے اقدامات کیے گئے۔ زیر نظر سال میں بڑے اور درمیانہ آبپاشی پراجکٹوں کے لیے ۱۰۶ر۶۸ کروڑ روپیہ اور سرکاری چھوٹی آبپاشی اسکیموں کے لیے ۵۳ر۱۵ کروڑ روپیہ کی رقم مختص کی گئی جس سے بالترتیب ۲ر۸۱ لاکھ ہیکٹر اور ۱ر۶۰ لاکھ ہیکٹر رقبہ میں آبپاشی کی سہولت حاصل ہو جائے گی۔ بجلی کی تنصیبی صلاحیت میں ۲۳۶ میگاواٹ کے اضافہ سے مجموعی تنصیبی صلاحیت دسمبر تک بڑھ کر ۳۵۲۶ میگاواٹ ہو گئی۔ معیشت میں زراعت کی اہمیت کے پیش نظر دیہی علاقوں کو اوسطاً دس گھنٹے یومیہ بجلی فراہم کی گئی۔ بجلی کی تنصیبی صلاحیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں گزشتہ سال ۴۲۰ میگاواٹ صلاحیت کے ایک فیروز گاندھی اونچاہار تھرمل پراجکٹ اور ۴۴۰ میگاواٹ صلاحیت کے سنجے گاندھی ٹانڈہ تھرمل بجلی پراجکٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے عوامی نظام تقسیم کا کام امداد باہمی زمرہ کو سپرد کیے جانے کے بعد سے اب تک امداد باہمی انجمنوں کے تحت ریاست میں ۱۰۶۹۹ معارفین فروخت مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ ان مرکزوں کے توسط سے بغیر کنٹرول والی اشیاء کی تقسیم کی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اسی طرح دیگر بھی زمروں مثلاً تعلیم، پہاڑی علاقوں کی ترقی، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور پسماندہ اور غریب طبقوں کی فلاح و بہبود، تعمیر مکانات، سرکاری ملازمین کی تنخواہ کی شرحوں میں اضافہ، عوام کو ضروری اشیاء اور پینے کے پانی کی فراہمی، اصلاحات اراضی، نقل و حمل اور سیاحت، غریب طبقوں کو مفت قانونی امداد کی فراہمی کے سلسلے میں موثر اقدامات کیے گئے جو اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ہماری ریاست وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں ہمہ گیر ترقی کی منزل کی جانب تیز رفتاری سے گامزن ہے۔

——— ایڈیٹر

امان اللہ خان شیروانی
پرنسپل، اسلامیہ کالج (اٹاوہ یو پی)

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم
کچھ یادیں کچھ باتیں

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم ایک عظیم شخصیت تھے۔ عظیم شخصیتیں وہ ہوتی ہیں جو قوموں کی زندگی اور وقت کے دھارے کو بدل دیتی ہیں۔ ایسی شخصیتوں کی ذات گرامی بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت بھی ہمہ گیر تھی۔ وہ ماہر تعلیم بھی تھے اور ایک اعلیٰ منتظم بھی، وہ ایک مدبر بھی تھے اور سیاست داں بھی، وہ مجسم تہذیب و شرافت بھی تھے اور پیکر خلوص و متانت بھی۔ وہ اعلا خطیب بھی تھے اور بلند پایہ ادیب بھی۔ ان کی زندگی کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو سب سے بڑی خوبی ان کا جذبۂ ایثار تھا۔ اسی جذبہ نے ان کی شخصیت کو عظیم بنایا اور اسی جذبے نے انھیں اس منصب جلیلہ تک پہنچایا جو دنیاوی زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔

ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کی بیشتر خوبیاں سید الطاف حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول اٹاوہ کی رہین منت ہیں ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت نے ہی ذاکر صاحب کی شخصیت میں وہ رنگ بھرے جو انھوں نے بعد میں اپنی صلاحیت سے اتنے تابناک بنا ڈالے کہ ان کی شخصیت منفرد ہو گئی۔ ذاکر صاحب ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۳ء تک اسلامیہ اسکول اٹاوہ (جو آج کل حافظ محمد صدیق اسلامیہ کالج ہے) کے طالب علم رہے تھے۔ ان دنوں اسلامیہ اسکول اٹاوہ شمالی ہندستان کا ایک ایسا منفرد اسکول تھا جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ مخصوص تربیت دی جاتی تھی اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب کا نام اس سلسلے میں بہت ہی مشہور تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو [illegible] میں ان کی اٹاوہ آمد پر اسلامیہ کالج اٹاوہ میں امان اللہ خاں شیروانی صاحب وہ کمرہ دکھا رہے ہیں جس میں ذاکر صاحب نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں قیام کیا تھا

کالج کے ریکارڈ میں ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں موجود ہیں۔ مثلاً داخلہ فارم کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۸ر نومبر ۱۸۹۷ء ہے جو بعد میں انسپکٹر آف اسکول کے دستخطوں سے ان کی عمر میں ۹ ماہ کا اضافہ کرکے ان کی تاریخ پیدائش ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کردی گئی ہے۔ اور یہی عمر ان کے ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ میں درج ہے۔ ریکارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی برسوں میں وہ بہت اچھے طالب علم نہیں تھے۔ ان کی حاضریاں بھی کم رہتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ وہ نہ صرف اچھے، بلکہ اسکول کے سب سے ہونہار طالب علم بن گئے۔ ان کے زمانہ کے کچھ اساتذہ جو ابھی دس بیس سال پہلے تک حیات تھے، ذاکر صاحب کی ذہانت، مطالعہ سے دلچسپی، خطابت، مضمون نگاری اور شائستگی کی تعریف کرتے تھے۔ مولوی فیاض خاں صاحب مرحوم (علی گڈھ) جو اتفاق سے میرے بھی استاد رہے ہیں، ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب ہوسٹل وارڈن بھی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذاکر صاحب ہوسٹل کے نظم وضبط کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کے بہت سے طالب علم ہوسٹل میں مقیم تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر وہاں کے پٹھان زمینداروں کے لڑکے تھے۔ ہر وقت لڑتے تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب جو خود بھی قائم گنج کے پٹھان تھے۔ ہمیشہ اس ٹولی سے الگ رہے۔ اس لیے اکثر وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ "ذاکر! تم پٹھان نہیں طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے سید ہو۔"

ذاکر صاحب نہ صرف ایک ذہین اور ہونہار طالب علم تھے بلکہ اپنے اساتذہ اور طالب علموں دونوں میں ہر دل عزیز بھی تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ایک واقعہ ان کے ساتھی طلبا، اور اس زمانہ کے اساتذہ سے سننے میں آتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ ہوسٹل کے کچھ لڑکوں نے یہ مطالبہ کیا کہ "پلیٹ بند کرنے کی سزا" موقوف کی جائے۔ اور اس بات پر اسٹرائک بھی کردی۔ ان دنوں ہوسٹل کے قواعد میں یہ بھی تھا کہ سزا کے طور پر کسی طالب علم کے کھانے سے ایک پلیٹ کم کردی جاتی تھی گویا اسے دوسروں کے مقابلہ میں ایک پلیٹ سالن کم ملتا تھا۔ اس اسٹرائک کی پشت پناہی ذاکر صاحب ہی کررہے تھے حالانکہ ظاہراً وہ اسٹرائک میں شریک نہیں تھے، جب یہ اسٹرائک باوجود کوشش ختم نہ ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کی گئی اور اسٹرائک کرنے والے لڑکوں کو اسکول سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ جب ذاکر صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے وارڈن کے پاس جاکر اصرار کیا کہ یہ حکم ناجائز ہے اسے واپس لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علم کی سزا میں پلیٹ بند کرنے کا طریقہ نہ صرف ظلم ہے بلکہ غیر اخلاقی بھی ہے۔ جب یہ لوگ کھانے کا پورا پیسہ دیتے ہیں تو ان کی پلیٹ کیوں بند کی جائے۔ آخرکار ان کی سفارش اور زور دینے پر وارڈن اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور پلیٹ بند کرنے کا طریقہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کردینا پڑا۔

ذاکر صاحب میں جذبۂ ایثار اور قومی ہمدردی اسی زمانے سے پیدا ہوچکی تھی۔ ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دنوں میں انھوں نے اسلامیہ اسکول کے ہوسٹل میں یہ تحریک چلائی تھی کہ طلبا گوشت کھانا بند کردیں اور اس طرح جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھجوایا جائے۔ یہی نہیں وہ جمعہ کے روز نماز کے بعد مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مظلوم ترکوں کے لیے اپنی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرتے تھے۔ اکثر مسجدوں میں اس کے لیے تقریریں کرتے تھے۔ خطابت انھوں نے اسی طرح سیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریروں میں گھن گرج کے بجائے نرمی اور شیرینی پائی جاتی تھی۔

انسانی ہمدردی اور شرافت بھی ان میں اسکول کے زمانے سے ہی بہت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ ہوسٹل سے اٹاوہ اسٹیشن جو قریب ایک کلو میٹر ہے صرف اخبار خریدنے جایا کرتے تھے، جب وہ اخبار لے کر واپس آتے تھے تو بہت سے طالب علم ان کے چاروں طرف اکٹھا ہوجایا کرتے تھے اور وہ سب کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور اکثر خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان باتوں سے بھی وہ اپنے ساتھیوں میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ ان کے ساتھی ان کو "مرشد" کے نام سے پکارتے تھے۔ ان تمام خوبیوں

کی بنا پر وہ ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم کی توجہ کا مرکز بنے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ ایسے طالب علم اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر گزارتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی مخصوص توجہ کا اثر ذاکر صاحب پر بڑا گہرا پڑا۔ ان میں اس زمانے کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہوئی۔ اسی بصیرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں ان معاملات کو سمجھنے کے لیے صحیح جذبات اور احساسات پیدا ہوے اور ان کے اندر نہ صرف قومی ہمدردی بلکہ انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ اگر خدا پرستی ان کا مذہب تھا تو خدمت خلق ان کا ایمان خدمت خلق کو وہ عبادت الٰہی کا ایک ضروری اور بنیادی جزو سمجھتے تھے۔ وہ چاہے غریب طالب علم ہو۔ یا امیر، خواہ پنجاب سے آیا ہوا کوئی شرنارتھی ہو یا ان کے اپنے وطن کا کوئی باشندہ یا ادکھلے کا غریب کسان ـــــ سب ہی ان کی ہمدردی کے مستحق ہوتے تھے اور وہ سب کی زیادہ سے زیادہ دل جوئی کیا کرتے تھے۔

قربانی اور ایثار کا جذبہ انھوں نے اپنے استاد ہیڈ ماسٹر صاحب کی زندگی سے حاصل کیا تھا۔ ان کے سامنے سید الطاف حسین مرحوم ایثار و قربانی کا ایک مجسّم نمونہ تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ اکثر وہ پوری تنخواہ نادار، غریب اور ایسے طلبا میں تقسیم کر دیتے تھے جن کے گھروں سے رقم آنے میں دیر ہو جاتی تھی اور قاعدے کے مطابق ہوسٹل میں ان کا کھانا بند کر دیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ان کو اپنا خرچ چلانے کے لیے قرض تک لینا پڑتا تھا۔ ان کے ایثار کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوے تو ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی تھی اور جب چالیس سال بعد ریٹائر ہوے تو بھی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ ہی رہی۔ اس دوران ان کو مختلف جگہوں، خصوصاً حیدرآباد سے ہزاروں روپے تک کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے اپنی پوری زندگی اس اسکول کے لیے وقف کر دی تھی۔ انھیں اسکول اور یہاں کے طالب علموں سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ ان کی ذات ان دونوں میں گم ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی، اپنا روپیہ سب کچھ اسکول اور اس کے طلبا پر قربان کر دیا۔ ان کے زمانے میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں ایک ایسا ہوسٹل بھی تھا جس میں غریب اور نادار طلبا رہتے تھے۔ جن کو کھانے کے ساتھ ساتھ کتابیں اور کپڑے بھی مفت ملتے تھے۔ اکثر یہ کپڑا بہت معمولی ہوتا تھا جسے پہننے میں کچھ طالب علم شرم محسوس کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ان کی دلجوئی کی خاطر اکثر اسی کپڑے کا اپنا لباس بھی بنوا لیا کرتے تھے۔ یہ تھا جذبۂ ایثار ہیڈ ماسٹر صاحب جب ریٹائر ہوے تو کچھ رقم جمع کر کے ان کی خدمات جلیلہ کے پیش نظر ایک تھیلی کی شکل میں پیش کی گئی۔ پہلے تو انھوں نے لینے ہی سے انکار کر دیا لیکن زور دینے پر فرمایا کہ "اسے میں اسکول میں جمع کر دوں گا۔" پھر بڑی مشکل سے وہ راضی ہوے اور یہ رقم ان کے نام سے ڈاک خانے میں جمع کر دی گئی اور چونکہ یہ خدشہ تھا کہ وہ اس رقم کو دوسروں پر خرچ کر دیں گے اس لیے پاس بک ان کے ایک شاگرد اور اس کالج کے نامور منیجر جناب شیخ نفیس الحسن صاحب مرحوم کے پاس رکھ دی گئی تاکہ ان کی نجی ضرورت کے وقت ہی روپیہ نکالا جا سکے۔ اب ان کے شاگرد رشید ذاکر صاحب کی زندگی پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے بھی ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ذاکر صاحب نے بھی جامعہ ملیہ کے لیے اپنی تمام ذہنی اور دماغی صلاحیتیں وقف کر دی تھیں اور اپنے استاد کی طرح اپنا تن من دھن جامعہ کی نذر کر دیا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف اسّی روپیہ ماہوار پر جامعہ ملیہ میں گزارا۔ وہ امیر جامعہ تھے لیکن انھیں اکثر اپنے دفتر میں صفائی خود کرنا پڑتی تھی۔ آج اسی ایثار اور قربانی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ ملیہ، علم و ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک اور خوبی ان کی انسان دوستی تھی۔ یہ صفت بھی انھوں نے اسلامیہ اسکول کے بانی ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم اور ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم کی

زیر سایہ حاصل کی تھی۔ ان حضرات کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں قومی اور انسانی خدمت کی دھن تھی اور اسی بنیاد پر انھوں نے اسلامیہ اسکول میں پڑھنے والوں کی زندگیاں سنواریں اور بنائیں اور انھیں اسی فلسفۂ زندگی کے مطابق تیار کیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت پر ان کے استادوں کے ہی لازوال نقوش نمایاں تھے۔ انسان دوستی کی آزمائش اس وقت ہوتی ہے جب ایک شخص اونچے مرتبہ پر پہنچ جائے اور اس کا سلوک عام انسانوں سے بھی اچھا رہے۔ ذاکر صاحب نے بلند سے بلند تر مقام حاصل کیا لیکن ان کا سلوک معمولی انسانوں سے نہ صرف ہمدردانہ بلکہ فراخ دلانہ بھی ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی مہمان ان کے یہاں قیام کرتا تو ان کو سب سے زیادہ فکر مہمان سے زیادہ مہمان کے خادم کی ہوتی تھی۔ وہ براہ راست خادم سے پوچھتے تھے کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ جب مرحوم ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ تشریف لائے اور ہوسٹل میں اپنا کمرہ دیکھنے گئے تو میں نے اسلامیہ اسکول کے ایک پرانے خادم "بندے حسن" سے جو بفضل خدا اب بھی حیات ہیں اور کالج سے ریٹائر ہوگئے ہیں، انھیں متعارف کرایا۔ بندے حسن صاحب ذاکر صاحب کے طالب علمی کے زمانے میں ہوسٹل میں بیرا تھے۔ ذاکر صاحب نے بندے حسن کو گلے لگایا اور کئی منٹ تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ انسان دوستی کا یہی جذبہ انھیں جامعہ ملیہ میں باوجود حالات ناسازگار ہونے کے کام کرنے پر اکساتا رہا۔ یقیناً ایک انسان دوست شخص ہی ان حالات میں جامعہ ملیہ جیسے عظیم ادارے کو چلا سکتا تھا جب وسائل کا فقدان ہو، اپنوں کی مخالفت اور حکومت کے عتاب کا سامنا ہو۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جسے انسانوں پر اور خود اپنی ذات پر بھروسہ ہو اور جسے انسانوں سے محبت ہو۔

انسان دوستی کے ساتھ بلند اخلاق اور اعلیٰ شرافت بھی ذاکر صاحب کی عظمت کی خصوصیات میں سے تھیں وہ اپنے چھوٹوں سے بھی جس طرح ملتے تھے اس کی مثال بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب بھی ان کے چھوٹے ان سے ملنے جاتے تھے تو وہ انھیں رخصت کرنے کے لیے کمرہ سے باہر تشریف لاتے تھے۔ انھیں حفظ مراتب کا بڑا خیال تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب وہ پٹنہ میں گورنر تھے۔ میں نے ایک خط اسلامیہ کالج کے بارے میں انھیں لکھا تھا اس کے جواب میں موصوف نے مجھے "مکرمی و معظمی جناب پرنسپل صاحب" لکھ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا "آپ حیران نہ ہوں میں یہ خط عزیزی امان اللہ خاں شیروانی کو نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ بہ حیثیت سابق طالب علم اپنے اسکول کے پرنسپل کو لکھ رہا ہوں۔"

اس عظیم شخصیت کا ایک اور وصف انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ میں نمایاں ہوتا تھا۔ یہ وصف بھی مرحوم نے اپنی مادر درسگاہ اسلامیہ اسکول سے ہی حاصل کیا تھا۔ اسکول کے بانی ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم میں بھی مردم شناسی کا یہ جوہر نمایاں تھا۔ انھوں نے اسکول میں قابل مستعد اور پر خلوص اساتذہ کی ایک ایسی جماعت یکجا کر لی تھی جنھوں نے خلوص اور لگن سے اس اسکول میں بچوں کو ایسی تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ آئندہ زندگی میں اندھیروں کو دور کرنے کے لیے شمعیں فروزاں کرتے رہیں۔ اس اسکول نے ذاکر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر محمد حسین، یٰسین نوری، عظیم بیگ چغتائی، پروفیسر حبیب الرحمٰن شیخ نفیس الحسن، کے۔ آصف (فلم ساز) اور بہت سی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں جنھوں نے سیاست، درس و تدریس ادب اور آرٹ میں اپنی عظمت کا سکہ جما دیا۔ ذاکر صاحب میں بھی مردم شناسی کا وصف نمایاں تھا۔ وہ ہمیشہ کاموں اور مقاصد کی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ اسی پرکھ کی بدولت انھوں نے جامعہ ملیہ میں ایسے ایسے یادگار زمانہ نادر جواہر اکٹھا کر لیے تھے جن کو نہ صرف ان کے مقاصد سے دلچسپی تھی بلکہ ذاکر صاحب کی ذات سے بھی عقیدت تھی۔ جامعہ ملیہ میں ایک مدت تک ایسے معلم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے اور نجی زندگی میں اور زیادہ عیش و آرام میسر آ سکتا تھا لیکن بقول شخصے "ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا جو ذاکر صاحب کے سینہ میں فروزاں تھا۔"

(باقی ص پر)

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی
وارانسی

جنگِ آزادی کا سپہ سالار

سب سے پہلا سب سے بوڑھا حریت کا تاجدار
جس کا ہر کردار قومی ایکتا کا شاہکار

وہ شہِ بیکس سہارا لے کے جس کی جان کا
خون گردش کر رہا تھا پورے ہندوستان کا

جن کے ہر مردِ مجاہد دین و ایمانِ وطن
اپنا سر دے دے کے سر کرتا تھا میدانِ وطن

لڑ رہے تھے جنگِ آزادی فدایانِ وطن
کر چکے تھے صاف کانٹوں سے گلستانِ وطن

بھوکے پیاسے سامنا کرتے ہوئے ہر وار کا
گولیاں کھا کھا کے پانی پی گئے تلوار کا

آگیا تھا ہوش انگریزوں کی مکاری کے بعد
ہو گئے بے بس مگر اپنوں کی عیاری کے بعد

قصرِ آزادی ہوا مسمار تیاری کے بعد
سب کے بازو شل ہوئے شہ کی گرفتاری کے بعد

ہر طرف تھا گرم انگریزوں کا جوشِ انتقام
چار جانب تھا محبانِ وطن کا قتلِ عام

اپنے سینوں پہ لیے داغِ گلستانِ وطن
خاک و خوں میں لوٹتے تھے رہنمایانِ وطن

کشتیٔ ہندوستاں کو دیکھ کر گرداب میں
ہچکیاں لیتی تھی جمنا خون کے سیلاب میں

وہ محبت موجزن تھی اس کے بوڑھے خون میں
روح دہلی میں تھی جسمِ ناتواں رنگون میں

ہے بجا یہ بھی کہ وہ محرومِ تخت و تاج تھا
یہ بھی سچ ہے ہندیوں کے دل پہ اس کا راج تھا

اُس بہادر شاہ کو ہم دیکھیں یا اُس کا جگر
اپنی آنکھوں جس نے دیکھے اپنے شہزادوں کے سر

اس کے اک اک شعر سے جھلکے نہ کیوں رنگِ ملال
جان سے مارے گئے اک ساتھ جس کے تین لال

بعد اسکے چاک ہر غفلت کا پردہ ہو گیا
پھر سے جاگا پورا ہندوستان، جب وہ سو گیا

لائقِ تعظیم اس کی شاعرانہ شخصیت
اور قسم کھانے کے قابل اس کی ہندوستانیت

ظالموں نے ختم کر دی جس پہ اپنی ہر جفا
بوس اس کی قبر پر لینے گئے عہدِ وفا

از سرِ نو دھوم سے تحریکِ آزادی چلی
پاؤں اکھڑے ظالموں کے، اس طرح آندھی چلی

رنگ لا کر ہی رہا خونِ شہیدانِ وطن
چھوڑ کر اپنے وطن بھاگے حریفانِ وطن

پالیسی جس میں گڑھی جاتی تھی انگلستان کی
راجدھانی ہے وہ آج آزاد ہندوستان کی

وہ بہادر جس کو دفنایا گیا رنگون میں
آج تک اس کی محبت دوڑتی ہے خون میں

اتحادِ باہمی کا آج بھی پرچار ہے
سونے والا سو گیا انسانیت بیدار ہے

ذکر اس کا ہے گلستاں در گلستاں آج بھی	ہوتی ہے دلی میں سیرِ گلفروشاں آج بھی
جس ظفر کو ناز تھا اپنے وطن کی خاک پر	بارشِ رحمت ہے آج اسکے مزارِ پاک پر
شاہ بھی، صوفی بھی شاعر بھی بڑا انسان بھی	ہند کا اک فرد بھی اور پورا ہندوستان بھی
جنگِ آزادی کی جو تاریخ ہوگی معتبر	نام تیرا ہی سرِ فہرست ہوگا اے ظفر

شاعرِ ہندوستاں شہرِ بنارس کا سفیر
اپنے گلہائے عقیدت پیش کرتا ہے نذیر

نوٹ: نذیر بنارسی صاحب نے اپنی یہ نظم بہادر شاہ ظفر نمبر کے لیے ارسال کی تھی لیکن تاخیر سے موصول ہونے کے سبب شاملِ اشاعت نہ ہو سکی۔ اب اسے "یوم جمہوریہ نمبر" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ —— ایڈیٹر

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم —— صفحہ ۲ کا بقیہ

ذاکر صاحب کو اپنی مادر درس گاہ اسلامیہ اسکول سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی کی تھی۔ سپاس نامہ میں ان کی توجہ ان کی مادر درس گاہ کی طرف دلائی گئی تھی اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا۔ "میں اس اسکول کو کیسے بھول سکتا ہوں مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں یہاں چھٹے کلاس کا طالب علم تھا۔ میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے۔ جب والدہ محترمہ کی وفات کی خبر مجھے دی گئی... تو یہاں کے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے گلے لگا کر کہا تھا کہ تمھاری ایک ماں نہیں رہیں لیکن یہ اسکول دوسری ماں موجود ہے اور پھر مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں یتیم و یسیر ہوں۔" یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔ ان کی یہ تقریر اتنی موثر تھی کہ مجمع میں بہت سے لوگ اور طلبا کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے تھے۔

ذاکر صاحب کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً بارہ سال ہو گئے لیکن آج بھی ان کی یاد تازہ ہے اور اس وقت تک تازہ رہے گی جب تک ان کے یاد کرنے والے زندہ رہیں گے۔ انھیں یہ اسلامیہ کالج اٹاوہ یاد کرتا رہے گا۔ جس نے ان کی شخصیت کو نکھارا۔ جامعہ ملیہ انھیں یاد کرتی رہے گی۔ جس کے بنانے اور سنوارنے میں وہ سب سے آگے آگے تھے اور جس کے لیے انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا، انھیں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یاد کرتی رہے گی جس کی گرتی ہوئی ساکھ کو مرحوم نے اٹھایا اور حکومت و عوام کی نظر میں اس ادارے کا اعتبار اور وقار قائم کیا۔ حکومت کے ارکان یاد کرتے رہیں گے جن کا کام انھوں نے پوری دیانت داری اور خلوص سے زندگی کے آخری لمحات تک کیا۔ اردو جاننے والے یاد کرتے رہیں گے۔ جس کی بقا کے لیے انھوں نے برابر کوشش جاری رکھی تھی۔ وہ ادیب و ماہر فن انھیں یاد کرتے ہیں جن کے ادب اور فن کی انھوں نے قدر کی اور پھر عوام الناس انھیں یاد کرتے رہیں گے جن کے سامنے وہ شرافت، محبت، شائستگی اور ہمدردی کا ایک نمونہ بن کر آئے۔

نثار اعظمی
بی/۴ نسیم منزل، سیتاپور روڈ
لکھنؤ

ہندستانی جمہوریت اور اس کے ثمرات

آج سے ۳۲ سال قبل ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو دستور اساسی کی رو سے ہندستان میں باقاعدہ ایک خودمختار اور با اختیار عوامی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا اور پارلیمانی طرز جمہوریت اختیار کیا گیا جس کی اساس بالغ رائے دہندگی پر رکھی گئی ہے اور جب ہی سے یہاں جمہوری اقدار کو مسلسل فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ہندستان اس وقت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور اس کا دستور اساسی بھی دنیا کا طویل ترین دستور ہے

قبل اس کے کہ ہندستان میں جمہوریت کی کامیابی اور جمہوری طرز حکومت کی خوبیوں پر روشنی ڈالی جائے اور ملک کے جغرافیائی اور تاریخی حالات سے اس کی مناسبت کا ذکر کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بنیادی باتوں کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔

جمہوریت: ایک ایسے نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں عوام کو طاقت و اقتدار کے استعمال میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوتا ہے یعنی عوام ہی کو سرچشمۂ اقتدار و قوت مانا جاتا ہے۔ یونانی لفظ ڈیماس (DEMOS) کے معنی "عوام" کے ہوتے ہیں اور خود ڈیموکریسی (DEMOCRACY) کا لغوی مفہوم "عوامی حکومت" ہوتا ہے۔ ڈیموکریسی یا جمہوریت کی سب سے زیادہ رائج اور موزوں تعریف ابراہام لنکن نے چند لفظوں میں کی ہے۔ جو اپنی جگہ پر بہت واضح اور جامع بھی جاتی ہے Government of the people, for the people and by the people.

یعنی عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام ہی کے ذریعہ سے جمہوریت یا عوامی حکومت کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ خالص عوام کی حکومت بلا واسطہ ہو، دوسرے یہ کہ ان کے نمائندوں کے ذریعہ بالواسطہ حکومت ہو۔ موجودہ دور میں عام طور پر جمہوری حکومتیں نمائندوں کے واسطے ہی سے مروج ہیں اور آج کثیر آبادی کے سبب جمہوریت کی قابل عمل صورت، عوامی نمائندوں کے ذریعہ ہی ممکن ہے کیونکہ بلاواسطہ خالص عوام کی حکومت کا تصور موجودہ دور میں ناقابل عمل ہے۔ قدیم زمانے میں جب کہ غیر منظم جمہوری حکومت کے طور پر چھوٹی چھوٹی اکائیاں (UNITS) موجود تھیں اور ان کی آبادی بھی محدود ہوا کرتی تھی اور مصروفیت کم تھی۔ اس وقت عوام یکجا ہو کر باہمی صلاح و مشورے سے حکومت کے کام براہ راست اور بذات خود انجام دے لیا کرتے تھے۔ اب اس طرز حکومت کا محض تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ موجودہ دور میں جملہ عوام کو یکجا ہو کر حکومت کے نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالنا اور کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ فی زمانہ ریاستوں میں بسنے والی آبادی مختلف گاؤں، قصبوں اور شہروں میں پھیلی ہوئی ہے موجودہ دور کے فرد کی اپنی روزمرہ ضروریات ہیں، فرائض و واجبات ہیں گوناگوں مسائل ہیں جن کی انجام دہی سے ہی اسے فرصت نہیں چہ جائیکہ وہ مزید حکومت کے فرائض انجام دے سکے۔ اسی لیے جمہوریت میں افراد یہ ذمہ داری اپنے نمائندوں کو سونپ کر [illegible] حکومت کی بہتر انجام دہی کی توقع

سے کرتے ہیں اور ان نمائندوں کا بھی اپنی جگہ پر یہ فرض اولین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوں اور اگر انھوں نے فرائض حکومت کی بجا آوری میں کوتاہی، لاپروائی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تو عوام کا اعتماد ان پر سے اٹھ جائے گا اور پھر وہ ان سے بہتر اور لائق و فائق نمائندوں کے اوپر اس ذمہ داری کا بار ڈالیں گے۔

مختصر تاریخ :-

جمہوریت کا تصور کوئی نیا تصور نہیں۔ قدیم زمانے میں اگر یونان ایک طرف تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور جمہوریت کی ابتدائی صورت یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اسپارٹا (SPARTA) وغیرہ میں موجود تھیں اور یہاں کی ریاستیں مورخین کی تحقیق کے مطابق جمہوریت کا بہترین نمونہ تھیں تو دوسری طرف ہندستان بھی یونان کے متوازی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا نمایاں مرکز رہا ہے اور یہاں بھی جمہوریت کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کے وجود کا پتہ تسلسل کے ساتھ موجود دور تک پایا جاتا ہے جس کا نام پنچایت راج رہا ہے جس کی عملی صورتیں یہاں زمانہ قدیم سے رائج رہی ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے خمیر میں پنچایتی راج کے طرز فکر و عمل کی اب بھی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ پنچایت راج کا نظام اب بھی یہاں کے دیہاتوں اور گاؤں میں باقی ہے جسے عوام کے خالص اور بلا واسطہ جمہوری طرز حکومت کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان کی قدیم مذہبی و تاریخی کتابیں اس کی گواہ ہیں کہ پنچایت راج میں درحقیقت عوام کے ہر طبقہ کی رائے اور مشورے کی بڑی قدر و قیمت تھی اور ان کی کثرت رائے سے جو بھی فیصلہ کیا جاتا تھا وہ سب کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہوتا تھا۔

سائنس کے اس ترقی یافتہ اور مصروف ترین دور میں انتخاب اور رائے دہی کے اصول کو اپنا کر عوام کے لیے ممکن ہے کہ وہ اقتدار و طاقت کو استعمال کرنے میں حصہ لے سکیں یا حکومت کے نظام کارکردگی کو چلا سکیں۔ اسی انتخاب اور نمائندگی کے طریقہ کار کا ایک عرصہ تک نشو و نما ہوتا رہا جس کی بدولت موجودہ جمہوریت کے بنیادی خصوصیات کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے

بنیادی خصوصیات:-

جمہوریت اپنے اصول و نظریات کے پیش نظر سیاسی مساوات اور برابری کی حمایت کرتی ہے اور وہ کسی مخصوص طبقے کو مخصوص سیاسی مراعات دینے اور اقتدار پر قبضہ و تصرف جمائے رکھنے کی مخالفت کرتی ہے۔ جمہوریت، اکثریت کی حکومت اور قانون کی اس حکمرانی کو بروئے کار لاتی ہے جسے رائے عامہ کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ ذریعۂ نمائندگی عوام کی خواہشات کے اظہار کا کم و بیش واحد طریقہ ہے اور اکثریت کی حکومت کو چلانے کا عملی ذریعہ بھی ہے۔ حکومتیں عملاً جمہوریت کے مختلف مدارج رکھتی ہیں ایک تو اس لحاظ سے کہ ان عوام کی تعداد کیا ہے جو سیاسی اقتدار میں شریک ہیں، دوسرے اس اعتبار سے بھی کہ عوام جو اس اقتدار کے مالک ہیں وہ عملی طور پر اس پر کتنا کنٹرول رکھتے ہیں بہرحال جمہوریت کی عمومی خصوصیات کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں :-

۱۔ حکومت کا ڈھانچہ رائے عامہ کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔

۲۔ رائے دہندگان کی اکثریت کی بدولت منتخب نمائندوں کے ذریعہ قوانین بنائے جائیں۔

۳۔ ریاست کا حکمران سربراہ، براہ راست یا بالواسطہ رائے عامہ کے ذریعہ منتخب کیا گیا ہو یا مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہو۔

۴۔ رائے دہی کا حق بالغ آبادی کو عطا کیا گیا ہو۔

۵۔ انتخابات اپنی میعاد پر آزادانہ اور خوشگوار ماحول میں ہوں۔

۶۔ حکومت میں شامل ہو کر خدمات انجام دینے کا موقع شہریوں کے تمام طبقوں کو حاصل ہو۔

۷۔ عوام کو اپنے بنیادی حقوق استعمال کرنے کی ضمانت

دی گئی ہو۔

۸۔ ملک کے دستور اساسی (constitution) کے ذریعہ حکومت کے اختیارات کو محدود رکھا گیا ہو۔

خوبیاں:

قدیم زمانہ کے علاوہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی جمہوریت کو بہترین طرز حکومت تسلیم کیا جاتا رہا ہے کیونکہ اس سے عوام کی حاکمانہ صلاحیتوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور جمہوریت انھیں سیاسی مراحل میں شریک بھی کرتی ہے۔ ملک کا ایک شہری ہونے کے ناطے جمہوریت میں ہر فرد اور اس کی گراں قدر رائے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حکومت کی تشکیل کے آغاز میں ہر فرد کو اپنا بنیادی فریضہ (رائے دہی) انجام دینا ہوتا ہے، حکومت بن جانے کے بعد اس کی پالیسیوں سے وہ متاثر بھی ہوتا ہے جس میں خود اس کی رائے اور مرضی کا پورا دخل ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کے ذریعہ عوام کے سیاسی شعور کو بالیدگی ملتی ہے۔ جمہوری حکومت اپنے ان عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے جن پہ حکومت کی جاتی ہے اور جس کے نتیجہ میں جمہوری حکومت ایسی پالیسیاں وضع کرتی ہے جن کا دار و مدار عوام کے سبھی طبقوں کی فلاح و بہبود پر ہوتا ہے۔ جمہوریت اگر ایک طرف شہریوں کو باشعور بناتی ہے تو دوسری طرف انھیں پالیسی بنانے کے لیے ایک آواز عطا کرتی ہے۔ انھیں حکومت کی ذمہ داریوں کا بوجھ عوام کے کاندھوں پہ ڈالا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ جمہوریت کا وجود ارتقاء پذیر اور مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ شہریوں کے مزاج میں مفاد عامہ سے دلچسپی دن بہ دن بڑھتی ہے اور ان میں خلوص ایثار کے جذبے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ حکومت سے ان کی وفاداریوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اپنی بنائی ہوئی حکومت پر ان کے اعتماد و یقین کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن ملکوں میں جمہوری طرز حکومت کا آغاز ہوتا ہے وہاں اس کی بنیادیں مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جاتی ہیں۔ جمہوریت میں حکومت کی تبدیلی کے لیے کسی خونیں انقلاب کے امکانات کم ہو جاتے ہیں البتہ رائے عامہ بدل جائے تو حکومت کے ارکین کی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے تاہم یہ کام بھی امن و سکون کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ اگر انصاف اور مساوات کے اصولوں پر جمہوریت کی بنیاد قائم ہو تو امید کی جاتی ہے کہ جمہوریت کی بدولت عدل و انصاف کو فروغ حاصل ہوگا جو کسی بھی ملک کے خصوصی مقاصد میں ایک اہم اور لازمی مقصد ہوتا ہے۔ اس طرز حکومت میں شخصی یا انفرادی آزادی کے تحفظ کا امکان قوی تر ہو جاتا ہے اس لیے کہ جمہوریت ملک کو افراد کے لیے سمجھتی ہے۔

نئی اور پرانی جمہوریت میں اس بات کا ہمیشہ خطرہ بھی لاحق رہتا ہے کہ بھولے بھالے کم پڑھے لکھے عاقبت نا شناس شہریوں میں کبھی گروہی عصبیت اور علاقائی کشمکش کو ہوا دے کر فسطائی ذہنیت رکھنے والے افراد کی اکثریت اقتدار پر قبضہ کر لے۔

ہندستان میں جمہوریت ہی کیوں؟

ہندستان قدیم زمانے سے ایک ایسا ملک رہا ہے۔ جو امن و شانتی کا پیامبر رہا ہے اور یہاں کے باشندوں میں مذہبی تہذیبی اور سماجی رواداری کی ایک تاریخ ملتی ہے جو کہ ہمیشہ میل ملاپ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، اتحاد اور بھائی چارے کی فضا میں سانس لیتے رہے ہیں درآں حالیکہ اس ملک میں مختلف رنگ و نسل، ذات، برادری، قبیلہ، مذہب اور تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہیں۔ ایک بہت وسیع اور کشادہ ملک ہونے کے ناطے یہاں کے مختلف گوشوں میں مختلف عقائد و رسوم کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ملک کی مختلف اکائیوں یا ریاستوں میں ایک دوسرے سے مختلف تہذیب معاشرہ، زبان اور مذہب کا وجود ملتا ہے۔ ہر ایک علاقہ کے الگ الگ تاریخی و جغرافیائی حالات ہیں۔ اس نوع سے دیکھا جائے تو یہاں کے اندرونی مسائل اور معاملات نہایت

پیچیدہ اور دیگر ممالک کے مقابلے میں دشوار ترین حالات کی غمازی کرتے ہیں۔ اگر جمہوریت کے علاوہ کوئی بھی دوسرا نظامِ حکومت یہاں اختیار کیا جاتا تو یقیناً یہاں کے باشندوں کا ایک کثیر طبقہ ناخوش حکومت سے بیزار اور انصاف و مساوات کے سلوک سے محروم رہ جاتا اور ہر شخص یا فرد کا اپنے ملک کی حکومت سے مطمئن ہونا سخت مشکل ہو جاتا۔ اگر یہاں صرف اکثریتی طبقہ کے رسوم و عقائد اور تہذیب و معاشرہ کو بنیاد بنا کر حکومت قائم ہوتی اور قانون وضع کیے جاتے تو اس میں بھی عملی طور پر دشواریوں کا سامنا ہوتا کیوں کہ مختلف علاقوں میں اگرچہ اکثریت ایک مخصوص مذہب سے وابستہ ہے لیکن ان کے عادات و رسوم اور تہذیب و تمدن میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر ان میں کسی طرح کا باہمی اختلاف و افتراق نہ بھی پایا جائے تو بھی دیگر متعدد مذاہب اور مختلف تہذیب و تمدن سے وابستہ اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنا ہرگز ممکن نہ تھا خود جمہوریت کی جو مختلف شکلیں دیگر ممالک میں اپنائی گئی ہیں انھیں بھی جوں کا توں یہاں لاگو کرنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے دستور اساسی (CONSTITUTION) کو وضع کرتے وقت یہاں کے مقامی حالات کے پیشِ نظر جمہوریت کے ان طریقوں کو اپنایا گیا جو قابلِ عمل ہوں اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور ہر ایک کو اپنی حکومت پر اعتماد و اعتبار حاصل ہو، ہر ایک کو یکساں حقوق حاصل ہوں، مذہبی آزادی حاصل ہو، اپنی تہذیب و معاشرت اور زبان کے تحفظ و بقا کا استحقاق ہو، طبقہ جاتی تفریق کا خاتمہ ہو، چھوت چھات کی لعنتوں سے نجات ملے، قانون کی نظروں میں سبھی بحیثیت شہری برابر ہوں، اظہارِ خیال و اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہو۔ ہر ایک کو اپنی شخصیت کی تعمیر و ترقی کا اختیار ہو، تعلیم و ترقی کے یکساں مواقع ہوں کوئی بھی پیشہ اختیار کر کے اپنی روزی روٹی کا سامان کرنا آسان ہو، سرکاری ملازمتوں کے دروازے سبھی کے لیے کھلے ہوں، بحیثیت شہری ہر ایک کو انتخاب میں حصہ لینے اور رائے دینے کا نہ صرف حق حاصل ہو بلکہ وہ خود اپنی جگہ پر حکومتی سطح کی خدمات

انجام دینے کے لیے عوامی نمائندہ بن سکتا ہو۔ ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے اپنے نجی مفادات کو پس پشت ڈال سکے۔ مذکورہ باتوں کے پیشِ نظر ہندوستان کے دستور اساسی میں عوام کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے جو کہ حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ برابری یا مساوات کا حق RIGHT TO EQUALITY

۲۔ شہری آزادی (آزادئ تحریر و تقریر) CIVIL LIBERTY

۳۔ مذہبی آزادی کا حق RIGHT TO FREEDOM OF RELIGION

۴۔ تہذیبی تعلیمی حقوق۔

۵۔ جائداد رکھنے کا حق۔

۶۔ دستوری دادرسی کا حق RIGHT TO CONSTITUTIONAL REMEDIES

ان حقوق کے ساتھ شہریوں پر بہت سے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اگرچہ جمہوریت میں ہر قسم کی آزادی دی گئی ہے لیکن جہاں اس راہ میں دوسروں کے حقوق کی پامالی یا ان سے ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس کی اجازت قانون نہیں دیتا۔ ہر آزادی ایک مخصوص دائرے میں رہ کر جائز ہے جمہوری دستور کی ایک بنیادی روح یہ بھی ہے کہ یہاں کے باشندے اپنے چھوٹے چھوٹے نجی مفادات پر دوسروں کے بڑے مفاد کو ترجیح دیں نیز ملک کے وسیع تر مفاد کا لحاظ رکھیں۔ کسی ایک فرد کی آزادی سے اور اس کے اپنے نجی مفاد سے دوسروں کے مفاد اور ملک کے مفاد پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص ملک کی بدنامی اور اس کو نقصان پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ قانون کی نظروں میں نہ صرف سماج دشمن بلکہ ملک دشمن قرار پائے گا۔

ہمارا دستور وفاقی بنیادوں پر قائم ہے جس میں مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کو علاحدہ علاحدہ بیان کر دیا گیا ہے ریاستوں کو اپنی حد کے اندر رہتے ہوئے مقامی اور علاقائی حالات اور تقاضوں کے مطابق قانون بنانے کا اختیار ہے

البتہ ریاستیں کوئی ایسا قانون وضع نہیں کر سکتیں جس کا ٹکراؤ دستور کی کسی دفعہ سے ہوتا ہو۔ اس طرح یہاں دوہرا نظام حکومت رائج ہے۔ ایک تو مرکزی دوسرا ریاستی۔ البتہ دیگر جمہوری ممالک کی طرح یہاں دوہری شہریت نہیں رکھی گئی ہے۔ ہندستان کے ہر باشندہ کو صرف ہندیونین کی شہریت حاصل ہے خواہ وہ کسی بھی ریاست یا علاقے میں رہتا ہو۔ جمہوریت میں حکومت کے تین عضو ہوتے ہیں۔ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ کسی معاملے پر مرکز یا ریاستوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو دستور کی تعبیر و تشریح عدلیہ کرے گی یا کسی فرد یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی ہو یا بنیادی حقوق میں دخل اندازی ہو تو عدلیہ کا مربوط نظام انصاف موجود ہے جس کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوگا۔

ہندستان کے دفاقی دستور میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ہنگامی حالات میں مرکز تمام ریاستوں کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور ملک کی سالمیت کے لیے اندرونی یا بیرونی خطرہ لاحق ہونے پر مرکز باضابطہ ایمرجینسی کا اعلان کر کے پورے دیش کو ایک اکائی میں تبدیل کر سکتا ہے۔

ہندستان میں جمہوری طرز حکومت کی یہ دین ہے کہ یہاں شروع سے ہی کثیر تعداد میں سیاسی پارٹیاں قائم ہیں جن کے اغراض و مقاصد کا انحصار بیشتر عوام، سماج اور ملک کی فلاح و بہبود پر ہے۔ ان میں چند ہی سیاسی پارٹیاں ملک گیر پیمانے پر کام کر رہی ہیں اور زیادہ مقامی اور ریاستی سطح پر سرگرم عمل ہیں۔

ہندستان کے بتیس سالہ دور جمہوریت کی تاریخ میں علاوہ دو برس کے، باقی تیس سال کا عرصہ کانگریس پارٹی کے مستحکم اور مضبوط دور حکومت کا سنہرا اور شاندار باب رہا ہے جو اپنی سنجیدہ، ٹھوس اور تعمیری پالیسیوں کی بدولت ہندستانی عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندستانی جمہوریت میں کانگریس کے دور اقتدار کا آغاز ہر دل عزیز رہنما اور اولین وزیر اعظم پنڈت شری جواہر لال نہرو سے ہوا تھا اور آج بھی ان کے نقش قدم پر چل کر ان کی لائق و محترم صاحبزادی محترمہ اندرا گاندھی ہندستان کی وزیر اعظم ہیں جن کی حکمت عملی اور دور اندیشانہ تعمیری پالیسیوں کی بنا پر ہندستان کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کے درمیان افتخار و سربلندی حاصل ہے اور اس کا شمار دنیا کے بڑے جمہوری ممالک میں ہوتا ہے۔

★

نیا دور کے قلمی معاونین سے

براہ کرم اپنی تخلیقات کے شروع یا آخر میں اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ اس کے علاوہ غیر طلبیدہ مضمون، افسانہ، غزل یا نظم کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔ اگر ان کی واپسی چاہتے ہوں تو ساتھ میں ٹکٹ چسپاں لفافہ ضرور ارسال کریں ورنہ ادارے پر ان کی واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

.... ایڈیٹر

نازش پرتاپگڈھی
بیگم وارڈ، پرتاپ گڑھ

ہمارا عہد

ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے
ہم ایک رہیں گے

آندھی کے قدم روکیں گے طوفاں سے لڑیں گے — رشک آئے زمانے کو کچھ اس طرح جئیں گے
ہم ہاتھوں میں ڈالے ہوئے جب ہاتھ چلیں گے — جو ٹوٹ نہ سکتی ہو وہ زنجیر بنیں گے
ہم ایک رہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

رستے کے خم و پیچ سے ہرگز نہ ڈریں گے — شمعوں کی طرح گھپ اندھیروں میں جلیں گے
خوشبو کی طرح ملک کے گلشن میں بسیں گے — ہم بن کے لہو دھرتی کی رگ رگ میں بہیں گے
ہم ایک رہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

مکاروں کی سازش سے خبردار رہیں گے — بھارت میں کبھی جھگڑے کو بھی اٹھنے نہ دیں گے
غداروں کے سائے سے بھی بچ بچ کے چلیں گے — سب لوگ اک آواز میں مل جل کے کہیں گے
ہم ایک رہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

ہم فرقہ پرستی کے اندھیروں سے بچیں گے — آپس میں غلط دھرم کی خاطر نہ لڑیں گے
پھندے میں نہ اب شیخ و برہمن کے پھنسیں گے — مذہب کے تقدس کو نہ شرمندہ کریں گے
ہم ایک رہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

کاندھے سے جو ہم جوڑے ہوئے کاندھے بڑھیں گے — فولاد کی چلتی ہوئی دیوار بنیں گے
اک دیش میں، اک حال میں، اک رنگ رہیں گے — مے خانۂ بھارت میں سب اک ساتھ پئیں گے
ہم ایک رہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

ہم ایک رہیں گے

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
(بڑریا ملّا ظریف رام پور یو پی)

مولانا محمد علی جوہر اور قومی یکجہتی

مولانا محمد علی جوہر کا شمار ہمارے اُن قومی رہنماؤں میں ہوتا ہے جو ملک کی آزادی کے لیے 'قومی یکجہتی' کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ مولانا نے قومی یکجہتی کے لیے جو تاحیات جد و جہد کی اُس کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'قوم' کا مفہوم متعین کر لیا جائے تاکہ مولانا کے نظریات کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو سکے۔

قومیت پر مختلف مفکرین کے اقوال موجود ہیں۔ بعض نے کسی ایک حکومت کے زیر سایہ رہنے والی 'نیشن' کو ایک قوم تسلیم کیا ہے اور بعض نے ایک جیسے عقائد رکھنے والے افراد کو ایک قوم مانا ہے۔ کبھی کبھی ایک انتظامیہ کے تحت زندگی گذارنے والے، مختلف مکتبۂ فکر اور مذہب و ملت کے افراد بھی ایک قوم مانے گئے ہیں۔ میک آئیور کے قول کے مطابق:

"... قومیت مشترکہ جذبہ اور ایک دوسرے سے وابستگی کے ایک ایسے شعور کا نام ہے جسے تاریخی حالات نے جنم دیا ہو ... جو یہ خواہش رکھتے ہوں کہ ہم اپنی حکومت بنائیں۔"

لارڈ برائس نے لکھا ہے:

"قومیت وہ آبادی ہے۔ جو زبان و ادب، تصورات اور رسم و رواج جیسے رشتوں سے اس طرح بندھی ہوئی ہو کہ وہ اپنی ٹھوس اکائی کو محسوس کرے اور اپنی اس اکائی کی وجہ سے دوسری آبادی سے اپنے آپ کو علاحدہ سمجھے۔"

مذکورہ بالا اقوال کے مطابق رسم و رواج کی وابستگی قوم کو ایک اکائی بناتی ہے۔

مولانا محمد علی نے لفظِ قوم پر باقاعدہ بحث نہیں کی ہے لیکن اُن کی مختلف تحریروں اور تقریروں میں 'قومیت' اور ملیت پر ضمنی بحثیں ضرور ملتی ہیں۔ مولانا ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

"منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک ملت تنظیم پا سکتی ہے نہ ایک قوم...... لیکن ارتقا کی ہر منزل میں ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ ایک اور یا چند اور منزلیں بھی ہیں آخری منزل نہ فقط اپنا نفس ہے، نہ خاندان ہے، نہ ملت ہے نہ قوم بلکہ انسان ہے۔ سب انسان پہلے ایک امت تھے اور سب انسان پھر ایک امت ہو سکتے ہیں"

گویا مولانا کے نزدیک 'انسان' اور 'انسانیت' قومیت اور ملیت سے بلند و بالا ہے۔ ملیت اور قومیت پر بحث کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"اسلام نے دنیا کو یورپ کی طرح قوموں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اختلافاتِ مذہبی کی بنا پر ملتوں میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس معنی میں بھی ملیت قومیت کے اس قدر منافی نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کا وجود قومیت کو پیدا نہ ہونے دے۔"

مولانا کے مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملتیں اگر مذہبی لحاظ سے علاحدہ بھی ہوں تب بھی قومیت ایک ہوسکتی ہے۔

محمد علی ہمارے ان قومی رہنماؤں میں تھے جو اپنے ملک کو آزاد اور ہندوستانی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کی آزادی اور قوم کی ترقی کے لیے یہ ضروری تھا کہ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی ربط بڑھے۔

مولانا سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک زندگی کے ہر شعبے کا حل مذہب میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا:

"۔۔۔۔ مذہب کو اگر آپ سیاست سے جدا رکھیں گے تو مذہب کے بارے میں آپ کا تصور غلط ہوگا۔ مذہب زندگی کی ایک تعبیر کا نام ہے۔"

اور زندگی کی اس تعبیر نے انھیں 'حق' اور 'باطل' کا فرق سمجھا دیا تھا۔ ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات انگریز کے زمانے سے شروع ہوئے۔ قومی رہنما ہونے کی حیثیت سے اس قسم کے مسائل محمد علی کے سامنے بار بار آئے۔ لیکن انھوں نے توازن اور مساوی انداز میں ان مسائل کے حل پیش کیے:

ہم کسی ایسے شخص کو جو مسلم نہ ہو مکلف بالشریعۃ الاسلام نہیں کر سکتے۔ اگر اُس کے مذہب اور عقیدے کے مطابق باجہ بجانا اور جلوس نکالنا جائز افعال ہیں تو ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ باجے کے ساتھ کوئی جلوس لے کر ہماری مسجدوں کے سامنے سے گزرے اور اگر ایسا کرنا اس کا مذہبی فریضہ ہو تب تو ہم کو اور بھی حق نہیں کہ اس کو مجبور کریں کہ اپنی شریعت کا احترام نہ کرتے۔"

یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جس کا دعویٰ ہے:

"میں اول مسلمان ہوں، دوم مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں۔"

مولانا نے باجہ اور مسجد کے لیے جو سطور تحریر کی ہیں۔ اگر اُن کی تحلیل کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محمد علی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندستان کے مختلف فرقوں کے درمیان کسی بھی قسم کا اختلاف ہو اور اس سے قومی اتحاد کو نقصان پہنچے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی پرزور تلقین کی ہے جو ان کے نزدیک حصول آزادی کی اولین شرط ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ قول ملاحظہ ہو:

"میں تو کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔"

لیکن افسوس کہ محمد علی کی ہندو مسلم ایکتا کی کوشش کے باوجود ملک کی صورتِ حال بگڑنے لگی۔ اور جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ اور ملک میں 'شدھی سنگٹھن' اور اس کے جواب میں مختلف تنظیمیں بننے لگیں۔ محمد علی مسلمانوں کی تنظیم کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن وہ جس طرح کی تنظیم چاہتے تھے۔ اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو تنظیم و تبلیغ کی ہمیشہ ضرورت تھی لیکن کون سی تنظیم کی۔ یہ نہیں کہ صبح سے شام تک ہندوؤں کے مظالم اور ان کی ریشہ دوانیوں کا دکھڑا رو دیا جائے۔ بلکہ اپنے نقائص کی تلاش کی جائے اور ایک ایک کر کے ان کو دور کیا جائے۔ اگر ہندو مریض کے مرض کی تشخیص کی جائے اور اس کو کڑوی دوا پلائی جائے تو کیا اس سے مسلمان مریض کا مرض اچھا ہو جائے گا؟ گھوڑ دوڑ میں ہم کو بازی جیتنا ہے مگر مسلمان گھوڑا سوار سے کہتا ہے کہ مہمیز اور چابک میرے نہ لگا۔ ہندو گھوڑے کے لگا تو ہم جیت جائیں گے۔ یہ منطق ہے جسے مسلمانوں کے دماغ سے نکالنا ہے۔"

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کی اولین حیثیت ایک مسلمان کی تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں میں تنظیم بھی چاہتے تھے۔ تاکہ 'دین الملل جمعیت' بن سکے۔ اس لیے کہ مولانا کے نظریہ کے مطابق ہندستان اور عالم اسلام دونوں

کی آزادی کی تحریکوں میں ہم آہنگی تھی۔ تحریر کرتے ہیں۔

"ایک مسلمان اس قومیت کا ہرگز طرف دار نہیں ہوسکتا جو اسے اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے باز رکھے لیکن وہ اس ملیت کا بھی طرف دار نہیں ہوسکتا جس کی طرف اسے بعض مسلمان گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان [illegible] کرے تو یہی نہیں کہ اس کو اس ظلم میں [illegible] ہونے [illegible] کے اس ظلم سے باز بھی رکھے۔"[9]

مولانا کی تحریر و تقریر کی قوت ہندو مسلم اتحاد پر صرف ہوئی۔ لیکن دونوں میں اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے چند جملوں سے ہم اس زمانے کی صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں:

"..... اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے۔ ... یا کانگریس اُن سے دور ہونے لگی۔ ... اس میں شاید کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ اُن حالات کا تھا جو ملک میں رونما ہوئے۔"[11]

ان فرقہ وارانہ فسادات اور مسائل کو حل کرنے کے لیے بہت کوششیں کی گئیں۔ اُن میں سب سے مشہور وہ کانفرنس تھی جو مولانا محمد علی نے اپنی صدارت کے زمانے میں ۱۹۲۴ء میں کی۔ یہ کانفرنس دہلی میں گاندھی جی کے ۲۱ روزہ برت کے دوران منعقد کی گئی تھی۔[12] اس کے بعد شملہ اور دوسری جگہوں پر بھی کانفرنسیں کی گئیں۔ لیکن بے سود۔

مولانا محمد علی ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن چلے گئے جہاں سے وہ کامل آزادی کا پروانہ لانا چاہتے تھے۔ یا آزاد ملک میں مرنا چاہتے تھے۔ مدینہ اخبار بجنور کی ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت کے مطابق انھوں نے پریس کے نمائندہ کو اپنا انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے بیماری نے آدبایا تھا۔ لیکن میں ابھی تک زندہ ہوں۔ اور ہندوستان کو ایک جگہ لانے کا جو کام شروع کیا تھا اسے پھر جاری کرسکتا ہوں۔ مولانا نے آگے چل کر فرمایا۔ ہندوؤں کی اکثریت جس قدر زیادہ کیوں نہ ہو انھیں مکمل اختیارات دے دیے جائیں اور ہر ایک مسلم اقلیت کے حقوق محفوظ رکھے جائیں۔ اور اسی طرح مسلم اکثریت کو اختیارات دے دیے جائیں اور ہندو اقلیتوں کی حفاظت کی جائے۔"

مولانا محمد علی اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی لندن میں ہندو مسلم سمجھوتے کے لیے مسودہ تیار کر رہے تھے۔ جس سے دماغ پر زیادہ بوجھ پڑنے سے دماغ کی رگیں مفلوج ہو گئیں۔ دماغ کی رگوں سے خون بہنا شروع ہوا۔ ۲ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی ۳ جنوری کو بیہوش ہو گئے اور پھر ہوش نہ آیا۔ ۴ جنوری [illegible] کو ہندوستان کی آزادی کا خواب لیے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سبھی مرتے ہیں
[illegible] مرحوم کی بات کفن کچھ اور کہتی [illegible]

حواشی
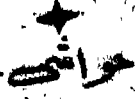
[illegible] MACIVER AND PAGE: A TEXT BOOK OF SOCIOLOGY PAGE [illegible]

[illegible] [illegible] LECTURE [illegible] PAGE 26-27

[illegible]

مشتاق پردیسی
معرفت قومی آواز۔ لکھنؤ

سنگم کی دھرتی

تعارف
ہر ایک دور کا دستور ہے کہ دنیا نے
حقیقتوں سے ہمیشہ بنائے افسانے

وقت
گذر چکی ہے دبے پاؤں شب کی رقاصہ
مہ و نجوم کی پائل کی نغمگی چپ ہے
اداس اداس سا لگتا ہے میکدوں کا جہاں
شراب و ساغر و مینا کی زندگی چپ ہے

مقام
جہاں پہ گنگ و جمن کا ملاپ ہوتا ہے
خلوص فن کے طفیل اس نے نغمگی پائی
اسی زمین کے سینے کا ایک راز ہے یہ
دگرنہ بزم جہاں کا فسوں ساز ہے یہ

منظر
وہ ملگجی سا اندھیرا یہ شب گزیدہ سحر
وہ ایک ناؤ چلی جا رہی ہے لہروں پر
نگینے ٹوٹ کے گرتے ہوں جیسے کشتی سے
کرن کی اوٹ میں بجتا ہے جلترنگ کہیں
عجیب حسن ہے پانی کے جھلملانے میں
عجیب نغمہ ہے پتوار کے چلانے میں

تمام ناؤ ہے کہرے کی اوٹ میں لیکن
گماں ہوتا ہے دو آدمی کے سائے ہیں
نجانے ان کو ہے کس صبح آرزو کی تلاش
چلے ہیں جانے کہاں کو کہاں سے آئے ہیں

(خموشی! ناؤ سے سرگوشیاں ابھرتی ہیں
شریک ہونے کو تنہائیاں ابھرتی ہیں

یہ نرم نرم سویرا یہ روشنی کم کم
بچھی ہوئی ہے ہری گھاس پر یہ شبنم
یہ دیوتاؤں کی دھرتی یہ دیویوں کی زمیں
یہ تیرہ بخت دلوں کے لاپ [illegible]
یہ لال رنگت ہے، اوشا کی جگمگاہٹ ہے
کہ دیوتاؤں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہے

یہاں سے دور وہ پانی پہ کشتیوں کے کنول — کہ جیسے ڈول رہے ہوں ہزاروں تاج محل
کسی نے خواب میں آکر کے جیسے چھیڑ دیا — کچھ اس ادا سے ہیں آنکھیں فضاؤں کی بوجھل

یہ ہلکا ہلکا سا کہرہ ہے یا کہ بادل ہے
نہیں یہ پیار کی گنگا کا پاک آنچل ہے

یہ دیوتاؤں کی چوکھٹ پجاریوں کی قطار — یہ گھنٹیوں کی ٹناٹن، یہ زندگی کی پکار
یہ صبح اتنی حسیں جیسے بانسری کی صدا — یہ صبح اتنی مقدس کہ جیسے دوست کا پیار

تمام پھیلی ہوئی زندگی کی خوشبو ہے
نجانے خواب ہے، سنگم ہے، یا کہ جادو ہے

یہ وقت وہ تھا کہ جی چاہتا تھا سو جاؤں — خود اپنے خواب کی رنگینیوں میں کھو جاؤں
مگر یہ سن کے مرا دل تڑپ اٹھا اے دوست — وطن کو تج دوں، غریب الدیار ہو جاؤں

بنا پیے میرے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا
یہ میرا دل بھی تو شیشہ تھا گر کے ٹوٹ گیا

یہ کیا کہا کہ میں اپنے وطن کو ٹھکرا دوں؟ — لہو دیا ہے جسے اس چمن کو ٹھکرا دوں؟
یہ کیا کہا کہ تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں؟ — یہ دوستوں سے بھری انجمن کو ٹھکرا دوں؟

وطن تو ماں کی طرح سب کو پیار کرتا ہے
تو ہی بتا کہ کوئی ماں کو چھوڑ سکتا ہے

یہ میرا ملک، یہ گوتم کی، رام کی دھرتی — یہ پاک سیتا کی، نانک کی، شیام کی دھرتی
یہ میر و غالب و مومن کی حسرتوں کا چمن — یہ کالی داس کے رنگیں کلام کی دھرتی

کہیں یہ صبح بنارس کی شانِ زیبائی
کہیں یہ شامِ اودھ کی جوان انگڑائی

یہ پربتوں کے پرے اپنے سر اٹھائے ہوئے — یہ ایورسٹ سنہرا مکٹ لگائے ہوئے
یہ اونچے نیچے پہاڑ اور یہ اونچی نیچی زمیں — کہ جیسے کوئی حسیں تیوریاں چڑھائے ہوئے

یہ کاشمیر یہ حسنِ نشاط و شالیمار
دلہن اکیلے میں شرمائے جیسے کر کے سنگھار

یہ سارناتھ، یہ کاشی ہے اور یہ مدھوبن ہے — یہ ملک اشوک اور اکبر کے گھر کا آنگن ہے
یہ سنگ مرمر کی تعمیر ہے یا حسینِ شفق — یہ لال قلعہ ہے یا گلستاں کا دامن ہے

قطب منار وہ دلی کا دل بڑھائے ہوئے
وطن کی لاج کے مانند سر اٹھائے ہوئے

یہیں پہ دل نے کسی دل کا ساتھ پکڑا تھا
یہیں پہ میں نے محبت کا ہاتھ پکڑا تھا
یہیں پہ پھیلی تھی زلفوں کی بھینی بھینی مہک یہیں اٹھی تھی مرے دل میں میٹھی میٹھی کسک
اسی زمین پہ پائل کا راگ گونجا تھا اسی زمین پہ ابھری تھی چوڑیوں کی کھنک
یہیں پہ خار ملے اور گل کی خوشبو بھی
یہیں پہ پیار بھی پایا یہیں پہ آنسو بھی

مہکتے جھومتے گلشن کو کس طرح چھوڑوں یہاں کے رس بھرے ساون کو کسطرح چھوڑوں
ہر ایک دامنِ ارماں تو چھوڑ سکتا ہوں بتا! کہ ممتا کے دامن کو کس طرح چھوڑوں
تڑپ رہا ہے مرا دل ہے میری آنکھ سجل
نہ توڑا جائے گا مجھ سے یہ میرا تاج محل
چلا تو جاؤں مگر پھر یہ دن، یہ رات کہاں دیارِ غیر میں یہ بانکپن یہ بات کہاں
ترا خیال تری آرزو، تری یادیں لیے لیے میں پھروں گا یہ کائنات کہاں
چھڑا نہ مجھ سے مرا گھر مرا عزیز وطن
رہِ حیات پہ اے دوست اجنبی تو نہ بن

اختتام

سکوتِ صبح میں سرگوشیاں بھی ڈوب چلیں
وہ ناؤ دور بہت دور ہو گئی شاید
افق کے عارضِ گلگوں پہ مسکراہٹ ہے
سحر کی گود میں وہ رات سو گئی شاید
یہاں تو دل بھی ہے سجدے میں اک جبیں ہی نہیں
یہ کوئے یار ہے سنگم کی سرزمیں ہی نہیں

★

بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر "نیا دور" جنوری، فروری کا مشترکہ شمارہ
مارچ میں شایع ہو رہا ہے۔ امید ہے آئندہ شمارہ سے نیا دور کی
اشاعت معمول پر آجائے گی۔
ایڈیٹر

بدیع الزماں اعظمی
۱۴۳ بکری ٹولہ اعظم گڈھ (یو.پی)

مہاتما گاندھی اور گُروگوکھلے

عزت مآب گوکھلے کا نام زبان پہ آتے ہی ایک عظیم شخصیت کی تصویر اُبھر کر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ گوکھلے ایک ہرتاباں کے مانند اپنے ان ستیاروں کے جھرمٹ میں جگمگا رہے ہیں جنھوں نے غیر ملکی حکومت کے مظالم کا احساس کیا اور ملک کو غلامی کے آہنی پنجہ سے آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ گوکھلے کے دل میں بے پناہ جذبۂ ہمدردی تھا۔ وہ مختلف طبقات اور مختلف الخیال لوگوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانا چاہتے تھے۔ یعنی کثرت میں وحدت پیدا کرنا ان کا نصب العین تھا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ گاندھی جی کو ایسی بیدار مغز اور سیاسی بصیرت رکھنے والی شخصیت یعنی شری گوکھلے کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس وقت کے دوسرے لیڈروں میں انھوں نے اپنے خیالات کی وہ ہم آہنگی نہ پائی جو ایک سچے گرو اور ایک فرمانبردار شاگرد میں ہوتی ہے۔ گاندھی جی نے نہایت ایمان داری کے ساتھ اپنے گرو گوکھلے کے بارے میں اپنے تاثرات کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا تھا کہ سرفیروز شاہ مہتا مجھے ہمالیہ پربت کی طرح بلند و بالا اور لوکمانیہ تلک ایک ساگر کی طرح وسیع اور عمیق دکھائی دیتے ہیں لیکن گوکھلے پوتر گنگا کے مانند ہیں۔ ہمالیہ کو سر کرنا یا سمندر کو عبور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی لیکن پوتر گنگا کا فیض تو سبھی کو پہنچتا ہے۔ گنگا جی تو ہر ایک کو اپنی گود میں بٹھانے اور اپنے سینہ سے لگانے کے لیے ہمہ وقت بے چین رہتی ہیں۔ گاندھی جی نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کے گرو گوکھلے نے انھیں اپنی شاگردی میں لے کر قومی اور ملکی سیاست سے روشناس کرایا۔

شری گوکھلے نے ایک جوہری کی طرح گاندھی جی کو پرکھا اور کہا کہ گاندھی جی ایسے عناصر سے بنے ہوئے ہیں جو سورما اور شہید پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گاندھی جی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۱۲ء میں جب گوکھلے جنوبی افریقہ میں مختصر قیام کرنے کے بعد واپس آئے تو انھوں نے ببانگ دہل کہا کہ وہی لوگ گاندھی جی کے مرتبہ اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ذاتی طور پر ان کے مشن سے کماحقہ واقف ہوں۔ یقیناً ان کی تشکیل ایسے خمیر سے ہوئی ہے جو بلاشبہ ایک بے غرض، ایماندار اور قابل پرستش لیڈر پیدا کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایسی بے پناہ روحانی طاقت کے بھی مالک ہیں کہ جس کے بل پر وہ بڑی سے بڑی مادی طاقت کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں اپنے مشن کی کامیابی کی بدولت بھارتی افق پر ایک مہاتما بن کر اُبھرے۔ گرودیو ٹیگور نے سب سے پہلے انھیں اس وقت 'مہاتما' کے لقب سے یاد کیا تھا جبکہ انھوں نے جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹ کی جابر حکومت کی مادی طاقت پر اپنی اخلاقی اور روحانی قوت سے غلبہ پایا تھا۔

گوکھلے کی اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کا کیا کہنا۔ مہاتما جی کی بعد کی کامیابیوں نے اس پیشین گوئی کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا کہ کس طرح ہندستان کے کروڑوں مردوں، عورتوں اور بچوں نے گاندھی جی کی قیادت کو قبول کیا اور کس طرح انھوں نے عدم تشدد کے حربہ کو اپناتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ حکومت وقت کی سختیاں برداشت کیں، پولیس کے ڈنڈوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سینوں پر گولیاں کھاتے ہوئے قید و بند کی سختیاں جھیلتے ہوئے جنگ آزادی کا پرچم لے کر آگے بڑھتے رہے۔ بالآخر عروسِ آزادی سے ہم کنار ہو گئے۔

گاندھی جی نے اس امر کا بھی اقرار کیا ہے کہ ان کے گرو کی نگاہ اس پر بھی رہتی تھی کہ میں کیا کہتا ہوں، کیا پہنتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، میرے مشاغل کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میری ماتا مجھ پر اتنی کرم فرما نہ تھیں جتنا کہ میرے گرو مجھ پر مہربان تھے۔ وہ مجھ جیسے سیاسی کارکن کے لیے سب کچھ تھے۔ ان کا دل بلوریں شیشہ کی طرح صاف تھا۔ مزاج میں ایک میمنہ کی سی نرمی تھی، شیر جیسے دلیر اور بہادر تھے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں بے جھجک تھے۔ چنانچہ میں نے بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں جبکہ تحریک ترک موالات اور عدم تشدد کی پالیسی زوروں پر تھی تو چوری چورا کے واقعہ سے متاثر ہو کر اپنی تحریک روک دی۔ اس واسطے کہ عدم تشدد کو اپناتے ہوئے سیاسی جنگ لڑنا میرا مطمح نظر تھا۔ میں نے لوگوں کے متعلق ایک غلط اندازہ لگا لیا تھا جس کا نتیجہ تشدد کی صورت میں سامنے آ گیا۔ اس غیر متوقع سانحہ کا سارا الزام میں نے اپنے سر لے کر اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا۔ اس واسطے کہ غلطی کو تسلیم کر لینا مثل جھاڑو کے ہے جو ہر قسم کے گرد و غبار کو صاف کر کے فرش کو صاف اور چکنا بنا دیتی ہے۔

گوکھلے نے سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (SERVANT OF INDIA SOCIETY) تشکیل کی۔ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں خاص خاص نکات یہ تھے۔

۱۔ عام جنتا کے اندر مادر وطن سے سچے پریم کا جذبہ پیدا کرنا کہ وہ سچی لگن اور سچی دھن کے ساتھ ملک کی خدمت کر سکیں اور قربانیاں دے سکیں۔

۲۔ عوام میں سیاسی بیداری لانا اور ان کو ہر تحریک میں عملی حصہ لینے کے لیے آمادہ کرنا۔

۳۔ مختلف طبقات اور ہر مکتبۂ فکر کے افراد میں میل محبت اور اتحاد پیدا کرنا۔

۴۔ پس ماندہ اقوام اور عورتوں میں تعلیم عام کرنا۔ صنعتی اور سائنسی تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ فروغ دینا۔

۵۔ پس ماندہ ذات کے لوگوں کو اونچا اٹھانا۔

۶۔ ملک کی گھریلو اور بھاری صنعتوں کو تیزی کے ساتھ بڑھاوا دینا۔

یہ سارے نکات مہاتما گاندھی کے لیے جنگ آزادی میں مشعل راہ بنے رہے۔ البتہ وہ بھاری صنعتوں کو تیزی کے ساتھ بڑھاوا دینے کے حق میں نہ تھے۔ اچھوتوں کو سماج میں کوئی مقام نہ دینا اور ان سے نفرت کا اظہار کرنا گوکھلے کے دردمند دل کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے وہ بار بار لوگوں سے پس ماندہ اقوام کی مدد کرنے اور ان کو انسان سمجھنے کی اپیل کرتے رہے۔ مہاتما جی نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر اچھوتوں کو ہریجن (ایشور کے بیٹے) کہہ کر اونچی ذات والے ہندوؤں کو ان کے علیحدگی پسند رجحانات کو دیکھتے ہوئے ایک تازیانہ لگا دیا۔

گوکھلے کی انسان دوستی کی ایک گہری چھاپ گاندھی جی کے دل و دماغ پر پڑ گئی تھی۔ گرو کی حب الوطنی نے گاندھی جی کو اپنا غلام بنا لیا۔ چنانچہ گاندھی جی کو جب اپنے گرو کی موت کی خبر ملی تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہی الفاظ نکلے:

"جب میں اپنے لیے ایک سچے ہیرو کی تلاش میں نکلا تو مجھے سارے ہندوستان میں ایسی ہستی صرف ایک ہی ملی اور وہ ہستی گوکھلے کی تھی۔"

مہاتما گاندھی نے اکثر و بیشتر اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ گوکھلے میرے سیاسی گرو تھے۔ گاندھی جی نے جس احترام اور محبت کا اظہا

کیا وہ دوسرے لیڈروں کے نصیب میں نہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ گرو اور چیلے میں ہر بات پر اتفاق تھا بلکہ بعض بعض مسائل پر اختلاف بھی رہا ہے۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کے اصول عدم تشدّد کی کامیابی پر گوکھلے کو شبہ ضرور تھا اس لیے وہ اس تحریک میں نمایاں حصّہ نہ لے رہے تھے۔ ان کو گمان بھی نہ تھا کہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کا جادو عوام پر چل جائے گا۔ افسوس کہ گوکھلے اپنے چیلے کی کامیابیوں کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے۔ ورنہ وہ دیکھتے کہ کس طرح مہاتما گاندھی جنگ آزادی کے ہر محاذ پر رکاوٹوں کو پھاندکر اپنے اخلاق حسنہ اور اپنی سچائی اور ایمان داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عدم تشدّد کا جھنڈا بلند کیے ہوئے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہے اس کٹھن راہ میں جابر حکومت کی سنگ دلانہ سختی اور قید و بند کی تکالیف کو مسکراتے ہوئے جھیلتے رہے اور ان لوگوں کو بھی اپنا پریم دیتے رہے جو ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہے۔ اس طور پر حصول آزادی کے لیے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دے کر پوری قوم کو ابھارتے رہے۔

اگر گوکھلے کی زندگی نے گاندھی جی کا ساتھ دیا ہوتا تو وہ یہ دیکھ کر اپنے تئیں کتنا فخر محسوس کرتے کہ وہ شخص جسے انھوں نے بہت امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ ابھار کر ہندستان کے سیاسی افق پر لا کھڑا کیا تھا وہ کس طرح پوری قوم کا واحد لیڈر بن گیا اور ساری قوم نے اسے بالآخر راشٹرپتا یا باپو کے لقب سے پکارا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۳ء میں سیگون ریڈیو پر ہندستانی قوم کے نام اپنی پہلی نشری تقریر میں سب سے پہلے گاندھی جی کو راشٹرپتا کہا تھا۔ ان کے الفاظ یہی تھے:۔

مہاتما جی! ہمارے راشٹرپتا! اس مقدس جنگ آزادی میں ہم آپ کا آشیرواد چاہتے ہیں۔

گوکھلے کا یقین بہ حد ایمان تھا کہ گاندھی جی جیسا مرد باصفا، شریف النفس، رحم دل اور روحانیت کا پیکر مہاتما گوتم بدھ کے بعد ہندستان کی سرزمین پر پیدا ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ گاندھی جی ان آدمیوں میں ہیں جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، بھائی بندوں سے پریم کرتے ہیں، سچائی اور عدل و انصاف کے دیوتا ہیں اور کمزور طبقہ کے افراد ان سے ایک نئی روشنی پاتے ہیں۔ گاندھی جی کی بھی اپنے گرو سے عقیدت کا اندازہ ان کی اس تقریر سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنے گرو کی موت پر اس تعزیتی کانفرنس میں کی تھی جو بہ مقام تلوتر منعقد ہوئی تھی۔ مہاتما جی نے ان الفاظ میں اپنا خراج عقیدت پیش کیا تھا کہ میرے گرو آنجہانی گوکھلے کی زندگی، ان کا پیغام، ان کے بول، ان کا کردار اور ان کا نصب العین ہمارے لئے ایک روشن ستارہ کے مانند ہیں جس کی روشنی ہمیشہ ہماری رہنمائی کرے گی۔ ہمیں چاہئیے کہ ہم ان کے آدرش جیون کی خوبیوں کو اپنے جیون میں سمو لیں۔

آنجہانی گوکھلے نہ صرف اپنی بے پناہ حب الوطنی، ملک و قوم کے لیے اپنی بے لوث خدمات اور اپنی سیاسی بصیرت کے لیے یاد کیے جائیں گے بلکہ اس لیے بھی یاد کیے جائیں گے کہ ان کی دوررس نگاہوں نے مہاتما گاندھی جیسا بے مثال لیڈر دریافت کر کے انھیں اپنی شاگردی میں لے کر ملکی اور قومی سیاسی اکھاڑے میں اتار دیا جس نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنی اور اپنے پرستاروں کی عظیم قربانیوں کی بدولت ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو بھارت کو طوق غلامی سے آزاد کر کے یونین جیک کی جگہ "قومی پھریرا" لہرا دیا۔

مہاتما گاندھی کچھ لوگوں کے لئے ایک پہیلی، کچھ لوگوں کے لیے ایک پیچیدہ معمہ، کچھ لوگوں کے لیے ایک عجوبہ، کچھ لوگوں کے لیے ایک مصلح، کچھ لوگوں کے لیے سنت اور کچھ لوگوں کے لیے دیوتا تھے لیکن اپنے پرستاروں کے لیے اعلا درجہ کے مدبر اور ایک آدرش گرو تھے۔ لطف یہ کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کی خاکساری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے کو سب کا سیوک سمجھتے تھے — دنیا والوں نے ان کی تذلیل کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ وہ گاندھی جی کو نیم برہنہ بھکاری، بن مانس، بدصورتی کا مجسمہ، گنوار، وہمی، موقع شناس

اور معلوم نہیں کن کن الفاظ سے یاد کرتے رہے۔ مگر وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک مہاتما ہی رہے اور ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ بھی گاندھی جی سے پہلی بار ملتے تھے تو وہ ان کے رتبہ کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ انھیں گاندھی جی کی عظیم شخصیت کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ وقت لگتا تھا۔ جب وہ سمجھ لیتے تھے تو ان کو گرویدہ مان کر ان کے پرستار بن جاتے تھے۔ ان کے پرستاروں میں سے صرف چند شخصیتوں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

آیئے دیکھیں کہ ان حضرات پر گاندھی جی سے پہلی ملاقات کا ردّعمل کیا ہوا:۔

۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی مہاتما جی سے پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں ہوئی تھی۔ نہرو جی نے اس ملاقات کا تاثر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں یوں قلم بند کیا ہے۔

"ہم سب نے گاندھی جی کی جنوبی افریقہ کی دلیرانہ جنگ کو بہ نظر تحسین دیکھا لیکن ہم نوجوانوں کی نگاہ میں وہ غیر سیاسی انسان نظر آئے کیونکہ انھوں نے کانگریس یا قومی سیاست میں کوئی خاص حصّہ لینے سے نہ صرف اپنے کو باز رکھا۔ بلکہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مسائل تک اپنے کو محدود رکھا۔ انھوں نے مغربی لباس اتار کر پھینک دیا تھا اور گنواروں کی طرح صرف دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ ان کی اس ظاہری ہیئت کو دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے انھیں خبطی اور دیوانہ سمجھا۔ ان کے حلیہ میں بھی کوئی جاذبیت نہ تھی۔ دبلا پتلا ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ، ٹانگیں ٹیڑھی، کان باہر کو نکلے ہوئے۔ دانت نہ ہونے کی وجہ سے گال پچکے ہوئے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے بظاہر گاندھی جی میں کوئی کشش نہ تھی اس لیے وہ ان کی طرف کھنچ نہ سکے۔ لیکن گاندھی جی نے پہلی نظر میں ہی موتی کے جوہر کو بھانپ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان کی قیادت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں آئے گی اور دنیا اسے امن کا پیغامبر کہے گی۔

یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ پنڈت نہرو نے مہاتما جی کو اپنا باپو اور مہاتما جی نے نہرو کو اپنا سیاسی وارث بنالیا۔

۲۔ ولبھ بھائی پٹیل احمد آباد کے ایک کامیاب وکیل تھے ان کی گاندھی جی سے پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں ایک کلب میں ہوئی تھی جب گاندھی جی کلب میں داخل ہوئے تو پٹیل سوٹ میں ملبوس فلٹ ہیٹ لگائے دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ گاندھی جی کا حلیہ دیکھ کر مسخرانہ انداز میں زیر لب مسکرائے اور پھر تاش کھیلنے میں مشغول ہوگئے۔ اگرچہ انھوں نے گاندھی جی کے جنوبی افریقہ کے کارنامے سن رکھے تھے مگر وہ پہلی نظر میں کچھ بھی متاثر نہ ہوئے۔ بعد میں جب گاندھی جی نے لگان نہ دینے کی کسانوں کی ایک کانفرنس بردولی میں بلائی تو ولبھ بھائی پٹیل اس میں شریک ہوئے۔ گاندھی جی کے دلائل سن کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے حصول آزادی کے لیے جن نکات کی مدلّل تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ ہمیں کسانوں کا تعاون حاصل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ کسان ہی بھارت کی شہ رگ ہیں۔ ہمیں ان کی خاطر، ان کی زبان ان کا لباس اور ان کا کلچر اپنانا ہے اور ان کی معاشی اور سماجی حالت کا جائزہ لینا ہے۔

گاندھی جی نے اپنی پُر مغز گفتگو سے پٹیل کا دل جیت لیا۔ پٹیل نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا گاندھی جی نے خوش ہو کر انھیں بردولی کا سردار کہہ کر مخاطب کرنا شروع کیا۔

۳۔ مسز سروجنی نائیڈو کی گاندھی جی سے پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ سروجنی نائیڈو نے تحریر کیا ہے کہ جب میں گاندھی جی کی جائے قیام پر پہنچی تو دیکھا ایک کمرہ میں ایک منحنی آدمی جس کا سر گھٹا ہوا ہے۔ جیل خانہ کے کالے کمبل پر بیٹھا ہوا جیل کے تسلے سے پچکے ہوئے ٹماٹر میں زیتون کا تیل ملا کر کھا رہا ہے اس کے قریب ہی کچھ بدشکل پچکے ہوئے ٹین کے ڈبے پڑے ہوئے ہیں جن میں مونگ پھلیاں اور سوکھے بدمزہ بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے

ایک مشہور اور بڑے لیڈر کی یہ حالت دیکھتے ہی ایک قہقہہ لگایا۔
گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا یقیناً تم مسز نائیڈو ہو۔ کھانا حاضر ہے۔ آؤ شریک ہو جاؤ۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے دل میں کہا کہ اسے آپ ہی زہر مار کریں۔ مسلسل ملاقاتوں کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے رہے۔ مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ لاغر انسان مجھ پر ایسا جادو کر دے گا کہ میں اُسے باپو، لیڈر اور اپنا سب کچھ سمجھنے لگوں گی۔

مسز نائیڈو بلبلِ ہند بن کر عدم تشدد اور ترک موالات کا ترانہ الاپنے لگیں اور سیاست ہی ان کی شاعری بن گئی۔

نوٹ:۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں پہلی بار جب وہ اعظم گڑھ آئی تھیں تو انھوں نے اپنی جادو بیانی کا آغاز اس شعر سے کیا تھا:

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

۴۔ شریمتی وجے لکشمی پنڈت نے اپنی چار سالہ بیٹی نین تارا کو سمجھا دیا تھا کہ پھولوں کی مالا باپو جی کو دینا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ تو بہت ہی بدصورت ہیں میں انھیں نہ دوں گی۔ اس نے پھولوں کو اپنی مٹھی میں دبا لیا اور اپنی بھنووں کو سکیڑتے ہوئے گاندھی جی کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے اس کے گالوں پر تھپکی دی اور کہا کہ اس کے تیور اس بات کے غماز ہیں کہ یہ ایمانداری کا ایک پیکر بنے گی۔ تارا اپنے والد کے پاس چلی گئی اور ان سے کہا کہ میں اب کبھی بھی گاندھی جی کی دعائیہ میٹنگ میں شرکت نہ کروں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ چھوٹی بچی بڑھ کر جب مسز سہگل بن گئی تو بدہیئت باپو جی کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

۵۔ ٹی۔ ایس۔ راجن جو مہاتما گاندھی کے ایک گونہ مرید تھے انھوں نے لکھا ہے کہ خدا کے بندے کبھی بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کو خود آشکار کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ سبق جو میں نے انسانیت کے پیکر اور جنوبی افریقہ کے بیرسٹر مسٹر گاندھی سے سیکھا۔

مجاہدینِ آزادی میں جو حیثیت ملک چین میں سن یات سین کی، جنوبی امریکہ میں بولیور ساممن کی اور شمالی امریکہ میں جارج واشنگٹن کی ہے وہی حیثیت بھارت کو برٹش سامراج سے آزادی دلانے میں مہاتما گاندھی کی ہے۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب مہاتما گاندھی گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے اور اس کی خبر امریکیوں نے ریڈیو پر سنی تو ہر ایک کی زبان سے یہی الفاظ نکلے کہ ابراہم لنکن ثانی کا قتل ہو گیا۔

سید شانِ معراج
تازین محل شاہجہانپور

سالِ نو*

سالِ نو کی آمد پر پھر امیدِ نو جاگی
زندگی عزائم کے نئے بال و پر آئی
پھر تھکن سے جاگ اٹھے زندگی کے متوالے
بازوؤں میں اک تازہ حرکتِ سفر آئی

پھر عمل کی راہوں پر پاؤں کارفرما ہیں
اور اس طرح ہم کو کتنی دور جانا ہے
اک طویل منزل ہے عمر کی مگر یارو!
موڑ موڑ پر ہم کو زور آزمانا ہے

تاکہ شل نہ ہو جائیں عزم کے قدم یکسر
زندگی کہیں تھک کر موت میں نہ ڈھل جائے
عزم اور بھروسے میں آنہ جائے پسپائی
زندگی حقائق کی آگ میں نہ جل جائے

سالِ نو تو وقفہ ہے مڑ کے غور کرنے کا
کتنی دور چل آئے کتنی دور جانا ہے
آؤ اک ذرا رک کر راستے بھی طے کرلیں
ہم کو ہر بلندی پر آشیاں بنانا ہے

مہدی پرتاب گڑھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینیر
اریگیشن ڈویژن پرتاب گڑھ

باغ جمہور پر بہار آئی

کھیت کھلیان مسکراتے ہیں
جال نہروں کے بچھتے جاتے ہیں
پھول محنت کے گنگناتے ہیں
باغِ جمہور پر بہار آئی

جل گئے صلح و آشتی کے دیے
ہر طرف علم و آگہی کے دیے
آدمیت کے، دوستی کے دیے
باغِ جمہور پر بہار آئی

جام چھلکے شعورِ محنت کے
امن و اخلاص کے محبت کے
در ہوے باز حسنِ راحت کے
باغِ جمہور پر بہار آئی

ایک آہنگ پر اٹھے ہیں قدم
نئی تاریخ ہو رہی ہے رقم
ہے بلندی پہ زیست کا پرچم
باغِ جمہور پر بہار آئی

درسگاہوں میں بن رہی ہے حیات
حسنِ تعبیر چھیڑے ہے نغمات
سب یہ جمہوریت کی ہے سوغات
باغِ جمہور پر بہار آئی

بن رہے ہیں ہزار منصوبے
قوم اور ملک کی ترقی کے
گونجتے ہیں حیات کے نغمے
باغِ جمہور پر بہار آئی

ہر طرف ہے وطن میں خوشحالی
بجتی ہے بانسری محبت کی
ہے فضاؤں میں نور رنگ جیتی
باغِ جمہور پر بہار آئی

حیات وارثی
باغ انوار لکھنؤ

جمہوریت

کاروانِ عزم، احساسِ خودی جمہوریت
بزمِ ہستی کے لیے ہے زندگی جمہوریت

قومیت اک قافلہ ہے جس کی منزل ملک ہے
رہنمائی کے لیے ہے روشنی جمہوریت

ہو یہ اک آئینِ وحدت، اور تنظیمِ حیات
چاند ہے جمہور اس کا چاندنی جمہوریت

یہ دلاتی ہے ہر اک انساں کو جینے کے حقوق
زندگی کے واسطے ہے، زندگی جمہوریت

سربلندی، سرفرازی اس کا ہے پہلا اصول
آدمیت کا نشانِ آگہی جمہوریت

اس کی محفل میں برابر رائے ہر انسان کی
ایکتا کا گیت، ربطِ باہمی جمہوریت

اے حیاتِ وارثی سب کو ہے اس کا اعتراف
ساری دنیا میں مثالی ہند کی جمہوریت

ساغر اعظمی
بارہ بنکی

غزل

اب تو ہمارے گھر کا یہ ماحول ہو گیا
رشتوں کا احترام بھی لفظوں میں کھو گیا

اک راہ گیر پاس سے رخصت تو ہو گیا
لیکن تمام جسم میں کانٹے چبھو گیا

احساس کی فضا میں غزل لکھ رہا تھا میں
ہر شعر میرے عہد کا آئینہ ہو گیا

بس اک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کے سو گیا

یہ اور بات گرد بھی اڑنے لگی مگر
گھر سے مرے ہواؤں کا رشتہ تو ہو گیا

اب کچھ نہیں بچا ہے تری یاد کے سوا
جو کچھ بچا تھا اب کے سفر میں وہ کھو گیا

معصومیت کا اس کی اڑاتے تھے سب مذاق
جب پہلی بار گاؤں سے وہ شہر کو گیا

یہ اور بات اب کے نہ بادل برس سکا
لیکن تمام شہر کی پلکیں بھگو گیا

زندہ تھے ہم تو ان کے لیے بھی تھے بے وفا
ساغرؔ اب اپنے سر سے یہ الزام تو گیا

ڈاکٹر سلام سندیلوی

بھگوتی پرشاد ریحان گورکھپوری کے بارہ ماسے

بارہ ماسہ ایک صنفِ سخن ہے جس میں ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں دردِ ہجر کی داستان سناتی ہے اور ہر مہینے میں اس کے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے اس کا ذکر کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے ملاقات کی تمنا بھی ظاہر کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں سوز و گداز کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ کیونکہ دردِ ہجر کا بیان ایک عورت کی طرف سے ہوتا ہے جس کا دل موم سے زیادہ نرم اور آئینے سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سنسکرت میں بارہ ماسے کا رواج باقاعدہ نہیں رہا ہے لیکن اس میں چھ موسموں کا ذکر ملتا ہے۔ چونکہ ہندستان میں ہر موسم دو ماہ پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے جب چھ موسموں کا ذکر کیا جاتا ہے تو بارہ مہینوں کی کیفیات کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ کالیداس نے اپنی تصنیف "رت سنہار" میں چھ موسموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس میں گرمی، برسات، سردی، ہیمنت، ششیر اور بسنت کی کیفیات کی عکاسی کی ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں دو مہینوں کی جغرافیائی کیفیت تقریباً یکساں رہتی ہے مثلاً ساون، بھادوں برسات کے مہینے، کنوار، کاتک گلابی جاڑے کے مہینے، اگہن، پوس سخت سردی کے مہینے، ماگھ، پھاگن کھلتی سردی کے مہینے، چیت، بیساکھ ہلکی گرمی کے مہینے اور جیٹھ، اساڑھ سخت گرمی کے مہینے ہیں۔ ان مہینوں کی کیفیات کا ذکر کالیداس نے کیا ہے۔

ہندی کے اپ بھرنش کال میں بارہ ماسوں کی بھی تخلیق کی گئی ہے۔ چنانچہ ونے چندر سود شاعر نے "نیم ناتھ چتشپادکا" (नेमिनाथ चतुष्पादिका) میں ایک حسین بارہ ماسہ نظم کیا ہے۔ اس بارہ ماسے میں شاعر نے راج متی کے جذبات کی ترجمانی کی ہے جو نیم ناتھ کے ہجر میں تڑپ رہی ہے۔ راج متی کی شادی نیم ناتھ سے طے تھی مگر اس کے بعد نیم ناتھ نے گرنار پہاڑ پر تپسیا شروع کر دی اور راج متی اس کے فراق میں سلگتی رہی۔ اس بارہ ماسے میں شاعر نے ساون سے اساڑھ تک بارہ مہینوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر مہینے میں راج متی کے جذبات کی عکاسی بھی کی ہے[2]۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہندی میں پہلا بارہ ماسا ہے۔ ونے چندر سور کے بعد اپ بھرنش کال میں شاہ برکت اللہ صوفی نے "پیم پرکاشن" کے نام سے ایک بارہ ماسا لکھا ہے[3]۔

ویرگاتھا کال میں بھی بارہ ماسے کی تخلیق کی گئی ہے۔ نرپت نال نے "وشال دیو راسو" میں راج متی اور بیسل دیو کی محبت کا ذکر کیا ہے۔ راج متی دھار (مالوہ) کے راجا بھوج پرمار کی بیٹی تھی، اور بیسل دیو اجمیر کا راجا تھا۔ ایک بار راج متی سے ناخوش ہو کر بیسل دیو اڑیسہ چلا گیا۔ راج متی نے بارہ سال ہجر کے صدمات برداشت کیے۔ نرپت نال نے راج متی کے دردِ فراق کو بارہ ماسے کی صورت میں پیش کیا ہے[4]۔

بھگتی کال میں بھی بارہ ماسے کی تخلیق کی گئی ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ "ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسا وہ ہے جو کبیر کی طرف منسوب ہے۔[۳] اس کے بعد پروفیسر محمود شیرانی نے کبیر کے بارہ ماسے کا پہلا بند نقل کیا ہے۔ مگر یہ مگہر والے کبیر کا بارہ ماسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اور کبیر اس بارہ ماسے کا مصنف ہو۔[۴] اس کے علاوہ یہ ہندی کا پہلا بارہ ماسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اب بھرنش کال اور ویرگاتھا کال کو ہندی ساہتیہ میں شمار کیا گیا ہے اور ان دونوں ادوار میں بارہ ماسوں کی تخلیق کی گئی ہے۔

بھگتی کال میں ملک محمد جائسی نے پدماوت میں ایک بارہ ماسا نظم کیا ہے۔ رتن سین کے فراق میں ناگ متی اشک باری کرتی ہے اور مختلف مہینوں میں اپنے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ چنانچہ اساڑھ، ساون، بھادوں، کنوار، کاتک، اگہن، پوس، ماگھ پھاگن، چیت، بیساکھ اور جیٹھ کے مہینوں میں ناگ متی کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا ذکر ملک محمد جائسی نے نہایت پرسوز انداز میں کیا ہے۔[۵]

بھگتی کال کے شاعر نند داس نے "ورہ منجری" میں ایک بارہ ماسہ نظم کیا ہے۔ ایک برج ناری کرشن جی کے ہجر میں تڑپ رہی ہے اور مختلف مہینوں میں اس کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا بیان شاعر نے پیش کیا ہے اس نے چاند کو قاصد بنا کر کرشن جی کے پاس روانہ کیا ہے اور اپنے دل کا حال ان تک پہنچایا ہے[۶]

ہندی ادب میں بھگتی کال کے بعد ریت کال کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو میں ریت کال وہ عہد ہے جب ہندوستان میں اکبر کی حکومت قائم تھی، اس دور میں اردو میں بھی بارہ ماسے کہے گئے ہیں۔ چنانچہ سب سے مشہور بارہ ماسہ افضل پانی پتی (وفات ۱۶۲۵ء) کا ہے جس کا نام "بکٹ کہانی" ہے۔ افضل کے علاوہ دیگر شعراء نے بھی بارہ ماسوں کی تخلیق کی ہے۔ جن کا ذکر محمد ذکی الحق نے اپنی تصنیف "ذکر و مطالعہ" میں کیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق اردو میں احقر، تسلیمن، رسال، قائم، آیت اللہ جوہری، کاظم علی جوان، مقصود، خیرآ شاہ، وہاب، بینی مادھو، بندرا بن داس، عبداللہ انصاری، میر بہادر علی وحشت، دین سنگھ، سید محمد یٰسین احمد، سید محمد عبداللہ علم، ڈوری لال اور اللہ بخش وغیرہ نے بارہ ماسے کہے ہیں۔[۹]

"بکٹ کہانی" کے مرتبین کا قول ہے کہ احقر نے کوئی بارہ ماسا نہیں کہا ہے۔ بکٹ کہانی میں ایک مصرعہ یوں ہے "خموش احقر ازیں مشکل کہانی"۔ اس مصرعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ احقر نے بھی کوئی بارہ ماسا کہا ہے مگر بکٹ کہانی کے مرتبین نے لکھا ہے کہ یہ مصرع اس طرح درست ہے "خموش افضل ازیں مشکل کہانی"[۱۰] اس لحاظ سے افضل ہی کے بارہ ماسے کو کچھ لوگوں نے احقر کا بارہ ماسہ تصور کر لیا ہے۔ جو غلط ہے۔

ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے مقصود لکھنوی کے بارہ ماسے کو "برہ کی کہانی" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس طرح مقصود لکھنوی کا اصل بارہ ماسا ہمارے سامنے آگیا ہے۔ بارہ ماسا ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

ان بارہ ماسوں کے علاوہ ایک اور بارہ ماسا موجود ہے جس کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے، منشی بھگوتی پرشاد ریحان گورکھپوری نے بھی ایک بارہ ماسا کہا ہے جس کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جاتا ہے۔

منشی بھگوتی پرشاد کا تخلص ریحان ہے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں محلہ شیخ پور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کالی پرشاد کے بیٹے تھے۔ انھوں نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد مشن اسکول گورکھپور میں مدرس ہو گئے آخر میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی اور وکالت کرنے لگے، ان کا انتقال سنہ ۱۹۶۰ء میں ہو گیا۔

ریحان گورکھپوری حضرت تسنیم خیرآبادی کے شاگرد تھے انھوں نے غزل گوئی کی طرف توجہ کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک بارہ ماسا بھی کہا ہے جو صلح پریس گورکھپور سے شائع ہوا۔ یہ بارہ ماسا جناب محمد حامد علی صاحب سابق میونسپل کمشنر، سا

محلہ قاضی پور خرد گورکھپور کی لائبریری "گل فشاں" میں موجود و محفوظ ہے۔

ریحان گورکھپوری کا بارہ ماسا ایک نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتا ہے عام طور سے جو بارہ ماسا کہا جاتا ہے اس میں ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کی جدائی کے صدمات کا ذکر کرتی ہے اور ہر مہینے میں اس کے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے اس کو بیان کرتی ہے۔ مگر ریحان نے خود کو ایک مہجور عورت تصور کیا ہے اور عاشق خدا کو قرار دیا ہے۔ خدا کی فرقت میں اس عورت کے دل پر ہر ماہ میں جو گزرتی ہے اس کا بیان وہ دلدوز انداز میں اپنی سکھی سے کرتی ہے۔ اردو میں یہ بارہ ماسا اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ جس میں خدا عاشق قرار دیا گیا ہے۔ اس سے قبل بھگتی کال میں نند داس نے "ورہ منجری" میں سری کرشن جی کو عاشق قرار دیا تھا۔ اور بارہ مہینوں کی کیفیات تک کا اظہار کیا تھا مگر اردو میں ریحان کا یہ بارہ ماسا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا درجہ رکھتا ہے۔

ریحان گورکھپوری نے اپنے بارہ ماسے کی ابتدا میں حمد بہ عنوان "سری گنیش انیمہ" نظم کی ہے اور خدا کی تعریف میں اشعار کہے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

کری بیشک سزا وار ثنا ہے ۔۔۔ ضیا جس کی سمک سے تا سما ہے
بیاں کیونکر ہو اس کی کبریائی ۔۔۔ کہ جس نے صورت انساں بنائی
کیا عالم کو لفظ کُن سے پیدا ۔۔۔ زمین و آسماں ثابت سیارہ
دکھا کر جلوۂ رخسار تاباں ۔۔۔ بنایا طور پر موسیٰ کو حیراں
اسی کی ذات کو دائم بقا ہے ۔۔۔ سوا اس کے ہر اک شے کو فنا ہے

حمد کے بعد ریحان نے "مناجات" پیش کی ہے اور اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ خدا بذات خود رام اور کرشن کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے انھوں نے رام اور کرشن کی تعریف کی ہے ؎

ثنا ہے یہی ہر صبح ہر شام ۔۔۔ زباں سے لوں میں ہر دم رام کا نام
کنھیا تھا تو ہی اور تھا تو ہی رام ۔۔۔ تو ہی تھا گوپیوں کا بھی دل آرام
تو ہی سیتا کے دل کا ارمان تھا ۔۔۔ عزیز راجہ دسرتھ کا بھی جان تھا

ریحان نے ایک عنوان "تقصیر مصنف" قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بربنائے انکساری اپنی کم علمی کا ذکر کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے اپنے بارہ ماسے کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

فراق یار میں گزرا جو مجھ پر ۔۔۔ لکھا ہے پیش وکم سب حال کھر
جدا ہر رنگ سے اپنا بیاں ہے ۔۔۔ حقیقت معرفت کی داستاں ہے

دوسرے شعر میں ریحان صاحب نے واضح طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ حقیقت و معرفت کی داستان ہے اس لیے ان کا بارہ ماسا عام بارہ ماسوں سے جدا ہے۔ اس کے بعد ریحان نے پہلے ماہ اساڑھ میں جو مہجور عورت کی حالت ہوئی ہے۔ اس کا بیان پیش کیا ہے۔ ہجر زدہ عورت اپنی سکھی سے مخاطب ہے۔ ؎

اساڑھ آیا پیا آئے نہیں گھر ۔۔۔ غم دوری سے دل اپنا ہے مضطر
سکھی برسات کا موسم ہے آیا ۔۔۔ فلک پر ہر طرف بادل ہے چھایا
گرجتا ہے کڑک کر جب کہ بادل ۔۔۔ میں تنہائی سے ہو جاتی ہوں بیکل
جدھر دیکھو ادھر چھائی گھٹا ہے ۔۔۔ مجھے تو یہ گھٹا کالی بلا ہے
مری تقدیر میں غم کے ہیں صدمات ۔۔۔ تڑپ کر میں بسر کرتی ہوں دن رات
بتا کوئل تجھے یہ کس کا غم ہے ۔۔۔ ترا نالہ ہے یا تیر ستم ہے
پیا پردیس سے آئے نہ پھر کر ۔۔۔ نہ کام آیا کوئی جادو نہ منتر
کبھی عامل کبھی پنڈت بلایا ۔۔۔ کبھی کچھ نقش کچھ منتر لکھایا
کبھی ٹونا کبھی جادو جگایا ۔۔۔ کبھی سرسوں پہ کچھ افسوں پھنکایا

ان اشعار میں کئی خصوصیات ہیں۔ اول تو ریحان نے اس موقع پر برسات کی منظر کشی کی ہے۔ جو بہت حسین اور فطری ہے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک فرقت زدہ عورت کے جذبات کی بھی عکاسی کی ہے۔ ریحان نے اپنے بیان میں ہندوستانی ماحول کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ فرقت زدہ عورت نے عامل اور پنڈت کو بلایا ہے۔ اور ان لوگوں سے پوچھا ہے کہ عاشق سے ملاقات کب ہوگی۔ اس نے نقش اور منتر بھی لکھائے ہیں، ٹونا اور جادو بھی جگایا ہے اور سرسوں پر افسوں بھی پھنکایا ہے۔ ان ساری باتوں پر ہندوستانی عورتوں کا

عقیدہ ہوتا ہے اور وہ ان پر عمل کرتی ہیں، یہ بیان بہت فطری ہے۔
اس کے بعد ریحان نے ساون کے مہینے میں فرقت زدہ عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

چڑھا برسوں سے ساون کا مہینہ — سکھی اب ہے بہت دشوار جینا
مرا پیتم جواں ہے سیدھا سادا — کسی سوتن نے ہوشاید نہ پھانا
میں جھولوں اے سکھی کیونکر ہنڈولا — مرے ٹکڑے کا ہے کچھ اور ڈولا
سکھی اپنے پیا سے مل کے دن رات — بسر کرتی ہیں خوش ہو ہو کے اوقات
کسی کے ہاتھ میں مہندی رچی ہے — کسی کے لب پہ مستی کی دھڑی ہے
کوئی عیش و خوشی سے گھر کے اندر — سناتی ہیں پیا کو راگ گا کر
کہار و رو کے میں نے ناگ بابا — بدل دیں آپ گر یہ بھاگ بابا
پلاؤں گی کٹھیں میں دودھ لا کر — تکلف سے نئے کوزے میں بھر کر
کروں ہر دم نہ کیوں میں آہ و زاری — لگا ہے دل پہ میرے زخم کاری
طبیعت ہجر سے گھبرا رہی ہے — گھٹا بن کر شب غم چھا رہی ہے

ریحان نے ساون کی اذیت کا بھی بیان پیش کیا ہے۔ ہجر زدہ عورت جھولا کیسے جھول سکتی ہے؟ جب اس کا پیتم اس سے جدا ہے۔ اس کو یہی صدمہ ہے کہ جو عورتیں اپنے شوہروں یا عاشقوں کے ساتھ رہتی ہیں ان کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے اور ہونٹوں پر مستی لگی ہے وہ ان کو گھر کے اندر راگ گا کر سناتی ہیں مگر وہ ان خوشیوں سے محروم ہے۔ ساون کے بیان ہی میں ہندستانی ماحول جلوہ گر ہے۔ ہندستان میں "سوتیا ڈاہ" مشہور ہے۔ اس عورت کا خیال ہے کہ اس کے سیدھے سادے پیتم کو کسی سوتن نے پھانس لیا ہے۔ وہ عورت ناگ کو دودھ پلانے کے لیے تیار ہے اگر وہ اس کو اس کے عاشق سے ملا دے۔ یہ خالص ہندستانی تصور ہے۔ ریحان نے پھر بھادوں کے مہینے کا ذکر کیا ہے اور اس ماہ میں جو ایک فرقت زدہ عورت کی کیفیت ہو سکتی ہے۔ اس کی عکاسی کی ہے۔ ریحان کہتے ہیں ؎

اندھیری رین ہے بھادوں کی مشہور — میں ہوں آہ خوشی دلبر سے مہجور
جھڑی برسات کی ہر دم ہے جاری — اندھیری رات ہو کیونکر نہ بھاری
چمک جاتی ہے جب بجلی فلک پر — تڑپ جاتی ہوں دل پہ ہاتھ رکھ کر

شب فرقت کٹے گی آہ کیوں کر — ملے گا کس طرح وہ میرا دلبر
سکھی خوش ہو کے گاتی ہیں ملہاریں — ہماری تو لٹیں ساری بہاریں
لباس خوشنما سکھیاں پہن کر — جوانی کی امنگوں میں ابھر کر
خوشی کرتی ہیں مل کر دل ربا سے — مزا لیتی ہیں بھادوں کی گھٹا سے
مبارک ہو کسی کو وصل دلبر — ہمیں تو زندگی اپنی ہے دوبھر
صنم میرا تو مجھ سے بے خبر ہے — بتا اے آہ تو کیوں بے اثر ہے

ریحان نے مندرجہ بالا اشعار میں برسات کا حسین منظر پیش کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ بھادوں کی اندھیری رات بہت خوفناک ہے۔ برسات کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ آسمان پر بجلی چمک رہی ہے۔ یہ سارے مناظر بہت فطری ہیں اس کے علاوہ جو عورتیں اپنے عاشقوں کے ساتھ ہیں وہ ملہاریں گا رہی ہیں اور وہ اچھے لباس زیب تن کیے ہیں، ایسی برسات میں ایک عورت اپنے عاشق سے جدا ہے۔ اور درد ہجر سے تڑپ رہی ہے۔
اس کے بعد چوتھا مہینہ کنوار کا آیا۔ کنوار کے مہینے میں بھی اس عورت پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ کہتی ہے ؎

کنوار آیا سکھی برسات گزری — کہیں کیا ہم کہ کیوں کر رات گزری
کیا نوراتا کا مندر میں پوجا — ہوئی دیبی کی بھی مجھ پر نہ کرپا
مجھے بردان گر دیبی سے ملتا — خوشی سے دل مرا ہاتھوں اچھلتا
جو پی کے اپنے درشن دیکھ پاتی — بڑے سامان سے پوجا چڑھاتی
ہمیں بھولا ہوا ہے شیام سندر — پھنسا سوتن کے پھندے میں مکرر
دسہرے کی خوشی میں کیا خوشی ہے — حسینوں میں پڑی اک کھلبلی ہے
پہن پاؤں میں پازیب و خلخال — قیامت چال ہے جس کے ہو پامال
کوئی رتھ پہ کوئی پیدل کوئی ساتھ — کوئی دے کر پیا کے ہاتھ میں ہاتھ
لباس فاخرہ بھی زیب تن کر — تماشے کو چلیں گھر سے نکل کر
سکھی سب دیکھنے جاتی ہیں لیلا — بدل کر آج جوڑا لال پیلا

کنوار کے بیان میں بھی ہندستانی عناصر جلوہ گر ہیں۔ اس عورت نے مندر میں نوراتا کی پوجا کی مگر پھر بھی دیوی کی نگاہ کرم اس پر نہیں ہوئی۔ اور اس کا عاشق اس کے پاس نہیں آیا۔ اس عورت کو دوبارہ خیال کہ شاید اس کا شیام سندر سوتن کے پھندے

میں گرفتار ہوگیا ہے۔ ریحآن نے اس حصّے میں دسہرے کا بھی ذکر کیا ہے۔ عورتیں کپڑے بدل کر اور پازیب اور خلخال پہن کر رام لیلا دیکھنے جا رہی ہیں، کوئی رتھ پر سوار ہے کوئی پیدل ہے۔ کوئی اپنے پیا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چل رہی ہے۔ یہ ساری عورتیں رام لیلا دیکھنے جا رہی ہیں مگر اس کا عاشق اس سے دور ہے، اس لیے وہ رام لیلا کس کے ساتھ دیکھنے جائے! ان اشعار میں بڑی حد تک جذبات کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔

کنوار کا مہینہ گزر گیا، اس کے بعد کاتک کا مہینہ آیا اور جاڑے کے موسم کا آغاز ہوگیا مگر اس عورت کا عاشق اب تک اس کے گھر نہیں آیا۔ کاتک کے مہینے میں اس فرقت زدہ عورت کو جو مصائب برداشت کرنا پڑے اس کا ذکر ریحآن یوں کرتے ہیں ؎

چڑھا کاتک ہوا جاڑے کا آغاز   نہ آیا دلبر دلبر دغا باز
نہائی روز جمنا میں جا کر   چڑھایا پھول بھی دیوتا پہ اکثر
سکھی کرتی ہیں سب گھر کی صفائی   مرے گھر گرد غم کی ہے چڑھائی
کہیں پر جھاڑ شیشے کے ٹنگے ہیں   کہیں پر فرش مخمل کے بچھے ہیں
گلی کوچے میں پھیلی روشنی ہے   خوشی کیا لکشمی جی کی مچی ہے
پیا کے ساتھ میں بازی لگا کر   سکھی سب کھیلتی ہیں تاش و چوسر
پیا ملتے تو میں بازی لگاتی   جگر اور دل کو اپنے ہار جاتی!
سناؤں آہ میں کیسے دیوالی   مرا گھر تو مرے پی سے ہے خالی

اس بیان میں بھی ہندستانی عناصر شامل ہیں۔ ہجر کی ماری عورت جمنا میں جا کر نہاتی ہے اور دیوتا کو پھول چڑھاتی ہے۔ پھر بھی اس کے پریتم سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی ہے۔ اسی مہینے میں دیوالی کا تہوار آگیا ہے، لوگوں کے گھروں میں صفائی ہو رہی ہے ہیں شیشے کے جھاڑ لگے ہیں، کہیں مخمل کے فرش بچھے ہیں، گلی کوچوں میں روشنی ہو رہی ہے، سب لوگ تاش اور چوسر بازی لگا کر کھیلتے ہیں۔ مگر یہ عورت کس کے ساتھ جوا کھیلے۔ اس کا شوہر عاشق اس سے دور ہے۔

اب اگہن کی سردی پڑنے لگی ہے اور وہ عورت تنہائی میں کانپ رہی ہے۔ اگہن کے مہینے میں اس کی کیفیت کا ذکر ریحآن نے یوں کیا ہے ؎

ستاتی ہے مجھے اگہن کی سردی   رہوں میں بن پیا کیوں کر اکیلی
اگر اگہن میں بھی پریتم نہ آئے   رہوں گی میں یوں ہی دھونی رمائے
نہ آنکھوں سے مری آنسو تھمے گا   جگر بھی ساتھ دل کے بہ چلے گا
مری تقدیر میں ہے غم کا گہنا   میں پہنوں کس کی خاطر تن پہ گہنا
سناؤں کس کو پازیبوں کی جھنکار   کروں یوں خواب سے میں کس کو بیدار
مجھے زیور ہوا ہے تن پہ بھاری   کروں کب تک پیا کی انتظاری

وہ عورت اپنے عاشق کے فراق میں بے حد بے قرار ہے سردی کا موسم ہے۔ جاڑا اس کو بہت ستاتا ہے۔ اس کو آرائش و زیبائش بھی نا پسند ہے۔ وہ آخر گہنا کس کی خاطر پہنے اور پازیبوں کی جھنکار کس کو سنائے؟ یہ اشعار ایک مہجور عورت کے دلی جذبات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

اس کے بعد پوس کا مہینہ آگیا۔ اس مہینے میں اس عورت کا کیا حال ہے۔ ریحآن اس کا بیان یوں کرتے ہیں ؎

کہوں کیا پوس کے جاڑے کی حالت   ہلا دیتی ہے دل کو اس کی شدت
گذر جاتا ہے دن رو دھو کے اکثر   رہا کرتی ہوں میں راتوں کو مضطر
سبھی سکھیاں پیا کے ساتھ دن رات   مسرت سے بسر کرتی ہیں اوقات
کوئی ہے بادۂ گلگوں سے مسرور   شراب وصل سے کوئی ہے مخمور
کسی کے دل میں ہے کچھ اور ہی جوش   کوئی ہے نعرہ ہو حق سے مدہوش
کوئی ہے صحبت دلبر سے شاداں   مہیا گھر میں ہے عشرت کا ساماں
بغل میں یار ہو، ساغر میں بادہ   نہ ہو سردی کا پھر کچھ غم زیادہ
کیا جاڑے نے مجھ کو اس طرح تنگ   حواس و ہوش دونوں ہوگئے دنگ
کلیجا دونوں ہاتھوں سے دبائے   پڑی ہوں سیج پر آنسو بہائے
مری آنکھوں سے پنہاں ہوگیا خواب   خدا جانے کہاں پر سو گیا خواب
غم و اندوہ میں گزرا مہینا   سکھی بے لطف ہے بے یار جینا

ان اشعار میں ہجر کے سچے جذبات نظم کیے گئے ہیں۔ مثلاً اس عورت کا قول ہے کہ دن رو دھو کر گذر جاتا ہے مگر رات کو پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ زندگی کا لطف حاصل کرتی ہیں مگر وہ اس لطف سے

محروم ہے بلکہ وہ سینے پر کلیجا ہاتھ سے دبائے ہوئے ہے اور آنسو بہا رہی ہے۔

رفتہ رفتہ ماگھ کا مہینہ آگیا۔ اب یہ جاڑوں کا اختتام ہے مگر اس غم زدہ عورت کو اس مہینے میں بھی سکون حاصل نہیں ہوا۔ اس ماہ میں اس کی کیفیت یہ ہے ؎

مہینہ ماگھ کا آخر ہے سردی　　نہ آیا آج تک ساجن بے دردی
نگر میں سب سکھی کھچڑی پکائیں　　ادا و ناز سے سکھیں ملائیں
کوئی اپنی وفاداری پہ نازاں　　کوئی وصلِ صنم سے شاد و خنداں
ہمارا پی بھی گر ہوتا مکاں پر　　دماغ اپنا بھی ہوتا آسماں پر
سکھی حالت مری اب ہے بہت غیر　　سوا اس کے نظر آتا نہیں خیر
وصالِ یار کو جی ہے ترستا　　جگر بے تابیوں سے ہے تڑپتا
کہاں جا کر مرا جانی پڑا ہے　　ہر اک قصر و محل خالی پڑا ہے
مقامِ لامکاں ہے دور منزل　　پہنچنا اس جگہ ہے سخت مشکل
سکھی میں کیا کہوں کیا آرزو ہے　　مجھے تو اس صنم کی جستجو ہے
عیاں ہر شے میں ہے جس کا کرشمہ　　جدھر دیکھو ادھر ہے اس کا جلوہ
گلستانِ جہاں کا باغباں ہے　　گل و بلبل کے دل کا راز داں ہے
مہ و خورشید میں اس کی جھلک ہے　　اسی گل کی گلوں میں بھی مہک ہے
دو عالم جس پہ صدقے ہو رہا ہے　　صنم اپنا وہی نام خدا ہے
سکھی زیبا ہے اس کو سب بڑائی　　جہاں میں جس کی روشن ہے خدائی

ریحان نے ماگھ کے مہینے میں جو بیان پیش کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس عورت کا عاشق خدا ہے۔ ریحان نے پہلی بار ان اشعار میں مجاز کا پردہ ہٹایا ہے اور حقیقت کا رخ نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اس صنم کی منزل مقامِ لامکاں ہے۔ وہ گلستانِ جہاں کا باغباں ہے۔ اس کا کرشمہ ہر شے سے عیاں ہے۔ اس کا جلوہ ہر طرف نمایاں ہے۔ وہ گل و بلبل کے دل کا راز داں بھی ہے۔ اس کی جھلک مہ و خورشید میں ہے اور اس کی مہک گلوں میں موجود ہے۔ اس صنم کو ساری بڑائی زیب دیتی ہے اور اس کی خدائی سارے جہاں میں روشن ہے۔ یہ سارے بیانات اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اس فرقت زدہ عورت کا عاشق کوئی انسان نہیں ہے بلکہ خدا ہے، اس لیے یہ بارہ ماسا متصوفانہ ہے۔

جب پھاگن کا مہینہ آیا تو اس عورت کا دل اس وقت بھی ناشاد رہا۔ اس کے دل کی کیفیات کی عکاسی ریحان یوں کرتے ہیں ؎

سکھی پھاگن بھی لاگا ہائے بیداد　　پیا بن دل مرا ہوتا نہیں شاد
درختوں میں ہوئی کونپل نمودار　　جوانانِ چمن ہیں مست و سرشار
گلستاں میں چلی بادِ بہاری　　بہارِ نو نے کی ہے آبیاری
کہیں پھولوں میں ناز دل ربائی　　کہیں بلبل کو ہے نغمہ سرائی
انوکھا رنگ سکھیوں نے نکالا　　گلے میں ڈال کر گیندے کی مالا
کوئی پر زر پہن کر سرخ جوڑا　　کسی نے دوش پر زلفوں کو چھوڑا
عبیر و بکہ بھی ہاتھوں میں لے کر　　پیا پر ڈالتی ہیں شاد ہو کر
پیا پچکاریوں میں رنگ بھر کر　　سکھی کو تر بتر کرتے ہیں اکثر
اٹھاتی ہیں سکھی لطف جوانی　　میسر ہے بہار زندگانی
نہ پوچھو حیف مجھ بدبخت کا حال　　جوانی ہو رہی ہے مفت پامال
جدائی کی مصیبت جھیلتی ہوں　　جلا کر تن کو ہولی کھیلتی ہوں

ان اشعار میں کئی خوبیاں ہیں۔ ریحان نے ان اشعار میں پھاگن کے موسم کی عکاسی کی ہے۔ درختوں میں کونپل نمودار ہو رہی ہے۔ پودے مست و سرشار ہو رہے ہیں گلشن میں بہار کی ہوا چل رہی ہے کہیں شاخ پر بلبل نغمہ سرا ہے۔ پھاگن کے موسم کا صحیح اور حسین جلوہ ان اشعار میں نظر آتا ہے۔ اس مہینے میں ہولی کا تہوار بھی آیا ہے۔ سکھیاں گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈالے ہیں وہ سنہرے جوڑے پہنے ہیں۔ اپنے شوہروں پر عبیر چھڑکتی ہیں شوہر اپنی بیویوں پر پچکاریوں سے رنگ ڈالتے ہیں مگر اس عورت کو ہولی کا کوئی لطف حاصل نہیں ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ چیت کا مہینہ آگیا مگر اس عورت کا عاشق اس مہینے میں بھی اس کے گھر نہ آسکا اور وہ بے قرار رہی۔ ریحان کہتے ہیں ؎

سکھی موسم بہاریں چیت آیا　　پیا اس گل سا کچھ اب تک نہ پایا
پیا میرے گلے سے کب ملیں گے　　فسانۂ غم کا میرا کب سنیں گے

سہانا وقت ہے جوتن کو گئیم — نئی رت اور مجھ سے دور پیتم
میں ایسے وقت میں پی سے پڑی دور — ہوا ہے زخم غم سے دل میں ناسور
ہمارے رام ہیں صاحب نرنکار — دو عالم میں ہے جلوہ جن کا اظہار
وہ کیسا دیش اور کیسا نگر ہے — جہاں رہتا مرا رشکِ قمر ہے
کسی سوتن نے ہے اس کو لبھایا — مجھے جو اس طرح جوگن بنایا
سکھی لیکن یہ سب وہم و گماں ہے — مرے پی کا مکاں تو لامکاں ہے
کسی کا جب نہیں کچھ اس پہ قابو — چلائے گا کوئی کیا خاک جادو
ہر اک رازِ نہاں سے وہ ہے باہر — وہ مالک اور ہے ہر شے پہ قادر
بھرا ہے وہم میرے دل کے اندر — سکھی جادو کہاں اور کیسا منتر
ہمارا پی تو ہے سب سے نرالا — دو عالم میں ہے اس کا بول بالا

چونکہ اس بارہ ماسے کا تعلق معرفت سے ہے' اس لیے اس فرقت زدہ عورت کے عاشق رام ہیں جو خدا کے اوتار ہیں یا رام خدا کا روپ لے کر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ رام کی خصوصیات ریحاؔن یوں بیان کرتے ہیں کہ رام نرنکار ہیں یعنی ان کی کوئی شکل متعین نہیں ہے۔ ان کا جلوہ دونوں عالم میں آشکار ہے۔ اس عورت کو ایک بار خیال آیا کہ شاید کسی سوتن نے اس کے عاشق کو لبھا لیا ہو مگر پھر یہ سوچا کہ اس کا عاشق لامکاں ہے۔ اس تک کسی کی رسائی دشوار ہے۔ اس کے علاوہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ اس پر کسی کا قابو نہیں ہے۔ پھر وہ کسی سوتن کے قابو میں کیسے آسکتا ہے۔ اب یہ بیساکھ کا مہینا ہے۔ اس مہینے میں بھی وہ فرقت زدہ عورت بے قرار ہے۔ اسی کی بے قراری کا عالم ریحاؔن یوں پیش کرتے ہیں ؎

سکھی بیساکھ کا آیا مہینا — بہے گا سر سے ایڑی تک پسینا
نہائی سات دن گنگا میں جاکر — چڑھایا پھول بھی دیوتا کے اوپر
ملا لیکن نہ وہ پیتم پیارا — سکھی نکلا نہ کچھ ارماں ہمارا
تپش اور لو سے جاں ہے پریشاں — جدائی سے ہے دل سینے میں بریاں
کہوں کس سے میں اپنی بے قراری — پیا کی ہر گھڑی ہے انتظاری
پیا کی کھوج میں جوگن بنوں گی — نکل کر گھر سے میں ہر سو پھروں گی
کبھی صحرا کبھی جنگل میں رو کر — پہاڑ کی کبھی چوٹی پہ چڑھ کر
چلوں وحشت میں [illegible] — شبِ تاریک میں بن بن کے جگنو

پیا کیلاش پر شاید چلے کچھ — وہاں جاکر سکھی یہ غم ٹلے کچھ
جلا کر جسم کو آتش میں یکبار — غم دوری سے ہو جاؤں سبکسار
سراپا خاک ہو جاؤں میں جل کر — ملوں یوں یار سے صورت بدل کر

ان اشعار میں مقامیت بھی ملتی ہے۔ وہ عورت اپنے عاشق کو ہمالیہ اور کیلاش پہاڑوں پر تلاش کرنا چاہتی ہے۔ یہ پہاڑ ہندستان میں ہیں۔ ان اشعار سے بیساکھ کے مہینے پر بھی روشنی پڑتی ہے یعنی اس ماہ میں تپش ہے اور لو چل رہی ہے۔ بیساکھ میں بھی اس کی ملاقات اپنے عاشق سے نہیں ہوتی ہے۔ اب اس کے دل میں ایک خیال آرہا ہے۔ وہ ستی ہوجانے کے لیے تیار ہے۔ یہ ستی کی منزل وادیِ فنا ہے۔ وادیِ فنا میں پہنچ کر ایک صوفی ذاتِ باری سے واصل ہوجاتا ہے اور قطرہ دریا سے مل جاتا ہے۔

اب جیٹھ کا بارھواں مہینہ آگیا اور عورت کی ملاقات اپنے عاشق سے نہیں ہوئی ہے۔ ریحاؔن کا قول ہے ؎

چڑھا ہے تین دن سے اے سکھی جیٹھ — لگائے گا لگی میں اور بھی جیٹھ
ہوا آغوش یوں دلبر سے خالی — صدف ہو جس طرح گوہر سے خالی
محبت نے لگایا آہ کیا روگ — نظر آتا ہے مجھ کو سوگ ہی سوگ
تڑپنے میں کٹا بارہ مہینا — مجھے بھاتا نہیں اب ایسا جینا
فنا کے گھاٹ پر کشتی اڑی ہے — لبِ ساحل اجل میری کھڑی ہے
اجل تو ہی ذرہ وعدہ وفا کر — مجھے پہنچا دے اس کے آستاں پر
مکاں افلاک سے ہے جس کا بالا — ہر اک صورت سے صورت میں نرالا
نہ ہو شوقِ وصالِ یار کچھ کم — نکل جائے اسی کی یاد میں دم
تعلق جب چھٹے اس جسم و جاں سے — فنا ہو کر ملوں اس دلستاں سے
یہی ورد زباں اب ہر نفس ہے — بجز کھگوان کے باقی ہوس ہے

صنم کی ہو میسر گر حضوری
تمنا ہو دلِ ریحاؔن کی پوری

جیٹھ کے مہینے میں اس عورت کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ اب اس کی یہ خواہش ہے کہ اس کو موت آجائے اور جسم و جاں کا تعلق ختم ہو جائے تاکہ وہ فنا ہو کر اپنے محبوب سے ملاقات کر سکے۔ [illegible] تصوف کی آخری منزل ہے۔ اس منزل میں پہنچ کر صوفی خدا کی

ذات میں خود کو ضم کر دیتا ہے اور جزو اپنے کل میں شامل ہو جاتا ہے۔

بھگوتی پرشاد ریحان گورکھپوری کے بارہ ماسے کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس بارہ ماسے کی بحر وہی ہے جو افضل پانی پتی کے بارہ ماسے "بکٹ کہانی" کی ہے۔ دونوں بارہ ماسوں کا انداز بیان بہت کچھ ملتا جلتا ہے لیکن افضل کی "بکٹ کہانی" میں فارسی اشعار کا استعمال جا بجا نظر آتا ہے۔ ریحان نے فارسی اشعار استعمال نہیں کیے ہیں۔ اس کے علاوہ افضل نے پہلا مہینہ ساون کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے "بیانِ ماہِ اوّل ساون" مگر ریحان نے پہلا مہینہ اساڑھ کو تصور کیا ہے۔

ریحان کے بارہ ماسے کا تعلق تصوف و معرفت سے ہے۔ اگرچہ ریحان بذاتِ خود صوفی نہیں تھے۔ اس لیے ان کے یہاں تصوف کی مختلف منزلوں کا ذکر نہیں ہے۔ تصوف کے چار درجات شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی جھلک اس بارہ ماسے میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ عطار نے تصوف کی جن سات وادیوں یعنی وادیٔ طلب، وادیٔ عشق، وادیٔ معرفت، وادیٔ استغنا، وادیٔ توحید، وادیٔ حیرت اور وادیٔ فنا کا ذکر کیا ہے، ان میں سے صرف آخری یعنی فنا کا ذکر ملتا ہے۔ وہ مہجور عورت اپنے عاشق کی قربت میں ہستی ہو جانا چاہتی ہے۔ اس طرح فنا ہو کر ذاتِ حق میں ضم ہو جانے کی خواہش مند ہے۔

ریحان کے بارہ ماسے میں عورت اسی نوعیت کی ہے جس طرح عام طور سے بارہ ماسوں میں اس کا وجود ملتا ہے۔ مگر عاشق کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ ریحان نے اس مہجور عورت کا عاشق رام، بھگوان یا خدا کو قرار دیا ہے۔ ریحان کی نظر میں رام، بھگوان اور خدا ایک ہی ہیں۔

اس بارہ ماسے کا جائزہ ہم ایک اور نقطۂ نظر سے لے سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ عورت انسانی روح کی نمائندگی کرتی ہے۔ روزِ ازل روح ذاتِ حق سے جدا ہو گئی۔ اس لیے روح خدا کی فرقت میں تڑپ رہی ہے۔ اس کو ہندو فلسفہ کی روشنی میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آتما پرماتما سے جدا ہو گئی ہے اور اب آتما پرماتما سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔

ریحان کے بارہ ماسے میں زبان و بیان کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں ان کے بہت سے اشعار میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بتا کوئل مجھے یہ کس کا غم ہے　　ترا نالہ ہے یا تیرِ ستم ہے
طبیعت ہجر سے گھبرا رہی ہے　　گھٹا بن کر شبِ غم چھا رہی ہے
مری تقدیر میں ہے غم کا سہنا　　میں بہنوں کس کی خاطر یہ گہنا
کہاں جا کر مرا دالی پڑا ہے　　ہر اک قصر و محل خالی پڑا ہے
انوکھا رنگ سکھیوں نے نکالا　　گلے میں ڈال کر گیندوں کی مالا
سہانا وقت ہے خوش رنگ موسم　　نئی رت اور مجھ سے دور ہیں ہم

روانی کے علاوہ ریحان کے یہاں بعض اشعار میں حسنِ بیان بھی موجود ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

جنوں میں دشت میں ڈھونڈوں گی ہر سو
شبِ تاریک میں بن بن کے جگنو

وہ عورت عاشق کی تلاش جگنو بن کر شبِ تاریک میں کرنا چاہتی ہے۔ جگنو کا لفظ اس شعر کی معنویت میں اضافہ کر رہا ہے۔

ریحان کے یہاں کہیں کہیں حسین تشبیہات بھی نظر آتی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

ہوا آغوش یوں دلبر سے خالی
صدف ہو جس طرح گوہر سے خالی

ریحان نے آغوش کو صدف سے اور دلبر کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ بہت دلکش ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریحان کے بارہ ماسے میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن اس میں جا بجا خامیاں بھی نظر آتی ہیں جن کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جاتا ہے۔

ریحان نے واؤ عطف کا استعمال مناسب طریقے سے نہیں کیا ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان واؤ عطف کو ختم کر دیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

بھرے پانی سے سب دریا و نالے　　پیا اب گھر نہیں ہیں آنے والے

اس شعر میں دریا فارسی لفظ ہے اور نالا ہندی لفظ ہے دونوں کے درمیان واؤ عطف کا استعمال ناجائز ہے۔ یہی عیب مندرجہ ذیل شعر میں ہے ؎

کسی خدمت کو گر کہتا خوشی سے بجالاتی اسے میں جان و جی سے

جان فارسی لفظ ہے اور جی ہندی لفظ ہے۔ دونوں کے درمیان واؤ عطف ناجائز ہے۔

بعض جگہ ریحاؔن نے مشدد لفظ کو غیر مشدد کر دیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

کیا عالم کو لفظ کن سے پیدا زمین و آسمان، ثابت، سیارا

اصل لفظ سیارہ ہے، یعنی یائے مشدد ہونا چاہیے۔

ریحاؔن کے یہاں بہت سے الفاظ میں کوئی حرف تقطیع سے گر جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

غم و اندوہ و حرماں اور رونا
ہمارا ہے یہی اوڑھنا بچھونا

"اوڑھنا" لفظ میں "و" تقطیع سے گر جاتا ہے اور یہ لفظ اڑھنا رہ جاتا ہے۔

ریحاؔن کا مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

خطاؤں کو ہماری معاف کر دو
تجلی روئے روشن کی دکھا دو

"معاف" لفظ میں تقطیع کے وقت "ع" گر جاتا ہے اور یہ لفظ "ماف" رہ جاتا ہے۔ ریحاؔن کا مندرجہ ذیل شعر بھی قابلِ غور ہے ؎

جوانی کا نہیں کچھ رنج و غم ہے نہ ملنا یار کا زیادہ ستم ہے

"زیادہ" کی "ی" تقطیع سے خارج ہو جاتی ہے اور یہ لفظ "زادہ" پڑھا جاتا ہے۔

ریحاؔن نے کچھ الفاظ محاورے کے خلاف استعمال کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے

[illegible] رو رو کے آنکھیں لال پیلی
[illegible]

آنکھیں لال پیلی کرنے کا مفہوم ہے غصہ کرنا مگر ریحاؔن کے کہنے کا مقصد ہے کہ اس مہجور عورت کی آنکھیں فرقت میں سرخ ہو گئیں۔

ریحاؔن نے کہیں کہیں لفظ کا غلط استعمال کیا ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

ہر اک رازِ نہاں سے ہے وہ ماہر
وہ مالک اور ہے ہر شے پہ قادر

مصرعۂ اول میں "ماہر" کی جگہ پر "واقف" زیادہ مناسب ہے۔ کہیں کہیں شعر میں ریحاؔن نے غلط قافیہ نظم کر دیا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

لباسِ خوشنما سکھیاں پہن کر
جوانی کی امنگوں میں ابھر کر

اس شعر میں ریحاؔن نے "پہن" اور "ابھر" کا قافیہ باندھا ہے، جو غلط ہے۔

ریحاؔن نے بعض اشعار میں واحد و جمع کا صحیح استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہر اک سکھیاں سمجھ کر مجھ کو بھولی ہمارے ساتھ کرتی ہیں ٹھٹھولی

"ہر اک" کے ساتھ "سکھی" کا لفظ استعمال ہونا چاہیے اور اگر "سکھیاں" استعمال کرنا ضروری تھا تو "ہر اک" کی جگہ پر "ساری" "یا سب" کا لفظ استعمال کیا جاتا، تو درست تھا۔

کہیں کہیں ریحاؔن نے جمع الجمع استعمال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

خیالاتوں سے کب ہے کام چلتا
تسلی سے کہاں ہے دل بہلتا

"خیال" کی جمع "خیالات" اب "خیالات" کی جمع "خیالاتوں" بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ریحاؔن کے بعض اشعار میں تذکیر و تانیث کی بھی غلطی ملتی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں:

بچھائی سیج پہ چادر [illegible]
لگا کر چار سو پھولوں کا جھالر

لفظ "جھالر" مونث ہے۔

ریحاؔن کے بعض اشعار میں تنافرِ کلمات موجود ہے [illegible]

(باقی ص ۶۲ پر)

گنگا

جعفر ملیح آبادی
(بیلا ولا گیٹ، پو بٹیاں
لکھنؤ

یہ گنگا یہ روحِ روانِ وطن
چلی آ رہی ہے بصد آب و تاب
تھرکتی ہوئی گنگناتی ہوئی
چٹانوں پہ گر کر اچھلتی ہوئی
کبھی جنگلوں سے گزرتی ہوئی
کبھی ہے یہ میداں میں محوِ خرام
بہاروں سے دامن سجائے ہوئے
اسی کی بدولت تو ہیں بے گماں
یہ اشنان کی گھاٹ پر ایک دھوم
نہانے میں مصروف یہ مرد و زن
یہ نظارہ ہے کس قدر جاں فزا
یہ مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیاں
چھلکتے ہوئے اتقا کے سبو
یہ قدرت کا ہے تحفۂ بے نظیر
نہیں صرف ہندو کی راحت رساں
یہ ہے نوعِ انساں کی خدمت گزار
یہ میداں کی رانی، پہاڑوں کی حور
کہیں جنگلوں کو نکھارے ہے یہ
کہیں رنگ و بو کے خزانے لٹائے
چمن در چمن گل کھلاتی ہے یہ
یہ جنگل، یہ باغات، یہ گلستاں
کہیں برق کی رَو کو پیدا کرے
کرے کارخانوں کو دولت عطا
غرض ہے یہ صدیوں سے گرمِ سفر
یوں ہی سوئے منزل بہ عزمِ جواں
نہاں اس کی لہروں میں سازِ حیات

یہ شانِ ہمالہ، یہ جانِ وطن
بجاتی ستار و سرود و رباب
فضاؤں میں نغمے لٹاتی ہوئی
پھسلتی، سنبھلتی، مچلتی ہوئی
کبھی گھاٹیوں میں اترتی ہوئی
کہیں سست رَو ہے کہیں تیز گام
کناروں پہ جنت بسائے ہوئے
یہ صبحِ بنارس کی رنگینیاں
نگارانِ گل پیرہن کا ہجوم
دمکتے یہ مکھڑے، نکھرتے بدن
کھلا ہے لبِ آب گل زار سا
یہ مسجد سے آتی صدائے اذاں
تقدس برستا ہوا چار سو
ہیں سیراب اس سے فقیر و امیر
مسلمان پر بھی ہے یہ مہرباں
ہے ممنون اس کا ہر اک جاندار
رواں اس کی موجِ کرم دور دور
کہیں گلستاں کو سنوارے ہے یہ
کہیں کھیتیوں سے یہ فصلیں اگائے
درختوں کو دولھا بناتی ہے یہ
ہوے اس کے پانی کو پی کر جواں
اندھیرے گھروں میں اجالا کرے
مشینوں کو چلنے کی طاقت عطا
نہیں ایک لمحے کو تھکتی مگر
رواں ہے دواں ہے دواں ہے رواں
کیا فاش اس نے یہ رازِ حیات

نہ عیش و طرب اور نہ ہے غم کا نام
ہے یہ زندگی سعیِ پیہم کا نام

راجیندر بہادر موج
نئی گڑھ، یو پی

آذر بارہ بنکوی
محلہ کمرہ، امام باڑہ بارہ بنکی

غزلیں

نہیں خواہش مجھے ان کی طرف سے بھی پیام آئے
یہ عزت کون کم ہے ان کے دیوانوں میں نام آئے

عقیدت دل میں آنکھوں میں ادب جذبات پہرے پہ
تری محفل میں جب بھی آئے ہم با اہتمام آئے

حسیں صورت، حسیں آواز، یہ مہکی ہوئی زلفیں
انھیں میں کھو گئے صیاد ہم اور زیرِ دام آئے

تعلق اس قدر کیوں ہے پسِ ترکِ تعلق بھی
سب ان کو دیکھنے لگتے ہیں جب بھی میرا نام آئے

سفر تو ابتدا سے انتہا تک طول تھا لیکن
چلے ہم بارِ ہستی کو لیے اور تیز گام آئے

مرے اشعار کی اس سے زیادہ قدر کیا ہوگی
کہ ان کے لب پہ ان کے ساز پر میرا کلام آئے

تصور نے مرا غم خانۂ ہستی سجا ڈالا
مرے گزرے ہوئے لمحاتِ رنگیں کچھ تو کام آئے

میں خود کو بھول کر جب کھو گیا ہوں ان کے جلووں میں
مری راہِ طلب میں اکثر ایسے بھی مقام آئے

سفینہ موج ڈوبا جب بھی دریائے محبت میں
نہ کچھ تدبیر بن آئی نہ عقل و ہوش کام آئے

ہجومِ غم میں یقیناً ہیں کچھ ملال نئے
پڑے ہیں آئینۂ دل میں آج بال نئے

نگارِ خانۂ ماضی میں تو رہا روپوش
تری تلاش میں پھرتے رہے خیال نئے

مرے جواب کی ندرت پہ چونک جاؤ گے
مگر یہ شرط ہے تم بھی کرو سوال نئے

دلِ ملول کو کیا کام آرزوؤں سے؟
کہاں سے آ گئے صحرا میں یہ غزال نئے

غموں نے بعدِ مسرت مجھے نہ دی آواز
نحیف کاندھوں پہ پھر نہ بوجھ ڈال نئے

تلاشِ منزلِ نو ہے تو اے مرے فنکار
یہ شہرِ فن ہے یہاں راستے نکال نئے

مرا مزاج قدامت سے منحرف ہی سہی
تمھارے ذہن میں کیوں آ گئے سوال نئے

بدل چکی ہے زمانے کی ہر پرانی قدر
نئے سماج میں آذر صنم بھی ڈھال نئے

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
۳۲۸ زینہ کوٹ سری نگر کشمیر

کشمیر کے غیر مسلم ادیب

کشمیری پنڈت ہندوستان میں سب سے زیادہ بیدار مغز، مہذب و متمدن اور تعلیم یافتہ قوم مانی جاتی ہے۔ اس قوم میں چند ایسے افراد نے جنم لیا جن کے کارناموں پر ہندوستان ہمیشہ کے لیے سر افتخار بلند رکھ سکتا ہے۔ کلہن پہلا کشمیری پنڈت تھا جس نے سنسکرت میں راج ترنگنی تصنیف کرکے ہندوستانی تاریخ کو عزت و آبرو بخشی۔ پنڈت نرائن کول تخلص عاجز اور پنڈت بیربل کاچرو المتخلص بہ وارستہ نے فارسی میں تاریخ کشمیر مرتب کرکے مسلمان مورخین کی صف میں اپنا مقام حاصل کیا۔

مغلوں اور پٹھانوں کے دور حکومت میں سیاسی وجوہ کی بنا پر بعض کشمیری پنڈتوں کو نقل وطن کرکے ہندوستان کے مختلف شہروں لاہور، دہلی، لکھنؤ، کانپور اور الہ آباد وغیرہ میں منتشر ہونا پڑا، چونکہ یہ لوگ ذہین، قابل اور ہوشیار تھے اس لیے وطن سے ہجرت کرکے جہاں بھی آباد ہوئے وہاں اپنی انفرادیت، کلچر، ذہانت اور مختلف علوم و فنون کے جوہر دکھائے۔

کشمیری پنڈتوں نے ہر شعبۂ زندگی مثلاً قانون، ریاضی، انگریزی، علم نجوم، صحافت، سیاست، علم و ادب اور شعر و شاعری وغیرہ میں ہندوستان کے طول و عرض میں اپنا سکہ جما دیا۔ پنڈت موتی لال نہرو (متوفی ۱۹۳۱ء) نے ہندستان کی جنگ آزادی میں اپنوں اور غیروں سے اپنی سیاست کا لوہا منوایا۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ سیاست کے ساتھ ساتھ انھیں اردو زبان سے بھی دلچسپی تھی اور بڑے بڑے جلسوں میں ایسی صاف، شگفتہ اور ادبی زبان میں تقریریں کرتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ ہندوستان کے ایک بلند پایہ کشمیری قانون داں سر تیج بہادر سپرو نے جنوری ۱۹۰۳ء میں "کشمیر درپن" کے نام سے الہ آباد میں ایک اردو رسالہ جاری کیا۔ یہ پرچہ کشمیری پنڈتوں کی فلاح و بہبود کا آئینہ دار تھا۔ اور اس کے لکھنے والے بھی کشمیری پنڈت ہی ہوتے تھے۔ رسالہ کے شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۵ ضمیمہ مارچ ۱۹۰۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو کا وہ معرکہ آرا خطبۂ صدارت چھپا جو انھوں نے یو۔ پی انڈین نیشنل کانگرس کی پہلی صوبائی کانفرنس میں اردو میں پیش کیا تھا۔ یہ خطبہ ۲۱ صفحات میں تقریباً ۱۶ ہزار الفاظ پر مشتمل تھا۔ ذیل میں تبرکاً ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ زبان کی روانی اور فصاحت قابل داد ہے:-

> وہ کون سی بات ہے جو دو بھائیوں کو خوشی خوشی ملنے اور پیاری ماں کی خدمت کے لیے تیار ہونے سے مانع آتی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے حکام والا شان سے خوشنودی مزاج کے پروانے حاصل کیے جاویں۔ اور کچھ نہیں۔ اور جیسی جیسی ذلتیں کہ اس جد و جہد میں نصیب ہوتی ہیں اس کا حال کچھ چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے پوچھیے۔ اے میرے مسلمان دوستو! خدارا اپنے عنایت فرماؤں سے ہوشیار رہنا۔ گو دو چار اعلیٰ عہدے آپ کے ہم مذہبوں کو مل گئے تو کیا ہوا۔ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا

اس میں نفع نہیں ہے۔ بلکہ نقصان ہے۔ قومی ترقی کاری
عہدوں کے بھروسے نہیں ہو سکتی۔ اس کا رشتہ دو سرا ہے

چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تو نے تو کیا
غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس کی بے اعتباری دور ہو۔ اور دونوں جماعتوں کے لیڈر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کریں۔

پنڈت موتی لال نہرو کے مایۂ ناز سپوت پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان بھی اردو تھی۔ ان کے بارے میں عبد الرحمان طارق کا یہ شعر آج بھی کانوں میں گونجتا ہے ؎

کون کہتا ہے کہ نہرو کی زباں اردو نہیں
اور ان کی گفتگوئے خانداں اردو نہیں

اس شعر کی تائید اردو کے ممتاز ترین محقق جناب قاضی عبد الودود صاحب سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

" مسز کملا نہرو کے بھائی کول عرصے تک ان کے پڑوسی رہے ہیں۔ اور کول یہ کہتے تھے کہ ان کے گھروں میں عورتیں اردو کے سوا کوئی زبان جانتی ہی نہیں "

" کشمیر درپن " کے ایڈیٹر سر تیج بہادر سپرو اردو کے ایک بلند پایہ ادیب، ناقد اور نثر نگار تھے۔ ان کے مضامین، دیباچے اور تبصرے قابل ذکر ہیں۔ ان کی قابلیت اور مہارت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کی یک جہتی کے لیے اردو زبان کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ اور ناقابل تقسیم ترکہ قرار دیا تھا " اردو، ہندی، ہندوستانی " کے موضوع پر ان کا ایک پر مغز مقالہ اس امر کا آئینہ دار ہے کہ اردو سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ ۱۹۴۳ء میں فرماتے ہیں کہ:-

" کچھ عرصہ ہوا کہ ایک وصیت ایک ہندو صاحب نے ایک وکیل صاحب کی معرفت میرے پاس بھیجی میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا۔ ہندی میں لکھی ہوئی تھی۔ مشکل سے

فی صدی الفاظ میں نہیں سمجھ سکا۔ ایسے ایسے قانونی الفاظ سنسکرت کے اس میں لکھے گئے تھے جو میں نے اپنے اڑتالیس برس کے تجربے میں کبھی نہیں سنے تھے آخر کار جب اس کا ترجمہ انگریزی میں میرے سامنے پیش کیا گیا اس وقت میں قانونی رائے دے سکا۔ اب ایسی دستاویز کو میں کیا کہوں۔ اردو، ہندی، یا ہندستانی؟ "

سپرو صاحب نے " شاہکار انیس " مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی میں میر انیس کی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کی وسعت نظر کا ثبوت ہے کہتے ہیں:-

" میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی دوسرے مصنف نے ہمارے لیے انیس سے زیادہ گرانقدر خزانہ نہیں چھوڑا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ زبانِ اردو میں انسانی دماغ کے عمیق ترین خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بننے کی کس قدر اہلیت ہے۔ اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو میں کتنی استعداد اور صلاحیتیں موجود ہیں "

کشمیری پنڈتوں نے اردو زبان و ادب کی جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں وہ صفحۂ روزگار پر ہمیشہ کے لیے ثبت رہیں گی۔ ان کی بدولت ہی مراسلۂ کشمیر، کشمیر درپن، کشمیر پرکاش، اخبار عام، راوی، معیار، پبلک نیوز، خیر خواہ، مراۃ الہند، سفیر کشمیر، کشمیری پنڈت ایسوسی ایشن، بہار کشمیر لاہور، صبح کشمیر، مارتنڈ، دلکش، اور وکیل وغیرہ اخباروں اور رسالوں کی بدولت ریاست کشمیر میں اردو زبان کو فروغ دیا۔ ان میں سے مارتنڈ، جیوتی، وکیل اور دلکش اب تک جاری ہیں۔ یہ سب اخبار اردو میں چھپتے تھے اور چھپتے ہیں۔ مارتنڈ تو کشمیری پنڈتوں کا ترجمان ہے۔

کشمیری پنڈتوں نے فارسی کی طرح اردو میں بھی استادی حاصل کی ہے۔ اردو کے سوا یہ لوگ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے آج کل بھی کشمیر میں یہ زبان سب پنڈتوں کے گھروں میں

مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ بولی جاتی ہے۔ بعض پنڈتوں نے اپنی مہارت سے اردو نظم و نثر میں چار چاند لگا دیئے۔ اگر ان کے شعری محاسن کو پرکھنا ہو تو "بہارِ گلشن کشمیر" کی سیر کی جائے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں سے چشم پوشی کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ "بہارِ گلشن کشمیر" اردو اور فارسی کے جملہ تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ یہ دو جلدوں میں ۲۰×۲۶/۸ سائز میں تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور آج سے پورے پچاس سال پہلے اسے دو کشمیری پنڈتوں جگ موہن ناتھ رینہ تخلص شوق اور برج کشن کول بے خبر نے پنڈت نندلال کول طالب اور پنڈت دینا ناتھ مست وغیرہ کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں مرتب کر کے انڈین پریس الہ آباد سے شائع کیا تھا۔ یہ معرکہ آرا تذکرہ اب دستیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> کشمیری پنڈت اپنی صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستان میں آکر ان کے خوب جوہر کھلے ہیں۔ انہوں نے ملک کی تہذیب و شائستگی اور ادب کی ترقی میں قابل تعریف کام کیا ہے۔ گو ان کی تعداد کم ہے لیکن جس قابلیت اور کمال کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہیں صف اول میں نظر آتے ہیں۔ بہارِ گلشن کشمیر جس کا دوسرا نام تذکرۂ شعرائے کشمیری پنڈتان ہے ان کے ادبی کمال کے ثبوت میں کافی شہادت ہے۔ [4]

بہارِ گلشن کشمیر میں کشمیری پنڈتوں کے ۲۴۵ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ اس سے پہلے جن تذکروں میں کشمیری پنڈت شعرا کے حالات درج ہیں اور جن کے نام کے ساتھ لفظ "کشمیری" بھی صراحتاً درج ہے ان میں سے چند کتابیں درج ذیل ہیں۔ قوسین میں سال تصنیف بھی لکھا گیا ہے۔

نکات الشعراء از میر تقی میر (۵۲-۱۷۵۱ء) تذکرہ شعرائے ہندی میر حسن (۱۷۷۴ء) چمنستان الشعرائے شفیق (۱۷۶۳ء) گلزار ابراہیم (۱۷۸۳ء) عمدۂ منتخبہ سرور (۱۸۰۱ء) گلشن ہند (۱۸۰۱ء) مجموعۂ نغز، حکیم ابوالقاسم قدرت اللہ شوق (۱۸۰۶ء) ریاض الفصحا مصحفی (۲۰-۱۸۰۵ء) گلشن بے خار، شیفتہ (۳۴-۱۸۳۲ء) خوش معرکۂ زیبا، ناصر لکھنوی (۱۸۴۵ء) طبقات الشعرائے ہند مولوی کریم الدین (۱۸۴۸ء) سراپا سخن محسن (۱۸۵۲ء) گلستان سخن صابر دہلوی (۱۸۵۴ء) گلشن ہمیشہ بہار خوشگی (۱۸۵۴ء) اودھ کیٹلاگ از ڈاکٹر اشپرنگر (۱۸۵۴ء مطبوعہ کلکتہ) سخن شعرا، نساخ (۱۸۶۴ء) تذکرہ خمخانۂ جاوید از لالہ سری رام (مطبوعہ ۱۹۰۷ء)

جن کشمیری پنڈت ادیبوں نے اردو شعر و ادب میں قابل تعریف کارنامے انجام دے کر اپنے نقوش جاوداں چھوڑے ہیں ان میں سے چند کے مختصر حالات مع نمونۂ کلام ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

ابر

نام پنڈت کشن نرائن در تخلص ابر۔ ان کے والد بزرگوار پنڈت کشن نرائن در تھے۔ ابر یو۔ پی کے ضلع بارہ بنکی میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو و فارسی میں ہوئی تھی اس کے بعد لکھنؤ کیننگ کالج اور پھر آگرہ میں تعلیم حاصل کی ڈاکٹر تیج بہادر سپرو آگرہ کالج کے انگریزی پروفیسر مسٹر اینڈریوز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پروفیسر موصوف جو انگریزی کے عالم تھے کہا کرتے تھے کہ اگر اس صوبے میں کوئی شخص ایسی متبحر انگریزی لکھتا ہے کہ جس کی تحریر پر اہل زبان انگریز کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے تو وہ کشن نرائن در ہیں۔ [5]

ابر نے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آنے کے بعد مطالعۂ قانون محض تفنن طبع کے طور پر جاری رکھا نیز سیاسی اور سماجی کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۹۱۶ء میں ۵۲ برس کی عمر میں انتقال کیا

ابر اردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ علاوہ بریں فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ وہ ناقدانہ صلاحیتوں کے حامل اور صحت مند تنقید کے قائل تھے۔ ان کا ایک مضمون بعنوان تنقید

شعر و سخن" راقم کی نظر سے گزرا ہے لکھتے ہیں :-

" اس وقت کی اردو شاعری کا حال قابلِ افسوس ہے۔ بیسیوں گلدستے نکلتے ہیں۔ اکثر رسالوں اور اخباروں میں طرح طرح کی نظمیں چھپتی ہیں۔ مگر جس کا نام شاعری ہے اس کا کہیں پتہ نہیں۔ اگر آج کل کے مشاعروں میں جائیے تو اکثر اصحاب نظر آئیں گے جن کو بجائے خود دعویٰ استادی ہے۔ گو میرے واسطے یہ کہنا چھوٹا منھ بڑی بات ہے۔ مگر اس وقت کوئی استاد شاعر نظر نہیں آتا۔ لکھنؤ میں البتہ ایک دو اصحاب ہیں جو مرثیہ گوئی میں بہت لائق ہیں۔ اور اگر اردو شاعری بالفعل کچھ ہے تو وہ مرثیوں ہی میں ہے۔ گو اس میدان میں بھی ہر صورت سے انیس اور دبیر ہی گوئے سبقت لے گئے مگر پھر بھی میر نفیس مرحوم، حضرت رشید، مرزا اوج، پر اہل لکھنؤ کا ناز بجا ہے۔ مگر یہ سب حضرات بھی مقلد ہیں۔ کسی طرز شاعری کے موجد نہیں۔ اب غزل کو اگر دیکھیے تو یہاں کوسوں چٹ میدان پڑا ہوا ہے۔ خصوصاً داغ اور امیر جب سے چل بسے اس وقت سے تو بالکل ہو کا عالم ہے۔ برسوں میں کہیں کوئی اچھا شعر دیکھنے یا سننے میں آتا ہے:"

ابر شعرائے اردو میں انیس، دبیر اور آتش کا کلام بے حد پسند کرتے تھے۔ انیس کو تمام شعرا میں ممتاز سمجھتے تھے غزل میں میر کے علاوہ آتش اور داغ سے بھی متاثر تھے کہتے ہیں ؎

کیسے کیسے ہوئے اس ہند میں استاد اے ابر
میر و آتش سا مگر کوئی سخنداں نہ ہوا

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

داغ و امیر اپنے زمانے کے تھے استاد مگر
ابر آتش سا کوئی سحر بیاں دیکھا ہے

نمونۂ کلام:

اے کاشمیر تو چمن بے نظیر ہے ۔۔۔ شیدا ترا جوان کی صورت ہے پیر کی

تجھ پر ازل سے فضلِ خدائے کبیر ہے ۔۔۔ جس کو لگی ہے لو تری روشن ضمیر ہے

ہے آرزوئے دل کہ تری آرزو کریں
جبتک زبان تن ہے تری گفتگو کریں

جو ہے ہزار جان سے تجھ پر نثار ہے ۔۔۔ گل ہے عزیز ہم کو ترا خار خار ہے
سرتاج دہر ہند کا تو افتخار ہے ۔۔۔ رنگین تجھ سے یہ چمنِ روزگار ہے

مدت سے اشتیاق ہے اک بار دیکھ لیں
بلبل ہیں چشم شوق سے گلزار دیکھ لیں

چشم وفا کا نرگسِ بیمار پر گماں ۔۔۔ سادہ رخوں کی پھول نہیں نرگس عزالیاں
بحرِ عطا کی طرح ہر اک نہر تھی رواں ۔۔۔ آزادیٔ وطن تھی ہر اک سر کو عیاں

کس جوش سے پہاڑ کے چشمے ابلتے تھے
اہلِ وطن کے ولولے دل سے نکلتے تھے

سب کچھ وہی ہے حیف مگر وہ بشر نہیں ۔۔۔ وہ اہلِ دل نہیں ہیں وہ اہلِ نظر نہیں
کان و صدف وہی ہیں یہ لعل و گہر نہیں ۔۔۔ باغ و چمن وہی ہیں یہ گلہائے تر نہیں

قالب ہے دیکھنے کو یہ قالب میں جاں نہیں
نام وطن ہے حب وطن کا نشاں نہیں

کیا آج کل وطن کی ہے حالت نہ پوچھیے ۔۔۔ کیا کیا پڑے ہیں رنج و مصیبت نہ پوچھیے
جہل و نفاق و کبر کی حالت نہ پوچھیے ۔۔۔ کشمیریوں کی گردشِ قسمت نہ پوچھیے

جنت میں بھی عذاب جہنم اٹھاتے ہیں
اعمالِ بد کیے ہیں سزا اس کی پاتے ہیں

گلزار میں بھی دشت کی وحشت کا رنگ ہے ۔۔۔ صبحِ وطن میں شام غریبی کا ڈھنگ ہے
جو ہے وہ جورِ دست زمانہ سے تنگ ہے ۔۔۔ کشت امید مورد باران سنگ ہے

آوارہ آرزو میں ہیں مانندِ گردِ راہ
کشتیٔ قوم موج طلاطم میں ہے تباہ

- چکبست لکھنوی

نام برج نرائن، تخلص چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ کیننگ کالج سے بی۔ اے کیا ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا آپ لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کا کلام اور مضامین کشمیر درپن، خدنگ نظر لکھنؤ۔ ادیب الہ آباد، زمانہ، کانپور اور اردوئے معلیٰ وغیرہ میں شائع

ہوتا تھا۔ ۴۴ سال کی عمر میں ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو انتقال کیا۔

چکبست دراصل قومی شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام "صبح وطن" جس پر ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اس میں قومی، سیاسی، سوشل اور نیچرل نظمیں شامل ہیں۔ یہ سبھی نظمیں اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ مسدس کا شوق زیادہ تھا۔ "برق اصلاح" کی نظم کشمیری پنڈتوں کے لیے مخصوص ہے۔ خاک ہند، فریاد قوم، نالۂ درد، پھول مالا، پھول، کشمیر، جلوۂ صبح وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں۔

چکبست تنقید میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تنقید ٹھوس سائنٹفک بنیادوں پر ہوتی تھیں۔ کبھی کسی کی تعریف یا تنقیص آنکھیں بند کر کے یا مبالغہ کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ تنقید کرنے میں ہمیشہ مخلص اور غیر جانبدار رہتے تھے۔ مضامین چکبست ان کی تنقیدوں کا مجموعہ ہے "مخزن" لاہور، کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر اقبال کا ایک قصیدہ نواب بھاولپور کے جشن تاجپوشی کی تہنیت میں مخزن نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے قصیدے کی تمہید میں اقبال کی "طبع داد" کے زور کا نمونہ ہا سے تسلیم کیا تھا۔ جب یہ قصیدہ چکبست کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اس پر بھی تلی منصفانہ رائے کا اظہار کیا۔ انھیں قصیدے میں جو شعر پسند آیا اس کی تعریف کی اور جس کے ساتھ اختلاف کیا اس کی وجہ بھی بتائی۔ مثال کے طور پر اقبال کا شعر ملاحظہ ہو ؎

مے کے پیغام طرب جاتی ہے سوئے آسماں — اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پہ میں

چکبست نے یہاں دوسرے مصرعے میں لفظ "اطلس" پر اعتراض کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ یونانی روایت ہے کہ زمین "ایٹلس" کے شانوں پر قائم ہے۔ انگریزی کتابوں میں یہ حوالہ جا بجا موجود ہے جو لوگ انگریزی نہیں پڑھے ہیں وہ اس شعر کے معنی کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوستان میں یونان کے "ایٹلس" کی بمقابل۔ "گاؤ زمین" موجود ہے۔ قصیدے میں جو شعر چکبست کو پسند آیا اس کی تعریف کی ہے۔ مثلاً ؎

صاف آتا ہے نظر صحن چمن میں عکس گل
بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشنگر زمیں

چکبست شعر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

"یہ شعر پاکیزگی زبان اور لطافت مضمون کے لحاظ سے قابل تحسین ہے۔"

چکبست نے "کلام اقبال" کے عنوان سے یہ تنقیدی مضمون لکھا تھا جسے حسرت موہانی نے شائع کیا تھا۔ مضامین چکبست میں یہ مضمون شامل نہیں ہے۔ اقبالیات میں بھی اس کا حوالہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

سرشار

نام رتن ناتھ در تخلص سرشار۔ جان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے اوائل عہد حکومت میں ۱۲۶۵ھ ہجری مطابق ۴۹-۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت بیج ناتھ در تھا۔ سرشار چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا سرشار عربی، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے لکھنؤ کے کیننگ کالج میں پڑھتے تھے لیکن کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ پہلے ضلع کھیری میں ٹیچر ہوئے یہیں سے مراسلہ کشمیر اور اودھ پنچ میں اپنے مضامین بھیجتے تھے۔ شاعری میں اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔

سرشار کا شمار اردو کے ممتاز نثر نگاروں میں ہوتا ہے جب تک اردو زبان قائم ہے ان کا "فسانۂ آزاد" اور اس کے دو اہم کردار میاں آزاد اور میاں خوجی لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ ادبی شاہکار انھوں نے اس وقت تخلیق کیا جب وہ منشی نولکشور کے شہرۂ آفاق "اودھ اخبار" لکھنؤ سے وابستہ تھے۔ موصوف نے فسانۂ آزاد کو دسمبر ۱۸۷۸ء سے بالاقساط دسمبر ۱۸۷۹ء تک شائع کیا۔ جب پورا ناول ۱۸۷۹ء میں اخبار میں چھپا تو پنڈت رتن ناتھ بخشی کشمیری تخلص دریا نے تاریخ کہی ؎

لے نام تو دو جہاں رتن ناتھ — از خامۂ در سخن بہ سفتی
تاریخ بگو زعیسوی سال — فسانۂ بے نظیر گفتی

۱۸۷۹ء

سرشار نے بعد میں ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی لکھنؤ آمد کے موقع پر ۲۹ دسمبر ۱۹۸۱ء کو اموسی ہوائی اڈہ پر شہریوں کی جانب سے ان کا خیر مقدم —

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ گزشتہ ۱۴ دسمبر کو اپنی رہائش گاہ پر اٹلی کے سفیر شری ایولیو پاؤلو واتسی اور ان کی اہلیہ سے ملاقات کے دوران گفتگو کرتے ہوئے

وزیر ریاست برائے اطلاعات و منصوبہ بندی شری کاشی ناتھ
مصرا ۹ جنوری ۱۹۸۲ء کو جونپور میں عید میلاد النبیؐ کے موقع
پر مرکزی سیرت کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں تقریر
کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۱ء کو لکھنؤ میں چلائی جانے والی دس نئی بسوں کو عوام کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے بعد، بس سے شہر کا دورہ کرنے کے واسطے کنڈکٹر سے ٹکٹ خرید رہے ہیں

محمدیا (لکھیم پور کھیری) دھان خریداری مرکز پر کسانوں کا لایا ہوا دھان تولا جا رہا ہے۔

گولا (لکھیم پور کھیری) دھان خریداری مرکز پر کسانوں کو چیک کے ذریعہ ادائگی کی جا رہی ہے

کتابی صورت میں چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ اردو کے مشہور
جرنلسٹ اور ناول نگار شرر لکھنوی نے سنہ ہجری میں تاریخ کہی ؂

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ   کن کن محاوروں کا کیا ہے نباہ واہ
دیکھیں جو شوخیاں ترے خامہ کی غور سے   بولے شفیق واہ عدو بولے آہ آہ

کرتا ہے شرر مصرع تاریخ پیش کش
کیا بول چال لکھی رتن ناتھ واہ واہ

۱۲۹۸ ہجری

سرشار کی تصانیف میں سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوج دار بہت مشہور ہیں۔ سرشار آخری زمانے میں ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد گئے۔ اپنے قیام حیدرآباد کا حال انہوں نے کشمیر درپن شمارہ مارچ ۱۸۹۹ء میں شائع کیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد ان کے مداحوں میں تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

"پنڈت سرشار لکھنوی کا احسان اردو لٹریچر پر کوئی مانے یا نہ مانے مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے جو نثر نگاری کی طرف میلان ہوا اس کا اصل باعث فسانۂ آزاد کی سیر ہے۔ وہ طرز تحریر وہ آمد وہ بیساختہ پن وہ ہر فقرے میں محاوروں، مثلوں، مقولوں کا برتنا، وہ گرماگرمی وہ شوخی میرے دل میں کھپ گئی۔ اگرچہ اس کے بعد جب میری نظر سے حضرت غالب اور حضرت آزاد کی تصنیفات گزریں میں نے انہی کے طرز تحریر کو ترجیح دی" [۱۱]

حیدرآباد سے سرشار نے ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" نکالا تھا۔ اس میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ اس کے علاوہ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، کشمیر درپن، مراۃ الہند، اور ریاض الاخبار وغیرہ میں ان کی نگارشات چھپتی تھیں۔ سرشار کا انتقال ۵۵ یا ۵۶ برس کی عمر میں حیدرآباد میں ۱۹۰۲ء میں ہوا کسی نے خوب کہا ہے ؂

سرشار فصیح و نکتہ پرور نہ رہا   سرمایۂ ناز اہل جوہر نہ رہا
اعجاز قلم کے جس کے سب قائل تھے   وہ نثر کا اردو کی پیمبر نہ رہا

طالب

نام پنڈت نند لال کول، تخلص طالب۔ ان کے آبا و اجداد حکومت کشمیر میں مختلف ذمہ دار اور باعزت عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے جد امجد پنڈت رگھوناتھ کول ریاست کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ طالب ۱۸۹۹ء میں بمقام سری نگر (کشمیر) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق اردو فارسی سے ہوئی۔ فارسی اور انگریزی میں اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔ ایم اے (فارسی) کے علاوہ اردو میں ادیب فاضل اور فارسی میں منشی فاضل بھی تھے۔ ایس پی کالج، امر سنگھ کالج اور پرنس آف ویلز کالج جموں میں اردو و فارسی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہو کر کلچرل اکادمی سری نگر سے وابستہ ہو گئے تھے۔

طالب صاحب پہلے سری نگر کی گنجان آبادی فتح کدل، متصل مشن اسکول میں رہتے تھے۔ اس کے بعد کرن نگر میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ یہیں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۵ء کو صبح ۷ بجے انتقال کیا۔

طالب کشمیری راقم الحروف کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ فارسی اردو میں اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔ عربی سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ بڑے خوددار اور سلیم الطبع تھے۔ پرانی وضع کے سختی سے پابند تھے۔ ہمیشہ پگڑی پہنتے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔

طالب بارہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس زمانے میں اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر میں مولوی امیر اللہ تخلص امیر امرتسری کہنہ مشق استاد تھے۔ انھوں نے ابتدا میں طالب کی ہمت افزائی کی۔ پھر اسی سال وہ تمنا لکھنوی ایڈیٹر دربار لکھنؤ کے حوالے کر دیے۔ ۱۹۱۵ء میں علامہ کیفی دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علامہ سے ان کے خاص مراسم تھے اور آپس میں سالہا سال تک خط و کتابت بھی جاری رہی۔ طالب ابتدا میں دلبر تخلص کرتے تھے جیسا کہ ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ [۱۲]

بجائے دلبر طالب بنا ہوں طالب دلبر

کر دامن گیر بنتا ہوں میں اب دامن کشاں ہوکر

کیفی بوبلوی طالب کشمیری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"فن سخن گوئی میں راقم سے تلمذ ہے۔ آپ دورِ جدید کے حالات سے واقف ہیں۔ اور دنیائے ادب کے مشہور انشا پرداز اور شاعر ہیں۔ ملک کے رسائل و اخبارات میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کا کلام "رشحات التخیل" کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ۔۔۔ وادیٔ کشمیر میں رہ کر آپ ایسی صاف ستھری اردو لکھتے ہیں۔ کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔ اپنے وقت میں منفرد صاحب طرز مانے جائینگے۔ احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں کمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی حال حقائق نگاری کا ہے"

طالب پہلے کشمیری شاعر ہیں جن کا مجموعۂ کلام نظامی پریس بدایوں سے پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "مرقع انکار" بھی چھپ چکا ہے۔ اس کا مقدمہ اردو اور فارسی کے عالم مولانا ضیا احمد بدایونی، پروفیسر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، نے لکھا تھا۔ موصوف طالب کشمیری کی اردو شاعری سے بے حد مانوس تھے۔

بابائے اردو کی رائے طالب کے بارے میں یہ تھی کہ:۔

"آپ نے وادیٔ کشمیر میں رہ کر اردو زبان پر ایسی قدرت حاصل کرلی ہے کہ بیان میں صفائی اور گداز ہے جو آپ کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے"[۱۳]

طالب کا کلام اور ان کے مضامین نیرنگ خیال لاہور، ادبی دنیا لاہور، نوائے ادب، شیرازہ سری نگر اور آجکل وغیرہ میں چھپتے تھے۔

طالب صاحب کا مذاق سخن فہمی اور تنقیدی شعور بہت بلند تھا۔ انھوں نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر جوہر آئینہ کے نام سے کلام غالب کا جائزہ ایک ضخیم کتاب میں پیش کیا۔ جوہر آئینہ کے بارے میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی لکھتے ہیں:۔

"حال میں غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر ہمارے مکرم پروفیسر نند لال کول طالب کاشمیری نے غالب کے اردو دیوان کا ایک مفصل جائزہ ترتیب دیا ہے جس میں ان کے کلام اور اس سے متعلق متعدد مسائل و مباحث پر سیر حاصل نظر ڈالی ہے۔ طالب صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا ذوق ادب ستھرا، مذاق سخن فہمی بلند اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے۔ انھوں نے متوازی اشعار تلاش کرنے اور ان کے درمیان محاکمہ کرنے میں جو سعی کی ہے وہ نہ صرف ان کی وسعتِ نظر بلکہ دقتِ نظر کا ثبوت ہے۔ ممکن ہے کہ کہیں کہیں موصوف کی ادبی رایوں سے اختلاف کیا جاسکے لیکن ان کے ادبی ذوق سے انکار مشکل ہے"[۱۲]

اسی کتاب پر اردو کے ممتاز ترین ناقد پروفیسر سید احتشام حسین تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پنڈت نند لال کول طالب کاشمیری نے کبھی ایک عاشق اور پرستار لیکن ہوش مند اور بیدار دل والے پرستار کی طرح کلام غالب سے دل چسپی لی ہے اور اسے قریب و دور سے نہ جانے کتنے زاویوں سے دیکھا ہے۔ ان کے وسیع علم اور تجربے اور ادب نوازی و سخن فہمی کا یہی تقاضا بھی تھا۔ طالب کشمیری نے مرزا غالب کے اردو کلام کے گہرے مطالعے سے ان کے فکروفن کے بہت سے گوشوں کو روشن کیا ہے"

غرضیکہ طالب اردو نظم و نثر میں بڑی مہارت رکھتے تھے آخر میں ان کا نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

عاشق نے دل دیا تو یہ کس کا قصور تھا
پی کر شرابِ حسن نشے میں وہ چور تھا
مجھ کو تو ناز عجز تھا قاتل کے سامنے
اس کو متاعِ حسن پہ فخر و غرور تھا

گو بظاہر شکلِ انسانی ہوں میں
ایک عکسِ نورِ یزدانی ہوں میں
دوزخ و جنت میں ہوں جلوہ نما
رنج اور راحت کا خود بانی ہوں میں
میری ہستی کو فنا ہرگز نہیں
اور تعجب یہ کہ پھر فانی ہوں میں
نقشِ اول میں بنا میرا وجود
اس پہ بھی تو طالب ثانی ہوں میں
دیر ہو یا ہو کلیسا یا حرم
شمع ہوں ہر گھر میں نورانی ہوں میں

طالب کی نظموں میں منظر کشی کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں ان کی نظم "کشمیر" سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

مدت سے آرزو تھی لطفِ بہار دیکھوں
کاشانۂ چمن کے نقش و نگار دیکھوں
آبادیٔ جہاں سے منھ موڑ کر جلوں میں
دامانِ کوہ میں اک جائے قرار دیکھوں
نظارۂ چمن میں جادو کا سا اثر ہو
سنسان جنگلوں میں دیدارِ یار دیکھوں

باغِ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل
تازہ نسیمِ ڈل ہو اور شالامار دیکھوں
کھل جائے مجھ پہ رازِ ناز و نیازِ الفت
بلبل کے سامنے جب گل کا سنگار دیکھوں
حیرت ہو دور میری نرگس کے درشنوں سے
مٹ جائیں داغ دل کے جو لالہ زار دیکھوں
دل میں تھا شوق ایسا گھر سے ہوا میں رخصت
تھا لطفِ گلستاں کا یا ایک طلسمِ قدرت

فدا۔

پنڈت جگموہن ناتھ بکھو نام تخلص فدا۔ ولد پنڈت جوالا ناتھ بکھو۔ دہلی کے ایک معزز کشمیری پنڈت خاندان سے تھے۔ فدا ۱۸۷۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے تھے بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف میلان طبع تھا۔ ابتدا میں آغا شاعر قزلباش، ارشد گورگانی اور ساحل دہلوی کی صحبت میں دن گزارے۔ مرزا سرفراز حسین طرار دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ جب ایک غزل کہی جس کا مطلع ذیل میں درج ہے تو استاد نے کہا کہ اب تمھاری اصلاح کی ضرورت نہیں ہے ؎

جلاتے آہِ شرر فشاں سے فلک سے ہم انتقام لیتے
جو رہتے جیتے ہم اور کچھ دن تو تجھ سے بدلے تمام لیتے

فدا نے غالب، آتش، ناسخ اور امانت کے کلام کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ ان کا کلام تشبیہ اور استعارات سے مالا مال ہے۔ تصوف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور شیخ المشائخ مولانا سید ابرار مکی مدنی کے مرید ہوئے تھے اور ان کے زیر اثر نعتیہ کلام کہنا شروع کیا۔ نمونہ کلام:

عشق کی منزل میں مومن اور کافر ایک ہیں
راستے دو ہیں مگر دونوں کا رہبر ایک ہے
لوگ کہتے ہیں محمدؐ مصطفٰے محبوب ہیں
میں یہ کہتا ہوں احد اور احمد سراسر ایک ہے
گر خدا کعبہ میں ہے تو کون بتخانے میں ہے
اس سے ثابت ہے فدا اللہ اکبر ایک ہے
حسنِ خوباں میں نیا گل یہ کھلا میرے بعد
زلف کا رنگ دھواں بن کے اڑا میرے بعد
میں تو یاں چین سے مرقد میں پڑا سوتا ہوں
اب کسے ڈھونڈتی پھرتی ہے قضا میرے بعد

کیفی۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ، تخلص کیفی خلف پنڈت کنھیا لال۔
کیفی ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے

آبا [illegible] بادشاہ فرخ سیر کے عہد حکومت میں کشمیر سے [illegible] آکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ اور اپنی فارسی دانی کی [illegible] ت حکومت کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر [illegible] فائز ہوئے۔ کیفی نے فارسی کی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی تھی۔ اور وہ (کیفی) فارسی اور انگریزی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی اور سنسکرت سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ ان کا شمار ہندی کے اساتذہ میں بھی کیا جاتا ہے۔

کیفی حصول تعلیم کے بعد کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تقسیم سے پہلے ان کا قیام زیادہ تر پنجاب میں رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے وطن دہلی چلے گئے۔ کیفی کو شعر و شاعری کا شوق [illegible] رگ پنڈت نرائن داس کشمیری تخلص ضمیر سے ورثے میں ملا تھا۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے۔ بعد میں نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے آزاد، شبلی، حالی اور سرسید کا زمانہ دیکھا تھا۔ حالی کے تو نیازمندوں میں تھے بلکہ ان سے غزلوں پر اصلاح بھی لی تھی۔ دور حاضر کے شعرا اور ادیبوں سے بھی گہرے روابط تھے۔ ان میں وحشت، صفی، ظریف، ثاقب، آرزو، سراج، قدیر، حسرت، آغا شاعر قزلباش، ناظر، نیرنگ، اقبال اور مسعود حسن رضوی ادیب [illegible] قابل ذکر ہیں۔ موصوف سے خمخانہ جاوید کی ترتیب کے بارے میں تحقیق طلب امور دریافت کرتے تھے اس سلسلے [illegible] ان کے ہاتھ کا ایک خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۴۴۔ سی نشاط روڈ (انگریزی حروف میں)

لاہور۔ ۲ اپریل ۱۹۳۳ء

میرے عنایت فرما

تسلیم۔ ایک تکلیف دیتا ہوں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو۔ نواب مولوی صدیق حسن خان بہادر مرحوم شوہر شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کے صاحبزادے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اب بھی وہیں ہوں گے۔ ان کا نام نورالحسن خاں ہے اور تخلص کلیم۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ اگر حیات ہیں تو سنہ ولادت کیا ہے۔ یا یہ کہ اس وقت تخمیناً عمر کیا ہوگی۔ اگر جنت سدھارے تو کب؟ آپ نے میرے عالم آشوب کا ذکر فرمایا تھا وہ کب تک ارسال خدمت ہو۔ حضرت ثاقب تشریف لاتے ہوں گے۔ سلام پہنچا دیجئے گا۔ میں ابھی یہیں لاہور میں رہوں گا۔

اخلاص کیش

برجموہن دتاتریہ کیفی

کیفی بڑے وسیع اخلاق، فراخ دل اور صلح پسند انسان تھے۔ اردو زبان سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ انھوں نے اردو زبان کی تحقیق، محاورات کی چھان بین اور اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ ادبی تحقیق کے علاوہ ایک خوش ذوق نقاد، ایک خوش گو شاعر، ایک سخن فہم ادیب اور ایک قادر الکلام نثر نگار بھی تھے۔ علم اللسان پر جو نگارشات انھوں نے اپنے ورثے کے طور پر زبان اردو کو عطا کی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ تک زبان کے معیار اور صحت کو قائم رکھنے میں ایک گراں بہا سرمایہ شمار ہوں گی۔ ان کی کئی تصانیف چھپ چکی ہیں۔ نثر میں عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری، مراری دادا، تہتا رانا، کیفیہ، اور منشورات ہیں۔ نظم میں مراۃ خیال، آئینۂ ہند، صدائے کیفی، بھارت درپن، پریم ترنگی، جنگی نظمیں، توزک قیصری، خمخانۂ کیفی اور ان کا مجموعہ کلام واردات ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے خمخانہ جاوید کی جلد چہارم اور پنجم بھی مرتب کی ہیں۔

علامہ کیفی اردو کے ایک مرد مجاہد تھے۔ آخر عمر تک اردو کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے۔ دسمبر ۱۹۳۵ء میں صاحب فراش تھے۔ پاؤں میں ورم تھا۔ اسی حالت [illegible] اپنی اسی ویں سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر عبدالحق کو مورخہ [illegible] ۱۹۴۴ء کو ایک خط لکھا جو "ہماری زبان" یکم جنوری

۱۹۲۶ء کے شمارہ میں "علامہ کیفی کی خیریت" کے عنوان سے
چھپا تھا۔ اس خط کے ساتھ ایک رباعی بھی درج ہے جو کیفی
نے سالگرہ کے دن ۱۳ دسمبر کو تصنیف کی تھی ؎

عمر گزری ہے حصولِ آدابِ نگاہی میں
اسّی وای سال سے اردو کی نکو خواہی میں
ٹھیک ہو جائیں گے جو آج ہیں اردو کے خلاف
کر رہ راست نکل آتی ہے کج راہی میں

کیفی کا انتقال ۹۱ برس کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

نمونۂ کلام

لطفِ ایامِ جوانی اور ہے — دل کٹے کی زندگانی اور ہے
الفتِ دل کی نشانی اور ہے — ظاہری شیریں زبانی اور ہے
ہیں بناوٹ کی یہ سب باتیں حضور — دل سے ہو جو مہربانی اور ہے
کیا ہوا دنیا پہ جو قبضہ کیا — ملک دل کی حکمرانی اور ہے
داستانِ عشق تم مجھ سے سنو — قیس و لیلیٰ کی کہانی اور ہے
برق میں شعلے میں یہ گرمی کہاں — سوزشِ دردِ نہانی اور ہے
آدمی بت اور بت [illegible] — گفتگوئے بے زبانی اور ہے
اب تو [illegible] ملیں گے پھر کبھی — گر یہاں کا دانہ پانی اور ہے
[illegible] الفاظ سے کچھ اور [illegible] — لطفِ اسلوبِ معانی اور ہے
اس کو کیفی کب پہنچ سکتا کوئی — میر کی شیوہ بیانی اور ہے

نسیم

پنڈت دیا شنکر کول نام نسیم تخلص۔ ولد پنڈت
[illegible] پرشاد کول۔ نسیم کا شمار اردو کے مشہور اور ممتاز شاعروں
میں ہوتا ہے۔ وہ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اردو مثنوی
میں میر حسن مصنف سحر البیان کے بعد اگر کسی دوسرے مثنوی
نگار کا نام لیا جاتا ہے تو وہ نسیم لکھنوی، مصنف گلزار نسیم ہیں۔
[illegible]
[illegible] نسیم [illegible] اور بہت خوب لکھی۔

اختصار بھی اس مثنوی کا ایک خاص وصف ہے۔ اس کے
باوجود عام و خاص سب میں شہرت پائی۔ اس کے نکتوں اور
باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں
جتنی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے
جاتے ہیں۔" ؎

مثنوی کے علاوہ دیوان بھی ترتیب دیا تھا۔ جو اب نایاب ہو۔
بشن نرائن در آبر کہتے ہیں کہ :۔

"نسیم کی شاعری کی شہرت ان کی مثنوی سے ہے جس کو مقبولِ
عام کی سند مل چکی ہے۔ مگر عوام کو یہ نہیں معلوم ہے کہ
وہ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ ۳۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔
لہٰذا زیادہ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جو کچھ مل گیا اس
کو بھی انھوں نے حتی الامکان اپنے پاس رہنے نہیں دیا۔ ان کے
اعزہ و احباب کو مشکل سے ان کی غزل ہاتھ آتی تھی اور جب
کوئی کہتا تھا کہ اپنا کلام رکھیے تاکہ کسی وقت میں آپ کا دیوان
چھپے تو یہی جواب دیتے تھے کہ اگر میرا نام رہے گا تو مثنوی
سے دیوان بڑے بڑے [illegible] ان سے بڑھ
کر کہنا مشکل ہے اور اگر [illegible] ہوا تو اس سے کیا حاصل۔"

گلزار نسیم مصنف کے زمانے میں ہی ۱۲۶۰ھ میں مطبع حسینی
بیت السلطنت لکھنؤ، محمود نگر، متصل اکبری دروازہ [illegible]
چھپی تھی۔ یہ نسخہ نایاب ہے لیکن راقم کی نظر [illegible]
اس کے آخر میں نسیم کی طبع زاد تاریخ موجود ہے ؎

ای خالق کردگار شکرا — شکرا شکرا ہزار شکرا
کیں جلد ز ابتدا خبر داد — شاخ قلم چنیں ثمر داد
در عہدِ خلافت شہنشاہ — امجد علی شاہ خلد اللہ
سید حسن آنکہ طبع پاکش — چون مطبع اوست خوش و دلکش
از سمع رضا شنید و بشنود — در مطبع خویش طبع فرمود
چون زیور طبع نیک پوشید — بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد [illegible] مسموع — گل گفت [illegible] گلشن مطبوع
۱۲۶۰ھ

صحیح تاریخ وفات ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء ہے۔ شکر لکھنوی نے تاریخ کہی ہے

بزم مشاعرہ بود و شنیدم مُردنسیم زہیضہ ہے ہے
فوراً مصرعِ مادہ گفتم مُردنسیم زہیضہ ہے ہے
ہجر ۱۳۱۳

نام پنڈت تربھون ناتھ سپرو ولد پنڈت بشمبر ناتھ سپرو تخلص صابر شاگرد قدر بلگرامی۔ ہجر ۱۸۵۸ء میں تحصیل چنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر زیادہ تر فیض آباد میں رہتے تھے۔ علوم مشرقی کی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق مکتب میں حاصل کی۔ انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف۔ اے تک سلسلہ تعلیم جاری رہا لیکن امتحان میں ناکامی کی وجہ سے بردل ہو کر سلسلۂ تعلیم کو ترک کیا۔ ہجر تلاش معاش کے لیے اودھ کے مختلف صوبوں میں گھومتے رہے۔ آخر کار گونڈہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر گردش تقدیر نے چین نہ لینے دیا۔ دو سال ہی ہوئے تھے کہ درد زانو نے پریشان کیا۔ آخر کار چھ مہینے بیمار رہ کر مارچ ۱۸۹۶ء میں ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

چکبست نے ہجر کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے جنھوں نے اردو زبان کو اپنے احسان سے گرانبار کیا ہے۔ ان کے مضامین اور اشعار اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، مراۃ الہند اور وکیل ہند میں شائع ہوتے تھے۔ ہجر غزلیں بھی کہتے تھے لیکن زیادہ تر ان کا رجحان نظم کی طرف تھا۔ مسدس کا رنگ زیادہ پسند خاطر تھا۔ سال نو اودھ پنچ، شاہنامہ پنچ، جام جہاں نما، فغان کشمیر، مثنوی لسان الغیب کشمیر، جنگ رشیسر جی اور رشوت وغیرہ ان کی شاندار نظمیں ہیں۔ ان کا ایک مسدس "کچا چٹھا" ہے جو انھوں نے بخار میں مبتلا ہو کر ستاون بند میں ایک رات میں نظم کیا تھا۔ مسدس میں شکوہ الفاظ اور الفاظ کی تراکیب قابل ذکر ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں؛

اگر کشمیر میں تھیں باخدا تھے بڑے نیک طینت بڑے پارسا تھے
اگر قوم میں تم ہی وہ محرم آشنا تھے بڑے پاک باطن بڑے پارسا تھے
تو بہتر تھا گھر بار سب تیاگ دیتے
چلے جاتے کاشی میں سنیاس لیتے

ہر اک قوم میں صید رنج و محن ہے نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ انجمن ہے
بری پر پھر اس سال چرخ کہن ہے نہ ہے جوش قومی نہ حب وطن ہے
محبت ہے باقی نہ الفت ہے باقی
پڑی قوم میں پھر یہ ہے نااتفاقی

پنڈت منوہر لال زتشی

آخر میں اردو کے ایک مشہور اور ممتاز ادیب، انشاپرداز زبان داں اور مضمون نگار زتشی صاحب کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ پنڈت بشن نرائن ابر، علامہ کیفی، سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت برج نرائن چکبست کے ہمعصر تھے۔ ان کے مضامین کشمیر درپن، ادیب، الہ آباد اور زمانہ، کانپور وغیرہ میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ پہلے الہ آباد ٹریننگ کالج اور بعد میں لکھنؤ جوبلی کالج کے پروفیسر تھے۔ ان کا مجموعہ مضامین ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ مجموعہ نایاب ہے۔ اردو کے بے لوث خادم اور سرگرم پرستار تھے۔ مضامین چکبست اور سید مسعود حسن رضوی کی روح انبس ان کے تعاون سے چھپی تھی۔ بڑے خلیق اور شریف النفس تھے۔ انھیں اردو ادب کے ساتھ جو لگاؤ تھا اس کا ثبوت ان کے خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے آج سے ۵۴۔۵۵ سال قبل جناب مسعود حسن رضوی کو لکھے تھے۔ ذیل میں ان کے کچھ خطوط درج کیے جاتے ہیں جو ان کی زبان دانی اور تحقیق الفاظ کے انہاک پر دلالت کرتے ہیں۔

۲۷ جنوری ۱۹۲۹ء

مکرم گستر۔ بندگی

میرے مضامین کا مجموعہ چھپ گیا۔ ایک نسخہ بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ قبول فرما کر مجھے شکر گزاری کا موقع دیں گے۔

ایک امر دریافت طلب یہ ہے کہ "محترم" اور "مخدوم" یہ الفاظ عربی قاعدہ سے مذکر ہیں اور مخدومہ اور محترمہ مونث یا محترم اور مخدوم اور محترمی اور مخدومی یہ لفظ مرد اور عورت دونوں کے واسطے یکساں استعمال ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں "جناب" کا لفظ تو مرد عورت دونوں کے واسطے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ اور "جنابہ" ہندیوں کا تراشا ہوا ہے۔ جناب نواب صاحب کی طرح جناب بیگم صاحب بھی صحیح ہے۔ محترم اور محترمی اور مخدوم اور مخدومی کے متعلق میرے شک کو رفع فرمایئے اگر مزید تحقیق کی ضرورت سمجھیے تو جواب دو ایک روز کے بعد دیجیے گا۔ مگر بالکل صحیح اور "یکا"۔ جواب چاہتا ہوں۔ اگر کسی عورت کو لکھا جائے تو محترم اور محترمی لکھنا صحیح ہے۔ یا محترمہ اور مخدومہ لکھنا چاہیے۔ غالب نے یا دپڑتا ہے کہ محسنہ لکھا ہے اور محسن سے محسنہ بنا تو مخدوم اور محترم سے اسی طرح مخدومہ اور محترمہ بن سکتا ہے۔ دریافت طلب یہ ہے کہ محسنہ کی ترکیب عربی قاعدے سے صحیح ہے۔ یا ہندیوں کی بنائی ہوئی ہے اور صحیح اور مستند کیا ہے۔ خطوط شبلی کو دیکھا۔ یہ خطوط عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام ہیں۔ ان میں محترمہ ہیں، مکرمی، خاتونِ محترم، محترمہ من، خاتونِ مکرم و محترم یہ سب کچھ ہے۔

منوہر لال زتشی

۲۴ اکتوبر وقت شب

میرے مکرم۔ بندگی

آج آپ تشریف لائے اور کچھ دیر بیٹھے بھی مگر چند باتیں جو آپ سے کرنی تھیں وہ بھول گیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے نسیان ہو گیا ہے۔ اب ان کو اس دفعہ لکھتا ہوں:

(۱) مقدمات عبدالحق حصہ دوم ص۱۳۵ میں لکھا ہے کہ بعض الفاظ کے "املے" میں فرق پایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "املے" کی جگہ "املا" ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ عبدالحق نے لکھا ہے اس لیے آپ سے دریافت کرتا ہوں۔ بعض لوگ لکھتے ہیں "ہندوستان کے راجے" یہ بھی میرے خیال میں غلط ہے۔ "راجہ" کے بجائے۔

(۲) سعادت علی خان کے "ناک" کے "بال ہو گئے" یا سعادت علی خاں کے ناک کیا بال ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے "کے" لکھا ہے۔

(۳) کیا "بزمِ بندرابن" مصنفہ بنواری لال شعلہ آپ کی نظر سے گزری ہے یا آپ کے پاس ہے۔ اگر آپ کے پاس ہو تو مجھے پڑھنے کے واسطے عنایت کیجیے اگر نہ ہو تو جو حال اس کا معلوم ہو وہ بتایئے۔ اس میں کیا ذکر ہے اور کہاں چھپی ہے۔ کیا نولکشور کے یہاں چھپی ہے؟

(۴) واجد علی شاہ کی مثنوی "حزنِ اختر" اگر آپ کے پاس ہو تو مجھے عاریتاً عنایت کیجیے۔

(۵) "نیرنگِ زمانہ" مصنفہ شیخ علی حسن، اس کے بھی پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ اگر آپ کے پاس ہو تو بھیج دیں۔

منوہر لال زتشی

ا ہماری زبان مورخہ ۸ جون ۱۹۳۶ء۔ ۲ خدا بخش لائبریری جرنل ۲۳، صفحہ ۱۴۹ مطبوعہ ۱۹۸۲ء ۳ ایضاً ص۱۹۶۔ ۴ شاہراہ ادب ص۲۶ مرتبہ پروفیسر سی۔ آر۔ رینا مطبوعہ دہلی۔ ۵ شاد کا عہد اور شاعری مرتبہ سید مسعود حسن رضوی۔ ۶ اردو شمارہ اپریل ۱۹۳۶ء مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۷ ادیب الہ آباد مطبوعہ جنوری ۱۹۱۱ء ۸ ادیب الہ آباد مطبوعہ نومبر ۱۹۱۱ء جلد ۲ نمبر ۵۔ ۹ اردوئے معلیٰ جلد ۲ نمبر ۴ مطبوعہ اپریل ۱۹۱۰ء ۱۰ بہارِ گلشنِ کشمیر جلد اول ص۱۱۱، تاریخ ادب اردو ص۲۸۱، مضامین چکبست ص۲۲۲، کشمیری پنڈت ۱۹۸۳ء ۱۱ مہاراجہ کشن پرشاد شاد ص۲۲۲ ڈاکٹر حبیب ص۱۱ ۱۲ بہارِ گلشنِ کشمیر جلد دوم ص۶۲۵ ۱۳ خمخانۂ جاوید ص۲۳۰ جلد پنجم ۱۴ جوہر آئینہ ص۱۵ آبِ حیات ص۲۵۶ ۱۶ ادیب الہ آباد مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۰ء ۱۷ مضامین چکبست ص۱۹، خمخانہ جاوید جلد سوم ص۱۲۶ میں سرشار کا شعر ہے جس سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ۱۸ زتشی صاحب کے یہ خطوط ڈاکٹر نیر مسعود سے ملے ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ (اکبر حیدری)

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں
ٹونک، (راجستھان)

باپو کی یاد میں

ہمارے دیش میں جادو جگا گئے باپو
ہمارے دیش کی بگڑی بنا گئے باپو
جو نام لیتی ہے دنیا ادب سے لیتی ہے
ہمارے دیش کا رتبہ بڑھا گئے باپو

وطن پہ مرتے ہیں جو لوگ زندہ رہتے ہیں
لگا کے جان کی بازی بتا گئے باپو
فرنگیوں سے اہنسا کے بل پہ جیتا ہے
کرشمہ دنیا کو یہ بھی دکھا گئے باپو

بلند خیال و ارادے کی پختگی کے ساتھ
تمام قوم کو جینا سکھا گئے باپو
اب امتیازِ من و تو نہیں ہے بھارت میں
کہ ذات پات کی رسمیں مٹا گئے باپو

روش روش پہ جلائے چراغ الفت کے
قدم قدم پہ خزانے لٹا گئے باپو
ہمارے ذہنوں سے نفرت نکال ڈالی ہے
ہمیں وہ پیار کا نغمہ سنا گئے باپو

تمہارِ حبِّ وطن کا نہ جائے گا مختار
شرابِ حبِّ وطن کی پلا گئے باپو

محشر صادقی
نظام آباد اعظم گڑھ

یہ وطن میرا وطن

جوئباروں کا نظاروں کا بہاروں کا وطن
لالہ و گل کی زمیں، چاند ستاروں کا وطن
رقص کرتی ہوئی گاتی ہوئی پریوں کا چمن
یہ وطن میرا وطن میرا وطن میرا وطن

چاند کے پیکرِ سیمیں کی ادا کیا کہیے
جگمگاتے ہوئے سورج کی ضیا کیا کہیے
کوئی چاندی کا کٹورا کوئی سونے کی لگن
یہ وطن میرا وطن میرا وطن میرا وطن

ابر آتا ہے سمندر کی ہوائیں لے کر
صبح آتی ہے حسینوں کی ادائیں لے کر
شام اوڑھے ہوئے آتی ہو شہیدوں کا کفن
یہ وطن میرا وطن میرا وطن میرا وطن

یہ نکلتا ہوا سورج یہ ہمالہ کی جبیں
اک سنہری سی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں
یہ چمکتی ہوئی دھرتی یہ حسیں نیل گگن
یہ وطن میرا وطن میرا وطن میرا وطن

شورِ ناقوس کہیں ہے کہیں آوازِ اذاں
مسجدوں اور شوالوں کے تقدس کا سماں
گوتم و نانک و چشتی کی امیدوں کا چمن
یہ وطن میرا وطن میرا وطن میرا وطن

حنیف نقوی
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی ۲۲۱۰۰۵

مرزا حاتم علی مہر — تحقیقِ مزید

مرزا حاتم علی مہر کے سوانحِ حیات اور ادبی آثار کی تحقیق پر مشتمل راقم السطور کا ایک مفصل مضمون "نیا دور" کے اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں کوشش کی گئی تھی کہ مہر کے متعلق تمام منتشر معلومات کو یکجا کر کے ان کی ضروری تنقیح اور تجزیے کے بعد ان کی ایک قابلِ اعتبار سوانحِ عمری اور ان کے کارناموں کا ایک مفصل خاکہ پیش کر دیا جائے۔ اس ضمن میں ان غلط فہمیوں کے ازالے اور غلط بیانیوں کی تصحیح کو بطورِ خاص مرکزِ توجہ بنایا گیا تھا۔ جو روایت کے تسلسل و تواتر کی بنا پر مسلّمات کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، تاہم بعض مآخذ تک نارسائی اور بعض سے لاعلمی کی بنا پر اس مضمون میں بھی کچھ خامیاں باقی رہ گئی تھیں جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) راقم السطور نے لکھا تھا کہ "بیشتر تذکرہ نگار مہر کو لکھنوی الاصل بتاتے ہیں لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت کے علاوہ ان میں سے کسی نے وضاحت کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔" بعد میں "سراپا سخن" (محسن لکھنوی) اور "دیوانِ غیب" (مرزا کلب حسین خاں نادر) کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ خواجہ عشرت سے بہت پہلے ان دونوں کتابوں کے مصنفین جو مہر کے دوست بھی ہیں، لکھنؤ کو ان کا مولد قرار دے چکے ہیں[1]۔ اکبرآباد کو مولد قرار دینے والوں میں صرف مرزا محمد عسکری ادیب کا نام لیا گیا تھا۔ بعد کے مطالعے سے انکشاف ہوا کہ اس معاملے میں مرزا صاحب تنہا نہیں، ان سے پہلے مظفر حسین صبا گوپاموی[2] اور مولانا محمد حسین آزاد[3] بھی انھیں اکبرآبادی لکھ کر آگرے سے ان کی وطنی نسبت کا اعلان کر چکے ہیں۔

(۲) راقم نے خواجہ عبدالرؤف عشرت کے بیان کے علاوہ خود مہر کے اس دعوے کے باوجود کہ "ہے مولد مرا شہر لکھنؤ ہے"، قطب الدین باطن اکبرآبادی کے اس قول کو کہ ان (مہر) کا مولد و منشا فرخ آباد ہے، زیادہ قرینِ صحت قرار دیا تھا۔ اب مہر کے پوتے آغا قاسم حسین مرزا کے ایک بیان سے معلوم ہوا کہ وہ دراصل "بمقام علی گڈھ پیدا ہوئے تھے[4]" قاسم نے اسی بیان کے ضمن میں ان کا سالِ ولادت ۱۲۳۰ھ بتایا ہے۔ یہ شہادت خواجہ عبدالرؤف عشرت کے بیان کی تائید کرتی ہے۔ اس کے باوجود راقم نے اپنے مضمون میں سنہ ولادت کے تعین میں جس غلطی کے احتمال کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ اپنی جگہ برقرار ہے۔

(۳) راقم نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مہر کی والدہ بگمانِ غالب فرخ آباد کی رہنے والی تھیں اور انھوں نے اپنے شوہر مرزا فیض علی بیگ کی وفات کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ مہر نے بچپن سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ

فرخ آباد میں گزارا اور سرسری اندازے کے مطابق وہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) تک وہیں مقیم رہے۔ اب اس قیاس کی تائید میں ہمیں دو ثبوت دستیاب ہوئے ہیں۔ پہلا ثبوت مہر کے برادر خورد مرزا عنایت علی ماہ کے دیوان ریاض ماہ کے ایک اشتہار پر مبنی ہے جس سے ہماری معلومات میں ایک نیا اضافہ یہ ہوتا ہے کہ ماہ کے علاوہ مہر کے ایک اور بھائی مرزا رعایت علی بیگ بھی تھے جو غالباً غیر شاعر ہونے کی بنا پر گمنام رہے۔ یہ اشتہار کئی اعتبار سے اہم ہے، اس لیے بجنسہٖ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

"واضح ہو کہ یہ دیوانِ بلاغت نشانِ شیر بیشۂ سخنوری گل بوستانِ نکتہ پروری اخوی المکرم جناب مرزا عنایت علی بیگ صاحب المتخلص بہ ماہ مرحوم اکبرآبادی شاگرد خواجہ آتش مرحوم لکھنوی و برادرِ خورد جناب مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر مرحوم اکبرآبادی میرے پاس عرصے سے بحفاظت رکھا ہوا، کچھ با ترتیب، کچھ متفرق۔ اب میں نے بڑی کوشش اور زر کثیر صرف کر کے اس کو جمع کرایا اور اس خیال سے کہ جناب مرحوم سے اس زمانۂ ناپائیدار میں یادگار رہے، طبع کرایا۔ امید کہ قدر دانانِ سخن اس کی قدر کریں گے اور مجھ کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔ حق تصانیف اس کا محفوظ ہے۔ کوئی صاحب بغیر میری اجازت قصد چھاپنے یا چھپوانے کا نہ فرمائیں ورنہ نفع کے عوض نقصان اٹھانا ہوگا۔ جس قدر جلدیں درکار ہوں مجھ سے قیمت پیشگی عہ بھیج کر طلب کریں یا اجازت دیلو کم دیں۔ میرا پتہ یہ ہے۔ مقام زین پور، ڈاک خانہ ٹھٹھیا، ضلع فرخ آباد۔

المشتہر

مرزا رعایت علی بیگ عرف ننھے مرزا افسر علاقہ
ریاست ترواں"

یہ اشتہار اگرچہ مہر اور ماہ دونوں کو اکبرآبادی الاصل قرار دینے والوں کی تائید میں اہم ترین شہادت کی حیثیت رکھتا ہے تاہم ہمارے نزدیک زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کے مطابق مہر کے ایک حقیقی بھائی فرخ آباد میں مقیم تھے۔

فرخ آباد سے نسبت کی تائید میں دوسری اہم شہادت مہر کے پوتے قاسم حسین مرزا کی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ اپنے والد آغا سخاوت علی بیگ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "ار ماہ شوال ۱۲۵۰ھ کو بمقام فرخ آباد پیدا ہوئے تھے"۔ سخاوت علی بیگ کی فرخ آباد میں ولادت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ کم از کم ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) تک مہر کے اہل خاندان بالیقین فرخ آباد میں موجود تھے اور ان کی یہ موجودگی اس شہر سے ان کے پائیدار اور مستقل تعلق کا ایک مستحکم ثبوت فراہم کرتی ہے۔

(۴) راقم السطور نے اپنے مضمون میں مہر کے اٹھائیس شاگردوں کی نشان دہی کی تھی۔ اس سے قبل آٹھ شاگردوں کے نام جناب کاظم علی خاں اپنے مضمون مشمولہ ماہنامہ "نیا دور" شمارہ (وری ۱۹۸۱ء) میں پیش کر چکے تھے۔ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد انھوں نے مزید تین شاگردوں کی نشان دہی فرمائی ہے جن سے متعلق موصوف کی پیش کردہ تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) منشی شیو مہتاب علی شہرت:۔ انھیں لالہ سری رام نے مرزا حاتم علی مہر کا شاگرد بتایا ہے۔

(خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۵۵۲)

(۲) محمد امیر [illegible]:۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق یہ بھی تلامذۂ مہر میں شامل تھے۔

(خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۲۱۶)

(۳) محمد ذاکر علی ذاکر:۔ (خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۲۹) اور رسالہ پیام یار لکھنؤ (شمارہ ماہ نومبر ۱۸۸۵ء) سے ان کے تلمذ مہر کی تصدیق ہوتی ہے۔

ذاکر علی ذاکر شاہ پور ضلع فتح پور ہسوہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا دیوان موسوم بہ نغمۂ بہار جو ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں مطبع بہار ہند آگرہ سے شائع ہوا تھا، راقم السطور کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اس میں ذاکر کے مہر سے تلمذ کی متعدد شہادتیں موجود

ہیا۔ رام سہائے تسلیم کے دیوان غنچۂ مراد کے قطعۂ تاریخ طباعت کے بموجب وہ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں آگرہ میں دفتر کمشنری کے محافظ تھے۔ اس قطعے کے عنوان سے بھی ان کے تلمذِ مہر کی تائید ہوتی ہے۔

دیوان تسلیم کی وساطت سے مہر کے مزید دو شاگردوں کے نام ہمارے علم میں آتے ہیں۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولوی الطاف حسین الطاف: اس دیوان کے آخر میں ان کا ایک قطعۂ تاریخ منقول ہے جس کے عنوان میں انھیں "تلمیذ جناب مرزا صاحب مہر مغفور" لکھا گیا ہے۔ انھوں نے مہر کے انتقال کی تاریخ بھی کہی تھی جو دیوانِ مہر میں موجود ہے۔ اس تاریخ کے عنوان کے مطابق الطاف مہر کے انتقال کے وقت سوروں (ضلع ایٹہ) میں محرر چنگی تھے۔

(۲) حافظ ممتاز علی تجم خیرآبادی:۔ انھوں نے دیوان تسلیم کی تقریظ بھی لکھی ہے اور اس کے سالِ طباعت کا قطعۂ تاریخ بھی کہا ہے۔ تقریظ کے عنوان میں انھیں شاگرد مہر لکھا گیا ہے۔

مہر کے ایک اور شاگرد سید مظفر حسین ایما کا نام مرزا قاسم حسین کی تصنیف منشورالمسرت کی وساطت سے ہمارے علم میں آیا ہے۔ منشورالمسرت مرزا قاسم حسین کے صاحبزادے آغا فیاض حسین میرزا قزلباش کی شادی سے متعلق منظومات کا مجموعہ ہے جو ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۱۰ء میں یا اس کے کچھ دنوں کے بعد تصویر عالم پریس اڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ایما کا لکھا ہوا ایک سہرا بھی شامل ہے جس کے عنوان میں انھیں "شاگرد حضرت قبلہ و کعبہ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر مرحوم" لکھا گیا ہے۔

مہر کی تصنیف بیاضِ مہر بھی ان کے تلامذہ کی فہرست میں ایک اور شاگرد محمد وارث علی مرتب کے نام کا اضافہ کرتی ہے۔ یہ کتاب مرزا قاسم حسین کی اجازت سے مرتب موصوف نے طبع کرائی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ یہ رسالہ "حضرت مصنف مرحوم و مغفور نے اپنی حیات میں از راہ شاگرد نوازی اس ہیچ میرز کو عطا فرمایا تھا"۔ مرتب کے اس اعتراف کے علاوہ ان کے تلمذِ مہر کی تصدیق مرزا قاسم حسین کے اجازت نامہ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء سے بھی ہوتی ہے جس میں ان کے نام کے ساتھ "شاگردِ جناب قبلہ و کعبہ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مرحوم" لکھا گیا ہے۔

خم خانۂ جاوید (جلد چہارم ص ۲۱۵) میں ایک اور شاگرد مہر عنایت خاں عرف کالے خاں متخلص بہ سفلی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ آگرے کے باشندے تھے اور صاحب تذکرہ کے بقول "ہزل گویانِ ملک میں ان کا نام نکلا ہوا تھا"۔ سفلی کا کلام اودھ پنچ، آگرہ پنچ اور گلدستۂ دامن بہار میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ مشاعرۂ آگرہ کے انعقاد کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ انتقال ۱۸۹۰ء میں ہوا۔

ان آٹھ نو دریافت ناموں کے اضافے کے ساتھ مہر کے شاگردوں کی مجموعی تعداد (۸+۲۸+۳+۵) چوالیس ہو جاتی ہے۔

(۵) کاظم علی خاں صاحب نے اپنے مضمون (مشمولہ ماہنامہ نیا دور شمارہ فروری ۱۹۸۱ء) میں "تاریخ لطیف" مولفہ مہدی علی خاں ممتاز رام پوری کے حوالے سے منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کو مہر کا شاگرد لکھا تھا۔

راقم السطور نے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے اس امکان کی طرف اشارہ کیا تھا کہ "تاریخ لطیف" کے مولف کا نقل کردہ قطعۂ تاریخ جس کے عنوان سے متوفی (مہر) کا "استاد تسلیم سہسوانی" ہونا معلوم ہوتا ہے۔ منشی انوار حسین تسلیم کے بجائے منشی رام سہائے تسلیم کی تصنیف ہو سکتا ہے جو تاریخ گو کی حیثیت سے تسلیم سہسوانی کی بہ نسبت غیر معروف ہیں۔ دیوان تسلیم سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ قطعہ اس دیوان کے صفحہ ۱۱۴ پر "قطعۂ تاریخ رحلت استادی جناب مرزا حاتم علی صاحب مہر" کے زیر عنوان موجود ہے۔ منشی رام سہائے تسلیم کے متعلق راقم السطور کا یہ بیان بھی کہ وہ "بدایوں کے رہنے والے تھے"، ترمیم کا طالب ہے۔ وہ اصلاً ضلع علی گڑھ کے باشندے اور وہاں کے رئیس منشی گنیش رائے کے صاحبزادے تھے۔

(۶) مضمونِ سابق میں مہر کی انیس[19] تصانیف نظم ونثر کا
ذکر کیا گیا تھا، بعد میں ایک اور تصنیف نغمت المسرت
کا علم ہوا جس سے متعلق تفصیلات درج ذیل ہیں :

راقم السطور کو اس رسالے کا ایک ناقص الآخر نسخہ جو صفحہ
۵۶ پر ختم ہو جاتا ہے جناب شاہد حسین ایڈوکیٹ ساکن گولہ گنج
لکھنؤ کی عنایت سے دستیاب ہوا۔ سرورق کی تحریر کے مطابق
یہ رسالہ "بیان ختنہ و مکتب فرزند دلبند آغا سخاوت علی صاحب
ضیا سپرنٹنڈنٹ بال ضلع اٹاوہ سے متعلق ہے اور ۱۲۹۱ھ (۴-۱۸۷۴ء)
میں مطبع الٰہی واقع آگرہ میں "بحسن سعی مچھو خاں" چھپ کر شائع
ہوا ہے۔ ابتدائی صفحات میں مہر اس کے سبب تالیف اور مشتملات
کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" بفضل خدا اور تصدق خیر الورا اور ائمہ ہدا سے جو میرے
پوتے کا پہلے ختنہ اور بعد اس کے مکتب ہوا۔۔۔۔ اکبرآباد اور
اٹاوہ میں جلسہ عجب حسن وخوبی سے مترتب ہوا۔۔۔۔ کچھ میں نے
کچھ بعض احباب نے اس سارے حال کو دونوں جلسوں کے قلم
بند کر کے یہ مجموعہ موسوم بہ اسم تاریخی نغمت المسرت ترتیب
دیا اور چونکہ اس میں سہرے اور تاریخیں عنایت اور محبت
سے احباب نے ارقام فرمائی تھیں، ان سب کو چھپوا کے
ہدیۂ خدمتِ احباب کیا۔۔۔۔" (ص ۱۲)

مہر کی اس پیش گفتار کے بعد ان کے ایک شاگرد منشی محمد
مہربان علی ماہر کے "فقرات صداقت آیات" اور ایک دوسرے
شاگرد میر مدد علی تپش کی نثر بے نقط سے جشن ختنہ کی تفصیلات
معلوم ہوتی ہیں۔ مہر کے لکھے ہوئے ر قعہ نثر تاریخی کے بموجب
یہ تقریبات ۷، ۸ ربیع الاول ۱۲۹۱ھ مطابق ۲۳، ۲۴
اپریل ۱۸۷۴ء کو بمقام اکبرآباد کٹرہ حاجی حسن میں منعقد ہوئی
تھیں۔ جشنِ مکتب نشینی سے متعلق تفصیلات پیش نظر نسخے کے
ناقص الآخر ہونے کی بنا پر محفوظ نہیں تاہم مہر کی پیش گفتار
میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ یہ جشن اٹاوہ میں منعقد
ہوا تھا ... سخاوت علی بیگ ضیا کی ایک ... کے

مقطع سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :

جلسہ تھا خوب مکتب قاسم حسین کا
اٹاوہ میں اے ضیا یہ ہوا یادگار رفیق

نغمت المسرت کا مطالعہ ان تقریبات کے علاوہ مہر کے
سوانح حیات اور شخصیت سے متعلق بعض پہلوؤں کے بارے
بھی اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر
ابتدائی صفحات میں مہر نے اپنے عنفوانِ شباب کے دور اور اس
زمانے کے بعض دوستوں کے بارے میں بالتفصیل گفتگو کی ہے
سطور ذیل میں ان کے اس مفصل بیان کی تلخیص خود انہی کے
الفاظ میں پیش کی جاتی ہے :-

" بد و شعور سے مجھے خوب یاد ہے کہ میری ہر آرزو کی
کفیل اس (خدا) کی امداد ہے۔ جو تمنا کی اس کے افضال
سے فوراً بر آئی، جو دعا مانگی، در اجابت پر مقبول ہو کے منہ
گھر آئی۔ جب تک عنفوانِ شباب رہا، مہیا عیش جوانی کا
اسباب رہا۔ ہنسی خوشی میں ہمیشہ صرفِ اوقات، دن
عید، رات شب برات۔ ہاں باایں ہمہ ہر حال میں وضع کا خیال
رہا۔ ہر امر میں مدنظر اعتدال رہا۔۔۔۔ چنانچہ اپنے جلسے کے
جو یار تھے، وہ سب کے سب علامہ عصر و فہامۂ روزگار تھے۔
ان میں ایک نواب محمد قاسم خاں خلف الصدق نواب محمد ناصر
خاں خاندانِ سترگ نواب بنگالہ سے اور بنا بہ متعلق ریاست
نواب فرخ آباد والا سے۔۔۔۔۔ دوسرے فلسفیٔ زمانہ حکیم
دوران، دبیر خاقان، راجہ کندن لعل بہادر منشی الملوک
اور وہ جن کی بیشتر کتابیں علوم مختلفہ۔۔۔۔۔ میں بہت
مستند موجود ہیں، گو وہ اس دار فانی ...
ان کے چھوٹے بھائی لکھنؤ میں حاکم بیت الاجرا دستاویز۔۔۔
ورشکی تخلص منشی ہزاری لعل، دوست کمیو المعروف بہ منشی
تجو۔۔۔۔۔ خالِ زلفِ معشوق کی طرح ہندو پیدا ہوئے۔
لیکن مصحفِ رخسار اور کعبۂ ابرو کے ...
... [illegible]

...... چوتھے جناب میر قاسم علی خاں صاحب قاسم تخلص سلمہٗ اللہ تعالیٰ، والا دودمان وذوالمدارج الاعلیٰ ... نثر نظم دونوں میں راسخ، شاگرد جناب استادی شیخ امام بخش ناسخ ...... پانچویں مولوی میر وارث علی صاحب سلمہٗ اللہ ...... شعر و شاعری میں سبقتی تخلص، مضامین تازہ اور دقیق کا تفحص ...... غرض ایسے بہت احباب یاران علیہ عالم شباب کہ بعض ان میں سے موجود ہیں، خدا ان کو سلامت رکھے اور جو نابود ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں بخشے ....

(ص ۴ تا ص ۱۰)

نغمت المسرت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اوراق میں چودھری عبدالغفور سرورؔ کی ایک نثر اور اردو فارسی کلام کافی مقدار میں محفوظ ہے۔ سرورؔ غالب کے نامور شاگردوں اور دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کا کلام تقریباً نایاب ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے ان کے خاندان والوں سے چند قطعات تاریخ اور ایک نعتیہ اردو قصیدہ حاصل کر کے ماہنامہ آج کل دہلی بابتہ ماہ فروری ۱۹۵۵ء میں شائع کروایا تھا اور عام طور پر اب تک یہی ان کا کل محفوظ سرمایۂ فکر سمجھا جاتا ہے۔ آرزو صاحب کے دریافت کردہ اس سرمایۂ کلام میں سے دس قطعات تاریخ جن میں سے دو اردو میں اور باقی آٹھ فارسی میں ہیں، واقعی سرورؔ کی تصنیف ہیں لیکن جس نعتیہ قصیدے کو انھوں نے سرورؔ سے منسوب فرمایا ہے وہ فی الحقیقت ان کا طبع زاد نہیں۔ اس قصیدے کے مصنف غالب ہی کے ایک اور مارہروی شاگرد چودھری عطا حسین عطاؔ ہیں۔ چنانچہ ان کے ... شعر میں جو نیچے نقل کیا جا رہا ہے، ان کا تخلص موجود ہے ...

بخشی خلعت کو تیرے کون جگاتا ہے عطاؔ
ان مگر وہ ہے ابرار شفیع امت

سرورؔ کے متذکرہ بالا قطعات تاریخ کے اشعار کی مجموعی تعداد چالیس ہے ... کی تاریخ ترتیب سے متعلق ایک اردو رباعی کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے تو ان کے محفوظ اشعار کی مجموعی تعداد چھیالیس ہو جاتی ہے۔ یہ تمام کلام ایک ہی صنف یعنی تاریخ گوئی سے متعلق ہے۔ نغمت المسرت میں محفوظ کلام اس سرمایے میں جو اضافہ کرتا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

(الف) قطعۂ فارسی در مدح آغا سخاوت علی بیگ (۱۹ اشعار)
(ب) ختنہ و مکتب کی مبارکباد سے متعلق ایک اردو غزل جو اس کی مشہور طوائف امیر جان نے گائی تھی۔ (۲۷ اشعار)
(ج) تقریب مکتب نشینی کا فارسی قطعۂ تاریخ۔ (۱۱ اشعار)
(د) شادی مکتب سے متعلق نثر کے ساتھ شامل دو اردو اشعار مشتمل بر تخاطب بہ ساقی۔ (۲ شعر)

یہ تمام اشعار جن کی کل تعداد ۵۹ ہے۔ جناب ویریندر پرشاد سکسینہ نے اپنے ایک مضمون "غالب کے ایک شاگرد سرورؔ مارہروی" مطبوعہ ماہنامہ رفتار زمانہ حیدرآباد بابتہ ماہ مارچ ۱۹۶۷ء میں یکجا کر دیے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کا نقل کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ سرورؔ کا سال وفات نامعلوم ہے اس لیے یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ نغمت المسرت کے یہ مندرجات ۱۲۹۱ھ (۷۴-۱۸۷۴ء) تک ان کے بقید حیات ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں)

(۷) اگست ۱۹۸۱ء میں مضمون کی اشاعت کے بعد مہر کی بعض تصانیف کے متعلق معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

(الف) پنجۂ مہر :- اس کتاب کی طباعت یا عدم طباعت کے بارے میں کوئی باوثوق اطلاع موجود نہیں تھی۔ مثنوی کے جس قطعۂ تاریخ کو راقم السطور نے سال طباعت کا حامل قرار دیا تھا، حقیقتاً اس کی نوعیت بالکل غیر واضح ہے۔ چنانچہ ... خاں صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بجا طور پر ... فرمایا ہے کہ اس قطعے کے آخری مصرعے سے حاصل شدہ سنہ (۱۸۵۲ء) پنجۂ مہر کے سال طباعت کے بجائے اس کا سن

[illegible] ہو سکتا ہے[؎]

راقم السطور کو اس رسالے کا سالِ طباعت تو اب بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے لیکن قہر کے حالات کے تحت عبداللہ خاں ضیغم کے اس بیان سے کہ:

"دیوان اور پنج مہر آپ کی تصنیفات سے مطبوعہ موجود ہیں"[؎]

یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ رسالہ چھپ چکا ہے۔

(ب) **پارۂ عروض:** اس کتاب کے متعلق سابقہ معلومات میں صرف اس قدر اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے قہر کے شاگرد محمد وارث علی مرتب نے شائع کرایا ہے جنھیں اس کا اصل نسخہ خود قہر نے ازراہ شاگرد نوازی عطا کیا تھا۔

(ج) **داغِ دلِ قہر:** مضمون کی تحریر کے وقت اس کتاب کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا کہ اسے واسوخت قرار دینے والے مصنفین کے بیانات درست ہیں یا مثنوی قرار دینے والوں کی اطلاع صحیح ہے۔ اس کے ساتھ ہی بر بنائے قیاس یہ رائے قائم کی گئی تھی کہ "داغ دل قہر" اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۸۴ھ حاصل ہوتا ہے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد جناب شاہد حسین ایڈووکیٹ کی عنایت سے اس کے ایک ناقص الطرفین نسخے سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا۔ جس سے پہلی بات تو یہ دریافت ہوئی کہ یہ واسوخت ہے جو اس صنف کی روایت کے عین مطابق مسدس کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی دس صفحات غائب ہیں۔ آخری صفحہ جس کا نمبر ۳۴ ہے، قطعاتِ تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کے غائب شدہ صفحات کی تعداد کے تعین کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ ہر صفحے پر مسدس کے چار بند منقول ہیں۔ اس طرح متن کے محفوظ تیرہ صفحات باون بندوں پر مشتمل ہیں۔ شروع کے دس صفحات کے ساتھ ضائع شدہ بندوں کی تعداد ۳۲ ہو یا ۳۴ ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر اندازہ یہ ہے کہ یہ واسوخت کل چوراسی یا چھیاسی بندوں پر مشتمل ہوگا۔ واسوخت کا آخری شعر جس سے اس کی تاریخ تصنیف نکلتی ہے، درج ذیل ہے۔

کہ آخر میں یہ کہا پھر ہے اردو واسوخت
اس کی تاریخ بھی اے قہر ہے اردو واسوخت

"اردو واسوخت" سے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۸۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہی سنہ داغ دل قہر سے بھی نکلتا ہے۔ ان دونوں تاریخوں کے علاوہ مرزا عنایت علی آہ کا مندرجہ ذیل مطلعِ تاریخ بھی اسی سال کی نشان دہی کرتا ہے:

یہ ہے واسوخت وہ جس کا مثل نہیں جس کا جواب
اس کی تاریخ ہے اے آہ "تب و تاب عتاب"

سالِ طباعت کی صرف دو تاریخیں محفوظ ہیں۔ پہلی تاریخ مرزا سخاوت علی بیگ ضیا نے ایک مطلع میں اور دوسری نیاز علی پریشاں نے دو شعر کے ایک قطعے میں نظم کی ہے۔ ان دونوں تاریخوں سے ۱۲۸۹ھ (۷۳-۱۸۷۲ء) حاصل ہوتا ہے۔ ضیا کا مطلعِ تاریخ درج ذیل ہے:

طبع واسوخت کی تاریخ ابھی کہہ دے ضیا
"شعلۂ طور کا پر تو ہے یہی" کہہ دے ضیا

شروع اور آخر کے صفحات موجود نہ ہونے کی بنا پر مطبع کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

(د) **شبیہِ عشرت:** یہ کتاب بھی مضمون کی اشاعت کے بعد جناب شاہد حسین ایڈووکیٹ کی عنایت سے دستیاب ہوئی۔ موصوف سے حاصل شدہ نسخہ کے بعض ابتدائی صفحات انتہائی شکستہ و بوسیدہ حالت میں تھے اور بعض یکسر ضائع ہو چکے تھے۔ اس ناقص حصے کے مشتملات سے متعلق تفصیلات مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مقیم لاہور) نے عنایت فرمائیں۔ یہ رسالہ ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور ماہ ستمبر ۱۸۷۱ء میں مطبع مصدر اللطائف، اٹیہ سے چھپ کر شائع ہوا ہے۔ قہر نے اس میں اپنے صاحبزادے مرزا سخاوت علی بیگ کی شادی

اور پوتے مرزا قاسم حسین کی ولادت سے متعلق تاریخیں اور نظمیں بھی کہہ کے چھپوائی ہیں۔ مرزا سخاوت علی بیگ کی شادی میر وزیر علی صبا کی صاحبزادی سے لکھنؤ کے محلہ شاہ گنج، احاطہ مکین بیگ میں واقع ان کے مکان پر بروز جمعہ ۵ ارجمادی الثانی ۱۲۸۵ھ (۲ راکتوبر ۱۸۶۸ء) کو ہوئی تھی۔ اسی پر مسرت موقع پر "بشیر اعزا و احباء سخندان ذو ... روزنہ دیک سخنے قطعات تاریخ تہنیت موزوں کرکے مولف کو ممنون عنایات فرمایا تھا" اس کے بعد جب آٹھویں محرم ۱۲۸۷ھ (۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء) کو یکشنبہ کے دن مرزا قاسم حسین کی ولادت ہوئی تو اس کی تاریخیں بھی بلاد و امصار سے احباب سخن آفریں نے عنایت فرمائیں اور بعض نام تاریخیں اور چند تاریخیں فکر ... (مولف) ..... انصرام پائیں۔" اس کے بعد مولف کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ "ان دونوں تقریبوں کی تاریخیں اور نام تاریخی اور زائچہ مولود مسعود..... مع کیفیت مختصر روز ولادت مجتمع کرکے چھپوا دیجئے تاکہ اس دار ناپائیدار میں یادگار رہیں۔" چنانچہ "پہلے تاریخ عقد اور بعدہٗ تاریخ میلاد بترتیب لکھ کے اس مجالہ کا نام تاریخی "شبیہ عشرت" رکھا۔"

شبیہ: اگرچہ اصلاً منظومات کا مجموعہ ہے تاہم اس میں قطعات تاریخ اور تہنیتی نظموں کی رسید اور شکریئے میں نیز ان کے جواب الجواب کے طور پر لکھے ہوئے بعض خطوط بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ ان میں مہر کے دو خطوں کے علاوہ ایک اہم خط تنویر شکوہ آبادی کا ہے جو اس مجموعے کے صفحات ۵۲ و ۵۳ پر منقول ہے۔ نعمت المسرت کی طرح شبیہ عشرت میں شامل قطعات و منظومات میں بھی سب سے اہم چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے کلام کے نمونے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) سات اور دو شعروں پر مشتمل فارسی کے دو قطعات تاریخ۔ (۹ اشعار)

(۲) فرد تاریخی فارسی (ایک شعر)

(۳) ایک "غزل سہرہ" اردو (۷ شعر)

(۴) مثنوی تاریخی در تہنیت ولادت فرزند۔ فارسی۔ (۸ شعر)

اردو میں لکھا ہوا سہرا غالب کے مشہور سہرے کی زمین میں ہے اور اس کے مقطعے میں سرور نے غالب کے مصرعے پر مصرع لگا کر فخریہ انداز میں ان کے تتبع کا اعتراف بھی کیا ہے فرماتے ہیں ؎

ہے تتبع میں یہ غالب کے سب اشعار سرور
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

یہ سہرا اور دوسرے تمام اشعار بھی جناب ڈریحیدر یہ شاد نگینہ اپنے مضمون مطبوعہ ماہنامہ سخنا بر زمانہ حیدرآباد میں شائع فرما چکے ہیں۔

(۸) ہمدم آخرت: آخر میں شائع شدہ ایک اعلان "رسالہ در ثبوت صحت تاریخ" لکھے سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی مہر کی وفات کے بعد ان کے پوتے مرزا قاسم حسین نے شائع کرائی تھی۔ دیوان ضیا میں اس کے سال تصنیف کا قطعۂ تاریخ موجود ہے جس کے آخری مصرع سے ۱۲۹۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

میرے والد نے کہی یہ مثنوی
اے ضیا شان سخاوت ہے یہی
دولت ایمان میں تاریخ کہہ
جائے تحقیق حقیقت ہے یہی

(۹) رسالہ در ثبوت صحت تاریخ: اس رسالے کا تعارف جناب کاظم علی خاں کے حوالے سے "رسالہ زبدۃ البینات" کے نام سے کرایا گیا تھا۔ بعد میں سید مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی کے مکتوب گرامی موسومہ راقم مورخہ ۲ جون ۱۹۸۱ء سے معلوم ہوا کہ اس کا اصل نام "رسالہ در ثبوت صحت تاریخ" ہے اور یہ مرزا قاسم حسین کی "سعی و کوشش" سے مطبع چشمۂ فیض لکھنؤ میں چھپ کر

شائع ہو چکا ہے۔ رسالے کی ضخامت کل آٹھ صفحات ہے۔ اس میں نہ تو
کہیں بھی اس کا سنہ طباعت درج ہے اور نہ اس کے کسی اندراج
سے اس کا سالِ تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ مہر نے اس کے سببِ تصنیف
کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"جناب مرزا سلامت علی دبیر نے جو تاریخ ...... جناب
میر ببر علی صاحب انیس کے انتقال کی بطابیہ زبردہینہ کمال جدت
کے ساتھ فرمائی، اس کے سمجھنے میں نابلدانِ کوچۂ تحقیق کو انتہائی
پریشانی ہوئی کہ آخر سمجھانے کی نوبت آئی تو سید بادشاہ علی
متخلص بہ بقا ابن میر مذبر علی صاحب اسکنہ اللہ فی الجنت المادا
خواہش مرزا مغفور نے اس کو کیفیت واقعی ناواقفوں کے ذہن نشین
پر جانی کرنے کو طریقۂ سوال و جواب جو ایجاد کیا اور رانہام تفہیم
نکات دعوا معنی سے طبیعت متردین کو شاد کیا...... اور
سید محمد علی حسین وکیل عدالت صدر اودھ المتخلص بہ شمس
نے ایک رسالہ مسمی بجلوۂ نیرنگ عجیب سخن بھی اس قطعۂ تاریخ
کے اشعار معترضۂ معترضین کے جواب میں دندان شکن تحریر کیا
ہے تو بندہ ذرہ بے مہر، حاتم علی مہر نے اس رسالہ کی تکمیل و تائید
میں مرکب (کذا؟) تفہیم تاریخ تصنیف مرزا سلامت علی صاحب
دبیر مغفور کو مناسب سمجھ کر یہ مختصر رسالہ جداگانہ ترتیب دے
دیا تاکہ متردین کو تاریخ نکالنے میں جو چند طریق مختلف
سے پیدا ہوتی ہے، آسانی ہو جائے۔"[۱۱۸]

مہر کے اس بیان سے جہاں اس رسالے کی تصنیف کی غرض
وغایت کا علم ہوتا ہے وہیں اس کے زمانۂ تصنیف کے تعین میں
بھی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے اس عبارت میں دو جگہ دبیر کا ذکر
بصیغۂ مرحوم کیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رسالہ
ان کی وفات یعنی ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء
کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے کی دوسری شہادت علی حسین
کے رسالے "جلوۂ نیرنگ عجیب سخن بھی" کا حوالہ ہے۔ ہمارے
نزدیک عجیب اس نام میں سہو کتابت ہے، اسے "عجب" ہونا
چاہیے۔ اس طرح اس کا پورا نام ہوگا "جلوۂ نیرنگ عجب
سخن بھی" ہے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ مہر کا
رسالہ یقینی طور پر اس کے بعد کی تصنیف ہے۔

(۷) آتو قیر شرف:[۱۱۹] یہ کتاب بھی راقم السطور کو دستیاب
نہیں ہوئی تاہم اس کے نام سے
حاصل شدہ اعداد کی بنیاد پر یہ رائے قائم کرتے ہوئے کہ یہ
۱۲۹۶ھ کی تصنیف ہے قیاس یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا
کہ یہ اسی سال صفر کے مہینے میں (۱۰ فروری ۱۸۷۹ء کو لفٹننٹ
گورنر کے دربار آگرہ کے موقع پر ان کے حضور میں پیش کی گئی۔
کسی کتاب یا نظم کا نام ہو سکتا ہے۔ بعد میں دیوانِ ضیا کے
مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب کسی مذہبی موضوع سے متعلق ہے۔
ضیا نے اس کی تاریخ تصنیف اس قطعے میں نظم کی ہے ~

اے ضیا قبلہ و کعبہ میرے
مہر ہیں باغِ جہاں میں روشن
ان کی تالیف کی ہے یہ تاریخ
ہادیٔ مذہبِ حق کا گلشن

۱۲۹۶ھ

(۸) مرزا غالب نے ایک خط میں مہر کو عہدۂ وکالت کی
مبارک باد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجیے۔
پریوں کی تسخیر کیا کیجیے۔ مثنوی پہنچی...... اس مثنوی نے
اگلی مثنویوں کو تقویمِ پارینہ کر دیا۔ "بیانِ بخشائش" ہم گنہگاروں
تک کیوں کر پہنچے گا...... میرزا یوسف علی خاں......
دو روز سے "شعاعِ مہر" کو دیکھ رہے ہیں...... اور
شعاعِ مہر کے مداح اور "بیانِ بخشائش" کے مشتاق ہیں۔"[۱۲۰]

مثنوی "شعاعِ مہر" ۵ دسمبر ۱۸۶۰ء کو اور "بیانِ بخشائش"
۲۷ [illegible] ۱۲۷۷ھ [illegible] کو چھپ کر شائع ہوا۔ اس اعتبار سے یہ
خط بظاہر ۱۸۶۱ء کے اوائل کی تحریر قرار پاتا ہے۔ اس خط کی
رو سے عہدۂ وکالت پر مہر کے تقرر کو بھی اسی زمانے کا واقعہ
ہونا چاہیے لیکن اودھ اخبار مورخہ ۲۰ [illegible] کی یہ خبر کہ

"حسب الحکم حکام تقرر مرزا حاتم علی کا بعہدہ وکالت صدر، دیوانی و نظامت ممالک مغربی مشتہر کیا جاتا ہے"[12] اس سے مختلف صورت حال کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس اعلان کے مطابق غالب کے اس خط کا زمانۂ تحریر ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء کے بعد قرار پائے گا۔ جو اس لحاظ سے ناقابل قبول ہے کہ متعارف مہر کا جس پر غالب نے تقریظ بھی لکھی ہے، طباعت کے ڈھائی برس کے بعد ان تک پہنچنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غالب کے پیغام تہنیت کو اس تقرر کے بجائے اس سے پہلے کے کسی تقرر سے متعلق قرار دیا جائے بظاہر یہی صورت زیادہ قرین قیاس بھی ہے۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ ابتدائی طور پر مہر کا تقرر ضلعی عدالتوں کے وکیل کی حیثیت سے ۱۸۶۱ء کے اوائل یا وسط میں عمل میں آیا ہوگا اور ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء میں انھیں عدالت صدر دیوانی و نظامت (ہائی کورٹ) میں وکالت کی اجازت دے دی گئی ہوگی۔

(۹) میر وزیر نور شاگرد مرزا محمد رضا برق کا ایک قطعۂ تاریخ ہماری معلومات میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ مہر کو ۱۲۹۳ھ (۷۶-۱۸۷۵ء) میں سرکار برطانیہ کی طرف سے سند قیصری بھی عطا ہوئی تھی۔ قطعہ درج ذیل ہے ؎

جناب قیصر ہندوستاں ز مہر و کرم
سند بمہر عطا کرد بہر ضیا اکنوں
بگفت نور دعائیہ بہر تاریخ
کہ شان و شوکت و اقبال او بیاد فزوں[13]

مہر کی زندگی اور شخصیت کے بعض اور گوشے بھی ابھی مزید تحقیق اور توجہ کے مستحق ہیں۔ بشرط حیات و فرصت ان میں سے بعض پہلوؤں پر آئندہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔"

---

[1] "سراپائے سخن" مطبوعہ مطبع نول کشور طبع ۱۸۷۵ء ص ۸۰ [2] دیوان غریب (از نادر) مطبوعہ مطبع دل کشا، فتح گڑھ، طبع فروری ۱۸۶۸ء ص ۲۱۷۔ [3] روز روشن ص ۶۶۲ [4] مولانا آزاد نے مرزا غالب کے حالات میں لکھا ہے کہ "مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ۔ ۔ ۔ ان سے خط و کتابت جاری ہوئی ۔ ۔ ۔" (آب حیات شائع کردہ عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ص ۵۲۷) [5] منشور المسرت مطبوعہ مطبع تصویر عالم پریس لکھنؤ، حاشیہ ص ۴ [6] ریاض مالا مطبوعہ مطبع رحیمی واقع قنوج "حسب فرمائش جناب مرزا رعایت علی بیگ عرف ننھے مرزا صاحب باہتمام عبدالرحیم خاں عرف بیگ خاں رحیم" سنہ طبع ندارد، سرورق ص ۲ [7] منشور المسرت۔ حاشیہ ص ۱۲ [8] تلامذۂ غالب (مطبوعہ ۱۹۵۷ء) میں کلام سرور کے نایاب ہونے کے ذکر کے بعد آرزو صاحب کے پیش کردہ انہی قطعات میں سے دو قطعے بطور نمونہ نقل کر دیئے گئے ہیں (ص ۱۵۱) اسی طرح "غالب اور سرور" (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے مصنف ایم حبیب خاں کے ۔ ۔ ۔ یک بھی ۔ ۔ ۔ ان قطعات اور نعتیہ قصیدے کے علاوہ سرور کا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام موجود نہیں" ص ۱۶ [9] ایم حبیب خاں نے اپنی کتاب غالب اور سرور میں سرور کے بھانجے اور پیر متبنیٰ چودھری عبدالصبور صابر کا ایک قطعۂ تاریخ انتقال نقل کیا ہے (ص ۱۶)، لیکن راقم السطور باوجود کوشش کے اس سے سنہ وفات دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ اس قطعے کے کسی مصرعے کے نیچے کوئی سنہ بھی مندرج نہیں [10] مرزا حاتم علی مہر: چند حقائق مضمون مطبوعہ ہفت روزہ ہماری زبان۔ دہلی شمارہ ۱۵ دسمبر ۱۹۸۰ء [11] یادگار ضیغم مرتبہ محی الدین قادری زور، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد ص ۱۰۹ [12] بحوالہ مضمون "تبلا آں، تسلیم اور دولا کی معرکہ آرائی" از کبریٰ جلال مطبوعہ مجلہ نقوش لاہور، ادبی معرکے نمبر، جلد دوم (شمارہ نمبر ۱۲۷، ستمبر ۱۹۸۱ء) ص ۱۸۰ [13] خطوط غالب۔ از مولانا غلام رسول مہر، طبع سوم (۱۹۶۲ء) ص ۲۱۹ و ۲۴۸۔ [14] بحوالہ مضمون "غالب اور منشی نول کشور" از کاظم علی خاں مشمولہ ماہنامہ نیا دور، نول کشور نمبر (شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء) ص ۱۲۸۔ [15] دیوان موسوم بہ ضیاء نور۔ مطبوعہ مطبع کارنامہ لکھنؤ (۱۲۹۶ھ)

ہم قلموں کے نام

نصر قریشی
۲۹ - بٹیا بہادر گنج۔ الہ آباد - ۳

ہمقلمو! ہمعصرو! آؤ، ارضِ وطن کا گیت لکھیں
اپنے وطن کی پاک زمیں کو نغموں کا نذرانہ دیں!

اپنا وطن ہے فخرِ زمن، صد رشکِ چمن گہوارۂ فن
اپنے وطن سے انسانی تہذیب نے پایا پیار کا دھن
امن کے نغموں سے گونجے ہیں اس کے دھرتی اور گگن
اس کے ہر ذرّے میں نہاں ہے موسمِ گل، خوشبو کا چمن
اس کی عظمت کے افسانے دہرائے دنیائے سخن
ملکوں ملکوں شہرت اس کی دل ہے الفت کا درپن
تہذیبوں کے سنگم پر ہوتا ہے روز و شب کا ملن
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سے معمور ہیں گھر آنگن
وقت پڑے تو ہنس کے لٹاتے ہیں پروانے جان و تن
اس کے لیکھک، دانش ور ساری دنیا میں ہیں روشن
اس کے شاعر اور فلسفی دیتے ہیں دنیا کو چلن
اس کے مدبر اور سیاست داں افکار کی ہیں دھڑکن
اس کے مبلغ اور سدھارک اعلیٰ قدروں کے درپن
رشیوں، منیوں، پیر، فقیروں نے بخشا ہے روح کو تن
من کی پیاسی دھرتی پر بادل ہے سے لے کر ساون
پیار کی برکھا سے کانٹوں کی وادی بھی ہے اک مدھوبن
اپنے وطن کی پاک زمیں پر سر کو جھکاتا ہے دشمن
بیگانوں کو بھی صدیوں سے اپناتا ہے اپنا وطن
بیگانوں نے اس کے پیار کی چھاؤں میں پایا ہے مسکن
اس دھرتی پر راحت پا کر بھول گئے سب اپنا وطن
اپنے وطن کی دولت سے ہر ایک نے بھرے خالی دامن
اپنے وطن کی پاک زمیں پر سکھ اور شانتی کا جیون

اے ہمقلمو! پھر عظمت لوح و قلم نے ہم کو پکارا ہے
فکر کی مشعل تیز کرو، ظلمت نے سب کو مارا ہے

پیار کی شبنم دل کے سوکھے پتوں کو شاداب کرے
پیار کا بادل پیاسی دھرتی کا آنگن سیراب کرے
صحنِ چمن کو اپنی رنگت سے رنگین گلاب کرے
ظلمت کے گوشوں کو روشن پیار و اک مہتاب کرے
نفرت کا بس ایک کنول گندہ سارا تالاب کرے
اک چنگاری خرمنِ ہستی کا خاکستر خواب کرے
اک سوراخ ہی پل بھر میں کشتی کو زیرِ آب کرے
خون کا اک قطرہ ہی جامِ احمر کو خوناب کرے
پیار کی کھیتی کو ویرانہ نفرت کا سیلاب کرے

ہمقلمو! ہر قلم کو ارضِ وطن کا قرض چکانا ہے
کاغذ اور سیاہی کا جائز مصرف سمجھانا ہے

قلم کا سورج ظلمت کے گوشوں کو ہر سو چمکائے
کالی راتوں کے ماتھے پر چاند کا جھومر دمکائے
قلم روشنی کی آواز ہے اندھیاروں سے ٹکرائے
سویا ہوا ماحول قلم کی ایک صدا سے اٹھ جائے
قلم محبت اور اخوت کا پرچم ہی لہرائے
قلم سے ذہن و دل کا دریچہ پل بھر میں کھلتا جائے
قلم کی خوشبو من کے گلشن کے ہر پھول کو مہکائے
قلم بہاروں کے نغموں سے ایک نیا موسم لائے
قلم مورخ، قلم مفکر، قلم مدبر کہلائے
قلم کی طاقت کے آگے شاہوں کا سر بھی جھک جائے
قلم، وفا کے گیت، جفا کے دور میں بھی ہنس کر گائے
قلم ہی خونِ شہیداں سے ہر جو لاتسبنی کر جائے

ہمقلمو! ہم لوگ وطن کی عظمت کے نغمے گائیں
اپنی تحریروں سے وقت کو ایک نیا رخ دے جائیں

کشور سلطانہ
۱۳۹۷، اقبانان کرتپور (بجنور)

نغمۂ وطن

وہ حسنِ بے مثال جو ہندوستاں میں ہے
دنیا کے طول و عرض، نہ باغِ جناں میں ہے
یوں تو حسین پیرس و لندن سہی مگر
کشمیر کا جواب کہاں اس جہاں میں ہے
دشمن کا ڈر ہو کیوں تجھے اے مادرِ وطن
جب تک ترا ہمالہ ترے پاسباں میں ہے
پیدا کبیر و غالب و تلسی یہیں ہوئے
جن کا کلام فخر کے قابل جہاں میں ہے
ہم لوگ ہیں ازل سے اہنسا کے دیوتا
یہ تذکرہ زمیں تو زمیں آسماں میں ہے
یہ سرزمیں ہے گوتم و گاندھی کی سرزمیں
جن کا شمار چارہ گرانِ جہاں میں ہے
کشور یہاں ہے شیخ و برہمن کا یہ چلن
ناقوس پر یقیں ہے تو ایمان اذاں میں ہے

نشاط فیض آبادی
محلہ احاطہ اٹل خان، فیض آباد

آج کتنا جواں میرا یہ دیش ہے

چاند ایسی زمیں پھول ایسا گگن، مسکنِ مہوشاں میرا یہ دیش ہے
اوجِ بامِ ترقی ترے واسطے، زینۂ کہکشاں میرا یہ دیش ہے
ہند میں اس کی تاریخ ممتاز ہے، یہ بھی اس سرزمیں ہی کا اعجاز ہے
اب قلم در قلم، اب ورق در ورق، داستاں داستاں میرا یہ دیش ہے
آئی برسات ساون کے ہرے لیے، دو دلوں پر نگاہوں کے پہرے لیے
بھیگے بھیگے بدن، بہکے بہکے سجن، گاؤں کا بر سماں میرا یہ دیش ہے
اس میں سور و کبیر ملک جائسی، اس میں آتش انیس اور چکبست ہیں
یہ ہے گلدستۂ شعر و نظم و غزل، حاملِ ہر زباں میرا یہ دیش ہے
جسم و نشو و نما پر تاپ کے فیض سے آئی والی ہیں اردو پہ رعنائیاں
دور اندیش کتنی ریاست ہے یہ، رشکِ دانشوراں میرا یہ دیش ہے
غیر محفوظ خود کو نہ سمجھے کوئی سب کے دل میں حفاظت کی ہو روشنی
قومی یکجہتی زندگی کی قسم، ذمہ دارِ اماں میرا یہ دیش ہے
ہو جو مالی حسین تو روش کا ہر اک پھول اک دن چمن زار بن جائے گا
کس قدر خوبصورت ہے اس کی زمیں آج کتنا جواں میرا یہ دیش ہے
کارخانے، ملیں، بجلی، نہریں، کنوئیں، اسپتال اور سڑکوں کے ہیں سلسلے
زندگانی ترے ارتقا کے لیے، کس قدر مہرباں میرا یہ دیش ہے
ہے سیاست، حکومت، صحافت، قلم، ولولے ہمتیں منزلیں، پیچ و خم
ہو نہ بیجا تعلّی تو میں یہ کہوں اصل ہندوستان میرا یہ دیش ہے
آ کے شہرِ ایودھیا کو دیکھے کوئی اس کی پیچیدہ گلیوں میں گھومے کوئی
سیتا جی کی رسوئی ہے اب بھی یہاں، رام جی کا مکاں میرا یہ دیش ہے

رفعت اختر خاں
شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی۔
جے پور (راجستھان)

اسلوب کی تلاش

انگلینڈ کے پروفیسر ذکاس نے یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔

"STYLE CANNOT BE TAUGHT"

یہ حقیقت ہے کہ آج تک اسٹائل کی کوئی جامع تعریف سامنے نہیں آئی۔ پروفیسر ریمے سے لے کر بوفاں تک، کارلائل سے لے کر ایمرسن تک سب ہی اسٹائل کی تعریف بیان کرنے میں اس بات سے متفق ہیں کہ اسٹائل "شخصیت کے اظہار" اظہار کی ٹیکنک اور "اظہار کی انفرادیت" کا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلوب کے اصطلاحی معنی فن کار کے اظہار کی ٹیکنک سے وابستہ ہیں۔ شاید اسی لیے کسی کے نزدیک اسٹائل "فن کارانہ طریقہ کار" ہے تو کسی کی نظر میں اسٹائل "اظہاریت کا شعوری طریقہ کار" ہے۔ بوفاں نے اسٹائل کو شخصیت کا اظہار بتایا ہے تو ایمرسن کے نزدیک اسلوب فنکار کے "ذہن کی زبان" ہے۔ لغوی اعتبار سے انگریزی کا لفظ اسٹائل لاطینی زبان کے لفظ (STILUS) سے ماخوذ ہے۔

اردو میں اسلوب انگریزی لفظ اسٹائل کے ترجمہ کے طور پر اپنے مترادفات یعنی طرز، انداز، اور پیرایہ کے ذیل میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اسلوب کے اصطلاحی معنی مختلف ناقدین نے مختلف انداز سے تحریر کیے ہیں جو بذاتِ خود اسلوب کی ایک مثال ہے۔

مثلاً عنوان چشتی نے اسلوب کو لسانیات کی روشنی میں پرکھا ہے۔ عابد علی عابد نے اسلوب کو لسانیات کے ساتھ ساتھ جمالیات اور فنونِ لطیفہ کے ذیل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نقوی، اطہر پرویز، نثار احمد فاروقی، آل احمد سرور وغیرہ نے اسلوب کو فن کار کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید نے اسلوب کو "ہیئت کا ذریعہ" بتایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلوب فن کار کے افکار و خیالات کی ترسیل کا ایسا اظہار ہے جو موزوں و مناسب، سادہ اور بلیغ ہو۔

مندرجہ بالا تعریفات اور تشریحات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ حسن، لطافت، اور دلکشی اسلوب کی جان ہیں۔ شاید اسی لیے لونجائنس نے اسلوب کی رفعت کو "ایک بڑی شخصیت کی گونج" کہا ہے۔ اسلوب اپنی فکری صفات جیسے زورِ بیان، گداز، مزاح، بذلہ سنجی، اور صفاتِ تخیلی یعنی تجسیم، خیال افروزی، اور تصوریت کے میڈیم سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ لیکن دمیترس نے اسلوب کی چار قسمیں کی ہیں:

(۱) سادہ، (۲) شاہانہ، (۳) مرصع، (۴) زوردار کلام

لیکن دمیترس سے پہلے افلاطون اور ارسطو کے نظریات نے اسلوب کی اقسام کی ہیں۔

مثلاً افلاطون صرف ادبی تخلیق میں اسلوب تلاش کرتا ہے اس کے برعکس ارسطو سی حکمت فکر ہر قسم کی تخلیق میں اسلوب

کے وجود کا قائل ہے۔ غالباً انھیں نظریات کی بنا پر اسلوب کی تمام
کی گئی ہیں۔ اسی ارسطوئی مکتبۂ فکر کے لوگ اسلوب میں حسنِ اسلوب
کے بھی قائل ہیں۔ دراصل یہیں سے اسلوب کی اقسام شروع
ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسلوب کو اگر لسانیات کا ذیلی شعبہ قرار دیا
جائے تو محاوراتی اسلوب، استعاراتی اسلوب، علامتی اسلوب
اگر جمالیات سے اس کا سلسلہ ملایا جائے تو جمالیاتی اسلوب
انفرادی اسلوب، فنونِ لطیفہ کے اعتبار سے غنائی اسلوب، شعری
اسلوب، نثری اسلوب، تاریخ کی مناسبت سے تاریخی اسلوب۔
فلسفہ کے اعتبار سے فلسفیانہ اسلوب، موضوع کے لحاظ سے
موضوعاتی اسلوب، اور عہد یا وقت کے اعتبار سے ۱۹ویں
صدی کا اسلوب، ۲۰ویں صدی کا اسلوب، لوکاس کے
نزدیک اسلوب چونکہ "شخصیت کا اظہار" ہے
اس لیے کسی شخص کے نام سے بھی اسلوب پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی
میں جانسن اسلوب، پلاٹونک اسلوب، اردو میں میر کا اسلوب
غالب کا اسلوب، وغیرہ وغیرہ۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلوب انفرادیت سے ماورا ہوتا ہے لیکن
یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا ظہور ہمیشہ منفرد طریقہ سے ہوتا ہے۔ ہر
عہد میں ذہنی رویہ اور تصورات تبدیل ہوتے ہیں۔ تصورات کی
تبدیلی کے ساتھ زندگی کا عام طرزِ عمل بھی بدل جاتا ہے۔ لہٰذا
ادب، تہذیب، اور تمدن بھی بدل جاتا ہے۔ نتیجتاً اسالیب
بیان میں بھی تغیر آنا ایک فطری امر ہے۔ مثلاً اسلوب کا ایک
کلاسیکل تصور یہ ہے کہ اسلوب "اظہار کے زیور" کا نام
ہے۔ لیکن مڈلٹن مرے نے (PRECISION) پر زور دیا
ہے۔ لوکاس کہتا ہے کہ:

ہر فن یا مواد اور ہیئت کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے
یعنی جب کوئی خیال اپنی لازمی، فطری، اور آخری ہیئت
اختیار کر لیتا ہے تو اس میں خود بخود اسلوب پیدا ہو جاتا ہے۔

بقول عنوان چشتی "اس خیال کے تحت خیال اور ساخت
ناقابلِ تقسیم اکائی ہے اور اسلوب کا بنیادی وصف اس
کا ناگزیر ہوتا ہے لیکن یہ محض اس صورت میں ممکن ہے جب
خیال اپنی آخری ہیئت اختیار کر لے دوسری صورت
میں نتیجہ صفر ہے"۔۔۔۔

جب کوئی فن کار کسی لفظ کا استعمال کرتا ہے تو قاری
کے ذہن پر پہلے اس لفظ کا ظاہری اثر ہوتا ہے۔ جب وہ پڑھتا
ہے تو اس کا مجموعی اثر ہوتا ہے۔ پھر اس لفظ کے پیچھے دبے
ہوئے احساسات، جذبات اور اس کی پوری تاریخ اپنا اثر چھوڑ
جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں الگ الگ اثرانداز نہیں ہوتیں
بلکہ بیک وقت اثر کرتی ہیں اور یہی فن کار کی صناعی، تکنیک
اور اسلوب جانچنے کی میزان ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات
بھی مصدقہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا رجحان بدلتا
ہے تو اسالیبِ بیان بھی بدل جاتے ہیں۔ نثری و شعری اسلوب
اور اس کی اقسام کو مدنظر رکھتے ہوئے کولرج نے "نیوٹرل
اسٹائل" کی اصطلاح رائج کی تھی لیکن نثری اسلوب
نثری ہوتا ہے اور شعری اسلوب شعری! ایک نثری اسلوب
اور ایک شعری اسلوب کی مثال پیش کرتا ہوں تاکہ بات اور
واضح ہو جائے۔

میرامن کی باغ و بہار میں بہن بھائی سے مخاطب
ہے اور نصیحت کرتے ہوئے کہتی ہے:

"اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی
موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔
جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہو جاتی ہوں۔ تو نے مجھے
نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے،
گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر
رہتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ دیتے ہیں خصوصاً
اس شہر کے آدمی بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے کہ اپنے
ماں باپ کی دولت کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا ہے، نہایت
بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام
کو سبب لاج لگنے کا ہے نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں

بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال کر رکھوں "۔۔

میرامنؔ نے عورت کے روپ میں ہمیں وہ بہن دکھائی ہے جس کی محبت کا دامن ازل سے بھائی کی ذات سے بندھا ہے اور ابد تک بندھا رہے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ میرامنؔ کی زندگی اسلوب اور شخصیت بن کر ان کی کتاب میں جھلکتی ہے۔

نثری اسلوب کے علاوہ شعری اسلوب کی انفرادیت کی جڑیں شعری تجربہ میں پیوست ہوتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن " اسلوب کی ابتدا اس لمحہ ہوتی ہے جب ہم کسی خاص شے سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اختتام اس وقت ہوتا ہے جب مصنف یا شاعر اپنے شہ کار کو پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آج شعر و ادب میں اقبالؔ کے اسلوب سے کون واقف نہیں۔ ایک معمولی استعداد کا قاری بھی اقبالؔ کے شعر کو اس کے معمولی شعر کے ذریعہ پہچان لیتا ہے خصوصاً اقبالؔ کا وہ شخصی مرثیہ جو انھوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" لکھا ہے۔ شخصی مراثی کی تاریخ میں انفرادی اسلوب اور انوکھی جدت کی وجہ سے آج بھی زبان زد خاص و عام ہے۔"

اس مرثیہ کی تمہید میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ تقدیر کا زندانی ہے اور موت کی تدبیر صرف "مجبوری و بے چارگی" ہے۔ شمس و قمر ہوں یا انجم سیماب پا، غنچۂ اسیر ہو یا سینۂ گل، نغمۂ بلبل ہو یا دشت و صحرا، ہر چیز فانی ہے جب اس مجبوری کا راز عیاں ہوتا ہے تو اشک کا سیل رواں بھی خشک ہو جاتا ہے۔ غرض نوائے شکوہ سے آلام انسانی کے راز کا پتہ نہیں چلتا۔ جس طرح پردۂ مشرق سے صبح نمودار ہوتی ہے تو آفاق سے دامنِ شب کا داغ دھلتا ہے۔ یہی صبح لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے، بے نوا طائر کو مست نوا کرتی ہے۔ سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہو جاتا ہے اور سیکڑوں نغمے فضا میں گونج اٹھتے ہیں، یہاں تک کہ خفتگانِ لالہ زار و کہسار و رود بار بھی عروسِ زندگی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے ؎ یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اور پھر لکھتے ہیں کہ ؎

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اُس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مرثیہ کے ہر شعر سے اقبالؔ کا اسلوب قاری بآسانی پہچان لیتا ہے کیونکہ اندازِ بیان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اقبالؔ کے اسلوب و اندازِ بیان میں موضوع کا انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص، طرزِ فکر اور تاثیر سب ہی عناصر سے اقبالؔ کا اسلوب تعمیر ہوا ہے۔ بقول کارلائل:

" اسلوب کسی ادیب یا شاعر کا کوٹ نہیں ہے کہ جب چاہا اتارا اور جب چاہا پہن لیا۔ یہ انسان کی جلد ہے"

ہر بڑے شاعر اور بڑے ادیب کی اپنی محفل ہوتی ہے جہاں لفظوں، فقروں، ترکیبوں، اور جملوں کو مہذب کیا جاتا ہے۔ اسی تہذیب اور اس تہذیب کے آداب اور طور طریق کو اسلوب کہا جاتا ہے، لیکن بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے بعد سے اردو شعر و ادب میں ایک نیا اسلوب نشو و نما پا رہا ہے اور یہ اسلوب مرکب ہے۔

علامت نگاری (سمبالزم) اور پیکر نگاری (امیجزم) سے گویا آج کی شاعری (خواہ غزل ہو یا نظم) کے دو نمائندہ اسلوب علامت نگاری اور پیکر نگاری ہیں۔

شعر کو فکر و اسلوب کی اکائی بنا کر پیش کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ عمل پل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے۔ ذرا قدم پھسلا اور فن کار کھائی میں گرا۔ شعر کی یہ وہ منزل ہے جہاں ناخن سے اسلوب چھیلئے تو فکر کا گودا ہاتھوں میں آ جائے اور فکر کو چھیلئے تو اسلوب ہاتھوں میں آ جائے۔ شاید اسی لیے پوپ نے اسلوب کو "خیال کا لباس" بتایا ہے۔

غرض اسلوب (اسٹائل) ایک ایسی صنعت شعر و ادب ہے جو فن کار کی شخصیت کو الفاظ کے ذریعہ متعارف کراتی ہے۔ ہر عہد میں فن کار نئے اسلوب کی تلاش میں رہتا ہے۔ آج بھی یہ تلاش جاری ہے.....

بھگوتی پرشاد ریحان گورکھپوری کا بارہ ماسہ۔ صفحہ ۳۷ کا بقیہ

کے طور پر مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

بینتی آپ کی کی میں نے شنکر
ملا لیکن نہ میرا شیام سندر

مصرعۂ اول میں "کی کی" بھونڈا لگتا ہے۔ "کی" کا استعمال دو بار پاس پاس تنافر کا باعث ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریحان کے اس بارہ ماسے میں کچھ خامیاں موجود۔ اس کے باوجود یہ ایک اہم بارہ ماسہ ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کا رنگ و آہنگ عام بارہ ماسوں سے جدا ہے۔ اس بارہ ماسے کی فضا میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس لیے یہ بارہ ماسہ قابل قدر ہے۔

۱؎ کالی داس گرنتھاولی۔ مرتبہ سیتا رام چترویدی، صفحہ ۳۱۲ تا ۳۲۶ ۲؎ اپ بھرنش ساہتیہ۔ مرتبہ ہربنس کوچھر۔ ص ۲۶۶ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۶۰
۴؎ ہندی ساہتیہ کا ادبھو اور وکاس، مرتبہ رام بہوری شکل و بھگیرتھ مسرا ص ۱۸۰ ۵؎ "پنجاب میں اردو" پروفیسر محمود شیرانی ص ۶۶ ۶؎ کبیر کے اس مفروضہ بارہ ماسے کی تردید میں نے اپنی تصنیف "اردو شاعری میں منظر نگاری" میں واضح اور مفصل طور پر کی ہے۔ ص ۵۲۰ تا ۵۴۰۔
۷؎ جائسی گرنتھاولی۔ مرتبہ رام چندر شکل ص ۱۰۳ تا ۱۰۹ ۸؎ ہندی ساہتیہ کا ادبھو اور وکاس۔ مرتبہ رام بہوری شکل و بھگیرتھ مسرا ص ۱۸۸
۹؎ ذکر و مطالعہ۔ محمد ذکی الحق۔ ص ۲۴۱ تا ۲۲۵ ۱۰؎ بکٹ کہانی۔ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی و ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۲۸۲

✦

نثار احمد جنگیری
بردا چندن پور۔ پوسٹ کھریا بازار
نوتنوا، گورکھپور

چلے جو بات تو جمہوریت کی بات چلے
ہماری آرزو یہ ہے کہ تا حیات چلے

جو جشن صبح شروع ہو تو ساری رات چلے
خوشی میں ساتھ یہ دنیائے ممکنات چلے

یہی سکھاتا ہے چھبیس جنوری ہم کو
نہ بھید بھاؤ ہو ہم میں نہ ذات پات چلے

چلے یہ ذکر چلے عرش پر شہیدوں کا
چلے یہ فرش پہ جب کائنات چلے

نثار ایسی خوشی میں سجائیں بزم سخن
کہ جس میں صبح تلک دور غزلیات چلے

عبدالمنان صدیقی (سیتاپوری)
ساکن حال بنگلہ پرانا سیتاپور

چھبیس جنوری

۲۶

شادمانی ساتھ لے کر آئی چھبیس جنوری
یادِ ہندوستاں کی کھل گئی دل کی کلی

گلستانِ ہند میں آئی بہارِ جانفزا
پتا پتا جھومتا ہے غنچہ غنچہ کھل گیا

چلتی ہے بادِ صبا گلشن میں اتراتی ہوئی
ہوگئی رقصاں وفورِ شوق سے ہر اک کلی

غنچہ ہائے لالہ و گل یاسمین و نسترن
کھل گئے فرطِ خوشی سے کیسے ہیں جلوہ فگن

سرزمینِ ہند کے ذرے ہیں کیسے ضوفشاں
شرمگیں ہے جن کے آگے آسماں پر کہکشاں

صاحبِ عز و شرف پنڈت جواہر لال تھے
کیسے عالی ظرف تھے کتنے بلند اقبال تھے

گاندھی جی تھے درحقیقت کس قدر ذی مرتبت
کانپتی تھی نام سے جن کے فرنگی سلطنت

مخزنِ اوصاف تھے آزاد اور قدوائی بھی
ہو نہیں سکتی مدح ان کی کرم فرمائی کی

صدقِ دل سے معترف ان سب کے ہیں اہلِ وطن
زندگی بھر یاد رکھیں گے انھیں سب مرد و زن

ہے دعا ان کی شاداں رہیں اہلِ وطن
چپہ چپہ سارے بھارت کا بنے رشکِ چمن

کلیم غازی پوری
اورینٹل کالج غازی پور

آہ خاموش غازیپوری

۲۷-۹-۸۱

سائے غم و الم سے ہم آغوش ہو گئے
تارے اداس رات کے روپوش ہو گئے

جن کو سکونِ دل کی تمنا تھی اے کلیم
جو نغمے سازِ دل کے تھے خاموش ہو گئے

فطرت شناس شاعرِ رنگیں تھا جو گیا
انمول شاعری کا نگینہ تھا کھو گیا

خاموش لب پہ ایسی تھی معصومیت کلیم
محسوس ہو رہا تھا کہ انسان سو گیا

دلکش، حسین غزلوں کا شاعر گزر گیا
اک دلفریب نغموں کا جادو بکھر گیا

خاموش شاعری میں تھی خود زندگی کلیم
اب ڈھونڈتی ہیں نظریں وہ شاعر کدھر گیا

اب شہر غازی پور کی محفل اداس ہے
نظریں اداس اداس ہیں اور دل اداس ہے

طوفاں کی زد پہ کشتئ خاموش تھی کلیم
اس کے لیے امید کا ساحل اداس ہے

چھیڑ دیتی ہے وہ دل کے نغمۂ خاموش کو
شاعری کب دل پہ جادو کا اثر کرتی نہیں

زندہ و پائندہ اس کا نام رہتا ہے کلیم
کوئی شاعر مر بھی جائے شاعری مرتی نہیں

صدائے درد و الم آہ کان تک آئی
اک ادبی گل ہوا افسوس شاعری کا چراغ

ادب کی جان تغزل کی شان تھے خاموش
ملا تھا جن کو حقیقت میں شاعری کا دماغ

مبشر علی صدیقی
گلی وحید بخش۔ محلہ سوتھا بدایوں

قمر الحسن قمرؔ بدایونی

بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں جن دو شاعروں کا بدایوں اور اس کے باہر کے مقامات میں طوطی بول رہا تھا وہ تھے فانیؔ بدایونی اور قمرؔ بدایونی۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ یہ دونوں مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہم جماعت بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں میں معاصرانہ چشمک بھی تھی اور یہ اردو شاعری کے کس عہد میں نہیں رہی۔ سوداؔ اور میرؔ، ذوقؔ و غالبؔ آتشؔ و ناسخؔ اور انیسؔ و دبیرؔ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ سوداؔ کو تو میرؔ کے مقابلے میں اپنی غزل کی اہمیت منوانے کے لیے یہاں تک کہنا پڑا ؎

وہ جو کہتے ہیں کہ سوداؔ کا قصیدہ ہے خوب
اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

لیکن میرؔ یہ کہہ کر مطمئن ہوگئے ؎

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں اشعار میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اور غالبؔ نے ذوقؔ کے مقابلے میں شہزادہ جواں بخت کا جو سہرا لکھا تھا اس میں خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے سہرے کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا تھا۔

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

لیکن اس معاملے میں غالبؔ خاصے چالاک تھے۔ انھیں جب یہ احساس ہوا کہ بہادر شاہ ظفرؔ اس شعر کو سن کر ناخوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کے ساتھ جو مراعات کی جا رہی ہیں، ان میں کچھ کمی واقع ہو، فوراً ایک قطعہ لکھ ڈالا جس کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

انیسؔ اور دبیرؔ کے زمانے میں ان کے شاگردوں اور حمایت کرنے والوں کے مستقل دو گروہ ہوگئے تھے جو انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ لیکن فانیؔ اور قمرؔ کے یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ فانیؔ کے مزاج نے ان کو استادی اور شاگردی کے چکر میں نہیں ڈالا۔ اور اپنی غزل گوئی کا لوہا ان کی غزل گوئی نے خود منوالیا۔ وہ پڑھتے بھی بہت ہلکی آواز میں تھے۔ نیچی نگاہیں، شرمیلاپن اور ایک شانِ بے نیازی مشاعرہ میں غزل پڑھتے وقت ان کے یہاں ظاہر ہوتی تھی۔ اور قمرؔ مع اپنے شاگردوں اور پرستاروں کے مشاعرے میں پہنچتے تھے اور بانگ دہل اپنی غزل سناتے تھے۔ میں نے ان دونوں باکمالوں کو غزل پڑھتے دیکھا اور سنا ہے۔ مجموعی طور پر قمرؔ بدایونی کو فانیؔ کا ہمعصر ہونے میں وہی نقصان ہوا جو حکیم مومنؔ خاں کو غالبؔ کا معاصر ہونے میں ہوا تھا۔ یہاں قمرؔ بدایونی کی شاعری کے کچھ اہم گوشوں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً پانچ ماہ ہوئے ان کے صاحبزادے ارشدی نے کراچی سے ان کی شاعری کے متعلق کچھ اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن میری بدنصیبی یہ ہوئی کہ میں اتنے طویل عرصہ تک ان چیزوں کو ڈالے رہا اور مقالہ کی شکل میں پیش نہ کر سکا۔

قمر الحسن قمرؔ ۴ صفر ۱۲۹۳ھ مطابق یکم مارچ ۱۸۷۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اور ان کی وفات یکم جولائی ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ وہ مولانا حضرت عبدالقدیر سے بیعت تھے اور یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے ہاتھ پر سب سے پہلے حافظ ظہور احمد نے بیعت کی تھی اور اس کے بعد قمرؔ بدایونی کا نمبر آتا ہے۔ قمرؔ کا سلسلۂ نسب حضرت محمد ابن حضرت ابو بکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ اور ان کے مورث

اعلیٰ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں بدایوں سبزوار سے تشریف لائے۔ یہ بزرگ جن کا نام صدر العلماء قاضی صدر الدین صدر جہاں وقت باقی تھا۔ تاریخی عظمت و شہرت کے لحاظ سے مشاہیر ہند میں سے ہیں۔ ان کو دربار شاہی سے عہدۂ قضا عطا ہوا تھا۔ اور مستقل سکونت کے بعد آپ کے والد ماجد فخر العلماء ملک حمید الدین بدایوں تشریف لے آئے۔ اور عرصۂ دراز تک عہدۂ قضا ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ چنانچہ بدایوں میں دادے حمید والی مسجد اور قاضی محلہ ان کی اقامت کی وجہ سے آج تک مشہور ہیں۔ یہ فخر بھی اس خاندان کو حاصل رہا کہ جس طرح جاگیر منصب اور عہدہ ہائے جلیلہ سے اسلاف سرفراز ہوتے رہے، اسی طرح علم وفن میں بھی ممتاز و منفرد رہے۔ شاعری بھی اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہی۔ چنانچہ طوطی ہند نواب ظہور اللہ خاں نوآ، مولوی شفاعت اللہ شفاعت (ترانہ غرائب) حضرت مولانا شاہ دلدار علی مذاق، اور شاعر ہفت زباں علی احمد حسین امجد کے نام آج بھی اردو دنیا میں بڑے احترام سے لیے جاتے ہیں۔ قمر کی قبر آستانۂ قادریہ بدایوں میں ہے۔ ادر ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی چہار دیواری بنوا کر اسے محفوظ کر دیا جائے۔

حضرت قمر بدایونی مرحوم سے لوگ بحیثیت شاعر بخوبی واقف ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت مسلم مگر ان کا نثری سرمایہ جسے میں نے ان کے خلف رشید جناب محبوب الحسن ارشدی صاحب سے حاصل کر کے اپنی حد و علمی سطح سے دیکھا ہے، فی الواقع اپنے دور کے نثری ادب میں اعلیٰ درجہ کی نگارشات کی ذیل میں آ سکتا ہے۔ مختلف بلند پایہ مضامین رسالہ توضیح القوافی، متروکات وجدید افسانوں کی بحثوں کے علاوہ ناول، افسانے تقاریظ اور تبصروں کا بڑا بیش بہا ذخیرہ اس میں شامل ہے۔ ان کے بلند پایہ نثری سرمایہ میں درج ذیل مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف قابل ذکر ہیں۔

"دلہنوں کی مجلس" باتصویر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سال طباعت ندارد۔ صفحات ۱۱۸، اس کتاب میں اصلاحی مواد ناول کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ "انوکھا فلاسفر" مطبوعہ وکٹوریہ پریس بدایوں صفحات ۳۲، اس کتاب میں حسن وعشق کے جذبات و احساسات کی فلسفیانہ ترجمانی کی گئی ہے۔ "ننھی کی مینا" ایک نصیحت آمیز اور سبق آموز افسانہ ہے۔ "نادان دوست" ناول ہے۔ جو وکٹوریہ پریس بدایوں میں چھپا ہے۔ صفحات ۱۰۰ پر مشتمل ہے۔ "جنت کا پھل" غیر مطبوعہ ناول ہے۔ رسالہ توضیح القوافی یعنی قوافی کی مکمل بحث مطبوعہ ہے۔ رسالہ تذکیر و تانیث مع امثال کلام متقدمین، متوسطین غیر مطبوعہ ہے۔ محاورات کلام مومن اور محاورات کلام راسخ دہلوی غیر مطبوعہ ہے۔

قمر بدایونی نظامی پریس بدایوں سے بھی متعلق تھے اور اس پریس کے رسالے "سودمند" کے لیے نظمیں لکھا کرتے تھے۔ جناب نظام الدین نظامی جب مسلم پراونشیل ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے تو انھوں نے قمر بدایونی کو ایک رکن مقرر کیا۔ اس سلسلے میں میں ان کی دو نظمیں پیش کر رہا ہوں، جو اسی زمانہ میں مشہور ہوئی تھیں۔ رسالہ "سودمند" نظامی پریس بدایوں سے اس لیے جاری کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو کفایت شعاری و دیانت داری کا سبق سکھائے۔ اور وہ سود پر روپیہ قرض لینے کی عادت کو ترک کریں۔ اس سلسلے میں ایک سودمند کانفرنس بھی فرخ آباد میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوئی تھی جس میں قمر بدایونی نے یہ نظم پڑھی تھی۔ جو بعد کو رسالہ "سودمند" بدایوں کے نومبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

کیوں خدا اب وہ خلوص اور اس کی عزت کیا ہوئی
وہ اخوت کیا ہوئی اب وہ محبت کیا ہوئی
جو پہاڑوں سے نہ رکتی تھی وہ ہمت کیا ہوئی
آدمی تو ہیں مگر وہ آدمیت کیا ہوئی
کیا ہوئے وہ سیدھے سادھے بھولے بھالے آدمی
پاک طینت صاف دل اللہ والے آدمی
وہ ضدوں کو جرم سمجھیں بغض کو بیجا کہیں

خانہ جنگی کو جنوں سمجھیں کبھی سودا کہیں
اس کو اچھا مان لیں، اچھے جسے اچھا کہیں
اس کو سمجھیں واقعی اپنا جسے اپنا کہیں
حق پرست ایسے کہ مانیں بے دلیل اللہ کو
قابلِ تقلید سمجھیں راستی کی راہ کو
اب تو حق وہ ہے کہ جس پر فخر خود رائی کرے
بات وہ اچھی ہے جو اچھوں کی رسوائی کرے
اس کو زیبا ہے کہ وہ اعلان دانائی کرے
صحبتوں میں صرف جو سب اپنی گویائی کرے
نام اس میں ہے کہ بدنامی ہو اپنی قوم کی
کام اس میں ہے کہ ناکامی ہو اپنی قوم کی
عمر بیکاری میں گزرے یہ گذر کی شکل ہے
بے ہنر مشہور ہو ویں یہ گذر کی شکل ہے
نفع اس میں جانتے ہیں جو ضرر کی شکل ہے
بے اثر بن کر جئیں اب یہ اثر کی شکل ہے
ٹھاٹھ ہوں بہتر سے بہتر حال بدتر ہے تو ہو
خوش گزاریں چین سے بے چین گھر بھر ہے تو ہو
حقیقت بک جائے لیکن ٹھاٹھ بڑھنا چاہیے
سود کی تعداد کچھ ہو قرض ملنا چاہیے
دو اکھاڑے، دو فریقوں کے بنائے ہوں اگر
چار شخص آپس میں کوئی بات سوچیں بیٹھ کر

دوسری نظم رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کے نومبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں ۲۸ اشعار ہیں۔ اس کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعری کا یہ دور دراصل حالی کی اصلاحی شاعری کا دور تھا۔ مسدس حالی کو کچھ نقادوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں کے اول دور کی بہترین اردو نظم قرار دیا ہے۔ ہر اچھا ادیب شاعر اپنے دور کے معاروں سے متاثر ہوتا ہے۔ قمر بدایونی بھی حالی کی اصلاحی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی یہ تین نظمیں جو سود منہ کانفرنس کی بخوبی ترجمانی کرتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

جس شخص سے کہتا ہوں قوم کی خدمت کو
کہتا ہے وہ، دیکھو پہلے میری حالت کو
ہے آمدنی سو کی دو سو کے مصارف ہیں
اس طرح بچاتا ہوں اجداد کی عزت کو
جو لڑکے ہیں وہ جاہل تعلیم ہو کیا ان کی
جب دام نہیں جڑتے فیشن کی ضرورت کو
بوٹ، ٹائی، کلپ، کالر فل، بوشرٹ گھڑی عینک
سوٹ اور بہت بڑھیا، ہیٹ اس کی حمایت کو
یہ اور جو فیشن کے سامان ضروری ہیں
ان سے نہیں فرصت کچھ سوختہ قسمت کو
کچھ لوگ یہ کہتے ہیں اولاد کو سمجھاؤں
تیار کبھی ہوتا ہوں میں ان کی نصیحت کو
پھر دھیان یہ آتا ہے اب اس سے نتیجہ کیا
بدلا ہے کسی نے بھی تدبیر سے قسمت کو
کیوں خرچ کیا اتنا جو بار ہوا آخر
کیوں مول لیا چل کر قرضے کی مصیبت کو
کچھ جس سے بچت ہوتی کچھ آمدنی بڑھتی
ہر سال مدد ملتی بڑھتی ہوئی دولت کو
وہ کام کرو جس میں کچھ نفع نظر آئے
کچھ صرف ہو کچھ باقی رہ جائے ضرورت کو
بچوں کی شریفوں کے بس خیر اسی میں ہے
جس طرح بنے ہو رکھیں قابو میں طبیعت کو
جو حیثیت اپنی ہو اس سے نہ بڑھیں آگے
مصرف کو برا سمجھیں ٹھکرائیں مشقت کو
تعلیم سے الفت ہو تہذیب سے رغبت ہو
ترجیح دیں شیخی پر اصلاح معیشت کو
عزت کی تمنا ہے ان کو تو کریں حاصل

یا علم کی دولت کو یا صنعت و حرفت کو
ہے علم و ہنر جس میں دولت ہے کنیز اس کی
قابو میں سمجھتا ہے وہ عزت و شہرت کو
افلاس و جہالت میں بندے ہیں جو فیشن کے
یہ نظم قمؔ کافی ہے ان کی نصیحت کو
(رہنمائے تعلیم نومبر ۱۹۳۶ء)

جس طرح تاروں میں ضو پھولوں میں نزہت چاہیئے
آدمی کو جس طرح پاسِ محبت چاہیئے
جس طرح نظمِ نفس ہے زندگی کو لازمی
ہے ہمیں کچھ کام کرنا، آدمی کو لازمی
واقعی مردہ ہے وہ جو آدمی بیکار ہے
زندگی بیکار کی جینا نہیں آزار ہے
یعنی جو بیکار ہے دنیا میں وہ نادار ہے
اور اس دنیا میں ناداروں کی مٹی خوار ہے
ساتھ ہی محنت کے توفیقِ کفایت چاہیئے
کچھ بچا کر جمع کر لینے کی عادت چاہیئے
جمع جو کچھ ہو کرے اس سے تجارت آدمی
کاروباری آدمی ہے درحقیقت آدمی
کام وہ اچھا ہے ہو جس کام کا اچھا مآل
جس کا سرانجام ذلت ہو وہ عزت ہو وبال
عشق وہ کس کام کا جس کا نتیجہ ہو ملال
وہ اولوالعزمی نحوست ہے جو ہو وجہ زوال
قرض لے کر جو بنائے ٹھاٹھ وہ نادان ہے
بال بچے بھیک مانگیں یہ کہاں کی شان ہے
نام وہ کیا جس کے بعد انسان خود بدنام ہو
کیوں کرے وہ کام ناکامی کا جو پیغام ہو
جو کمائے کچھ نہ کچھ اس میں بچانا چاہیئے
مطمئن رہ کر قمؔ دنیا سے جانا چاہیئے
(سودمند، جنوری ۳۷ء)

اس وقت میرے پیش نظر قمؔ بدایونی کا مجموعۂ کلام سلسلۂ جذبات قسمر نمبر ہے، جو آٹھ صفحات کا کتابچہ ہے اور کرم خوردہ ہے۔ میری لائبریری میں یہ نسخہ موجود ہے۔ صفحہ ۸ کے بالکل آخر میں یہ عبارت درج ہے " باہتمام منشی محمد آغا جان لکھنوی پرنٹر و کوثر پریس بدایوں میں منشی قمر الحسن صاحب بدایونی کے لیے چھپا" یہ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں قمؔ کی تین نظمیں ہیں جن کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مناجات
(۲) ڈریں گے قید سے کیا جو نہیں ڈرتے ہیں مرنے سے
(۳) دشمنانِ دیس سے دیواروں کو . . . .

اس مضمون میں دوسری نظم پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مقصود ہے۔ جن حالات اور پس منظر میں یہ نظم لکھی گئی ان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ہمارے ملک کی تاریخ میں کافی سیاسی ہنگامہ آرائی کا زمانہ رہا ہے۔ کانگریس ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ تحریک ترک موالات شباب پر تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے جاں افزوز مناظر اور کیف انگیز نظارے آنکھوں کے سامنے تھے۔ مہاتما گاندھی، تلک، مولانا آزاد، شوکت علی اور مولانا محمد علی سب نظر بندی کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے۔ اہل دیش کی آزادی کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کو تیار تھے۔ شاعر اپنے زمانے اور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ بدایوں کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے قمؔ جیسا قوم پرور شاعر پیدا کیا۔ اس نظم میں انگریزوں کے حاشیہ بردار اور چاپلوس حکام سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

ہمارے دوست بن بن کر جو ہم سے چال کرتے ہیں
وہ گویا دشمن کا اپنی خود اقبال کرتے ہیں
جو مخبر خط چھپا کر آج کل ارسال کرتے ہیں
ہمارے ہم زباں ہو کر وہ عرض حال کرتے ہیں

غلط خبروں سے جو دلجوئیِ حکام کرتے ہیں
وہ تحقیقات کے اسباب کو بدنام کرتے ہیں
وہ حاکم زندگی سے جو ہمیں بیزار کرتے ہیں
حقیقت میں ہمارے ملک کو بیدار کرتے ہیں
جو اپنی سختیوں کی ہر طرح بھرمار کرتے ہیں۔
ہمارے واسطے راہِ سفر تیار کرتے ہیں

شاعر ان حاکموں کو اس طرح تنبیہہ کرتا ہے ؎

ابھی تک سختیوں سے کیا ہوا حاصل جو اب ہوگا
دکھائے گا اثر کیا وہ ستم جو بے سبب ہوگا
بھلا وجہ تسلی کس طرح غیظ و غضب ہوگا
خدا جانے دماغ ان حاکموں کا ٹھیک کب ہوگا
کوئی پوچھے تو ان سے اس ستمگاری سے کیا حاصل
زباں بندی سے کیا حاصل نظر بندی سے کیا حاصل

لیڈروں کی نظر بندی کا یہ عالم تھا کہ آج شوکت علی نظر بند ہوئے تو کل محمد علی۔ نہ ظفر علی خاں اس سے بچ سکے اور نہ ابو الکلام آزاد، شاعر ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

نظر بندی شوکت کا اثر کیا کام آیا تھا
نظر بندی سے ان کے بھائی کی کیا فیض پایا تھا
نظر بندی مولانا ظفر نے کیا دلایا تھا
نظر بندی شیخ الہند سے کیا رعب چھایا تھا

اس سلسلہ میں شاعر گاندھی جی کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے ؎

آؤ گاندھی جی سے چل کے پوچھیں ان کی حالت کو
جنھوں نے بارہا جھیلا ہے محبس کی مصیبت کو
سمجھتے ہیں جو راحت جیل خانوں کی مشقت کو
لگائے چاند اس قید ہی نے ان کی شہرت کو
چلو کچلو سے پوچھیں حال ان کی رائے عالی کا
نہ بدلی رائے جن کی حکم سن کر اپنی پھانسی کا

چکبست نے قومی نظمیں لکھ کر اپنے دور کے شاعروں کی پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ قمر بدایونی بھی چکبست کی ان نظموں سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور اس مسدس نما نظم کے کئی بندوں میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مثال کے طور پر قمر کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں ؎

طلب میں گوہر مقصود کی جو گھر سے چلتا ہے
بھلا وہ سختیوں سے رائے کو اپنی بدلتا ہے
ہر اک لیڈر جگر کا دی میں یہ کہہ کر نکلتا ہے
کہ کھلتا ہے جگر جب سبب کا موتی نکلتا ہے
سہی جس نے اذیت اس نے راحت بے گماں پائی
ہمیشہ فصل گل ہر باغ نے بعد خزاں پائی

اس یادگار نظم میں کل سترہ بند ہیں یہ آخری بند ملاحظہ ہو۔

نہ سمجھیں سنگدل یہ سختیاں کچھ کام آئیں گی
نہ سمجھیں وہ کہ یہ باتیں ارادوں کو گھٹائیں گی
کسی دن ان کی تدبیریں یہ خود ان کو بتائیں گی
کہ یہ قربانیاں وہ ہیں جو الٹا رنگ لائیں گی
ملے گا کیا ہمارے لیڈروں کو قید کرنے سے
ڈریں گے قید سے کیا جو نہیں ڈرتے ہیں مرنے سے

حب الوطنی سے متعلق نظموں کے کسی معیاری انتخاب میں قمر بدایونی کی اس یادگار نظم کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ایک نظم "ذوق ادب" ہفتہ وار ھمدرد بدایوں مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اس زمانہ میں کافی مقبول ہوئی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس نظم میں اردو زبان اور اس کی ترویج پر قمر بدایونی نے کچھ اہم اشارے کیے ہیں ؎

ہمیں ہر مسئلے میں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے
محبت پھر محبت ہے عداوت پھر عداوت ہے
بتاتے ہیں نزاع باہمی جو لوگ اردو کو
غرض ان کی یقیناً خانہ جنگی کی امانت ہے
وہی اردو تو ہے یہ فخر تھا جس کی حمایت پر
اب اس نے کیا خطا کی ہے اب اس سے کیا عداوت ہے
ابھی تک جس کو آغوش محبت میں جگہ دی تھی

اب ان سے اس قدر نفرت یہ کوئی آدمیت ہے
غرض یہ ہے وہ قوت، باہمی جھگڑوں میں کام آئے
کہ جس کی ملک کو آزاد کرنے کی ضرورت ہے
حقیقت میں بہانہ ڈھونڈتے پھرتا نہ جنگی کا
نہ وہ اردو کے دشمن ہیں نہ اردو سے عداوت ہے
خدا توفیق دے ان کو تو اپنے دل میں یہ سوچیں
کہ اردو ہندوؤں کی بھی تو ممنون عنایت ہے
شریک اس کی ترقی میں مسلماں بھی ہیں ہندو بھی
جب اس سے کیوں محبت تھی اب اس سے کیوں عداوت ہے
قمر اردو کی خدمت فرض ان پر بھی ہے ہم پر بھی
کہ اس سے اتحادِ ہند و مسلم عبارت ہے

قمر بدایونی نے ۱۳۴۰ھ میں اپنی غزلیات کا مجموعہ شائع کیا۔ اور اس وقت کے مشہور خطیب و مقرر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی نے اس پر تقریظ لکھی ہے۔ مولانا عبدالماجد کی یہ تقریظ اب خود آثار قدیمہ کے ضمن میں آ گئی ہے۔ قمر بدایونی نے اس کے شروع میں یہ اشعار لکھے ہیں ؂

بندش پہ فدا ہے روحِ معنی
ہیں لوٹ محاوروں پہ ابیات
جدت سے پر ہر ایک مضمون
جو بات لکھی ہے ہے نئی بات
رنداں کی صفت جہاں لکھی ہے
گویا ہے وہ موتیوں کی برسات
گیسو کی صفت کہیں ہے رخ کی
دن ہے جو کہیں تو ہے کہیں رات
لکھا ہے جو وصف چشمِ جاناں
شعروں میں دکھائے ہیں طلسمات
دل میں تھا خیالِ سالِ ہجری
تھی وقتِ رقم یہ بحث میں بات
طوطیٔ سخن ہوا شکر ریز
مجموعۂ شہ دفتر کمالات
۱۳۴۰ھ

اب وہ تقریظ ملاحظہ فرمائیے:-

"جناب قمر بدایونی دورِ حاضر کے شعرا میں ایک ممتاز و خوش گو شاعر ہیں، مجھ سے بعض دہلی و لکھنؤ کے مشہور شعرا اور حضرت احسن قبلہ مارہروی جناب سائل دہلوی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جناب قمر کی غزلیں مشاعروں میں ایک خاص رنگِ قبول پاتی ہیں۔ اور ان کا کلام سلاست و جدت و معاملہ بندی اور زبان کی صفائی میں ایک مخصوص شہرت و کمال رکھتا ہے۔ میں نے بھی قمر صاحب کا کلام اکثر سنا ہے اور قومیات و نظم متعلق خلافت و دردِ اسلام وغیرہ میں ان کے کلام کے مختلف و متعدد نمونے تو میری ہی فرمائش سے تیار ہوئے ہیں۔ جن سے ان کی قدرت کمال و ذوقِ صحیح و کامل مشاقی و حسن مقال کا مجھکو تجربہ ہوتا رہا ہے۔ اور بعض اوقات تو بہت تھوڑی فرصت اور نہایت کم مدت میں ان کی طویل الازیابی و بلیغ و فصیح کلام حسب فرمائش موجود و منظوم کرتے اور لاتے ہیں۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے جس طرح یہ عادتاً خوش و مطمئن ہیں اس سے مراتب زائد ان کی طبیعت و ذوق میں فکر و خوض کے وقت غیر معمولی بےچینی اور تڑپ ہوتی ہے۔ یہ اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے جناب قمر کو فرمائش دیکر بہت کم فرصت میں ایک سیلاب وجذبات اوقیانوس تخیلات بہاتے دیکھا ہے۔ سب سے بہتر دلیل ان کی پختہ مشقی کی ان کی یکرنگی ہے۔ طرز تغزل ہو یا قومیات نگاری سب ایک ہی سلیس و سہل ممتنع زبان و رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں شاید ہی طرز ادا و ادائے طرز بیان کے مختلف نمونے نکل سکیں۔ اس سے زائد تبصرہ و تنقید اہل فن کا حق ہے مجھے صرف

اتنا کہنا ہے ۔ کہ میری اس تقریظ کا شکریہ و معاوضہ یہ
ہے کہ جلد سے جلد اتنا ہی ضخیم صحیفۂ نظم تو یات جناب
قمر صاحب پیش کریں اور آج کل جن خدمات جلیلہ میں
وہ شبانہ روز مصروف و مشغول ہیں، ان کی تبلیغ اپنی
قوت نظم و کمال فن سے بامید نجات و ثواب عمل میں
لائیں ۔ (عبدالماجد بدایونی)

قمر بدایونی کی زندگی کے اہم واقعات تاریخی تسلسل کے
ساتھ نیچے لکھے جاتے ہیں ۔

۱۹۰۶ء - انڈین پنچ کے ایڈیٹر رہے ۔

۱۹۲۴ء - تبلیغ آگرہ اور علی گڑھ میں شریک رہے ۔
اس کی سربراہی جناب غلام بھیک نیرنگ کر رہے تھے ۔

۱۹۲۶ء - رسالہ "سودمند" بدایوں سے منسلک رہے ۔

۱۹۲۸ء - دہلی کے ایک باتصویر اردو اخبار سے منسلک
رہے ۔ اور وہاں کے دارالتصنیف سے بھی وابستہ رہے ۔
وہ آخر عمر تک (تقریباً ۱۹۳۹ء تک) نظامی پریس بدایوں
سے وابستہ رہ کر ادبی خدمات انجام دیتے رہے ۔

قمر بدایونی نے ابتدائی تعلیم اور عربی فارسی کی تعلیم بدایوں
میں حاصل کی ۔ اس کے علاوہ انگریزی تعلیم گورنمنٹ ہائی
اسکول بدایوں میں حاصل کی جس میں جناب شوکت علی خاں
فانی آپ کے ہم جماعت تھے ۔ قمر بدایونی کا ملک کے جن موقر
اردو جرائد میں کلام شائع ہوا وہ مندرجہ ذیل ہیں ۔ ان کے
ان رسائل میں مختلف اوقات میں تنقیدی، تحقیقی، ادبی اور
تاریخی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ۔ اودھ اخبار
انڈین پنچ، (انجمن ترقی اردو)، مخزن، لاہور ۔ نقاد، آگرہ
موکب جبل پور ۔ پیمانہ، آگرہ ۔ شاعر، آگرہ ۔ ستارہ
علی گڑھ ۔ خوبہار، علی گڑھ ۔ علی گڑھ کالج میگزین ۔ کمال
ناسخ ۔ زمانہ دہلی ۔ پیام یار ۔ تسنیم آگرہ ۔ معراج الکلام
۔ اودھ پنچ ۔ حریت ۔ ذوالقرنین بدایوں ۔ ہلال
پنچ ۔ الامان دہلی ۔ شاہد دہلی ۔ ہمدرد بدایوں ۔ الہدی
بدایوں ۔ زمانہ کانپور ۔ ایشیا آگرہ ۔

نوٹ :- "شاعر" آگرہ "اودھ پنچ" کے مستقل کالم نگار تھے
اور "اودھ پنچ" میں "کھلے رستم" "البدایونی" کے نام سے
مزاحیہ مضامین بھی لکھتے تھے ۔

قمر بدایونی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اپنے دور کے معیار کے مطابق
اردو غزل کو ایک نیا آب و رنگ دینا ہے ۔ تغزل میں روایتی رنگ ہونے
کے باوجود قمر بدایونی کے یہاں اپنی ایک انفرادیت ہے ۔ روزمرہ
محاوروں کا برجستہ استعمال ان کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ ان کا
تغزل زبان کی چاشنی نے نکھارا ہے ۔ فن عروض پر ان کو کافی قدرت
تھی ۔ اس سلسلہ میں قافیہ کی بحث پر انھوں نے ایک طویل مقالہ "توضیح
القوافی یعنی قافیہ کی مکمل بحث" لکھا تھا جو علی گڑھ میگزین کے
جولائی ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ اور یہ مقالہ اس شمارے
کے صفحہ ۱۲۵ سے لے کر ۱۴۷ تک محیط ہے ۔ آفتاب احمد ردولوی (جو
اب ڈاکٹر آفتاب احمد ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں) ایڈیٹر تھے ۔ قمر
کا یہ مقالہ مبتدی شعرا کے لیے قافیہ اور اس سے متعلق دیگر امور کی توضیح
کا کافی مواد فراہم کرتا ہے ۔ قمر کا شمار اپنے زمانے میں بدایوں کے استاد
شعرا میں ہوتا تھا ۔ اور بدایوں کے اس زمانہ کے ہر مشاعرے میں وہ
اپنے شاگردوں کے شامل ہوتے تھے ۔ اس زمانہ کے بدایوں کے بیشتر
غزل گو شعراء ان کو اپنا کلام دکھانا باعث فخر سمجھتے تھے ۔ یہاں ان
کی ایک یادگار غزل پیش کی جاتی ہے ۔ جو انھوں نے اسی قسم کے
ایک مشاعرے میں یہاں پڑھی تھی ۔ اور بعد کو علی گڑھ میگزین
کے جنوری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں صفحہ ۷۵ پر شائع ہوئی ۔

بیکار تھے شکوے غیروں سے بے سود ہمارا رونا تھا
ہم تم سے گئے تم ہم سے گئے آخر وہ ہوا جو ہونا تھا

کچھ عمر گزاری غفلت میں کچھ سنگدلوں کی الفت میں
افسوس ہماری قسمت میں یا سونا تھا یا رونا تھا

یہ بات تو کہنے کو رہی قاتل کی خوشی کی قدر نہ کی
جاں آج نہیں تو کل جاتی یہ دن تو آخر ہونا تھا

شیریں کی محبت کیا کرتی، خسرو کی رقابت کیا کرتی

فرہاد کی وحشت کیا کرتی قسمت میں پتھر ڈھونا تھا
کیوں بس [illegible] ہوتے ظالم کے کیوں اشک نہ بہتے آنکھوں سے
تقدیر میں صدمے سہنے تھے قسمت میں نام ڈبونا تھا
کیا سوچ رہے ہو تم دل میں کیوں آئے یہ میری محفل میں
کچھ تم سے کہنا سننا تھا کچھ غیر کی جان کو رونا تھا
مضمون ہی کیا میرے خط کا جو حال تھا انکو لکھ بھیجا
کچھ انکی جفا کے شکوے تھے کچھ اپنی وفا کا رونا تھا
کچھ قتل سے میرے پچھتائے کچھ دامن دیکھ کے گھبرائے
آنکھوں سے اشک جو برسائے کچھ رونا تھا کچھ دھونا تھا
سننے کو سنے لوگوں نے مگر خوش ہوتا کون انھیں سن کر
اشعار ہمارے کیا تھے قمرؔ قسمت کا اپنی رونا تھا

نوٹ: ایک خاص چیز اس غزل میں یہ ہے کہ اس میں کوئی اضافت نہیں ہے۔ میرے سامنے اس وقت قمرؔ بدایونی مرحوم کا وہ صفحہ ہے جو ان کے صاحبزادے نے کراچی سے بھیجا ہے۔ کاغذ پیلا پڑ گیا ہے اور بوسیدہ ہے۔ ارشدی اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

یہ تمام غزلیں قمرؔ مرحوم کے ہاتھ سے رقم کی ہوئی ہیں۔ اس لیے آثار قدیمہ کے ضمن میں آتی ہیں تبرک سمجھ کر ان کو محفوظ رکھیے۔

قمرؔ نے اپنی ڈائری کے اس صفحہ میں مندرجہ بالا غزل کا چوتھا اور چھٹا شعر قلم زد کر دیا ہے۔ اب ان کی ڈائری کے ان صفحات میں لکھی ہوئی دیگر غزلیں ملاحظہ ہوں۔ جو بقول ارشدی ان کو بہت پسند تھیں۔

نفرت گناہ ہے نہ عداوت گناہ ہے
اس عہد میں بس حرف محبت گناہ ہے
ارماں ہے گناہ نہ حسرت گناہ ہے
تم سے امید لطف و عنایت گناہ ہے
دل دے کے ان کو جان مصیبت میں پڑ گئی
اب اپنی زندگی کی حفاظت گناہ ہے
میرا خیال غیر کی نسبت نہ پوچھیے
اس کا جواب یہ ہے کہ غیبت گناہ ہے
صحرا کو جائیں کوچہ دیدار چھوڑ کر
وحشت کا یہ اثر ہو تو وحشت گناہ ہے
پوچھا ستم ثواب ہے بولا نہ ہو تو کیا
پھر کبھی ستم گری کی شکایت گناہ ہے
اب تک تو دوستوں سے عداوت گناہ تھی
اب اپنے دوستوں سے محبت گناہ ہے
بدقسمتی ہے خواہش مافات کیا قمرؔ
میرے لئے تو ذکر مصیبت گناہ ہے

ایک اور غزل ملاحظہ ہو:

دنیا تجھ کو دیکھ لیا اب تجھ سے کنارا کرتے ہیں
مرنے کو یہ حیلہ کافی ہے ایک دشمنِ جاں پر مرتے ہیں
مجبور فغاں کہہ کہہ کے قمرؔ الزام وہ ہم پر دھرتے ہیں
یعنی یہ ہمیں احساس نہیں ہم ان کو رسوا کرتے ہیں
اب قتل سے کیوں منھ موڑ لیا کیوں مجھ کو زندہ چھوڑ دیا
کیا روز جزا کی پرسش سے کچھ آپ کے دشمن ڈرتے ہیں
وہ کرتے ہیں وعدہ ملنے کا ہم چاہتے ہیں تکمیل وفا
وہ دل کی قیمت دیتے ہیں ہم جان کا سودا کرتے ہیں
اے پاس محبت جوش میں آ مقتل میں یہ کیا قاتل نے کہا
مرنے کے لیے کون آتا ہے کہنے کے لیے سب مرتے ہیں
الفت تو ہے آخر انکو بھی میری نہ سہی دشمن کی سہی
مجھ سے نہ سہی دشمن سے سہی وہ بھی تو محبت کرتے ہیں
مرنے کا جو ذکر میرے ہوا اور ان کا سے نام لیا
بولے کہ یہ جھوٹی تہمت ہے سب اپنی موت سے مرتے ہیں
جب عاشق روئیں حسینوں کے چہروں کی رونق کیوں بڑھے
شبنم کے آنسو گرنے سے پھولوں کے رنگ نکھرتے ہیں
مجبور ہیں ہم مختار ہیں وہ مجبور ہیں ہم خوددار ہیں وہ
ہم دل کا کہنا کرتے ہیں وہ اپنا کہنا کرتے ہیں
جب میں نے کہا اے ماہ لقا کیا سوچ کے تو کرتا ہے جفا

بے مہر سنا پھر ہنس کے کہا اور آپ وفا کیوں کرتے ہیں
اب تک تو فغاں پر لب تھے مگر اب مرنے پر باندھی ہے کمر
جب حسن کو رسوا کرتے تھے اب عشق کو رسوا کرتے ہیں

مطبوعہ "مدینہ" بجنور (جلد نمبر ۱۹)

یا تو یہ ہو کہ سر نہ ہو، ہو تو سرِ نیاز ہو
اور پھر اس کے ساتھ ہی ذوقِ خرامِ ناز ہو

عرضِ نیاز کا صلہ لطفِ نگاہ ناز ہو
عشق تو دل فگار ہے حسن بھی دلنواز ہو

عاشقِ بے خبر اگر واقفِ اصلِ راز ہو
ہم فراق چھوڑ دے، وصل سے بے نیاز ہو

آہ و فغاں کے ساتھ ہی دل کی لگی بھی شرط ہے
یعنی اثر کے واسطے سوز شریکِ ساز ہو

کہتی ہے اس کو دیکھ کر چشمِ حقیقت آشنا
راہ میں ورنہ کس لیے مرحلۂ مجاز ہو

عشق کی یہی کرامتیں حسن کی یہی عنایتیں
ورنہ جبینِ غزنوی وقفِ درِ ایاز ہو

لطف کرو وفا کرو غیر کو دوست کیوں کہو
غیر میں اور دوست میں کوئی تو امتیاز ہو

پہلے تو سرکشی چھٹے اس کی رضا میں سر جھکے
یہ بھی کوئی نماز ہے سجدہ نہ ہو نماز ہو

قصۂ دردِ ماسے قمر کوئی سنے تو ہو اثر
یہ تو پھر اس کے بعد ہے سوز ہو یا گداز ہو

مطبوعہ الامان ۔ یکم اپریل، ۱۹۴۲ء

طیبہ ہے طلبگار کو جنت نہ عطا ہو | محشر میں کہیں اور قیامت نہ بپا ہو
دنیا تو سمجھتی ہے کہ محبوبِ خدا ہو | تم بھی کہو للّٰلہ کہ تم کون ہو کیا ہو
رحم آ ہی گیا آج انھیں انکی بدولت | اللہ کرے دردِ محبت کا بھلا ہو
کس بات کا سائل ہوں میں کچھ نہیں کہتا | وہ مانگ رہا ہوں جو عنایت سے عطا ہو
اللہ محمد کی غلامی کا شرف دے | بس اسکے سوا حسرتِ دل اور نہ کیا ہو
سجدہ کے یہ معنی ہیں قمر اہلِ یقیں میں | گردن سے زیادہ سرِ تسلیم جھکا ہو

غلام صابر قدیری سندیلوی
۲۷/۴ دریائی ٹولہ ۔ پاٹانالہ ۔ لکھنؤ ۔ ۳

شاعر کی دعا

وطن کو میرے یارب منبعٔ امن و اماں کر دے
پھر اپنی رحمتوں کا رُخ سوئے ہندوستاں کر دے
غریبی دور ہو پسماندگی کے ابر چھٹ جائیں
عطا اس دیس کو گنجینہ ہائے بیکراں کر دے
جہالت دور ہو جائے وطن کے کونے کونے سے
الٰہی بچے بچے کو یہاں کے علم داں کر دے
کھلا دے ایسے گل یارب جو کھل کر پھر نہ مرجھائیں
عطا میرے چمن کو پھر بہارِ بے خزاں کر دے
الٰہی پرچمِ ہندوستاں کو اپنی رحمت سے
اخوت کا مروت کا محبت کا نشاں کر دے
وسیلہ ہے یہی آپس میں اظہارِ محبت کا
ہم اہلِ ہند کو دلدادۂ اردو زباں کر دے
بچا ہم کو نگاہِ حاسدانِ دہر سے یارب
ہمارے دشمنوں کی سازشوں کو رائیگاں کر دے
ترانہ ہم کو گانا ہے وطن کی شان و عظمت کا
عطا یارب ہمیں اقبال و حالی کی زباں کر دے
نکاتِ امن و آزادی سکھانے ہیں زمانے کو
ہمیں اب نکتہ سنج و نکتہ بین و نکتہ داں کر دے
وہ ہندو ہو مسلماں ہو کہ سکھ ہو یا کہ عیسائی
دعا صابر کی ہے یارب ہر اک کو شادماں کر دے

(افسانہ)

نزہت فاطمہ
نئی محل، لکھنؤ

شبراتن بُوا

ان کا اصلی نام تو کچھ اور تھا بلکہ سچ پوچھئے تو آج تک کسی کو ان کا اصلی نام معلوم ہی نہیں ہو سکا ہم سب شبراتن بوا کے نام سے پکارتے ہیں جس کی وجہ وہ یہ بتاتی ہیں کہ شبرات کے دن ہماری پیدائش ہوئی تو ہمارے گھر والوں نے ہمیں شبراتن کہہ کر پکارنا شروع کر دیا چنانچہ اب شبراتن بوا صرف شبراتن بوا ہی ہیں۔ حالانکہ وہ فخریہ انداز میں یہ بھی بتاتی ہیں کہ ہمارے ابّا نے ہمارا حقیقہ (عقیقہ) بھی کیا تھا۔ اماں بتاتی ہیں کہ ڈھیروں پلاؤ زردہ برادری والوں کو کھلایا تھا گیہوں گوشت سب سستا تھا آج کی سی مہنگائی تھوڑے تھی۔ پھر وہ آج کا رونا رونے بیٹھ جاتیں "اب یہ حال ہے کہ ہر چیز کی قیمت نگوڑی آسمان کو چھو رہی ہے انسان مرے تو کیا کرے۔ ارے اس دن چمیلی کا تیل منگوایا نگوڑے تیلی کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے تھوڑا سا دینے پر تیار نہیں ہوا' موا کہتا تھا کہ پوری شیشی لو، پانچ روپے کی شیشی، آگ لگے ایسے زمانے کو۔"

اسی دوران ہم لوگ انھیں یاد دلاتے کہ "بھئی اپنا اصلی نام تو بتاؤ" لیکن بے چاری بڑی کوشش کے بعد بھی اپنا نام نہیں بتا پاتیں۔ کیا کریں غریب کو یاد ہی نہیں آتا اور جب ہم لوگ ہنستے کہ "لو بھئی یہ اپنا نام ہی بھول گئیں" تو وہ بے حد غصہ ہو کر کہتیں کہ "اَے تو کون سی بات ہے تم لوگ نہیں مہر النساء کو موتی اور جاوید کو جوڑی کہتے ہو اس مدلل بات کے بعد ہم لوگوں نے ان کا نام پوچھنا چھوڑ دیا ہے اور یوں بھی سچ پوچھئے تو نام میں دھرا ہی کیا ہے ہم لوگ تو انھیں ان کی بے حد دلچسپ شخصیت کی وجہ سے جانتے ہیں۔

ہمارے محلے میں شبراتن بوا اپنے حلیہ، باتوں اور عادتوں کی وجہ سے عجیب و غریب جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتی ہیں ہم لوگوں کو ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ امی ڈانٹتی بھی ہیں کہ "توبہ کرو توبہ ان کو بھی خدا نے بنایا ہے یہ بہت بد تہذیبی کی بات ہے کہ تم لوگ ان پر ہنستی ہو۔" لیکن کمبخت ہنسی کو کیا کہیں توبہ کرتے کرتے گال سرخ ہو جاتے ہیں لیکن ہنسی ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی اور شبراتن بوا اس ہنسی سے بے نیاز بڑے شاہانہ انداز سے گھر میں داخل ہوتی ہیں۔ لال چار خانے کی لنگی باندھے ہیں سفید کرتا اور خوب گہرا اودا اردپٹہ اوڑھے بڑی بڑی آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل لگائے ہماری دادی کو بے حد جھک کر سلام کرتی ہیں "سلام بھابھی اماں" ہماری دادی سلام کا جواب دے کر ان سے خیریت دریافت کرتیں "اَے شبراتن اتنے دن سے کہاں غائب تھیں؟"

"ارے بھابھی اماں اجمیر شریف سے واپسی پر بڑی سردی تھی۔ دلّی میں ماندے پڑ گئے تو وہیں پڑے رہے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں۔ ارے وہ لوگ تو بہت اچھے ہیں بڑی محبت سے ملے بڑی خاطر کی۔ لیکن کمبخت تو کرب جگہ ایک جیسے ہی نگوڑا نوکر جان کو آ گیا تو ہم چلے آئے۔" شبراتن بوا تھے ہارے تھکے تھکے لہجے میں اپنے سفر کی روداد بیان کی۔

ہمارے یہاں اوپر کے کام کے لیے رکھا ہوا ملازم لڑکا پہلے

ہی انھیں دیکھ کر بے قابو تھا اس کو موقع ملا "ہاں ہاں ہم لوگ تو کمبخت ہیں ہی بس ایک تم نیک بخت ہو۔"

"اے چپ رہ مردار! تجھے کون کہہ رہا ہے۔" "اے دیکھ لو ابھی بیٹھ نہیں ٹکائی اور یہاں اللہ دے بندہ لے شروع ہوگئی۔"

پھر وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر تخت پر اپنا سامان الٹنے پلٹنے لگتیں، اپنا جھولا اٹھا کر تخت پر رکھتیں اس میں سے ایک کے بعد ایک چیز برآمد ہوتی "یہ صندل درگاہ کا ہے چھوٹی دلہن کے سر میں درد رہتا ہے ان کے لیے لائی ہوں۔ اور یہ کھٹیاں ہیں ——— ایک بے حد میلی سی پڑیا میں بالکل سیلی ہوئی کھٹیاں جن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک بھی تل نہ ہوتا ہم سب کی طرف بڑھاتیں ——— "یہ تم لوگوں کے لیے تبرک ہے۔"

"اے ہے کس قدر گھن آئی کہ کیا کہیں ہمارے ساتھ کی کھیلی ہوئی ملازم لڑکی بے حد مسلک کر کہتی۔" اے بیٹا ہرگز نہ لیجیے گا نہ جانے کہاں سے اٹھالائی ہیں ان کا کیا بھروسا۔"

"ارے کہاں سے لائے ہیں شاہ مینا کی درگاہ کی ہیں۔ اعتبار نہ آئے تو شاہد میاں سے پوچھ لو۔ انھوں نے خود دی ہیں۔"

"ارے جاؤ پتہ نہیں کہاں سے لائی ہو۔ اے بیٹا ہرگز ہرگز نہ لیجیے گا، آپ سے سچ کہہ رہے ہیں کہ جب کھٹیاں بالکل سیل جاتی ہیں تو مجاور انھیں فقیروں کو بانٹ دیتے ہیں۔ وہیں سے یہ اٹھالائی ہوں گی۔" "اے جوتی ماروں تیری صورت کو، جھوٹی کہیں کی، خود جا کر شاہد میاں سے پوچھ لے۔" شبراتن بوا کو غصہ آجاتا۔

ہم بے حد مروت کر کے کھٹیاں ان کے ہاتھ سے لے کر وہیں تخت پر رکھ دیتے۔ پھر وہ ہماری دادی کو بہت سے سیلے ہوئے بتاشے ایک پلیٹ میں رکھ کر پیش کرتیں تو کھانا پکانے والی بوا بڑبڑاتیں ——— "اللہ جانے کہاں کہاں سے کیا کیا بھیکی ہوئی چیزیں لاکر سب کو کھلاتی ہے یہ عورت۔"

شبراتن بوا کی آمد کے ساتھ گھر میں جنگ شروع ہو جاتی صرف ہماری دادی کی وجہ سے مخالفت کا طوفان دبا رہتا کیونکہ بقول ہم لوگوں کے وہ ان کی بے حد منہ چڑھی ہیں۔

شبراتن بوا وہیں تخت پر بیٹھے بیٹھے ڈونگے میں پانی لے کر کلی کرتیں۔ وہیں پیر دھوتیں، کنگھی کرتیں، سرمہ لگاتیں اور بقول ہم سب کے سج سنور کر تیار ہو جاتیں۔

"تمھاری یہی گندگی تو بری لگتی ہے دیکھو سارے صحن میں کیچڑ ہوگئی۔" کھانا پکانے والی بوا دبا دبا احتجاج کرتیں۔

ایک دن ایک بڑی سی گٹھری لے کر چلی آئیں۔ ہم سب کو تجسس ہوا کہ آخر اس میں ہے کیا؟ اب جو کھولا تو اس میں سے ایک بڑی سی سوکھے پھولوں کی چادر نکلی۔ لوا چیخیں "اے کسی مردے کے اوپر پڑی ہوئی پھولوں کی چادر تم گھر میں لے آئیں تو یہ سب یہ عورت بھی کیا چیز ہے۔"

امی بھی جز بز ہوئیں "بھئی آخر تم یہ سب چیزیں گھر میں لاتی ہی کیوں، بلا وجہ کوڑا ہوتا ہے۔"

"ارے منجھلی دلہن تمھارے سر کی قسم مردے پر کی چادر نہیں ہے درگاہ سے لائے ہیں۔ اس میں سے ڈورے نکال کر لحاف میں تاگے ڈالیں گے۔ نگوڑے جاڑے سر پر آگئے ہیں، ابھی تک لحاف نہیں سلا ہے۔"

پھر وہ سب کے احتجاج کے باوجود چادر سے تاگے نکالنے لگتیں۔

ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ شبراتن بوا چیزیں بھی ادھر سے ادھر کر دیتی ہیں۔ ایک دن صبح نعمت خانہ سے بالائی کی پلیٹ بالکل صاف ملی جب کہ نعمت خانہ بند تھا۔ شبنو دوڑی دوڑی آئی ———

"صاحبی اماں وہ جو بالائی رکھی تھی وہ کسی نے کھالی۔" پھر اس نے بے حد گھور کر شبراتن بوا کو دیکھا لیکن شبراتن بوا نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ "آخر بالائی ہوئی کیا۔" ہماری دادی نے پوچھا۔

"ارے بی بی کوئی کھا گیا ہے اور نام ہم نوکروں کا لگے

گا۔" شبو نے بڑے تیز سے بات کی۔
ہم لوگوں کو [illegible] معلوم تھا اس "کوئی" سے کیا مراد ہے۔ لیکن
سب ہی لطف لے رہے تھے آخر شبراتن بوا کے صبر کا پیمانہ چھلک
اٹھا ــــ "ارے چار چار تو بلّیاں پال رکھی ہیں۔ وہی نگوڑی کھا
گئی ہوں گی۔"

"اور نہیں تو کیا بلّی نعمت خانہ سے بالائی نکال کر کھا گئی
اور نعمت خانہ بھی بند کر گئی۔" شبو نے بے حد مٹک کر کہا ــــ
شبراتن بوا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر کہا "مردار
اگر میں نے کھائی ہو تو میرے پوتوں سوتوں کے آگے آئے ــ"
پھر ہماری دادی سے مخاطب ہو کر بولیں "اللہ جانتا ہے بی بی
ہاں ہم نے بالائی نہیں کھائی اپنی آنکھوں کی قسم دیکھی ضرور
ہے لیکن ہاتھ نہیں لگایا۔"

"چمچہ سے کھائی ہو گی بے" یہ کہتے ہوئے بے ساختہ ہم کو
ہنسی آ گئی۔ ہم لوگ دن بھر بالائی کا ذکر مزے لے لے کر کیا
کیے اور شبراتن بوا بے فکری سے لحاف میں ڈورے ڈالا کیں۔

رمضان شریف میں شبراتن بوا تخت کے اوپر افطاری سجا
کر بیٹھ جاتیں اور اذان کا انتظار کرتی رہتیں ہم لوگ ان کی بے
ساختہ حرکتیں دیکھتے رہتے۔ کبھی پھلکیاں اٹھا کر پلیٹ میں کئے
رکھتیں، کبھی کچالو سمیٹ کر ایک طرف کرتیں، کبھی کھجوریاں الٹ
پلٹ کر رکھتیں۔ اللہ توبہ ان کا روزہ ضرور مکروہ ہو جاتا ہو گا۔
ساری نیت تو افطاری میں لگی رہتی تھی۔

شبراتن بوا جتنے دن کا پروگرام بنا کر آتی ہیں اس میں
سے ایک دن بھی کم نہیں کرتیں خواہ ان کے سر پر سے قیامت
ہی کیوں نہ گزر جائے۔ عرس کے زمانے میں ان کا قیام
زیادہ عرصہ تک رہتا۔ دسترخوان پر سے خمیری روٹیوں کے
ٹکڑے اکٹھا کرتیں اور اپنے میلے سے جھولے میں ڈال لیتیں کہ وقت
بے وقت کام آئیں گے۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ بیچاری کی غذا
بہت کم ہے۔ لیکن کیا کریں غریب نیت سے مجبور ہیں ہمارے
محلے سے نکل کر پارچہ والی گلی تک جانا ان کے لیے قیامت ہو جاتا
ہے جدھر سے گزرتی ہیں کوئی نہ کوئی فقرہ ان پر ضرور کسا جاتا
ہے۔ ان کے آ جانے سے پورے محلے میں رونق آ جاتی ہے۔

ہماری شبراتن بوا اجمیر شریف ضرور حاضر ہوتی ہیں۔
وہاں جانے کے لیے پہلے سے تیاری کرتی ہیں اور ہمارے گھر
سے باقاعدہ رخصت ہوتی ہیں۔ دو تین چھوٹے تین چار ڈبے
لوٹا کٹورا رسی سے بندھا ہوا بستر اور نہ جانے کیا کیا، ساتھ
ہی ایک موٹی سی چھڑی بھی۔

"اے شبراتن بوا تم یہ چھڑی کیوں لے جا رہی ہو۔"
ہم پوچھتے ــ "اے بیٹا نگوڑے لڑکے تو لڑکے اچھے بھلے
مرد ہوئے ستاتے ہیں۔"

"ارے تم نے بتایا نہیں کہ چھڑی کا کیا کرو گی؟"

"ارے بیٹا جب کوئی مردار سامان گڑبڑ کرتا ہے یا
ہمیں چھیڑتا ہے تو اسے اسی چھڑی سے بھگاتے ہیں۔"

"اور اجمیر شریف میں ٹھہرو گی کہاں؟"

"اے بیٹا درگاہ میں رہیں گے۔ سینکڑوں اللہ والے
ٹھہرتے ہیں وہاں۔"

"اور تم سے بڑی اللہ والی ہو ــ" بوا بڑبڑائیں۔

"اچھا تو بیٹا تم نے پوچھا تو ہم بتا رہے ہیں، ہم درگاہ
شریف میں چدر (چادر) بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہیں لنگر
بٹتا ہے، وہی کھا لیتے ہیں۔"

"بیٹا یہ بھیک ضرور مانگتی ہوں گی" شبو چپکے سے کہتی
لیکن شبراتن بوا کے کان بڑے تیز تھے۔

"اے جھاڑو ماروں تیری صورت پر خدا کی مار" شبراتن
کو بے حد غصہ آ گیا ــــ "ہم اللہ نہ کرے بھیک مانگیں ہمارے
سب کام خواجہ صاحبؒ کی بدولت ہو جاتے ہیں ــ
ــــ اور پچھلی دفعہ تو ہم بلا ٹکٹ گئے تھے۔"

"وہ ۔۔۔۔ وہ کیسے؟" ہم سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

"کیسے کیا" وہ بے حد اطمینان سے بتاتیں ــ "ہم گاڑی
میں بیٹھ گئے، جب ٹکٹ بابو آیا تو ہم رونے لگے کہ اب

"ٹکٹ کہاں سے لائیں ۔۔۔" وہ خوب بگڑا ۔ موا کہنے لگا
ابھی ابھی گاڑی سے اترو ۔ بس ہم کو بھی غصہ آگیا ہم نے
کہا ہم تو نہیں اتریں گے کیا کروگے ؟" اس نے ہم کو اتارنا
چاہا تو ہم زور زور سے رونے لگے وہ خوب بگڑا کہنے لگا یا
ٹکٹ لاؤ یا گاڑی سے اترو ، ہم نے کہا ہمارا ٹکٹ خواجہ
صاحب کے پاس ہے وہی دیں گے ۔"

" وہ چیخنے لگا ہم نے بھی بگڑ کر کہا ہم درگاہ کے غلام
ہیں ، ہمارا ٹکٹ اللہ کے پاس ہے چلو اجمیر تب ٹکٹ
مانگنا ۔" پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے کہا چھوڑیے صاحب
پگلی ہے اس سے کیا جھگڑنا پہلے تو وہ بہت خفا ہوا پھر سب
کے کہنے سے کہنے لگا ۔۔۔ اچھا مائی ایک کونے میں بیٹھ جاؤ
اور ہم بیٹھے بیٹھے اجمیر شریف پہنچ گئے ۔"

" بھئی کس قدر آسان نسخہ ہے " ہم لوگوں نے داد دی ۔

" بی بی ہمارے سب کام بزرگوں کے صدقہ میں بن جاتے ہیں
قربان اس کی قدرت کے شبراتن بوا کی بڑی بڑی آنکھیں فرط
عقیدت سے جگمگا اٹھیں ۔

شبراتن بوا جب میلے سے واپس آتیں تو ہم سب بھی ان
کے سامان پر ٹوٹ پڑتے ہیں کہ دیکھیں اب ان کی زنبیل
سے کیا کیا برآمد ہوتا ہے ، ان کے جھولے سے پلاسٹک کا
گلاس ، معمولی موتی کے ہار ، پیتل کی انگوٹھیاں ، طرح طرح
کے صابن ، پلاسٹک کی کنگھی ، اشتہاری منجن کی مفت
ملی ہوئی شیشی ، سرمہ کی پڑیا اور بہت ہی رنگ لگا پوڈر
کا ڈبہ ہم سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ۔ اور ہم لوگ انتہائی
سعادت مندی سے ان کے سامان کی تعریف کرتے رہتے ہیں ۔

" شبراتن بوا ہر وقت اور ہر طرح ستائی جاتی ہیں ۔"
ہماری دادی کا تو خیال یہ ہے کہ غریب شبراتن جب آجاتی
ہیں تو سب لوگ اطمینان سے چیزیں گڑبڑ کرتے ہیں کہ
نام تو شبراتن کا لگے گا ہی وہ بے چاری بڑے زیادہ بدنام
ہے اور گھر کے تمام ملازمین کو یقین ہے کہ کھٹکی ہوئی چیزیں
پھسلا کر شبراتن بوا نے ہماری دادی کو اپنے قابو میں کر لیا ہے
حالانکہ ہماری دادی ان کی لائی ہوئی چیزیں صرف ان کا دل
رکھنے کے لیے لے لیتی ہیں ۔

" شبراتن بوا تم رات کو کہاں غائب ہوگئی تھیں ؟"

" اے نوج ہمارے دشمن غائب ہوں بیٹا تم لوگوں کی زبان
بڑی خراب ہے جو کچھ منہ میں آئے کہہ دیتی ہو ۔"

" ارے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے ؟"

" لو اور سنو خود ہی پوچھ رہی ہیں کہ رات کہاں غائب
تھیں اور پھر ستم یہ کہ کون سی بری بات ہے ؟ "

" اے ہمارے زمانے میں نگوڑی لڑکیاں رات کا نام نہیں لیتی
تھیں ۔"

" بھئی اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے تم ہر بات کا برا
پہلو نکال لیتی ہو ، کل رات تم یہاں نہیں تھیں اس لیے پوچھ
لیا کون سا گناہ ہوگیا ؟ "

" اے تو رات اگر یہاں نہیں رہے تو کیا کہیں بھاگ گئے
تھے ؟ ارے باجی جان کے یہاں گئے تھے ۔۔ دیر ہوگئی تو وہیں
سو گئے تھے ۔"

" تم ہی برا مان گئیں ، غائب ہونا تو محاورہ ہے ہمارے
اسکول میں جب کوئی لڑکی ناغہ کرتی ہے تو ٹیچر اس سے
پوچھتی ہیں کہ کل تم کہاں غائب تھیں ؟ "

شبراتن بوا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا ۔۔۔ " تو یہ کہو
یہ سب مدرسے سے سیکھ کر آتی ہو ۔"

ٹھیک ہے جب استانیاں شاگردوں سے یہ پوچھیں کہ
کہ تم کہاں غائب تھیں تو پھر اور کیا ہونا ہے اور پڑھو مدرسے
میں اے آگ لگے ان مدرسوں کو سارا بگاڑ تو انھوں نے ہی
کیا ہے ۔

" اب تم کہاں جاؤ گی ؟ " ہم نے موضوع بدلنے میں عافیت
سمجھی ۔

" ارے کہاں جائیں گے ذری گھر جانا ہے ۔ اس مردار

کے لیے مہندی لائے ہیں وہ دینا ہے۔"

"ہاں شبراتن بوا گھر پر یاد آیا۔ تم اپنی بہو کو کب لاؤگی؟ ہم لوگوں نے تو دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"اے وہ مردی دیکھنے کے قابل بھی تو ہو۔" "کیوں؟ تم تو بڑی تعریف کر رہی تھیں۔"

"ارے ہاں کہا تھا جب اس ناگن کی حرکتیں نہیں دیکھی تھیں۔ ہم تو شکل دیکھ کر ریجھ گئے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ پیٹ میں یہ گن بھرے ہیں۔"

"نگوڑا سارا زیور بھی اسے دے دیا تم سے سچ کہتے ہیں بیٹا سیر بھر کی تو پازیب ہی تھی ٹیکا بندے، انگوٹھی اور سرولے سونے کے ڈبے۔ دلہن نگوڑی کی ماں کی تو آنکھیں پھٹ گئی تھیں زیور دیکھ کر اللہ جانتا ہے جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں چاہے بھابھی اماں سے پوچھ لو۔ یہاں عرس میں ہم زیور پہن کر آتے تھے۔"

"اب یہ تو بتاؤ کہ بہو میں برائی کیا ہے"؟

"اے برائی ایک ہو تو کوئی کہے۔ صاحب شادی شام کو ساری باندھ کر سنگار کر کے میاں کے ساتھ چاٹ کھانے جاتی ہیں اور وہ بے غیرت لے بھی جاتا ہے۔ خدا کی قسم ہمارا خون کھول جاتا ہے کہ ہم اب ایسے رذیل ہو گئے کہ ہماری بہو ٹھیلے کے پاس کھڑی ہو کر پتے چاٹے۔ لاکھ بار سمجھایا کہ گھر میں آلو منگاؤ چٹنی بناؤ، تو بہت سی چاٹ کھالو نہیں انھیں تو فقیروں کی طرح پتے چاٹنے میں مزہ آتا ہے"

"اچھا شبراتن بوا تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔" ہم نے انھیں پھسلانا چاہا۔

"ارے آرام ہمارے مقدر میں کہاں لکھا ہے۔ تم نے اس ناگن کا نام لے کر ہمارے کلیجے میں آگ لگا دی۔ اس کی ذات سے ہی ہم نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا ہے۔ نگوڑی رات دن ریڈیو پر عشقیہ گانے سنتی ہے۔ اس بڑھاپے میں لڑکے بہو کے سامنے ہم کو غیرت آتی ہے لیکن اس مردی کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔ موا گھر نہ ہوا کوٹھا ہو گیا۔" شبراتن بوا نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

شبراتن بوا تھوڑی بہت اردو پڑھی ہیں کہتی ہیں کہ بچپن میں ان کے ابا نے ایک مولوی صاحب سے قرآن شریف اور کریما پڑھوائی تھی۔ اب بھی جب موڈ میں ہوتی ہیں تو کریما سناتی ہیں ؎

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

اور ہم لوگ جب اس کا مطلب پوچھتے ہیں تو وہ اطمینان سے کہتی ہیں کہ مانی "معنی" مطلب ہم کو نہیں معلوم" ــــ تم نے اپنے مولوی صاحب سے بھی نہیں پوچھے"؟ اے نوج ہم مولوی صاحب سے گستاخی کرتے یہ تو تمہارا زمانہ ہے کہ منھ سے بات بعد میں نکالو مانی (معنی) مطلب پہلے سمجھاؤ، ہمارے لیے بس اتنا ہی ٹھیک ہے کہ کریما اللہ کا کلام ہے۔"

"ارے ارے بھئی یہ کس نے کہہ دیا کہ کریما اللہ کا کلام ہے؟" ہم نے حیرت سے کہا۔

بٹیا تم کابلیت (قابلیت) نہ جتاؤ۔ دلہن بی بی نے تم سب کو مدرسہ بھیج کر ہوائی دیدہ کر دیا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی قرینہ ہے کہ (صبح صبح) ہوئی لڑکوں کی طرح بستہ اٹھایا اور مدرسے چلی گئیں۔ نہ قرآن نہ کریما کچھ نہیں پڑھا۔"

پھر وہ انتہائی تاسف اور یقین کے ساتھ کہتیں آج کو تمہاری پر دادی زندہ ہوتیں تو بھلا مجال تھی کہ تم لوگ سوٹ بوٹ پہن کر مدرسے جاتیں۔" شبراتن بوا ہمیشہ کوٹ کو سوٹ بوٹ کہتیں ــــ "ارے وہ تو ہم لوگوں کا یونیفارم ہے ــــ"

"اے بھاڑ میں گیا اونی فارم (یونیفارم)"

"ارے بھئی سبھی لڑکیاں اسکول میں پڑھتی ہیں اگر ہم لوگ پڑھتے ہیں تو کیا برائی ہے؟"

"ہاں ہاں خوب اچک بھاند ہوتی ہے وہاں ہم کو سب معلوم ہے۔ لڑکیاں دو دو چوٹیاں باندھ کر نگوڑا پچی ایسا

پٹے گلے میں ڈالے اچکتی ہیں۔

"اچھا بابا اسکول نہ جائیں تو گھر پر پڑے پڑے کیا کریں؟" ہم لوگ انھیں ستانے کی غرض سے پوچھتے ——

"ارے کرو کیا ہزار کام ہیں گھر میں۔ پکانا، ریندھنا سیکھو تم لوگوں کو تو باورچی خانے سے اللہ واسطے کا بیر ہے ائے یہ تو بتاؤ، جو کھانا پکانا نہ آیا تو کل کلاں کو کیا ہوگا لڑکی ذات، پرائے گھر جانا ہے، مگر دلہن بی بی کو فکر ہی نہیں۔" شبراتن بوا بے حد فکرمند لہجے میں کہتیں۔

"شبراتن بوا! تم نے زہرِ عشق پڑھی ہے"؟ ہم لوگ چھیڑتے۔

"اے نوج خدا نہ کرے شیطان کے کان بہرے۔ سات قرآن درمیان اور تم کنواری بالی یہ نام منھ سے نکالتی ہو" شبراتن بوا مارے غیرت کے زہرِ عشق کا نام لینا بھی گوارہ نہ کرتیں۔

"ارے بھئی وہ تو ایک قصّہ ہے۔"

"اے بس رہنے دو، موے قصّے کو آگ لگاؤ، خبردار اب یہ نام منھ سے نکالنا۔ ہمارے زمانے میں یہ نام لینا ہی گالی سمجھا جاتا تھا۔ اب تو شرم لحاظ سب اٹھ گیا ہے۔"

پھر وہ ہماری دادی سے احتجاج کرتیں۔

"اے بھابھی اماں! تمھاری جان کی قسم ہم تو پہلے ہی تھکے ماندے آئے تھے اپنا سامان بھی ٹھیک نہیں کر پائے کہ یہاں سب جان کے لاگو ہوگئے۔ کوئی چور بتاتا ہے کوئی فقیرن۔ اب ہم جا رہے ہیں۔ جا کر کوٹھری کا حال دیکھنا ہے۔" شبراتن بوا بڑبڑا کر اپنا سامان لپیٹنے لگیں۔ چھوٹے کورے سے کس کس کر باندھا گلاس کو لوٹے کے اندر رکھ کر بلکہ یوں کہیے کہ اپنا سامان پیک کرکے گول ٹوپی کا کڑھا ہوا برقعہ سر پر ڈال کر وہ ہماری دادی سے رخصت ہونے کو آگے بڑھیں تو شبّو ان کے گلے سے لپٹ گئی: "میری اچھی شبراتن بوا ابھی نہ جاؤ۔"

"نگوڑی چھوڑ کیا ہڈیاں توڑ کر دم لے گی۔ اری مردی یہاں سے نہ جاؤں تو کیا تیری جوتیاں کھاؤں؟" شبّو کو غصہ میں ایک جھٹکا دے کر وہ ہماری دادی کی طرف بڑھیں، اور

بڑی عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہنے لگیں — "ہمارا کہا سُنا معاف کرنا۔" اور اپنے جھولے سنبھالتی چل دیں۔ — اس فکر کے ساتھ کہ دیکھو وہ پارچے والی گلی سے اصل خیر سے گزر سکیں گی یا نہیں ہم نے سب زور زور سے انھیں خدا حافظ کہنا شروع کیا اور وہ اپنی پاٹ دار آواز میں سلامت رہو، اچھی رہو، اللہ حافظ، اللہ نگہبان کہتی ہوئی پھاٹک کی طرف چل دیں۔

★

روشنی پٹیالوی
مکان نمبر ۲۱۶
سکٹر ۱۹۔سی
چنڈی گڑھ

وطن کی محبت

وطن سے ہے ہم کو حقیقی محبت
وطن کا ہر اک چپہ ہو رشکِ جنت
سہیں گے وطن کے لیے ہر مصیبت
یہی ہے تقاضائے رسمِ محبت
وطن ہی کی عزت سے اپنی ہے عزت
بہر طور اس کی کریں گے حفاظت
صداقت پہ مبنی ہے اس کی ریاست
ہر اک دل پہ ہو نقشِ بھارت کی عظمت
وطن کو نہیں جنگ سے کوئی نسبت
یہ دنیا کے حق میں ہو شمعِ ہدایت
ہمیشہ حفاظت کریں گے وطن کی
کریں گے نہ اب ہم کسی طور غفلت
یہی ہاں یہی اوجِ انسانیت ہے
وطن کی محبت۔ وطن سے محبت
وطن کے لیے جان قرباں کریں گے
پئیں گے بصد شوق جامِ شہادت
اسے اونچا رکھیں گے ہم اس طرح ہی
نہ کم ہونے دیں گے ترنگے کی رفعت
وطن پھر سے بن جائے گا رشکِ عالم
کریں گے اگر مل کے ہم اس کی خدمت
زمانے سے دشمن کی ہستی مٹا دیں
جوانانِ قومی میں ہو ایسی طاقت
ہمارے رگ و پے میں یہ بس گئی ہے
نہ جائے گی دل سے وطن کی محبت
یہ کشمیر سارے کا سارا ہے اپنا
گوارا نہیں ہم کو اس میں شراکت
اگر جان جائے نہ پروا کریں گے
مگر ملک کی ہم بچائیں گے عزت
جوانوں نے جوہر کچھ ایسے دکھائے
زمانے نے دی ان کو دادِ شجاعت

چراغِ محبت یہاں کرکے روشن
وطن سے مٹائیں گے نفرت کی ظلمت

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن
میرے جان اور دل، میری سچی لگن
تو خیالوں کی جنت میں چھایا ہوا
میری دلکش تمناؤں کی انجمن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

خاک بھی تیری میرے لیے کیمیا
تیرا پانی ہے شیر و شکر سے سوا،
الغرض تیری ہر شے ہے جاں سے عزیز
وہ ہوں گنگ و جمن یا ہوں دشت و دمن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

امن اور دوستی کا پیمبر ہے تو!
علم کی روشنی سے منور ہے تو!
تو نے جنگ و جدل کی کمی ساعتیں
ٹال کر دوسروں کو سکھایا چلن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

ہو کے آزاد تو کامراں ہو گیا
تو نے راہِ ترقی کو روشن کیا
فخر کے ساتھ دنیا نئی آج پھر
تیرے نقشِ قدم پر ہوئی گامزن!
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

تجھ سے جمہوریت کا علم سر بلند
تیری پالیسیاں غیر کو بھی پسند
رہنمائے جہاں تجھ کو کیوں نہ کہوں
دستگیری کے تو نے کیے ہیں جتن!
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

تیرا ہر ایک باسی محافظ ترا!
کوئی بھی اس کے ہو کام کا دائرہ!
بارہا سالمیت کی خاطر تری
سب کھڑے ہو گئے سر سے باندھے کفن
میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن!

رباب رشید
۶۵ تارین شاہ جہاں پور

گجرہٹ چنار پراجکٹ سے
ایشیائی کھیلوں تک

۱۹۸۱ء کو الوداع کہتے ہوئے ہم ۸۲ء کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اسے اپنا سلام پیش کرتے ہیں۔ سلام جو دعا ہے امن و سلامتی کی، جو تمنا ہے حصول رحمت کی، جو تقاضا ہے نیک خواہشات کا۔ اس کے ماحول میں سانس لینے والے، اس کے لمحوں میں عمل سے رنگ بھرنے والے، اس کے شب و روز کو تابناک بنانے والے ہم وطنوں کو بھی سلام، اس تیز رفتار صنعتی دور میں خواب دیکھنے کا زمانہ تو گیا اب تو بس مسلسل جد و جہد، پیہم تگ و دو اور رات دن کی ریاضت سے ہی اپنی منزل ہاتھ آ سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وقت کی اس کسوٹی پر ہم کسی سے کم کھرے نہیں اترے۔ باوجودیکہ ارضی و سماوی آفات سدِ راہ رہی ہیں، ملک نے ہر شعبۂ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری تعمیری کوششیں فوری طور اس طرح نہیں رنگ لاپاتیں جیسی کہ ہم توقع کرتے ہیں اور لوگ نیچے میں کچھ بچی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ رجحان درست نہیں۔ بعض اوقات قومی کاموں کے نتائج پوری طرح طویل مدت میں برآمد ہوتے ہیں۔ معاشرے کی بعض بنیادی خرابیاں بھی اس سلسلے میں حائل ہوتی ہیں۔ دراصل ہم کو ٹھنڈے دل سے اپنے دیش کے محدود وسائل پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ دنیا میں آج کل جس طرح اقتدار کی رسہ کشی جاری ہے اور بڑی طاقتیں اپنے اپنے حلقۂ اثر کو بڑھانے میں جس انداز سے سرگرم ہیں وہ بھارت جیسے غیر جانبدار ملک کے لیے

باعث تشویش ہیں، پھر ہماری ترقی بھی کچھ آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے، تیسرے آبادی اس قیامت خیز انداز میں بڑھ رہی ہے کہ اس پر قابو پانا ایک دشوار گزار مرحلہ بن گیا ہے ایسی ہی متعدد مشکلوں کے دائرے میں رہ کر جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ ہر بھارت واسی کے لیے قابل فخر ہے۔

ہمارا اتر پردیش جو بھارت کا عظیم جز ہے محدود وسائل کے ساتھ تیزی سے زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ آبادی کی کثرت نے ایک بڑا مسئلہ رہائش کا بھی پیدا کر دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کچے راستے، مٹی کے مکان، افلاس کے اندھیرے یہاں کی علامت تھے۔ اب جب خوشحالی آئی، یہ اپنے طور طریقے بدلے، نئے نئے منصوبے تکمیل کے متقاضی ہوئے تو اس کے لیے جو سب سے اہم ضرورت سامنے آئی وہ سیمنٹ کی فراہمی تھی۔ اس سنگین مسئلہ سے نپٹنے کے لیے حکومت اتر پردیش نے چرک چنار سیمنٹ پراجکٹ پر تیزی سے کام شروع کیا۔ اب اس عظیم منصوبہ کا کام مکمل ہو گیا ہے اور ان شاء اللہ جنوری ۸۲ء میں سیمنٹ کی پیداوار یہاں بھرپور طریقہ سے ہونے لگے گی۔ یومیہ پیداوار کے لحاظ سے یہ پراجکٹ ایشیا میں جاپان کے بعد دوسرا سب سے بڑا پراجکٹ ہوگا۔ اس سے نہ صرف صوبہ بلکہ ملک کی ترقی میں بھی نمایاں پیش رفت ہوگی۔ ابھی تک سیمنٹ کارپوریشن کے زیر اہتمام چرک اور ڈالہ میں واقع ان کارخانوں کی سالانہ پیداواری صلاحیت بالترتیب ۴٫۸۰ لاکھ ٹن اور چار لاکھ ٹن ہے۔ چرک سیمنٹ فیکٹری ۱۶٫۸۰ لاکھ ٹن سالانہ سیمنٹ پیدا کرنے لگے گی۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے مقدار تین گنی ہو جائے گی۔ کارپوریشن کے ۱۵۸٫۰۵ کروڑ روپیہ کے اس پراجکٹ پر صوبائی حکومت نے ۲۵ کروڑ روپیہ لگایا ہے۔ باقی رقم کا بندوبست ریاست کے بیرونی مالیاتی وسائل سے کیا گیا ہے۔ اتنے بڑے سرمایہ کے پردیش کے اندر آنے سے بہت جلد بعض مفید و مثبت نتائج سامنے آئیں گے اور صوبے کی خوشحالی میں نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ ہزاروں لوگوں کو براہ راست یا بالواسطہ روزگار کے مواقع بھی حاصل ہوں گے جس سے بے روزگاری کی سنگینی کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ جو سیمنٹ ملک کے دیگر علاقوں میں جائے گا اس پر عائد ایکسائز ڈیوٹی سے کروڑوں روپیہ صوبائی حکومت کو بھی حاصل ہوگا۔ فخر کی بات یہ ہے کہ اس میں کام آنے والے کل پرزے صرف ۹۰ لاکھ روپے کے ہی باہر سے آئیں گے باقی ۳۲ کروڑ روپیہ سے زیادہ کے کل پرزے ہمارے عظیم بھارت ورش کے ہی تیار کردہ ہیں۔

وزیر اعظم نے ۲۷ جون ۸۱ء کو یہ شاندار پراجکٹ قوم کے نام وقف کر دیا۔ یہ منصوبہ دو حصوں میں تقسیم ہے یعنی ڈالہ اور چنار میں اسے بانٹ دیا گیا ہے اور ایسا تال میل رکھا گیا ہے جو نقل و حمل میں آسانی پیدا کرے۔ اب ڈالہ میں ۱۲۰۰ ٹن یومیہ صلاحیت کے دو ڈرائی پراسیس کلن لگائے گئے ہیں اور ایک عظیم کام حکومت کی مخلصانہ کوششوں سے بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اس طرح ایک بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی جس سے تعمیراتی کاموں کی رفتار تیز سے تیز تر کرنے میں کافی مدد ملے گی۔

آج کل ہر طرف ایشیائی کھیل تقریبات کی دھوم ہے۔ دہلی جہاں یہ کھیل ہوں گے بہت تیزی سے اپنے نقش و نگار بدلنے میں مصروف ہے۔ تعمیرات کا بازار گرم ہے۔ سال رواں کے اکتوبر نومبر میں دہلی کھیلوں کے شہر میں تبدیل ہوتا نظر آئے گا۔ بھارت میزبان ہے اور ایشیا مہمان۔ ظاہر ہے روایتی مہمان نوازی کا اہتمام ہمارا فرض ہے۔ بہر نوع ہم شایان شان استقبال و خوش آمدید کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ منصوبہ کے تحت تین فلائی اوور بھی تعمیر ہوں گے اور مسرت کی بات یہ ہے کہ دیگر اداروں کے مقابلے میں یہ پراجکٹ پہلی بار اتر پردیش پل کارپوریشن کو ملا ہے یہ تینوں پل جون تک بلکہ اُن سے بھی پہلے کارپوریشن کو تیار کر کے متعلقہ حکام کے سپرد کر دینا ہیں۔ ان تعمیرات پر ۲ کروڑ روپیہ سے زیادہ کی لاگت کا تخمینہ ہے۔ کام شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد آپ کو اس کے تکمیل کی خبر مل جائے گی۔ یہ دلیش

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: مسافتِ شب ۔ شاعر ۔ زبیر رضوی ۔

ضخامت ۸۰ صفحے ۔

قیمت: دس روپے ۔ شائع کردہ: ۔ انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر ۔ نئی دہلی ۔

زبیر رضوی، ایک ایسی آواز کا نام ہے جو شعری فضاؤں میں گونجتی ہوئی تمام تر آوازوں میں ایک ممتاز منفرد اور جداگانہ انداز رکھتی ہے ۔ زبیر رضوی نام ہے جہد مسلسل کا، تلاش پیہم کا اور ایسی انداز فکر کا جس نے اپنی راہ اور اپنے لہجے کا خود تعین کیا ہے ۔

آج سے تقریباً چوتھائی صدی سے بھی کچھ زیادہ ہی کا عرصہ ہو گیا جب مشاعروں کے ڈائس پر زبیر رضوی ارضِ وطن کی عظمت کے ترانے گاتے ہوئے جلوہ گر ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی خوبصورت آواز سحر انگیز شخصیت کے باوصف مشاعروں کی دنیا پر چھانے لگے لیکن شاید مشاعروں کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ زبیر رضوی نے مشاعروں کے ذریعے حاصل ہونے والی برق رفتار شہرت کو اپنی صلاحیتوں کے لیے ایک خطرہ محسوس کر لیا اور مشاعروں میں بہت زیادہ شرکت کے بجائے مطالعاتی اور تخلیقی مصروفیات کی جانب متوجہ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ادبی شعور نے اگر ایک طرف اردو کے کلاسیکی ادب سے استفادہ کیا تو دوسری طرف نئی شعری قدروں میں اپنے کو مدغم کر لیا۔ قدیم اور جدید کے اس خوبصورت امتزاج سے زبیر رضوی کی فکر ایک ایسے شاعر کی فکر بن کر سامنے آنے لگی ہے جس میں قدیم روایات کی پاسداری بھی تھی اور جدید تقاضوں کی بے لاگ اور بھرپور نمائندگی بھی۔ زبیر رضوی کا اپنا انداز فکر ہے اور اپنا ہی لہجہ، ایسا لہجہ جو ان کو منفرد بناتا ہے، نمایاں کرتا ہے اور یہ وصف بہت کم ہی شعراء کے حصے میں آتا ہے۔

زبیر رضوی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے ۔ انھوں نے گیت بھی لکھے ہیں، غزلیں بھی کہی ہیں اور نظموں کو بھی موضوع سخن بنایا ہے لیکن جس طرح ان کی غزلوں اور نظموں میں فکر و فن کی دلکشی نمایاں ہے اسی طرح ان کے گیتوں میں بھی ادبیت بدرجۂ اتم موجود ہے ۔

مسافت شب زبیر رضوی کی نظموں اور غزلوں کا مختصر سا مجموعہ ہے جس میں چند گیت بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ مختصر سا شعری مجموعہ جو کل ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے زبیر رضوی کے مزاج اور انداز فکر کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے۔ نظموں میں خاص طور پر شریف زادہ، دوسرا آدمی، ردِ عمل الف زبر آ، ملاقات، بیناجنم، تبدیلی، ڈس کو تھک کی ایک دوپہر، علی بن متقی اور تیسرے شخص کی تلاش کے علاوہ، بارش اور کینوس ایسی نظمیں ہیں جو قاری کی توجہ خود بخود اپنی جانب مبذول کرا لیتی ہیں۔ بجنسہٖ یہی کیفیت غزلوں میں بھی جابجا نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بچھڑتے دامنوں میں پھول کی کچھ پتیاں رکھ دو
تعلق کی گراں باری میں تھوڑی نرمیاں رکھ دو

برستے بادلوں میں گھر کا آنگن ڈوب تو جائے
ابھی کچھ دیر کاغذ کی بنی یہ کشتیاں رکھ دو

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی
ان سے بچھڑے تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں

حسنِ امروز کو تشبیہ میں تولیں کیسے
اب وہ پہلے سے خم کاکل و گیسو بھی نہیں

خورشید کی بیٹی کہ جو دھوپوں میں پلی ہے
تہذیب کی دیوار کے سائے میں کھڑی ہے

الجھے ہیں قدم اور نہ اٹھی ہیں نگاہیں
شاید تری رفتار کی شوخی میں کمی ہے

ڈسوایا ہے پھنکارتے سانپوں سے بدن کو
تب جا کے یہ اک دولت فن ہاتھ لگی ہے

مختصراً مسافتِ شب، عمدہ کاغذ اور بہترین کتابت و طباعت سے آراستہ ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے بغیر کسی بھی لائبریری کا شعر و ادب نامکمل رہ جاتا ہے ۔

—— ساحر لکھنوی

نام کتاب - جلوۂ نو   شاعر - حرمت الاکرام
ضخامت - ۱۹۲ صفحات   قیمت - پندرہ روپیہ
ناشر - حلقۂ ترویج ادب - رام باغ - مرزا پور

حرمت الاکرام درمیانی نسل کے اُن شعراء میں ہیں جنھوں نے انتہائی ثابت قدمی و سلامت روی سے صحرائے سخن کی مسافت طے کی ہے اور اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ روایتی اقدار کے امین بھی ہیں اور جدید رجحانات کے پاسدار بھی۔ جہاں انھوں نے کلاسیکیت کے پھولوں سے رس نچوڑا ہے وہاں مختلف سمتوں سے آنے والے نئے جھونکوں سے بھی مشام جاں معطر کیا ہے۔ مزاج کے اس سنگم نے ان کی شعری تخلیقات کو جو رچاؤ دیا ہے اور تاثر کی جو فضا ان کے ادبی ماحول پر چھائی ہوئی ہے وہ اس عہد کے کم ہی شعرا کو نصیب ہوتی ہے۔ حرمت الاکرام کی شاعری تصور کی دین نہیں بلکہ مرزاپور کی ٹھہری ہوئی زندگی سے کلکتہ کی صنعتی و ہنگامی زندگی تک ورق در ورق پھیلی ہوئی ہے۔ تجربات و مشاہدات کی بھرپور عکاسی ان کے آئینۂ سخن میں لو دیتی نظر آتی ہے۔

"جلوۂ نو" نظموں، غزلوں اور رباعیوں پر مشتمل ایسی ادبی دستاویز ہے جس میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی، زندگی کی دلکش تصویر بھی ہے، خوابوں کی حسین تعبیر بھی، ماضی کا دھندلکا بھی ہے، حال کی کشمکش اور بلاخیزی بھی۔ وہ انتہائی کامیاب فنکار ہیں جو اپنی کاوشوں سے مختلف جہانوں کی سیر کراتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے ہم بھی اسی منظر کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ فن جب اس سطح پر اپنا جوہر دکھانے لگے تو ہم کو فنکار سے بہت کچھ توقع رکھنی چاہیے۔ ایک تابناک مستقبل اس کا منتظر رہتا ہے۔ ان کی نظم "کتابوں کے آگے" کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

دماغوں سے دلوں تک خامشی ہے
نظر اوراق کے آگے جھکی سی ہے
کتابیں راستہ روکے کھڑی ہیں
چٹانوں کی طرح ذہنوں سے سینوں تک پڑی ہیں
کتابوں نے چڑھا رکھا ہے چلوں پر کمانوں کو
کتابیں ریت کے طوفاں کی صورت گھٹتی جا رہی ہیں کاروانوں کو
دبستاں کس قدر سونا پڑا ہے
. . . .
ساعت کاغذوں کی شال میں لپٹی پڑی ہے
چلو آگے بڑھیں تھوڑی سی جرأت کی ضرورت ہے
بس اک ماچس کی تیلی سے یہ کہدیں آمد فرما، کتابوں کی ضرورت ہے

حرمت کی یہ نظم بڑی تیکھی اور منفرد انداز کی ہے۔ اسی طرح بیشتر نظمیں اپنی ایک اہمیت رکھتی ہیں۔ رہی غزل کی بات تو یہ ان کے بنیادی ذوق کی غماز ہے۔ چند شعر مختلف غزلوں سے ملاحظہ فرمائیں ـ

دشت بلا میں اور ہے منزل رسی کی شرط
دل سے ہٹے غبار تو رستہ دکھائی دے
کیا وقت آپڑا ہے کہ اپنا وجود بھی
خنجر کی طرح سر پہ لٹکتا دکھائی دے

ہائے کم کم کے گزرتے لمحے
وقت کچھ سوچ رہا ہو جیسے

نہ پھر میں نے چاہا نہ کچھ میں نے پایا
یہ ناکہی چھن گئی تو مرے پاس کیا رہے گا
سنگدل وقت نے پیدا کیے آذر کیا کیا
ڈھونڈ کر لائے یہ کہسار سے پتھر کیا کیا

شاعری میں رباعی ایک مشکل صنف ہے۔ بقول جوش یہ چالیس سال کے بعد ہی کہیں قابو میں آتی ہے۔ موجودہ دور میں چند ہی شعرا ایسے ہیں جو اس کا زاد اکو اپنے سینے سے لگائے ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ جو بیشتر اوزان میں سے کوئی چار ایک رباعی میں استعمال ہو سکتے ہیں یعنی ہر مصرع الگ

وزن ہو سکتا ہے، دوسرے چوتھا مصرع باقی تین مصرعوں کی جان ہوتا ہے۔ غرض اس میں بڑے اسرار ہیں۔ آیئے موصوف کی رباعیات دیکھیں ۔

تھک جاؤں اور تھک کے سو جاؤں میں
منزل سے نہ دور اور ہو جاؤں میں
آنکھوں سے کہو مجھ کو پکاریں اک بار
آواز کے صحرا میں نہ کھو جاؤں میں

کنکریوں نے ہیرے کا جگر کاٹا ہے
اخلاص کے سودے میں بڑا گھاٹا ہے
ہم لے کے کہاں جائیں دھڑکتا ہوا دل
احساس کے بازار میں سناٹا ہے

کتابت و طباعت خاصی ہے۔ کاغذ عمدہ استعمال کیا گیا ہے صوری و معنوی اعتبار سے جلوۂ نمو ایک معتبر مجموعہ ہے جس کی ہر حلقہ میں پذیرائی یقینی ہے ۔۔۔ رباب رشیدی

کچھ ہٹ چناب پراجکٹ سے ایشیائی کھیلوں تک صفحہ ۸۵ کا بقیہ

کے انجینیر شب و روز اس کی تعمیر لگن کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ پل یوں تو ہنگامی طور پر پیدا ہونے والی صورت کے تحت بن رہے ہیں مگر بعد میں یہ عوامی راحت کا مستقل طور سے ذریعہ بنے رہیں گے اور اہل دہلی کو ہمیشہ ایشیائی کھیلوں کا فیضان یاد دلاتے رہیں گے۔

ایک پل، اسکول لین فلائی اوور کے نام سے ہے۔ دوسرا ادبرائے ہوٹل فلائی اوور ہے۔ تیسرا اندرپرستھ فلائی اوور ہے۔ اسکول لین والا پل نئی اور پرانی دہلی کو مربوط کر دے گا اس پر ۱۰ میٹر چوڑائی کے دو لین ۵ر۱ میٹر فٹ پاتھ، ۲۲ر۱ میٹر سینٹرل برج ہوگا۔ پل میں ۴۶ میٹر لمبے ۹ در ہوں گے۔ اس کا ڈیزائن این ڈی ایم سی کا ہے۔ ریلوے لائن کے اوپری حصے کا پل ۲۵ر۵۳ میٹر لمبا ہوگا اور اس کی لاگت ۹۵ لاکھ روپیہ ہوگی۔ یہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے ۔۔۔ ادبرائے فلائی اوور دہلی نظم و نسق تعمیر کرا رہا ہے یہ ۷۰۶ میٹر لمبا ہوگا اور اس پر ۲۵۳ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ اس میں ۱۱ میٹر کی دو لین، ۴ر۱ میٹر سینٹرل برج کے ساتھ ہوں گی ۔۔۔ اندرپرستھ فلائی اوور بھی دہلی نظم و نسق کی طرف سے ہے۔ یہ ۵۶۷ میٹر لمبا پل ہے۔ جس پر ۲۱۷ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ اس کا ڈیزائن بھی ادبرائے فلائی اوور کی طرح کارپوریشن کا اپنا ہے۔ ویسے بھی ہمارا پل کارپوریشن جمنا پل کی تعمیر کے لیے بھی کوشاں ہے جس پر ۳۵ کروڑ کی لاگت کا اندازہ ہے۔ اگر یہ ٹھیکہ مل جاتا ہے تو اس سے ریاست کی ترقی میں نمایاں مدد ملے گی۔ نجی زمرے سے سرکاری زمرے تک اگر سب ہی مخلصانہ طور پر دیش کی ترقی کے لیے سرگرم ہو جائیں اور کوشش کر کے باہر سے ریاست میں روپیہ لائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک صبح تابناک ہمارے استقبال کی منتظر نہ ہو اور ہمارے لیے یہ پیام مسرت نہ لائے۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
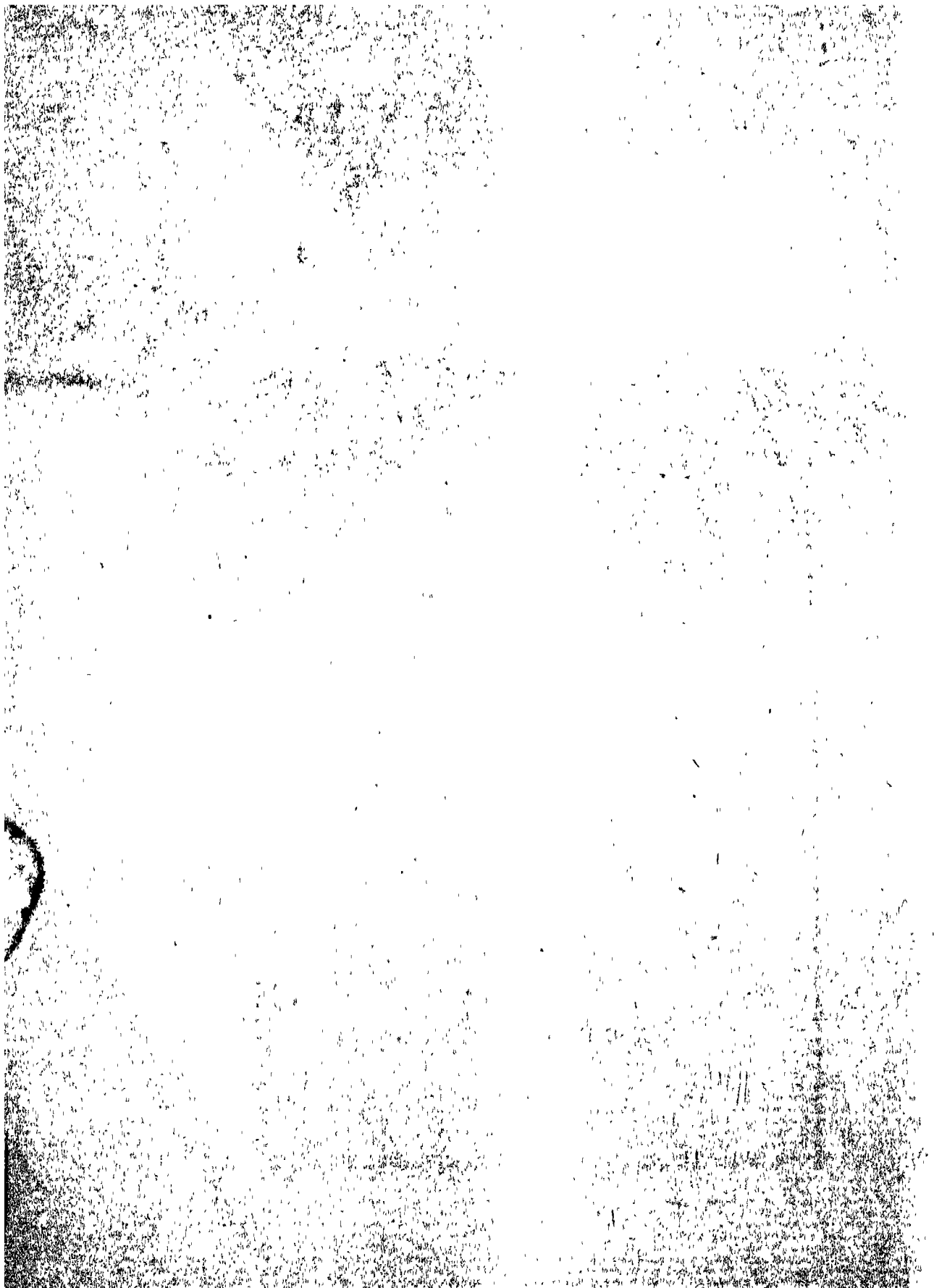
Urdu Monthly
NAYA DAUR
POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

75. No 10,11
FEB. 19[illegible]
PAISE

REGD No. LW/NP. 17
Annual Subs.
Rs. 5/-

مارچ ۱۹۸۳ء

جلد ۳۶ | نمبر ۱۲

مارچ سنہ ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

زرِ چندہ کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۳۔ لکھنؤ

بیمہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات
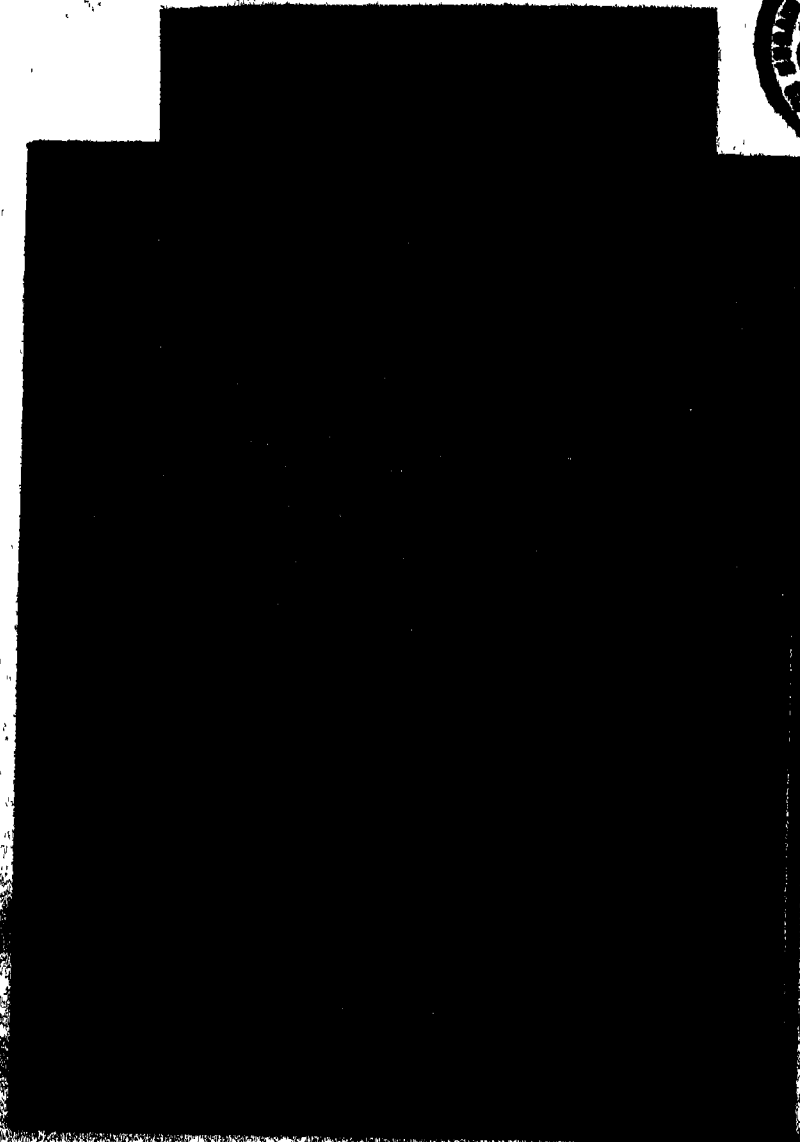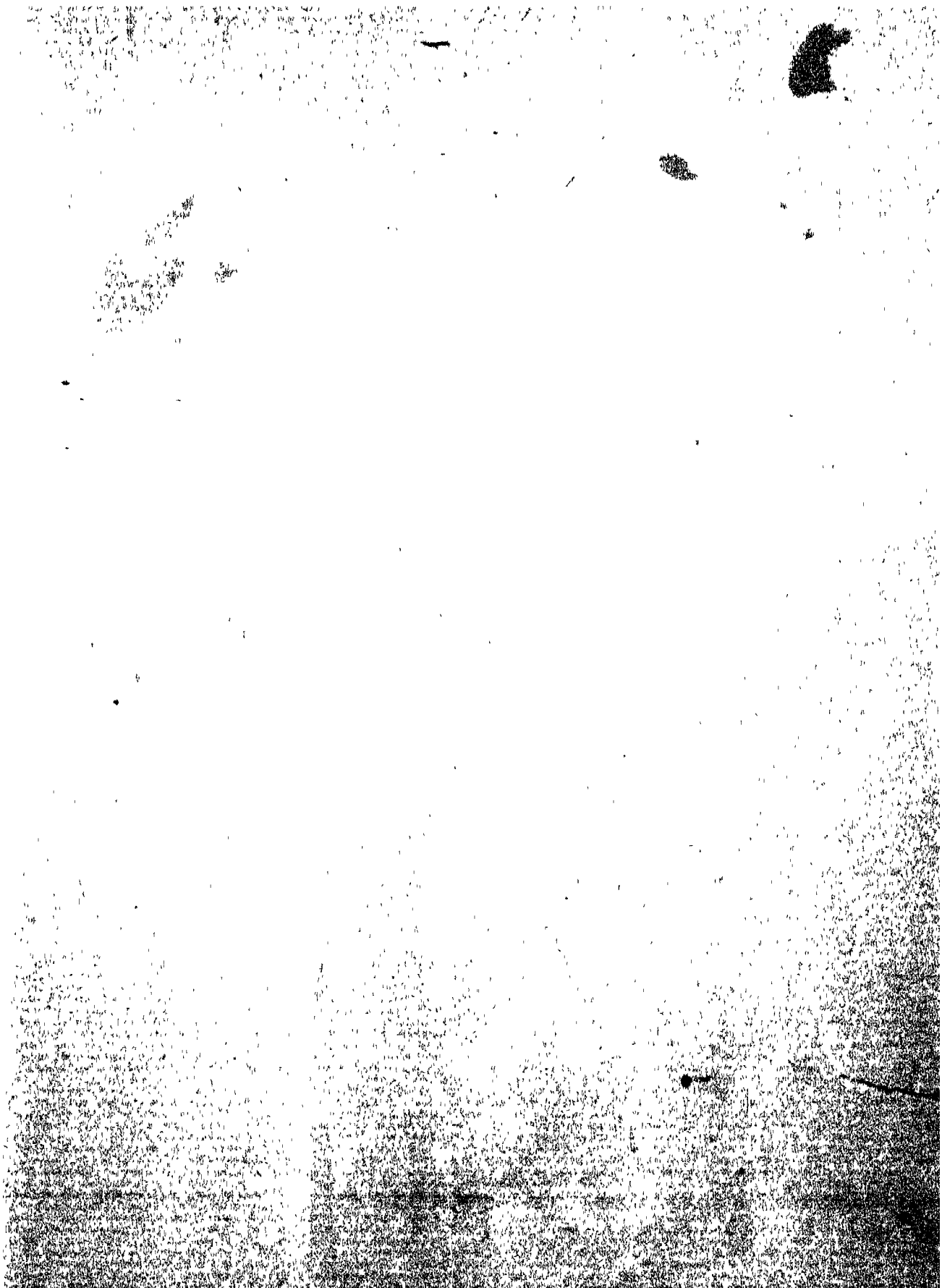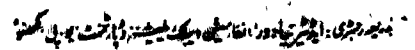
جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کی وفات اس صدی کے عظیم ادبی سانحات میں سے ایک ایسا سانحہ ہے جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چند ہی دنوں کے اندر اردو زبان اپنی دو قد آور اور عہد ساز شخصیتوں سے محروم ہو گئی اور ان کی موت سے اردو شاعری کا ایک عظیم الشان دور ختم ہو گیا۔

جوش ملیح آبادی کا انتقال ۲۲ فروری کو اسلام آباد (پاکستان) میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمت کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جوش صاحب بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور انھوں نے نظم کو بانکپن بلند آہنگی، گھن گرج اور ایک ایسا لہجہ عطا کیا جس نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ ان کے ۲۳ شعری مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ ان کی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" بھی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ مختلف ناشروں نے اسے دوبارہ ہندستان میں بھی شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی آٹھ کتابیں ابھی غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ جوش صاحب کی تعلیم سیتا پور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ میں ہوئی۔ اپنے والد کی رحلت کے چند سال بعد وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے آئے اور ایک نہایت اہم ادبی جریدے "کلیم" کی اشاعت کا آغاز کیا۔ حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامے "آج کل" کے بھی وہ کافی عرصے تک مدیر رہے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ان کے بڑے قریبی مراسم تھے۔ انھیں حکومت ہند کی جانب سے "پدم بھوشن" کے اعزاز سے نوازا گیا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر وہ ۱۹۵۶ء میں ملک چھوڑ کر پاکستان جا بسے اور وہیں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس طرح وہ آواز جس نے اپنے متعلق خود یہ کہا تھا ؎

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب   میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

خاموش ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آواز ہمارے ذہن و دل میں ہمیشہ گونجتی رہے گی اور تحریک عزم و عمل دیتی رہے گی۔

جوش صاحب کے انتقال کے چند ہی دن بعد اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک اور زبردست صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صدمہ فراق گورکھپوری کے انتقال کا تھا، جو ۳ مارچ کو نئی دہلی میں ہوا۔ انتقال کے وقت فراق صاحب کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔ وہ آخر دم تک شعر و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو کے کاز کے لیے بھی ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ اس طرح ان کے انتقال سے اردو اپنے ایک بے باک اور نڈر مجاہد سے محروم ہو گئی ہے۔ جہاں تک فراق صاحب کی شاعری کا تعلق ہے اس میں بلا کا رچاؤ ملتا ہے۔ خواہ ان کی غزلیں ہوں، نظمیں ہوں یا رباعیات ایک رچاؤ سب میں موجود ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق انھوں نے خود کہا تھا کہ ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر انھیں شاعر نیم شبی کہا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری پر انگریزی، سنسکرت اور فارسی ادب کے اثرات نمایاں تھے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے، جن میں شبنمستان، گل نغمہ، روح کائنات اور مشعل وغیرہ نے خاص طور سے ادبی و علمی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اس کے علاوہ رباعیات کا ایک خوبصورت مجموعہ "روپ" بھی شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "اندازے" بھی شائع ہوا جو تاثراتی تنقید کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان دونوں شخصیتوں کے انتقال کو بجا طور پر دو کاری ضربیں قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "اردو کی قد آور شخصیتیں اٹھ گئیں، اردو اور ہندستانی کو دو کاری ضربیں لگیں۔ موت ہمیشہ غمناک ہوتی ہے اور ایک شاعر کی وفات تو خاص طور پر تکلیف دہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ پیام حسن دیتا ہے۔" جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کا انتقال محض دو عظیم فن کاروں کا انتقال نہیں ہے۔ بلکہ ایک پورے دور کا خاتمہ ہے۔ جوش اور فراق ہمعصر تھے۔ لیکن زبان و اسلوب کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ اس کے باوجود خیال و احساس کی ہم آہنگی نے دونوں کے درمیان ادب کی سطح پر بھی ایک طرح کا ربط قائم رکھا تھا۔ ادارۂ نیا دور ان عظیم فن کاروں کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اپنا پر خلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

● لکھنؤ کے ادبی و علمی حلقوں کی ایک ہر دلعزیز شخصیت ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل کا بھی ۱۱ فروری کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی تھی۔ خلیل صاحب نے پی ایچ ڈی کے لیے "اردو غزل کے پچاس سال کا تجزیہ" کیا تھا، وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین کے مجموعے "مقدمات و مقالات" نے بھی ادبی و علمی حلقوں سے کافی داد و تحسین حاصل کی۔ ادب کی کلاسیکی روایات اور فارسی زبان و ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے فارسی کے لغات کشوری، گلستان اور بوستاں کے قدیم ترجموں پر نظر ثانی بھی کی اور میر کالج کے نصاب کے لیے "گلہائے ادب" مرتب کی۔ تصنیف و تالیف کے کاموں میں وہ آخری وقت تک لگے رہے۔ ایک اچھے نثر نگار

(باقی ص ۲۳ پر)

غلام ربانی تاباں
۲۲۰، ذاکر نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵

غزل

کوئی بھی موسم ہو اذنِ لب کشائی تو ملے
اک ذرا سی فرصتِ نغمہ سرائی تو ملے

دل کے ویرانے میں کھل جائیں جراحت کے چمن
اس قدر یاروں سے دادِ آشنائی تو ملے

ختم ہو جائیں گے سب سود و زیاں کے مرحلے
زندگی کو اعتبارِ نارسائی تو ملے

گل نہ ہوں برق و شرر کی گرم بازاری تو ہو
شوق کو قیدِ نشیمن سے رہائی تو ملے

اور اب اُن کے کرم سے کیا توقع کیجیے
انجمن میں مژدۂ بے اعتنائی تو ملے

مصلحت کے ڈر میں رہ جائے دل کی آبرو
حسن کو تاباں خلوصِ بے وفائی تو ملے

[illegible]
خاتون [illegible] ڈی ۲۲۹۰
[illegible] ساگر، لکھنؤ

ریڈیو ناٹک - کہانی کے تعلق سے

یہ تیسری دہائی کی بات ہے، ریڈیو کی مقبولیت بڑے بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹے چھوٹے شہروں تک بھی پہنچنے لگی تھی۔ فلمی نغموں اور کلاسیکی سنگیت کے پروگرام اس زمانے میں بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سنے جاتے تھے لیکن انہی دنوں ریڈیو میڈیا سے ادب کی جس صنف نے سننے والوں کے دل میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی وہ اردو ڈراما تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراما قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ اگر ڈرامے لکھے بھی جاتے تھے تو وہ رسالوں میں افسانوں کی سی دلچسپی ہی پیش کیا کرتے تھے۔ یعنی وہ کسی بھی نقطۂ نظر سے اسٹیج کے جملہ تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ جس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ہمارے ڈرامانگار عملی طور پر اسٹیج سے دور جا چکے تھے۔ اس زمانے میں بولتی فلمیں یعنی ٹاکی فلمیں بڑی تیزی سے اپنے قدم جما رہی تھیں۔ ظاہر ہے فلم کا اسکرپٹ بھی دراصل ایک ڈراما ہی ہوتا ہے جس کا جنم داتا بھی اسٹیج ہی تھا۔ لیکن فلم سازی ایک دوسرا آرٹ بھی ہے جسے ہم بڑی آسانی سے کمرشیل آرٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے دور میں ریڈیو ناٹک ایک نئے آرٹ کے طور پر اچانک ابھرا اور اس نے آواز کی دنیا میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی۔

مجھے یاد ہے اس زمانے میں ہم لوگ، جن میں ہم سے زیادہ عمر کے افراد بھی یقیناً شامل تھے، ریڈیو کے پروگراموں کو جو آواز، لسنر وغیرہ رسالوں میں باقاعدگی سے چھپتے تھے بڑے غور سے پڑھتے اور ناٹکوں والے دنوں اور اوقات پر نشان لگا کر رکھ لیتے تھے تاکہ پروگرام والے دن انھیں سننا بھول نہ جائیں۔ اس دور کے ڈراما لکھنے والے کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، حکیم عبدالرحیم، اپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، رفیع پیر، شوکت تھانوی وغیرہ ہمارے لیے بڑی کشش رکھتے تھے۔ جو شمالی ہند میں لاہور، پشاور، دلی اور لکھنؤ وغیرہ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وابستہ تھے۔ اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشن ساری دنیا میں اس قدر زیادہ نہیں تھے اس لیے کوئی بھی اسٹیشن ذرا سی سوئی گھما کر بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا جب کہ آج یہ صورت حال ہے کہ سوئی کی نوک پر کئی کئی اسٹیشن موجود ہیں اور اکثر و بیشتر ذرا دوری پر واقع اسٹیشن پکڑنے میں بھی خاصی دشواری پیش آ جاتی ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا ذکر کرتے وقت میں اسٹیج کا یا فلمی منظر کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ ان دونوں میں ایک خاص منظر ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی مکان یا اس کا کوئی حصہ یا گلی یا بازار یا کوئی بھی لینڈ اسکیپ جس کا ڈرامے سے تعلق ہو۔ اور اس منظر میں — ایک یا ایک سے زیادہ متحرک جیتے جاگتے انسان جو اپنے اپنے مخصوص لباس پہنے ہوتے ہیں اور ناٹک کے اندر چھپی ہوئی کہانی کے مطابق اپنے ڈائیلاگ بول رہے ہوتے ہیں۔ ریڈیو ناٹک نے انہی دو اصناف کی کوکھ میں سے جنم لیا ہے لیکن اس کی ساری

پرفارمینس صرف آوازوں پر ہی ہوتی ہے یعنی ـــ آواز ہی کی مدد سے ہم اپنے تصور میں ایک مکان یا کوئی بھی منظر دیکھتے ہیں اور آواز ہی سے ہم ڈرامے کے کرداروں کے حلیہ، عمر اور ان کے جذبات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو کی آواز ہمارے سامنے ایک مکمل آواز بن جاتی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ یہ تو ہم سننے والوں کی حیات کا کمال ہے کہ ہم کوئی بھی پردۂ غیب سے آنے والی آوازسن کر بولنے والے کے سلسلے خدوخال اور اس کے گرد وپیش کا بھی آناً فاناً اندازہ کر سکتے ہیں تو ہمارا یہ دعویٰ سو فی صدی صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ریڈیو پر اجنبی لوگوں کی تقریریں سن کر ہم ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہم تقریر کا صرف متن سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اور ریڈیو ڈراما تقریر ہرگز نہیں ہوتا ـــ یہ کہانی، واقعے مسئلے اور کرداروں کا ایک ترتیب شدہ مجموعہ ہوتا ہے جس کی ریڈیو میڈیا سے پیشکش اسٹیج اور فلم کی پیش کش سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ تینوں میڈیا الفاظ ہی کے محتاج ہوتے ہیں لیکن اسٹیج اور فلم میں الفاظ کی پرفارمینس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے جبکہ ریڈیو پہ سننے کے لیے صرف الفاظ ملتے ہیں اور الفاظ ہی ریڈیو ڈرامے کے لیے ایک بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ریڈیو ڈرامے کے کسی حصے میں کوئی کردار اگر یہ کہے ـــ 'میں اس وقت بڑی تنہائی محسوس کر رہا ہوں' یا 'میں اس وقت بڑی تنہائی محسوس کر رہی ہوں' ـــ تو ہمارے تصور میں ایک مرد یا عورت کے ہی خدوخال ابھریں گے اور یہ صاف طور پر معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس مرد یا عورت نے کس ماحول یہ الفاظ کہے ہیں ـــ اور جب ہم اس کی زبان سے یہ بھی کہلوا دیں ـــ 'اُف! یہ گھر یا گلی یا بھیڑ بھاڑ مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہے' ـــ تو ہمارے ذہن میں آناً فاناً ایک گھر یا گلی یا بھیڑ بھاڑ والا منظر گھوم جائے گا۔

اسی طرح ریڈیو ناٹک میں اگر کوئی سپہ سالار اپنے فوجیوں سے صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جائے ـــ 'بہادرو! بڑھے چلو' تو یہ منظر بھی ہمارے تصور میں ادھورا ہی رہ جائے گا جب تک کہ ہم اس کے ڈائیلاگ میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیں 'دشمن کی صفیں ہمیں پہاڑیوں کی چوٹیوں سے اترتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ ہمیں ان پر تین طرف سے حملہ کرنا ہے ایک ٹکڑی دائیں راستے سے نالا پار کر کے ان کے پیچھے جائے گی، دوسری ٹکڑی بائیں جانب موقع کا انتظار کرے گی اور تیسری ٹکڑی سامنے جا کر لڑے گی' ـــ یہ سنتے ہی ہمارے سامنے میدان جنگ کا پورا نقشہ آجاتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم الفاظ ہی کی مدد سے موت خوشی، ہنگامہ افسردگی، مایوسی اور امید کا ایک ایسا ماحول پیدا کر سکتے ہیں جو ہمیں اپنی روزمرّہ زندگی میں دیکھنے کو ملتا ہے یا جو ہماری سماجی یا تاریخی کتابوں میں محفوظ پڑا ہے۔ اگرچہ ایسے مناظر کو زیادہ EFFECTIVE بنانے میں ریڈیو کے دوسرے ذرائع بھی مدد دیتے ہیں یعنی DUBBING کے ذریعے ایسی آوازوں کو بھی شامل کر لینا جو گلی محلے بازار و سڑکوں، جنگی توپوں، بندوقوں، گھوڑوں کی ٹاپوں، بادلوں، ہوائی جہازوں، ریل گاڑی وغیرہ سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ یا موت، خوشی، مایوسی، خاموشی وغیرہ کو سنگیت کے ذریعے ابھارا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ان میں سے بعض کیفیتوں کو ہم سنگیت کی مدد لیے بغیر بھی بڑے موثر انداز سے پیش کر سکتے ہیں اس صورت میں ناٹک کار کے لکھے ہوئے الفاظ ہی اپنا کام کرتے ہیں۔

یہی الفاظ ایک ناٹک میں کہانی یا واقعے کی گرہیں بھی رفتہ رفتہ کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ کام ہم کرداروں کی زبان سے لیتے ہیں۔ ناٹک کا موضوع کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ سماجی یا تاریخی ـــ پرانا یا ماڈرن ـــ اسی ماحول کے کردار بھی ہوں گے جن کو ہم الفاظ کی مدد سے ESTABLISH

کریں گے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر، پروفیسر، اسٹوڈنٹ، باپ بیٹا، پتی، پتنی، سائنس داں، سیاست داں، ڈاکو، بہادر بزدل، چالاک، مکار، معصوم وغیرہ سبھی آجاتے ہیں۔ اب یہ ڈراما لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کرداروں کو نہ صرف بھائی یا بیٹا یا حضور یا سر کہلا کر متعارف کرائے بلکہ ان سارے کرداروں کو وہ زبان بھی دیدے جو وہ اپنے اپنے پیشے ماحول، علاقے اور عمر کے علاوہ اپنی نفسیات کے عین مطابق روزمرہ بولتے ہیں یا ماضی قریب یا ماضی بعید کی تاریخ میں بولتے رہے ہوں گے۔ اس معاملے میں ذرا سی بھی چوک سننے والے کے کانوں پر بار گزر سکتی ہے۔ کردار نگاری بھی ڈرامے کے کہانی پن کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ کبھی کبھی یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی ڈرامے میں کہانی پن یا واقعہ بہت ذرا سا ہو لیکن اس صورت میں سارا بار کردار نگاری پر آپڑے گا۔ اگر یہاں ہمارا ڈرامہ نگار کردار نگاری پر دھیان نہیں دے گا تو سارا ڈرامہ پھسپھسا ہو کر رہ جائے گا۔

مثال کے طور پر کسی قصبے کی پُلیا پر ہر روز شام کے وقت دو آدمی آکر بیٹھتے ہیں اور قصبے میں ہونے والے واقعات اور دن میں اخباروں میں پڑھی ہوئی خبروں پر تبصرہ کیا کرتے ہیں۔ ان دو آدمیوں اور قصبے کی سماجی زندگی کی تصویر کشی کرنے کے لیے کردار نگاری ہی کے فن میں مہارت کا ہونا ضروری ہے ورنہ واقعات اپنی اہمیت محسوس نہیں کرا پائیں گے۔

اسی طرح شمال سے جنوب یا جنوب سے شمال کی طرف رواں دواں اور سامان سے لدے ہوئے دو ٹرکوں کے ڈرائیور شام کے جھٹپٹے میں کسی شہر کی سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک ڈھابے میں دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے جا بیٹھتے ہیں۔ تو ان کی باتوں میں ہمارے سماج، ہماری معیشت اور طویل ترین سفر کی صعوبتوں کے علاوہ اور بھی کتنا کچھ سمیٹا جا سکتا ہے۔ ان کی اپنی زندگی کے مسائل، ان کے ہر چیز

کو دیکھنے کے انفرادی رویے اور یقیناً ان کے اندر کا DIGNITY OF LABOUR) کا احساس بھی۔

یہ دو مثالیں میں نے ڈرامے کے بہت ہی THIN PLOT کو واضح کرنے کے لیے پیش کی ہیں تاکہ سننے والے یہ اندازہ کر سکیں کہ ریڈیو ڈرامہ صرف دو کرداروں کا ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی ڈرامے زندگی کو ABSTRACT (تجریدیت) یا مونو لوگ بنا کر بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جس طرح انسان بولتا ہے۔ اسی طرح کمرے میں لگی تصویریں، یا دیواریں یا خالی مکان یا پورا ماحول بھی بول سکتا ہے اور ہماری زندگی کی حرکت، شور، بے حسی بیزاری یا سناٹے کو نئے نئے تجرباتی انداز سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا ایک اور اہم پہلو اس کی زبان کا اسٹائل ہے۔ کہانی یا ناول پڑھنے والا کوئی بھی ذہین قاری فکشن آرٹ کے اس نکتے کو بخوبی جانتا ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جس کے ذریعے اس ماحول کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ ماحول صرف واقعات، مسائل یا کردار ہی نہیں دیتا وہ ہر دیکھنے والے کو ایک طرزِ اظہار بھی دیتا ہے اور ایک نقطۂ نظر بھی۔ ڈرامے میں بھی نقطۂ نظر کی وہی اہمیت ہے جو ناول اور کہانی میں ہوتی ہے لیکن ڈرامے میں صرف طرزِ اظہار یا اسلوب ہی پیچھے رہ جاتا ہے کیونکہ اس میں صرف کردار بولتے ہیں۔ مصنف خود نہیں بول سکتا۔ میں یہاں DETATCHED رویے یا APPROACH کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ کردار اپنی اپنی زبان اور انفرادی لہجے کی مدد سے مسائل کو پُر حرکت بنا کر پیش کریں خواہ وہ مسائل سارے ریڈیو ڈراما سننے والوں کے لیے نہ ہوں یا ان کے ساتھ وہ کم سے کم بھی (IDENTIFY) نہ کر سکیں مگر ان میں ان کے لیے اتنی دلچسپی ضرور پیدا ہو جائے کہ وہ پہلوؤں کو الگ ہو کر بھی سوچنے کا حق حاصل ہے۔ کے اصول کو مان کر ڈراما سننے اور خود ہی سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ کسی بھی ڈرامے کی کامیابی کا یہی ایک بڑا ثبوت ہو سکتا ہے۔

دیا شنکر سکسینہ بحر موجی
نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ
ڈویژنل آفس ۲
۱۶/۹۶ دی مال روڈ، کانپور-۱

ویران آبادیاں

دیکھ اے چشمِ بصیرت دیکھ شہروں کا سماں
کس قدر ویراں نظر آتی ہیں یہ آبادیاں

شہرِ دہلی کا ہے یہ اعلان مجھ کو ناز ہے
میرے سینے میں نظامِ سلطنت کا راز ہے

راستوں میں ساکنانِ شہر ہیں گرمِ خرام
خندہ زن دن کے اجالوں پہ ہے میخانے کی شام

ملک کے قابل نمائندوں کی میں ہوں جلوہ گاہ
میری تابش دیکھ کے شرمائے ہیں مہر و ماہ

کارخانوں کی مشینیں چیختی ہیں رات بھر
خواب سے ناآشنا ہے جگمگاتی رہ گزر

آگرہ کہتا ہے میرا تاج ہے فخرِ جہاں
میرا دعویٰ ہے کہ میں ہوں نازشِ ہندوستاں

موٹروں کے ہارن، سیٹی مل کی، بازاروں کا شور
بیچنے والوں کی آوازیں، خریداروں کا شور

میں ہوں صناعی کا مرکز کہہ رہا ہے کانپور
جانتے ہیں مجھ کو سب، شہرت مری دور دور

بمبئی کا شہر کہتا ہے کہ میں ہوں انتخاب
میرا منظر روح پرور، قصر میرے لاجواب

الغرض ہر شہر کا دعویٰ ہے میں ہوں بے مثال
میرے دم سے ہے یہاں سرمایہ داری کا جلال

اپنی رعنائی کا قصہ کس زباں سے میں کہوں
جو سمندر کے کنارے ہے میں وہ فردوس ہوں

میں نے پوچھا تم میں انساں بھی کوئی آباد ہے
ذرہ ذرہ چیخ کر کہنے لگا فریاد ہے

ناز کرتا ہے مری تعمیر پہ ذوقِ بشر
ہوش اڑ جاتے ہیں چوپاٹی کا ساحل دیکھ کر

پھر جواب آیا کہ سن اے شاعرِ شیریں زباں
کس قدر ناداں ہے تو، اس دور میں انساں کہاں

مہ جبینوں نازنینوں کی حسیں محفل ہوں میں
حسن کی جنت ہوں، اہلِ عشق کی منزل ہوں میں

سیم و زر کے دور میں انساں کی ہے جستجو
مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوانہ ہے تو

بحرؔ انساں کا کہیں ملتا نہیں نام و نشاں
کس قدر ویران ہیں یہ شہر کی آبادیاں

ڈاکٹر سمیع اللہ
یونگ کالج - بنارس ہندو یونیورسٹی
انسی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں

مشرقی علوم کی توسیع و ترقی

اس میں شبہہ نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے بڑی عیاری و مکاری سے کام لیا اور اپنی سیاسی گرفت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے نارواحرکات بلکہ بعض اوقات کشت و غارت گری کا بھی مظاہرہ کیا لیکن اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندستان میں تعلیم و تدریس کے فروغ میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس تعلیم کی نوعیت مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ شروع کے زمانے میں جبکہ کمپنی محض ایک تجارتی ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی اس نے ایسے مدارس قائم کیے جن میں صرف عیسائی مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان۔ ان۔ لا کے بقول ۱۶۱۴ء میں اپنے ہم وطنوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و توسیع کے لیے کئی اقدام کیے گئے۔ ۱۶۵۹ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ہندستان میں مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بڑے شدومد کے ساتھ اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا اور جہازوں پر مشنریوں کو ہندستان آنے کی اجازت دی۔ مسیحیت کی اس تبلیغ و اشاعت کو برطانوی پارلیمنٹ نے بھی بڑا سہارا دیا۔ چنانچہ ۱۶۹۸ء میں جب کمپنی کا چارٹر تجدید کے لیے پیش ہوا تو اس میں ایک خاص دفعہ شامل کی گئی، جس کی رو سے کمپنی کو اپنے تمام کارخانوں میں پادری رکھنے اور پانچ سو ٹن یا اس سے زیادہ کے ہر جہاز میں ایک چیپلین (CHAPLAIN) لانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ پارلیمنٹ یہ چاہتی تھی کہ کمپنی اپنی تمام چھاؤنیوں اور کارخانوں میں جہاں بھی ناگزیر سمجھے اسکول قائم کرے۔ ان اسکولوں کے ذریعہ عیسائی بچوں خاص طور سے ہندستانی بیویوں سے کمپنی کے سپاہیوں کے بچوں اور انڈین بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ ان بچوں کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ان چیپلینوں نے ذاتی طور پر بھی چندے جمع کر کے اس قسم کے اسکول قائم کیے۔ ایسے اداروں کو "چیریٹی اسکول" کہا جاتا تھا اور انھیں کمپنی کی اعانت و حمایت حاصل ہوتی تھی۔

۱۷۶۵ء تک کمپنی نے اپنی توجہ یوروپین اور اینگلو انڈین بچوں کی تعلیم تک ہی محدود رکھی۔ لیکن اس کے بعد جب اس نے ایک سیاسی قوت حاصل کر لی تو اپنی تعلیمی پالیسی میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اسے ہندستانیوں کی تعلیم کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ سیاسی طور پر کمپنی ان ہندو اور مسلمان حکمرانوں کی جانشین تھی جنھوں نے کلاسیکی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے پاٹھ شالائیں اور مدرسے قائم کیے تھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ پنڈتوں اور مولویوں کو اعزاز اور مالی امداد دی تھی اور اعلیٰ تعلیم کے بعض اداروں کی اوقاف کے ذریعے ہمت افزائی کی تھی۔ چنانچہ کمپنی نے بھی ان ہی روایات کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس اقدام کا دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ بااثر ہندستانیوں

کے لڑکوں کو اعلا عہدوں پر فائز کرکے ان کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ اسی خواہش نے انھیں چیریٹی اسکولوں سے مختلف قسم کے تعلیمی اداروں کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے اعلا تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے۔ ان اداروں میں کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج سرفہرست ہیں۔ ان دو تعلیمی اداروں کے قیام سے مشرقی مکتب (ORIENTAL SCHOOL) کا آغاز ہوا۔ ۱۷۶۵ء کے بعد کمپنی نے نہ صرف یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ مشنری تنظیموں اور تبدیلیٔ مذہب کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی مدد نہیں کرے گی۔ بلکہ مسیحی مبلّغین کو ہندستان آنے اور یہاں مذہب کی تبلیغ کرنے سے روکا بھی گیا۔ اپنی بدلی ہوئی پالیسی کے تحت اس نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کی طرح عربی و فارسی سنسکرت زبانوں اور مشرقی علوم و فنون کا پرچار کرے گی اور ہندوؤں مسلمانوں کی تعلیم کا جو پرانا نظام چلا آرہا ہے اس پر عمل پیرا رہے گی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ کمپنی نے یہ پالیسی سیاسی مصلحت ہی کی بنا پر اختیار کی تھی کیونکہ اس وقت ہندوستان میں تعلیم نے نہیں بلکہ سیاست نے اہمیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ ڈائرکٹروں نے بھی طوعاً و کرہاً ہی سہی لیکن مشرقی نقطۂ نظر کو قبول کر لیا۔ اس طرح ۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء تک کمپنی کی توجہ مشرقی نظام تعلیم کی سرپرستی اور ہمت افزائی پر مرکوز رہی اور اس کے تعلیمی اخراجات کا بڑا حصہ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت پاٹھ شالا پر صرف ہوتا رہا۔

کمپنی کا سیاسی حلقہ جیسے جیسے وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا وہ مشنری تنظیموں سے قطع تعلق کرتی اور غیر مذہبی پالیسی پر عمل پیرا ہوتی گئی۔ ویلور کے سپاہیوں کی بغاوت جیسے واقعات نے کمپنی کے ارباب حل و عقد کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ ہندستان میں سیاسی استحکام کے لیے انھیں تبدیلیٔ مذہب کی تمام سرگرمیوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں وہ تبدیلیٔ مذہب کی ساری کوششوں کی شدید مخالفت بن گئی اور مشنریوں کو اپنے مقبوضات سے دور رکھنے کی ہر امکانی کوشش کرنے لگی۔

کمپنی کی اس پالیسی سے پادری آگ بگولا ہو گئے اور انھوں نے پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اب وہ اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح انھیں مسیحیت کی تعلیم و تبلیغ کا قانونی حق حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر تجدید کے لیے پیش ہوا تو پارلیمنٹ کے ایک رکن ولبر فورس (WILBER FORCE) نے جو مسیحیت کے جذبے سے سرشار تھا، کہا کہ "برطانوی لیجس لیچر (مجلس قانون ساز) کا یہ فرض عین ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے برطانوی مقبوضات کے تمام باشندوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے ایسے اقدام کرے جن سے ان لوگوں میں مفید علوم و فنون کی بہ تدریج اشاعت ہو اور ان کی مذہبی اور اخلاقی ترقی کا سبب بنیں۔"[۱۶]

اپنی اس تجویز کو قانونی سہارا دینے کے لیے اس نے چارٹر میں حسب ذیل دفعہ کے اضافے کی کوشش کی۔

"کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز اس کے مجاز ہوں گے کہ وہ ایسے ہوشیار افراد کو منتخب کرکے مختلف مقامات پر بھیجیں جو مذہبی اور مشنری کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دے سکیں اور مذکورہ بالا مقاصد کے حصول میں معاون ہوں۔"[۱۷]

ڈائرکٹروں کی مخالفت کی وجہ سے ولبر فورس کی یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ ڈائرکٹر اب یہ سمجھ گئے تھے کہ مشنریوں اور ہندستانی عوام کے درمیان وقتاً فوقتاً جو تنازعے رونما ہوتے رہتے ہیں اس کی وجہ یہی مذہبی جوش اور تبلیغ و اشاعت ہے۔ چنانچہ ولبر فورس کا جواب دیتے ہوئے کورٹ نے کہا تھا کہ:

"دوسرے تمام لوگوں کی طرح ہندوؤں کے پاس بھی ایمان اور اخلاق کا ایک بڑا اچھا نظام موجود ہے۔ ان کو تبدیلیٔ مذہب کی تلقین کرنا، یا اس تعلیم کے علاوہ جو ان کے پاس ہے کسی اور چیز کی تعلیم دینا محض دیوانگی ہوگی۔"[۱۸]

اس فیصلے سے مشنریوں کے عزائم کو زبردست دھکا پہنچا اور وہ چراغ پا ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تنظیموں کو آزادی دلانے

اور کمپنی کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر احتجاج شروع کر دیا، جس کی رہبری آگے چل کر چارلس گرانٹ نے کی۔

چارلس گرانٹ نے ایک کتابچہ "آبزرویشنز" (OBSERVATIONS) کے نام سے لکھا۔ اس کتاب میں اس نے ہندستانیوں کو تبلیغ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تجویز پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقصد کے حصول کی پہلی منزل یہ ہے کہ یہاں انگریزی تعلیم کا رواج عام ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب ہندستانی انگریزی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی وساطت سے انھیں عیسائیت کے مطالعے کا موقع بھی ملے گا اور وہ اسے آسانی سے قبول کرلیں گے۔ اس نے انگریزی کی تعلیم و ترویج کے لیے یہ تجویز رکھی کہ:

(الف) کمپنی کا سارا کام انگریزی زبان میں ہونا چاہیے

اور

(ب) ہندستانی مدرسوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کر دیا جائے۔ ؎

چارلس گرانٹ کی یہ کتاب ۱۷۹۷ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بہت سے نسخے مفت تقسیم کیے گئے۔ مشنریوں نے اسے اپنے احتجاج کی بنیاد بنایا۔ مختصر یہ کہ برطانوی عوام کو موافق بنانے اور پارلیمنٹ کو ہندستانیوں کی تعلیم کا احساس دلانے میں گرانٹ کے اس کتابچے نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس زمانے تک کمپنی کے ایسے قدیم اور اعلا ملازمین پر مشتمل ایک جماعت معرض وجود میں آگئی تھی، جنھوں نے دوران قیام ہندستان کی مشرقی زبانوں خصوصاً عربی، فارسی اور سنسکرت میں بڑی حد تک استعداد حاصل کرلی تھی۔ اس جماعت کو ہم "مشرقی جماعت" کہہ سکتے ہیں۔ اس جماعت کی تجویز تھی کہ مشرقی زبانوں کے قدیم علمی و ادبی ذخیرے کو طبع کرا کے محفوظ کر دینا چاہیے اور آئندہ ہندستانی کالجوں اور مدرسوں میں ان زبانوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج کی حیثیت سمندر میں قطرے سے زیادہ نہیں۔ جس زمانے میں مشنری انگلینڈ میں کمپنی کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کے لیے احتجاج کر رہے تھے، اس وقت مشرقی جماعت مشرقی علوم و السنہ کے احیا اور ترویج و ترقی کے لیے سرگرم عمل تھی۔ اگر مشنری اور ان کے مؤیدین مسیحیت کی تبلیغ، انگریزی زبان کی ترویج اور اپنے عقیدے کی توسیع اور اشاعت کے لیے آسمان و زمین کے قلابے ملا رہے تھے تو مشرقی جماعت نے بھی مشرقی زبانوں کی توسیع و ترقی کے لیے ایک محاذ بنا لیا تھا اور کافی تگ و تاز کے بعد اس عہد کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ ان زبانوں کی ترقی کے لیے انھیں کچھ کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے گورنر جنرل کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ چنانچہ ان کی تحریک سے متاثر ہو کر گورنر جنرل نے ۶ مارچ ۱۸۱۱ء کو ایک سفارشی یادداشت تیار کی، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"یہ ایک عام خیال ہے کہ ہندستان میں سائنس اور ادب روبہ زوال ہے۔ میں نے اس دل چسپ موضوع پر جتنی بھی تحقیقات کیں مجھے اس خیال کا بہت واضح اظہار ملا۔ صرف یہی نہیں کہ پڑھے لکھوں کی تعداد کم ہو گئی ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے جو اب بھی علمی کاموں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، علوم کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے: مجرد علوم متروک ہو چکے ہیں، ادب لطیف نظر انداز ہوتا جا رہا ہے اور عوام کے مخصوص مذہبی نظریات سے متعلق علوم کے علاوہ علم کی تمام دوسری شاخیں بے توجہی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہو رہا ہے کہ بہت سی قابل قدر کتابیں بے مصرف ہو گئی ہیں یا سرے سے ضائع ہو چکی ہیں۔ یہ دیکھنے اور محسوس کرنے کی بات ہے کہ اگر حکومت نے مشفقانہ دست گیری نہ کی تو علم و ادب کا احیا کتابوں کے فقدان یا کتابوں کے سمجھانے والوں کی کمی کی وجہ سے ناممکن ہو جائے گا۔"

ہندستانی ادب کی اتنی زبوں حالت کیوں ہوئی؟ اس کا خاص سبب ادب کی اس ہمت افزائی کی کمی میں ملے گا، جو پہلے دیسی حکومتوں کے حکمران، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور امیر

افراد کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہمت افزائی مطالعے یا دوسری ادبی کاوشوں کیلیے زبردست محرک ہوتی ہے۔ خاص طور سے ہندستان میں جہاں علمی کام کرنے والوں کو کوئی اور معقول سہارا نہیں ملتا۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کہ ایک قوم جو اپنی سلطنت کے دوسرے حصوں میں شعر و ادب سے محبت اور اس کی کامیاب پرورش کے لیے ممتاز ہو وہ ہندوؤں کے ادب کی مشفقانہ خبر گیری اور یورپ کے علما کے سامنے اس ادب کے ذخائر کو کھولنے کے لیے امداد دینے میں ناکام ہو۔"[۸]

مشنریوں اور ان کے مؤیدین نے اس یادداشت پر بڑی تنقیدیں کیں اور انگریزی اخبارات میں اس کے خلاف مضامین لکھے گئے۔ چنانچہ "ریویو" کے ایک مقالہ نگار نے لکھا تھا کہ

"لارڈ منٹو کی یادداشت تمام تر ہندستانی علوم کا مرثیہ ہے، اس میں ہندستان کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا ہے"[۹]

مشرقی جماعت نے گورنر جنرل کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کو بھی اپنے نقطۂ نظر کا مؤید اور حامی بنا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر تجدید کے لیے پیش ہوا تو پارلیمنٹ کے ممبروں میں کافی گرماگرم بحث ہوئی۔ چونکہ ممبروں کی اکثریت مشرقی جماعت کے ساتھ تھی لہٰذا مشرقی علوم و السنہ کی ترویج و ترقی کے لیے کمپنی کے چارٹر میں دفعہ ۴۳ کا اضافہ کیا گیا، جس کی رو سے قرار پایا کہ:

"گورنر جنرل کا یہ حکم آئینی ہوگا کہ مذکورہ علاقوں میں فوجی، شہری اور تجارتی شعبوں کے اخراجات اور قرضوں کے سود کی باقاعدہ ادائیگی کے بعد کرایوں، منافعوں اور محصولوں کی بچت میں سے ہر سال ایک معتدبہ رقم (جو ایک لاکھ روپے سے کم کی نہ ہوگی) الگ نکالی جائے اور اسے ادب کے احیاء اور ترقی کی غرض سے پڑھے لکھوں کی ہمت افزائی کے لیے اور ہندستان کے برطانوی مقبوضات میں رہنے والوں کو سائنس کے علم سے متعارف کرانے اور اس کی ترویج و ترقی میں صرف کیا جائے"[۱۰]

مشنریوں کی اشک شوئی کے لیے جو پابندی ۱۷۶۵ء میں ان پر لگائی گئی تھی وہ ہٹا لی گئی۔ یعنی یہ کہ ان کو ہندستان آنے اور یہاں مدرسے چلانے کی اجازت دے دی گئی لیکن اس سلسلے میں کسی قسم کی امداد یا سرپرستی کی ذمہ داری کمپنی پر نہیں ڈالی گئی۔

جناب مالک رام کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ "کسی نے دس برس تک اس (دفعہ ۴۳) پر عمل نہیں کیا۔ آخر کار ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل باجلاس کونسل نے پہلی مرتبہ ایک قرارداد کے ذریعہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کی۔"[۱۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس پر ۱۸۱۳ء کے فوراً بعد ہی عمل شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں ہگلی میں، ۱۸۱۷ء میں راج شاہی میں، ۱۸۱۸ء میں بردوان اور بنارس میں اور ۱۸۲۰ء میں کانپور میں کمپنی کی طرف سے مشرقی تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے۔ البتہ ۱۸۲۳ء اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس سال ۱۷ جولائی کو:

GENERAL COMMITTEE OF PUBLIC INSTRUCTION

کو (مرکزی مجلس تعلیمات عامہ) کے نام سے ایک ادارہ معرض وجود میں آیا اور ایک لاکھ روپے کی منظور شدہ رقم اس کے حوالے کر دی گئی۔ علاوہ بریں مختلف مقامات پر اس کی شاخیں LOCAL COMMITTEE (مقامی مجلس) کے نام سے قائم کی۔

"مرکزی مجلس تعلیمات عامہ نے ۱۸۲۳ء کے اواخر میں ایک گشتی مراسلہ "مقامی مجلسوں" کے نام جاری کیا جس میں ان مقامات کے تعلیمی حالات دریافت کیے گئے تھے۔ نیز ان سے یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ ان مقامات میں تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے کون کون سے ذرائع و وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ [illegible] امور بطور خاص دریافت کیے گئے تھے۔"

"ان اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون کون سے مکتب یا تعلیم گاہیں ہیں، ان میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں کون کون سے مدرسے سرکاری امداد و اعانت کے مستحق معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس امداد کی کون سی صورت زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی۔ نیز کمیٹی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اگر ان مقامات میں ایسے اوقاف موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کے لیے کام آسکیں تو ان سے بھی مطلع کیا جائے۔" [۱۱]

مقامی مجلسوں نے اپنے اپنے حلقۂ کار کے مدرسوں کا جائزہ لیا اور رپورٹیں تیار کرکے "مجلس تعلیمات عامہ" کو ارسال کیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان مقامات میں سے بعض جگہوں پر پہلے ہی سے مشرقی علوم کے مدرسے موجود تھے۔ لیکن چونکہ وہ مخیر حضرات جن کی داد و دہش اور امداد و تعاون سے یہ مدرسے چلتے تھے، اب انقلاب زمانہ کے ہاتھوں خود نانِ شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے اس لیے ان کی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی طلبا کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ بہت سے ایسے مدارس بھی تھے جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اس کا اندازہ دلی کے مدرسوں سے متعلق مندرجہ ذیل رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"وہاں بہت سے خانگی مدارس موجود ہیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں دستور ہے یہ کار خیر سمجھ کر قائم کیے گئے تھے۔ ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے.... آبادی کے مقابلے میں طالب علموں کی تعداد بہت ہی کم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کچھ نہیں ہے...... عام طور پر بے قاعدہ سے اور جو تعلیم کہ ان مدرسوں میں دی جاتی ہے اس سے بہت ہی کم فائدہ پہنچتا ہے۔" [۱۲]

اسی رپورٹ میں خاص طور سے مدرسۂ غازی الدین کا ذکر کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ۱۸۲۴ء میں اس مدرسے میں صرف نو طالب علم تھے۔ جنھیں صرف ایک مدرس مولوی عبداللہ تعلیم دیتے تھے۔ [۱۳]

بہرحال جیسے جیسے مقامی مجلسوں کی رپورٹیں موصول ہوتی گئیں، ویسے ویسے ان کے مشوروں کے مطابق ان مقامات کے مدرسوں یا پاٹھ شالاؤں کی مدد کی گئی یا وہاں از سر نو مشرقی علوم کے ادارے قائم کیے گئے۔ چنانچہ تین چار سال کے اندر ہندوستان کے تقریباً تمام کلیدی مقامات پر مشرقی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ ان مدرسوں میں عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے علاوہ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ مدرسے مختلف نوعیت کے ہوتے تھے۔ بعض عربی و فارسی اور اسلامی فقہ کے لیے مشہور تھے، جیسے کلکتہ کا مدرسہ عالیہ اور بعض میں سنسکرت اور دھرم شاستر کی تعلیم خاص طور پر دی جاتی تھی، جیسے بنارس کا سنسکرت کالج اور کلکتہ کا ہندو کالج۔ بعد میں ان میں سے بعض درس گاہوں میں انگریزی تعلیم کے شعبوں کا اضافہ کر کے مغربی علوم و فنون کی تدریس کی سہولت بھی فراہم کر دی گئی۔

مرکزی مجلس تعلیمات عامہ کے سکریٹری جے۔ آر۔ کالون نے ۱۸۳۱ء میں ایک رپورٹ تیار کی تھی، جو سطور ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ جس سے اس وقت مجلس تعلیمات عامہ کے زیر انتظام اداروں کی تعداد، طلبہ کی تعداد اور ان پر صرف کی جانے والی رقموں کا پتہ چلتا ہے:

نام ادارہ	سال قیام	تعداد طلبا	اوسط ماہانہ اخراجات (روپیوں میں)	کیفیت
کلکتہ سنسکرت کالج	۱۸۲۴ء	۱۲۲	۱۳۵۸	
بنارس سنسکرت کالج	۱۷۹۱ء	۱۷۸	۱۲۶۳	
مدرسہ عالیہ کلکتہ	۱۷۸۱ء	۱۲۵	۱۹۵۰	
دلی کالج	۱۸۲۵ء	۲۱۱	۱۷۰۰	مغربی و مشرقی شعبے
آگرہ کالج	۱۸۲۴ء	۳۳۹	۸۳۹	انگریزی و مشرقی اور ورناکیولر شعبے

محمد محسن کالج		۳۴۹	۴۵۰۰ انگریزی و مشرقی اور
الہ آباد اسکول	۱۸۲۵ء	۱۵۷	۳۲۱۵ دینیوی شعبے
ہندو کالج کلکتہ		۴۵۱	۴۰۵۹
بنارس سمنری		۱۴۷	۵۲۷
ہگلی برانچ اسکول	۱۸۲۴ء	۲۲۷	۲۲۵
مدرسہ انگلش اسکول		۱۵۱	۶۵۰
ڈھاکہ اسکول	۱۸۲۳ء	۳۰۴	۵۳۶
میرٹھ اسکول	۱۸۲۹ء	۸۶	۴۰۵
گوہاٹی اسکول		۱۵۴	۲۷۹
چاٹ گام اسکول	۱۸۲۷ء	۸۰	۱۵۰
مدنا پورا اسکول		۷۹	۳۰۵
پٹنہ اسکول		۱۰۹	۳۸۳
بلیا اسکول		۸۰	۱۷۷
اجمیر اسکول	۱۸۲۷ء	۳۵۰	۳۷۳ مشرقی، ہندستانی
ساگر اسکول		۲۹۷	۲۶۴ اور انگریزی
خضر پور اسکول		۶۹	۲۰۰ شعبے
گورکھ پور اسکول		۵۰	۲۰۰
فرخ آباد اسکول		۵۵	۲۷۵
جبل پور اسکول		۲۴	۱۲۵
ہوشنگ آباد اسکول		۱۲۲	۲۲۰ مشرقی ہندستانی اور انگریزی شعبے)
بھاگل پور اسکول	۱۸۲۳ء	۵۲	۳۰۰
پوری اسکول		۳۳	۱۱۸
بریلی اسکول	۱۸۲۷ء	۶۰	۲۵۰
کوملّا اسکول		۸۸	۳۰۰
اعظم گڑھ اسکول		۴۱	۱۵۰
آرہ اسکول		۳۳	۱۰۰
بھاگل پور پہاڑی اسکول		۲	۲۳۹

اس مختصر مضمون میں متذکرہ بالا تمام اداروں کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال ناممکن ہے۔ اس لیے اجمالاً چند اہم اور نمائندہ اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کلکتہ مدرسہ یا مدرسہ عالیہ :- "تواریخ کلکتہ" کے مصنف محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ :-

"۱۷۸۰ء میں جب ہیسٹنگز گورنر جنرل تھا تو مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہمارے شہر میں ایک مولانا صاحب آئے ہیں جن کی نگرانی میں مسلمانوں کے لیے عربی اور فارسی کا ایک مدرسہ سرکار کی طرف سے قائم ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔"

گورنر جنرل نے اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور اگلے سال یعنی ۱۷۸۱ء میں ساٹھ ہزار روپے عمارت کے لیے منظور فرمائے۔ اور انتیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر جسے مدرسہ محال کہا جاتا تھا اس کے اخراجات کے لیے مخصوص کر دی۔ ۱۷۸۵ء میں ایک سند کے ذریعے تمام زمینیں مدرسے کے نگراں محمد معزالدین اور ان کے جانشینوں کے نام کر دی گئیں۔ مدرسہ کی عمارت بہو بازار اسٹریٹ کے جنوبی کنارے پر بیٹھک خانہ کے قریب بنائی گئی تھی۔ اس مدرسے کا بنیادی مقصد عربی، فارسی اور اسلامی فقہ کی تعلیم دینا تھا تاکہ عدلیہ کو مناسب اور لائق افسر دستیاب ہو سکیں۔

مدرسے کے نظم و نسق میں بدعنوانیوں کی وجہ سے گورنمنٹ نے ۱۷۸۸ء میں اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۷۹۱ء میں اس کا نیا دستور مرتب کیا گیا اور اس کے تحت ایک کمیٹی تشکیل دے کر اس کے انتظام کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دی گئی۔ ڈاکٹر لمسڈن (DR. LUMSDEN) نے ۱۸۱۲ء میں اس ادارے سے متعلق ایک رپورٹ تیار کی تھی، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مدرسہ بہت ہی خستہ اور خراب حالت میں ہے۔ انتظامیہ کمیٹی نے بھی ۱۸۱۸ء میں اس سے متعلق کچھ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس کے لیے ایک یورپی سکریٹری کا تقرر کیا جائے۔ چنانچہ کیپٹن ایف اروائن (F. IRVINE) کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مدرسے کے جملہ اخراجات کے لیے تیس ہزار روپے سالانہ کی

رقم مخصوص کی گئی۔

۱۸۱۲ء میں مدرسے میں کتابوں کے نقصان پر اظہار تاسف کیا گیا اور ایک مفید اور کارآمد کتب خانے کے لیے گورنمنٹ نے چھ ہزار روپے منظور کیے۔ اسی سال مدرسے کا نیا دستور بھی مرتب کیا گیا۔

۱۸۲۲ء میں کمیٹی کی طرف سے جو رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی گئی تھی، اس میں مدرسے کی بہتر کارکردگی کا ذکر کیا گیا تھا۔

۱۸۲۲ء میں کمیٹی کے سکریٹری کے عہدے پر ڈاکٹر ملٹن کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی سال انھوں نے ایک رپورٹ مرتب کر کے گورنمنٹ کو ارسال کی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"مدرسے کے مدرسین کا تعصب اس کی ترقی و فلاح و بہبود میں مانع ہے۔"

چنانچہ مدرسے کو اس ماحول سے دور رکھنے کے لیے اسے ہیٹنگز پلیس میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور وہاں مدرسے کی عمارت کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار پانچ سو سینتیس (۱۴۰۵۳۷) روپے کی رقم منظور کی گئی۔ علاوہ بریں شہر کے رؤسا نے اس نئی عمارت کی تعمیر کے لیے فراخ دلی کے ساتھ عطیات دیے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ انگریزوں اور ہندوؤں نے بھی اس کار خیر میں دل کھول کر اعانت کی تھی۔ ایک روایت کے بموجب شوبھا بازار کے راجہ خاندان کے ایک فرد مہاراجہ نبو کرشن بہادر نے جو فارسی کے زبردست عالم اور لارڈ کلائیو کے فارسی مشیر اور دفتر فارسی کے صدر تھے، تین لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا تھا جب یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مدرسہ اس میں منتقل کر دیا گیا۔

مشرقی علوم و فنون کے علاوہ انگریزی تعلیم کے لیے ایک علاحدہ شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ ۱۸۲۸ء میں جبکہ طلبا کی مجموعی تعداد محض ۴۹ تھی ۴۴ طلبا انگریزی بھی پڑھتے تھے۔

مشرقی علوم حاصل کرنے سے رغبت پیدا کرنے کی غرض سے طلبا کے لیے وظائف کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ تیجر یا سو کے بقول سو سے زیادہ طلبا کو تین تین روپے ماہانہ کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس مدرسے کے ممتاز طلبا میں مولوی اکرام علی (مصنف "اخوان الصفا") مولوی خلیل علی خاں اشک (مترجم داستان امیر حمزہ) اور مولوی حفیظ الدین (مولف خرد افروز) کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں بہت دنوں تک فورٹ ولیم کالج سے بھی وابستہ رہے۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کئی سال تک اس کے پرنسپل رہے۔

بنارس سنسکرت کالج:- ۱۷۹۱ء میں بنارس کے ریزیڈنٹ جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں ایک سنسکرت پاٹھ شالا قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسی سال اسے عملی شکل بھی دے دی۔ اس کے سالانہ اخراجات کے لیے پہلے ہی سال چودہ ہزار روپے منظور کیے گئے۔ بعد میں یہ رقم بڑھا کر بیس ہزار روپے سالانہ کر دی گئی۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوؤں کو سنسکرت اور دھرم شاستر کی تعلیم دینا تھا۔ چونکہ ہندو انگریز پروفیسروں سے تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور خود برہمن عالم انگریز کے قائم کردہ ادارے میں ملازمت کرنا باعث ننگ و عار سمجھتے تھے اس لیے لارڈ منٹو کے مشورے پر ۱۸۱۱ء میں اس کا نام بدل کر اسے سنسکرت کالج بنا دیا گیا۔ کالج کے ریکٹر کی بدکرداری اور مجلس انتظامیہ کے باہمی تصادم سے کالج کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی چنانچہ ۱۸۱۵ء میں ایک یوروپین مسٹر گیلانوس (GALANOS) کو اس کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں مسٹر ایچ ایچ۔ ولسن اور لیفٹیننٹ فیل (E. FELL) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ انھیں مجلس انتظامیہ میں شامل کر لیا جائے تاکہ وہ کالج کے تمام معاملات سے متعلق گورنمنٹ کو مفصل رپورٹ دے سکیں۔ ولسن کے مجلس انتظامیہ میں شامل کیے جانے کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ لیکن مسٹر فیل کو اسی سال کالج کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا ۱۸۲۱ء میں انھوں نے جو رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی تھی اس میں معمولی پیش رفت کا ذکر کیا گیا تھا۔ ۱۸۲۴ء میں فیل کا انتقال ہو گیا۔ اس سال کے اواخر تک کالج پر چھ لاکھ بہتر ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے اور جو رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی گئی تھی وہ تسلی بخش تھی۔

کالج کی جانب سے ہر سال کامیاب طلبا کو انعامات بھی دیے جاتے تھے لیکن کمیٹی کے باہمی تصادم سے ۱۸۲۷ء میں کوئی

انعام تقسیم نہیں کیا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں یہاں انگریزی شعبہ قائم کیا
گیا۔ یہی سنسکرت کالج بتدریج مختلف مراحل سے گزرنے
کے بعد اب سمپورنانند سنسکرت یونیورسٹی کے روپ میں جلوہ گر ہے۔
اور ہزاروں طالب علم اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

دلّی کالج:- اٹھارہویں صدی کے اواخر میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اجمیری دروازہ کے
قریب ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ کمپنی کی نئی تعلیمی پالیسی کے تحت
۱۸۲۵ء میں دلّی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے اس کا احیا کیا گیا۔
بعد میں یہی مدرسہ دلّی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسے کے
قیام کا مقصد مشرقی ادب اور مغربی علوم و افکار کی ترویج و ترقی تھا۔
اس کے پہلے عارضی پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ مسٹر جوزف ہنری ٹیلر مقرر
ہوئے جنھیں ۱۷۵ روپے ماہانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں
اس میں انگریزی شعبے کا اضافہ کیا گیا اس کے بعد اسے کشمیری
دروازہ والی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۸۲۹ء میں شاہ اودھ کے نواب اعتماد الدولہ نے ایک لاکھ ستر
ہزار روپے کی خطیر رقم بطور وقف اس شرط کے ساتھ گورنمنٹ
کے حوالے کی کہ اسے پانچ فی صد والے قرض میں لگا دیا جائے اور
اس سے جو منافع حاصل ہو دلّی کے لوگوں کی تعلیم پر خرچ کیا
جائے۔ چنانچہ اس کے منافع کو بھی کالج کے خرچ میں استعمال
کیا جانے لگا۔

۱۸۴۱ء میں ایک فرانسیسی مستشرق کو جس کا نام فیلکس
بوترو (FILIX BOUTROS) تھا، چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ
پر اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد بوترو بیمار
پڑے اور ۱۸۴۵ء میں استعفا دے کر اپنے وطن واپس چلے
گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل کے عہدے پر مامور ہوئے
بوترو اور اسپرنگر دونوں کو ہندستانی زبان و ادب سے بے حد
دل چسپی تھی۔ چنانچہ مغربی علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل
کرنے میں انھوں نے بڑی مدد کی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد یہ کالج بند کر دیا گیا۔ اس کے
سات سال بعد یکم مئی ۱۸۶۴ء کو اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔
لیکن اس کی گئی ہوئی رونق اور چہل پہل واپس نہ آسکی۔ حکام کا
رویہ بھی اس کی جانب سرد مہری کا رہا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر لائٹنر
(LIETNER) لاہور کالج کے پرنسپل بن کر آئے اور انھوں نے
رفتہ رفتہ سرکاری حلقہ میں کافی اثر و رسوخ پیدا کر لیا وہ چاہتے
تھے کہ ان کا کالج خوب چمکے۔ چنانچہ ان کے مشورے کے بموجب
حکومت نے دلی کالج کو لاہور کالج میں ضم کرنے کا حکم صادر کر
دیا۔ اس حکم کے تحت اپریل ۱۸۷۷ء میں دلّی کالج توڑ کر اس
کے تمام طلبا اور اساتذہ کو لاہور گورنمنٹ کالج بھیج دیا گیا۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں دلّی کالج کو بڑی اہمیت حاصل
ہے۔ یہاں مغربی و مشرقی علوم و فنون سے متعلق تقریباً ۱۲۸ کتابیں اردو میں
منتقل کی گئیں اور مولوی مملوک العلی نانوتوی اور مولانا امام بخش
صہبائی جیسے منتخب روزگار عالموں نے مشرقی شعبے میں اساتذہ کی حیثیت
سے خدمات انجام دیں۔ طلبا میں نذیر احمد، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد
پیارے لال آشوب، رام چندر اور مولوی کریم الدین وغیرہ کے
نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان
لوگوں کی خدمات کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔

آگرہ کالج:- یہ کالج آگرہ لوکل کمیٹی کی سفارش پر عربی
فارسی، سنسکرت اور ہندستانی زبانوں
کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے اخراجات کے لیے جن
میں مکان کا کرایہ بھی شامل تھا، گورنمنٹ نے پندرہ ہزار دو سو
چالیس روپے سالانہ منظور کیے تھے۔ اس میں پنڈت گنگا دھر کا تعاون
بھی شامل تھا۔ کالج کا افتتاح مشرقی زبانوں کی تعلیم سے ۱۸۲۵ء
میں ہوا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں مغربی نصاب تعلیم کی بنیاد پر جغرافیہ، ریاضی
اور علم نجوم کی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ دیگر درس گاہوں کی طرح
بعد میں اس کالج میں بھی انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے شعبۂ
انگریزی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۲۶ء میں یہاں طلبا کی تعداد ۱۷۰،
۱۸۲۷ء میں ۲۱۰ اور ۱۸۲۹ء میں ۲۰۳ تھی۔ اسی اثنا میں وظیفہ پانے
والے طلبا کی تعداد ۷۰ بتائی گئی ہے۔

آگرہ کالج میں مشرقی علوم و فنون کی تعلیم نہایت اعلا پیمانے پر دی جاتی تھی۔ دلّی کالج کی طرح یہاں بھی مشرقی زبانوں کے مشہور عالم درس و تدریس کی خدمت پر مامور تھے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا گورنمنٹ کے اعلا عہدوں پر فائز کیے جاتے تھے۔

الٰہ آباد اسکول:- یہ اسکول ۱۸۲۵ء میں چند سرکاری افسران کے تعاون سے معرض وجود میں آیا تھا۔ جنھوں نے شروع میں اس کے لیے تیس روپے ماہانہ چندہ جمع کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ مجلس تعلیمات عامہ نے ایک ہزار روپے کی کتابیں مرحمت فرمائیں۔ ۱۸۳۰ء میں اس کے متعلق جو رپورٹ تیار کی گئی تھی وہ نہایت تسلی بخش تھی۔ چنانچہ اسی سال سو روپے ماہانہ کی امداد منظور کی گئی۔ بعد میں یہ رقم بڑھا دی گئی۔ یہاں طلبا کی تعداد عموماً زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن تعلیمی معیار دوسرے اداروں کی بہ نسبت بلند تھا۔ ۱۸۲۶ء میں یہاں صرف ۴۸ طلبا اور ۱۸۳۰ء میں ۶۴ طلبا زیر تعلیم تھے۔ اس اسکول میں عربی و فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔

★

۱؎ PROMOTION OF LEARNING IN INDIA BY EARLY EUROPEAN SETTLERS, P.7-8,

۲؎ W. H. SHARP, SELECTION FROM EDUCATIONAL RECORDS, VOL-I, P. 3

۳؎ ایضاً ص ۳ ۴؎ A. J. RICHARD, HISTORY OF MISSIONS IN INDIA, P 149

۵؎ ایضاً ص ۱۵ ۶؎ SHARP, SELECTION FROM EDUCATIONAL RECORDS, VOL. I P. 17

۷؎ بہ حوالہ قدیم دلّی کالج۔ از مالک رام ص ۲۱ ۸؎ بہ حوالہ تاریخ تعلیم ہند، از جے۔ پی۔ نایک اور نور اللہ (اردو ایڈیشن) ص ۸۲-۸۱

۹؎ بہ حوالہ ماسٹر رام چندر۔ از صدیق الرحمان قدوائی ص ۱۴

۱۰؎ SHARP' SELECTION FROM EDUCATIONAL RECORDS. VOL. I. P. 22 ۱۱؎ قدیم دلّی کالج ص ۲۲

۱۲؎ بہ حوالہ مرحوم دہلی کالج۔ از ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص ۴-۳ ۱۳؎ ایضاً ص ۴

۱۴؎ بہ حوالہ ذوق و جستجو۔ از خواجہ احمد فاروقی ص ۲۳۷۔

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شایع کیے جاتے ہیں

(۱) مقام اشاعت: لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت: ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ: شری اشوک کمار۔ ہندوستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اترپردیش، الٰہ آباد۔

(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ: شری ٹھاکر پرشاد سنگھ۔ ہندوستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش۔ لکھنؤ۔

(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ: شری امیر احمد صدیقی۔ ہندوستانی۔ اڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات۔ لکھنؤ۔

(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔: نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں ٹھاکر پرشاد سنگھ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) ٹھاکر پرشاد سنگھ (پبلشر)

نمودِ سخن

عمر انصاری
۲۰، امین آباد پارک
لکھنؤ

خیال ذہن میں یوں کروٹیں بدلنے لگے
کہ جیسے شام ہوئی اور چراغ جلنے لگے

نگاہِ شوق جہاں جس زمیں پہ جا نکلی
ردیفیں سجنے لگیں، قافیے سنبھلنے لگے

عجب وہ خواب کا عالم، عجب سی بیداری
ہنسے جو پھول، تارے بھی آنکھ ملنے لگے

کوئی لطیف سی خوشبو کچھ اس طرح پھیلی
شراب جیسے کہیں ساغروں میں ڈھلنے لگے

وہ طرفگی کہ نہ کچھ جس کی حد نہ جس کا حساب
وہ نغمگی، جو گلوں کے بھی دل مسلنے لگے

نظر کچھ ایسے بھی آئے ہوا میں اڑتے پہاڑ
قدم زمیں پہ جو رکھ دیں، زمیں کچلنے لگے

کچھ ایسے تیر چلے جو کھنچی کمانوں سے
کچھ ایسے تیر، جو خود ترکشوں سے چلنے لگے

ہر ایک بات اُس ایک بھاگتے ہرن کی طرح
جو زخم کھا کے گرے اور پھر سنبھلنے لگے

ہر ایک لفظ، وہ اک طفلِ شیر خوار جسے
نہ لے لو گود میں جب تک وہیں مچلنے لگے

زمیں پہ آ کے گرے آسماں سے تارے کچھ
کچھ آبشار سرِ کوہ سے ابلنے لگے

ہزاروں در تھے، جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا
اک ایک در سے ہزاروں حسیں نکلنے لگے

بنے ہوئے تھے مضامیں جو راہ کے پتھر
کسی غریب کے دل کی طرح پگھلنے لگے

وہ قافلے تھے، جو خود اپنی گردِ راہ میں گم
قدم ملا کے مرے ساتھ چلنے لگے

وہ سانپ ہاتھ لگاتے بھی جن کو ڈرتا تھا
مری جناب میں آ آ کے مَن اُگلنے لگے

ہوئی نمودِ سخن اس طرح، کہیں جیسے
زمیں کو چیر کے چشمہ کوئی ابلنے لگے

فکر تونسوی

وقت کی قلّت

میں نے ایک صاحب سے کہا: "براہ کرم مجھے دو چار گالیاں دے دیجئے۔"

"انھوں نے فائل سے عینک اوپر اٹھائے بغیر کہا "سوری! میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اس خدمت کے لیے کسی اور کے پاس جائیے۔"

انھوں نے کسی اور کا ایڈریس بھی نہیں دیا اور نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ جب گالی ایسی لذیذ چیز کے لیے ان کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ تو ایڈریس ایسی بے رس شے کے لیے وہ ٹائم کیسے نکالتے۔ میں نے سوچا ان صاحب سے تو وہ آدمی بہتر تھا جس سے ایک مرتبہ میں نے پوچھا تھا۔

"جناب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میونسپل کارپوریشن کا دفتر کہاں ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ بتانے کے لیے میں پچاس پیسے چارج کروں گا۔"

میں نے اس کی ہتھیلی پر پچاس پیسے رکھ دیے اور اس نے بتایا "کہ جس جگہ آپ کھڑے ہیں وہی میونسپل کارپوریشن کا دفتر ہے۔"

میں رشوت کے خلاف ہوں۔ یہ میرا اصول ہے۔ مگر میں نے پچاس پیسے رشوت دے دی۔ گویا اپنا اصول توڑا۔ اگر اصول شکنی نہ کی جائے تو یہ زرخیز دنیا بالکل ڈل اور بنجر ہو کر رہ جائے۔ ایک تہذیب کے بجائے جب کوئی دوسری تہذیب وجود میں آتی ہے تو اسی اصول شکنی کی برکت سے وجود میں آتی ہے۔

میں نے پچاس پیسے دے کر اس آدمی کے وقت کی قیمت چکا دی۔ اگر وہ صاحب بھی مجھے بتا دیتے کہ میری ایک گالی کی قیمت پانچ روپے ہے۔ بلکہ اگر گالی فحش ہوتی تو وہ ڈیوڑھا ریٹ بھی بتا سکتے تھے۔

حالانکہ خدا ہر انسان کو ایک جیسا پیدا کرتا ہے۔ مگر خدا کا کیا ہے۔ وہ تو پیدا کرنے کے بعد "غیر جانبدار" ہو جاتا ہے۔

اور کمتر حالانکہ یہ ہے کہ اگرچہ ریل ہر ادنیٰ و اعلیٰ مسافر کو ایک ہی وقت میں منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر ہر ایک سے وقت کی الگ الگ قیمت وصول کرتی ہے۔

ریل اپنی امتیازی گالیاں کب تک ترک کرے گی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ وقت، جو ہم سب پر یوں گزر رہا ہے کہ ہمیں اس کے گزرنے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک حسینہ سے دریافت کیا۔ "تم نے کون سے لمحے اپنے عاشق سے غداری کی تھی؟"

وہ بولی۔ "مجھے یاد نہیں۔"

"کیوں یاد نہیں؟"

"کیونکہ وہ لمحہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور مجھے تو اس وقت معلوم ہوا، جب میں غداری کر چکی تھی۔"

میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ دوسری غداری کس وقت کریں گی کیونکہ اس وقت وہ لپ اسٹک لگانے میں مصروف تھی اور اگر وہ اس وقت لپ اسٹک نہ لگاتی تو لپ اسٹک کا لمحہ

اس کے ہاتھ سے نکل جاتا اور وہ اس بوسے سے محروم ہو جاتی جو لپ اسٹک کی بدولت وجود میں آنے والا تھا۔

ہر انکشن کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر آپ مقررہ ساعت پر آنسو نہیں بہا سکتے تو اس آنسو کی قیمت وصول نہیں کر سکیں گے جو آنسو کے زور پر وصول کرنا چاہتے تھے۔

ایک محفل میں ایک صاحب نے لطیفہ سنایا۔ سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ مگر ایک صاحب نے قہقہہ نہیں لگایا۔ میں نے ان سے پوچھا "آپ نے قہقہہ کیوں نہیں لگایا؟"

وہ بولے "میرے پاس ٹائم نہیں تھا۔"

"کیوں نہیں تھا؟"

"کیوں کہ میں اس لمحہ سوچ رہا تھا کہ کل میں جس ہوائی جہاز پر سفر کرنے والا ہوں اگر وہ پاش پاش ہو گیا۔ تو۔۔۔"

میں نے کہا "واقعی اگر آپ قہقہہ لگاتے تو ضرور پاش پاش ہو جاتا۔ آپ نے قہقہہ نہیں لگایا۔ کوئی ہرج نہیں۔۔۔ مگر آپ پاش پاش ہونے سے تو بچ گئے۔

اسے کہتے ہیں وقت کا صحیح استعمال۔"

قارئین کرام! اوپر میں نے جتنی باتیں کہیں وہ غیر متعلقہ تھیں۔ میں نے غیر متعلق باتیں کر کے آپ کا وقت ضائع کیا۔ مگر میں کیا کروں۔ میں باتیں کرتا گیا اور آپ ان میں کھوتے گئے۔ اور آپ کو یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ قیمتی لمحے آپ کے ہاتھ سے برابر نکلتے جا رہے ہیں۔۔۔ حالانکہ میں ان صاحب کی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا جنھوں نے مجھے گالی نہیں دی۔ کیونکہ ان کے پاس ٹائم نہیں تھا۔

وہ صاحب میرے دوست ہیں۔ انھیں میرے ساتھ اپنی دوستی پر اتنا اعتماد ہے کہ اکثر کہتے ہیں، میں تمھارے جنازے کو کندھا ضرور دوں گا اور میں دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ میرے جنازے کے وقت تک ضرور زندہ رہیں۔ کیونکہ ہر آدمی کو اپنے جنازے کے لیے سچّے غمگساروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن جب وہ پچپن برس کے پیٹے سے آگے بڑھے، تو ان کے پاس وقت کی بہت قلت رہنے لگی۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی وہ بھاگ رہے ہوتے اور جب ظاہر میں نہیں بھاگ رہے ہوتے تو ان کے باطن میں بھاگ دوڑ ہو رہی ہوتی اور میں انھیں کہا کرتا ہوں، یہ باطن کی بھاگ دوڑ تو تمھیں ہلکان کر دے گی۔

دوسرے دن میں نے انھیں ٹیلی فون کیا "یار! کل تم نے مجھے گالی نہیں دی۔ جس پر مجھے شدید صدمہ ہوا۔ تمھارا کچھ بگڑتا نہیں، ہمیں دیدار ہو جاتا۔"

بولے "یار! دراصل اس وقت میں ایک قطعہ زمین خریدنے کے پیچ و خم پر غور کر رہا تھا۔ سرکار سستے داموں فروخت کر رہی تھی۔ دو برس بعد اس کی قیمت اتنی بڑھ جاتی کہ میں اس قیمت میں اپنی بیٹی نمبر چار کی شادی کر سکتا تھا۔"

وہ اپنی بیٹی کو قطعۂ زمین سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ چند برس پہلے اپنے مارکسسٹ ہونے کا اعلان کر چکا تھا اور کہتا تھا "مارکس کی جدلیاتی مادیت میں ہی سماج کے ہر دکھ کا مداوا پوشیدہ ہے۔"

اور اب وہ قطعۂ زمین کو ہی مداوا سمجھ رہا تھا اور اسے حاصل کرنے میں اتنا مصروف تھا کہ کسی دوست کو گالی تک دینے کے لیے ایک لمحہ نہیں نکال سکتا تھا۔

جب وہ مارکسسٹ تھا تو بیٹی ایک قدر زائدہ تھی۔ لیکن اب وہ قدر محض بن گئی تھی۔ کیونکہ جوں جوں بیٹی کی عمر بڑھ رہی تھی۔ باپ کی عمر گھٹ رہی تھی۔ بیٹی والی قدر اس کے اعصاب پر تیز تیز لمحوں کی طرح گزر رہی تھی اور جب لمحے قدر زائدہ نہ رہیں تو گالی دینے کے لیے وقت کون ضائع کر سکتا ہے۔

انھوں نے پچاس برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ اس تھیوری کو مان کر کہ شاعری فنِ لطیف ہے۔ شاعری سے پہلے وہ افسانے لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا "آپ نے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیئے؟"

وہ بولے "یار! افسانے پر ٹائم زیادہ لگتا ہے اور اگر اچھا افسانہ لکھنا ہو تو اس پر تین چار گنا زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔"

"گویا آپ اچھے افسانے بھی لکھتے رہے ہیں۔ تو پھر مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ تاکہ میں ان کا مطالعہ بھی کر لیتا۔"

"اطلاع کیسے دیتا۔ اچھا افسانہ لکھنے کے بعد اطلاع دینے کا ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے اور پھر افسانہ پڑھنے اور سنانے میں قارئین اور سامعین کا وقت بھی کافی برباد ہوتا۔ اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ۔۔۔"

اور وہ واقعی سچ کہتے تھے۔ کیونکہ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ وہ ایک شام افسانہ میں اپنی کہانی سنا رہے تھے تو سامعین دو تین پیراگراف کے بعد جماہیاں لینے لگے تھے۔ وہ تو شکر کیجئے کہ افسانہ پڑھتے پڑھتے اچانک بجلی فیل ہو گئی۔ تو ایک سامع کے منہ سے بے اختیار یہ فقرہ نکل گیا۔"

"اب پڑھو افسانہ! دیکھوں کیسے پڑھتے ہو۔"

یہ فقرہ! سامع کے وقت برباد ہونے کی شہادت دے رہا تھا۔

پھر بھی میں نے کہا۔ "مگر شاعری پر بھی تو خاصا ٹائم صرف ہو جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگے۔ "اجی۔ شاعری میں بڑی آسانیاں ہیں۔ صرف ایک شعر لکھ ڈالو، لوگ جب بھی شاعر مان لیتے ہیں۔ ایک قطعہ یا رباعی لکھی تو سمجھو، شاعر اعظم ہو گئے۔ بشرطیکہ رباعی ہٹ ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں ہٹ ہونے کی شرط ذرا کڑی ہے۔ اچھا، اگر آپ نے کوئی ہٹ رباعی عرض کی ہو تو مجھے بھی ضرور سنائیے گا۔"

وہ سنانے پر رضا مند ہو گئے۔ مگر شرط یہ لگائی کہ آپ کل صبح چھ بج کر دس منٹ پر میرے غریب خانے پر تشریف لائیے (غریب خانہ چار کمروں اور ایک ہال پر مشتمل تھا) تو ایک رباعی ضرور سناؤں گا۔ کیونکہ اس کے بعد چھ بج کر ۲۵ منٹ پر میرا ہوائی جہاز بمبئی کے لیے چھوٹنے والا ہے۔ جہاں مجھے "تبا تات اد [illegible]" کے موضوع پر ایک سیمینار میں شرکت کرنی ہے۔

میں چھ بج کر دس منٹ پر ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا کیونکہ اس وقت میں ملک ڈپو کے کیو (Queue) میں کھڑا تھا۔ اور یوں ان کی رباعی سننے سے بال بال بچ گیا۔ بلکہ اس دن ڈپو ہولڈر سے میری تو تو میں میں ہو گئی اور اس نے مجھے ایک کراری گالی سنا دی۔ رباعی سن لیا گالی۔ دونوں میں وقت ایک جیسا صرف ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سیکنڈ کا فرق پڑ جاتا ہے۔

اور اس تیز رفتار [illegible] عہد میں دو چار سیکنڈ بچا لینا بھی کامیابی کی ضمانت ہے۔

میرا وہ دوست ــــ اس کا نام ایل این شرما۔ ایل۔ این گپتا ایل این۔ جین ــــ ان میں سے کوئی بھی سمجھ لیجئے۔ نام کا کیا ہے، رکھتے ماں باپ ہیں، بھگتنے بیٹے کو پڑتے ہیں۔ وہ بمبئی کے سیمینار میں اس لیے جا رہے تھے کہ ایک تو سفر خرچ اور بھتہ سیمینار کے گذمے پر تھا۔ اور دوسرے ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی فلم ساز سے ڈائیلاگ یا گیت لکھنے کا چانس بھی مل جائے گا۔ ایک وقت دو کاج ــــ ٹائم کی واضح بچت!

ایک ہفتہ بعد ان سے ملاقات ہوئی۔۔۔ میں نے پوچھا "جناب فلم سازوں نے تو آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہو گا۔"

وہ بولے۔ "ارے چھوڑ یار! میں بمبئی گیا ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہی کمبخت ٹائم کی قلت۔"

"کیا ہوائی جہاز کا ٹکٹ جعلی نکلا؟"

"نہیں پیارے! عین چھ بجے سالی صاحبہ کا ٹیلی گرام آ گیا کہ آپ اپنے سارے پروگرام کینسل کر دیجئے۔ آپ کو پرسوں کی فلائٹ سے سعودی عرب جانا ہے۔"

چونکہ ان دنوں ہندوستان کا ہر تیسرا آدمی تیل کے خلیجی ممالک جا رہا تھا۔ جہاں کی تنخواہیں اتنی زیادہ تھیں کہ مغل بادشاہوں کو بھی اتنی سالانہ آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے ایل۔ این (شرما، گپتا، جین) کی بات سے تعجب نہیں ہوا۔ مگر اپنی ناقص معلومات میں اضافہ کے لیے پوچھ لیا۔ "وہاں شاعری کے اعلا امکانات ہیں۔ یا۔۔۔۔"

"نہیں، وہاں ایک انٹرنیشنل کنسٹرکشن کمپنی میں سیلز ڈائرکٹری کا عہدہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ماہانہ تنخواہ بیس ہزار روپے بنگلہ اور کار، مال مفت میں۔"

"بلکہ رباعیاں جو آپ وہاں لکھیں گے۔"

"اجی انسان کے پاس اتنا ٹائم کہاں۔ یا شاعری کر دیا ڈائرکٹری"

"مگر آپ کے بغیر ہندوستان میں شاعری کا جنازہ اٹھ جائے گا۔ بہر کیف آپ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے تو تشریف لائیں گے ہی۔!"

"دیکھوں گا اگر ٹائم مل گیا۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔؟"

اور چھ مہینے تک پھر ایل۔ این۔ کی کوئی خبر نہیں آئی جس سے ہندوستان میں امن و سکون رہا۔

لیکن اچانک چھ مہینے بعد وہ کناٹ پلیس میں ایک بوٹ پالش کے چھوکرے کے پاس کھڑے بوٹ پالش کروا رہے تھے۔ بوٹ پالش کے ساتھ ساتھ "ایوننگ نیوز" کا مطالعہ بھی کر رہے تھے اور ہر دو سیکنڈ کے بعد جیب سے کوئی چیز نکال کر پھانک بھی لیتے۔ میرا خیال ہے کہ بھنے ہوئے چنے ہوں گے۔ ویسے پستہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سعودی عرب سے ہندوستان لوٹنے والا ہندوستانی بھنے ہوئے چنے نہیں کھاتا۔ بھنے ہوئے چنے کھانا تو خالص دیسی بھگتی ہے۔"

اور ٹائم کی بچت کرنے کے لیے کبھی کبھی ادھ ننگی ٹانگوں والی ہپی پر بھی نظر ڈال لیتے۔ جو ایک کالے کلوٹے چھوکرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر شاید چرس اور عصمت دونوں کا سودا کرنے میں مصروف تھی۔

میں ایل۔ این۔ کو دیکھ کر متحیر اور ملتفت ہو گیا۔ اس کے قریب جا کر پوچھا۔ "ہیلو ایل۔ این! واشنگٹن سے کب آئے؟"

ایک جماہی پیش کر کے مجھ سے بولے۔ "یار تم کب سے جیوتشی ہو گئے۔ تمھیں کیسے معلوم ہو گیا۔ کہ میں واشنگٹن گیا ہوا تھا؟"

"میں نے کہا۔" سعودی عرب کی نالی کا ملبہ تیل کی نالی کی طرح واشنگٹن سے ہی جڑا ہوا ہے۔ یہ ستاروں کا علم نہیں، سیاست کا علم ہے کہو! اب کیا ارادے ہیں ــــ ہندوستان میں رہو گے تو آؤ، تمھارے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر کافی کا ایک کپ ہی پی لیں۔"

"نہیں یار! مجھے پالش کروا کر سیدھا ڈسٹرکٹ کورٹ پہنچنا ہے۔ وہاں بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"کیوں؟"

"ارے چھوڑ یار! یہ عبرت ناک کہانی ہے۔ واشنگٹن میں میں نے ایک گوری میم سے شادی کر لی تھی اسے لے کر ہندوستان لوٹا تو ہندوستانی بیوی کو لال مرچیں وغیرہ لگ گئیں۔ میں نے کہا مرچوں کا ان سائنٹفک استعمال کیوں کرتی ہو۔ ماڈرن بنو! آزادی پسند کورٹ میں چل کر مجھے باہمی طلاق دیدو۔"

میں نے کہا۔" تمھارا یہ فیصلہ بڑا مہذبانہ تھا ـــ اچھا پھر؟ کیا وہ مان گئی؟"

"کہاں مانی۔ کہنے لگی۔ طلاق کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

"اس کی دلیل بھی جینین دن معلوم ہے کہ زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ کسی کے پاس طلاق یا شادی کے لیے بھی ٹائم نہیں ہے۔" لیکن مسٹر ایل۔ این! اگر تم ہندوستانی ٹیکنک استعمال کرتے اور ہندوستانی بیوی سے مطالبہ کرتے کہ مجھے ایک بوسہ دے دو۔ تو وہ اپنے پورے وجود کو تمھاری سپردگی میں دے دیتی۔ اس کے بعد تم اس سے جو مطالبہ کرتے، پتی برتا استری مان جاتی۔"

مگر ایل۔ این نے ٹھنڈی آہ بھر کر بتایا کہ میں نے یہ ہندوستانی گر بھی استعمال کر کے دیکھ لیا تو وہ بولی۔ میرے پاس بوسہ دینے کے لیے بھی ٹائم نہیں ہے۔ کیونکہ میں چاول صاف کرنے میں مصروف ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس امر پہ رضامند ہو گئی کہ تم پچاس ہزار روپیہ مجھے حق مطلقہ دے دو۔ آج گیارہ بج کر بیس منٹ پر کچہری پہنچ کر طلاق کی درخواست پر دستخط کر دوں گی۔"

وہ تیزی سے لپک کر ایک بس پر سوار ہو گیا۔ مگر چند دنوں بعد ہمارے ایک مشترکہ دوست نے بتایا کہ ایل۔ این عین وقت پر کچہری نہیں پہنچ سکا۔ اس لیے اس کی بیوی گھر لوٹ گئی۔"

میں نے پوچھا۔" تو کیا وہ پھر واشنگٹن لوٹ گیا؟"

"نہیں وہ تو نہیں گیا۔ البتہ اس کی امریکن بیوی لوٹ گئی۔ کیونکہ وہ کہنے لگی۔ کہ میں اب ہندوستان میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی۔ کیونکہ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ دو ہفتے تک اگر تم ہندوستانی بیوی کو طلاق دے کر واشنگٹن آگئے، تو ٹھیک ورنہ میں نے وہاں کے ایک بوڑھے فریڈنٹ سے عشق کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس سے شادی

(باقی ص ۳۴ پر)

فنا نظامی
چمن گنج۔ کانپور

دکھائے گی محبت خواب کتنے
اس اک دریا میں ہیں سیلاب کتنے

نئی پابندیاں ہر روز ظالم
تری محفل کے ہیں آداب کتنے

حسابِ میکدہ دے مجھ کو ساقی
ہیں کتنے تشنہ لب سیراب کتنے

خزاں نے فصلِ گل کی آڑ لے کر
اجاڑے گلشنِ شاداب کتنے

وہ دن بھی یاد ہیں جب میری خاطر
رہا کرتے تھے تم بیتاب کتنے

نہ نکلا سازِ غم سے کوئی نغمہ
شکستہ ہو گئے مضراب کتنے

لیے سینے میں ساحل کی تمنا
سفینے ہو گئے غرقاب کتنے

الٰہی ڈال دے کوئی مصیبت
میں دیکھوں ہیں مرے احباب کتنے

فناؔ دنیائے فانی پر نہ اترا
یہ ظلمت کھا گئی مہتاب کتنے

ڈاکٹر آفتاب اختر
مقابل دھرم کانٹا بہند گڑھی
شاہجہانپور

عوامی لے کا مغنی

نظیر اکبر آبادی

نظیر کی شاعری آگرہ کا کناری بازار ہے جہاں آگرہ اپنی پوری معاشرت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جو ظاہر بینی سے زیادہ دروں بینی چاہتا ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے بصارت کی نہیں بصیرت کی ضرورت ہے۔ اگر پورے آگرہ کو جو نظیر کے زمانہ میں عہد مغلیہ کی تصویر زوال تھا دیکھنا ہو تو نظیر کے ذہنی جام جم میں پرکشش انداز اور قوس قزحی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اٹھارویں صدی کے وسط یعنی نادری حملے کے آس پاس پیدا ہوا اور ۱۸۳۰ء میں رحلت کر گیا۔ ساری عمر آگرہ میں کٹی۔ گویا آگرہ اس کا شیرازہ تھا اور ساحل جمنا آب رکنا باد اس کی پوری دنیا آگرہ میں سمٹ آئی تھی اور وہ اس کل کا جز بن گیا تھا۔ یعنی دجلہ قطرہ میں سمٹ آیا تھا۔ اس کل کی نظر بازیاں اور دجلہ کی دلفریبیاں دیکھنا ہوں تو کلام نظیر سے بہتر کوئی اور آئینہ نہیں۔ اس آئینہ میں سکندرہ و سیکری کی عظمت، تاج محل کا حسن، موتی مسجد کا تقدس اور اعتماد الدولہ کی خاموش فضا کے علاوہ قلعہ کے اندر اور باہر کی دنیا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے گی۔ وہاں کے پیشہ ور، امیر، غریب، ہندو اور مسلمان سب الفاظ کی زنبیل میں قید ہوں گے لیکن سب فعال ہوں گے اور سب حرکت کرتے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظیر نے مصوری کے زیادہ عکاسی کی ہے اور اس میں یہ خیال رکھا ہے کہ تمام مرقعے آئینہ حیرت ہونے کے بجائے متحرک ہوں۔

نظیر کی پیش کردہ دنیا کا پس منظر اگر سترھویں صدی ہے تو جاگیردارانہ ماحول اپنی حدود میں ترقی پذیر نظر آئے گا اور اگر اٹھارہویں صدی کے وسط پر نگاہ ڈالیں گے تو کسی یورپی طاقت کی دخل اندازی اور استحصال سے ملک کے بعض حصوں کے حالات متغیر نظر آئیں گے۔ جہاں جاگیرداری نظام کی کمزوری اور کسی دوسرے نظام کی غیر موجودگی نے ایک انتشاری کیفیت اور افراتفری کا عالم پیدا کر رکھا تھا۔ سیاست دم توڑ چکی تھی معاشرت کا قلعہ مسمار ہو رہا تھا۔ صنعت و حرفت پر جمود طاری تھا۔ مرکزیت لامرکزیت میں بدل رہی تھی اور ہندوستان بقول احتشام حسین صرف اپنی تقدیر کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ ہندوستانی شاعر و فنکار جن کی جڑیں عوام میں پیوست تھیں وہ بھی ان تبدیلیوں سے بے خبر قدیم روایات کی بیساکھیوں پر چل رہے تھے۔ ممکن ہے اس وقت شعراء کو جاگیرداری نظام کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا احساس رہا ہو لیکن وہ اس دور کی خاص دین یعنی بد دلی کے شکار کسی نہ کسی شکل میں ضرور تھے۔ احتشام حسین کا یہ خیال کسی [illegible] درست ہے کہ نظیر جیسا شاعر بھی ان بدلتے ہوئے حالات کی [illegible]

نہ پیش کرسکا۔ جبکہ اُردو کا کوئی بھی شاعر اس سے زیادہ عوام کے قریب نہیں ہے۔

نظیر دراصل دیوانِ عام کا شاعر ہے۔ دیوانِ خاص کا نہیں۔ جس نے زوال پذیر شاہی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں دنیا قلعہ سے وسیع ہونے کے باوجود قلعہ کی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ جہاں عوام و خواص کا فرق دیوانِ عام اور دیوانِ خاص سے نمایاں تھا۔

انتظام اللہ شہابی کا بیان ہے کہ نظیر جب تاج گنج سے آگرہ آیا کرتے تھے تو راستے میں کنجڑے، کہار، کمہار اور حجام کا ماران سے نظموں کی فرمائش کرتے تھے اور وہ سب کے لیے نظمیں لکھتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ نظیر کے یہاں کبیر کے اخلاق اور خسرو کے ذہن کا ایک دلکش امتزاج ملتا ہے۔ آل احمد سرور سخن فہمی کا حق ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نظیر بازار کے لوگوں کی فرمائش اس لیے پوری کرتے تھے کہ وہ بازار کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان کے مشاغل، ان کی مزدوریاں اور ان کی مجبوریوں سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔

حقیقت نگاری کا تمغہ حاصل کرنے کے باوجود نظیر کی شاعری زندگی کی بے ثباتی اور موت کے پیغام سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی نگاہ خارجی حقائق پر بھی ہے اور تبدیلیوں پر بھی لیکن اسباب و علل اور نتائج و مضمرات پر نہیں ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ وہ جاگیردارانہ عہد کا شاعر ہے اور اس دور میں ادیب یا تو دربار میں رقص کرتا تھا یا پسپا و مضمحل انفرادیت کے قید خانہ میں گھرا ہوا تھا۔ مگر نظیر ان دونوں باتوں سے محفوظ رہے۔ انھوں نے زندگی کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اجتماعیت کے ساگر میں شناوری کی تھی اور آزادی کے آکاش کی طرف پرواز کی تھی۔

نظیر اگرچہ اپنے زمانہ سے جُدا تھے پھر بھی وہ عصری اثرات سے دامن بچا نہ سکے۔ ان کے اپنے عہد نے ان کی شخصیت و فن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ اثر خاص طور سے ان کی شاعری کے تضاد کی شکل میں نمایاں ہوا تھا لیکن اس کی ذمہ داری نظیر کی نہیں اس سماج کی ہے جو خود تضاد کا شکار تھا اور نظیر اسی کے پروردہ تھے۔

نظیر نے عوام کو اپنا موضوع بنا کر عوام کی دھڑکنوں کو اپنی شاعری میں سمو لیا اور ایک نئے انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ تذکرہ نگاروں نے خواہ نظیر کو مانا ہو یا نہ مانا ہو انھوں نے عوام کو اپنا لیا اور اپنے تاثرات کچھ اس انداز میں بتایا کہ خود عوام ان کی شاعری سے روحانی اور ذہنی مسرت حاصل کرنے لگے۔

احتشام صاحب کا خیال ہے کہ نظیر نے دربار سے علاحدہ رہ کر عوام سے رشتہ جوڑا۔ اس لیے نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے۔ انھیں میں سے اٹھے اور انھیں کے دکھ درد، ہنسی خوشی، افکار و تاثرات میں شریک رہے۔ نظیر نے عوام کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ہر حال میں ان کی نظر اتنی وسیع رہی کہ اس میں ہندو مسلمان، امیر غریب، فقیر اور پیشہ ور سب سما سکتے ہیں۔ انھوں نے احساسات اور جذبات کے لحاظ سے تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں کے تجربات اور تاثرات پیش کیے لیکن ان کی ہمدردیاں عوام کے ہی ساتھ تھیں۔

نظیر کے یہاں عوام سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو خواہ پیشہ ور ہوں یا کوئی اور، بہر حال ان کی شاعری کا اصل موضوع عام لوگوں کے محسوسات اور تجربات ہی ہیں۔ اس لیے احتشام صاحب نے نظیر کی شاعری کے بارے میں یہ صد فی صد درست رائے قائم کی ہے کہ انھیں نہ تو دورِ جدید کا علمبردار کہا جا سکتا ہے اور نہ پرولتاری شاعر ہی۔ بلکہ انھیں دربار کی گھٹی ہوئی فضا سے دور رہ کر ہوا میں سانس لینے والا اور بندھے ٹکے موضوعات کی زنجیر توڑ کر زندگی کی وسیع ترین فضا میں پرواز کرنے والا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظیر نے اردو شاعری کو اس کے ذہنی حصار سے نکال کر کھلی فضا سے ہمکنار کیا اور وہ فضا خالص ہندوستانی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نظیر اردو کے پہلے نظم نگار ہیں جن کے موضوعات میں ہندوستانی عوام کے دل کی دھڑکن

شامل ہے۔ کسی نقاد کا یہ قول درست ہے کہ نظیر کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ اردو شاعری کو محلوں کے کنگوروں سے اتار کر جھونپڑی کے آنگن میں لے آئے اور ایسی شاہراہ کی تعمیر کی جس پر آگے چل کر عوامی شاعری کی منزل صاف اور روشن ہوئی اور ترقی پسند شعرا کی عوامی لے کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔

نظیر زندگی سے بخوبی واقف تھے۔ زندگی اُن کی شاعری میں ایک ایسی رقاصہ ہے۔ جسے زمانہ کے سرد و گرم اور نشیب و فراز نے کانچ کے ٹکڑوں پر رقص کروا کے اس کے پیروں کو لہو لہان کر دیا ہو۔ لہو کی انھیں چھینٹوں سے کلام نظیر گلنار ہے۔ ان کے شہر آشوب، خونفشانی کرواتے ہیں۔ ان کے مژگاں پر سرخ ستاروں کا چراغاں ہوتا ہے۔

اختر اورینوی کا خیال ہے کہ وہ شیش محل یا اپنے من مندر میں زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں۔ وہ دکھ سکھ میں سب کے ساتھ ہے۔ اس کے کلام کے جام حیات کی تہ میں غم انجام کی تلخی کا احساس ہے۔ لیکن وہ اُسے من کی موج، بے صبری اور بے خودی کی ترنگ میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ اس کی شاعری اس عہد کی منفی شاعری کے ریگستان میں ایک شاداب نخلستان ہے۔ اس کی شاعری میں غیر معمولی طور پر زندگی اور زندگی کی امنگوں کی روشنی نظر آتی ہے یہ روشنی نظیر کو عوام کی محبت سے ملی تھی۔ اس لیے خواص نظیر سے خفا تھے کیونکہ اس کے یہاں بازاری رنگ آ گیا تھا۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ اس کے بہت سے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں۔ اس لیے اس کو اچھے شعرا کی صف میں شمار نہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنی کتاب نظیر اکبرآبادی ان کا عہد اور شاعری کی ابتدا میں غالباً شیفتہ جیسے نقادوں سے متاثر ہو کر ہی یہ تحریر کیا ہے کہ بعض لوگ انھیں اوباش، آوارہ، اور بد اطوار اور ان کے کلام کو عامیانہ، مبتذل، فحش اور رکیک سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نظیر کو صف اوّل کے شعرا کی صف میں رکھنے میں تامل کرتے ہیں۔ میرے خیال میں شیفتہ کی اس رائے سے نظیر کے مرتبہ و مقام پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ البتہ اس عہد کے ناپختہ

خود ساختہ اور مصنوعی معیارِ نقد کی قلعی ضرور کھل جاتی ہے۔

آل احمد سرور نے اپنی کتاب ادب اور نظریہ میں شیفتہ و آزاد جیسے نقادوں کے برخلاف نظیر کی مدافعت میں بازاری رنگ کی وضاحت کچھ انداز میں کی ہے جس کے زیر اثر نقادوں اور شعرا کی باتوں کو اگلے وقتوں کا سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ سرور صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یہ بازاری رنگ کیا ہے اور شریف لوگ اس سے کیوں بھڑکتے ہیں۔ بازاری رنگ سے مراد عریانی یا فحاشی نہیں ہے۔ اس سے شائستگی، سنجیدگی، متانت اور آرائش کی کمی مراد ہے جو اس زمانہ میں تہذیب کی پہچان سمجھی جاتی تھی۔ مجمع، بھیڑ، عرس، تیوہار عوام کی نفسیات کو بہتر طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ عوام تیز رنگ کے شوخ کپڑوں، بلند آوازوں اور بھاری بھرکم شخصیتوں کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ نفاست، نزاکت، اشارے کنائے کے حسن تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ دل لگی، ناچ، رنگ، کھیل، کود، باجے اور تماشے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ تبسم زیر لب کے قائل نہیں۔ اس لیے جب انھیں کوئی بات اچھی لگتی ہے تو قہقہے لگاتے ہیں اور مصیبت پڑے تو رونے لگتے ہیں۔ وہ جنسی شائستگی کے قائل نہیں۔ کوئی اچھی صورت سامنے آئے تو اس کے حسن کو تشبیہ کے پردے میں آراستہ کرنے کی فکر میں نہیں لگ جاتے وہ ہر عروسِ جمیل کے لیے آل احمد سرور کے مطابق لباس حریر نہیں ڈھونڈتے۔ وہ نعرے لگاتے ہیں۔ رقص کرتے ہیں۔ ہنس بول کر زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی طنز میں زہر بھی نہیں ہوتا۔ ان کی ہنسی بھدی ہوتی ہے لیکن مریض نہیں۔ وہ صحت مند ہوتی ہے۔ کسی کا بُرا نہیں چاہتی۔ وہ اپنے احساس کمتری کو نہیں چھپاتی۔

عوام زندگی اور مسرت، قوت اور امید کا بہت بڑا چشمہ ہیں جب تہذیب و تمدن اپنی بد نظمی کی وجہ سے خطرناک اور مہلک ہو جاتے ہیں تو زندگی اپنی نشاط اور احیاء کے لیے عوام کی طرف نظر کرتی ہے۔ دراصل نظیر نے بھی عوام کے سورج سے اپنی زندگی بدوش

شاعری کا دیا روشن کیا ہے۔

نظیر کے عوام کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ جنھیں اس وقت تک اور نظیر کے بہت دنوں بعد تک شعر و ادب کے ایوان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر نظیر کی انسان دوست شاعری نے انھیں بھی اس صف میں بٹھا دیا جس میں بادشاہ، وزیر، امراء اور بزرگانِ دین بٹھائے جاتے تھے۔ احتشام حسین صاحب نظیر کی انھیں خوبیوں کو پیش نظر نظر رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نظیر کے ہاتھوں اردو شاعری کے محل میں ایک چور دروازہ بن گیا جس سے مقررہ موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی داخل ہو سکتے تھے۔ نظیر نے عوام کی زندگی کو اس کی سادگی اور خامیوں کے ساتھ پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں عوام کی شوخ و شنگ، چلبلی اور دیوانی زندگی ملتی ہے۔ مگر وہ اس زندگی کے ناچ میں بھی اس ناچ کے اختتام کو نہیں بھولتے۔ درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

پہنا کسی نے خوب لباس عطر کا بھرا
یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا
آخر کو جب اجل کی چلی آن کر ہوا
پولے کے جھونپڑے کو کوئی چھوڑ کر چلا
باغ و مکان، محل، کوئی بنوا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مر گیا

کیا ہندو اور مسلماں، کیا رند و گبر و کافر
نقاش کیا مصور، کیا خوش نویس شاعر
جتنے نظیر یاں ہیں اک دم کے ہیں مسافر
رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا

جہاں ہے جب تلک یاں سیکڑوں شادی و غم ہوں گے
ہزاروں عاشق جانباز اور لاکھوں صنم ہوں گے
بہار و بوس اور عیش و طرب بھی دم بدم ہوں گے
مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہوں گے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

سچ ہے کہ نظیر کے عوام کا دور بہتر زندگی پانے کا دور نہ تھا۔ کھونے الجھنے اور غم کھانے کا دور تھا۔ جھنجھلانے اور گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کا دور تھا۔ نظیر کا شہر آشوب اس دور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ جب ایک دفعہ آگرہ میں بے روزگاری کی وبا پھیل گئی تھی۔ سارے شہر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ لوگ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور اپنی تقدیر کی بے وفائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب آگرہ میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار، تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

ہے کون سادہ دل جسے فرسودگی نہیں
وہ گھر نہیں کہ روزی کی نابودگی نہیں
ہرگز کسی کے حال میں بہبودگی نہیں
اب آگرے میں نام کو آسودگی نہیں
کوڑی کی آ کے ایسی ہوئی راہ گم دریچ

نظیر نے ایسے پُر آشوب دور کے دردناک مرقعے کھینچ کے آئینے

ابھارے ہیں۔ انھوں نے اپنے شہر آشوب میں نا اہل حاکموں کی بدولت پھیلی ہوئی تباہ حالی کا زبردست ماتم کیا ہے۔ یہ نظم، آل احمد سرور کے مطابق اکبر آباد کی روح کی پکار ہے۔ یہ پکار محلوں اور کوٹھیوں کی نہیں۔ بلکہ دوکانداروں، فقیروں، کاریگروں، معموتوں اور شاعروں کی پکار ہے۔

نظیر نے یہ شہر آشوب آگرہ سے اپنے قلبی تعلق کی بنا پر تحریر کیا تھا۔ درج ذیل بند اس کا واضح ثبوت ہے۔ سہ

عاشق کہو اسیر کہو آگرہ کا ہے
مُلا کہو دبیر کہو آگرہ کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرہ کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرہ کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چاربند

نظیر بظاہر مست مولا نظر آتے ہیں لیکن سینے میں حالی کی طرح دل دردمند رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ حالی کو دلی عزیز تھی اور نظیر کو آگرہ۔ دونوں ہی مغلیہ تہذیب کے گرویدہ تھے۔ اس لیے جب حالی نے دلی اجڑتے دیکھی تو اسے مرحوم جان کر اپنے سینہ پر پتھر رکھ لیا اور اس کی کہانی سننے سے ہی گریزاں ہو گئے۔ لیکن نظیر اپنے آگرہ کی خلق کے کاروبار بند ہونے پر ایسا جگر تفتہ اور سوختہ جاں ہوے کہ ان کی فکر سخن کا پہلو دریا ہی تھم گیا لیکن حیرت یہ ہے کہ نظیر جیسا لاابالی، درویش صفت اور مست مولا شخص اپنے عہد کی سماجی اور معاشی حالت کی ناگفتہ بہ صورت حال سے اثر پذیری میں اتنا نستعلیق کیسے ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے کہ جس نے زندگی کو اتنے قریب اور ایسے ارتکاز سے دیکھا ہو کہ وہ اپنی تمام فتنہ سامانیوں اور حشر زائیوں کے ساتھ اس کے ذہن و دل سے اتری ہوئی اس کی شاعری میں سمٹ آئی ہو وہ حالات سے اتنا متاثر ہو جائے کہ موت اس کا آئیڈیل بن جائے۔ وہ ہستی کے قریب ہیں آئے ہوے لوگوں کے سامنے زندگی کی اصل حقیقت کچھ اس انداز میں رکھے کہ لوگ اس سے رغبت ہی کھو بیٹھیں۔ بنجارہ نامہ کل نفس ذائقۃ الموت، انجام اور موت سے دلوں پر کچھ اسی طرح کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس کی شاہد ہیں۔ سہ

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مرگیا
دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مرگیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مرگیا
بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مرگیا
دکھ پا کے مرگیا کوئی سکھ پا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

وہ شخص تھے جو سات ولایت کے بادشاہ
حشمت میں جن کی عرش سے اونچی تھی بارگاہ
مرتے ہی اُن کے تن ہوے گلیوں کی خاک راہ
اب ان کے حال کی بھی یہی بات ہے گواہ
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو
خیرات کرو احسان کرو یا پن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ یا خاصہ حلوا مان کرو
کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا کچھ دھیان کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

حقیقت یہ ہے کہ جب حالات موت کے تصور کو ذہن و دل پر حاوی کر دیں تو انسان کی دنیاوی و مادی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر انسانیت کے دھاگے میں بندھ کر ایک ہو جاتا ہے۔ معاشی قدریں سب کو برابر کر دیتی ہیں اور فرشتۂ اجل کی نظروں میں انسان انسان میں فرق نہیں رہتا۔ نظیر نے ان خیالات کو بار بار دہرایا ہے۔ انسانی مساوات کا اظہار سب سے بہتر طور پر ان کی مشہور نظم آدمی نامہ میں ہوا ہے۔ اس نظم کی سادگی، زور اور خلوص کا جواب شاید ہی اُردو اور ہندی میں ملے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کی انسان دوستی اور عوام پرستی ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے ان کی شاعری صداقت کی بھٹی میں تپ کر کندن بنی ہے۔ نظیر نے سادگی، صداقت اور حق گوئی کا راز پالیا تھا۔ مصنوعی تہذیب اور سماجی نابرابری اور بلندی و پستی کے غار میں پوشیدہ انسانیت فہمی کے خزانے تک ان کی رسائی مساوات کے "کھل جا سم سم" سے ہوگئی تھی۔

مجنوں گورکھپوری نظیر کی اس خوبی پر زور دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی رفاقت سے ہمارے اندر تقویت پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن تقریظ و تنقیص کے بین بین تنقیدی کسوٹی پر نظیر کو پرکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں اپنی موضوعاتی وحدت اور وسعت کے باوجود احساسِ تعمیر اور خیال و تاثر کی منزل بہ منزل تشکیل اور اندازِ اظہار سے بھی خالی ہیں پھر بھی وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ نظیر کی نظمیں موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ایسی ہیں کہ انھیں دورِ قدیم کا سب سے بڑا نظم گو قرار دینا مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ دورِ جدید میں بھی اقبال اور چند دیگر مستثنیات کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ان کا مقابل نکلے۔

وقار ناصری
شیش محل حسین آباد
لکھنؤ ۳

غزل

گھر گھر پھیلی ایسی رات
سوجھ نہ پاے ہات کو ہات

جنگل جنگل چاند کا نور
بستی بستی کالی رات

شہر میں سایہ کون کرے
سر پر اپنے ڈال نہ پات

دن کو سورج 'دھوپ' پہاڑ
خواب سنہرے ساری رات

کس کا دامن کون ڈھلاے
خون میں لتھڑے سب کے ہات

مدمقابل لاکھوں ہیں
ایک اکیلی اپنی ذات

غزلیں

صلاح الدین نیّر
۳۳۴-۶-۲۰ ، بازار روپ لال
حیدر آباد ۲

تاخیر سہی، رسم نبھانے کے لیے آ
آ اے دوست مرے گھر کو بسانے کے لیے آ

دب جاؤں نہ پھر بوجھ سے میں اپنی انا کے
روٹھا ہوں بہت دن سے منانے کے لیے آ

جس موڑ پہ میں پہلے پہل چھوٹ گیا تھا
اس موڑ پہ پھر چھوڑ کے جانے کے لیے آ

مے خانے تلک جانے کی ہمت نہیں ہوتی
پیاسا ہوں تو احساس دلانے کے لیے آ

ناکردہ گناہوں کی سزا دے مرے ماضی
بھولا ہوں تجھے یاد دلانے کے لیے آ

خوابوں میں بکھر جائے نہ یہ روشنی شب کی
سوئی ہوئی پلکوں کو جگانے کے لیے آ

آ اے رسم جنوں توڑ دے برسوں کی روایت
قاتل کو مسیحا سے ملانے کے لیے آ

برسوں سے یہاں کاسہ بکف ٹھہرا ہوا ہوں
نیّر کی کبھی پیاس بجھانے کے لیے آ

کرشن بہاری نورؔ
۶۰- غوث نگر لکھنؤ

اپنا پتہ نہ اپنی خبر چھوڑ جاؤں گا
بے سمتیوں کی گردِ سفر چھوڑ جاؤں گا

تجھ سے اگر بچھڑ بھی گیا میں تو یاد رکھ
چہرے پہ تیرے اپنی نظر چھوڑ جاؤں گا

گزرے گی رات رات مرے ہی خیال میں
تیرے لیے میں صرف سحر چھوڑ جاؤں گا

غم دوریوں کا دور نہ ہو پائے گا کبھی
وہ اپنی قربتوں کا اثر چھوڑ جاؤں گا

آنسو ملیں گے میرے نہ پھر تیرے قہقہے
سونی ہر ایک راہ گزر چھوڑ جاؤں گا

میں تجھ کو جیت کر بھی کہاں جیت پاؤں گا
لیکن محبتوں کا ہنر چھوڑ جاؤں گا

جیسے کہ شمعدان میں بجھ جائے کوئی شمع
بس یوں ہی اپنے جسم کا گھر چھوڑ جاؤں گا

سنسار میں اکیلا تجھے اگلے جنم تک
ہے چھوڑنا محال مگر چھوڑ جاؤں گا

اُس پار جا سکیں گی تو یادیں ہی جائیں گی
جو کچھ ادھر ملا ہے ادھر چھوڑ جاؤں گا

غم ہوگا سب کو اور جدا ہوگا سب کا غم
کیا جانے کتنے دیدۂ تر چھوڑ جاؤں گا

بس تم ہی پا سکو گے کریدو گے تم اگر
میں اپنی راکھ میں جو شرر چھوڑ جاؤں گا

کچھ دیر کو نگاہ ٹھہر جائے گی ضرور
افسانے میں اک ایسا کھنڈر چھوڑ جاؤں گا

کوئی خیال تک بھی نہ چھو پائے گا مجھے
یہ چاروں سمت آٹھوں پہر چھوڑ جاؤں گا

باوا کرشن گوپال مغموم
چنڈی گڑھ (مقیم حال امریکہ)

ذاکر باغ

...ن کہتا ہے کہ بلبل چھوڑ کر تو زاغ دیکھ
فتنۂ گل دیکھ، یا پھر اپنے دل کے داغ دیکھ
عالم سرسبزیٔ اشجار و باغ و راغ دیکھ
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

علم و دانش کا گلِ شاداب تھا ذاکر حسین
باغِ انسانی کی آب و تاب تھا ذاکر حسین
سچ تو یہ ہے اک گلِ نایاب تھا ذاکر حسین
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

فصلِ گل میں کیاری کیاری میں مہکتے ہیں گلاب
صبح کی کرنوں کے پڑتے ہی دمکتے ہیں گلاب
ٹہنی ٹہنی جب لرزتی ہے، لچکتے ہیں گلاب
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

یہ ہے ایسا باغ جس میں ہیں گلاب اندر گلاب
ہر روش پر خود بہار رنگی دلہن ہے بے نقاب
حسن اک اک پھول کا ہے بے نظیر و لاجواب
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

اس چمن میں کچھ نہ دیکھے گا گلابوں کے سوا
کچھ نہ پائے گا ہواؤں میں شرابوں کے سوا
کچھ نہیں اس باغ کی خلوت میں خوابوں کے سوا
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

اس گلستاں میں گلابوں کی سبھی اقسام ہیں
یہ ہے ایسا میکدہ جس میں ہزاروں جام ہیں
سیر کے دلدادگاں میں سینکڑوں گلفام ہیں
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

ہر روش ہے خوبصورت، ہر شجر ہے انتخاب
جھاڑی جھاڑی بن گئی ہے ایک پھولوں کی کتاب
صحنِ گلشن کیا ہے گویا باغِ جنت کا جواب
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

وسط میں اس باغ کے اک دلنشیں فوارہ ہے
بوندیں یوں پانی کی اڑتی ہیں کہ گویا پارہ ہے
ایک رنگ و بو کی دنیا حاصلِ نظارہ ہے
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

مختصر سا ایک چوبی پل بھی ہے اس میں بنا
سیر کرنے والے اس پر چڑھ کے کھاتے ہیں ہوا
دیکھتے ہیں منظرِ خوش رنگ گرد و پیش کا
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

ایشیا بھر میں نہیں اس باغ کی پیدا نظیر
اس کے ہر گل میں کھنچ آتا ہے جمالِ کاشمیر
سایہ کر دیتا ہے اس پر آ کے جب ابرِ مطیر
اے مسافر! چنڈی گڑھ میں آ کے ذاکر باغ دیکھ

ے ڈاکٹر ذاکر حسین روز گارڈن، چنڈی گڑھ سے مراد ہے

ڈاکٹر اسلم حنیف

علامہ ابر احسنی پر ایک نظر

علامہ ابر احسنی گنوری کا شمار ان معدودے چند اساتذہ میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب کی خدمت کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا۔

ابر صاحب کی پیدائش ان کے آبائی وطن قصبہ گنور میں ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ تقریباً ۹ برس کی عمر میں شاعری کا شوق بیدار ہوا۔ پہلے حضرت سخا شاہجہان پوری سے بعد ازاں مولانا احسن مارہروی سے فیض اصلاحِ سخن حاصل کیا۔

بقول آل احمد سرور "احسن مارہروی کی شاعری پھیکی اور بے کیف ہوتی تھی"۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے دور کے جید عالم، ماہرِ عروض و بیان ہونے کے ساتھ ساتھ لسانیات پر اچھا عبور رکھتے تھے۔ ابر صاحب نے اپنے استاد احسن مارہروی سے فن کے تمام عناصر و جواہر کو نہایت محنت سے حاصل کیا۔ حالانکہ یہ دور قدیم اردو شاعری کے لیے قنوطی دور تھا کیونکہ عالمی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نوجوان ذہنوں پر ایک خاصا اثر پڑ رہا تھا اور اس دور کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا گروہ روایت پرستی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے فنی اسالیب اور عروض و بیان کے بندھے ٹکے اصولوں کے مجسموں کو دیارِ ادب سے باہر نکال پھینکنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ مگر ابر صاحب اس تحریک سے قطعاً متاثر نہ ہوئے اور وہ اس دھارے ہی سے منسلک رہے جو شاہ حاتم اور خان آرزو سے ہوتا ہوا آتش، ذوق، داغ اور احسن سے ہوتا ہوا خود ان تک پہنچا تھا۔

جن لوگوں نے ابر صاحب کی فعال شخصیت کو قریب سے جانچا اور پرکھا ہے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ابر صاحب کے یہاں خلوص، وضع داری، صبر و تحمل، وفورِ آگہی، سلیقہ مندی، راست گوئی اور شرافت جیسے محاسن بدرجۂ اتم موجود تھے اور اس کے برخلاف چاپلوسی، تصنع، خود پسندی اور خوشامد جیسے عیوب سے ان کا دامن پاک تھا۔

اگر شخصیت سے ہٹ کر ان کو صرف دائرہ فن میں دیکھا جائے تو وہ ایک بلند پایہ شاعر، فنی باریکیوں کے رمز شناس اور ایک حقیقت پسند نقاد تھے ان کے بارے میں سحر عشق آبادی فرماتے ہیں۔

"پاکستان میں تو ان کا ہم پلہ کوئی ہے نہیں ...... جگر اور فراق گورکھ پوری کی تعریف کے پل باندھنے والے اگر انصاف کی عینک لگا کر ابر صاحب کا کلام دیکھتے تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ میری ہی ہمنوائی کرتے ?"

اور غالباً مظفر حنفی ملسوی بھی یہی کہنا چاہتے ہیں:

"مجھے تسلیم ہے کہ فراق صاحب، سرور صاحب، مجنوں صاحب اور جذبی صاحب قسم کے بزرگوں کے سامنے جلتے ہوئے ہیں۔

۔ کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوا لیکن آبر صاحب کی
کی قربت مجھے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا کرتی رہی۔"

آبر صاحب کے تلامذہ کی تعداد لگ بھگ ڈھائی ہزار تک پہنچتی ہے جس کی مثال اردو ادب میں ملنا نہایت مشکل ہے۔ اسی وجہ سے سیفی پریمی نے انھیں "استاد شاعر" کہا ہے۔ اور عنوان چشتی (تلمیذ آبر احسنی مرحوم) اسی کثرت دہبات پر اپنی تصنیف عکس و شخص میں رقم طراز ہیں کہ:

"حق تو یہ ہے کہ وہ کثیر شاگردوں کے نرغے میں گھر کر خود فراموش بن بیٹھے۔ حالانکہ یہ کثیر امت دنیا میں آبر صاحب کے کام نہ آسکی اور یقین ہے کہ محشر میں بھی نہ بخشوا سکے گی۔"

اسی کثیر امت کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے آبر صاحب رات دن اصلاح کا کام کیا کرتے تھے اور اسی فیضانِ عام کی بنا پر حضرت جوش ملسیانی نے انھیں سحابِ سخن کا خطاب عطا فرمایا جو برصغیر اور ہند و پاک کے مایہ ناز فن کار اور محسن اعظم کے لیے نہایت موزوں اور مناسب تھا۔

آبر صاحب کلاسیکی شاعری کے دلدادہ تھے مگر چند معاصرین سے ادبی اختلافات اور تلامذہ کے مسلسل ریاض نے انھیں زبان داغ اور محاورہ و بیان کا اور بھی کٹر عاشق بنا دیا تھا۔ آبر صاحب کو پہلا ادبی اختلاف علامہ نیاز فتحپوری سے ہوا جو مسلسل دو سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد حضرت سیماب اکبرآبادی کو آبر صاحب کی فنی بصیرت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یہ ایک ایسا سلسلۂ بحث تھا جس سے آبر صاحب کی شخصیت نکھر کر سامنے آئی اور دنیائے ادب کو آبر صاحب کی علمی لیاقت کا لوہا ماننا پڑا۔ آبر صاحب کی پہلی تصنیف اصلاح الاصلاح اسی اہم معرکہ کی دین ہے۔

چونکہ آبر صاحب قادرالکلام شاعر تھے اس لیے انھیں تمام شاعری کی تمام اصناف پر پورا پورا عبور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے قطعات، رباعیات، غزلیات اور نظموں وغیرہ کا سہارا لیا ہے اور ہر صنفِ سخن کو عیوب سے پاک رکھا ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام سفینے شائع ہوا جو نظموں پر مشتمل ہے جس کی تمام نظمیں مترنم اور رواں ہیں ان کے بارے میں مفتون کوٹوی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آبر صاحب غزل جس چابکدستی اور خوبصورتی سے کہتے تھے اس کے مقابلے میں نظم زیادہ جاندار نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے انھیں غزل گو شاعر تسلیم کرنا نہایت مناسب ہے اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کا مختصر جائزہ لیا جائے۔

سب سے پہلا غزلوں کا دیوان نگینے شائع ہوا جس میں روایاتِ قدیم کے مطابق صرف الفاظ کی شیشہ گری سے مفہوم پیدا کیا گیا ہے۔ مفرد الفاظ کا موزوں استعمال، فنی بصیرت اور صحتِ زبان نے اس دور کی شاعری میں اہم اضافے کیے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

رہا دستِ جنوں کا مشغلہ یہ آبر زنداں میں
بنایا اور بگاڑا خاک پہ خاکہ بیاباں کا

اک اچھوتا سا تخیل خالقِ کونین کا
بزمِ رنگ و بو میں آیا اور انساں ہو گیا

حسرتیں بالائے مرقد اہلِ حسرت زیرِ خاک
اک جہاں مدفن کے باہر اک جہاں مدفن میں ہے

برابر کر نہ ٹھوکر سے زمیں گورِ غریباں کی
ہزاروں گھر اجڑ کر یہ جہاں آباد ہوتا ہے

نگینے میں ابتدائی دور کی شاعری میں انھیں روایات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ شاعر خارجی حقیقتوں پر بھی نظر دوڑاتا ہے۔ اس طرح اس دور کی شاعری داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کا سہارا لے کر آگے بڑھی ہے۔ چنانچہ شاعر کے یہاں اس دور کی شاعری میں مسائل کو سلجھانے کی کوشش حسن و عشق کی نفسیات کی ترجمانی، حسین استعارے اور خوبصورت تشبیہات نیز فارسی کی رنگ آمیزی سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا ہے جس سے قاری کا ذہن بوجھل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہاں دل کو سرور اور آنکھوں کو نور میسر آتا ہے۔

قسمت نیے آبر صاحب کا دیوانِ ثانی ہے۔ اس میں شاعر کا ذہن

تدریجی ارتقائی منازل طے کر کے کافی بلندی تک پہنچ گیا ہے۔ اس
دور کی شاعری کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غزل کی
زمین پر رات کی رانی مہک رہی ہو۔

باطن ہے پھولوں میں اک آگ پنہاں
بظاہر بہاریں سہانی سہانی

غریبانیت سے تنگ ہیں میرے وطن کے لوگ
دینا پڑے گا جائزہ ہستی اتار کے

وہ مجبور ہے میرے تھک کے بیٹھ جانے سے
چھین لی گئیں جیسے گردشیں زمانے سے

میری ہمت کی داد دے اے دوست
جی رہا ہوں ترے زمانے میں

ترقی پسند ناقدین کا خیال ہے کہ غزل کی نشوونما کے لیے
خارجیت اور اجتماعیت ہی اہم عناصر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ داخلیت
بغیر خارجی اثرات کے عمل میں نہیں آتی۔ کیونکہ خارجی اشیاء کا
اثر ہی ادیب یا شاعر کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ جس سے شاعر کے
اندر کی دنیا میں تغیر پیدا ہوتا ہے اور وہ دروں بینی کے زیرِ اثر اپنے
خیالات کو لفظوں کا روپ عطا کرتا ہے۔ اس لیے خارجیت کو داخلیت
سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس قسم کی کوشش کی جائے تو یہ
محض ایک بے بنیاد بات ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر خارجیت اور داخلیت
کی ہم آہنگی سے حقیقتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ ابرؔ صاحب کے
یہاں حقیقت نگاری کا بہت کچھ ثبوت موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ
فرمائیے: ؎

اب سمجھ میں آگیا سب کچھ جو لٹ کر رہ گیا
اک رہرو رہزن کو میر کارواں سمجھا تھا میں

تمہاری جفاؤں کا شکوہ نہیں
ہمیں مار ڈالا ہماری وفا نے

ترے کردار کے ہے گرد جہاں سبھی اپنے سبھی پرائے ہیں

مجھ کو جلووں کی، ان کو نظر کی طلب
عشق بھی تشنہ لب، حسن بھی تشنہ لب

خوشہ ہیں۔ ابرؔ صاحب کا آخری اور تیسرا دیوان ہے۔ چونکہ یہ
دیوان ابرؔ صاحب کی غزلیہ شاعری کا آخری دیوان ہے۔ اس لیے
اس میں شاعر کے تدریجی ارتقا سے گزر کر نقطۂ عروج تک پہنچنے والے
تمام شاعرانہ محاسن و کمالات کو بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔ میرا خیال
ہے کہ اس دور کی شاعری میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک بڑے
فن کار کی عظمت کے لیے اس کی عالمانہ بصیرت کے آئینہ دار
ہوتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں شاعر نے مرکب الفاظ کی فہرست
(VOCABULARY) میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے جس میں بعض
اصطلاحات کو کلیدی حیثیت بھی دی جا سکتی ہے۔

چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

میں غرق ہو چکا ہوں تو بہلائیں کس سے دل؟
دریائے ہست و بود کے دھارے اداس ہیں

ان کے دو لب داغ کا شعر
ان کا سراپا میری غزل

تخریب کا دو دل ملنے ہی پر کیف بدل ہو جاتا ہے
تعمیر فضائے عالم میں اک تاج محل ہو جاتا ہے

اس شوق کا عالم کیا کہیے جب ان کو کبھی خط لکھتا ہوں
ہر بات رباعی بنتی ہے، ہر لفظ غزل ہو جاتا ہے

اپنی نظر میں خود ذلیل ہونا نہیں مجھے پسند
اور جو چاہے دے خدا جذبۂ کم تری نہ دے

خوشہ ہیں۔ میں اکثر غزلیں سخت بحروں میں کہی گئی ہیں جن کو
ابرؔ صاحب نے فنکارانہ چابکدستی اور مشق و مہارت کے باعث موم
بنا دیا ہے۔ ان میں بعض مقامات پر عروض سے فائدہ اٹھا کر اپنی
علمیت کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔

وہی دل فغاں سے دھواں دھواں وہی تن میں درد کی بجلیاں
یہ ہر ایک رات کا ہے سماں کوئی ایک رات کی بات ہے

پہلے ہی لوگ غرق ہیں ظلمتِ انقلاب میں
رخ پہ نقاب ڈال کر دہر کو تیرگی نہ دے

ان کی خوشی ہے تہ نظر کس نے کہا مجبور ہیں ہم

دو دل جب مل جاتے ہیں — بن جاتا ہے تاج محل

انسان دوستی، مساوات، حب الوطنی، آپ بیتی اور اپنی تہذیب کا جیتا جاگتا تصور ایسی فضا میں پہنچا دیتا ہے جہاں قاری کو نگارِ رنگا رنگ سے محظوظ ہونے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔ ابرؔ صاحب کے یہاں زبان کی سادگی، کار آزمودہ تشبیہات و تلمیحات، خوبصورت اندازِ بیان اور حسین استعاروں کا استعمال ایسے جواہر پارے ہیں جنھیں ناموسِ فن کے تحفظ اور شاعر کی ترسیل کی بے پناہ قوتوں کے جواز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہر ایک آہ یہ سینے کا داغ جلتا ہے
ہوائیں چلتی ہیں پھر بھی چراغ جلتا ہے

بایں ہمہ خوں ریزی و بربادی و تکلیف
اے ابرؔ وطن اب بھی مجھے خلد بریں ہے

کیا حقوقِ زمیں سب ادا کر دیئے
تیرے پیشِ نظر چاند تارے ہیں کیوں؟

دل کب سے ان کی زلفِ شکن در شکن میں ہے
کتنا حسین چاند مسلسل گہن میں ہے

سوزِ باطن میں بہ ظاہر نغمۂ زندگی تاج محل ہو جیسے

دونوں ہی جبرِ عشق سے مجبور ہو گئے
وہ برق بن گئے ہیں تو ہم طور ہو گئے

خزینے میں یہی بالیدگی، فکر و نظر، جمالیاتی رنگ اور طہارتِ فن کا حسین و شفاف دھارا رواں دواں نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس دور کی شاعری کو ہم ان کی بہترین شاعری کہہ سکتے ہیں۔

میری اصلاحیں:۔ ابرؔ صاحب کی دو جلدوں پر مشتمل عمدہ کتاب ہے اس کے ابتدائی اوراق پر متروکات کی طویل فہرست موجود ہے۔ ساتھ ہی شاعری کے عیوب و محاسن پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ابرؔ صاحب کے کلام کو اگر بغور پڑھا جائے تو ہمیں اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ انھوں نے فن کے تمام تر عیوب سے اپنی شاعری کا دامن پاک رکھا ہے۔

ابرؔ صاحب عمر کی اس منزل میں قدم رکھ چکے تھے جہاں فطری تقاضے اس بات کے مظہر تھے کہ وہ اب بہت دنوں تک ادبی خدمات انجام نہیں دے سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ انھیں موت کا ذائقہ بالکل غیر فطری صورت میں چکھنا پڑا یعنی ۷ر نومبر ۱۹۷۳ء کی رات کو ان کے حلقوم پر اجنبی قاتل کا خنجر بے باکی سے پھر گیا اور ایک عظیم شاعر، ادیب و فنکار کو اس دارِ فانی کو خیرباد کہنا پڑا۔

کس کس پہ مری موت کا الزام نہیں ہے
جس کا ہے یہ کام اس کا کہیں نام نہیں ہے
(خزینے)

وقت کی قلت —— صفحہ ۲۱ کا بقیہ

کر لوں گی۔ ہندستانی خاوند نہ سہی، ہالینڈ کا سہی۔"

میں نے پوچھا۔ "اب ایل۔این کہاں ہے؟"

میرے دوست نے تو اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ سبزی مارکیٹ میں ایک تھیلہ پکڑے مولیاں خرید رہا ہے مولیاں خرید کر وہ تیزی سے بھاگا۔ میں نے پیچھے سے آواز دی "ایل۔این۔ ایل این!" مگر اس نے بغیر میری طرف دیکھے جواب دیا۔ "معاف کیجئے۔ مجھے یہ مولیاں جلد سے جلد گھر پہنچانی ہیں۔ کیونکہ وہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج اس کا جنم دن ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو گالی دی ہے گویا گالی دینے کے لیے اب اس کے پاس "ٹائم" نکل آیا تھا۔

فطرت

رباعیات

ڈاکٹر اقبال ماہر
۲۳۴ - نخاس کہنہ الہ آباد ۳

دیباچۂ اسرارِ نہاں ہے فطرت
تجدیدِ جہانِ گزراں ہے فطرت
ہر ذرۂ مہر و مہ و انجم کی طرح
مستقبلِ روشن کا نشاں ہے فطرت

فطرت میں خموشی بھی ہے آواز بھی ہے
مضراب بھی ہے سوز بھی ہے ساز بھی ہے
دریائے سبک رو کی طرح محوِ خرام
شبنم کی طرح مائلِ پرواز بھی ہے

خورشیدِ درخشاں ہے جلالِ فطرت
وادی و چمن، حسن و جمالِ فطرت
ہر چیز ہے خود اپنی جگہ پر شہکار
انسان ہے اک نقشِ کمالِ فطرت

اٹھی ہے بڑے زور سے پُرشور گھٹا
سرتاپا نمی سے ہے سبز اور گھٹا
سیراب ہواؤں میں ہے خنکی کا اثر
بکھرے ہوئے گیسو ہیں کہ گھنگھور گھٹا

لکھنے کے لیے رنگِ شفق ملتا ہے
برگِ گل و لالہ کا ورق ملتا ہے
نغموں سے ہے معمور دبستانِ حیات
طائر کے ترانوں سے سبق ملتا ہے

ہر پھول ہے رعنائیٔ فطرت کی کتاب
ہر شاخ ہے صنّاعیٔ قدرت کی کتاب
یہ سلسلۂ نشو و نما ہے ہستی
ہے اہلِ خرد کے لیے حکمت کی کتاب

کاشانۂ مشرق سے ابھرتا سورج
آئینۂ فطرت میں سنورتا سورج
ظلمات کو دیتا ہوا حکمِ رخصت
دامانِ سحر نور سے بھرتا سورج

گردوں پہ ستارے ہیں سمندر میں صدف
نور ایک طرف ہے تو گہر ایک طرف
پھولوں ہی پہ موقوف نہیں حسنِ جہاں
کانٹوں کا بھی ہوتا ہے بہت کچھ مصرف

ہوتی ہے شگوفوں میں مسرت محسوس
پیڑوں کے خنک سائے میں راحت محسوس
نظارۂ فطرت سے بہلنے کے لیے
وجدان کی ہوتی ہے ضرورت محسوس

احمد میرٹھی
سپلائی سیکشن
کرشی بھون لال باغ
مالویہ مارگ لکھنؤ

شوکت عمر
قومی آواز لکھنؤ

غزلیں

اپنی ہستی کا ذرا بھی نہیں عرفاں کہ جو تھا
کیا ہوا صاحبِ ادراک وہ انساں کہ جو تھا

حوصلے پست جو طوفانِ حوادث میں ہوئے
اب وہ پہلا سا کہاں شوقِ فراواں کہ جو تھا

ہے رواں آج بھی گو لاکھ تغیّر آئے
جانبِ کوئے ملامت دلِ ناداں کہ جو تھا

جگمگاتا ہوا دنیائے تصوّر میں مری
کیا ہوا جانے وہ اک شہرِ نگاراں کہ جو تھا

یوں تو چلنے کو چلی بادِ خزاں بھی لیکن
ہے شگفتہ تری یادوں کا گلستاں کہ جو تھا

بحرِ ظلمات میں ہر سمت تلاطم ہے بہت
آج بھی ہے وہی اندیشۂ طوفاں کہ جو تھا

وہ گیا چھوڑ کے بستی کو خدا جانے کدھر
ایک دیوانہ یہاں خاک بداماں کہ جو تھا

ہم نے بے خوف سرِ بزم جو حق بات کہی
وا ہوا اپنے لیے پھر وہی زنداں کہ جو تھا

کوئی تعبیر سمجھ میں نہیں آتی احمد
اپنے خوابوں کا اک عالم ہے درخشاں کہ جو تھا

ہر مرحلۂ زیست کو دشوار تو کرلیں
اک رات بسر اور سرِ دار تو کرلیں

بہتے ہوئے لمحات سے کہہ دو کہ ٹھہر جائیں
ہم اہلِ جنوں ذکرِ رخِ یار تو کرلیں

ہاں تیز کرو اور ابھی ساز کی لَے کو
خوابیدہ تمناؤں کو بیدار تو کرلیں

اس غم کی کڑی دھوپ میں اے کاہشِ دوراں
آرام تہہِ گیسوئے خم دار تو کرلیں

سونا ہے تو سو جائیں گے آغوشِ سناں میں
ہم نقشۂ دوراں پہ کوئی وار تو کرلیں

کل قافلہ گزرے گا اسی راہ گزر سے
شوکت ذرا آؤ اسے ہموار تو کرلیں

پرشوتم سنگھ سیٹھی
۷۰۔ آفیسرز ہوسٹل۔ بہادر جی مارگ لکھنؤ

اتر پردیش کی
ایک عجیب و غریب جیل

جیل، اس میں شادی اور وہ بھی ایک عمر قیدی کی۔

یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ شادی کسی غیر ملکی جیل میں نہیں بلکہ ہندستان کی ایک جیل میں ہوئی جو ضلع نینی تال میں اتر پردیش کی ترائی میں واقع ہے اور جو ستار گنج کھلی جیل کے نام سے مشہور ہے۔

ضلع بریلی کے رہنے والے نرائن کو قتل کے ایک مقدمہ میں عمر قید کی سزا آٹھ سال قبل عدالت سے ہوئی۔ نرائن پچھلے چھ برسوں سے ستار گنج جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ نرائن کی شادی اسی جیل میں ہوئی۔

جیلوں میں قیدیوں کی اصلاحات کے ایک منصوبے کے ذریعہ ستار گنج جیل ۵۹۶۵ ایکڑ کے ایک بڑے فارم پر قائم کیا گیا۔ اس میں یو پی کی مختلف جیلوں سے چن کر قیدیوں کو بھیجا جاتا ہے جو فارم پر کام کرتے ہیں اور بغیر دیواروں کی جیل میں رہتے ہیں۔ ان قیدیوں کو سات روپے پچاس پیسے یومیہ مزدوری دی جاتی ہے جبکہ ان سے دو روپے چالیس پیسے کھانے وغیرہ کے لیے جاتے ہیں۔

جن قیدیوں کو کام نہیں مل پاتا یا جن کی ڈیوٹی نگرانی کی ہوتی ہے انہیں مفت کھانے اور کپڑے کے علاوہ ۲۵ پیسے یومیہ دیا جاتا ہے۔ یہ پیسے ان کے حساب میں جمع ہوتے ہیں اور وہ ان پیسوں سے دوسری اشیا اپنے لیے منگوا سکتے ہیں، یا رہائی پر اپنے گھر لے جا سکتے ہیں۔

ستار گنج جیل کی نگرانی دوسری جیلوں کی طرح سے پولیس نہیں کرتی ہے اور نہ ہی جیل وارڈر قیدیوں پر تعینات ہوتے ہیں قیدی آزادانہ طور سے گھومتے پھرتے ہیں۔ رات کو وہ اپنی بیرکوں میں سوتے ہیں جن میں تالے نہیں ڈالے جاتے اور نہ ہی دروازے بند کیے جاتے ہیں۔

قیدیوں کو اس جیل میں کئی مراعات حاصل ہیں جو دوسری جیلوں میں دستیاب نہیں ہیں۔ یہاں پر زیادہ تر ایسے قیدی رکھے جاتے ہیں جنھیں قتل ڈکیتی وغیرہ جرائم میں عمر قید یا لمبی سزائیں ملتی ہیں۔ اس جیل میں ان قیدیوں کو نہیں لایا جاتا جو اغوا اور زنا کے جرائم میں سزایاب ہوتے ہیں۔

بند جیلوں (دیواروں والی جیلوں) کے برعکس قیدیوں کے خاندان کے افراد ستار گنج جیل میں آکر دو تین دن تک ٹھہر بھی سکتے ہیں۔ ہر سیکٹر میں نو نو دس دس کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جہاں قیدی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ان کوٹھریوں کو SEX HUTS کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ قیدی آزادانہ ماحول میں اپنی بیوی اور بچوں سے ملتے ہیں اور انھیں اپنی خواہشات کی تکمیل کی بھی آزادی ہوتی ہے۔

چند دن قبل جب میں ستار گنج جیل گیا تو اس وقت کئی قیدیوں کی بیویاں آئی ہوئی تھیں اور ان کوٹھریوں میں ٹھہری تھیں۔ رامپور ضلع کے ایک قیدی شیام لال کی بیوی نے بتایا کہ اس کا خاوند پچھلے آٹھ برسوں سے جیل میں ہے۔ اسے قتل کے ایک مقدمے میں عمر قید کی سزا ملی تھی اس کے چار بچے ہیں۔ دو بچے شیام لال کے جیل

میں آنے کے بعد پیدا ہوے۔ شیام لال جو پاس ہی کھڑا تھا اس نے کہا کہ میری بیوی دو تین ماہ میں ایک مرتبہ آتی ہے اور کچھ دن جیل کی ان کوٹھریوں میں میرے ساتھ گزارتی ہے۔

ضلع پیلی بھیت کے قیدی جیت رام نے بتایا کہ اقدام قتل کے مقدمے میں اسے سزا ہوئی تھی وہ پچھلے ایک سال سے جیل میں ہے شادی کے ایک ماہ بعد ہی جیل میں آنا پڑا اس لیے پریشان رہنے لگا مگر جب اس جیل میں آیا تو اس بات سے خوشی ہوئی کہ بیوی میرے پاس آسکے گی اور دونوں یکجا رہ سکیں گے ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ہمیں جیل میں جنسی آزادی ملے گی اور ہم خوشی و غم کی باتیں تنہائی میں کر سکیں گے۔

ایک تیسرے قیدی تیج پال کو اپنی بیوی کے ساتھ ایک کوٹھری کے باہر بیٹھے پایا اس سے پوچھا کہ وہ اس ماحول سے خوش ہے تو اس نے کہا کون قیدی ہوگا جو اسے پسند نہیں کرے گا۔ یہاں ہم اپنے گھر کی باتیں آزادانہ ماحول میں کر سکتے ہیں اس کے علاوہ نفسانی خواہشات بھی پوری کر سکتے ہیں تیج پال جو ضلع بلند شہر کا رہنے والا ہے قتل کے ایک مقدمے میں سزایاب ہوا اور عمر قید بھگت رہا ہے۔ پچھلے دو برسوں سے وہ اس جیل میں ہے اور اس کی بیوی چار پانچ مرتبہ وہاں آکر اسکے ساتھ تین تین چار چار دن رہ چکی ہے۔

قیدیوں میں اپنے ساتھیوں کے لیے کتنی ہمدردی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کھانے میں سے اپنے ساتھیوں کے بیوی بچوں کو کھانا دیتے ہیں کیوں کہ جیل قانون کے مطابق قیدیوں کے خاندان کے افراد کو کھانا وغیرہ جیل سے نہیں دیا جاتا اور جیل کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سے بیوی بچے خرید کر خوردنی اشیا لا سکیں۔

اسی جیل کے قیدی نرائن کی شادی عجیب و غریب ماحول میں ہوئی۔ نرائن جس کا تعلق سپیروں کے ایک خاندان سے ہے سے ملنے ایک دن اس کے ماں باپ آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص اور اس کی بیوی بھی تھی انھوں نے نرائن سے بات چیت کی اور لکھنؤ کی ایک لڑکی لجاوتی سے اس کی شادی طے کر دی۔ شادی کی پہلی رسم اس کے ماتھے پر تلک لگانا تھا جو لڑکی کے باپ نے ادا کی۔

دوسرے مہینے لڑکی، اس کے ماں باپ اور نرائن کے ماں باپ پہونچ گئے۔ "جے مالا" کی رسم سے لجاوتی اور نرائن کی شادی ہو گئی۔ جیل کے عملے نے مٹھائی کا انتظام کیا۔ شادی کے بعد دونوں کے والدین اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، لیکن لجاوتی جیل میں خاوند کے ساتھ رہ گئی۔

ایک ماہ تک دونوں ایک کوٹھری میں رہے جیل قانون کے مطابق تین دن تک قیدی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کوٹھری میں رہ سکتا ہے لیکن جیل سپرنٹنڈنٹ کو اختیار ہے کہ وہ خاص حالات میں اس میں توسیع کر سکتا ہے۔ اسی لیے لجاوتی اور نرائن کو ایک ماہ تک رہنے دیا گیا۔ اس کے بعد پچھلے چھ سات ماہ میں وہ دو تین مرتبہ پھر نرائن سے ملنے جیل آئی اور چند دنوں تک اپنے خاوند کے پاس رہنے کے بعد وہ گھر چلی گئی۔

نرائن نے بتایا کہ اب اس کی بیوی چند ماہ تک جیل میں نہیں آسکے گی کیونکہ وہ حاملہ ہے۔ وہ خوش تھا کہ وہ ایک بچے کا باپ بننے والا ہے۔ نرائن نے کہا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عمر قید کے ایک ملزم کی کبھی شادی ہو سکتی ہے اور وہ بھی جیل میں۔ شادی کے بعد بیوی کی صحبت ملنا تو ممکن نہیں تھا جب تک جیل سے آزادانہ ہو جاتا لیکن ستار گنج جیل میں ہونے والے نئے تجربے نے یہ تمام مواقع فراہم کیے اور اس کی تاریک زندگی کو تابناک بنا دیا۔

اس جیل کے قیدیوں کو گھر جانے کے لیے چھٹی دینے کی بھی ایک اسکیم زیر عمل ہے جس کے تحت قیدی پندرہ دن کے لیے چھٹی جا سکتے ہیں یہ چھٹی جیل حکام کی سفارش پر حکومت اترپردیش منظور کرتی ہے۔ قیدیوں کو یہ چھٹی شادی اور غمی وغیرہ کے موقعوں پر دی جاتی ہے۔ اس جیل کے بیشتر قیدی اس سہولت سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

ستارگنج جیل میں قیدیوں کو سزا میں زبردست چھوٹ دی جاتی ہے۔ اگر قیدیوں کا جیل میں طرز عمل (BEHAVIOUR) اچھا ہے اور وہ کام میں مستعدی دکھائیں تو یہ چھوٹ سو فیصد تک ہوتی ہے یعنی ایک سال کی قید بھگتنے پر ایک سال کی چھوٹ دی جاتی ہے۔

قیدیوں کو ایک اور آزادی ہے کہ وہ اپنے فاضل وقت میں تجارت کر سکتے ہیں۔ اس جیل کے کئی قیدیوں نے درزی، دھوبی، موچی اور پان بیچنے کے دھندے شروع کر دیئے ہیں۔ درزی کو مشین خریدنے کے لیے اسٹیٹ بنک سے قرض دلایا جاتا ہے اسی طرح دیگر اقسام کے کاروبار کے لیے بھی بینک نے قیدیوں کو قرضے دیئے ہیں چند قیدیوں نے قرض لے کر گائے اور بھینس خریدیں اور ان کا دودھ فروخت کر کے قرض ادا کیا۔ چند درزیوں نے بھی نہ صرف قرضے ادا کیے بلکہ پونجی اکٹھی کر لی۔ یہ قیدی فارم پر کام کرنے والے دوسرے افراد اور جیل کے عملہ کو دودھ سپلائی کرتے تھے یا کپڑوں کی سلائی کا کام کرتے تھے یا دھوتے تھے۔

ستارگنج کے قیدیوں کا دل بہلانے کے لیے ثقافتی پروگرام اکثر ہوتے رہتے ہیں جیل کے عمر قید کے ایک ملزم وجے جہنا نے ایک پارٹی بنائی ہے جو قوالیوں اور دوسرے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے لکھنؤ، دہلی اور دوسرے مقامات پر جاتی ہے۔ قیدیوں کو ستارگنج شہر میں سنیما دیکھنے کے لیے گروپوں میں لے جایا جاتا ہے اور حال ہی میں ایک سرکس دکھانے بھی قیدی لے جائے گئے۔ جیل میں بھی فلمیں دکھانے کا منصوبہ ہے۔

اس جیل میں قیدیوں کو ملنے والی مراعات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ نہ تو بھاگنے کی بات سوچتے ہیں اور نہ ہی ڈسپلن شکنی پر آمادہ ہوتے ہیں اسی لیے اس جیل میں نہ کوئی جھگڑا کبھی ہوا ہے اور نہ قیدیوں میں مارپیٹ۔ یہ جیل یوپی کی ایک عجیب و غریب جیل ہے۔

*

آفتاب نقوی سہوانی
آدرش انٹر کالج۔ کوڑا جہان آباد
ضلع فتحپور۔ یوپی

ہولی

پیام عید لیے جب بھی آ گئی ہولی ۔۔۔ دلوں سے ہر خلش غم مٹا گئی ہولی

ہر ایک دل کو شگفتہ بنا گئی ہولی ۔۔۔ بہار آئی وطن میں کہ آ گئی ہولی

ہوئے بلند جو شعلے تو نور سا پھیلا ۔۔۔ اندھیری رات کو روشن بنا گئی ہولی

چمن میں لالہ و گل رنگ ہے بہار اس کی ۔۔۔ فلک پہ حسن شفق بن کے چھا گئی ہولی

ہیں رنگ رنگ ہر اک سمت آج پیراہن ۔۔۔ ہر ایک سمت چمن سا کھلا گئی ہولی

گلے ملے تو ہوئے ختم سب گلے شکوے ۔۔۔ عداوتوں کو دلوں سے مٹا گئی ہولی

نشاں کہیں بھی نہیں آج ظلمت غم کا ۔۔۔ خوشی کی جوت دلوں میں جگا گئی ہولی

منائیں جشن مسرت کے جام پی پی کر ۔۔۔ مبارک اہل وطن کو کہ آ گئی ہولی

رہے خلوص و محبت دلوں میں آج کے دن
بس آفتاب ہمیں یہ سکھا گئی ہولی

شفیع اللہ خان راز اٹاوی
ایس این کالج کٹرہ پیرداد خاں
اٹاوہ

ظفر شہیدی
احاطہ کمال جمال
ہنرد کراس - لکھنؤ

غزلیں

جسم مٹی ہے روپ سونا ہے
آدمی خوشنما کھلونا ہے

ہم جنھیں بے خبر سمجھتے ہیں
ان کو معلوم ہے جو ہونا ہے

سامنا ہے دہکتے سورج کا
ہاتھ میں موم کا کھلونا ہے

شور ہے ہو رہے ہیں ساحل پر
کس کی کشتی کہاں ڈبونا ہے

مسکرانا کہاں نصیب ہمیں
اب تو دن رات خون رونا ہے

آپ آئیں تو روشنی ہو جائے
گھر کا تاریک کونا کونا ہے

کوئی بھی انجمن نہیں روشن
ہر جگہ تیرگی کا رونا ہے

رازؔ کا شغل پوچھتے کیا ہو
شاعری اوڑھنا بچھونا ہے

مانوس ہو چلا ہوں غم بے حساب سے
اک راستہ تو مل گیا، تعبیر خواب سے

بچوں کے سر تک آ گئی نفرت کی تیز دھوپ
کمہلا کے رہ نہ جائیں یہ چہرے گلاب سے

وہ موجِ حسن و عشق، جو طوفاں بدوش تھی
ساحل کو اپنے مانگ رہی ہے چناب سے

ماضی کے کچھ نقوش ابھر آئے ذہن میں
سوکھا ہوا گلاب جو نکلا کتاب سے

سر سے ہمارے سیکڑوں طوفاں گزر گئے
تشبیہ کس نے زیست کو دی ہے حباب سے

دل میں نقوش درد ابھارا کیا ظفرؔ
اشعار سے کبھی، کبھی تار رباب سے

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

ریاض خیرآبادی کے

مخمس و مسدس

ریاض خیرآبادی امیر مینائی کے نامور شاگرد تھے امیر مینائی سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ امیر کے زمرے کے تمام شعراء تجدید غزل کے لیے سعی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں شعر کو محض صنعت گری پر قربان نہیں کیا گیا بلکہ اس میں معنویت کی گہرائیاں پیدا کی گئیں۔ ریاض نہ صرف اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں بلکہ کچھ معنوں میں ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔ امیر کے شاگرد لکھنوی رنگ سے بیزار اور ناسخیت سے کوسوں دور ہیں۔ ریاض اور مضطر کا کلام اس کا اچھا نمونہ ہے۔ شاعری اور سوسائٹی کا مزاج ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ اور ہم آہنگ ہوتا ہے۔

آج قومیت شاعری کا عام موضوع بنتی جا رہی ہے اور ان لوگوں کے خلاف ایک طرح کا جذبۂ مخالفت پیدا ہوتا جا رہا ہے جو ابتدائی دور کے اسلوب اور رنگ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ریاض کے کلام میں دیر تک زندہ رہنے والے عناصر کتنے ہیں۔ شاعر ماضی و حال کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کا پیامبر و آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مذاق بدل جاتے ہیں سماجی رکاوٹیں جس طرح مزاج بدلتی ہیں نام بھی بدل دیتی ہیں۔ ممنوعات پیدا ہوتے اور مٹتے ہیں۔ آج جسے پست اور عریاں کہہ کر ٹھکرایا جا رہا ہے کل کو اعلیٰ درجہ کی حقیقت نگاری کہہ کر سراہا جا سکتا ہے۔ شاعری میں اچھے اور بڑے موضوع نہیں ہوتے تاہم یہ سچ ہے کہ ایک زمانے کا انداز گفتگو دوسرے زمانے میں متروک ہی نہیں ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ خود ریاض کے یہاں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جنھیں آج شستہ مذاق کی وجہ سے رد کرنا پڑے گا لیکن کبھی ان کی مانگ تھی۔ آج کے پڑھنے والے ان سے خوش نظر نہیں آتے۔

جو بے حجاب ہمیں سینہ تانے جلتے ہیں کھلے خزانے وہ جوبن لٹائے جاتے ہیں
ہم لاکھ پارساؤں کے اک پارسا سہی موقع ہے تم کو پائیں تو بتلاؤ کیا کریں

لیکن۔۔ ایسے اشعار میں کچھ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

ریاض ان میں بھی کوئی بات اچھی ہوگی
بُرے شعر جو درج دیوان کیے ہیں

یہ خوبی اس دور کے سماج کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کوئی صاحب قلم ہر وقت اپنے بہترین رنگ میں نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ہومر بھی اونگھ جاتا ہے اور کہیں کہیں اچھے سے اچھے لکھنے والے کی تحریر بھی محض لفاظی، ڈھیلے پن اور بھرتی کے الفاظ سے داغدار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ریاض کے کلام میں بھی کہیں کہیں نہایت عریاں تصویریں نظر آتی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ریاض کے کلام پر عریانی یا فحش گوئی کا حکم صادر کر دیا جائے۔ یہ ان کے قلم کی لغزش ہے جو شعر و سخن کے محاکات کی فضا میں روپوش ہو جاتی ہے اور جس کا احساس

پڑھنے والے پر عیاں ہوتا ہے۔ بہت عمیق مطالعہ کے بعد ہی اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

ریاض اپنے دور کے شاعرِ اعظم ہی نہیں بلکہ اخبار نویس اور انشا پرداز بھی ہیں۔ وہ اپنے اندازِ شاعری کی وجہ سے خیام سے آگے نکلتے نظر آتے ہیں اور عشقیہ شاعری کے میدان میں کبھی داغ دہلوی پر بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی ناولوں کے ترجمہ سے یہ روشن کر دیا ہے کہ نقل اصل سے کیسے آگے نکل جاتی ہے۔ ریاض اسد اد ب ہیں اپنے طنزیہ و مزاحیہ انداز کی مثال نہیں رکھتے۔ فتنہ ریاض کی رنگین زندگی کا ایک ورق ہے۔ ریاض الاخبار کی ادبیت اور فتنہ کی ظرافت نے سماج میں ایک شگفتہ ادب اور شستہ مذاق کی بنیاد ڈالی۔ ریاض خیام الہند بھی ہیں اور لسان الملک بھی۔

ریاض خیرآبادی نے غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان چند اوراق میں ہم نے ریاض کے مخمس اور مسدس کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

ریاض نے مخمس اور مسدس پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے مخمس بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن جو بھی لکھے ہیں وہ معیاری ہیں اور ادبی محاسن رکھتے ہیں۔ اس میں ایک تضمین بر مصرعہ طرح مشاعرہ احمد آباد بر زمانہ کانگریس ہے[3] اور دوسرا خمسہ مقطع غزل خود مشاعرہ احمد آباد کانگریس ہے[4] جس کا ایک بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کانگریس والوں سے کچھ آنکھیں ملا کر آئی شرم
دختِ رز کو بے تکلف ساتھ لا کر آئی شرم
وہ جگہ پاکیزہ تھی بوتل اٹھا کر آئی شرم
اے ریاض آشرم میں گاندھی کے جا کر آئی شرم

پھینک دی دریا میں جتنی تھی سمندر پار کی۔

اس میں رندانہ طرز کے اندر سیاسی خیالات و تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔

تیسرا مخمس ریاض نے بہ عنوان خمسہ غزل جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں ''حسب ایمائے خلد آشیاں بہ مقام رام پور لکھا ہے[1]'' یہ مخمس بہت طویل ہے۔ اس کا آخری بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

یہ تو مجال کیا ہے کہ الزام ان کو دیں　　اتنا کہیں ریاض ہماری جو سن سکیں
کیا آگئی ہے آج یہ حضرت کے ذہن میں　　نواب روزِ حشر خدا سے شکایتیں
اتنا بھی کوئی عشقِ بتاں میں نڈر نہ ہو

اس مخمس میں ریاض نے نواب کی ستائش کرتے ہوئے عرضِ حال کیا ہے۔

ریاض نے کچھ مسدس بھی لکھے ہیں ان کی بھی تعداد بہت کم ہے۔ پورے دیوان میں صرف پانچ چھ مسدس ہیں۔ کیونکہ ریاض کا اصل رنگ غزل میں موجود ہے اس لیے انھوں نے اس صنفِ سخن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اور پھر یہ صنف ان کے دور کی چیز بھی نہ تھی۔ اب ہم ریاض کے کچھ مسدسوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ریاض نے ایک ۲۹ بندوں کا مسدس کہا ہے جو فتنہ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا ہے[2]۔ اس میں زمانہ کی نیرنگیوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اور حسینوں کو فتنہ کی طرف سے مبارک باد پیش کی گئی ہے۔ یہ ریاض کی شوخ نگاریوں کا پھڑکتا ہوا ایک نمونہ ہے۔ ذیل کا ایک بند ملاحظہ ہو، جو حسینوں کے راز کا انکشاف کرتا ہے۔

کوئی نور کے تڑکے چپکے اٹھا ہے　　پریشان گیسو میں جوڑا کھلا ہے
وہ بھولا سا چہرہ کچھ اترا ہوا ہے　　چھپائے ہوئے رخ پہ آنچل پڑا ہے
یہ ڈر ہے ستائیں گے جھونکے ہوا کے
کریں گے پریشان آنچل اڑا کے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

[1] ریاض رضوان از تلمذ حسین ص ۵۷۲۔　[2] ایضاً ۵۷۲-۵۷۸
[3] ریاض رضوان از تلمذ حسین ص ۵۶۸-۵۷۱　[4] ریاض رضوان از تلمذ حسین ص ۷۲۔

عزیز جھانسوی
بساطی بازار جھانسی

غزل

ہوں گے کبھی تو ختم حجابوں کے سلسلے
ان سے یہ ملنے جلنے میں خوابوں کے سلسلے

اک لمحۂ حیات کا حاصل کہو ہمیں
دریا سے کہہ رہے ہیں حبابوں کے سلسلے

جو بھی یقین ہے وہ گماں لگ رہا ہے آج
صحرا میں دور جیسے سرابوں کے سلسلے

ہم سے جنونِ عشق کو حاصل ہوا عروج
ہم سے چلے ہیں خانہ خرابوں کے سلسلے

عقبیٰ میں فکر ہو گی عذاب و ثواب کی
دیکھیں گے روزِ حشر حسابوں کے سلسلے

ہر رمز کائنات سے واقف ہیں ہم عزیز
حق نے عطا کیے ہیں کتابوں کے سلسلے

❖

سید شکیل احمد سید

غزل

ابھی تو آئے ہو بیٹھو کہاں یہ رات گئی
تمہاری ٹھہری ادا اپنی تو حیات گئی

نفس نفس نے عداوت نبھائی ہے ہم سے
کھلی زباں تو رقیبوں میں اڑ کے بات گئی

ذرا سی شوخی پہ ہم سے وہ بدگماں ہو کر
جھٹک کے ہاتھ چلے میری کائنات گئی

قفس ہے مجھ کو گوارا رہا نہ کر صیاد
چمن بہار میں چھوٹا چمن کی بات گئی

بڑا تھا نام جوانی کا میں نے دیکھ لیا
سکوں نہ دن میں ملا بیخودی میں رات گئی

نگاہِ ناز سے وہ دیکھ لے اگر سید
تڑپ کے تم بھی کہو گے مری حیات گئی

رضیہ صلاح الدین
اصطبل - یحییٰ گنج، لکھنؤ

(افسانہ)

اجالے کا زہر

رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی، آتی بھی کیسے؟ بات ہی کچھ ایسی ہوئی۔ بالکل انہونی۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ایسا دن اس کی زندگی میں آسکتا ہے۔ اس نے وہ سنہرے خواب جو عموماً لڑکیاں دیکھا کرتی ہیں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی حیثیت پہچانتی تھی۔ کیا تھا اس کے پاس؟ وہ معمولی خدوخال اور سانولے رنگ کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ پھر بھی اتنی بری نہیں تھی جتنی وہ اپنے کو سمجھتی تھی۔ اس احساس نے اس کے اندر احساس کمتری پیدا کردیا تھا۔ وہ ہر محفل سے گریز کرتی۔ اگر چار مل کر قہقہہ لگاتے تو اسے ایسا لگتا کہ وہ اس کی بدصورتی کا مذاق اڑا رہے ہیں اور بھری محفل میں وہ اپنے کو تنہا تنہا محسوس کرتی۔

مالی اعتبار سے بھی اس کی حالت اچھی نہیں تھی ورنہ پیسہ تو ہر عیب چھپالیتا ہے۔ بدصورتی بھی خوبصورتی نظر آنے لگتی ہے۔

ماں باپ تھے نہیں، ایک بھائی تھا جو کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کا اپنا خرچ بہت تھا ایک بیوی اور چار بچے پریشانی میں کٹ رہی تھی۔ پھر بھی جس طرح ممکن تھا وہ بہن کا بار سنبھالے تھا۔ صدف کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کرلے اور اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے اور زندگی کا سفر بغیر کسی سہارے کے پورا کرسکے۔

لیکن اس دن پھول نے ایک ایسی بات کہہ دی جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔

پھول صدف کی واحد سہیلی تھی۔ ماں باپ نے اس کا نام بالکل صحیح رکھا تھا۔ وہ اپنے نام کی طرح بے حد حسین گلاب کا تازہ تازہ بھیگا بھیگا مہکتا ہوا پھول تھی، شاعروں نے اپنی غزلوں میں محبوبہ کا جو نقشہ کھینچا ہے ہو بہو وہی۔

پھول اور صدف کی دوستی کا سبھی نے مذاق اڑایا پھبتیاں کسیں۔ صدف پیچھے ہٹی مگر۔ پھول پر ان واہیات باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ تو ایسا منھ توڑ جواب دیتی کہ مذاق اڑانے والے اپنا سا منھ لے کے رہ جاتے۔

ایک خاص وجہ تھی دونوں میں دوستی کی۔ مالی اعتبار سے پھول بھی صدف کی طرح شکستہ تھی۔ صدف پر گھر کی کوئی ذمہ داری نہ تھی سوائے اپنی ذات کے۔ برخلاف اس کے پھول کے دو چھوٹے بھائی بہن یعنی ایک بھائی اور ایک بہن جن کی ذمہ داری پھول ہی کے سر تھی کیونکہ گھر میں کمانے والا کوئی تھا نہیں، باپ تھے نہیں۔ ایک ماں تھی جو اکثر بیمار رہتی تھی۔ بس یہی تھے حالات جس نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کردیا تھا۔ دونوں کی زندگی کا مقصد تعلیم پوری کرکے سروس کرنا تھا۔

ایک دن پھول نے صدف سے کہا:

پھول ۔ صدف ایک بات کہوں؟

صدف ۔ کوئی خاص بات ہے؟

پھول ۔ خاص ہی سمجھ لو۔

صدف ۔ سمجھ کیا لو، کہو نہ کیا بات ہے؟

پھول ۔ تم میرے خالہ زاد بھائی عمر کو جانتی ہو ؟
صدف ۔ بھلا میں کیا جانوں تمھارے خالہ زاد بھائی کو ؟
پھول ۔ ارے کبھی جانتی کیوں نہیں، میرے گھر کے پاس ہی تو رہتے ہیں، تم نے کئی بار ان کو میرے یہاں دیکھا ہے۔
صدف ۔ اچھا اچھا وہی جو تمھارے منگیتر ہیں ؟
پھول ۔ ہاں وہی۔
صدف ۔ کیا ہوا ان کو ؟
پھول ۔ ہوا تو کچھ نہیں۔
صدف ۔ اُفوہ کہو بھی تو کچھ آخر ؟
پھول ۔ وہ عمیر بھائی شادی کرنا چاہتے ہیں۔
صدف ۔ تو یہ بات ہے جبھی میں کہوں . . .
پھول ۔ نہیں صدف یہ بات نہیں، پھول نے صدف کی بات کاٹتے ہوئے کہا، تم تو جانتی ہو میں ابھی شادی نہیں کرسکتی مجھ پر گھر کی کتنی ذمہ داری ہے۔
صدف ۔ مطلب کیا ہے تمھارا ؟
پھول ۔ مطلب یہ کہ جب تک میرے بھائی بہن کی تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی میں شادی نہیں کرسکتی۔
صدف ۔ یہ کام تم شادی کے بعد بھی کرسکتی ہو۔
پھول ۔ نہیں میں اپنی ماں کو کس پر چھوڑ دوں، جو قریب المرگ ہیں۔
صدف ۔ تب تو عمیر بھائی کو کم از کم دس سال انتظار کرنا ہوگا۔
پھول ۔ یہی تو مشکل ہے۔
صدف ۔ کیوں مشکل کیوں۔ اگر ان کو تم سے محبت ہے تو وہ دس سال کیا عمر بھر تمھارا انتظار کریں گے۔
پھول ۔ محبت سے تمھاری کیا مراد ہے، ہماری شادی امی اور خالہ امی نے طے کی تھی۔
صدف ۔ خالہ امی تمھاری کیا کہتی ہیں۔
پھول ۔ وہ کیا کہینگی بیچاری ان کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے چراغ سحری ہو رہی ہیں۔ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور تم جانو عمیر بھائی ہی ان کے اکلوتے بیٹے ہیں اور فرمانبردار بھی ہیں جو بہرحال اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں۔
صدف ۔ میری تو رائے ہے کہ تم شادی کرلو۔
پھول ۔ کیسی آسانی سے کہہ دیا کہ شادی کرلو تمھارے آخری خواہش پوری کرنے کے لیے میں اپنے گھر والوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں میں نے عمیر بھائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کسی بھی قیمت پر ابھی شادی نہیں کرسکتی۔
صدف ۔ پھر کیا کہا عمیر بھائی نے ؟
پھول ۔ کہتے کیا۔ وہ کسی بھی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔
صدف ۔ ارے، یہ تو بڑے بے وفا نکلے۔ صدف نے حیرت سے کہا۔
پھول ۔ میں نے کہا نہ میری شادی کا فیصلہ بزرگوں نے کیا تھا ہماری محبت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔
صدف ۔ ٹھیک ہے، تم نے انکار کیا بات ختم ہوگئی۔ اب وہ جانیں ان کا کام۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ ؟
پھول ۔ بات ختم کیسے ہوگئی۔ میرے انکار نے تو میری ذمہ داری اور بڑھادی۔
صدف ۔ وہ کس طرح ؟

پھول ۔ خالہ امی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میری امی بھی
اس قابل نہیں۔ لہذا انھوں نے یہ ذمہ داری
مجھ پر ہی ڈال دی ہے کہ میں ہی اپنی جگہ کسی
دوسری لڑکی کا انتخاب کردں۔
صدف ۔ یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے، امتحان دینا ہے کہ نہیں؟
سر پر امتحان ہے اور تم شادی کے چکر میں ہو۔
میری مانو تو پڑھائی چھوڑ دو اور اپنے عمیر بھائی
کے لیے لڑکی تلاش کرو۔
پھول ۔ وہ تو کرلی۔
صدف ۔ سچ؟ کون ہے بھئی جو تمھاری جگہ لے گی۔
اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
پھول ۔ میری نعم البدل صرف ایک ہی لڑکی ہوسکتی ہے
صدف ۔ میں سمجھی نہیں۔ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔
پھول ۔ اس طرح چونکو نہیں۔ میں نے کیا غلط کہا کہ میرا
نعم البدل صرف ایک لڑکی ہوسکتی ہے اور وہ
تم ہو!
صدف ۔ نہیں، ایسا مذاق مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ
ناگواری سے کھڑی ہوگئی۔
پھول ۔ بیٹھو بیٹھو۔ پھول نے صدف کو بٹھاتے ہوئے
کہا ۔۔۔ میں نے مذاق نہیں کیا بلکہ بہت
سوچ سمجھ کر کہا ہے۔
صدف ۔ کچھ بھی ہو میں تمھارے منگیتر سے شادی نہیں
کرسکتی۔
پھول ۔ پھر وہی بے وقوفی، ارے بابا میں کئی بار تم سے
کہہ چکی ہوں کہ ہماری شادی بزرگوں نے
طے کی تھی، ہم نے نہیں۔
صدف ۔ اور پھر میں تمھارا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔
پھول ۔ کیوں نہیں مجھ میں ایسا کیا ہے جو تم میں نہیں۔
صدف ۔ مجھ میں وہ کچھ بھی نہیں جو تم میں ہے۔ اس
نے طنز سے کہا۔
پھول ۔ پھر وہی صورت کا رونا لے بیٹھیں۔ ارے
بابا سیرت بھی تو کوئی چیز ہے، اور پھر تم ایسی
بری بھی نہیں جیسا اپنے کو سمجھتی ہو۔
صدف ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔
پھول ۔ نہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات نہیں، میں نے
عمیر بھائی سے پوچھ لیا ہے وہ راضی ہیں۔
صدف ۔ وہ اس لیے کہ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔
پھول ۔ انھوں نے تم کو میرے گھر پر کئی بار دیکھا ہے۔
صدف خاموش رہی اس سے کوئی جواب بن نہیں
پڑا۔
پھول ۔ میں تو چلی رات میں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ
کر کل مجھے جواب دینا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

پلک جھپکتے شادی کے دس سال بیت گئے، اور یہ دس
سال صدف کے لیے دس صدیوں سے کم نہیں تھے۔ عمیر کے
ساتھ شادی کرکے اس نے سخت غلطی کی تھی اس کا اندازہ اسے
بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مگر افسوس تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
اور پھر مقابلہ کرنا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بہت
جلدی حالات کے آگے سپر ڈال دیتی تھی۔ صدف سے شادی
کرنے کے بعد بھی عمیر پھول ہی کا تھا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات
نہیں تھی، اس کا اندازہ تو اس کے آٹھ سالہ لڑکے عبید کو بھی ہوگیا
تھا۔ وہ اکثر کہتا۔
عبید ۔ ممی یہ پھول آنٹی یہاں کیوں آتی ہیں۔
صدف ۔ بیٹے وہ تمھاری آنٹی ہیں اس لیے آتی ہیں
عبید ۔ مگر وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی ہیں۔
صدف ۔ کیوں بیٹے؟
عبید ۔ ممی آپ نہیں جانتیں، وہ پاپا کے پاس ایک ایک
گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں۔ اس نے بھولپن

سے کہا۔
اور یہ منظر وہ خود بھی کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

صدف۔ بات ایسا نہیں کہتے۔

عبید۔ اور پاپا بھی تو آنٹی سے خوب ہنستے بولتے ہیں آپ سے تو ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتے۔

صدف۔ میری طبیعت جو ٹھیک نہیں رہتی ہے اسی لیے آنٹی آجاتی ہیں۔ ذرا گھر کی دیکھ بھال بھی ہو جاتی اور تمھارے پاپا کا بھی جی بہل جاتا ہے۔

عبید۔ میں یہ کچھ نہیں جانتا آپ آنٹی کو منع کر دیجیے وہ ہمارے گھر نہ آیا کریں۔ کام کے لیے آپ نوکر کیوں نہیں رکھ لیتی ہیں؟

صدف۔ اچھا بھئی میں نوکر رکھ لوں گی تم اپنے پاپا سے کچھ نہ کہنا، جاؤ اپنا ہوم ورک کر لو۔

عبید تو پیر پٹخ کر چلا گیا اور صدف کی آنکھوں کے سامنے شادی کے گزشتہ دس سال تھے۔ کس طرح اسے قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ شادی جب ہوئی تو وہ ٹریننگ کر رہی تھی پاس ہوتے ہی فوراً سروس کر لی۔ اسکول کے بعد ٹیوشن کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا — اسے حسرت رہ گئی کہ کبھی تو عمیر اس سے جھوٹ موٹ ہی یہ کہہ دیتا کہ بس کرو اتنی محنت۔ تم تھک جاؤ گی بلکہ وہ تو اور اس کے لیے ٹیوشن لاتا تھا اور اس کی اپنی محنت سے چند ہی سال میں عمیر کا ٹوٹا گھر ایک خوب صورت بنگلے میں بدل گیا تھا۔ گھر میں اسکوٹر، ٹی وی، فریج کیا نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ اس نے کبھی اچھا کھانا نہ کھایا نہ ہی اچھا کپڑا پہنا پیٹ بھرا اور تن ڈھکا۔ گھر بنانے کے لیے اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔ اپنے مٹنے کا غم نہیں افسوس تو یہ تھا کہ جس کے لیے مٹ گئی اس کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

صدف دھیرے دھیرے اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ کر بھی انجان بنی رہی اور یہ خاموشی اس کو اندر ہی اندر ڈس رہی تھی جس کے نتیجے میں وہ دو مہینے سے بستر سے لگ گئی تھی۔ کئی ڈاکٹر بدلے جا چکے تھے۔ بظاہر اچھی اچھی اور قیمتی دوائیں بھی دی جا رہی تھیں مگر سب بے سود۔

پھول مستقل طور پر اسی کے گھر رہنے لگی تھی کیونکہ صدف کی تیمارداری اور گھر کی تمام ذمہ داریاں اسی کو تو نبھانا تھیں۔

اور اس دن عبید غصہ سے کانپتا ہوا صدف کے کمرے میں داخل ہوا اور ایک شیشی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا

عبید۔ یہ دیکھیے۔ اس کے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

صدف۔ شیشی کو پڑھتے ہوئے بولی۔ یہ شیشی تمھیں کہاں سے مل بیٹے اس میں تو زہر ہے۔

عبید۔ اور یہ زہر آنٹی روز آپ کو دودھ میں ملا کر دیتی ہیں۔

صدف۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟

عبید۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ آنٹی نے کوئی شیشی بلاؤز سے نکالی اور ایک قطرہ دودھ میں ڈال کر شیشی پھر اپنے بلاؤز میں چھپا لی پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی دوا ہوگی پھر خیال آیا کہ دوا ہوتی تو بلاؤز میں کیوں چھپاتیں؟ جب سے میں تاک میں تھا۔ آج معلوم نہیں یہ شیشی وہاں کیسے رہ گئی۔؟

صدف کا سر چکرا رہا تھا۔ کتنا بڑا جال اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کیسی زبردست سازش تھی، پھول اپنی چھوٹی بہن کی شادی کر چکی تھی۔ بھائی تعلیم مکمل کر کے نوکر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے فرائض پورے کر چکی تھی۔ بقول اس کے جس کی وجہ سے اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا ادھر اس نے بھی اپنے خون سے سینچ کر اس کے لیے ایک خوبصورت گھر تیار کر دیا تھا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کام پورا ہو چکا تھا۔ وہ یہ سب

سوچ ہی رہی تھی کہ پھول مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے۔

پھول ۔ معاف کرنا صدف آج دودھ میں دیر ہوگئی
ماچس نہیں مل رہی تھی کہ دودھ گرم کرتی ——
ڈھونڈنے میں دیر ہوگئی۔

صدف ۔ ماچس یا زہر؟

پھول ۔ زہر! کیسا زہر؟ کیا کہہ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ ایک دم گھبرا گئی۔

صدف ۔ پھول مجھے مارنا ہی تھا تو ایک دم سے مار دیا ہوتا
تِل تِل کرکے مارنے سے کیا ملا تمھیں؟ میں خود سمجھ رہی ہوں کہ اب میری ضرورت اس گھر میں نہیں ہے۔ دودھ میں ملانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تم مجھے شیشی لاکر دے دیتیں۔ میں خوشی خوشی زہر پی لیتی۔ کیا میں اپنی سہیلی اپنی دوست کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتی؟ یہ دیکھو میں تمھارے سامنے پی رہی ہوں
یہ کہہ کر صدف نے عبید کی دی ہوئی شیشی اپنے منھ سے لگالی۔

اپنی بات : صفحہ ۲ کا بقیہ

ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے اور اپنی نگارشات سے نیادور کو نوازتے رہتے تھے۔ تقریباً ۱۳ برس تک وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی واردو سے وابستہ رہے۔ اس سے قبل وہ ۱۰ برس تعلقدار کالون کالج لکھنؤ میں اردو کے استاد رہے۔ اس حیثیت سے طلبا کی ایک بڑی تعداد ان کے علم و فضل سے مستفید ہوئی۔ خلیل صاحب کا تعلق ملیح آباد کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ لیکن زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے لکھنؤ ہی میں گزارا۔ چنانچہ لکھنؤیت ان کی گفتگو، طرز عمل اور رکھ رکھاؤ میں رچ بس گئی تھی۔ ان سے ملنے والے ان کی مرنجاں مرنج شخصیت، ان کے اخلاص و مروت اور ان کی خوش مزاجی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ادارۂ نیادور خلیل صاحب کے انتقال پر گہری سوگواری کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

ریاض خیرآبادی کے مخمس و مسدس صفحہ ۴۲ کا بقیہ

ایک اور بند حسینوں کی عشوہ گری اور خرام ناز کے متعلق ملاحظہ فرمائیے۔

خراماں خراماں حسیں جارہے ہیں   وہ پھر ہٹ کیے نازنیں جارہے ہیں
وہ اٹھلاتے کچھ مہ جبیں جارہے ہیں   وہ شرمائے پردہ نشیں جارہے ہیں

قیامت ہیں آفت ہیں انداز ان کے
اٹھائے نہ دشمن کبھی ناز ان کے

مسدس کے آخری بند میں حسینوں کو مبارکباد پیش کی گئی ہے۔ مسدس کی زبان بہت ہلکی پھلکی ہے۔ اور اس صنفِ سخن کے لیے موزوں ہے۔

٭ ریاض کا ایک اور مسدس بہ عنوان جلسۂ دستاربندی مدرسہ نیازیہ خیرآباد ہے۔ یہ بہت مختصر مسدس ہے جس میں صرف چار بند شامل ہیں۔ مدرسہ نیازیہ آج بھی خیرآباد میں جونیر ہائی اسکول کی صورت میں چل رہا ہے، لیکن یہ مسدس اس وقت کی یادگار ہے جب مدرسہ اپنے شباب پر تھا اور علم و ہنر کا مخزن عوام کے لیے بنا ہوا تھا۔

ریاض کا یہ آخری مسدس ترانے کے روپ میں ہے جس کی صنفِ سخن مسدس ہے اور مضامین و انداز ترانہ سے متعلق ہے۔ یہ بہ عنوان ترانۂ خلافت (لہرائے سائے میں عرش بریں کے) شامل دیوان ہے۔ اس میں چوبیس بند شامل ہیں۔

ریاض نے ایک مسدس بہ تقریب تشریف آوری اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن بھی لکھا ہے جو نو بندوں پر مشتمل ہے۔

Urdu Monthly

NAYA DAUR

POST BOX No.146 LUCKNOW 226001

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی صدارت میں ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء کو نئی دہلی میں منعقدہ قومی ترقیاتی کونسل کے جلسہ کا
ایک منظر۔ تصویر میں مرکزی وزیر منصوبہ بندی شری ایس۔ بی چوہان تقریر کرتے ہوئے۔ مرکزی وزیر مالیات
شری پرنب کمار مکھرجی اور منصوبہ بندی کمیشن کے ممبر شری ایم۔ ایس سوامی ناتھن بھی نظر آرہے ہیں۔